سوز و سازِ رُومیؒ

پیر عبداللطیف خان نقشبندی
ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور

مثنوی معنوی مولوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؒ کبھی پیچ و تابِ رازیؒ
(اقبالؒ)

سوز و سازِ رومیؒ

تصوف کی کتاب مثنوی مولانائے رومؒ سے
منتخب اشعار مع مختصر تشریح

پیر عبداللطیف خان نقشبندی
ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور

مثنوی معنوی مولوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

مجلد: 978 969 0 02154 0

بارِ اوّل ـــــــــــــ ۲۰۰۸ء

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ہیڈ آفس و شو روم: 60۔ شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

راولپنڈی آفس: 277۔ پشاور روڈ، راولپنڈی۔

کراچی آفس: فرسٹ فلور، مہران ہائٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔

سوز و سازِ رومیؒ | Sozo Sazay Roomi
پیر عبداللطیف خان نقشبندی | Peer Abdul Latif Khan Naqshbandi

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور، پاکستان۔ باہتمام ظہیر سلام پرنٹر و پبلشر

email:support@ferozsons.com.pk

www.ferozsons.com.pk

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا

(یقیناً بعض بیان سحر کا اثر رکھتے ہیں)

(بخاری)

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَۃٌ

(بے شک بعض اشعار حکمت ہیں)

(بخاری، مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ وغیرہ)

انتساب

بنام

حضور پُر نور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

و

جُملہ خواجگانِ نقشبندؒ

از حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تا خواجہ و مخدومِ مَن قبلہ پیر حضرت علّامہ علاؤ الدّین صدّیقی غزنوی مدظلّہ العالی، سجادہ نشین دربارِ عالیہ نیریاں شریف تراڑ خیل آزاد کشمیر...... اور اس فقیر کے محبوب قومی شاعر علّامہ اقبالؒ اور میرے درویش والدین رحمتہ اللہ علیہم جن کی فیض رَس نگاہوں نے مجھے ملّت و قوم کی خدمت کے قابل بنایا۔

خادم الفقرا

عبداللطیف خان نقشبندی

تشکّر

زیرِ نظر کتاب کی مرحلہ وار تکمیل میں جناب محمد عاصم مجید خان ایڈیشنل کلکٹر کسٹمز نے میری بلاغرض و غایت مدد فرمائی ہے جس کا میں بے حد ممنون ہوں۔ آپ کے والدین نے بھی اس کتاب کی تکمیل میں جو کوششیں کی ہیں، وہ بھی قابلِ ستائش ہیں۔ جناب محمد شاہد ملک ایم۔ ڈی۔ ٹرپل ایم نے بھی اس کتاب کی پروف ریڈنگ کے لیے جو انتظامات فرمائے ہیں، میں ان کا بھی بے حد ممنون ہوں۔

عبداللّطیف خان نقشبندی
ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات لاہور
خلیفہ مجاز نیریاں شریف، آزاد کشمیر
کیولری گراؤنڈ، لاہور چھاؤنی
فون: 6666631-6665475

لاہور
۲۱ دسمبر ۲۰۰۷ء

مولانا رومیؒ کے اشعار کے حوالہ جات

زیرنظر کتاب ''سوز و سازِ رومیؒ'' میں شامل کئے گئے مولانا رومیؒ کے ہر شعر کے نیچے اس کا ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ''الفیصل ناشران کتب، اُردو بازار، لاہور'' کی شائع کردہ مثنوی سے اُن کی اجازت سے ماخوذ ہے۔ ہر شعر کے اُردو ترجمے کے بعد بریکٹ میں الفیصل کی مطبوع مثنوی کا صفحہ نمبر اور جلد نمبر بھی لکھ دیا گیا ہے، تاکہ قارئین کو ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔ ایران کے شائع کردہ اشاریہ میں سے بہت سے شعر نہیں مل سکے، اس لئے ایسے اشعار کے بعد صفحہ نمبر اور جلد نمبر کی جگہ (x) کا نشان دے دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا رومیؒ کے شعر کے ترجمے کے بعد (۴۱۸/۳) دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ الفیصل کی مثنوی کے ترجمہ کی جلد نمبر سوم کے صفحہ نمبر ۴۱۸ پر یہ شعر مل سکتا ہے۔

جب دو یا اس سے زائد اشعار کسی صفحہ پر لکھے گئے ہوں تو آخری شعر کے نیچے جو حوالہ دیا گیا ہے وہ اس سے اُوپر درج شدہ اشعار کا حوالہ بھی سمجھا جائے گا، خواہ وہ شعر مثنوی سے ہو یا کلیاتِ اقبالؒ سے ہو۔ اس کتاب کے آخری باب میں کچھ حوالے احادیثِ مثنوی (مؤلف ڈاکٹر محمد عبداللطیف) سے بھی دیئے گئے ہیں۔ ان حوالوں کا مطلب یہ ہے کہ ان اشعار کو احادیثِ مثنوی سے لیا گیا ہے، مثلاً (۷۷/۱۳۳) کا مطلب ہے احادیثِ مثنوی میں اس شعر کا نمبر ۱۳۳ ہوگا اور یہ شعر اس کتاب کے ۷۷ صفحے پر ملے گا۔ اسی طرح (۵/۱) کا مطلب یہ ہوگا کہ صفحہ پانچ پر پہلا شعر۔

کلیاتِ اقبالؒ کی کتابوں کے لئے درج ذیل مخففات استعمال کئے گئے ہیں۔

کلیاتِ اُردو

بانگِ درا = (ب۔د)

بالِ جبریل = (ب۔ج)

ضربِ کلیم = (ض۔ک)

ارمغانِ حجاز = (ا۔ح)

کلیاتِ فارسی

اسرار و رموز = (ا۔و۔ر)

پیامِ مشرق = (پ۔م)

زبورِ عجم = (ز۔ع)

جاوید نامہ = (ج۔ن)

پس چہ باید = (پس۔چہ)

ارمغانِ حجاز = (ا۔ح)

فہرست

(حصہ دوم)

رومیؒ اور وادیٔ عشق

۴۔ پروازِ عشق

۵۔ شاد باش اے عشق خوش سودائے ما (کمالاتِ عشق)

(حصہ سوم)

شیخ نورانی ز راہ آگہ کند

۱۷۔ شیخ نورانی ز راہ آگہ کند (شیخ نورانی راہوں سے آگاہ کرتا ہے)

(حصہ چہارم)
نفس اور اس کی سرکشی

(حصہ پنجم)

مثنوی اور قرآن

۳۷۔ دُنیا اور اس کی آفات

۳۸۔ جبر و قدر

(حصہ ششم)

مثنوی میں احادیث اور اشاراتِ قرآن

حمدِ باری تعالیٰ

(از مصنف)

نہ میں ہی ترے قابل ہوں، نہ یہ دل ترے قابل ہے
خدایا کر کرم کہ یہ تری عادت میں شامل ہے
طریقت میں شریعت کا ہے گویا اوّلیں منصب
شریعت جس سے ٹکرائے تو وہ تحریرِ باطل ہے

مٹا دیتا ہے سالک حرفِ "لاؔ" سے پورے عالم کو
دلِ سالک میں تو حق کے سوا ہر چیز فاضل ہے
مجھے کیا کام داغِ لالہ و گل کے بکھیڑوں سے
میرے دل میں تو سوزِ "ہَاوہُوْ" کی ایک محفل ہے

رہی ہے آیۂ "لاتَقْنَطُوْا" پیشِ نظر میرے
سمندر کے تلاطم میں مجھے اُمیدِ ساحل ہے
جدھر دیکھو ادھر جلوۂ "وَجْهُ الله" نظر آئے
فقط یہ بات، جس کو عشق والی آنکھ حاصل ہے

جب عرشِ پاک کی ہر شے میں نورِ مصطفائی ﷺ ہے
وہی اک نور ہے جو ہر ولی کے دل میں شامل ہے
خدائے کبریا کی شانِ مشتاقی کو کیا کہیے
رسول اللہ ﷺ کا جو مشتاق ہو، انسان کامل ہے

نبیؐ پاک ﷺ کے در سے ملا ہم کو پتہ تیرا
جو اس راہ سے نہیں آتا وہ اک حرفِ تجاہل ہے
جمالِ حق میں پوشیدہ ہے عرفاں مصطفائی ﷺ کا
لطیفؔ ایسا ہی دل ہے جو نبی ﷺ کے در کے قابل ہے

ہم عاشق ہیں محمد ﷺ کے ہمارا کام درویشی

نہ حسرت مال و زر کی ہے نہ خطرۂ کم و بیشی
ہم عاشق ہیں محمد ﷺ کے ہمارا کام درویشی
کوئی نسبت کسی کے کام نہ آئے گی محشر میں
ملی ہم کو رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے ہم آغوشی

خزانے اہلِ دنیا کے مبارک اہلِ دنیا کو
بڑی دولت ہے دولت سے جو مل جائے فراموشی
نہ کارِ عیش و عشرت ہے نہ کارِ منصب و کرسی
ملی ہے ہم کو گویا اس طرح کی خود فراموشی

جو محتاجِ زمانہ ہو تو خاک ایسی امارت پر
فقیری میں ہو سلطانی تو پیدا کر وہ درویشی
خدا کے ہاں فنا فی الصفت مومن کی علامت ہے
شعار موموناں ہے آج غفلت اور کم کوشی

مسلماں کی روش میں مغربی انداز چھائے ہیں
یہودی سے بھی بڑھ کر ہے مسلماں کی ستر پوشی
رسول اللہ ﷺ کی صحبت نے جنہیں دیں کا سکون بخشا
وہ مسلم ڈھونڈتا ہے سازِ مغرب کی گرم جوشی

میں عشقِ مصطفےٰ ﷺ میں غرق رہتا ہوں لطیفؔ اکثر
مرا مذہب ہے مے نوشی، مرا مسلک ہے مدہوشی

تأثرات

پیر عبداللطیف خان نقشبندی نے اس سے قبل دس عدد کتب کی تکمیل کی ہے جو کہ پاکستان اور بیرون ملک میں بے حد مقبول ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب سوز و سازِ رومیؒ میں آپ نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی تصنیف مثنوی معنوی کو عام فہم الفاظ میں پیش کیا ہے جسے پاکستان کے ہر طبقے کے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ میں ایسی کتاب کی کمی بہت دیر سے محسوس کر رہا تھا جس کو عبداللطیف خاں صاحب کی کاوشوں نے ایک طویل مدت کے بعد مکمل کیا ہے۔ اُمید ہے یہ کتاب اہلِ تصوف کی دیرینہ تشنگی کو دُور کرے گی۔ اللہ تعالیٰ مصنف کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کی فیض رسانیوں کے سلسلہ کو جاری و ساری فرمائے۔

خاک راہِ صاحب دلاں

پیر علاؤ الدین صدیقی، غزنوی، نقشبندی

نیریاں شریف، تراڑ خیل (آزاد کشمیر)

۲۳ ستمبر ۲۰۰۶ء

تقدیم

از مصنّف

مغلیہ خاندان کے زوال کے بعد برصغیر ہندو پاک میں انگریزوں کی حکومت کے تسلط کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا دَور دَورہ جاتا رہا اور انگریزی نے فارسی کی جگہ لے لی۔ انگریزی زبان کی آمد کے بعد عوام میں فارسی کا رُجحان جاتا رہا اور لوگوں کا رُجحان انگریزی زبان سے وابستگی اختیار کر گیا، حتیٰ کہ اب فارسی زبان کا اقتدار اس قدر کم ہو گیا ہے کہ یہ محض ایک معمولی مضمون کی صورت میں تعلیمی اداروں میں پڑھایا جانے لگا ہے۔ فارسی جو ایک زمانے میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اب اس کی وہ قدر و قیمت نہ رہی۔ اس تبدیلی کے ساتھ رفتہ رفتہ تصوّف اور اسلامی ادب کا بیش بہا سرمایہ مسلمانوں کے ہاتھوں اور ذہنوں سے نکل کر حوادثاتِ زمانہ کے پسِ منظر میں چلا گیا۔ مسلمانوں کو اس محرومی کا احساس ہوا تو کچھ حضرات میں فارسی کی طرف پھر سے رجوع کرنے کی خواہش اُبھرنے لگی۔ اس کتاب کی تالیف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ عوام کے دلوں میں فارسی زبان کو ایک نیا مقام حاصل ہو جائے گا۔ فارسی زبان سیکھنے کا سہل طریقہ بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے تاکہ سیکھنے والوں کے لیے کوئی مشکل نہ رہے۔

کسی قوم کی بلندی اس کی سرگزشت سے معلوم کی جاتی ہے۔ جس قوم میں بڑے بڑے مفکر، سائنسدان، فلاسفر اور عالی مرتبہ شعراء گزرے ہوں تو کبھی نہ کبھی اس قوم میں ترقی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اور کچھ دیگر شعراء نے مسلمانوں میں اس زبان کو عروج دینے کی کوشش کی۔ علامہ اقبالؒ نے صحبتِ رفتگان کے عنوان سے مسلمانوں کے ماضی کی عظمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا کلام پیش کیا اور فرمایا ؎

میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ　　　میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

یک زمانہ بارفتگاں صحبت گزیں　　　صنعتِ آزاد مرداں ہم بہ بیں

کچھ عرصہ کے لیے گزرے ہوئے مردوں کی صحبت میں رہو، ایسے آزاد مردوں کے کارناموں کو بھی دیکھو۔

قوم روشن از سوادِ سرگزشت　　　خود شناس آمد ز یادِ سرگزشت

قومیں اپنی گذری ہوئی سرگزشت کی وجہ سے روشن ہیں، ایسے آزاد بندوں کے کارناموں سے خودشناسی ملتی ہے۔

ایں ترا از خویشتن آگاہ کند　　　آشنائے کارِ مرد و راہ کند

یہ تجھے اپنے آپ سے آگاہ کرے گا، یہ تجھے آشنائے کار اور مردِ راہ بنا دے گا۔

شعلۂ افسردہ در سوزش نگر درس در آغوشِ امروزش نگر
ان کی جلن میں بجھے ہوئے شعلوں کو دیکھو، گزری ہوئی رات کو آج کے پہلو میں دیکھو۔

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی بیداری کا بیڑا اٹھایا اور اپنے اسلاف کے کردار اور نوادرات کی طرف درج ذیل اشعار میں توجہ دلائی ؎

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

مسلمانوں کی مفلسی اور ناداری کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ ایک طویل داستان ہو جائے گی۔ اس حقیقت کو راقم الحروف نے اپنی ایک عنقریب شائع ہونے ولی کتاب ''سرمایۂ ملت'' میں واضح کیا ہے اور اُمتِ مسلمہ کے عروج اور زوال کے اسباب کا جائزہ لیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عناصر جو مسلمانوں کے زوال کے اسباب بنے ہیں ان کا تعلق مسلمانوں کی دینِ اسلام سے دوری، سرمایہ داری کی جستجو، عیش و عشرت کے اسباب کی تمنا اور موت کا خوف سمائے رہنا ہے۔ مسلمانوں کے اس مرض کا علاج صرف یہ ہے کہ وہ ذخائرِ علم کی طرف رجوع کریں، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی اور جس کے سبب نیابتِ الٰہیہ کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ اس حقیقت پر قرآن کریم کی آیت یوں گواہی دیتی ہے کہ ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا'' یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو عِلْمُ الْاَسْمَاء عطا فرمایا۔ (البقرۃ : ۳۱) مسلمانوں کے اس مرض کا علاج یہ ہے کہ علمائے کرام بجائے مشکل کتب تصنیف کرنے کے، آسان الفاظ میں عوام کے لیے ایسی عبارتیں پیش کریں جو ان کے دلوں میں دین سے لگاؤ اور دلچسپی پیدا کریں۔ ایسی کتب کا تصنیف کرنا جن کو صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۹۹ فیصد عام فہم رکھنے والے مسلمان اس سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ علم کے فائدہ مند نہ ہونے کی یہی صورت ہے اگر علماء میں خلوص اور جذبۂ ایمان کی دولت ہو تو یہ کام مشکل نہیں۔ اس میں حکومت اور مقتدر حضرات کا تعاون بھی ضروری ہے۔ مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کا کلام تو مُردہ دلوں میں بھی رُوح پھونک دیتا ہے۔

حالات کا تقاضا دیکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مولانا جلال الدین رومیؒ کے کلام کو عام لوگوں میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا رومیؒ کا کلام تمام مطلوبہ علوم پر وافر معلومات پیش کرتا ہے کیونکہ آپ نے اسے نہایت دلچسپ اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے، جو عام مسلمانوں کے دلوں کو آسانی سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ان کا کلام فہم اسلام، جذبۂ عمل اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کے لیے بہت کافی سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں والہانہ عشق، جذبۂ شوق کو اُبھارنے، مشائخ سے رہنمائی حاصل کرنے کے طریقے اور متفرقاتِ اسلام پر آگہی نصیب

کرتا ہے جو دیگر علوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟

مولانا رومؒ کے اکثر رموز و اِسرار کو علامہ نے کھول کر اپنے کلام میں بھی بیان کیا ہے۔ مولانا رومیؒ کے کلام کی گہرائی مبنی برحقیقت ہونے کے باعث علامہ نے مولانائے رومؒ کو اپنا مرشد تسلیم کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کو اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ ''علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا'' کبھی علامہ اقبالؒ یہاں تک فرماتے ہیں ''ہرکجا رومیؒ برد آنجا برو'' یعنی رومیؒ تمہیں جدھر بھی لے جائے، ادھر ہی جاؤ اور ایک لمحہ بھر اس کی صحبتِ معنوی کے بغیر نہ گزارو۔ آپ نے فرمایا کہ پیام رومیؒ حیات افروز ہے اور آپ کا فیض سربستہ رازوں کو کھولتا ہے۔ علامہ اقبالؒ خود کو رومیؒ کے شعلوں کی ایک چنگاری تصور کرتے ہیں۔ مرشدِ رومیؒ کاروانِ عشق و مستی کے امیر ہیں، ان کا سینہ نورِ قرآن سے روشن ہے۔ آپ کے اندر خاک کو اکسیر کرنے کی طاقت ہے، آپ کی جلائی ہوئی شمع نے مجھ پروانے پر حملہ کیا۔ ان کی بانسری نے میرے بدن میں ایک شور پیدا کر دیا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ خلیل اللہ کی طرح خدا مست رہو اور ہر پرانے بت خانے کو توڑ دو۔ بڑی قوموں کے افراد نے جنونِ عشق سے کام لیا ہے جس کے باعث وہ دنیا بھر میں چمکی ہیں۔ میں نے مولانائے روم کے نکات کو سمجھا اور خود کو ان کے حروف میں جلایا۔ مولانا رومیؒ کا قول ہے کہ صلاح الدین ایوبی کی تلوار (یعنی کوشش پیہم) اور حضرت بایزید بسطامیؒ جیسی نگاہ ہو تو دونوں جہانوں کی کلید ہاتھ آتی ہے۔ آپ کی مراد ہے کہ ذکر و فکر کا اختلاط (یعنی ایک ہاتھ میں دنیا کے کام پر جدوجہد اور دوسرے ہاتھ میں افکارِ دین کی کنجی ہو تو کامیابی قدم چومتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ مولانا رومیؒ نے مجھ پر معنوی اسرار کھولے ہیں اس لیے میں ان کے آستانے پر سجدہ ریز ہوا ہوں۔ آپ کی پاکبازی میری زندگی پر اثرانداز ہوئی، مجھ پر معرفت کے اسرار کھولے اور مجھ ناکارہ کی مشکلوں کی گرہ انہوں نے ہی کھولی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری خودی دنیا سے بے پرواہ ہو جائے تو مولانا کے فقر سے آدابِ خدائی سیکھو۔ میں نے رومیؒ کی مست آنکھوں سے وہ قرض لیا ہے جس کا مقام کبریائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں پیر رومیؒ کے مٹکے سے تازہ شراب لایا ہوں جس سے گوہرِ تابدار حاصل ہوتا ہے۔ میری مستی ان کی شراب سے ہے اور میری زندگی ان کے دَم سے وابستہ ہے۔ رومیؒ کی طرح میں نے حرم میں اذان دی اور ان سے رُوحانی اسرار سیکھے۔

علامہ اقبالؒ کا ایک خاص مضمون ''اسرار و رموزِ خودی'' ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی قوم کی بے بسی پر رو رہا تھا کہ مولانائے رومؒ کی رُوح حاضر ہوئی اور اس قوم کو موجودہ مصائب سے نکالنے کے لیے خودی کا فلسفہ بیان کیا، جس کو علاّمہ نے اپنے مخصوص انداز میں فلسفۂ خودی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ آپ کا یہ مضمون کافی طویل اور وقت طلب ہے۔ اس کا مختصر ذکر ہماری تصانیف ''عقل و عشق اور فلسفۂ خودی'' اور ''رابطۂ شیخ'' میں بیان کیا گیا ہے (اول الذکر کتاب ان شاء اللہ جلد ہی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو جائے گی)۔ فلسفۂ خودی میں علامہ اقبالؒ نے مولانا رومیؒ کے ارشادات کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کی تعمیرِنو کا حل یوں پیش کیا ہے کہ جس طرح کوئی بوسیدہ

اور پرانی عمارت کارآمد نہیں رہتی تو اس کا علاج یہ کیا جاتا ہے کہ اس عمارت کو گرا کر اسے از سرِ نو تعمیر کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان قوم کا علاج اس کی تعمیرِ نو میں ہی مضمر ہے۔ فلسفۂ خودی میں سبق دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں لاتعداد خوبیوں کو مضمر کیا ہے اور جب انسان اپنی خودی کے جواہرات کو دریافت کرے تو پھر ان کو عمل میں لائے۔ عرفانِ خودی سے مراد اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اندازہ لگانا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو گویا اس نے خدا کو بھی پہچان لیا اور جو خدا کو (اور خود اپنے آپ کو) پہچان لے تو اس کے لیے کوئی مشکل باقی نہیں رہ جاتی۔ یہی بات ایک حدیث شریف میں بھی بیان کی گئی ہے، جس کی طرف مولانا رومیؒ نے علامہ اقبالؒ کی توجہ کا دھارا موڑ دیا ہے۔

علامہ اقبالؒ مولانا کے کلام سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ مولانا رومیؒ کو اپنا مرشد خیال کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رومیؒ کے قدم اپنے محبوب (یعنی اللہ تعالیٰ) کے کوچے میں محکم ہیں اور جدھر بھی رومیؒ لے جائے تم اسی سمت چلے جاؤ۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ان کی روح کو مولانا کے کلام سے فائدہ پہنچا ہے کیونکہ علم و حکمت اس وقت ہاتھ آتے ہیں جب انسان کی روح میں وجد پیدا ہو جائے۔ مولانا رومیؒ نے مثنوی میں ایک ایسے راز کی بات لکھ دی ہے کہ جس کو علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے کلام میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان کی روح متاثر نہ ہو جائے اور اس کے جسم میں رقص و سرور کی مستی پیدا نہ کر دے تو اس وقت تک وہ ترقی کی جانب رواں دواں نہیں ہو سکتا اور جب یہ بات پیدا ہو جائے تو وہ خدا کے سوا ہر چیز کو جلا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر حرص و غم کی آگ سے جگر سوزی ہو رہی ہو تو اس وقت تک روح کا وجد میں آنا ممکن نہیں اور علم و حکمت بھی روح کے وجد سے ہاتھ لگتے ہیں۔ ایسے عاشق جب اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو جلا دینے کے قابل ہوں تو پھر دنیا کی رکاوٹیں اور مشکلات ان کی راہ میں کس طرح حائل ہو سکتی ہیں۔ دل کو سکون اس وقت ملتا ہے جب روحانی وجد سے حصہ مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ صوفیوں کی بے روح زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ؎

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی — فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز — کتابِ صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی
خراب کو شکِ سلطان و خانقاہِ فقیر — فغاں! کہ تخت و مصلیٰ کمالِ زرّاقی

چمن میں تلخ نوائی مری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

علامہ اقبالؒ نے رومیؒ کے جذباتِ عشق کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ آپ کے کلام عشق کا ایک اچھا خاصہ حصہ اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عشق ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے دل توانا اور خاکی ذرّات ہمدوشِ ثریا بن جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رومیؒ کے لیے عشق ایک کامل دلیل ہے اور پیاسوں کے لیے ان

کا کلام سلسبیل ہے۔ ان کی نوا آسمانوں کو برہم کر دیتی ہے اور ان کے کلام سے انسان کا دل جبریل علیہ السلام سے بھی زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ رومیؒ نے اپنے آپ کو کن مجاہدات میں ڈھالا ہے، یہ بات ان کی مثنوی سے واضح ہوجاتی ہے۔ اس مردِ حق کا نغمہ خدا کا رنگ رکھتا ہے اور انسان کو بارگاہِ کبریا میں لے جاتا ہے۔ مولانا رومیؒ ان لوگوں کے ساتھ زندگی گذارنے کا سبق دیتے ہیں جن کی نواء شعلہ بار ہو۔ فرماتے ہیں کہ عشق تو زندگی میں شرع اور آئین کا مقام رکھتا ہے۔ تہذیب کی اصل دین ہے اور دین سراسر عشق ہے۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ دل کا بیدار ہونا بہتر ہے اور یہ اس وقت ہی ممکن ہے کہ جب انسان افکار کی دنیا سے باہر نکل جائے۔

مولانا رومیؒ کی تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مولانا رومیؒ کو رفیق راہ بناؤ اور وہ جدھر تمہیں لے جائیں ادھر ہی جاؤ۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے آتشِ رومیؒ کے کلام سے کافی حصہ پایا ہے اور جو مولانائے رومؒ کے فیض سے رسائی حاصل کرنا چاہے تو وہ میرے اندر سے نکلی ہوئی عشق کی ایک چنگاری لے لے کیونکہ رومیؒ کی طرح میرا خون بھی عشق کی آگ سے گرم ہے۔ رومیؒ سے فقیری کے اسرار حاصل کرو کیونکہ ان کے فقر پر امارت بھی رشک کرتی ہے۔ رومیؒ کی روح نے بہت سے پردوں کو چاک کیا ہے۔

مولانا رومیؒ اپنے کلام میں بہت سے سوالوں کے جوابات بھی دیتے ہیں۔ انہوں نے روح وتن، جذب، شعور، انقلابِ جذبہ وشوق وغیرہ کے اسرار کھولے۔ فرمایا کہ آدمی ایک تلوار ہے، جس کو اللہ کے ہاتھوں سے چلایا جاتا ہے اور یہ دنیا اس تلوار کو تیز کرنے کے لیے سان ہے۔ اپنی زندگی کو خدا کے لیے کھولنا بندگی ہے۔ اپنے آپ کو بے پردہ دیکھنا عرفان ہے۔ بندہ جب زندگی کی لالچ کو دل سے نکال دیتا ہے تو خدا ایسے بندے پر رحمت بھیجتا ہے۔ رومیؒ کے کاموں میں پختگی ہے اور خامیوں سے پاک ہے اور میں ان کی نہ ختم ہونے والی جستجو کا عاشق ہوں۔ وہ بانسری کی طرح ہر دم نغمہ سرا ہے۔ اُن کو وصال اور فراق دونوں مار دیتے ہیں ؎

جلوۂ خال خال نے مارا — مجھ کو ان کے جمال نے مارا
لوگ مرتے ہیں ہجر کے مارے — مجھ کو ان کے وصال نے مارا

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مولانا ایک مرشدِ روشن ضمیر ہیں اور کاروانِ عشق ومستی کے امیر ہیں۔ ان کی منزل چاند اور سورج سے بھی بلند تر ہے، جس کی طنابیں کہکشاں سے بندھی ہوئی ہیں۔ مولانا رومیؒ کے افکار سے پورا عالم روشن ہے۔ انہوں نے پورے جہان کو تاریکیوں سے نکالنے اور شریعتِ محمدیؐ کے چراغوں سے بیابانوں اور آستانوں کو روشن کرنے کی راہ بیان کی۔ انہوں نے شریعت، طریقت اور حقیقت کی نہایت خوب صورت الفاظ میں تشریح کی ہے اور مثالوں سے ان تینوں کے مقامات کو واضح کیا ہے۔ آپ نے فلسفے کی خامیوں کے متعلق فرمایا کہ مجھے اس منطقی نظریات میں خامی کی بو آتی ہے اور علامہ اقبالؒ نے بھی ایسا ہی فرمایا اور اس کی ہر دلیل کو دلیلِ ناتمامی کہہ کر

پکارا ہے۔ آپ نے سائنس کے اصولوں کو سینکڑوں سال پہلے بیان کر دیا تھا، جس کو سائنسدانوں نے آج کے زمانے میں اپنی تحقیقات میں ظاہر کیا ہے۔

مولانا رومؒ کے افکار کو چند الفاظ میں واضح کر دینا ایک ناممکن بات ہے۔ اس کے لیے ہزاروں صفحات بھی لکھ دیئے جائیں تو بھی کفایت نہ کر سکیں گے۔ آپ کی مثنوی کے پہلے شعر ''بشنواز نے'' پر ایک ہزار صفحات کی کتاب لکھی جا چکی ہے۔ مثنوی کی وسعتِ معنی کا اندازہ ہونا بعید از قیاس ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا فہم نصیب فرمائے۔ آمین۔

لاہور — خاکِ پائے اولیاء

یکم نومبر ۲۰۰۷ء — **پیر عبد اللطیف خان نقشبندی**

ڈائریکٹر (ر) محکمہ موسمیات، لاہور

تبصرہ

سوز و سازِ رومیؒ جسے پیر عبداللطیف خان نقشبندی نے تالیف کیا ہے، وہ ان نکات کا خلاصہ ہے کہ جس پر علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی کی راتوں میں تفکّر اور سوچ و بچار کیا ہے اور مثنوی کی خوبیوں کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ مؤلف نے اس کتاب میں کئی سالوں کی عرق ریزی کے بعد ایسے منتخب اشعار کی تشریح کی ہے جو مثنوی کے بہت مشہور اور معروف اشعار میں شمار ہوتے ہیں۔ مثنوی میں مولانا رومیؒ نے قرآن کی آیات اور احادیث کا ذکر بھی کیا ہے، جن کی عام مسلمانوں کو روزمرہ کی زندگی میں ضرورت پیش آتی ہے۔

مثنوی کے مخصوص پہلو جن کو مولانا نے بہت اہمیت دی ہے وہ انسانی زندگی میں کام آنے والی عشق کی کارفرمائیاں اور اس کے وہ خوبصورت پہلو جس سے انسان اپنی زندگی میں گوناں گوں کامیابیاں حاصل کرتا ہے، شامل ہیں۔ ایک کامیاب اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے انسان کو کسی راہبرِ راہِ شریعت کی ضرورت رہتی ہے، لہٰذا اس مضمون کو بھی مولاناؒ نے بہت عمیق نکات میں بیان کیا ہے۔ اسلام کے دیگر متفرقات جو قرآن اور حدیث کا ماحصل ہیں، کو بھی مولاناؒ نے کھول کھول کر بیان فرمایا ہے اور سب سے بڑی بات جو آپ کے کلام میں نظر آتی ہے وہ فلسفۂ خودی ہے، جس کو مولاناؒ نے علامہ اقبالؒ کو روحانی ملاقات میں تجویز فرمایا ہے اور علامہ نے اس پر ایک مکمل کتاب فلسفۂ خودی کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔

مثنوی میں بیان کردہ قرآنی آیات کی طرف اشارات اور احادیثِ نبویہ ﷺ کی روایات کو بھی مولاناؒ نے کافی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ تمام مضامین زیرِ نظر کتاب میں پیر صاحب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کئے ہیں۔ میری نظر میں یہ کتاب اس موضوع کی منفرد کتاب ہوگی جو اس زمانے کے عُشاق کی تشنگی کو دور کرے گی۔ اللہ تعالیٰ پیر صاحب کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آمین۔

خادم الفقرا

عاصم مجید خان

ایڈیشنل کلکٹر کسٹمز، لاہور

لاہور

یکم نومبر ۲۰۰۶ء

فارسی زبان مشکل نہیں، اس کے سمجھنے کی آسان ترکیب

مسلمانوں کے دورِ اقتدار کے اختتام کے بعد فارسی، عربی اور اُردو زبان کا استعمال بہت کم ہو گیا اور حکومتِ برطانیہ کے دوران مسلمانوں میں ان زبانوں کے فہم کا تقریباً مکمل فقدان پیدا کر دیا گیا۔ غالباً دشمنانِ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے اسلاف کے علوم سے استفادہ نہ کر سکیں کیونکہ جب کسی کو ان زبانوں سے آشنائی نہ رہے گی تو اس زبان کی علمی کتابوں کے مطالعہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان تینوں زبانوں کو اضافی مضمون یا اختیاری مضمون کے طور پر باقی رہنے کی اجازت تو تھی لیکن ان زبانوں کے پڑھنے والوں کے لیے اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہونا مسدود ہو گیا اور اس کے برعکس انگریزی زبان اور دیگر مضامین کو باقاعدہ عروج ملتا رہا۔ ان پابندیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بالخصوص عربی اور فارسی زبان کے فہم سے تقریباً محروم کر دیے گئے اور اب ان کا اپنے مذہب سے اور اسلاف سے کوئی ربط قائم نہیں رہا۔

فارسی زبان میں مثنویٔ مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کی چھپے کتب کے علاوہ دوسرے فارسی شعراء کا کلام بہتات سے ملتا ہے۔ مولانا رومیؒ کی مثنوی تصوف کی سب سے بڑی کتاب تصور کی جاتی ہے اور علامہ اقبالؒ کے کلام میں مسلمانوں کو بیداری اور سراپا عمل ہونے کا سبق ملتا ہے جو مسلمانوں کے عروج کے لیے بہت کافی ہے۔

راقم الحروف نے ازسرِنو کوشش شروع کی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں فارسی اور عربی زبان کا ذوق اور شوق پھر سے پیدا ہو جائے اور وہ اپنے اسلاف کے گراں مایہ علوم کو اپنے دلوں میں محفوظ کر لیں اور اس طرح ان کے کلام سے مکمل استفادہ کر سکیں۔

یہ بات بہت حیرت انگیز ہے کہ عربی اور فارسی زبان کو سیکھنا اس قدر مشکل نہیں جس قدر دوسرے ماڈرن علوم کا سمجھنا مشکل ہے اور افسوس ہے کہ مسلمان ان زبانوں کو سیکھنے کی اپنے دلوں میں خواہش بھی نہیں رکھتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو فارسی زبان سیکھنا بہت آسان ہے کیونکہ یہ اردو زبان سے کافی ملتی جلتی ہے اور اگر کوئی فارسی زبان کو پڑھنے کا عزم کرے تو یہ منزل اس قدر مشکل نہیں (جتنی لاعلمی کی وجہ سے مشکل سمجھی جا رہی ہے)۔ ابتدائی مراحل میں مثنوی مولانا رومؒ اور دیگر فارسی شعراء کی کتب کے تراجم جو بازاروں میں عام مل جاتے ہیں ان کے پڑھ لینے سے ہی انسان فارسی زبان سے مانوس ہو جاتا ہے، اگر ضرورت ہو تو فارسی کی ڈکشنری سے بھی مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔

الفاظ پر غور کرنے سے یا مصدر نامہ سے رجوع کرنے کے بعد ہر لفظ کا مادہ اور ماخذ خود بخود سمجھ میں آنے لگتا ہے۔
راقم الحروف اپنے ابتدائی ایام میں باقی لوگوں کی طرح ان علوم سے بے بہرہ تھا اور چونکہ اپنی تمام عمر جدید سائنسی تعلیمات کے حصول میں صَرف کرتا رہا لیکن (تقریباً ۴۰ سال کی عمر میں) جب دل میں اولیائے کرام علیہم الرحمۃ کی محبت جو پہلے سے ہی بیدار ہو چکی تھی کے سبب فارسی زبان سیکھنے کا شوق ہوا تو بحمدہٗ تعالیٰ اپنی زندگی کو اسلامی معیار میں ڈھالنے کی سعی کو تقریباً تکمیل تک پہنچا دیا۔ اسی شوق اور لگن کی بناء پر نہایت عرق ریزی سے عربی اور فارسی زبان پر خاصہ عبور حاصل کر لیا، یہاں تک کہ اب راقم الحروف کو عربی زبان میں تقریر کرنا چنداں مشکل محسوس نہیں ہوتا اور بحمداللہ عربی اور فارسی کے اچھے خاصے پڑھے لکھے حضرات کی بخوبی رہنمائی کر سکتا ہے۔ ان زبانوں پر خاصی دسترس حاصل کرنے کے بعد اب راقم الحروف نے مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ کے اشعار کی وضاحت اس قدر دل کش انداز میں کی ہے کہ میری کتابوں کو پڑھ کر اکثر و بیشتر قارئین کے دل میں اس فقیر سے ملاقات کا شوق بیدار ہو جاتا ہے۔ اگر اس فقیر کو یہ سعادت حاصل ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قارئین میں سے جو حضرات اس زبان کی طرف رجوع فرمائیں تو وہ بھی اس زبان پر خاطر خواہ دسترس حاصل نہ کر سکیں۔ چنانچہ عوام کے دلوں میں اس زبان کے شوق کو بیدار کرنے کے لیے فارسی زبان سیکھنے کے چند رہنما اصول نیچے بیان کیے جا رہے ہیں۔

اردو زبان چونکہ بہت ساری زبانوں کا مجموعہ ہے اس لیے اس کے بہت سے حروف فارسی زبان میں مل جاتے ہیں اور فارسی زبان کو سمجھنے میں چنداں دِقّت محسوس نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ''زبورِ عجم'' سے لیے گئے علامہ اقبالؒ کے ایک شعر کا معائنہ کیجیے ۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ از فرِّ فریدوں بہ

عام آدمی اگر اس شعر کو دیکھے تو اسے یہ شعر بہت مشکل معلوم ہو گا اور وہ شاید اس شعر کے الفاظ کی بھی ادائیگی کرنے میں نہایت دقت محسوس کرے گا، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس شعر میں استعمال کئے گئے تمام الفاظ روزمرّہ کی اردو بول چال میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اب ہم ان الفاظ کے معانی پر غور کرتے ہیں۔

مصرعہ اوّل:

''آں'' کے معنی وہ ہیں۔ ''فقر'' کے معنی تو سب ہی جانتے ہیں۔ ''بے تیغ'' کا مطلب ہے، بغیر تلوار کے۔ ''صد کشورِ دل'' کے معانی دل کی سینکڑوں مملکتیں ہیں۔ (کشور کے معنی ولایت یا مملکت کے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کشورِ ہند یعنی ہند کی مملکت) ''دل گیرد'' کے معنی دل پکڑنے والے کے ہیں یعنی دل کو مسخر کرنے والا۔ چنانچہ پہلے مصرعہ کا مطلب یہ ہوا۔ ''وہ فقر جو بغیر تلوار کے دل کی سینکڑوں مملکتیں مسخر یا فتح کر لیتا ہے۔'' اب اس مصرعے کے

معانی کو دوبارہ دیکھیں تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد

وہ فقر جو بغیر تلوار کے دل کی سینکڑوں مملکتیں حاصل یا مسخر کر لیتا ہے۔

مصرعہ دوم:

دوسرے مصرعہ میں ''از شوکت دارا بہ'' کا مطلب ہے کہ یہ فقر ایران کے بادشاہ دارا کی شان وشوکت سے بہتر ہے (یہاں ایران کے حکمران شہنشاہ دارا کی شان سے بہتر ہونا مراد ہے) اور ''از فرِ فریدوں بہ'' میں ''فرّ'' کا مطلب شان وشوکت ہے، جیسے اردو میں کہا جاتا ہے (کرّ وفرّ) یعنی شان وشوکت والا)۔ ''فریدوں'' سے مراد فارس کا ایک بہت ہی جاہ وجلال والا بادشاہ ہے جس نے ضحاک کو قتل کر کے فارس میں حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً ۵۳۰ برس قبل اپنی حکومت قائم کی تھی۔ ''بہ'' کا مطلب بہتر ہے۔ چنانچہ دوسرے مصرعے کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا فقر تو ''ایران کے بادشاہ دارا'' کی شان وشوکت اور ''فریدوں کی سی شان'' سے بھی بہتر ہے۔ اب اس مصرعہ کے معانی کو دوبارہ دیکھیں۔

از شوکتِ دارا بہ از فرِّ فریدوں بہ

(ایسا فقر تو) ایران کے بادشاہ دارا کی شان وشوکت سے اور فریدوں کی بھی شان سے بہتر ہے۔

اس شعر کی مذکورہ بالا تشریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ فارسی زبان کا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔ خواہش مند اور اہلِ ہمت لوگوں کو فارسی زبان بآسانی سکھانے کی غرض سے اس تحریر کے ساتھ فارسی کے چند راہ نُما اصول اور کلیے شامل کیے جا رہے ہیں، جن کے مطالعہ سے اس زبان کا فہم اور بھی آسان ہو جائے گا۔ فارسی زبان کو سیکھنے سے قارئین فارسی کے تمام بلند پایہ کلام کو سمجھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور انہیں اسلامی، روحانی اور وجدانی معاملات کا فہم حاصل ہو سکے گا۔ فارسی زبان میں ایسے روحانی مضامین بھی موجود ہیں جو پڑھنے والوں کی زندگیوں کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

فارسی سمجھنے کے آسان طریقوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے صیغے معلوم کر لیے جائیں

فارسی زبان کی تفہیم کے لیے اگر درج ذیل صیغوں کا علم حاصل کر لیا جائے تو انسان فارسی میں ماہر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے صرف ذخیرہ الفاظ معلوم ہونے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ تمام اسم اور فعل مصدر سے نکلتے ہیں، چنانچہ مصدر کے لفظی معنی جائے صدور (نکلنے کی جگہ) ہے اور اس سے مختلف قسم کے اسم و فعل نکلتے ہیں۔ اس

لئے اس کو مصدر کہتے ہیں۔ فارسی میں مصدر کے آخر پر ''دَنْ'' یا ''تَنْ'' آتا ہے۔

فعل مضارع

وہ فعل ہے جس میں حال اور مستقبل کے دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔

کلیہ نمبر۱:۔ فارسی زبان میں مصدر کے آخر میں ''ن'' آتا ہے۔ مصدر سے مضارع کا کوئی قاعدہ نہیں ہے مگر یہ ماضی سے بنتا ہے۔ ہاں ایک بات بطور قاعدہ کلیہ کے ہے کہ مضارع کے آخر میں ''د'' ہوتا ہے اور ''د'' سے پہلے حرف پر زبر دی جاتی ہے، مثلاً:

کردن (کرنا) سے کند (کرے)
رفتن (جانا) سے رود (جائے)
خوردن (کھانا) سے خورد (کھائے)

فعل حال

کلیہ نمبر۲:۔ وہ فعل ہے جس میں موجودہ زمانہ پایا جائے، مضارع سے پہلے ''می'' لگانے سے فعل حال بن جاتا ہے، جیسے:

کند (کرے) سے می کند (وہ کرتا ہے)
رود (جائے) سے می رود (وہ جاتا ہے)
خورد (کھائے) سے می خورد (وہ کھاتا ہے)

فعل مستقبل

کلیہ نمبر۳:۔ وہ فعل ہے جس میں آئندہ زمانہ پایا جائے۔ مصدر کے آخر سے ''ن'' اڑا کر اس سے پہلے ''خواہد'' لگا دیں، جیسے:

کردن (کرنا) سے خواہد کرد (وہ کرے گا)
رفتن (جانا) سے خواہد رفت (وہ جائے گا)
خوردن (کھانا) سے خواہد خورد (وہ کھائے گا)

ماضی مطلق

کلیہ نمبر۴:۔ وہ ماضی ہے جس میں مطلق گزرا ہوا زمانہ پایا جائے یعنی زمانہ کے قریب یا بعید ہونے کا لحاظ نہ ہو۔ مصدر کے آخر سے ''ن'' حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے:

کردن (کرنا) سے کرد (کیا)
رفتن (جانا) سے رفت (گیا)
خوردن (کھانا) سے خورد (کھایا)

ماضی قریب

کلیہ نمبر۵:۔ وہ ماضی ہے جس میں قریب کا گزرا ہوا زمانہ پایا جائے۔ ماضی مطلق کے آخری صیغہ واحد غائب میں ''ہ است'' لگاتے ہیں۔ مثلاً مصدر کا ''ن'' اڑا کر بعد میں ''ہ'' اور ''است'' لگائیں، جیسے :

کردن سے کرد (کیا) اور اس سے کردہ است (کیا ہے)

رفتن سے رفت (گیا) اور اس سے رفتہ است (گیا ہے)

خوردن سے خورد (کھایا) اور اس سے خوردہ است (کھایا ہے)

ماضی بعید

کلیہ نمبر۶:۔ وہ ماضی ہے جس میں بعید کا گذرا ہوا زمانہ پایا جائے۔ پچھلے کلیہ میں ''است'' کی بجائے ''بود'' لگا دیں، مثلاً:

کردن (کرنا) سے کردہ بود (کیا تھا)

رفتن (جانا) سے رفتہ بود (گیا تھا)

خوردن (کھایا) سے خوردہ بود (کھایا تھا)

ماضی استمراری

کلیہ نمبر۷:۔ یہ وہ ماضی ہے جس میں کام کا جاری رہنا پایا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ماضی مطلق سے پہلے ''می'' یا ''ہمی'' لگا دو، مثلاً :

کرد (کیا) سے می کرد یا ہمی کرد (کر رہا تھا)

رفت (گیا) سے می رفت یا ہمی رفت (جا رہا تھا)

خورد (کھایا) سے می خورد یا ہمی خورد (کھا رہا تھا)

ماضی شکیہ

کلیہ نمبر۸:۔ یہ وہ ماضی ہے جس میں شک پایا جائے۔ اس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ مصدر کا ''ن'' اڑانے کے بعد ''ہ'' لگا دیں اور ''باشد'' یا ''می باشد'' لگایا جائے، مثلاً :

کردن (کرنا) سے کردہ باشد یا کردہ می باشد (کیا جا رہا ہوگا یا کیا ہوگا)

رفتن (جانا) سے رفتہ باشد یا رفتہ می باشد (جا رہا ہوگا یا گیا ہوگا)

خوردن (کھانا) سے خوردہ باشد یا خوردہ می باشد (کھایا جا رہا ہوگا یا کھایا ہوگا)

فعل امر

کلیہ نمبر ۹:۔ وہ فعل ہے جس میں کسی کام کے کرنے کا حکم یا درخواست کی جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مضارع کے آخر میں ہمیشہ ''د'' ہوتی ہے اس ''د'' کے اڑانے سے فعل امر بن جاتا ہے، مثلاً :

کند (کرے) سے کن (کر)

رود (جائے) سے رو (جاؤ)

خورد (کھائے) سے خور (کھاؤ)

فعل نہی

کلیہ نمبر ۱۰:۔ یہ وہ فعل ہے جس میں کسی کام کے کرنے سے روکا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ فعل امر سے پہلے ''م'' لگا دو تو فعل نہی بن جائے گا، مثلاً :

کن (کر) سے مکن (مت کر)

رو (جاؤ) سے مرو (مت جاؤ)

خور (کھاؤ) سے مخور (مت کھاؤ)

فارسی زبان کی چند گردانیں

۱۔ ماضی مطلق

غائب		حاضر		متکلم	
واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
کرد	کردند	کردی	کردید	کردم	کردیم
(اس نے کیا)	(انہوں نے کیا)	(تو نے کیا)	(تم سب نے کیا)	(میں نے کیا)	(ہم سب نے کیا)

۲۔ ماضی قریب

کردہ است	کردہ اند	کردہ ای	کردہ اید	کردہ ام	کردہ ایم
(اس نے کیا ہے)	(ان سب نے کیا ہے)	(تو نے کیا ہے)	(تم سب نے کیا ہے)	(میں نے کیا ہے)	(ہم سب نے کیا ہے)

۳۔ ماضی بعید

کردہ بود	کردہ بودند	کردہ بودی	کردہ بودید	کردہ بودم	کردہ بودیم
(اس نے کیا تھا)	(انہوں نے کیا تھا)	(تو نے کیا تھا)	(تم سب نے کیا تھا)	(میں نے کیا تھا)	(ہم سب نے کیا تھا)

۴۔ ماضی استمراری

می کرد	می کردند	مے کردی	می کردید	می کردم	می کردیم
(وہ کر رہا تھا)	(وہ سب کر رہے تھے)	(تو کر رہا تھا)	(تم کر رہے تھے)	(میں کر رہا تھا)	(ہم کر رہے تھے)

۵۔ ماضی شکیہ

کردہ باشد	کردہ باشند	کردہ باشی	کردہ باشید	کردہ باشم	کردہ باشیم
(اس نے کیا ہوگا)	(انہوں نے کیا ہوگا)	(تو نے کیا ہوگا)	(تم نے کیا ہوگا)	(میں نے کیا ہوگا)	(ہم نے کیا ہوگا)

۶۔ فعل حال

می کند	می کنند	می کنی	می کنید	می کنم	می کنیم
(وہ کرتا ہے)	(وہ کرتے ہیں)	(تو کرتا ہے)	(تم کرتے ہو)	(میں کرتا ہوں)	(ہم کرتے ہیں)

۷۔ فعل مستقبل

خواہد کرد	خواہند کرد	خواہی کرد	خواہید کرد	خواہم کرد	خواہیم کرد
(وہ کرے گا)	(وہ سب کریں گے)	(تو کرے گا)	(تم سب کرو گے)	(میں کروں گا)	(ہم سب کریں گے)

فارسی زبان میں الفاظ کا ذخیرہ

جب کوئی زبان استعمال کی جاتی ہے تو اس کا ذخیرہ معلوم ہونا بہت ضروری ہوتا ہے، فارسی الفاظ کا ذخیرہ اس کے مصادر ہیں اور بازار میں بہت سے ''مصدر نامے'' دستیاب ہیں۔ ایسے مصدر ناموں سے الفاظ کا ذخیرہ حاصل کیا

جا سکتا ہے۔ چند مصادر بطور نمونہ نیچے دیے جا رہے ہیں :

مصدر	معنی	مضارع	معنی	حاصل مصدر
آمدن	آنا	آید	آئے	آمد
رفتن	جانا	رَوَد	جائے	روش۔ رفتار
خوردن	کھانا	خورَد	کھائے	خورش
نوشیدن	پینا	نوشد	پئے	نوش
نوشتن	لکھنا	نویسَد	لکھے	نوشت
خواندن	پڑھنا	خواند	پڑھے	خواندگی
دادن	دینا	دہد	دیئے	دادودہش
گرفتن	لینا۔ پکڑنا	گیرد	پکڑے	گرفت
نشستن	بیٹھنا	نِشیند	بیٹھے	نشست
برخاستن	اٹھنا	برخیزد	اٹھے	برخاست
داشتن	رکھنا	دارد	رکھے	۔
شدن	ہونا	شود	ہوئے	شد
خفتن	سونا	خسپَد	سوئے	خسپد
بیدار شدن	جاگنا	بیدار شود	جاگے	۔
دیدن	دیکھنا	بیند	دیکھے	بینائی۔ بینش
خندیدن	ہنسنا	خندد	ہنسے	خنده
گریستن	رونا	گرید	روئے	گریہ
آوردن	لانا	آورد	لائے	آورد
بردن	لے جانا	برد	لے جائے	۔
کردن	کرنا	کند	کرے	کار
زدن	مارنا	زند	مارے	زَد
گریختن	بھاگنا	گریزد	بھاگے	گریز
گفتن	کہنا۔ بولنا	گوید	کہے۔ بولے	گفتار۔ گویائی

رسیدن	پہنچنا	رسد	پہنچے	رسائی
آموختن	سیکھنا	آموزد	سیکھے	آموزگاری
آموختن	سکھانا	آموزد	سکھائے	آموزگار
پختن	پکنا	پزد	پکے	پزش، پخت و پز
دوختن	سینا	دوزد	سیئے	دوخت، دوزندگی
خریدن	خریدنا	خرد	خریدے	خرید
فروختن	بیچنا	فروشد	بیچے	فروخت
مردن	مرنا	میرد	مرے	-
دویدن	دوڑنا	دوَد	دوڑے	دو
پُرسیدن	پوچھنا	پرسد	پوچھے	پرسش
کشادن	کھولنا	کشاید	کھولے	کشائش
بخشیدن	بخشنا	بخشد	بخشے	بخشش
کوشیدن	کوشش کرنا	کوشد	کوشش کرے	کوشش
پَروَردن	پالنا	پرورد	پالے	پرورش
ایستادن	کھڑے ہونا	ایستَد	کھڑا ہوئے	ایستادگی
پوشیدن	پہننا	پوشد	پہنے	پوشش
جستن	ڈھونڈنا	جوید	ڈھونڈے	جستجو
دانستن	جاننا	داند	جانے	دانش۔ دانائی
ساختن	بنانا	سازد	بنائے	ساخت
سوختن	جلنا، جلانا	سوزد	جلے	سوز
کاشتن	بونا	کارد	بوئے	کاشت
کشیدن	کھینچنا	کشد	کھینچے	کشش
شناختن	پہچاننا	شناسد	پہچانے	شناسائی
فرستادن	بھیجنا	فرستد	بھیجے	-
یافتن	پانا	یابد	پائے	یافت
شستن	دھونا	شوید	دھوئے	شست شو

دزدیدن	چرانا	دزدد	چرائے	دزدی
خواستن	چاہنا	خواہد	چاہے	خواہش
خرامیدن	ٹہلنا	خرامد	ٹہلے	خرام
کُشتن	مار ڈالنا	کشد	مار ڈالے	کشت
ترسیدن	ڈرنا	ترسد	ڈرے	ترس
کِشتن	بونا	کارد	بوئے	کشت
آزمودن	آزمانا	آزماید	آزمائے	آزمائش
آراستن	سنوارنا	آراید	سنوارے	آرائش
انداختن	ڈالنا، پھینکنا	اندازد	ڈالے	انداز۔ اندازہ
اُفتادن	گر پڑنا	اُفتد	گر پڑے	اُفتادگی۔ اُفتاد
آفریدن	پیدا کرنا	آفریند	پیدا کرے	آفرینش
بوسیدن	چومنا	بوسد	چومے	بوسہ۔ بوس
بوسیدن	بوسیدہ ہونا	بوسد	بوسیدہ ہوئے	بوسیدگی

مصدر نامے سے اور بھی بہت سے مصادر مل سکتے ہیں۔

حصہ اوّل

پہلا باب

مرشدِ رومیؒ پر علامہ اقبالؒ کے تأثرات

یہ حقیقت علامہ اقبالؒ کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں پر آشکار ہے کہ علامہ اقبالؒ نے عارف رومیؒ کو اپنا مرشد تسلیم کیا ہے اور آپ مولانا رومیؒ کے کلام سے اس قدر متاثر تھے کہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ مولانا کی مثنوی نے بہت سے رُوحانی اسرار ان پر کھولے ہیں اور علامہ اقبالؒ ان سے اس قدر مستفیض ہوئے ہیں کہ ان کی فکر مولانا رومیؒ کے آستان پر سجدہ ریز نظر آتی ہے۔ عارف رومیؒ نے انسانوں کی خاک کو اکسیر کر دکھایا ہے اور غبارِ آدم سے بے شمار جلوہ ہائے عرفان و معرفت کو ظاہر کیا ہے۔ مولانا رومیؒ نے مُردہ ضمیر مسلمانوں کو ایک نئی زندگی عطا فرمائی ہے اور انہیں ایک نہایت بلند مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ مولانا رومیؒ کے کلام سے اس طرح مستفیض ہوئے ہیں کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے کلام نے بھی مسلمانوں میں ایسی روح پھونک دی ہے کہ انہیں زمین سے اُٹھا کر فلک بوس بلندیوں پر لے گئے ہیں۔ علامہؒ اپنے الفاظ میں اس حقیقت کی غمازی کرتے ہوئے اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو

لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند (ض۔ک ۴۸۵)

اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے بہت بلیغ اور عریض کلام پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مولانائے رومؒ کے کلام میں کن اسرار و رموز کو جھلکتے ہوئے پایا ہے اور ان کے کلام سے علامہ نے عوام الناس کو کس طرح تفویض کیا۔ مولانا کے ساتھ علامہ اقبالؒ کی بے پناہ عقیدت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ نے ہر

مسلمان کو یہ رائے دی ہے کہ وہ مولانا رومیؒ کو اپنا مرشد تسلیم کریں اور جس طرف انہیں جانے کے لیے حکم دیں اسی راستے کو پختگی سے اختیار کریں۔ فرماتے ہیں کہ رومیؒ کے سوز وساز کی آگ کو اپنے دلوں کی طرف ڈھالنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی لگن اور عملِ پیہم پیدا ہونے کی سعادت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ رومیؒ کو اپنا رفیقِ راہ بناؤ اور فرمایا ؎

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا (ب۔ج ۳۲۰)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مولانا رومیؒ کے ساتھ اکثر اوقات روحانی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ مشکل سوالات میں علامہ کی عقدہ کشائی فرماتے رہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا فلسفۂ خودی مولانا رومیؒ نے ہی ان پر ایک ملاقات میں ظاہر فرمایا اور آپ نے اس موضوع پر اس قدر طویل کلام فرمایا کہ اسے اہلِ یورپ نے بہت پسند کیا۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ اقبالؒ کی اجازت سے فلسفۂ خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کے بارے میں علامہ اقبالؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگرچہ یہ فلسفۂ خودی آپ نے مسلمانوں کی راہ نمائی کے لیے لکھا تھا مگر اس کا صحیح فائدہ یورپین قوموں نے اٹھایا ہے۔

نیچے دی گئی سطور میں علامہ اقبالؒ کے نظریات کا علم ہوتا ہے جس کے ذریعے انہوں نے مولانا رومیؒ کے کلام کو دیکھا، سمجھا اور اس سے قیمتی جواہرات کا خزانہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ مولانا رومیؒ کے متعلق آپ کے یہ تاثرات کوئی معمولی بات نہیں کیونکہ مولانا رومیؒ سے روحانی فیض حاصل کرنے کے بعد انسانوں کی منزلیں یکسر بدلتی ہوئی نظر آتی ہیں اور تھوڑی ہی مدت میں انسان فلک بوس بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خود مسلمانوں کو تاریک راستوں سے نکال کر ان پر عجیب حقیقتوں کو منکشف کیا۔ اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبالؒ کو ایک مردِ درویش کے پیکر میں ڈھالا اور اس میں وہ غیر معمولی خرد و دانش ڈال دی جو کہ خاص الخاص لوگوں کا خاصہ رہی ہے۔ مولانا رومیؒ سے اخذ شدہ فیض کے اثر سے اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبالؒ کو نوازا اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا کلام تمام شاعروں سے کہیں بلند، اعلیٰ اور ارفع ہے۔ علامہ اقبالؒ کے کلام میں مقصدیت ملتی ہے جو بالکل عیاں اور بیاں ہے۔ علامہ میں موجود تمام خوبیاں ان کو مولانائے رومیؒ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ملیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے مولانا رومیؒ کے کلام اور قرآن کریم کی تلاوت اس انداز سے پڑھی، جس طرح کہ کلام کو پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ مثنوی شریف اور قرآن مجید کی اس تلاوت کا ہی یہ اثر تھا کہ آپ پر یورپ کا فلسفہ اثر انداز نہ ہو سکا۔ مولانا رومیؒ کی ذاتِ والا صفات کے متعلق علامہ اقبالؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے اشعار سے نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ ہماری ایک عنقریب شائع ہونے والی کتاب ''سرمایۂ ملت'' میں علامہ اقبالؒ کا عارف رومیؒ کے متعلق لکھے گئے اشعار پر مبنی ایک مقالہ درج کیا گیا ہے جو اس موضوع سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ آئندہ صفحات میں قارئین علامہ اقبالؒ کے ان اشعار سے لطف اندوز ہوں گے، جن کے متعلق اُوپر سرسری ذکر ہوا ہے۔

خدمتِ ملت میں رومیؒ اور اقبالؒ کا حصہ (امتیازات)

یوں تو دنیائے اسلام میں بہت سے نامور شعراء ہو گزرے ہیں لیکن جو مقام مولانائے رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کو حاصل ہوا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ صوفی شعراء اسلام کی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور ہر ایک نے اپنے دَور کے مسلمانوں کو بے دینی کے گڑھے سے نکالنے کی انتھک کوشش کی ہے۔ مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کا شمار ان اسلامی شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور اوقات قوم کی اصلاح کے لئے صرف کیے۔ ان دونوں کے کلام کی خصوصیات لکھنے کے لئے کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مزید لکھی جا رہی ہیں۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان شعراء کا کلام اس قدر واضح ہے کہ ان کے کلام کی وضاحت کرنے کی چنداں حاجت نہیں کیونکہ اگر ان کے کلام کا براہِ راست مطالعہ کیا جائے تو ان کی تحریروں کے مقاصد خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیت یہی ہے کہ جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ معانی اور مطالب کی خود ہی نمائندگی کرتے ہیں، چنانچہ ان دونوں کے کلام کے مطالعہ سے ہی ان کا بہترین تعارف ہو سکتا ہے۔

مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کے کلام کی امتیازی حیثیت کا سبب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں دینِ اسلام کی محبت، اولیائے کرام کا عشق اور قومی اصلاح کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ دینی تعلیم میں مہارت حاصل ہونے کے علاوہ انہوں نے فلسفیانہ انداز سے قومی اصلاح کی راہوں کو واضح کیا۔ ان کے اقوال جو ان کے اشعار میں ملتے ہیں وہ بالکل ایسے درست، فیصلہ کن اور مستند معلوم ہوتے ہیں جس طرح قرآن اور حدیث کے فرامین اپنی وضاحت میں منفرد ہیں۔ مولانا جامیؒ نے تو صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ مولانا رومیؒ کی مثنوی تو فارسی زبان میں قرآن کا ترجمہ ہے (ہست قرآں در زبانِ پہلوی)۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جو اثر اور لطافت موجود ہے وہ کسی کے ہاں نہیں۔ مطالعہ کے بعد ان کے مطالب اور مقاصد میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا بلکہ ان کے اشعار تو بڑی بڑی تقاریر اور مباحثوں میں بطورِ سند پیش کیے جاتے ہیں۔

پیامِ رومیؒ حیات افروز ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کلام نفسانی خواہشات سے پاک ہو تو وہ اپنے اندر الہامی رنگ رکھتا ہے اور زیرِ غور دونوں شعراء کے کلام کو ''کلامِ حق'' یا ''آوازِ دوست'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایسے لوگوں کی زبان میں حق گفتگو کرتا ہے (گفتۂ او گفتۂ اللہ بود) مولانا رومیؒ کو علامہ اقبالؒ نے ان کے کلام میں تعمیری خوبیوں کی بناء پر اپنا مرشد تسلیم کیا ہے اور وہ اپنے کلام میں انہیں مرشد رومیؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ کے متعلق تو اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ وہ عالم بے بدل ہونے کے باوجود عارفِ کامل اور نہایت بلند پایہ صوفی بھی تھے۔ آپ کی مثنوی تصوف کی بہترین اور اعلیٰ ترین کتاب ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو پر قرآن اور حدیث کی

زبان میں گفتگو کی ہے اور خوب صورت انداز سے پیچیدہ مسئلوں کا حل پیش کیا ہے اور اہم معاملات کو عام فہم مثالوں سے سمجھا دیا ہے۔ مولانا نے جب کبھی کوئی مثال دی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمثیل نہیں بلکہ کوئی حقیقی واقعہ ہے اور پھر اس مثال کے بعد کسی نہایت پیچیدہ مسئلے کی آسانی سے وضاحت کر دیتے ہیں، جو قارئین کے ذہن میں پوری طرح اُتر جاتا ہے۔ آپ نے اسی طرح زندگی سے متعلق عام معاملات کا حل پیش کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا رومیؒ کا کلام اس لیے پسند کیا ہے کہ مولانا نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر حیات افروز لائحہ عمل پیش کیا ہے۔

اسرارِ خودی کی تمہید میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

باز برخوانم زفیضِ پیرِ رومؒ   دفترِ سربستہ اسرارِ علوم

پیر رومؒ کے فیض کا قصہ میں پھر سناتا ہوں کہ وہ بہت سے سربستہ رازوں اور اسرار کا دفتر تھے۔

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار   من فروغِ یک نفس مثل شرار

رومیؒ حرارت افروز اشعار سے مالا مال ہیں، میں ان کے درمیان ایسا ہوں جیسے شعلوں میں لمحہ بھر کے لئے ایک چنگاری ہو۔ (ا۔ح۔۸)

شمعِ سوزاں تاخت بر پروانہ ام   بادہ شب خوں ریخت بر پیمانہ ام

ان کی جلائی ہوئی شمع نے مجھ پروانے پر حملہ کیا، ان کی شراب نے میرے پیمانے پر شبخون مارا۔

پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد   از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

پیر رومیؒ نے خاک کو بھی اکسیر کر دیا اور میری خاک سے کئی جلوے تعمیر کیے۔

ذرہ از خاکِ بیاباں رخت بست   تا شعاعِ آفتاب آرد بہ دست

چنانچہ میرے ذرّے نے اس خاکی بیاباں سے سفر کیا اور شعاعِ آفتاب پر ہاتھ ڈال دیا۔

من کہ مستی ہا زصہبایش کنم   زندگانی از نفس ہایش کنم

میں ان کی شراب سے بہت مستیاں حاصل کرتا ہوں، میری زندگی انہی کے دم سے وابستہ ہے۔ (ا۔ح۔۹۔۸)

مرشدِ رومیؒ

علامہ اقبالؒ اور دیگر تمام صوفی شعراء نے مولانا رومیؒ کو مرشدِ رومیؒ کہہ کر پکارا ہے کیونکہ علم و فضل، جذبۂ عشق و محبت اور احیائے اسلام کے لئے آپ کا کلام پوری قوم کے لئے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے کلام کے متعلق کسی تفصیل کا لکھنا طوالت کا سبب ہوگا، چنانچہ طویل بیانات کی بجائے مناسب ہوگا کہ علامہ اقبالؒ کے چند اشعار پیش کر دیئے جائیں، جنہیں پڑھنے کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ مرشدِ رومیؒ کا ہی فیض ہے کہ جس طرح علامہؒ نے مولانا کو مرشد تسلیم کیا، عین اسی طرح آج پاک و ہند اور مصر و ترکی میں بے شمار لوگ موجود

ہیں جو علامہؒ کو اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ اپنے مرشد کی یاد میں ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کی تمہید کا آغاز علامہ اقبالؒ ان اشعار سے کرتے ہیں ؎

پیرِ رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر

مولانا رومیؒ وہ مرشدِ روشن ضمیر ہیں جو کاروانِ عشق اور مستی کے لیے راہبر ہیں۔

منزلش بر تر زماہ و آفتاب خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

ان کی منزل چاند اور سورج سے بھی بلند تر ہے، جن کے خیمے کی طنابیں کہکشاں سے بندھی ہیں۔

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

قرآن کا نور ان کے سینے میں موجود ہے، جامِ جمشید بھی ان کے آئینہ کے سامنے شرمسار ہے۔

از نئے آں نَے نوازِ پاک زاد باز شورے در نہادِ من فتاد

اس پاک باز بانسری سَرا کی بانسری نے میرے بدن میں پھر سے ایک شور برپا کر دیا۔

گفت جانہا محرمِ اسرار شد خاور از خوابِ گراں بیدار شد

رومیؒ نے کہا کہ انسانوں کے ضمیر اسرار کو سمجھتے ہیں اور اہلِ مشرق خوابِ گراں سے اب بیدار ہوئے ہیں۔

جذبہ ہائے تازہ او را دادہ اند بندہائے کہنہ را بکشادہ اند

ان کو تازہ جذبات دیئے گئے ہیں اور پرانی زنجیریں اب ٹوٹ گئی ہیں۔ (پس چہ۔۸۰۳)

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ کس نکو نہ نشست در نار فرنگ

اے فرنگ کے اسرار سمجھنے والے! سوائے تیرے کوئی شخص درست طریقے سے فرنگ کی آگ میں نہیں بیٹھا۔

باش مانندِ خلیل اللہ مست ہر کہن بت خانہ را باید شکست

اے مخاطب! خلیل اللہ کی طرح خدا مست ہو اور ہر پرانے بت خانے کو توڑ دو۔

اُمتاں را زندگی جذبِ دروں کم نظر ایں جذب را گوید جنوں

قوموں کے لئے دل کی کشش (عشق) ہی زندگی ہوتی ہے، کم نظر لوگ اس عشق کو دیوانگی کہتے ہیں۔

ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد بے جنونِ ذو فنوں کارے نہ کرد

کوئی قوم اس نیلے آسمان کے نیچے ایسی نہیں جس نے اہلِ ہنر ہوتے ہوئے بھی بغیر جنون کے کوئی کام کیا نہ ہو۔

مومن از عزم و توکل قاہر است گر نہ دارد ایں دو جوہر کافر است

مومن عزم اور توکل سے ہی غالب آتا ہے اور اگر اس میں یہ دو صفات نہ ہوں تو وہ کافر ہوتا ہے۔ (پس چہ۔۸۰۴)

ان اشعار کے بعد بھی علامہؒ نے مولاناؒ کے نظریات کو مزید تفصیل کے ساتھ منظوم کیا ہے، ''در اسرارِ شریعت'' میں بھی مولانا کے نکتہ ہائے دقیق کو آسان لفظوں میں بیان کیا ہے، جس کے پہلے تین اشعار یہ ہیں ؎

نکتہ ہا از پیرِ رومؒ آموختم   خویش را در حرف او واسوختم

میں نے بہت سے نکات کو پیر رومیؒ سے سیکھا ہے، اُن کے حروف سے میں نے خود کو جلایا ہے۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول   نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ گوید رسولﷺ

اگر مال کا جمع کرنا دین کے لیے ہو تو رسولِ مقبولﷺ نے فرمایا کہ صالح مال اچھا ہوتا ہے۔

گر نداری اندر ایں حکمت نظر   تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر

اگر تیری نظر اس حکمت پر نہ ہو تو تُو غلام ہے اور تیرے آقا سونا اور چاندی ہیں۔ (پس چہ۔ ۸۲۵)

علامہ اقبالؒ ''حرفِ چند با امّتِ عربیہ'' میں لکھتے ہیں کہ دین و دنیا دونوں کو کام میں لایا جائے تو کامیابی قدم چومے گی۔ اگر فخر الدین رازیؒ کے عقلی اثاثے (فکر) کو مولانا رومیؒ کے عشق کی شرابِ ذکر سے ملایا جائے تو کام بنتا ہے، یعنی ذکر و فکر کا باہم ہونا ضروری ہے ؎

تیغِ ایوّبیؒ، نگاہِ بایزیدؒ   گنجہائے ہر دو عالم را کلید

صلاح الدین ایوبی کی تلوار اور بایزیدؒ کی نگاہ دونوں جہانوں کے لیے کلید ہے۔

عقل و دل را مستی از یک جامِ مئے   اختلاطِ ذکر و فکرِ رومؒ و رے

عقل و دل کی مستی ایک شراب کے جام سے کرنا روم و رے یعنی مولانا کے ذکر اور فخر الدین رازیؒ کے فکر کے اختلاط سے ملتی ہے۔ (پس چہ۔ ۸۳۶)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ جو لوگ جدوجہد نہیں کرتے وہ ان آرام طلب لوگوں کی طرح ہیں جو ساحل پر ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں اور حوادث کے سمندر میں چھلانگ لگانے کے مخالف ہیں۔ رومیؒ مسلمانوں کو ہمیشہ حوادث سے برسرِ پیکار رہنے کا پیغام دیتے ہیں اور ہر مسلمان کو ذکر و فکر، جستجو و تلاشِ علم اور تخلیقِ افکار کے لئے کوشاں رہنے کا سبق دیتے ہیں۔ علامہؒ فرماتے ہیں ؎

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار   اک بحرِ پُرآشوب و پُراسرار ہے رومی

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبالؔ   جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام   کہتے ہیں چراغِ رہِ احرار ہے رومی

(ب۔ج۔ ۴۴۰)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جو علم الاشیاء آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اس سے یہی مراد ہے کہ انسان ذکر اور فکر کو ملا کر کام کرے کیونکہ جب تک علم کی بات روحانیت کے ساتھ نہ ملے تو کامیابی حاصل نہیں ہوتی ؎

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام   وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ
مقامِ ذکر کمالاتِ رومیؔ و عطارؔ   مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا
(ض۔ک۔۴۸۵)

مولانا رومیؒ کی تجلیٔ افکار سے پورا عالم روشن ہے، انہوں نے پورے جہان کو تاریکیوں سے نکالنے اور شریعتِ محمدی ﷺ کے چراغوں سے بیابانوں اور آستانوں کو روشن کرنے کی راہ بتائی۔ ان کے کلام میں نئے افکار ملتے ہیں ؂

آفتابے کہ از تجلیٔ اُو   افقِ رومؔ و شامؔ نورانی
وہ آفتاب جو ان کی تجلّی سے روشن ہے، روم اور شام کی اُفق ان سے نورانی ہے۔

شُعلہ اش در جہانِ تیرہ نہاد   بہ بیابانِ چراغِ رہبانی
ان کا شُعلہ اس ظلمت کدہ کے لیے ایسا چراغ ہے جو بیابان کے ڈرنے والے درویشوں کے لئے ہے۔

معنی از حرفِ او ہمی روید   صفتِ لالہ ہائے نعمانی
ان کے حروف سے معنی اس طرح پھوٹتے ہیں جیسے نعمان بن منذر بادشاہ کے لگائے ہوئے لالہء سرخ کے پھول۔
(پ۔م۔۳۷۲)

مولانا رومیؒ کا کلام عشق اور مستی سے لبریز ہے اور وہ مروّجہ استدلال اور فلسفے سے کام نہیں لیتے۔ ان کا استدلال اپنے انداز کی آپ ہی ایک مثال ہے، چنانچہ علامہؒ نے فرمایا ہے کہ ؂

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم   دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت
بوعلیؒ تو (قافلۂ استدلال کی) اونٹنی کے غبار میں کھو گیا اور رومیؒ کے عشق کے ہاتھ نے بڑھ کر (لیلیٰ کے) محمل کے پردے کو تھام لیا۔ (پ۔م۔۲۷۶)

مولانا رومیؒ کے کلام کی وضاحت کے لئے لاتعداد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ آپ کے پہلے شعر ''بشنو از نے چہ حکایت می کند'' پر ایک ہزار صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جا چکی ہے۔ مفتاح العلوم کی چھ جلدیں مثنوی کی تفسیر میں محمد نذیر عرشی نے لکھی ہیں۔ مولانا پر لکھی گئی تشبیہات رومیؒ، ملفوظات رومیؒ، حکمتِ رومیؒ وغیرہ کے علاوہ ''فیہ مافیہ'' میں مولانا کے ملفوظات ہیں۔ دیوانِ شمس تبریزؒ کی تشریحات بھی ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ مثنوی کی دس ضخیم شروح لکھی جا چکی ہیں، جن میں سے اکثر ناپید ہیں۔ چند اور کتابیں مثلاً احادیثِ مثنوی، معارفِ مثنوی، مثنوی میں ذکرِ رسول ﷺ، گلدستۂ مثنوی، کلیدِ مثنوی، مکاشفاتِ رضویہ، بحرالعلوم وغیرہ بازار میں خال خال دستیاب ہیں۔

علامہؒ کے ہاں مرشدِ رومیؒ کا فیضان

علامہ اقبالؒ نے مرشدِ رومیؒ سے جو فیوض حاصل کیے ان کا کچھ تذکرہ تو زیرِ نظر کتاب میں ''پیامِ رومیؒ حیات

افروز ہے" میں ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ آپ نے اپنے کلام میں متعدد بار مولانا سے مستفیض ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ ایسے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہؒ کے کلام میں جگر سوزی اور رُوح پروری مولانا رومیؒ سے ہی ماخوذ اور مستعار ہے۔ اس لیے آپ نے کھلے لفظوں میں مولانا کو اپنا مرشد تسلیم کیا ہے ؎

رازِ معنی مرشدِ رومیؒ کشود فکرِ من بر آستانش در سجود

مجھ پر معنوی اسرار مرشدِ رومیؒ نے کھولے ہیں اور میری فکر اس کے آستان پر سجدہ ریز ہے۔ (ز۔ع۔۵۷۷)

پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

پیر رومیؒ نے خاک کو بھی اکسیر کر دیا ہے اور میری خاک سے کئی جلوے تعمیر کیے۔ (ا۔ح۔۹)

مرشدِ رومیؒ حکیمِ پاک زاد سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد

مرشدِ رومیؒ وہ حکیمِ پاک باز ہیں جنہوں نے زندگی اور موت کے اسرار ہم پر کھولے۔ (پ۔م۔۱۹۰)

گرہ از کارِ ایں ناکارہ وا کرد غبارِ رہگذر را کیمیا کرد

مجھ ناکارہ کی مشکلوں کی انہی نے گرہ کشائی کی ہے اور ایک راہگذر کی خاک کو کیمیا بنا دیا ہے۔ (ا۔ح۔۹۵۸)

نئے آں نَے نوازے پاک بازے مرا با عشق و مستی آشنا کرد

اس پاک باز بانسری نواز کی بانسری کی "نَے" نے مجھے عشق و مستی سے آشنا کر دیا ہے۔ (ا۔ح۔۹۵۸)

خودی تا گشت مہجورِ خدائی بہ فقر آموخت آدابِ گدائی

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری خودی دنیا سے بے پروا ہو جائے تو مولانا کے فقر سے طلب کرنے کے آداب سیکھو۔
(ا۔ح۔۹۶۰)

زچشمِ مستِ رومیؒ دام گردم سرورے از مقامِ کبریائی

میں نے رومیؒ کی مست آنکھوں سے قرض کے طور پر لیا ہے وہ سرور، جس کا مقام کبریائی ہے۔ (ا۔ح۔۹۶۰)

بیا کہ من زخُمِ پیرِ روم آوردم مئے سخن کہ جواں تر زبادۂ عِنَبی است

آؤ کہ میں پیر رومیؒ کے شراب کے مٹکے سے ایسے سخن کی شراب لایا ہوں جو انگوری شراب سے جواں تر ہے۔
(پ۔م۔۳۳۵)

آمیزشے کجا، گہرِ پاکِ اُو کجا از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

ملاوٹ والی شراب کہاں اور آپ کی پاکیزہ شراب کہاں، میں نے شراب اُن کی انگور کی شاخ سے حاصل کی اور پیالے میں ڈال لایا ہوں۔ (پ۔م۔۳۸۳)

موجم و در بحرِ او منزل کنم تا دُرِّ تابندہ حاصل کنم

میں ایسی موج ہوں جس کی منزل رومیؒ کے سمندر میں ہے پھر وہاں سے گوہرِ تابدار حاصل کرتا ہوں۔ (ا۔ح۔۹)

من کہ مستی ہا ز صہبایش کنم زندگانی از نفس ہایش کنم

میری مستی اُن کی شراب سے آتی ہے، میری زندگی اُن کے دم سے ہی وابستہ ہے۔ (ا۔ح۔ ۹)

شرارِے جستہء گیر از درونم کہ من مانندِ رومیؒ گرم خونم

میرا حاصل کردہ شرارہ میرے اندر سے لے لو کہ میں بھی رومیؒ کی طرح گرم خون رکھتا ہوں۔ (ز۔ع۔ ۵۶۷)

چوں رومیؒ در حرم دادم اذاں من ازو آموختم اسرارِ جاں من

رومیؒ کی طرح میں نے بھی حرم میں اذان دی، انہی سے میں نے روح کے اسرار سیکھے۔ (ا۔ح۔ ۹۳۸)

بہ دورِ فتنہء عصرِ کہن او بہ دورِ فتنہء عصرِ رواں من

وہ پرانے زمانے کے فتنوں کے لیے آئے اور اس دور کے فتنوں کے لیے میں آیا ہوں۔ (ا۔ح۔ ۹۳۸)

رازِ خودی کو مولاناؒ نے فاش کیا

علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مولانا رومیؒ سے بہت متاثر تھے اور اپنے خیالات و افکار کو مہذب اور عالی مرتبت کرنے کے لئے ان ہی کے رہینِ منّت ہیں۔ علامہ اقبالؒ اپنی تمہیدِ مثنوی میں لکھتے ہیں کہ جب عرفان اور آگہی کی طلب نے ان کو بے قرار کر دیا تو اسی عالمِ فکر میں وہ سو گئے۔ سونے کے دوران مولانا رومیؒ سے خواب میں ملاقات ہو گئی۔ مولانا رومیؒ مجھ کو تسکین دیتے ہوئے بہت سے حقائق کو مجھ پر منکشف فرماتے رہے۔ چنانچہ عارف رومیؒ کی اس تلقین کے بعد میں نے رازِ خودی کو فاش کیا۔ اُن کے درمیان جو سوال و جواب ہوئے درج ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیں ؎

شب دلِ من مائلِ فریاد بود خامشی از ''یاربم'' آباد بود

رات کو میرا دل مائلِ فریاد تھا، میری خاموشی نعرۂ یا رب سے آباد تھی۔

شکوہ آشوبِ غمِ دوراں بُدم از تہی پیمانگی نالاں بُدم

میں دنیا کی مشکلات کا شکوہ کر رہا تھا اور اپنی بے سروسامانی پر رو رہا تھا۔

روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت کو بہ حرفِ پہلوی قرآں نوشت

پیر نیک طینت رومیؒ کا چہرہ نمودار ہوا، جس نے فارسی زبان میں قرآن لکھا ہے۔

گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق جرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق

رومیؒ نے کہا کہ اے اہلِ عشق کے دیوانے! شرابِ عشق کا ایک گھونٹ پی (تو سہی)۔

بر جگر ہنگامۂ محشر بزن شیشہ بر سر دیدہ بر نشتر بزن

اپنے جگر میں قیامت کا ہنگامہ برپا کر، شراب کے شیشہ سے سر پھوڑ لے اور آنکھیں نشتر سے پھوڑ لے۔

خندہ را سرمایۂ صد نالہ ساز　　　اشکِ خونیں را جگر پر کالہ ساز

دُنیا کے عیش و آرام کو آہ و زاری کا ذریعہ بنا لو، اپنے خونیں اشکوں سے جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر لو۔ (اسرار۔ ۹)

تا بکے چوں غنچہ می باشی خموش　　　نکہتِ خود را چوں گل ارزاں فروش

غنچے کی طرح کب تک خاموش رہو گے، اپنی خوشبو کو پھول کی طرح عام کر دو۔

آتش استی بزمِ عالم برفروز　　　دیگراں را ہم زسوز خود بسوز

تو ایک آگ ہے، دنیا کی بزم کو چمکا دے، دوسروں کو بھی اپنے سوز میں جلا دے۔

فاش گو اسرارِ پیرِ مے فروش　　　موجِ مَے شو کسوتِ مینا بپوش

عشق کی شراب بیچنے والے پیر کے راز بیان کر، سراپا شراب بن جا اور مینا کا لباس پہن لے۔

سنگ شو آئینۂ اندیشہ را　　　برسر بازار بشکن شیشہ را

خوف و اندیشہ کے شیشے کے لئے پتھر بن جا اور سرِ عام ایسے شیشے کو توڑ ڈال۔

از نیستاں ہمچو نَے پیغام دہ　　　قیس را از قوم حے پیغام دہ

بانس کے جنگل (روحانی دُنیا) سے بانسری کی طرح اپنا پیغام دے، قیس یعنی ملت کو لیلیٰ (عربی سرکار) کا پیغام سنا۔

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن　　　بزم را از ہائے و ھُو آباد کن

اپنی فریاد کو نئے انداز میں ایجاد کرو، محفل کو اپنی ھاو ھُو سے آباد کرو۔

خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را　　　از قُمِ خود زندہ تر کن زندہ را

اُٹھ اور ہر زندہ کو نیا پیغام دے، اپنے لفظ ''قُم'' سے ہر زندہ کو زندہ تر بناؤ۔

زیں سخن آتش بہ پیراہن شُدم　　　مثلِ نَے ہنگامہ آبستن شدم

مولانا کی اس بات سے میرے بدن میں آگ پیدا ہوگئی، بانسری کی طرح میں ایک ولولے سے لبریز ہو گیا۔

چوں نوا از تارِ خود برخاستم　　　جنتے از بہرِ گوش آراستم

جب میں نے اپنے رباب سے نغمۂ خودی بلند کیا تو کانوں کو ایک پُرلطف نعمت سے آراستہ کر دیا۔

برگرفتم پردہ از رازِ خودی　　　وا نمودم سرّ اعجازِ خودی

(پھر) میں نے رازِ خودی سے پردہ ہٹایا اور اعجازِ خودی کے راز کو کھول دیا۔

تمہید مثنوی میں علامہ اقبالؒ مولانا رومیؒ سے فیض حاصل کرنے سے پہلے کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ اس سے قبل میں ایک نقشِ ناتمام تھا پھر عشق کی ریتی نے مجھے انسان بنایا اور میں بلند آسمانوں کی پرواز کرنے لگا۔ میں نے انسانیت کے لئے خفیہ اسرار سے پردہ اُٹھایا ۔

بود نقشِ ہستیم انگارہء ناقبولے، ناکسے ناکارہء

میرا وجود ایک ناتمام نقش کی طرح تھا جو ناقبول، نکما اور نقشِ ناتمام تھا۔

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم عالمِ کیف و کمِ عالم شدم

عشق نے مجھے سان پر چڑھایا تو مجھے انسان بنا دیا اور میں پورے عالم کے جملۂ اسرار کا عالم بن گیا۔ (اسرار۔ ۹۔۱۰)

حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام در رگِ مہ گردشِ خوں دیدہ ام

میں نے آسمانوں کے اعصاب کی حرکتوں کو دیکھا ہے اور چاند کی رگوں میں خون کی گردش دیکھی ہے۔

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

انسان کے لئے میری آنکھ کئی راتوں تک روتی رہی تب کہیں میں نے زندگی کے اسرار کا پردہ کھولا۔

از درونِ کارگاہِ ممکنات برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات

اس دنیائے ممکنات کے کارخانہ میں سے میں نے زندگی کے استحکام کے اسرار کو کھولا۔

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم گردپائے ملتے بیضاستم

میں نے اس تاریک رات کو چاند کی طرح سجا دیا کہ میں تو اس مِلت بیضا کے پاؤں کی خاک ہوں۔

ملتے درباغ و راغ آوازہ اش آتشِ دلہا سرود تازہ اش

وہ ملت جس کی سبزہ زاروں میں شہرت ہے اور کئی دلوں میں گرمی اس کے تازہ نغموں کی وجہ سے ہے۔

ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد خرمن از صد رومیؒ و عطارؒ کرد

وہ ملت جس نے ایک ذرّہ بویا اور اس سے ہزاروں آفتاب پیدا ہو گئے اور سینکڑوں رومیؒ و عطارؒ کا ڈھیر لگ گیا۔

آہِ گرمم رخت بر گردوں کشم گرچہ دودم از تبارِ آتشم

میں ایک آہ گرم ہوں جو آسمان تک پہنچتی ہے، اگرچہ میں آگ کا دھواں ہوں مگر آگ کے گھرانے سے ہوں۔

(اسرار۔ ۱۰۔۱۱)

علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی اور بے خودی کو ہماری تصنیف ''عشق و عقل اور فلسفۂ خودی'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، جو اِن شاء اللہ عنقریب شائع ہو گی۔

سوز و سازِ رومیؒ

وہ سوز و ساز جو مولانا رومیؒ، عطارؒ، خسروؒ اور سنائیؒ جیسے شعراء کے کلام میں تھا، وہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک کسی مغربی مفکر کے کلام میں نہیں مل سکا۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آج بھی ایران اور دیگر ممالک سے اُٹھنے والے بہت سے شعراء نظر آتے ہیں لیکن مسلمانوں کو سوزِ حیات صرف انہی اسلامی شعراء سے ملا ہے (سوز و ساز سے مراد سوختن یعنی جلنا اور ساختن یعنی کچھ نہ کچھ کرنا ہے) تو گویا سوز و ساز سے مراد زندگی کا درد یا لگن رکھنا اور اِس کے نتیجے میں

عملِ پیہم کرنا ہے۔ علامہ نے فرمایا ہے ؎

نہ اُٹھا پھر کوئی رومیؒ عجم کے لالہ زاروں سے　　　وہی آب و گِل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

(ب۔ج۔۳۰۳)

علامہ اقبالؒ سوز و ساز کی وضاحت درج ذیل اشعار میں فرماتے ہیں ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ　　　یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری　　　یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومیؒ　　　یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ

(ب۔ج۔ ۳۵۹)

علامہ اقبالؒ اللہ کے حضور اکابرین صوفیاء کی طرح کا سوز و ساز اور تڑپ عطا ہونے کے لئے دُعا کرتے ہیں ؎

عطا کن شورِ رومیؒ ، سوزِ خسروؒ　　　عطا کن صدق و اخلاصِ سنائیؒ

چناں با بندگی در ساختم من　　　نگیرم گر مرا بخشی خدائی

سوز و سازِ رومیؒ و سوزِ خسروؒ اور اخلاصِ سنائیؒ کے مانگنے کے بعد علامہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بندگی کے ساتھ اس طرح موافقت کر لی ہے کہ اگر مجھ کو خدائی بھی دے دی جائے تو قبول نہ کروں۔

علامہؒ فرماتے ہیں کہ حکیمانِ مغرب کا فلسفۂ سوزِ عشق نہ ہونے کی وجہ سے خام اور ناتمام ہے اور انسانیت کے پیچیدہ مراحل کا حل پیش نہیں کر سکتا لیکن مولانا رومیؒ یا جامیؒ جیسے شاعروں کا کلام معرفت اور حقیقی عشق سے لبریز ہونے کی وجہ سے اسلامی نقطۂ نظر سے وابستگی رکھتا ہے، اس لیے ان کے ایک یا دو اشعار سے ہی مسائل کے بہت سے بند دروازے کھل جاتے ہیں ؎

مرا از منطق آید بوئے خامی　　　دلیلِ اُو دلیلِ نا تمامی

مجھے فلسفہ سے خامی کی بُو آتی ہے کیونکہ اس کی دلیل نامکمل ہوتی ہے۔

بروئیم بستہ درہا را کشاید　　　دو بیت از پیرِ رومیؒ یا زِ جامیؒ

میرے لیے کئی بند دروازوں کو کھولتے ہیں مولانا رومیؒ یا جامیؒ کے دو بیت (شعر)۔　　　(ا۔ح۔۱۰۱۴)

''ایک فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام'' پر آپ نے ایک نظم میں حقیقتِ فلسفہ کو آشکار کیا ہے ؎

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا　　　زناریٔ برگساں نہ ہوتا

انجام خرد ہے بے حضوری　　　ہے فلسفہ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت　　　ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

دین مسلکِ زندگی کی تقویم　　　دین سرِّ محمد ﷺ و براہیمؑ

دل در سخن محمدی ﷺ بند ۔ اے پورِ علیؓ زبوعلی چند
چوں دیدۂ راہ ہمیں نداری قائد قرشی بہ از بخاری

(ض۔ک۔۴۸۰)

اپنے دل کو حدیثِ محمدی ﷺ کا پابند کرو! اے علیؓ کی اولاد تو کب تک علیؓ سے دور رہے گا، چونکہ تیری آنکھ راہ بین نہیں اس لیے تو عام قائد قریشی کو بخاری سے بہتر سمجھتا ہے۔

جو فن یا ہنر انسان کو زندگی سے دور لے جائے اور انفرادیت کو کچل دے، اس کو کائنات کے تابع کر دینا کیونکہ وہ فن علامہؒ کے نزدیک مصنوعی پن، نقالی اور بہروپ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تری خودی سے ہے روشن تیرا حریمِ وجود ۔ حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام ۔ اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا، خودی غیر کی، مَعَاذَاللہ ۔ دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے ۔ رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

(ض۔ک۔۵۶۸)

علامہ نے رومیؒ کے سوز و ساز کو اس لیے اہمیت دی ہے کہ علامہ وجود کے بلند آہنگ اظہار و اعلان کے لئے خلوصِ عشق، سوزِ خودی، جذبۂ زندگی اور عرفانِ نفس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اثباتِ وجود اور خودی سے پہلے فن کار کو اپنی پہچان ضروری ہے۔ پھر تعمیرِ خودی کے لئے نیاز میں ناز پیدا کرے اور قطرہ روکشِ دریا ہو جائے۔ علامہ سجدے کو بے خودی اور قیام کو خودی کا اشارہ سمجھتے ہیں، جیسے فرمایا کہ ''ہے قیام سے خالی تیری نماز اب تک''، یعنی تمہاری نماز خودی کے مقام سے خالی ہے ۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود ۔ کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر ۔ وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود
مکتب و میکدہ جز درسِ نبودن ند ہند ۔ بودن آموز کہ ہم باشی وہم خواہی بود

مکتب اور میکدہ منفی اسباقِ درس کے سوا کچھ نہیں بتاتے، مثبت اسباق سیکھ کہ تو موجود رہے گا اور جو چاہے گا کرے گا۔

(ض۔ک۔۵۷۶)

علاج آتشِ رُومیؒ کے سوز میں ہے ترا

یہ حقیقت ہے کہ قوم کی تمام برائیوں کا علاج قرآن و سنت کی اتّباع ہی میں ہے اور چونکہ مولانا نے اپنے کلام میں قرآن اور سنت کو ہی بیان کیا ہے، جو کہ دین و دنیا کی بہترین راہ بتاتی ہے، چنانچہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اگر مولانا رومیؒ کے فرمودات پر عمل کرو گے تو دین اور دنیا میں نجات حاصل کرلو گے۔

مولانائے رومیؒ کے زمانہ میں خشک فلسفیانہ موشگافیاں مسلمانوں کے ذہنوں اور دینی مدرسوں میں سرایت کر چکی تھیں مگر مولانا کی مثنوی اس قسم کے فلسفے سے ہٹ کر لکھی گئی ہے جس میں قوتِ حیات، ادبی بلندی، معانی کی جدت، حکیمانہ مثالوں اور نکتوں کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ مولانا کے کلام نے لاکھوں انسانوں کے قلب و نظر میں تبدیلی پیدا کی۔ علامہ اقبالؒ کے زمانہ میں یورپ کے مادی و عقلی، بے روح اور لامذہب افکار و خیالات پوری دنیا پر چھا گئے تھے، چنانچہ اس مادہ اور روح کی کشمکش نے فکری انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے پوری دنیا کو بتایا کہ عقل و خرد کی گتھیاں جسے یورپ کی مادیت نے اُلجھا دیا تھا ان کا حل آتش رومیؒ کے سوز میں ہی پنہاں ہے اور سب کو کہا کہ اپنی نگاہِ فکر اسی کے فیض سے روشن کریں۔ آپ نے اپنی قابلیت کے جہانگیر جوہر سے ثابت کر دیا کہ میرے سبوچہ میں مولاناؒ کے فکر و نظر کا بحرِ بے کنار پوشیدہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا — تیری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں
(ب۔ج۔ ۳۲۰)

ضربِ کلیم میں علامہ نے رومیؒ کے عنوان سے تین اشعار قلمبند کیے ہیں، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی ناکامی کا راز افشا کیا ہے، چنانچہ آپ نے یہی مشورہ دیا ہے کہ بجائے بے ہودہ کتابوں کے پڑھنے کے مولانا کے کلام کو پڑھو اور اس پر عمل کرو۔ افسوس ہے کہ اس قوم نے اپنے عظیم محسنوں کو بھلا دیا اور اب یہ وقت ہے کہ خال خال ہی کوئی شخص رومیؒ کے کلام کو زیر مطالعہ لاتا ہوگا ؎

غلط نگر ہے تیری چشم نیم باز اب تک — ترا وجود تیرے واسطے ہے راز اب تک
تیرا نیاز نہیں ہے آشنائے ناز اب تک — کہ ہے قیام سے خالی تیری نماز اب تک
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک — کہ تو ہے نغمۂ رومیؒ سے بے نیاز اب تک
(ض۔ک۔ ۵۸۳)

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
(ب۔ج۔ ۳۴۸)

صحبتِ پیرِ رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف
(ب۔ج۔ ۳۳۱)

نہ جبریلے، نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے — کفِ خاکے کہ می سوزد ز جانِ آرزو مندے
(ح۔ن۔ ۷۴۰)

نہ جبریلِ امینؑ، نہ جنت، نہ حور اور نہ ہی خدائے تعالیٰ کی ذات ایسی آرزو مند ہے جیسی کہ مٹھی بھر آدم کی خاک اپنی

جان کی آرزوؤں میں سُلگ رہی ہے۔

رومیؒ کو رفیقِ راہ بناؤ

محمد حسین عرشی لکھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے مجھے ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء میں ایک خط لکھا، اس کا مضمون یہ تھا۔ ''آپ اسلام اور اس کے حقائق کے لذت آشنا ہیں۔ مثنوی رومیؒ کے پڑھنے سے اگر دل میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے؟ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعۂ کتب ترک کر چکا ہوں اور اگر پڑھتا ہوں تو صرف قرآن اور مثنوی کو پڑھتا ہوں۔ افسوس! ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔ کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں ایک بھی صاحبِ سرور نہیں۔ بہرحال آپ مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیے اور مجھ سے کبھی کبھی ملتے رہیے کیونکہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض اوقات ایسے نتائج پیدا کر دیتی ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتے۔ یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے، جن کو جاننے والے مسلمان ہند کی بدنصیبی سے اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے۔'' ؎

پیرِ رومیؒ را رفیقِ راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

پیرِ رومیؒ کو اپنے راستے کا ساتھی بناؤ تاکہ خدا تجھے سوز و گداز سے نوازے۔

زانکہ رومیؒ مغز را داند زپوست پائے او محکم فتد در کوئے دوست

یہ اس لیے کہ رومیؒ چھلکے اور مغز کو پہچانتے ہیں، ان کے قدم محبوب کے کوچے میں محکم ہیں۔

شرح او کردند و او را کس ندید معنیء او چوں غزال از ما رمید

لوگ اُن کی شرح تو کرتے ہیں مگر حقیقت آشنا نہیں، ان کا کلام یوں ہے جیسے ہم سے بھاگا ہوا ہرن۔

رقصِ تن از حرفِ او آموختند چشم را از رقصِ جاں بردوختند

صوفیوں نے اُن کے کلام پر سر دھنا تو سیکھ لیا لیکن روح کے وجد سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رقصِ تن در گردش آرد خاک را رقصِ جاں برہم زند افلاک را

جسم کے وجد سے تو خاکی دُنیا میں انقلاب آتا ہے اور روح کے وجد سے افلاک درہم برہم ہو جاتے ہیں۔

علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست ہم زمیں ہم آسماں آید بدست

علم اور حکومت روح کے وجد سے حاصل ہوتے ہیں بلکہ اس سے تو زمین اور آسمان بھی فتح ہو جاتے ہیں۔

فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم

اس سے بندہ جذبِ کلیم حاصل کر لیتا ہے اور ملت بہت بڑی مملکت کی وارث ہو جاتی ہے۔

رقصِ جاں آموختن کارے بود غیرِ حق را سوختن کارے بود

روح کا رقص سیکھنا تو کارِ دارد ہے، ماسوائے اللہ کے سب کو جلا دینا تو ایک بہت بڑا کام ہے۔

تا زنارِ حرص و غم سوزد جگر — جاں برقصِ اندر نیاید اے پسر

جب تک حرص اور غم کی آگ سے جگر سوزی نہ ہو، روح کا وجد میں آنا ممکن نہیں۔

ضعفِ ایماں است و دلگیری است غم — نوجوانا! نیمۂ پیری است غم

دلگیر ہونا اور غم کھانا تو ضعفِ ایمان ہے، اے نوجوان! غم سے تو آدمی آدھا بوڑھا ہو جاتا ہے۔

می شناسی؟ حرص فقرِ حاضر است — من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است

کیا تم جانتے ہو کہ حرص تو ہر وقت محتاج بنائے رکھتی ہے؟ میں تو اس کا غلام ہوں جو خود پر غالب آئے۔

(ج۔ن۔ ۷۹۶)

اے مرا تسکین جانِ ناشکیب — تو اگر از رقص جاں گیری نصیب

اے بیٹے! تُو میرے مضطرب دل کا سکون ہے اگر تجھے رُوحانی وجد یا رقص سے کچھ حصہ مل جائے۔

سرِّ دینِ مصطفےٰ ﷺ گویم ترا — ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

میں نے دینِ مصطفےٰ ﷺ کا راز تجھے بتا دیا ہے اور میں قبر میں بھی تیرے لیے دُعا گو رہوں گا۔ (ج۔ن۔ ۷۹۶)

ز رومیؒ گیر اسرارِ فقیری

علامہ اقبالؒ زندگی کا رازِ عشق سے وابستگی میں تصور کرتے ہیں اور مولانا رومیؒ کی فقیری اور خودداری کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اُن کی اس دولت پر تو اُمرا بھی رشک کرتے ہیں ؎

ز رومیؒ گیر اسرارِ فقیری — کہ آں فقر است محسودِ امیری

رومیؒ سے اسرارِ فقر اخذ کرو کیونکہ اُن کے فقر پر اُمرا بھی رشک کرتے ہیں۔ (ا۔ح۔ ۷۵۹)

شرارے جستۂ گیر از درونم — کہ من مانند رومیؒ گرم خونم

میرے اندر سے نکلی ہوئی عشق کی ایک چنگاری لے لو کیونکہ میں رومیؒ کی طرح خون میں حرارت رکھتا ہوں۔

(ز۔ع۔ ۵۶۷)

وگرنہ آتش از تہذیبِ نو گیر — برونِ خود بیفروز اندروں میر

ورنہ نئی تہذیب کی آگ حاصل کر لو تو اس طرح تم اپنے ظاہر کو آراستہ کر لو گے مگر باطن کو ختم کر دو گے۔

(ز۔ع۔ ۵۶۷)

حذر زاں فقر و درویشی کہ از وے — رسیدی بر مقامِ سر بزیری

ایسے فقر اور درویشی سے بچو جس کی وجہ سے تمہیں اپنا سر جُھکانے کی نوبت آئے۔ (ا۔ح۔ ۹۵۹)

مشائخ کبار کا قول ہے کہ جس طرح مولانا رومیؒ نے اپنے مرشد شمس تبریزؒ کی صحبت اختیار کی، ان کو خضرِ راہ بنایا اور اپنی خودی کو مستحکم کیا، اسی طرح تم بھی کسی مرشدِ کامل کی صحبت میں آ کر اپنی خودی کو مکمل کرو۔ علامہ اقبالؒ

فرماتے ہیں کہ گوئٹے نے جرمنی ادب میں عجمی روح پیدا کی۔ اس کے علاوہ بہت سے شعراء مثلاً پلاٹن، روکرٹ، بوڈن سٹاٹ نے فارسی زبان سیکھی اور فلسفۂ رومیؒ اور دیگر اسلامی شعراء کی بہت قدر کی ہے اور ان کی غزلیات میں زیادہ تر رومیؒ کی تقلید پائی جاتی ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں میں اکثر اور بیشتر لوگ مولانا رومیؒ اور دیگر اسلامی شعرا سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کو مولانا رومیؒ کی شمع سے اپنی شمع کو روشن کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شمعِ خود را ہمچو رومیؒ برفروز روم را در آتشِ تبریزؒ سوز

اپنی شمع کو رومیؒ کی طرح روشن کرو، مولانائے روم کی طرح اپنے دل کو شمس تبریزؒ کی آگ میں جلاؤ۔ (ا۔و۔ر۔ ۱۹)

دل زعشقِ او توانا می شود خاک ہمدوشِ ثُریا می شود

ان کے عشق میں دل توانا ہو جاتا ہے اور خاکی (ذرّات) ہمدوشِ ثریا ہو جاتے ہیں۔ (ا۔و۔ر۔ ۱۹)

مرشدِ رومیؒ چہ خوش فرمودہ است آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است

مرشدِ رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے، گویا انہوں نے قطرے میں سمندر سمویا ہوا ہے۔ (ا۔و۔ر۔ ۱۳۱)

مگسل از ختم الرّسل ﷺ ایام خویش تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش

اپنی زندگی کو ختم الرسل ﷺ سے منقطع نہ کرو، اپنے فن اور اپنی رفتار پر بھروسہ نہ کرو۔ (ا۔و۔ر۔ ۱۳۲)

عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد از تاب و تبِ رومیؒ تا حیرتِ فارابیؒ

یہ عشق ہی ہے کہ تمہاری روح میں ہر کیفیت پیدا کرتا ہے، تاب و تبِ رومیؒ سے لے کر حیرتِ فارابی تک۔

(پ۔م۔ ۳۰۳)

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ رومؒ آور تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

اے غزل خواں! مرشدِ رومیؒ کا ایک بیت سنا تا کہ میری جان بھی شمس تبریزؒ کی آگ میں غوطہ زن ہو جائے۔

(پ۔م۔ ۳۳۱)

شعلہ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من مرشدِ رومیؒ کہ گفت ''منزلِ ما کبریاست''

بھڑک اُٹھنے والا شعلہ میرے خس و خاشاک پر مارو کیونکہ مرشدِ رومیؒ نے کہا ہے کہ ہماری منزل خدائے کبریا ہے۔

(پ۔م۔ ۳۴۱)

جدھر رومیؒ لے جائے اُدھر ہی جاؤ

درج ذیل اشعار میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ رومیؒ تمہیں جس سمت لے جائے اُدھر ہی چلے جاؤ کیونکہ ایسا دین دار شخص کبھی گمراہی کی طرف رہنمائی نہیں کرے گا۔ مولانا رومیؒ کی رہنمائی میں جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں ؎

ہر کجا رومیؒ برد آں جا برو — یک دو دم از غیرِ او بیگانہ شو

رومیؒ تمہیں جہاں بھی لے جائے ادھر ہی جاؤ، کچھ دیر کے لئے خود کو اُس کے علاوہ ہر شے سے منقطع کر لو۔
(ج۔ن۔ ۶۲۱)

رومیؒ آں عشق و محبت را دلیل — تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

رومی وہ ہیں جو عشق اور محبت کی کامل دلیل ہیں، پیاسوں کے لئے ان کا کلام چشمۂ سلسبیل ہے۔

آں نوا گلشن کند خاشاک را — آں نوا برہم زند افلاک را

ان کے نغمے کی نوا تو گھاس پھوس کو بھی گلشن بنا دیتی ہے، ان کی نوا آسمانوں کو بَرہم کر دیتی ہے۔

آں نوا برحق گواہی می دہد — با فقیراں بادشاہی می دہد

ان کی نوا اللہ تعالیٰ پر گواہی پیش کرتی ہے اور فقیروں کو بادشاہی عطا کرتی ہے۔

خوں ازو اندر بدن سیار تر — قلب از روح الامیں بیدار تر

اس کی وجہ سے بدن میں خون کی حرکت تیز ہو جاتی ہے اور دل جبرائیلؑ سے زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔ (ج۔ن۔ ۶۳۱)

پیرِ رومیؒ آں سراپا جذب و درد — ایں سخن دانم کہ با جانش چہ کرد

پیرِ رومیؒ سراپا جذب و درد ہیں، میں جانتا ہوں کہ اس نے اپنی جان کو کن مجاہدات میں ڈالا۔

از دروں آہے جگر دوزے کشید — اشکِ او رنگیں تر از خونِ شہید

ان کے سینے سے جگر دوز آہ نکلتی ہے، ان کا ایک آنسو خونِ شہید سے زیادہ رنگین ہے۔

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست — ملّتے را می برد تا کوئے دوست

اس مرد کا نغمہ جس میں خدا کا رنگ ہو، ملت کو بارگاہِ الٰہی میں لے جاتا ہے۔ (ج۔ن۔ ۶۷۱)

گفت رومیؒ ایں قدر از خود مرو — از دمِ آتش نوایاں زندہ شو

رومیؒ نے کہا کہ اس قدر از خود نہ ہو جاؤ بلکہ ان لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ جن کی نوا شعلہ بار ہے۔ (ج۔ن۔ ۷۰۴)

مولاناؒ مسائل کو حل کرتے ہیں

مثنوی میں مولاناؒ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو مسائل عام فہم نہیں ان کو آسانی سے سمجھانے کے لیے وہ کوئی دُنیاوی مثال پیش کرتے ہیں اور پھر اس سے استدلال قائم کر کے اس مسئلے کو آسانی سے حل کر دیتے ہیں، مثلاً آپ نے مجنوں کے متعلق لکھا ہے کہ ایک دن وہ صحرا میں نہایت غمگین انداز سے بیٹھا ہوا تھا اور ریت کو کاغذ بنا کر کچھ لکھ رہا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو خط لکھ رہا ہے۔ کسی شخص نے مجنوں سے پوچھا کہ یہ خط کس کو لکھ رہے ہو تو مجنوں نے کہا کہ میں خط نہیں لکھ رہا بلکہ لیلیٰ کا نام بار بار لکھ رہا ہوں کیونکہ میں جب اس کا نام لکھتا ہوں تو میرے دل کو سکون ملتا ہے (دیکھئے مولانا کا شعر ''دید مجنوں را یکے صحرا نورد'') پھر آپ اس مثال سے یہ ظاہر کرتے ہیں

کہ جو لوگ اللہ کے عاشق ہوں ان کو اللہ کے ذکر سے اسی طرح سکون ملتا ہے جس طرح مجنوں کو لیلیٰ کے نام سے سکون ملتا تھا (دیکھئے سورۃ الرعد آیت نمبر ۲۸ ''اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'')۔

خلیفہ عبدالحکیم نے ایسی تمام مثالوں کو ایک کتاب ''تشبیہاتِ رومیؒ'' میں جمع کر دیا ہے، جو لوگ خواہش مند ہوں اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ تشبیہاتِ رومیؒ پر ایک باب اس کتاب کے آئندہ صفحات میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کو حضرت مولانا رومیؒ سے اس قدر عقیدت تھی کہ وہ جب بھی کسی پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کی فکر میں ہوتے تو اپنے وجود کی نفی کر کے عالم ھُو میں گم ہو جاتے۔ اس کیفیتِ انہماک میں وہ دیکھتے کہ مولانا رومیؒ کی روح نمودار ہو جاتی اور ان کے مسائل کا خاطر خواہ اور حکیمانہ جواب دیتی، چنانچہ مولانا رومیؒ کے ان ارشادات کو آپ قلمبند کر دیتے۔ طوالت کے خوف سے ان تمام واقعات کا لکھنا ممکن نہیں، البتہ مولانا رومیؒ کے چند ارشادات علامہؒ کے اپنے الفاظ میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

حاکمی بے نورِ جاں خام است خام　　بے یدِ بیضا ملوکیت حرام

روحانی نوا کے بغیر حکومت خام رہتی ہے اور جب تک موسیٰ ؑ کی طرح یدِ بیضا نہ ہو تو بادشاہی حرام ہے۔

(ج۔ن۔۶۸۳)

مذہبِ عصرِ نو آئینے نگر　　حاصلِ تہذیب لادینے نگر

اس دور کے نئے آئین والے مذہب کو دیکھو، اس لادینی تہذیب کا حاصل بھی دیکھو۔

زندگی را شرع و آئین است عشق　　اصلِ تہذیب است دیں، دیں است عشق

زندگی کے لیے عشق شرع اور آئین کا مقام رکھتا ہے، تہذیب کی اصل دین ہے اور دین سراسر عشق ہے۔

(ج۔ن۔۷۰۰)

راقم الحروف نے ''عقل اور عشق'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب عاشقانِ رومیؒ اور اقبالؒ کے لئے لکھ دی ہے جو اِن شاءَ اللہ جلد ہی عوام کے لیے پیش کر دی جائے گی۔ اس کتاب میں رومیؒ اور اقبالؒ کے علاوہ دیگر اکابرین اور اولیائے کرام کی آراء بھی پیش کی گئی ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

گفت رومیؒ وقت را از کف مدہ　　اے کہ می خواہی کشودِ ہر گرہ

رومیؒ نے کہا کہ وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، یہ بات اس کے لئے ہے جو ہر مشکل کی گرہ کھولنا چاہے۔

چند در افکارِ خود باشی اسیر　　ایں قیامت را بروں ریز از ضمیر

کب تک افکار میں گرفتار رہو گے، اس افکار کی قیامت کو ضمیر سے باہر نکالو۔　　(ج۔ن۔۷۰۷)

''حـرکـت بـجَنَّتُ الْفِرْدَوْسِ'' کی نظم میں علامہ اقبالؒ جنت کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ انسان کو نیک کاموں سے جنت اور بُرے کاموں سے جہنم ملتی ہے ؎

گفت رومیؒ اے گرفتارِ قیاس درگذر از اعتبارات حواس

رومیؒ نے کہا کہ اے قیاس میں گرفتار انسان! حواس کی غلط اعتباری سے گذر جاؤ۔

از تجلی کارہائے خوب و زشت می شود آں دوزخ ایں گردد بہشت

اچھے اور برے کاموں کی تجلی سے ایک دوزخ بنتی ہے اور ایک جنت بنتی ہے۔

ایں کہ بینی قصرہائے رنگ رنگ اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ

یہ جو رنگ رنگ کے محل دیکھ رہے ہو ان کی اصل اعمال ہیں، اینٹ اور پتھر نہیں۔ (ج۔ن۔۷۴۳)

بالِ جبریلؑ میں علامہ اقبالؒ کی ایک نظم ''پیر و مرید'' کے چند اشعار نیچے دیے جا رہے ہیں جو کہ مثنوی سے ماخوذ ہیں اور اِن میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کا کیا علاج ہے؟

تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

کوئی قوم اس وقت تک رُسوا نہیں ہوتی جب تک کسی صاحبِ دل کا دل رنج سے بھر نہ جائے۔

زیرکی بفروش و حیرانی بخر زیرکی ظن است و حیرانی نظر

عقل کو بیچ دو اور اس کی جگہ حیرانی خریدو کیونکہ عقل محض وہم و گمان ہے اور حیرانی سے نظر پیدا ہوتی ہے۔

بندہء یک مردِ روشن دل شوی بہ کہ بر فرقِ سرِ شاہاں شوی

تو کسی مردِ روشن دل کا مرید ہو جا، یہ اس سے بہتر ہے کہ بادشاہوں کے سر کے اشارے پر چلے۔

علم و حکمت زآید از نانِ حلال عشق و رقت آید از نانِ حلال

رزقِ حلال سے علم و حکمت بڑھتی ہے، اسی طرح عشق اور رقّت بھی حلال روزی سے بڑھتی ہے۔

آنچہ خوانی کوثر و غلمان و حور جلوہَ ایں عالمِ جذب و سرور

اور وہ جو کوثر و غلمان اور حور کا ذکر پڑھتے ہو یہ اس دنیا کے جذب و سرور کا جلوہ ہے۔

زندگی ایں جا ز دیدار است و بس ذوقِ دیدار است و گفتار است و بس

اس جگہ دُنیا مشاہدے سے قائم ہے، یہاں ذوقِ دیدار اور گفتار کام آتے ہیں۔ (ب۔ج۔۴۳۴۔۴۲۶)

''حرکت بہ کاخِ سلاطینِ مشرق'' میں بھی رومیؒ کے ارشادات درج ہیں۔

گفت رومی چشمِ دل بیدار بہ پا بروں از حلقہَ افکار بہ

رومیؒ نے کہا کہ بیدار دل کی آنکھ بہتر ہے اور ان افکار سے باہر نکلنا بہتر ہے۔

کردہَ بر بزمِ درویشاں گذر یک نظر کاخِ سلاطیں ہم نگر

تو نے درویشوں کی محفل دیکھی ہے، ایک نظر بادشاہوں کے محلوں کو بھی دیکھ۔ (ج۔ن۔۴۵۹)

شیشۂ صبر و سکونم ریز ریز　　　پیرِ رومیؒ گفت در گوشم کہ خیز

میرے صبر وسکون کا پیمانہ ٹوٹ گیا تو پیرِ رومی نے میرے کان میں کہا کہ اب اُٹھ جاؤ۔ (ج۔ن۔۷۷۴)

مثنوی کے ذخائر

مولانا رومیؒ کی مثنوی جو کہ چھ دفتروں پر مشتمل ہے، اپنے اندر تمام ضروری اسلامی علوم کو سموئے ہوئے ہے۔ اس میں کوئی شعبۂ حیات یا علمِ موجودات ایسا نہیں جس پر آپ نے کلام نہ کیا ہو۔ حقیقت تو یہی ہے کہ آپ نے قرآن کے رموز کو فارسی زبان کا جامہ پہنایا ہے۔ اگر ان موضوعات کی فہرست مرتّب کی جائے جن پر مولاناؒ نے سخن بندی کی ہے تو اس فہرست کے لئے بھی تیں، چالیس صفحات درکار ہوں گے۔ وہ موضوعات جو نہایت اہم ہیں اور جن پر آپ نے نہایت فلسفیانہ گفتگو کی ہے ان میں سے روح، اخلاق، الٰہیات، صفاتِ باری تعالیٰ، نبوت، وحی، معجزہ، مبداء و معاد، جبر و قدر، سنتِ رسول ﷺ، شریعت، طریقت اور حقیقت، فلسفہ اور سائنس، تجاذبِ اجسام (کششِ اجسام)، تجاذبِ ذرّات، تجددِ امثال (جسمِ حیوانی کے اجزاء کا جلد فنا ہو جانا اور ان کی جگہ فوراً نئے اجزاء کا پیدا ہونا جس کی وجہ سے انسان ہر دم تازہ رہتا ہے) کے مسئلوں کے علاوہ ارتقاءِ موجودات کا اپنی بہترین صورت کی طرف رجوع کرنا اور ارتقائی منزلیں طے کرنا، عقل اور عشق وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام مضامین کا خلاصہ بیان کرنے کے لئے بھی ایک کتاب کی ضخامت درکار ہو گی، چنانچہ قارئین کے لیے یہ مشورہ ہے کہ مثنوی کا مطالعہ کریں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں متعدد مقامات پر اور بالخصوص جاوید نامہ کی ایک غزل ''تمہیدِ آسمانی'' میں مولاناؒ کے کلام میں بیان کردہ اسرار کا مختصر سا خلاصہ شامل کیا ہے۔ اس کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں ؎

روحِ رومیؒ پردہ ہا را بر درید　　　از پسِ کہ پارۂ آمد پدید

رومیؒ کی روح پردے چاک کرکے پہاڑی کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔

طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب　　　شیبِ او فرخندہ چوں عہدِ شباب

ان کا چہرہ آفتاب کی طرح روشن تھا، ان کی پیری جوانی سے بھی زیادہ آب و تاب رکھتی تھی۔

بر لب او سرِّ پنہانِ وجود　　　بند ہائے حرف و صوت از خود کشود

ان کے لبوں پر وجود کے پوشیدہ راز کا بیان تھا، انہوں نے الفاظ اور آواز کے بندھن کھولے۔

گفتمش موجود و ناموجود چیست　　　معنیٔ محمود و نامحمود چیست

میں نے پوچھا موجود اور ناموجود کیا ہے؟ محمود اور نامحمود کے معنی کیا ہیں؟

مولاناؒ نے فرمایا کہ زندگی کو اپنی نظر سے آراستہ کرنا ضروری ہے اور اس کام کے بعد انسان کو اپنے اوپر خود اپنی اور لوگوں کی شہادت طلب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نظروں سے پرکھنا ضروری ہے۔

زندگی خود را بخویش آراستن　　بر وجودِ خود شہادت خواستن

اپنے آپ کو اپنی نظروں سے آراستہ کرنا اور اپنے وجود پر شہادت طلب کرنا زندگی ہے یعنی اپنے آپ سے پوچھو کہ میں کیسا ہوں۔

زندہَ یا مردہَ یا جاں بلب　　از سہ شاہد کن شہادت را طلب

تو زندہ ہے یا مردہ ہے یا جاں بلب، تین شاہدوں سے شہادت طلب کر۔ (ج۔ن۔ ۶۰۷)

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است　　ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

اپنے مقام پر پہنچنا اور ذاتِ باری تعالیٰ کو بے پردہ دیکھنا زندگی ہے۔ (ج۔ن۔ ۶۰۷)

چیست معراج؟ آرزوئے شاہدے　　امتحانے رو بروئے شاہدے

معراج کیا ہے؟ شاہدِ محبوب کی آرزو کرنا کہ اس کے رُوبرُو اپنا امتحان کیا جائے۔

گفت اگر سلطاں ترا آید بدست　　می تواں افلاک را از ہم شکست

رومیؒ نے کہا کہ اگر تجھے سلطان یعنی قوت میسر آجائے تو افلاک کی حدود کو بھی توڑا جا سکتا ہے۔

سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس کوئی طاقت کی سند ہے تو تم آسمانوں کو چیر سکتے ہو ؎

نکتۂ ''اِلَّا بِسُلْطَانٍ'' یاد گیر　　ورنہ چوں مور و ملخ در گِل بمیر

کرۂ ارض کو طاقت سے چیر کر نکلنے کا نکتہ یاد رکھو، نہیں تو تم چیونٹیوں اور مرغیوں کی طرح مرجاؤ گے۔ (ج۔ن۔ ۶۰۸)

ہم بروں جَستن بزادن می تواں　　بندہا از خود کشادن می تواں

اس جہانِ چارسو سے نئے روحانی جنم کے ساتھ باہر نکل سکتے ہو، تمام بندھنوں کو تم خود کھول سکتے ہو۔ (ج۔ن۔ ۶۰۹)

کچھ سوالوں کے جواب

جاوید نامہ میں ''تمہیدِ آسمانی'' کی اس غزل کے آخر میں علامہ اقبالؒ جان و تن، شعور اور معراج کی حقیقت بیان کرتے ہیں ؎

چیست جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد　　ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد

جان کیا ہے؟ جذب و سرور اور سوز و درد ہے، چاروں طرف گھومنے والے آسمانوں کی تسخیر کا جذبہ ہے۔

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است　　با مقامِ چار سو خو کردن است

تن کیا ہے؟ یہ خود کو رنگ و بُو کا عادی کرنا ہے اور چار سُو سے خود کو راضی کرنا ہے۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور　　چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

تم جو نزدیک و دور کہتے ہو یہ تو ایک شعور ہے، معراج کیا ہے؟ اسی شعور میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔

انقلاب اندر شعور از جذب و شوق — وارہاند جذب و شوق از تحت و فوق

شعور کا یہ انقلاب جذب اور شوق سے ہوتا ہے، جذب و شوق چھڑا دیتا ہے چار سُو یعنی مکاں و زماں سے۔

ایں بدن با جانِ ما انباز نیست — مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

یہ بدن ہماری جان پر بوجھ کی طرح نہیں، یہ مٹھی بھر خاک پرواز کے لئے رکاوٹ نہیں۔ (ج۔ن۔۶۱۲)

جاوید نامہ میں علامہ اقبالؒ کا ''جہاں دوست'' مولانا رومؒ سے سوال کرتا ہے اور مولانا رومؒ اس کا جواب دیتے ہیں۔ ایک سوال یہ ہے کہ چیست عالم؟ چیست آدم؟ چیست حق؟ (یعنی یہ عالم یہ آدم اور خدا کیا ہے) مولانا جواب دیتے ہیں ؎

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن — عالم ایں شمشیر را سنگ فسن

آدمی تلوار ہے اور اللہ اس تلوار کو چلانے والا ہے اور یہ دنیا اس تلوار کو تیز کرنے کے لیے سان ہے۔

شرق حق را دید و عالم را نہ دید — غرب در عالم خزید از حق رمید

اہلِ مشرق نے خدا شناسی کی اور عالم سے دُور رہے، مغرب والے عالم پر رینگتے رہے اور حق سے دُور رہے۔

چشم بر حق باز کردن بندگی است — خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

اپنی آنکھ کو خدا کے لئے کھولنا بندگی ہے، اپنے آپ کو بے پردہ دیکھنا (یعنی عرفان) زندگی ہے۔

بندہ چوں از زندگی گیرد برات — ہم خدا آں بندہ را گوید صلوٰت

بندہ جب زندگی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے تو خدا بھی ایسے بندے پر درود بھیجتا ہے۔ (ج۔ن۔۶۲۴)

مولانا رومیؒ کا مقام اقبالؒ کی نظر میں

علامہ اقبالؒ نے کئی مقامات پر مولانا رومیؒ کا ذکر فرمایا ہے اور جاوید نامہ میں رومیؒ کے عنوان سے آٹھ اشعار ان کی تعریف میں لکھے ہیں۔ علامہ اقبالؒ جیسے عارف اور معروف شاعر نے جو الفاظ مولانا کے لئے استعمال کئے ہیں ان سے مولانا کے مقام کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس قدر بلند و ارفع مقام کے راہ نما سے آج ۹۹ فیصد سے زیادہ مسلمان بے بہرہ ہیں۔ آج کے مسلمان راگ رنگ اور کھیل تماشہ والوں کو تو خوب جانتے ہیں مگر اپنے راہبروں سے ناآشنا ہیں ؎

مردے اندر جستجو آوارۂ — ثابتے با فطرتِ سیارۂ

یہ مردِ خدا ہمہ وقت جستجو میں سرگرداں ہے، یہ گویا ایک ستارہ (ثاقب) ہے جس کی فطرت سیارے کی سی ہے۔

پختہ تر کارش زخامی ہائے اُو — من شہید نا تمامی ہائے اُو

اس کی خامیوں نے ہی اس کو پختہ بنایا ہے، میں اس کی نہ ختم ہونے والی جستجو کا عاشق ہوں۔

ہر زماں از شوق می نالد چو نال　　　　می کشد او را فراق و ہم وصال

وہ بانسری کی طرح ہر زماں شوق سے نغمہ سرا ہے، اس کو فراق اور وصال دونوں راس نہیں آتے۔

من نہ دانم چیست در آب و گِلش　　　　من نہ دانم از مقام و منزلش

میں نہیں جانتا کہ اُس کی سرشت میں کیا چیز ہے اور نہ ہی مجھے اس کے نام و منزل کا پتہ چلتا ہے۔ (ج۔ن۔۶۲۳)

علامہ اقبالؒ ''پس چہ باید کرد'' میں خطاب بہ قومِ سرحد کے عنوان سے مولانا کے نکات کو پیش کرتے ہیں ؎

ز آتشِ مردانِ حق می سوزمت　　　　نکتۂ از پیرِ رومؒ آموزمت

میں تمہیں مردانِ حق کی آگ سے گرماتا ہوں اور پیرِ رومؒ کا ایک نکتہ تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔

رزق از حق جُو مجو از زید و عمر　　　　مستی از حق جُو مجو از بنگ و خمر

رزق اللہ سے تلاش کرو، زید و عمر سے نہیں، مست ہونا ہے تو اللہ سے مست ہو، بھنگ اور شراب سے نہیں۔

(پس۔چہ۔ ۸۵۵)

حکیم سنائیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے سفر غزنی میں علامہؒ نے چند اشعار محمود، طوسی اور سنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھے ہیں اور اس کے علاوہ مولانا رومؒ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ خود فرماتے ہیں کہ میں نے سنائیؒ کے کلام کی ہی خدمت کی ہے یہ اس لیے کہ سنائیؒ کی ''حدیقۃ الحقیقت'' سب سے پہلی صوفیانہ مثنوی تھی ؎

خفتہ در خاکش حکیمِ غزنوی　　　　از نوائے اُو دلِ مرداں قوی

غزنی کی خاک میں حکیم غزنوی (سنائیؒ) سو رہے ہیں، اُن کے نغمات سے مردانِ حق کے دل قوی ہوتے ہیں۔

آں حکیمِ غیب، آں صاحب مقام　　　　ترکِ جوشِ رومیؒ از ذکرش تمام

وہ حکیمِ غیب داں اور صاحبِ مقام تھے جس کے افکار نے رومیؒ کے نیم پختہ جذب کی تکمیل کی۔

اُو نقاب از چہرۂ ایماں کشود　　　　فکرِ من تقدیرِ مومن وانمود

سنائیؒ نے ایمان کے چہرے سے نقاب اُلٹا اور میرے (اقبالؒ کے) فکر نے مومن کی تقدیر کو نمایاں کر دیا۔

ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق　　　　اُو ز حق گوید من از مردانِ حق

ہم دونوں نے حکمتِ قرآں سے سبق پایا تھا، انہوں نے خدا کے متعلق گفتگو کی: میں نے خدا کے بندوں کے متعلق۔

(پس۔ چہ۔۸۶۲)

علامہ اقبالؒ ''پس چہ باید کرد'' کی ایک غزل میں فرماتے ہیں کہ آج مولانا رومیؒ کی تعلیمات کو عام کرنے کا وقت ہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اس کتاب کے لکھنے کے ساتھ یہ خدمت بھی انجام دے دی ہے۔ مولانا رومؒ پر لکھا گیا علامہ اقبالؒ کا کلام کافی طوالت کے ساتھ پایا جاتا ہے مگر اس سارے کلام کو یکجا کرنا اس کتاب کی وسعت سے زیادہ ہوگا۔ شاید علامہ اقبالؒ نے درج ذیل شعر ایسے ہی لوگوں کے لئے لکھا ہو ؎

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات　　　　تا زبزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

بہت سی عمریں کعبہ و بُت خانہ میں گذر جاتی ہیں تو پھر کہیں بزمِ عشق سے کوئی دانائے راز ظاہر ہوتا ہے۔ (ز۔ع۔ ۴۶۵)

حصہ دوم

دوسرا باب

رومیؒ اور وادئ عشق

وادئ عشق بسے دُور و دراز است ولے　　طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

وادئ عشق کا فاصلہ عموماً دُور اور دراز ہے لیکن کبھی کبھار سو سال کا راستہ ایک آہ میں طے ہو جاتا ہے۔ (اقبالؒ)

زیرِ نظر باب میں عشق کے عنوان پر مولانا رومیؒ کا وہ کلام جو زیادہ مشہور ہے، یکجا کر دیا گیا ہے تا کہ شائقین کو مثنوی کی بھاری بھر کم کتابوں میں تلاش کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ اُوپر لکھے ہوئے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق ایک ایسی قوت ہے جس کے ہوتے ہوئے بڑے بڑے کام چند لمحات میں طے ہو سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ لوگ عشق کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ایک اور شاعر کا درج ذیل شعر بھی اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

جائے کہ زاهداں بہ صد ماہ می رسند　　مستِ شرابِ عشق بہ یک آہ می رسند

وہ جگہ جس پر زاہد لوگ سینکڑوں مہینوں میں پہنچتے ہیں، مستِ شرابِ عشق وہاں ایک آہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ (غیر مثنوی)

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص جو باجماعت نماز ادا کرنے کا عادی تھا، ایک مرتبہ ایک نماز کے لئے مسجد میں دیر سے پہنچا، جب اس کو معلوم ہوا کہ نماز باجماعت ادا ہو چکی ہے تو جماعت نہ ملنے کے افسوس میں اس نے ایک سرد آہ بھری جس کا نور ساتویں آسمان تک پہنچا۔ مسجد میں موجود ایک بزرگ نے جب آسمان پر اس کی آہ کے نور کو ملاحظہ فرمایا تو دریافت کیا: ''یہ کس چیز کا نور ہے جو اس قدر بلندی پر گیا ہے۔'' جب جماعت قضا ہونے کا معاملہ اسے معلوم ہوا تو اس نے اس نمازی کو بُلا کر کہا کہ ''اگر تم مجھے اپنی آہ دے دو تو میں تمہیں اپنی نماز باجماعت کا ثواب دے دیتا ہوں۔'' ظاہر ہے کہ عشق میں بھری گئی ایک آہ کی کتنی قدر و قیمت

ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک دن ابلیس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فجر کی نماز سے پہلے جگا دیا کہ اُٹھیں اور نماز پڑھ لیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ ''تم تو لوگوں کی نمازوں کو قضا کروانے میں خوش ہوتے ہو پھر تم نے مجھے کیوں جگا دیا۔'' کہنے لگا کہ ''ایک دن آپ کی نماز قضا ہوئی تو آپ نے اس قدر آہ و زاری کی تھی کہ آپ کو اس قضا نماز کا ثواب کئی ہزار گنا زیادہ ملا تھا۔ آج میں نے یہ سوچا کہ آپ اپنی نماز کا عمومی ثواب لے لیں اور آپ کو کئی گنا زیادہ ثواب نہ مل جائے۔''

ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں صاحبِ عشق کو عام عابد اور زاہد سے کئی گنا زیادہ ثواب ملتا ہے اور کئی گنا درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ اعمال کا ثواب نیتّوں پر ہی مرتب ہوتا ہے۔ ایک عاشق کی نیت تو عام انسانوں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے، اس لئے عشق سے جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ دو انسانوں کے اعمال پر ملنے والے اجر میں اس قدر فرق ہو سکتا ہے جتنا کہ رائی اور پہاڑ میں ہوتا ہے اور یہ فرق ان کی عقل یا سوچ کے مطابق ہوتا ہے۔ (الحدیث)

اصطلاحِ عشق کی اِبتدا

عشق عربی لفظ ہے لیکن قرآن میں استعمال نہیں ہوا، اگرچہ بعض شعرائے جاہلیت کے کلام میں یہ لفظ آیا ہے۔ متاخرینِ شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کا بہت کم استعمال کیا ہے بلکہ عشق کی وہ اہم خصوصیات جو فارسی شاعری میں نظر آتی ہیں ان کا عربی شعراء کے کلام میں وجود ہی نہیں۔ فارسی شاعری میں عشق کی اہمیت اس لئے ہے کہ سب سے پہلے عشق کی خصوصیات کو مشرقی فلسفہ نے نمایاں کیا۔ شیخ الاشراق ''حکمۃ الاشراق'' میں لکھتے ہیں کہ:

ہر بلند نور کو نیچے والے نور پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہوتا ہے اور نیچے کا نور بلند نور سے محبت رکھتا ہے۔ جب بہت سے نور جمع ہو جائیں تو سب سے بلند نور نیچے کے نور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور نیچے کے نور کو بلند نور سے عشق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح احادیث میں آیا ہے کہ جنت میں ہر درجے کا جنتی اپنے سے اُوپر والے جنتی کو دیکھ کر خوش ہوگا، برعکس اس کے کہ یہاں اس دنیا میں نیچے والے لوگ اُوپر والوں کو دیکھ کر جلتے ہیں۔ نور الانوار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کو اپنے سوا تمام موجودات پر غلبہ ہے۔ وہ اپنی ذات کے سوا کسی سے عشق نہیں کرتا کیونکہ وہ سب سے زیادہ خوب صورت اور مکمل ہے، اس لئے اس کو اپنا ہی کمال نظر آتا ہے، چنانچہ وہ عاشق بھی ہے اور معشوق بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشقِ الٰہی میں جو لطف آتا ہے وہ کسی اور کے عشق میں نہیں آتا۔ تمام عالم مل کر ایک عالم بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا عشق سب عالم سے سوا ہے۔

عشق کے معنی کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزوِ ذات بنانا ہے۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اپنے سامنے ایک نصب العین رکھا جائے اور اس کے گرد اپنی ہستی کو گھماتا رہے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور محبوب میں شانِ انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عشق سے خودی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ سوال

کرنے سے عشق میں ضُعف اور نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں: ایک دستورِالٰہی کی اطاعت، دوسرے ضبطِ نفس اور تیسرے نیابتِ الٰہی، جو ضبطِ نفس کی ارتقائی منزل حاصل کر لینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

اربابِ رسائل ''اخوان الصفا'' نے لکھا ہے کہ عشق اپنے محبوب کے ساتھ متحد ہونے کی سخت کوشش کا نام ہے، اسی لئے عاشق کو کسی حالت پر قناعت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے عشق میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے کہ میں اپنے محبوب سے انتہائی قرب حاصل کرنے کے بعد بھی محسوس کرتا ہوں کہ دل اس کا مشتاق رہتا ہے۔ پیار کے مختلف زاویئے اختیار کرنے سے عشق بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں کہا ہے کہ دل کی پیاس اس وقت بُجھ سکتی ہے کہ (بجائے جسموں کے) دونوں کی روحیں آپس میں مل جائیں۔ مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ اگر ایک کمرے میں دو شمعیں فروزاں کی جائیں تو ان دونوں کی روشنیاں باہم متحد ہو جاتی ہیں اور ایک روشنی کو دوسری شمع کی روشنی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دو روحوں کا اتحاد ہو تو دونوں روحوں کو روحانی اتحاد اور قرب بھی حاصل ہو سکتا ہے اور جسموں کے قرب میں وہ رُوحانی قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ قرب کی تشنگی کے پائے جانے کا ذکر کرنے کے بعد صاحبِ اخوان الصّفا لکھتے ہیں کہ اتحاد صرف رُوحانی ذریعے سے ہو سکتا ہے کیونکہ یہ رُوحانی امور کا ایک الگ خاصہ ہے۔ اس مثال سے ثابت ہوا کہ جسموں کے اتحاد سے ایک جسم دوسرے کو چھو تو لیتا ہے لیکن محض جسموں کے ملنے سے حقیقی اتحاد نہیں ہوتا، اتحاد تو صرف رُوحانی چیزوں میں ہوتا ہے۔

(شرح حکمۃ الاشراق، ص ۳۳۸ سے ۳۴۰)

اشراقی فلسفے کا یہی عشق ہے جس کو ہمارے صوفیوں نے وحدت الوجود کی شکل میں لیا ہے۔ اشراقی فلسفے کے نظریات حسب ذیل ہیں۔ ان کا پہلا نظریہ ہے کہ کائنات کی بنیاد عشق اور محبت پر قائم ہے کیونکہ دنیا میں علت (کسی سبب، وسیلہ اور ذریعہ کو کہتے ہیں یہاں علت سے مراد معشوق ہے) اور معلول کا سلسلہ قائم ہے (معلول کہتے ہیں جس پر عمل کیا جائے یعنی عاشق) اور ہر علت (معشوق) اپنے معلول (عاشق) سے محبت رکھتا ہے اور علت یعنی معشوق کو اس پر غلبہ حاصل ہوتا ہے چونکہ ایک ہی چیز دونوں حیثیتوں سے عِلت بھی ہوتی ہے اور معلول بھی، اس لئے ہر چیز میں قہر (یعنی جوش، جذبہ، ولولہ یا وضع داری) اور مہر (محبت، الفت، دوستی، یارانہ، ہمدردی، اخلاص بھی) پائے جاتے ہیں، البتہ بعض میں قہر اور بعض میں مہر زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر شے کی اس کے ساتھی سے محبت لازمی طور پر ہوتی ہے اور یہی عشق ہے۔ عشق کے اس عالم گیر نظریہ کو رومیؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش   جُفت جُفت و عاشقانِ جُفت خویش

اس ازلی حکم کی وجہ سے دنیا کے تمام اجزا جوڑے جوڑے ہیں اور اپنے جوڑے کے عاشق ہیں۔ (۳/۴۱۸)

ہست ہر جُزوے بعالم جفت خواہ   راست ہمچو کہربا و برگِ کاہ

دُنیا کی ہر چیز جوڑے کی خواہش مند ہے، بالکل ایسے ہی جس طرح کہربا (بجلی) اور گھاس کا تنکا۔ (۳/۴۱۸)

آسماں گوید زمیں را مرحبا با توام چوں آہن و آہن رُبا

آسمان زمین کو کہتا ہے خوش آمدید! میں تیرے لئے ایسا ہی ہوں جیسے لوہا اور مقناطیس۔ (۴۱۸/۳)

میل ہر جزوے بہ جزوے ہم نہد زاتحاد ہر دو تولیدے جہد

ہر جزو میں دوسرے جزو کا میلان رکھا ہے، دونوں کے اکٹھا ہونے سے تولید (پیدائش) ہوتی ہے۔ (۴۱۹/۳)

ہر یکے خواہاں دگر را ، ہمچو خویش از پئے تکمیلِ فعل و کارِ خویش

ہر ایک دوسرے کو جان کی طرح چاہتا ہے، اپنے فعل اور کام کو مکمل کرنے کے لئے۔ (۴۱۹/۳)

دورِ گردونہا زموجِ عشق داں گر نبودے عشق بفروزے جہاں

آسمانوں کی گردش عشق کی موج سے سمجھ، اگر عشق نہ ہوتا تو جہاں ٹھٹھر جاتا۔ (۳۸۷/۵)

کے جمادے محو گشتے در نبات کے فدائے روحِ گشتے نامیات

جماد (پتھر وغیرہ) نبات (سبزی) میں کب فنا ہوتا ہے، نمو پانے والی روح پر کب فدا ہوتی ہیں؟ (۳۸۷/۵)

ہر یکے برجا ترنجیدے چو یخ کے بُدے پرّاں و جویاں چوں ملخ

ہر ایک اپنی جگہ پر برف کی طرح سکڑ جاتا ہے، ٹڈی کی طرح کب پرواز اور جستجو میں ہوتا ہے؟ (۳۸۷/۵)

اشراقی فلسفہ اور عشق

شعرائے ایران نے عشق کے اس نقطۂ نظر سے کائنات کو دیکھا تو جن چیزوں میں باہم عشق و محبت کی کشش زیادہ نظر آئی، انہیں باہم عاشق اور معشوق بنا دیا۔ ذرّہ و آفتاب، تنکا اور بجلی، کبک و چاند، گل و بلبل، پروانہ و شمع، نیلوفر و آفتاب سب کے سب باہم عاشق اور معشوق ہیں۔ دوسرے ممالک میں ایک آدھ چیز کو عاشق مانتے ہیں لیکن فارسی شاعروں نے تمام کی تمام کائنات کی چیزوں کو عاشق و معشوق بنا دیا۔ مولانا شبلیؒ ''شعر العجم'' میں لکھتے ہیں کہ یہ عالمگیر حُسن کا اثر تھا کہ ایران میں جمع ہو گیا لیکن حقیقتاً یہ فلسفہ اشراق کا اثر تھا کہ جس نے عشق کو عالمگیر (کائناتی) نظریہ دیا۔

اشراقی فلسفے کا نظریہ ہے کہ عِلّت معشوق ہوتی ہے اور معلول عاشق ہوتا ہے۔ عِلّت (معشوق) میں قہر اور معلول (عاشق) میں مہر کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ زمین اور زمین کی پیداوار پر سب سے زیادہ اثر آسمان کا پڑتا ہے، اس لئے آسمان اس کی عِلّت اور زمین معلول ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آسمان میں قہر اور زمین میں مہر (عاجزی) کا جذبہ زیادہ موجود ہے۔ ایرانی شاعر آسمان کی جفاکاری (بے مہر آسماں) اور بے مہری کی شکایت جو کرتے ہیں وہ اسی اشراقی فلسفہ کا اثر ہے جو علت کو علتِ قاہرہ قرار دیتے ہیں۔

چھٹی صدی میں صوفی شاعروں کی بہتات

صوفیوں کا قول ہے کہ عشق اتحاد چاہتا ہے۔ عاشق جب تک اپنے محبوب سے متحد نہ ہو جائے اس کو کسی چیز

سے تسکین نہیں ہوتی۔ جسم کا اتحاد جسم سے ہو تو اس میں فرحت نہیں ہوتی بلکہ روح کا اتحاد روح سے ہو سکتا ہے اور اس میں فرحت بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمہ تن روح ہے اور اس سے اتحاد کے لئے جسم کو فنا کرنا ضروری ہے اور صوفیوں کے مجاہدات کی بنیاد اسی نظریۂ عشق پر ہے۔ حسن و جمال میں خدا سے بڑھ کر کوئی ہستی نہیں۔ اس کا فیض جب کائنات پر پڑتا ہے تو دنیا اس سے روشن ہو جاتی ہے، اسی لئے ہر شے میں جو حُسن نظر آتا ہے وہ عارضی اور مستعار ہے۔ اگر دیوار پر سورج کی شعاع پڑے تو جب وہ سورج غائب ہو جاتا ہے تو سورج کا نور یعنی روشنی بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اصل میں دیوار روشن نہیں تھی لیکن دیوار پر سورج کا پرتو پڑ گیا تھا۔ مولانا نے فرمایا ہے ؎

گر شود پُرنور روزن یا سرا　　تو مداں روشن مگر خورشید را

اگر روشن دان یا گھر نور سے بھر جائے تو اس کو روشن نہ سمجھ بلکہ خورشید کو روشن سمجھ۔ (۳۳۸/۱)

چھٹی صدی میں تصوّف اور فلسفہ کو بہت ترقی ہوئی اور تاتاریوں کے ہنگامے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا اور دُنیا کی بے ثباتی اور بے قدری سب کو نظر آنے لگی۔ اس حال میں لوگوں نے خدا سے لو لگانی شروع کر دی۔ اس کے بعد مولانا رومیؒ، سعدی، واحدی اور عراقی وغیرہ پیدا ہوئے۔ امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے فلسفہ کو مقبولِ عام بنا دیا، چنانچہ اس زمانے میں عقل اور عشق کا حریفانہ مقابلہ ہوا۔ فلسفہ اور علم الکلام استدلال کے ذریعے خدا کی راہ دکھاتا رہا اور تصوفِ عشق اور محبت سے اس راہ کو طے کرتا رہا۔ مولانا رومیؒ فلسفی بھی تھے اور اہل تصوف بھی، مگر آپ نے عشق و محبت کی راہ کو ان دونوں راہوں میں سے بہتر خیال کیا ہے۔ اس دَور میں عقل کا دَور دَورہ ہے اور عشق بالکل مُردہ ہو چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی توجہ اُن علوم کی طرف ہوئی جہاں ان کو مادی فائدہ نظر آتا ہے ؎

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے　　فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

(اقبالؒ) (ب۔ج۔ ۳۳۵)

جواناں را بد آموز است ایں عصر　　شبِ ابلیس را روز است ایں عصر

جوانوں کو یہ زمانہ برائی کی طرف لے جاتا ہے، ابلیس کی رات کے لئے یہ زمانہ دن ہے۔ (اقبالؒ) (ا۔ح۔ ۹۷۷)

بہ دامانش مثالِ شعلہ پیچم　　کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

اس زمانے کے دامن سے میں شعلے کی طرح لڑ رہا ہوں کیونکہ یہ زمانہ بے نور اور بے سوز ہے۔ (اقبالؒ) (ا۔ح۔ ۹۷۷)

علامہ نے اس دَور میں یہی کام کیا جو قدیم فتنے کے زمانے میں مولانا رومیؒ نے کیا تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

چو رومیؒ در حرم دادم اذاں من　　ازو آموختم اسرارِ جاں من

رومیؒ کی طرح میں نے حرم میں اذان دی، اس سے ہی میں نے روح کے راز معلوم کئے۔ (اقبالؒ) (ا۔ح۔ ۹۳۸)

بہ دورِ فتنۂ عصر کہن اُو　　بہ دورِ فتنۂ عصر رواں من

پرانے فتنے کے زمانے میں اس نے کام کیا اور اس دور کے فتنوں پر میں نے کام کیا۔ (اقبالؒ) (ا۔ح۔ ۹۳۸)

علامہ نے عشق کو عقل پر کیوں ترجیح دی

(آپ نے عشق کو درج ذیل وجوہات پر ترجیح دی)

۱- عشق کی بنیاد عقیدہ کی وحدت اور یک رنگی پر ہے اور وہ ہے لَاالٰــہَ اِلَّا اللّٰـــہ۔ اس عقیدے کی وحدت پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عمل کیا اور فتح یاب رہے مگر عقل والوں میں یہ یک رنگی نہیں پائی جاتی ۔

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل　　بیا کہ عشق مسلماں و عقل زناریست

ہر زمانے میں عقل کے تراشوں کو توڑا گیا، ادھر دیکھ کہ عشق مسلمان ہے اور عقل زناری ہے۔　(ز۔ع۔۴۶۸)

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے　　عشق بیچارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

۲- عشق کو اختیار کرنے والی دوسری وجہ۔ علامہ کا خیال ہے کہ ایمان و یقین انسان کو آمادۂ عمل کرتا ہے، جو عقلی نظریات سے پیدا ہونا مشکل ہے بلکہ انسان شک اور تذبذب میں مبتلا رہتا ہے اور عقل تو حقیقت میں راہزنی کرتی ہے وہ مکر وفریب اور حیلہ سازی سے کام لیتی ہے ۔　(ب۔ج۔۳۵۲)

علاجِ ضعفِ یقین ان سے ہو نہیں سکتا　　غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

(ب۔ج۔۳۲۶)

فریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد　　کہ میرِ قافلہ و ذوقِ راہزنی دارد

عقل فریبِ کشمکش کو دیکھنے والی ہوتی ہے کہ وہ میرِ قافلہ بھی ہے، اس کو راہزنی کا شوق بھی ہے۔　(پ۔م۔۳۳۲)

نشان راہ زعقلِ ہزار حیلہ مپرس　　بیا کہ عشق کمالِ یک فنی دارد

خدا کی راہ کا نشان ہزار حیلے والی عقل سے نہ پوچھ، آ کہ عشق اس منفرد فن کا کمال رکھتا ہے۔　(پ۔م۔۲۳۳)

عشق صید از زورِ بازو افگند　　عقل مکّار است و دامے می زند

عشق اپنے شکار کو زورِ بازو سے مارتا ہے، عقل مکار ہے اور جال میں پھنسا لیتی ہے۔　(ا۔ح۔ ۱۰۹)

۳- تیسری وجہ جس کی خاطر علامہ نے عشق کا انتخاب کیا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی بھی کام کے عملی میدان میں کامیابی کے لئے جرأت اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اہلِ عشق میں موجود رہتی ہے۔ ایسی جرأت اور استقامت اہلِ عقل میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ عشق آگ میں فوراً کود پڑتا ہے، مگر عقل غور وفکر میں رہ جاتی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق کے برعکس عقل خطرات سے گھبراتی ہے اور جرأت اور ہمت کی کمی سے فتح مند نہیں ہوتی۔　(ب۔د۔ ۲۷۸)

میشود ہر سنگ رہ اُو را ادیب　　میشود برق و سحاب اُو را خطیب

راستے کا ہر پتھر اس کے لئے ادیب ہے، بجلی اور بادل اس کے خطیب بن جاتے ہیں۔　(ج۔ن۔۶۱۰)

چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست　　　　لیک اُو را جرأت رندانہ نیست

عقل کی آنکھ ذوقِ نگاہ سے تو محروم نہیں، لیکن اس میں جرأتِ رندانہ نہیں ہوتی۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

پس ز ترس راہ چوں کورے رود　　　　نرم نرمک صورتِ مورے رود

عقل راستے کے خوف سے چونکہ کوری ہو جاتی ہے، اس لیے چیونٹی کی طرح آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

کارش از تدریج می یابد نظام　　　　من نہ دانم کے شود کارش تمام

عقل کے کام بتدریج پورے ہوتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ اس کے کام کس طرح مکمل ہوں گے۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عقل کے کام برسوں میں ہوتے ہیں اور اس کے مقابلے میں عشق اپنے معاملات کو آنِ واحد میں پورا کر لیتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے باوجود بے سر و سامانی کے دنیا بھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ آج کا صوفی خود کو محض محویّتِ ذات میں محدود کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عشق تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

می نداند عشق سال و ماہ را　　　　دیر و زود و نزد و دور و راہ را

عشق سال اور ماہ کو نہیں جانتا اور نہ ہی جلد اور دیر کو اور نہ راستے کی نزدیکی اور دُوری کو جانتا ہے۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

عقل در کوہے شگافے میکند　　　　یا بگردِ او طوافے میکند

عقل تو پہاڑ میں شگاف کر سکتی ہے یا اس کے گرد (کسی حل کے لئے) طواف کرتی ہے۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود　　　　دل سریع السیر چوں ماہے بود

عشق کے سامنے تو پہاڑ ایک تنکے کی طرح ہوتا ہے اور اس کا دل چاند کی طرح جلد چکر کاٹ لیتا ہے۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست　　　　قوتش از سختیء اعصاب نیست

عشق کا زور ہوا، خاک اور آب سے نہیں، اس کی قوت اعصاب کی مضبوطی سے نہیں۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

عشق با نانِ جویں خیبر کشاد　　　　عشق در اندام مہ چاکے نہاد

عشق تو جو کی روٹی کھا کر درّۂ خیبر اُکھاڑ دیتا ہے، عشق چاند کے جسم کو چاک کر دیتا ہے۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

کلّہء نمرود بے ضربے شکست　　　　لشکر فرعون بے حربے شکست

نمرود کا سر (یعنی غرور) بغیر ضرب کے توڑ دیتا ہے اور فرعون کے لشکر کو بغیر جنگ کے شکست دیتا ہے۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

عشق سلطان است و برہانِ مُبیں　　　　ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں

عشق بادشاہ ہے اور حق کی کھلی دلیل ہے، دونوں جہاں عشق کے تابع ہیں۔ (ج۔ن۔۶۱۰)

عقل ایک تحقیقی قوت ہے جب کہ عشق ایک تخلیقی قوت ہے

ایک مسلمان عقل کے ذریعے تحقیقی معلومات اور حجابات کو اُٹھا دیتا ہے مگر عشق میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس

میں تخلیقی کارنامے نظر آ سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے غار میں خلوت نشیں ہو کر خود اپنی ذات یعنی خودی کی تخلیقی قوتوں کا مشاہدہ کیا اور مسلمانوں کی ایک نئی قوم پیدا کر دی۔ علامہ اقبالؒ نے آپ ﷺ کے اس کمال کی بہت شرح کی ہے اور خودی سے تخلیقی مقاصد حاصل ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ تخلیقی مقاصد کی تشریح کافی طوالت طلب ہے۔ اس موضوع پر ہماری تصنیف ''رابطہ شیخ'' میں صفحہ نمبر ۱۹۶ پر ''تخلیق رابطے میں ایک لازمی جزو ہے'' کا مطالعہ کریں۔ اس کے علاوہ ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' صفحہ نمبر ۱۱۱ پر ''انسانی روح اگر چاہے تو ہر شے سامنے آجاتی ہے'' میں تخلیق کا مخفی راز بیان کیا گیا ہے اور آپ اس کو بہت دلچسپ انداز میں پائیں گے۔ علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ عشق پر کلام تنگیٔ قرطاس کے باعث اس جگہ دینا ممکن نہیں اس لئے مذکورہ تصانیف کے علاوہ ہماری تصنیف ''عقل و عشق اور فلسفہء خودی'' جو اِن شاء اللہ تعالیٰ عنقریب زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے والی ہے، کا مطالعہ فرمائیں۔

اگر عشق نہ بودے بخدا کس نہ رسیدے

(اگر عشق نہ ہوتا تو خدا تک کوئی نہ پہنچتا)

حضرت بوعلیؒ قلندر کا انوکھا زاویہء فکر ہے کہ اگر عشق نہ ہوتا تو کوئی بھی شخص خدا تک نہ پہنچ سکتا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عقل کی نظر اسباب پر ہوتی ہے اور عشق اسباب سے آزاد ہے اور تلاطمِ سمندر میں کود پڑتا ہے۔ عشق کی اگر کوئی پونجی ہے تو حوصلہ اور ہمت ہے اور اس کی نظر اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر ہوتی ہے۔ صوفی بھی چونکہ عاشق ہوتا ہے، اس لئے اس کی نگاہ سے اسباب مرتفع ہو جاتے ہیں اور جسے مسبب الاسباب کی طرف سے مدد مل جائے تو اس کی راہ سے تمام مشکلات اُٹھ جاتی ہیں۔ درج ذیل اشعار میں عقل کی نارسائی اور عشق کی وسیع سلطنت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان اشعار میں مولانا رومیؒ کے علاوہ مولانا عطارؒ، بوعلی قلندرؒ اور علامہ اقبالؒ کے نظریات بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ حضرت بوعلی قلندرؒ کا یہ قول کتنا حسین ہے کہ اگر عشق نہ ہوتا تو کوئی شخص خدا تک نہ پہنچ سکتا بلکہ راقم الحروف کا خیال ہے کہ عشق نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کائنات کو تخلیق ہی نہ کرتا۔

شیخ فریدالدین عطارؒ اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

عقل در اسباب می دارد نظر　　　عشق می گوید مسبب را نگر

عقل کی نظر اسباب پر ہوتی ہے مگر عشق کہتا ہے کہ مسبّب الاسباب یعنی اللہ کو دیکھ! (عطارؒ)

عقل گوید دنیا و عقبیٰ بجو　　　عشق می گوید بجز مولیٰ مجو

عقل کہتی ہے کہ دنیا اور آخرت کو طلب کرو، عشق کہتا ہے مولیٰ کے سوا کچھ تلاش نہ کرو۔ (عطارؒ)

عقل گوید شادی و مرحم طلب　　　عشق گوید درد و سوز و غم طلب

عقل کہتی ہے کہ خوشی اور مرحم طلب کرو، عشق کہتا ہے کہ درد و سوز اور غم کو طلب کرو۔ (عطارؒ)

عشق گوید امتحان خویش کن　　عقل می گوید کہ خود را پیش کن

عقل کہتی ہے کہ اپنے آپ کو آگے کرو، عشق کہتا ہے کہ اپنا امتحان کرو۔ (ا۔و۔ر۔ ۱۰۹)

عشق گوید بندہ شو آزاد شو　　عقل گوید شاد شو آباد شو

عقل کہتی ہے کہ خوش رہو اور آباد رہو، عشق کہتا ہے کہ بندۂ خدا بنو اور آزاد رہو۔ (ا۔و۔ر۔ ۱۰۹)

حضرت بوعلی قلندرؒ تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر عشق نہ ہوتا تو کوئی شخص خدا تک نہ پہنچ سکتا۔

حسنِ ازلی پردہ زرخ بر نہ کشیدے　　اگر عشق نہ بودے بخدا کس نہ رسیدے

اگر عشق نہ ہوتا تو کوئی خدا تک نہ پہنچ سکتا، حُسنِ ازلی اپنے چہرے سے پردہ نہ ہٹاتا۔ (بوعلی)

عشق کو در لامکاں جولاں کند　　عشق کو بے بال و پر طیراں کند

عشق وہ ہے جو بغیر بال و پر کے اُڑتا ہے، عشق وہ ہے جو لامکاں میں جولانی کرتا ہے۔ (بوعلی)

عشق کو تا سینہ پُر سودا کند　　عشق کو تا چشمِ دل بینا کند

عشق ہی دل کی آنکھ کو بینا کرتا ہے، عشق ہی دل کو سودا یعنی جنوں سے بھر دیتا ہے۔ (بوعلی)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق　　ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
(ب۔د۔ ۱۵۶)

عشق سوز زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے　　عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
(ب۔د۔ ۱۵۶)

عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام　　مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
(ب۔ج۔ ۳۸۶)

مولانا رومیؒ نے مجنوں کے عشق کی مثال پیش کی

عشق کے بارے میں صوفیا نے بہت کلام کیا ہے۔ یہ عشق شرابِ حیات ہے۔ یہ کیفیت وجد کی اُس حالت تک لے جاتی ہے جو عاشق کو خدا کے قریب کرتی ہے۔ سچا عشق تمام خود غرضانہ مقاصد سے مبرّا ہوتا ہے۔ ایک صاحبِ عشق جب آتا ہے تو اپنے محبوب کی طرف سے آتا ہے اور اگر اسے پوچھو کہ اب کدھر جاؤ گے تو وہ یہ کہتا ہے اپنے محبوب کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ اس کا اوڑھنا، بچھونا اور لباس محبوب ہی ہے، اُسے ہمیشہ اپنے محبوب کی تلاش رہتی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے نام کی رٹ لگاتا چلا جاتا ہے۔

مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ مجنوں کو ایک صحرا نورد نے دیکھا کہ وہ صحرا میں تن تنہا بیٹھا ہے اور ریت کو کاغذ بنا کر کچھ لکھ رہا ہے۔ اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو خط لکھ رہا ہے۔ جب وہ شخص مجنوں کے قریب آیا اور اس

سے صحرا میں بیٹھ کر زمین پر لکھنے کے متعلق دریافت کیا تو مجنوں نے کہا کہ ''میں کسی کو خط نہیں لکھ رہا بلکہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اس طرح بار بار لیلیٰ کا نام لکھنے سے میرے دل کو تسلی ہوتی ہے۔'' مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میرے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے یعنی ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' (الرعد: ۲۸) اسی طرح مجنوں اپنے دل کی پیاس لیلیٰ کے نام کو بار بار لکھنے سے بجھا رہا تھا۔ (درج ذیل اشعار ''ہفت مسئلہ'' میں دیئے گئے ہیں)۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　در بیابانِ غمش بہ نشستہ فرد

کسی صحرا نورد نے مجنوں کو دیکھا کہ وہ بیابانِ غم میں الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔

ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم　　می نمودے بہرِ کس نامہ رقم

ریت کو کاغذ بنائے ہوئے اور انگلیوں کو قلم بنائے ہوئے تھا، لگ رہا تھا کہ وہ کسی کو خط لکھ رہا ہے۔

گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں　　می نویسی نامہ بہرِ کیست ایں

پوچھا کہ اے عاشق مجنوں یہ کیا ہے، تُو یہ خط کس کو لکھ رہا ہے؟

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ می کنم　　خاطرِ دل را تسلی می دہم

مجنوں نے کہا کہ میں لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اس طرح اپنے دل کی خواہش کو تسلی دے رہا ہوں۔

عشق پر صوفیہ کے نظریات (عشق کے چھے درجات)

عشق وہ حرکی قوت ہے جس کے بغیر عاشق ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ پروانے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا سوزِ دروں عشق ہی کی ایک صورت ہے۔ عشق سیدھی سڑک پر نہیں چل سکتا بلکہ مرکزِ آرزو کے گرد طواف کرتا ہے۔ (پروانہ بھی شمع کے گرد طواف ہی تو کرتا ہے) تصوف میں عشق کے مدارج کو درج ذیل چھے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱- حُسن　　۲- طواف　　۳- ارتکاز (ایک مرکز کی طرف مرتکز ہونا)

۴- قربانی　　۵- جست (چھلانگ)　　۶- وصال (جا ملنا)

عشق کا پہلا درجہ ''حُسن'' ہے

سمندر میں طوفان اُٹھتا ہے تو اس کے اردگرد ہواؤں اور بادلوں کے دائرے ہوتے ہیں۔ طوفان میں ہوا تیز ہوتی ہے مگر طوفان کا مرکز جسے طوفان کی آنکھ کہا جاتا ہے، اس جگہ ہوا تیز نہیں ہوتی بلکہ سکون اور خاموشی ہوتی ہے، اسی طرح حسنِ ازل کا جلوہ دکھائی نہیں دیتا (یہ جلوہ کس نوعیت کا ہوتا ہے اس کی تفصیل مکتوباتِ ربانی میں درج کی گئی ہے) جب تک یہ خواہشات کے پردے اُٹھ نہ جائیں تو اس وقت تک حسن کا آفتاب نظر نہیں آتا۔

خواہشات، زُہد و تقویٰ سے ختم کی جاتی ہیں۔ دوسرا طریقہ عشق کی مدد سے اختیار کیا جاتا ہے جو زیادہ تیز ہوتا ہے۔ مولانا ثناء اللہ پانی پتیؒ نے لکھا ہے کہ وہ امانت جو اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں پر نازل کرنا چاہی تھی اور جسے اُٹھانے سے سب نے انکار کر دیا "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ" یعنی ہم نے اس امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا (الاحزاب:۷۲) سے مراد نماز و روزہ یا عبادات کی امانت نہ تھی بلکہ عقل اور عشق کی امانت تھی۔ عقل بذریعہ استدلال اللہ تعالیٰ کی بُرھان کو تلاش کرتی ہے اور عشق تو ایک آگ ہے جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتی ہے اور حسنِ ازل کو (مختلف شکلوں میں) بندوں کے سامنے کر دیتی ہے۔

حسن سے صرف وہی شخص محبت کر سکتا ہے جو اسے دیکھنے پر قادر ہو کیونکہ حُسن کا نظارہ کرنا بھی خود ایک مسرت ہے۔ جب حسن کا جلوہ منکشف ہوتا ہے تو انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے عشق کرے۔ یہ محبت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ انسان کی روح کا روحِ کل (یعنی اللہ) میں خاص ربط ہوتا ہے۔ ایسی محبت جب توانا اور مضبوط ہو جائے تو عشق کہلاتی ہے۔ حسنِ ازل مظاہرِ حیات (یعنی ہر شے) میں جلوہ گر ہے۔ اس نورِ محکم پر علامہ اقبالؒ کا کلام بہت طویل ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی (ب۔د۔۸۴)
محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ عشق (ب۔د۔۹۳)

مولانا رومؒ نے عشق کے جس تصور کو اپنے افکار، اپنے جذبات، اپنے عقیدے اور اپنے عمل کا محور بنایا ہے، وہ انسانیت کا ہمہ گیر اور دل پذیر تصور ہے۔ رومیؒ کی اصطلاح میں عشق کسی محبوبہ یا پری کی محبت کی مثل نہیں بلکہ وہ ایک لافانی جذبہ ہے جو کائنات کے حسن کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور اس خیرِ مطلق سے فروغ حاصل کرتا ہے۔

عشق کا دوسرا درجہ "طواف" ہے

عشق کا دوسرا درجہ طواف ہے، جہاں عاشق محبوب کے گرد ایک پروانے کی طرح طواف کرنے لگتا ہے۔ اس میں اگرچہ پروانہ شمع کے ساتھ مس نہیں کرتا لیکن اس طواف میں خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز　　سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے　　اُلجھ کر سلجھنے میں لذّت اسے
(ب۔ج۔۴۱۸)

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ عشق ایک دائرے میں گھومتا ہے اور محبوب کے گرد پروانہ وار طواف کرتا ہے۔ چنانچہ اقبالؒ کے ہاں ایک طرف تو پوری کائنات مرکزِ عظمٰی کے گرد بے پناہ رفتار سے طواف کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور دوسری طرف مردِ مومن کائنات کی اس رفتار سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے کہ وہ تو پوری کائنات کی جہدِ مسلسل کا اعلامیہ بن گیا ہے، جیسے علامہؒ فرماتے ہیں ''ایام کا راکب نہیں مرکب ہے قلندر'' ؎

عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم　　عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیروبم
(ب۔ج۔۳۲)

بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات　　فقر مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
(پس۔چہ۔۸۱۸)

عشق کا تیسرا درجہ ''ارتکاز'' ہے

مذکورہ بالا طواف میں پروانے کی رفتار پہلے کم ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے اور یہاں عاشق بھی مقصود کو مرکز بنا کر اس کے گرد گھومتا ہے۔ طواف کا یہ کام ہے کہ وہ ارتکاز (مرکز کی طرف رجوع کرے) کے لئے ذہن ہموار کرتا ہے اور ارتکازِ ذہن اور جسم کی رفتار کے فرق کو مٹا کر اسے ہم آہنگ کر دیتا ہے اور اس عبارت کے مفہوم کو سمجھتا اور اس کی افادیت حاصل کرتا ہے۔ شیخ فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ عاشق کو اپنی ہستی سے گزرنا پڑتا ہے۔ عشق سوائے محبوب کے ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے ؎

در مقامِ سرمدی پیوستن است　　عشق از ہستیء خود وارستن است

عشق اپنی ہستی سے گذر جانا ہے اور مقامِ سرمدی سے پیوست ہونا ہے۔

ہر چہ جز معشوق بود آں را بسوخت　　در دِلِ عاشق چوں عشق آتش فروخت

عشق جب عاشق کے دل میں آگ لگا دیتا ہے تو معشوق کے علاوہ ہر چیز کو جلا دیتا ہے۔

عشق کا چوتھا درجہ ''قربانی'' ہے

قربانی کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین چیز کو قربان کر دینا۔ اس قربانی سے انسان اپنے اندرونی دُکھوں سے نجات پا لیتا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ'' یعنی تم بھلائی کو ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ چیز خرچ نہ کر دو، جس کو تم سب سے زیادہ عزیز جانتے ہو (آلِ عمران : ۹۲) صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی قربانیوں کا نقشہ قابلِ دید تھا، جس کو جو چیز سب سے زیادہ

پیاری تھی، اس نے وہ اللہ کی راہ میں دے دی (مثالیں لاتعداد ہیں، جن کا اس جگہ ذکر ممکن نہیں ہے)۔

عشق کا پانچواں درجہ "جست" ہے

اس میں فرد خارج سے یکا یک منقطع ہو کر خود فراموشی کی حالت میں چلا جاتا ہے۔ جب عشق خود فراموشی کی حالت میں آ کر لحہ بھر کے لئے رُکتا ہے تو وہ دراصل اپنی تمام تر قوتوں کو جمع کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک جست لگا کر حسنِ ازل سے وابستہ ہونے کی کوشش کرتا ہے، جیسا کہ علامہؒ نے فرمایا ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (ب۔ج۔۳۱۰)

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی (ب۔د۔۲۷۸)

اس جست کا ایک یہ بھی منظر نظر آتا ہے کہ عاشق ایک جہاں کے زمان و مکاں سے نکل کر دوسرے جہاں میں چلا جاتا ہے، جہاں کے معاملات اس جہاں سے بہت مختلف ہیں۔ معراج النبی ﷺ اس کی ایک مثال ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں ؎

درگذشتم از حدِ ایں کائنات پا نہادم در جہانِ بے جہات

میں اس کائنات کی حد سے گذر گیا اور ایسے جہان میں قدم رکھا جہاں اطراف کا تصور نہیں۔

بے یمین و بے یسار اُست ایں جہاں فارغ از لیل و نہار است ایں جہاں

اس جہاں میں دایاں اور بایاں نہیں، اس جہاں میں رات اور دن نہیں۔

پیشِ اُو قندیلِ ادراکم فسرد حرفِ من از ہیبت معنی بمرد

وہ جہاں دیکھ کر میری سمجھ کا چراغ گل ہو گیا، معنی کی ہیبت سے یارائے الفاظ نہ رہا۔

ہر زماں اُو را کمالِ دیگرے ہر زماں اُو را جمالِ دیگرے

ہر وقت اس کا کمال ایک اور ہی طرح کا ہے، ہر وقت اس کا جمال بھی اور ہی طرح کا ہے۔

نشانِ راہ زعقلِ ہزار حیلہ مُپرس بیا کہ عشق کمالِ یک فنی دارد

خدا کی راہ ہزار حیلہ کرنے والی عقل سے نہ پوچھ، آ کہ عشق اِس منفرد فن میں کمال رکھتا ہے۔

عشق کا چھٹا درجہ "وصل" ہے

اِبتدائی دور میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وصال ترکِ خود کے بغیر ممکن نہیں۔ آئینۂ دل کو صاف کرنا بھی ضروریاتِ وصال میں سمجھا جاتا تھا، اس کے علاوہ رذائل کی تطہیر اور مراقبے کروائے جاتے تھے۔ ذکر و فکر کے بعد

تعطلِ احساس کی منزل آتی ہے۔ اس میں وجد و حیرت، قبض اور بسط کے معاملات بھی دیکھنا ہوتے ہیں۔ دسویں صدی کے بعد سریانی تصورات کے دور میں عشق کو بہت اہمیت دی جانے لگی مگر اب صوفیوں کے طریقے نے عشق کو ذریعۂ وصال بنا دیا ہے۔ پہلے زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ خودی کو راہ سے ہٹا دیا جائے تو وصال حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ خودی علامہ اقبالؒ والی خودی سے مختلف تھی، جس کے معنی خود، وجود، انا یا شخصیت کے ہیں۔ چنانچہ حافظؒ نے فرمایا ہے کہ ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

عاشق اور معشوق میں کوئی چیز حائل نہیں ہے، حافظ تُو اپنا حجابِ خودی خود ہی درمیان سے ہٹا دے۔

علامہ اقبالؒ نے خودی اور بے خودی میں فرق واضح کیا ہے، جس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہماری تصانیف بالخصوص ''رابطۂ شیخ'' کا مطالعہ فرمائیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

تُو خودی از بے خودی نشناختی　　　خویش را اندر گماں انداختی

تُو نے خودی کو بے خودی سے الگ نہیں پہچانا، خود کو خیالات و گمان میں ڈال دیا ہے۔　　(ا۔و۔ر۔ ۸۷)

جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو　　　یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو

تری خاک میں خودی کے نور کا جوہر ہے، تیرے فہم و ادراک کی روشنی خودی کی ایک شعاع ہے۔　(ا۔و۔ر۔ ۸۷)

علامہ اقبالؒ کے تصورِ خودی کے سلسلے میں عقل اور عشق دونوں حصہ لے سکتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ عقل جب عشق سے متاثر یا نم خوردہ ہو جائے تو یہ عقلِ سلیم کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اور عشق کی ہم راز بن جاتی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں ؎

خودی ہو عقل سے محکم تو غیرتِ جبریلؑ　　　اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیلؑ

(ب۔ج۔ ۳۵۵)

مذکورہ بالا شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر خودی علم کے اثرات کی حامل ہو جائے تو اس میں ہمہ دانی، ہمہ بینی اور قدرے پست سطح پر نخوت اور تکبّر پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی خودی کو وہ غیرتِ جبریلؑ کہتے ہیں کیونکہ جبریل علیہ السلام صرف وہی کلام لے کر آئے جس کی انہیں اللہ نے اجازت دی مگر اس علم کو جس میں خودی عقل سے محکم ہو تو اس کو دیکھ کر وہ رشک کرتے ہیں۔ اگر خودی عشق سے محکم ہو جائے تو وہ زیادہ مکمل اور تخلیقی اعتبار سے زیادہ فعّال ہو جاتی ہے اور عشق کی بھٹی سے کندن بن کر نکلتی ہے۔ اس خودی کو وہ صورِ اسرافیلؑ کہتے ہیں یعنی عشق سے حاصل ہونے والی خودی عشق سے مالا مال ہوتی ہے، نیز صورِ اسرافیلؑ بن کر لوگوں کو زندگی عطا کرتی ہے اور ایک نئے جہاں کو وجود میں لانے کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ بات تخلیقی عمل میں شامل ہوتی ہے اور مُردوں کی طرح بے عمل مسلمانوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ خود اقبالؒ عشق سے حاصل ہونے والی خودی کے قائل تھے ؎

آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیٔ نیام ابھی جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی

زندگی کا جوہر عشق ہے اور عشق کا جوہر خودی ہے، افسوس کہ یہ تیز دھار تلوار ابھی تک نیام کے پردے میں ہے یعنی لوگ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ (ب۔ج۔ ۴۰۱)

تصوف میں عشق کا سفر پروانے کی مانند ہے

جو کچھ اُوپر بیان ہوا اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف میں عشق کا سفر پروانے کے سفر کی طرح ہے جو شمع کی روشنی کی ایک جھلک پانے پر شروع ہوتا ہے اور اُس لمحے انجام کو پہنچتا ہے جب وہ پروانہ خود کو شمع کی آگ میں جلا کر اپنے آپ کو روشنی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ عشق کے چھے مدارج ہیں اور درمیانی مدارج میں سے ایک طواف ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ پروانے کا سفر دائرے میں طے ہوتا ہے اور جیسے جیسے طواف کی رفتار تیز ہوتی ہے عاشق اپنے وجود کے فاضل بوجھ سے دَست کش ہو جاتا ہے۔ عشق میں اس مرحلے کو قربانی کا مرحلہ کہتے ہیں، پھر جب طواف کی رفتار زندگی کی عام رفتار سے تیز ہو جاتی ہے تو عاشق ایک دھماکے کے ساتھ طواف کی لکیر کو توڑ کر شمع کی طرف لپکتا ہے۔ یہ مرحلہ عشق میں ''جست'' لگانا کہلاتا ہے۔ اس کے بعد وہ خود کو روشنی میں مدغم کر کے قطرے کی طرح سمندر میں مل جاتا ہے اور یوں ابدیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس حالت کو نروان یا بے خودی کا نام دیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ مذکورہ بالا روشنی میں اس طرح مدغم ہونے کو تسلیم نہیں کرتے، جس طرح قطرہ دریا میں مل جائے اور اپنی پہچان کھو دے۔ اقبالؒ پروانے ہی کی طرح شمع کو دیکھ لینے سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں، پروانے کی طرح ہی شمع کا طواف کرتے ہیں پھر اپنے فاضل بوجھ سے دستبردار ہو کر پروانے کی طرح دائرے کی ازلی و ابدی لکیر کو توڑتے ہیں۔ اس کے بعد وہ شمع کے شعلے میں بھسم نہیں ہوتے بلکہ اس کے رُوبرُو کھڑے ہو کر اس سے اکتسابِ نور کرتے ہیں (معراج کا واقعہ یاد کریں) اور اس نور کو صورت پذیر کر کے ایک تخلیقی عمل کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ گویا اقبالؒ عاشق کی بے خودی کے عالم کو مس تو کرتے ہیں مگر اس میں جذب نہیں ہوتے، چنانچہ رُوبرُو کھڑے ہونے کے عالم میں وہ نہ صرف اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہیں بلکہ ہوش و حواس بھی قائم رکھتے ہیں۔ وہ شعور و لاشعور (کے سنگم) پر کھڑے ہو کر ایک فن کار کی طرح نورِ ازل کی روشنی سے آب و گل کی دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھالتے ہیں اور ایک نئی صورت میں دوبارہ خلق کرتے ہیں، چونکہ اس حالت میں عاشق کی حالت تبدیل ہو جاتی ہے، اس لئے اقبالؒ نے اسے مردِ قلندر اور بندۂ مومن کا نام نہیں دیا جس کی تحویل میں لاشعور بھی ہے اور شعور بھی، عشق بھی ہے اور عقل بھی۔ اقبالؒ کے نزدیک جب تک فرد دائرے کی لکیر کو توڑ کر تخلیقی سطح کو چھونے میں کامیاب نہیں ہوتا اس کی حیثیت کنویں کے بیل سے مختلف نہیں۔ ایک جگہ علامہ اقبالؒ کی یہ روایت ہم تک پہنچی ہے کہ اقبال سمندر میں اپنے وجود کو فنا کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ اپنے قطرہ ہونے کی شناخت کو زائل نہیں کرنا چاہتے تھے اور قطرے کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے اندر سمندر کے خواص پیدا کرنے کے قائل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے

اپنی کتاب ''تصوراتِ عشق و خودی'' میں عشق کے متعلق بے شمار لوگوں کے نظریات بیان کئے ہیں، جن میں سے انہوں نے ابنِ عربی، الغزالی، صلاح الدین احمد، ایم ایم شریف کے علاوہ سوامی رام تیرتھ، ایچ تھاولیس، ہائیڈگر، ولیم ہملٹن، شنکر اور کرگے کار کے نظریات کا ذکر کیا ہے جو اس کتاب کی ضروریات سے بہت زیادہ ہیں، لہٰذا جو لوگ اس قدر تفصیل کے خواہاں ہوں تو وہ وزیر آغا کی مذکورہ کتاب کا مطالعہ کریں۔

عشق پر علامہ اقبالؒ کا بے پایاں کلام

عشق کے موضوع پر علامہ اقبالؒ کے نظریات اس قدر وسیع ہیں کہ ان کا احاطہ اس جگہ ممکن نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تو عشق کو ہی اپنا امام بنا لیا ہے اور جس طرف عشق راہ نمائی کرتا ہے آپ اسی سمت کو رواں ہوتے ہیں۔ اگر علامہ اقبالؒ کے کلام پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عشق کے موضوع پر بہت طویل کلام پیش کیا ہے۔ اِن شاء اللہ ہماری تصنیف ''عقل اور عشق'' میں اس موضوع کو سمونے کی کوشش کی جائے گی۔

من بندۂ آزادم ، عشق است امامِ من   عشق است امامِ من ، عقل است غلامِ من

میں بندۂ آزاد ہوں، عشق میرا امام ہے، عشق میرا امام ہے اور عقل میری غلام ہے۔   (ز۔ع۔ ۵۳۱)

عشق کے موضوع پر علامہ اقبالؒ کا کلام اس قدر طویل ہے کہ اس پر سیر حاصل تبصرہ ممکن نہیں، آپ کے اشعار کے چند مصرعے نیچے دیئے جا رہے ہیں، جس سے آپ کی عشق شناسی کا علم ہوتا ہے ؎

عشق را کاشانہ قلبِ لا ینام   (عشق کا گھر، نہ سونے والا قلب ہے) (ج۔ن ۵۹۸)

عشق را ما دلبری آموختیم   (عشق کو ہم نے دلبری کا انداز سکھایا) (پ۔چ ۸۴۱)

عشق را ناممکنِ ما ممکن است   (عشق سے ہمارا ناممکن ممکن ہو جاتا ہے) (ا۔ر ۱۰۹)

عشق سلطان است و برہانِ مبیں   (عشق بادشاہ ہے اور کھلی دلیل) (ج۔ن ۶۱۰)

عشق شبخونے زدن بر لامکاں   (عشق لامکاں پر ڈاکہ ڈالنا ہے) (ج۔ن ۶۱۰)

عشق عریاں از لباس چون و چند   (عشق مثل و مثال کے لباس سے عریاں ہے) (ا۔ب ۱۰۹)

عشق غرق اندر جمالِ کائنات   (عشق کائنات کے جمال میں غرق ہے) (ج۔ن ۷۰۸)

عشق گوید آنچہ می آید نگر   (عشق وہی کہتا ہے جو اس کو نظر آتا ہے) (ج۔ن ۷۰۸)

عشقِ ما از شکوہ ہا بیگانہ ایست   (ہمارے عشق کو شکوہ شکایت سے کوئی کام نہیں) (ج۔ن ۷۰۸)

عشقِ مرداں سرِ خود را گفتہ است   (عشق نے مردانِ خدا کو اپنے اسرار کہہ دیے ہیں) (ز۔ع ۵۸۶)

عشقِ من از زندگی دارد سراغ   (میرا عشق زندگی کا سراغ رساں ہے) (پ۔چ ۸۷۴)

عشق می گوید کہ فرمانم پذیر   (عشق کہتا ہے کہ میرا حکم مانو!) (ا۔ر ۱۵۹)

اس کے علاوہ سینکڑوں اشعار اور بھی ہیں۔

عاشقوں کا مذہب ہی عشق ہے

زیرِ نظر کتاب میں چند صفحات کے بعد مولانا رومیؒ کا بیاں کردہ ایک گڈریے کا قصہ لکھا گیا ہے کہ وفورِ شوق سے وہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ ''الٰہی! اگر تو میرے سامنے آئے تو میں تیری ٹانگیں دباؤں، تیرے پیروں کی میل اُتاروں اور تیری جوئیں نکالوں۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ بات سنی تو اس گڈریے پر سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ ''تُو اللہ تعالیٰ سے سخت بے اَدبی کا مرتکب ہوا ہے۔'' یہ باتیں سن کر گڈریا رونے لگا اور اسی وقت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ ''اے موسیٰ! ہم نے تجھے اس لئے بھیجا ہے کہ تم لوگوں کو مجھ سے ملاؤ مگر تم نے ایک بندے کو جو مجھ سے ملا ہوا تھا، الگ کر دیا ہے۔ جاؤ اب اس کو جا کر پھر سے راضی کرو۔'' (مولانا کا کلام اس کتاب میں ''عاشقوں کا دین اور مذہب ہی خدا ہے'' کے عنوان کے تحت چند صفحات کے بعد مطالعہ کریں)۔

حضرت امیر خسروؒ کو اپنے شیخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے اس قدر محبت تھی کہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ''اگر اسلام اجازت دیتا تو میں یہ وصیت کرتا کہ امیر خسروؒ کو میری قبر میں دفن کر دینا۔'' ادھر حضرت امیر خسروؒ کا یہ حال تھا کہ وہ ایسی باتیں کہہ جاتے کہ جس سے لوگوں کو ان کے دین پر بھی شبہ ہو جاتا اور وہ یہ کہنے سے دریغ نہ کرتے کہ امیر خسروؒ تو اپنے پیر کی پوجا کرتا ہے اور بت پرستی کے مرض میں مبتلا ہے۔ آپ نے جواب میں جو رباعی لکھی ہے اس میں کہا ہے کہ ''ہاں ہاں! میں بت پرستی کرتا ہوں مگر لوگوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔''

ایک بزرگ کا قول ہے ''اِنَّ اللّٰہَ لَایُؤَاخِذُا الْعُشَّاقَ بِمَا یَصْدُرُ مِنْھُمْ'' یعنی اللہ تعالیٰ عشاق کے منہ سے نکلی ہوئی بات کا مواخذہ نہیں کرتا۔ امیر خسروؒ نے فرمایا ہے ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

میں تو عشق کا کافر ہوں مجھے مسلمانی کی ضرورت نہیں، میرے من کی ہر رگ تار بن گئی ہے مجھے زنار کی حاجت نہیں۔

(امیر خسروؒ)

خلق می گوید کہ خسؔرو بت پرستی میکند آرے آرے میکنم با خلق و عالم کار نیست

لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے، ہاں ہاں! میں کرتا ہوں، مجھے مخلوق اور پورے عالم سے کوئی تعلق نہیں۔

(امیر خسروؒ)

مذکورہ بالا کلام کا یہ مطلب ہے کہ جب عشق شیخ سے ہو تو عشقِ خدا سے جدا نہیں، لہٰذا شیخ سے محبت خدا سے محبت کے مترادف ہوئی۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ شمس الدین پہلے عاشق تھے پھر معشوق ہو گئے۔ عشق حقیقی میں کسی قدر عشق مجازی سے مناسبت رکھتے ہیں اور عشق مجازی میں اکثر معشوق کو بت، صنم اور کافر بھی کہتے ہیں، مولاناؒ نے فرمایا ؎

مسلماناں مسلماناں نگہ دارید دینِ خود کہ شمس الدین تبریزیؒ مسلماں بود کافر شد

مسلمانو! مسلمان کو اپنے دین پر نگاہ رکھنی چاہئے کیونکہ شمس الدین تبریزیؒ مسلمان تھا اور اب کافر ہو گیا ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں عشق کرنے والا کسی نعمت یا جنت سے عشق نہیں کرتا بلکہ اس کے خالق اور مالک سے محبت کرتا ہے۔ حضرت شاہ نیاز احمد بریلویؒ نے اس کی تشریح درج ذیل شعر میں فرمائی ہے۔

زُہد و تقویٰ برفگندم زیرِ پائے آں صنم مذہبم عشقت و رندی، مشربم جوش و خروش

زُہد و تقویٰ کو میں نے اپنے محبوب کے پاؤں کے نیچے پھینک دیا ہے، میرا مذہب تو اس کا عشق ہے اور میرا مشرب جوش و خروش ہے۔ (نیاز احمد بریلویؒ)

زاہدا! بشنو خدا را آنچہ می گویم ترا زُہدِ بے معنی گذار و جامِ مے از من بنوش

اے زاہد! خدا کے لئے سن، جو بات میں تجھے کہتا ہوں، ایسا زُہد جو بے معنی ہے اس کو چھوڑ دے اور مجھ سے شراب کا ایک جام پی لے۔ (نیاز احمد بریلویؒ)

اولیائے کرام کا ہمیشہ سے یہی مذہب رہا ہے کہ اپنے دوست یعنی اللہ تعالیٰ کے تخیل سے سرمست رہتے ہیں اور اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے عشق سے ہی باندھ کر رکھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کس سمت میں جا رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

بیا بمجلسِ اقبال و یک ساغر کش اگرچہ سر نہ تراشد قلندری دا ند

مجلسِ اقبال میں آؤ اور ایک دو ساغر پیؤ، اگرچہ وہ سر نہیں تراشتا مگر قلندری جانتا ہے۔ (پ۔م۔ ۳۴۶)

قلندر بو علیؒ ہستم بنامِ دوست سرمستم دل اندر عشقِ اُو بستم نمی دانم کجا رفتم

میں بوعلی قلندر ہوں اور میں اپنے دوست کے نام میں مست رہتا ہوں، اپنے دل کو اس کے عشق میں ہی باندھے رہتا ہوں، مجھے علم نہیں کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔

ایسے ہی حضرت عثمان ہارونیؒ چشتی نے اپنی ان واردات کا جو دورانِ وجد اور احوالِ عشق میں ان کو محسوس ہوتے رہے ہیں اپنے کلام میں بیان کیا ہے اور ان کی ایسی ایک نظم کے کچھ اشعار جو راقم الحروف کو یاد ہیں، قارئین کی نذر کر رہا ہے۔ نیچے دیئے گئے ترجمے سے معنی صاف واضح ہو جاتے ہیں ؎

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم مگر نازم با ایں ذوقِ کہ پیشِ یار می رقصم

میں نہیں جانتا کہ جب مجھے دوست کا دیدار ہوتا ہے تو میں رقص کیوں کرنے لگتا ہوں، لیکن مجھے اس بات پر ناز ہے کہ میں دوست کے سامنے رقص کرتا ہوں۔ (عثمان ہارونیؒ)

زہے رندی کہ پامالش کند صد پارسائی را زہے تقویٰ کہ من با جبّہ و دستار می رقصم

خوش قسمت ہے ایسی رندی جو سینکڑوں پارسائیوں کو پاؤں میں روند ڈالے، خوش قسمت ہے ایسا تقویٰ کہ میں جبّہ اور

دستار یعنی شریعت کی حدود میں رقص کرتا ہوں۔ (عثمان ہارونیؒ)

تو ہر دم می سرائی نغمہ و ہر بار می رقصم بہر رنگے کہ تو رقصانیم اے یار می رقصم

تُو ہر گھڑی ایک نیا نغمہ چھیڑتا ہے اور میں ہر بار رقص کرتا ہوں، اے یار! تُو جس رنگ میں نچاتا ہے میں اسی طرح ناچتا ہوں۔ (عثمان ہارونیؒ)

منم عثمانِ ہارونیؒ کہ یارِ شیخ منصورم ملامت می کند خلقے و من بر دار می رقصم

میں عثمان ہارونیؒ ہوں کہ میرا یار شیخ منصورؒ ہے، لوگ تو مجھ کو ملامت کرتے ہیں اور میں پھانسی کے تختے پر بھی رقص کرتا ہوں۔ (عثمان ہارونیؒ)

اہلِ عشق کی کیفیت کا کچھ علم مذکورہ بالا اشعار سے ہوتا ہے اور ان کی حقیقی منازل کا علم تو خود اس کا ذائقہ محسوس کرنے سے ہی آ سکتا ہے کیونکہ ایسی باتیں احاطہء تحریر سے باہر ہیں۔

تیسرا باب

مولاناؒ کی بانسری کی فریاد

(انسان کی روح کی شکایت)

ہر شاعر اپنے کلام کی ابتدا یا تو حمدِ باری تعالیٰ سے کرتا ہے یا اپنے افکارِ نادرہ سے۔ غالب کا دیوان اس فکر سے شروع کیا گیا ہے کہ ہر نقش اپنی زندگی کی فریاد کر رہا ہے اور زبانِ حال سے کہتا ہے کہ کون سی ہستی ہے جس نے اسے اس دنیا میں بھیج دیا ہے اور اپنی مجبوریوں میں اس طرح دھکیل دیا ہے کہ جس سے اس دُنیا میں اس کا پیرہن بھی گویا کاغذی اور بے بنیاد ہے۔ دیوانِ غالب کی ابتداء یوں ہوتی ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوے سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی کا آغاز بھی (جلد اوّل مطبع فیصل بک ڈپو صفحہ ۳۱ سے) انسانی روح کی بے سکونی، تڑپ اور بیزاری سے کیا ہے۔ درج ذیل شعر میں بانسری سے مراد انسانی روح ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند (۱/۱)

اس شعر سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح کو اللہ تعالیٰ نے اس کے چمن یا وطن (یعنی جنت) سے دنیا میں بھیجا ہے تا کہ وہ کچھ ایسے کام کر کے دکھائے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ مگر جب وہ یہاں آئی تو اس کو روٹی کپڑا مکان اور دیگر آلائشوں کا سامنا کرنا پڑا اور بنی آدم کا اکثر حصہ ان معاملات سے مقابلہ کرنے کے نا قابل ثابت ہوا۔ بانسری اب اس جگہ (جنت) کو یاد کر کے فریاد کرتی ہے کہ جنت میں روحِ انسانی خوش تھی کیونکہ

وہاں اس کو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوتی تھی مگر دنیا میں آ کر روح کی توجہ اپنے ظاہری ماحول کی طرف ہو چکی ہے اور وہ اللہ کی طرف توجہ کرنے سے محروم ہو گئی ہے۔ اس کی یہ فریاد اسی لئے ہے کہ اب وہ اپنے وطن سے دور کیوں ہو گئی۔ عالمِ سفلی کے لوازمات میں بغض، نفاق، نزع، فساد، تکبر و کینہ کے علاوہ رذائل، غضب، حسد، طمع، ریا اور بُخل و خیانت عام طور پر ہر انسان میں کسی نہ کسی حد تک پائے جاتے ہیں۔

جو اپنے وطن سے دُور ہو جاتا ہے

اس دُنیا میں آ کر روح یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ کن حالات میں سے نکل کر کہاں اور کس ادنیٰ عالم میں اُتری ہے اور کن کن سعادتوں سے محروم ہو کر کیسی آلودگیوں میں گھر گئی ہے۔ روح اپنے اس حرمان اور خسران کو محسوس کرتی ہے۔ بہت سے شاعروں نے روح کی اس بدنصیبی کے متعلق بہت سے اشعار لکھے ہیں مگر مولانا رومیؒ نے اس قصے کو بانسری کی فریاد سے تشبیہ دی ہے۔

عالمِ لاہُوت سے آنے کے بعد اگرچہ کچھ مقربین کی روحیں (یعنی انبیائے کرام علیہم السلام اور خاص اولیائے کرامؒ کی روحیں) ایسی ہیں جو عالمِ سفلی میں آنے کے بعد بھی اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اس طرح سجائے رکھتی ہیں کہ اگر وہ ایک لحہ بھر کے لئے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائیں تو خود کو مُرتد تصور کرتی ہیں۔ ان کی روح پر یادِ الٰہی کا وہی رنگ رہتا ہے جو عالمِ بالا میں ان کو میسّر تھا اور وہ اس عالمِ سفلی میں رہنے کے باوجود اب بھی اللہ کی یاد میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ اپنے ماحول اور دنیا میں پھیلی ہوئی شیطانیت کی وجہ سے ان کی روح اپنے وطن کی طرف جانے کے لئے مائل رہتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وقتِ رحلت اگرچہ اس دنیا میں رہنے یا عالمِ بالا میں آنے کے لئے اختیار دیا گیا تھا مگر آپ ﷺ نے عالمِ بالا کی طرف جانے کو قبول فرمایا۔ مولانا رومیؒ کے مذکورہ بالا شعر میں یہ نظریہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ طربناک اشعار سنتے ہیں تو بانسری کی آواز ان کو عالمِ لاہوت کی طرف لے جاتی ہے اور ان دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے جب وہ وہاں موجود تھے۔ مذکورہ بالا بیان سے درج ذیل اشعار کا مفہوم ان میں موجود الفاظ سے خود ہی سمجھ میں آ جاتا ہے ؎

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

جب سے مجھے بانس کی زمین سے کاٹ کر جدا کر دیا ہے، میرے نالہ وفغاں سے مرد و زن روتے ہیں۔ (۳۱/۱)

ان اشعار میں ''نَے'' سے روح اور نیستاں سے عالمِ ارواح مراد ہے یعنی جب سے مجھے وہاں سے جدا کیا ہے تو میرے رونے کا انداز دیکھ کر ازراہِ ترحم سب مرد و عورت بھی رونے لگتے ہیں ؎

سینہ خواہم شَرحہ شَرحہ از فراق　　　تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

میں اپنے غم کے سُننے والوں کا سینہ ایسا چاہتی ہوں جو پہلے ہی فراق کے مارے چاک چاک ہو، تاکہ اس کو ہمدرد سمجھ کر اپنا حال کھول کر سناؤں۔ (۳۱/۱)

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش   باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

جو شخص اپنے اصل (وطن) سے دور ہو جاتا ہے، وہ پھر ایامِ وصل کی تلاش کیا کرتا ہے۔ (۳۱/۱)

من بہر جمعیتے نالاں شُدم   جفت خوشحالان و بدحالاں شُدم

میں ہر مجلس میں رہ چکی ہوں اور نالے سے (جان پانے والے) خوشحال اور قیودِ (جسمانیہ میں جکڑے ہوئے) بدحال لوگوں کی صحبت میں رہ چکی ہوں۔ (۳۱/۱)

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من   وز درونِ من نہ جست اسرار من

ہر شخص اپنے خیال کے مطابق میرا یار بنا مگر اس نے میرے دل کے بھیدوں کو نہ پہچانا (کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کو اس دُنیا کا دُکھ ہے، حالانکہ دُکھ روح کا تھا۔ (۳۱/۱)

لیک داند ہر کہ اُو را منظر است   کایں فغانِ ایں سرے ہم زاں سرست

لیکن جس شخص کو چشمِ بصیرت حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ بانسری کے اس سرے کی آواز بھی دوسرے سرے سے آ رہی ہے۔ (۳۲/۱)

(اللہ کے منہ میں بانسری کے سرے سے مراد یہ ہے کہ بانسری کا ایک سرا خدا کی جانب ہے اور دوسرا بانسری نواز کے منہ میں ہے، جو آوز ادھر سے آتی ہے ادھر بھی وہی آواز ہے)۔

دمدمہ ایں نائے از دمہائے اوست   ہائے و ہوئے روح از ہیہائے اوست

اس بانسری کی آواز اس (حقیقی نَے نواز) کی پھونکوں سے ہے۔ روح کا شور وغل اسی کی تنبیہات سے ہے، یعنی بصیرت والا جانتا ہے کہ اس سرے کی آواز اسی حقیقی نَے نواز کی پھونکوں سے ہے۔ (۳۲/۱)

محرمِ ایں ہوش جز بیہوش نیست   مر زباں را مشتری چوں گوش نیست

اس قصۂ عشق کا واقف اس شخص کے سوا نہیں ہوسکتا جو غیراللہ سے بیہوش ہو، چنانچہ زبان کی باتیں کان والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ (۳۲/۱)

بر سماعِ راست ہرکس چیر نیست   طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

سچی بات سننے پر ہر کوئی قادر نہیں، چنانچہ ہر حقیر پرندے کی خوراک انجیر نہیں ہوسکتی (یعنی پختہ کار بزرگوں کی بات ہر شخص کے آگے کیا بیاں کریں جو اس کو سننے کے قابل ہی نہیں اور جنہیں ان کی باتوں پر یقین نہیں۔ (۳۳/۱)

بند بگسل باش آزاد اے پسر!   چند باشی بندِ سیم و بندِ زر

بیٹا! قید کو چھوڑ کر تُو آزاد ہو جا، چاندی سونے کے خیال میں تو کب تک قید رہے گا (خلاصہ یہ کہ ماسویٰ اللہ سے آزاد ہو جا)۔ (۳۳/۱)

درج ذیل اشعار میں جو کچھ مولاناؒ نے فرمایا ہے اس کا مطلب بالکل واضح ہے اور ان اشعار میں بھی بانسری کی اپنے وطن سے جدائی کی کیفیت بیان کی جارہی ہے ؎

تن زجان و جاں زتن مستور نیست　　لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست

بدن روح سے اور روح بدن سے چھپی ہوئی چیز نہیں ہے لیکن کسی کے لئے روح کو دیکھنے کا دستور نہیں ہے۔ (۳۲/۱)

آتش ست ایں بانگ نائے و نیست باد　　ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

بانسری کی یہ آواز آگ ہے، ہوا نہیں ہے، جس میں یہ آگ نہ ہو وہ نیست (یعنی نابود) ہو جاتا ہے۔ (۳۲/۱)

آتشِ عشق ست کاندر نے فتاد　　جوششِ عشق ست کاندر مے فتاد

عشق کی آگ ہے جو بانسری میں لگی ہے، عشق کا جوش ہے جو شراب میں آیا ہے۔ (۳۲/۱)

نَے حریفِ ہر کہ از یارے بُرید　　پردہایش پردہائے ما درید

بانسری اُس کی ساتھی ہے جو یار سے کٹا ہو، اس کے راگوں نے ہمارے دل کے پردے پھاڑ دیئے۔ (۳۲/۱)

ہمچو نے زہرے و تریاقے کہ دید　　ہمچو نے دمساز و مشتاقے کہ دید

بانسری جیسا زہر اور تریاق کس نے دیکھا ہے، بانسری جیسا ساتھی اور عشق والا کس نے دیکھا ہے۔ (۳۲/۱)

گر نبودے نالۂ نے را ثمر　　نے جہاں را پُر نہ کردے از شکر

بانسری کی فریاد کا اگر کوئی نتیجہ نہ ہوتا، بانسری دُنیا کو شکر سے نہ بھرتی۔ (۳۲/۱)

درج ذیل اشعار میں بانسری کی فریاد یہ ہے کہ جو سوز میرے سینے میں ہے اگر اپنے نغموں میں کہہ دوں تو یہ آواز تمام دُنیا کو درہم برہم کر دے۔ فرماتے ہیں کہ اگر میں بھی اپنے یار سے ملا ہوا ہوتا تو میں بھی یہی باتیں کرتا جو بانسری نے کہی ہیں (بانسری کی بات یار کی طرف سے ہوتی ہے)۔

سرِ پنہاں ست اندر زیر و بم　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

بانسری کی زیر و بم میں راز چھپا ہوا ہے، صاف صاف بیان کروں تو دُنیا کو درہم برہم کر دوں۔ (۳۴/۱)

آنچہ نے می گوید اندر ایں دو باب　　گر بگویم من جہاں گردد خراب

ان دونوں معاملوں میں بانسری جو کچھ کہتی ہے اگر میں بیان کر دوں تو دُنیا تباہ ہو جائے۔ (۳۴/۱)

بالب دمسازِ خود گر جفتمے　　ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے

اگر میں اپنے یار کے ہونٹ سے ملا ہوا ہوتا تو بانسری کی طرح کہنے کی بات کہتا۔ (۳۴/۱)

ہر کہ اُو از ہم زبانے شُد جدا　　بے نوا شُد گرچہ دارد صد نوا

جو شخص ہم زبان دوست سے جدا ہوا وہ بے سہارا بنا، خواہ سو سہارے رکھتا ہو۔ (۳۴/۱)

چوتھا باب

پروازِ عشق

(عشقِ مجازی و حقیقی اور عشق کی خصوصیات)

عشقِ مجازی اور حقیقی کی تعریف

عشقِ مجازی اور حقیقی کی بحث اس قدر طویل ہے کہ اس کے لئے فرصت کے رات دن میّسر ہونے کی ضرورت ہے۔ مثنوی میں مولانا رومیؒ نے کئی مقامات پر عشقِ مجازی اور حقیقی پر بحث کی ہے مگر اس بحث میں اُلجھنا ایک مشکل امر ہے، اس لئے پہلے عشق کی تعریف اور اس کی انواع کو ملاحظہ فرمائیں۔

عشق: محبت ایک کششِ مقناطیسی ہے جو کسی کو کسی کی جانب کھینچتی ہے۔ عشق یہ ہے کہ کسی میں حسن وخوبی کی ایک جھلک دیکھ کر اس کی جانب مائل ہو جانا۔ دل میں اس کا شوق، اس کی طلب وتمنا اور اس کے لئے بے چینی کا پیدا ہونا، اسی کے خیال میں شب و روز رہنا، اسی کی طلب میں تن من دھن سے منہمک ہونا، اسی کے فراق سے ایذا پانا، اسی کے وصال سے سیر نہ ہونا، اسی کے خیال میں اپنے خیال کا رہنا، اسی کی رضا میں اپنی رضا اور اسی کی ہستی میں اپنی ہستی کو گم کر دینا ہے۔ یہ سب عشق ومحبت کے کرشمے ہیں۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بہ دستِ دگر دادن و حیراں بودن

عاشقی کیا ہے؟ کہہ دو محبوب کا غلام ہو جانا، دل کو کسی کے ہاتھ میں دے کر حیران ہو جانا۔ (غیر مثنوی)

محبت کی عالمگیریت: اس کائنات کا پیدا ہونا محبت کے تحت ہوا اور یہی وجہ ہے کہ کائنات کی ہر شے میں عشق سرایت کئے ہوئے ہے۔ اجسامِ فلکی اور اجسامِ غیر ذِی رُوح سب ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں اور سائنس کی عینک لگا

کر دیکھیں اور ایٹم کی ساخت پر غور کریں تو یہ عشق ادھر بھی نظر آتا ہے۔ اجسام کا کھینچنا اور ایک دوسرے سے دُور جانا (Attraction and repulsion) محبت اور عشق کی شہادت دیتے ہیں۔ غیر مادی اجسام کا ایک دوسرے کی طرف کھچنا اور کشش کا ہونا بھی عشق ہے۔

عشق انسان کا خاصہ ہے۔ محبت کا انتہائی مرتبہ عشق کہلاتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ"۔ (اور جو ایمان والے ہیں اللہ تعالیٰ سے شدید ترین محبت کرتے ہیں۔ البقرہ: ۱۶۵) شدید محبت کا ہونا ہی عشق ہے۔

راقم الحروف کی کتاب "حضورِ قلب" کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی محبت کے لئے پیدا فرمایا اور اس راہ میں جو مسائل حائل تھے وہ سب دُور کر دیئے۔ "حضورِ قلب" میں شامل کردہ نکات کا اس جگہ پر تذکرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی چیز کی محبت میں گرفتار ہے بلکہ کسی نہ کسی لیلیٰ کی محبت میں گرفتار ہے، جس کی لیلیٰ میں زیادہ خوبیاں موجود ہیں وہ لیلیٰ سب سے زیادہ برتر ہے۔ عشق کی شاعری میں عاشق لوگ خدا کو لیلیٰ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

محبت کی کیفیات: محبت ایک فطری جذبہ ہے جس کا ظہور مختلف کیفیات، حالات اور صورتوں میں ہوتا ہے۔ بعض محبتیں طبعی، بعض ارادی و اکتسابی ہوتی ہیں۔ ماں کی بچے کے ساتھ محبت طبعی ہے۔ اُستاد اور شاگرد کی اِرادی اور اکتسابی ہے، پیر و مرشد کی محبت بھی ارادی محبت میں شامل ہے۔

محبت کی مناسبتیں: وہ مناسبتیں جن کی وجہ سے محبت اُبھرتی ہے محبّ و محبوب کی صورتوں میں معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ نسبت کبھی ضعیف ہو جاتی ہے اور کبھی قوی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

عشقِ مجازی (طبقات اور مراتبِ عشق)

مدارجِ محبت میں سے ایک درجہ ہویٰ کا بھی ہوتا ہے۔ مودت اور محبت کا ظہور "ابتدائی ہویٰ" سے ہوتا ہے (یعنی خواہشاتِ نفسانی کے زیر اثر) اور محبت کے اصل مراتب یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ جب یہ معاملہ پختہ ہو جائے تو اس میں دل کو ہمیشہ مجاہدہ میں رکھا جاتا ہے اور ہمیشہ مائل بہ محبوب رہنا ضروری ہے۔ یہی محبت کی اصلی اور پہلی منزل ہے۔ یہ عشق اصلاً حقیقی ہے مگر مجازی عشق کے مشابہ ہے، لہٰذا علامتی انداز میں عشق عموماً مجازی مراحل سے گذرتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک عشقِ حقیقی مذہب کا جوہر ہے اور عبادت اسی عشق ہی کی ایک صورت ہے۔ تصوف کے مطابق عشق مجازی عشق حقیقی کے لئے ایک زینے کا کام دیتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مادی حسن وہ کھڑکی ہے جس سے صوفی کو حسن ازل کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔

آسان انداز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک جذبۂ محبت اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عطا کیا ہے۔ کچھ لوگوں میں یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اور کچھ لوگوں میں یہ جذبہ نہ ہونے

کے برابر پایا جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس لئے دیا گیا ہے کہ انسان اپنے امور کو دل لگا کر اور پورے عزم و انہماک سے انجام دے۔ انسان کو چونکہ اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے اس لئے اس جذبے کا ہونا انسان کے اندر اشد ضروری تھا کیونکہ اس کو جو کام دنیا میں سونپے جاتے ہیں ان کو پوری تندہی سے کرنے میں انسان کی کامیابی کا راز رکھا گیا ہے۔ بڑے بڑے کاموں کے لئے ہمت، عزم اور پختہ ارادے کا ہونا لازمی امر ہے، لہٰذا اس بلندی پر پہنچنے سے سب سے پہلے انسان کو جذبۂ عشق عطا کیا گیا۔

بچہ جب معصوم ہوتا ہے تو اس وقت بھی یہ جذبہ اس میں پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں (اور قریبی لوگوں) سے محبت کرتا ہے۔ جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس کی محبت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ اس کو ہر چمکنے والی اور خوش نُما چیز سے محبت ہوتی ہے (خواہ وہ چمکنے والی چیز تیز دھار چاقو ہی کیوں نہ ہو جس سے اُس کا ہاتھ کٹ سکتا ہے مگر اس عمر میں وہ اس چیز کے نقصان دہ پہلوؤں کو نہیں جانتا۔) اگر موذی سانپ بھی بچے کے سامنے آ جائے تو وہ اپنا ہاتھ اس پر ضرور ڈال دیتا ہے۔ قدرت نے ایسی نقصان دہ چیزوں سے بچوں کو کافی حد تک محفوظ رکھا ہے۔ اصل میں محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کا حوصلہ اس شعر کا مصداق ہو جائے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مذکورہ بالا گفتگو سے معلوم ہوا کہ عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو پیدائشی طور پر عطا کیا جاتا ہے اور حقیقتاً بچے کو آگ میں ہاتھ ڈالنے سے بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ یہ جذبہ انسان کے ظرف کے مطابق ہوتا ہے اور ہر شخص میں مختلف حد تک پایا جاتا ہے۔ ماں باپ کی غلط پرورش اور ماحول کے اثراتِ بد سے انسان کا یہ جذبہ معدوم ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض انسانوں میں عشق کی معمولی سی رَمق ہی پائی جاتی ہے۔ غلط پرورش کا ذکر اس لئے بھی ضروری تھا کہ ہر انسان کے اندر جو کمالاتِ ربانی رکھے گئے ہیں ان کی پرورش میں والدین کوتاہی اس لیے کر جاتے ہیں کہ ان کے والدین نے بھی ان کے اس جذبے کی نشوونما اور پرورش نہیں کی ہوتی، ایسے بچے بڑے ہو کر صرف دُنیا کی چمک دمک میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور براہیمی نظر کے فُقدان سے وہ سونے اور چاندی کے بتوں کی پوجا کرنے لگتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ''سورۂ التکاثر'' کو نازل کیا گیا (اس سورہ میں یہ کہا گیا ہے کہ تمہیں مال کی کثرتِ چاہت نے اس قدر مغلوب کر دیا ہے کہ تم بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے تمام عمر مالی بہتات کی چاہت میں گذار دیتے ہو، حتیٰ کہ تم جوان ہوتے ہو پھر بوڑھے ہو جاتے ہو مگر تمہاری یہ چاہت ختم نہیں ہوتی اور آخر تم قبروں میں چلے جاتے ہو)۔ کچھ لوگوں کو تو کوئی نیک شخص اس راہ سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لگا دیتا ہے لیکن زیادہ لوگ اسی حال میں رہ جاتے ہیں۔

یہ لوگ جو سونے چاندی کے عشق میں گرفتار ہوتے ہیں ان کی خوراک عموماً اکتسابِ حرام سے ہوتی ہے اور اتنا پیٹ بھر کر کھاتے ہیں کہ ان کے نفوس شہوات میں گرفتار ہو کر مادی محبت یعنی مجازی رنگ میں عورتوں کی محبت میں

گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہی عشق مجازی کہلاتا ہے، جو مولانا کے نزدیک گندم کھانے کے اثر سے ہوتا ہے اور اس میں سوائے راگ و رنگ کی محفلوں اور عیاشی کے سامان کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مجازی عشق بھی حقیقی کی طرف لے جاتا ہے۔ مجازی عشق کے حسبِ ذیل دو طبقات پائے جاتے ہیں۔

طبقہ نمبر۱: وہ لوگ جو مجاہدات کی وجہ سے بہت سے احکام سے تجاوز کر چکے ہیں اور حسنِ صورت پر نظر ڈال کر اپنے قلب میں گرمی پیدا کرتے ہیں اور اپنے اندر سوز و گداز بڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ عشقِ مجازی سے بہت جلد عشقِ حقیقی میں ترقی کر جاتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اَلْمَجَازُ قَنْطَرَةُ الْحَقِيْقَةِ. یعنی مجازی عشق حقیقی عشق کا پُل ہے۔

طبقہ نمبر۲: یہ لوگ آزمائشوں میں مبتلا رہتے ہیں اور ترقی سے گریز کرتے ہیں اور حجابات سے اُنس رکھتے ہیں اور نفس امارہ کے نرغہ میں پھنسے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عشق و محبت کی حرکات سے محروم ہیں۔ محبوبِ حقیقی کو کلیۃً فراموش کر چکے ہیں۔ محبوبانِ مجازی کی ہمراہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ہوسِ نفس کو عشق کے نام سے پکار کر خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ محبت کا ادنیٰ درجہ محبتِ آثاری ہے۔ یہ مذموم مرتبہ ہے اور ان کی یہ محبت شہوت پرستی ہے۔ یہ لوگ نفس کے غلام اور طبیعت کے قیدی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔

مراتبِ محبت: عشق کے بے شمار مراتب بیان کئے جاتے ہیں لیکن طوالت کے باعث ان کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس میں میلانِ عشق کی اقسام ہیں، یعنی مقامِ جمع سے جمع میں، جمع سے تفصیل میں، تفصیل سے جمع میں اور تفصیل سے تفصیل میں آنا ہے۔ محبت کے حقیقی مراتب کیا ہیں؟ یہاں محبت کے سات مراتب کا ذکر آتا ہے، مثلاً لحظہ، رمقہ، ہوا، ودّ، خلّت، حبّ، عشق وغیرہ، ان کے علاوہ محبت کے دس مدارج جو مجمع السلوک شرح رسالہ مکیہ میں بیان کئے گئے ہیں، مثلاً موافقت، موانست، مودت، ہوا، خلّت، شغف، تیم، ولہ اور عشق (سرِّ دلبراں) اب عشقِ مجازی اور حقیقی کے متعلق کچھ بیان کیا جائے گا جو عام انسان کی فہم میں آسانی سے آ جاتا ہے۔

انسانوں اور فرشتوں کے عشق میں فرق: حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ فرشتوں میں بھی عشق ہے لیکن درد نہیں کہ وہ مارے مارے پھریں۔ وہ ذرہ جس کو عاشق ذوقِ محبوب اور آرزوئے وصال میں محسوس کرتا ہے انسان کا ہی حصہ ہے۔ فرشتوں کا عشق کشش ذرّات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسی کشش کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ "قدسیاں را عشق ہست" مگر یہ بھی درست ہے کہ سوزِ فراق اور قریب تر ہونے کا جذبہ ان میں نہیں ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے "درد نیست"۔ مولانا عطارؒ کا شعر یوں ہے ۔

قدسیاں را عشق ہست و درد نیست　　　درد را جز آدمی درخورد نیست

فرشتوں کو عشق ہوتا ہے درد نہیں، درد کی خوراک صرف انسان کو ملی ہے۔ (عطارؒ)

عشق کی صوفیانہ تعریف: جب حقیقی وجود اللہ تعالیٰ کا ہے تو کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کا پرتو ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا جمعاً اور تفصیلاً اپنے کمال کی جانب میلان کا ہونا عشق کہلائے گا۔ سرِ دلبراں میں صوفیائے کرام

کے چار طبقات بیان کیے گئے ہیں۔

طبقہ نمبر۱: یہ طبقہ اُن حضرات کا ہے جو شہوات سے بالکل پاک ہیں اور مظاہرِ خلقی میں بجز مشاہدۂ حق کے اور کسی جانب ملتفت نہیں ہوتے اور مرایائے کونیہ (کونین کے شیشوں) میں جمالِ مطلق کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتے۔ مولانا جامیؒ کے مطابق ان کا عشق مطبوع اور موزوں صورتوں میں مقید نہیں۔

ہست بے صورت جنابِ قدسِ عشق　　　لیک در ہر صورتے خودرا نمود

اللہ کے جمال میں کوئی خاص رونمائی نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ ہر صورت میں ظاہر ہے۔　　　(جامیؒ)

طبقہ نمبر۲: اُن حضرات کا طبقہ ہے جو کثرتِ احکام سے تجاوز کر چکے ہیں، اپنے قلب میں گرماؤ پیدا کرنے سے اپنے عشق کو بھڑکنے کا موقع دیتے ہیں، یہ لوگ جلد ہی عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی میں پہنچ جاتے ہیں۔

طبقہ نمبر۳: اُن گرفتارانِ ابتلا کا طبقہ ہے، جنہیں ترقی سے گریز ہے اور حجابات سے اُنس ہے، اُن کا حُبّی میلان ایک سے دوسری، تیسری اور چوتھی صورت سے اُلجھتا ہے اور ساری عمر اسی طرح گذر جاتی ہے۔

طبقہ نمبر۴: اس طبقہ کے لوگ محبوبانِ مجازی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ہوائے نفس کو عشق کا نام دیتے ہیں۔

عشق باصد ناز می آید بہ دست
(عشق بہت مشکل سے ہاتھ آتا ہے)

عموماً عشقِ مجازی والے اپنی محبت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی بدنام ہو جاتے ہیں، مگر سچا عشق چھپ نہیں سکتا اس کی خوشبو تو دُور سے آ جاتی ہے۔ اگر عشق شیطان میں آ جائے تو جبریل علیہ السلام کا رُتبہ پا سکتا ہے۔ سچے عشق میں بہت محنت کرنا ہوتی ہے اور سختیاں جھیلنا ہوتی ہیں کیونکہ یہ سختیاں اور مصائب عاشق کو صیقل کر کے اس کا اہل بنا دیتی ہیں۔ حقیقتاً انسان کو عشق کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

میلِ عاشق با دو صد طبل و نفیر　　　میل معشوقاں نہان است و ستیر

معشوقوں کی محبت مخفی اور مستور ہوتی ہے اور عاشق کی محبت علی الاعلان ہوتی ہے۔　　　(۳/۴۳۶)

دیو اگر عاشق شود ہم گوئے برد　　　جبرئیلے گشت و آں دیوے بمرد

ابلیس کو بھی اگر حق تعالیٰ کا عشق ہو جائے تو میدان سے گیند لے جائے گا اور جبریلؑ ہو جائے گا اور اس کی ابلیسیّت ختم ہو جائے گی۔　　　(۶/۳۴۹)

تُو بجز نامے چہ می دانی زعشق　　　تُو بہ یک خواری گریزانی زعشق

تُو ایک مرتبہ کی ڈانٹ سے بھاگ نکلتا ہے، تُو تو عشق کو جانتا ہی نہیں فقط اس کا نام سنتا ہے۔　　　(۵/۱۲۲)

عشق باصد ناز می آید بدست　　　عشق را صد ناز و استکبار ہست

عشق کے سینکڑوں ناز اور تکبر ہیں، عشق سینکڑوں ناز اُٹھانے کے بعد ہاتھ میں آتا ہے۔　　　(۵/۱۲۲)

گر بہر زخمے تو پر کینہ شوی پس چرا بے صیقل آئینہ شوی

اگر تو ہر ڈانٹ پر کینہ پیدا کرے گا، پھر تو صیقل ہو جائے (یعنی شیخ کی سختیوں) بغیر کیسے آئینہ بنے گا۔ (۳۱۲/۵)

ناف ما بر مہر خود ببریدہ اند عشقِ او در جانِ ما کاریدہ اند

خدا نے ہماری ناف کو اپنی محبت کی شرط پر کاٹا ہے اور ہماری جان میں اس کے عشق کا بیج بو دیا ہے۔ (۲۵۰/۲)

ایں (عشقِ مجازی) فساد از خوردنِ گندم بود
(عشقِ مجازی گندم کھانے کے فساد کے باعث ہے)

مجازی عشق گندم اور دیگر نعمتوں کے غلط استعمال سے پیدا ہوتا ہے، اگر خوراک کا خیال نہ رکھا جائے اور بے احتیاطی برتی جائے تو گندم جسمِ انسانی میں فساد پیدا کر دیتی ہے لیکن حلال رزق کے کھانے میں اور اعتدال رکھنے سے نیک خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔

عشق از اوّل چرا خونی بود تا گریزد آنکہ بیرونی بود

عشق پہلے سے ہی خونی نظر آتا ہے تاکہ غیر مخلص دربارِ عشق میں حاضر نہ ہو سکے۔ (۴۵۰/۳)

آں طرف کہ عشق می افزود درد بوحنیفہؒ، شافعیؒ درسے نہ کرد

جس راہ میں عشق درد بڑھاتا ہے اس راہ کی تعلیم امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے نہ دی۔ (۳۶۶/۳)

عشق زندہ در رواں و تا بصر ھر دمے باشد زغنچہ تازہ تر

عشقِ حقیقی (اللہ تعالیٰ کا) ہمیشہ ہماری رگوں میں اور آنکھوں میں پھولوں کی کلیوں سے زیادہ تازہ ہے۔ (۵۴/۱)

زانکہ عشقِ مُردگاں پایندہ نیست چونکہ مُردہ سوئے ما آیندہ نیست

دُنیا والوں یعنی مرنے والوں کا عشق باقی رہنے والا نہیں اور مرنے والا ہماری طرف آنے والا نہیں بلکہ جانے والا ہے۔ (۵۳/۱)

عشقہائے کز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

وہ عشق جو ان صورتوں کے نقش و نگار کے لئے ہوتا ہے، عشق نہیں بلکہ نفس کی خواہش کی وجہ سے آخرت کی شرمساری ہے۔ (۵۲/۱)

عشق نبود آنکہ در مردم بود ایں فساد از خوردنِ گندم بود

جو عشق بندوں سے کیا جاتا ہے وہ دراصل عشق نہیں بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے۔ (X)

دمشق میں قحط سالی عشق کو فراموش کرنے سے ہوئی

حضرت مولانا رومیؒ کا قول ہے کہ جب معشوق کا حسن ختم ہو جاتا ہے اور دھواں ظاہر ہو جاتا ہے، یعنی وہی مکروہ

صورت نظر آنے لگتی ہے تو اسی وقت یہ عشق مجازی ختم ہو جاتا ہے۔ (یہ اس لیے کہ جب کسی محبوب کا عشق اور اس کا حسن قائم ہے تو محبت کا سامان قائم رہتا ہے اور جونہی حسن رخصت ہو جائے تو عشق مجازی بھی رخصت ہو جاتا ہے) شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ دمشق میں جب قحط سالی رونما ہوئی تو اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں نے عشق کو فراموش کر دیا تھا (یعنی بجائے عشقِ خدا کے عشقِ مجازی میں لگ چکے تھے) مسلم ممالک آج بھی مغربی تہذیب کے دلدادہ ہو رہے ہیں اور مجازی عشق میں غرق ہونے کی وجہ سے قہرِ الٰہی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق — کہ یاراں فراموش کردند عشق

دمشق میں قحط سالی اس لئے آئی کہ یار لوگوں نے عشق (الٰہی) کو فراموش کر دیا۔ (سعدی)

چوں رود نور و شد پیدا دخاں — بفسرد عشقِ مجازی آں زماں

جب نور چلا جاتا ہے تو دھواں رہ جاتا ہے، اس وقت عشقِ مجازی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ (۱۰۸/۶)

عشق زاوصافِ خدائے بے نیاز — عاشقی بر غیر او باشد مجاز

عشق تو خدائے بے نیاز کے اوصاف سے ہے، اس کے علاوہ عشق، عشقِ مجازی ہے۔ (۱۰۸/۶)

زانکہ شہوت با خیالے رانده اند

(کیونکہ انہوں نے صرف خیالی صورت کی طرف عشق بازی کی)

کچھ لوگ غلط انداز میں عشقِ مجازی میں شہوات کی پوجا کرتے ہوئے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذار دیتے ہیں، وہ بالآخر اپنی حرماں نصیبی پر روتے ہیں ؎

زیں بتاں خلقاں پریشاں میشوند — شہوتے رانده پشیماں میشوند

ان معشوقوں کے عشق سے لوگ (ناحق) پریشان ہوتے ہیں (زنا اور لواطت سے) اپنی شہوت پوری کرکے آخر میں پچھتاتے ہیں۔ (۲۰۹/۳)

مطلب:- چونکہ عاشقِ مجاز کو اگرچہ مطلوب کا دیدار میسّر ہوتا ہے مگر وہ غیبت میں بھی صرف اسی خیالی صورت کی پرستش کرتا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مشرک نے جو اپنے غلط خیال سے ایک معبود تجویز کر لیا ہے اس کی گرویدگی میں وہ معبودِ حقیقی سے دور رہ جاتا ہے۔ "اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" (الفرقان: ۴۳) ترجمہ: کیا آپ نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا؟

پس مقصودِ اصلی حقیقت ہے، مجاز صرف بطور ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مظاہر کی طرف میلان صرف ظاہر کے مشاہدے کے لئے ہونا چاہیے اگر صرف مظاہر کے دلدادہ ہو کر رہ گئے تو بس رہ گئے۔

زانکہ شہوت با خیالے رانده است — درحقیقت دور تر وامانده ست

کیونکہ انہوں نے ایک خیالی صورت کے ساتھ عشق بازی کی ہے اور حقیقت یعنی محبوبِ حقیقی سے دور رہ گئے ہیں۔ (۲۰۹/۳)

باخیالے میل تو چوں پر بود تا بداں پر بر حقیقت بر شود

کسی خیال (یعنی خیالی صورت) کے ساتھ تمہارا میلان ایک پر کے مشابہ ہونا چاہیے تا کہ اس پر کے ساتھ حقیقت کی طرف پرواز ہو سکے۔ (۲۰۹/۳)

گوش آنکس نوشد اسرارِ جلال کو چو سوسن صد زباں افتاد لال

اس شخص کا کان اسرارِ الٰہیہ سُن سکتا ہے جو سوسن کی طرح سو زبانیں رکھتا ہو اور گونگا بھی ہو، چونکہ جو شخص اسرارِ طریقت کا پورا امین ہو، وہی رازدارِ حق ہو سکتا ہے۔ (۱۷/۳)

جس کو معرفت حاصل ہو اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے

مثل مشہور ہے کہ ''آں را کہ خبر شُد خبرش باز نیامد'' (یعنی جس کو خبر ہو جائے تو پھر اس کی خبر نہیں آتی) اسی کو عربی میں کہا جاتا ہے ''مَنْ عَرَفَ رَبَّهُ كَلَّ لِسَانُهٗ'' (جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس کی زبان گنگ ہو گئی)۔

مولانا رومؒ نے اسے رسولِ خدا ﷺ کے کلام سے منسوب کیا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کسی کو کوئی بات معلوم ہو تو وہ سمجھانے کے لئے الفاظ نہیں پاتا۔ ؎

لفظ در معنی ہمیشہ نا رساں زاں پیغمبر ﷺ گفت قَد كَلَّ لِسَانُ

الفاظ معنی کو پہنچ نہیں سکتے، اسی لئے پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

حلق بخشد خاک را لطفِ خدا تا خورد آب و بروید صد گیاہ

خداوند تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے خاک کو حلق بخشا ہے، حتیٰ کہ خاک پانی نوش کرتی ہے اور اس سے سینکڑوں قسم کی گھاس اُگ پڑتی ہے۔ (۱۷/۳)

مطلب یہ ہے کہ خدا نے مٹی کو استعداد کا حلقوم عطا فرمایا ہے تو وہ پانی پی کر اس قدر نباتات اُگاتی ہے۔ اگر یہ حلقوم اس کو نہ ملتا تو خطۂ خاک تختۂ سبز کیونکر بناتا۔ مولاناؒ کا اشارہ اس طرف ہے کہ زمین خاموشی سے یہ خدمت ادا کرتی ہے۔ انسان بھی جب معرفتِ خدا حاصل کر لیں تو گنگ ہو جاتے ہیں۔

باز حیوان را بہ بخشد حلق و لب تا گیاہش را خورد اندر طلب

پھر حق تعالیٰ جاندار کو حلق اور لب بخشا ہے، حتیٰ کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس (خاک) کی گھاس کو چرتا ہے۔ (۱۷/۳)

چوں گیاہش خورد حیواں گشت زفت گشت حیواں لقمۂ انسان و رفت

جب اس خاک کی گھاس کو چر کر حیوان موٹا ہو گیا تو حیوان انسان کا لقمہ بن گیا اور نابود ہو گیا۔ (۱۷/۳)

مجازی سے حقیقی کی طرف آنے کا طریقہ ترکِ شہوات ہے

جن لوگوں کا عشق محض رنگ و روپ کی مورتیوں کے لئے ہو تو وہ عشقِ حقیقی تک نہیں پہنچ سکتے، ان کا ایسا عشق آخرکار کلنک کا ٹیکا ثابت ہوتا ہے اور اُن کا عشقِ الٰہی تک پہنچنا بعید از قیاس ہوتا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا ہے ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود | عشق نبود عاقبت ننگے بود

جو عشق بازیاں محض رنگ و روپ تک محدود ہوں وہ سچا عشق نہیں ہوتا بلکہ کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوتی ہیں۔ (۵۲/۱)

جو لوگ عشق حقیقی تک آنا چاہتے ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ گندم کے فساد سے بچیں اور شہوات کی پوجا سے اپنے عشق کو بچا کر رکھیں۔ اس میں ایک بات ضرور ہے کہ انسان ایک ہی شخص کی محبت میں ایسا محصور نہ ہو جائے کہ روح کی پرواز کے پر کٹ جائیں۔ جو شخص دنیوی محبت سے خالی محبت کی راہیں عبور کر جائے اس کا عشق فانی نہیں ہے اور اس کا معشوق بھی فانی نہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کی محبت حقیقت کی طرف پرواز کے لئے پر و بازو بن سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اس دنیاوی محبت میں محصور ہو کر نہ رہ جائے ؎

باخیالے میل تو چوں پر بود | تا بداں پر بر حقیقت بر شود

خیال کی جانب تیرا جھکاؤ پر کی طرح ہوتا ہے، تاکہ تُو اس پر کے ذریعے حقیقت تک پہنچے۔ (۲۰۹/۳)

چوں براندی شہوتے پرّت بریخت | لنگ گشتی واں خیال از تو گریخت

جب تُو نے شہوت رانی کی تو تیرا پر جھڑ گیا، تُو لنگڑا ہو گیا اور وہ خیال تجھ سے بھاگ گیا۔ (۲۰۹/۳)

پر نگہدار و چنیں شہوت مراں | تا پرِ میلت برد سوئے جناں

پر کی حفاظت کر اور شہوت رانی نہ کر، تاکہ میلان کا پر تجھے جنتوں میں لے جائے۔ (۲۰۹/۳)

شہوات کی اتّباع میں تباہی ہے

قاعدہ ہے کہ وصالِ معشوق سے عشق کی گرمی سرد پڑ جاتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر مجازی معشوق کے ساتھ بوس و کنار ہونا ہی اپنے عشق کا مقصدِ اعلیٰ سمجھ لیا تو پھر ترقی ناممکن ہے اور پھر یہ مجازی عشق بھی زائل ہو جائے گا۔

خلق پندارند عشرت میکند | بر خیالے پرِّ خود بر میکند

لوگوں کو گمان ہے کہ وہ عیش کر رہے ہیں (حالانکہ) ایک خیال میں مبتلا ہو کر اپنی ترقی کے پر اکھیڑ رہے ہیں۔ (۲۰۹/۳)

مطلب یہ کہ مجازی عاشق مجازی دلبروں سے بوس و کنار کرنے کو سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہیں، حالانکہ وہ اپنی حقیقی کامیابی کے ذرائع کو برباد کر رہے ہیں۔ اسی طرح معبودانِ باطل کے پرستار اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ حق پر نہیں ہیں اور اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں۔

عشقِ حقیقی کی طرف کوشاں رہنا ضروری ہے

اگرچہ دنیا کے بادشاہوں کے سپرد کوئی کام نہیں کیا جاتا لیکن اللہ تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے وہ بھی اپنی

مخلوق کی دیکھ بھال اور اپنی ربوبیت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں انہماک رکھتا ہے اور ہر روز نئے نئے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنا ایسے ہی ہے، جیسے کہ کوئی بیمار نہ بھی ہو تو بھی واویلا کرتا رہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ بیکار غفلت میں بیٹھے رہنے کی بجائے کچھ نہ کچھ کوشش (خواہ بیہودہ ہی کیوں نہ ہو) کرتے رہو۔ آئندہ صفحات پر آنے والے مضمون میں عشق کی خوبیوں کا ذکر اس لئے کیا جا رہا ہے کہ لوگوں کو عشق کی افادیت کا اندازہ ہو سکے۔

دوست دارد دوست ایں آشفتگی　　　کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

اگرچہ اس مہربان حقیقی کے حکم پر ثمرہ کوشش موقوف ہے تاہم وہ اس قسم کی متردّدانہ اور نامکمل کوشش کی پریشانی کو پسند کرتا ہے۔ (۲۰۲/۱)

(کیونکہ) خوابِ (غفلت) سے سعی بے ثمر ہی بھلی۔ (یعنی ایک حالت سے دوسری حالت میں جانا ہجرت ہے اگر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو۔ آشفتگیٔ ظاہر سے آشفتگیٔ باطن کی طرف جانا اللہ کو پسند ہے۔ اگرچہ ہجرت پوری نہ ہو پھر بھی اس کا اجر مل سکتا ہے، اس لئے خواب غفلت میں پڑے رہنے سے تھوڑی سی کوشش کرنا بہرحال بہتر ہے۔

آنکہ او شاہ است او بیکار نیست　　　نالہ ازوے طرفہ کو بیمار نیست

(دیکھو) وہ ذات پاک (جو شہنشاہ حقیقی) ہے وہ (بھی) بیکار نہیں۔ اس شخص کی زاری عجیب بات ہے جو بیمار نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اسے محنت کی ضرورت نہیں پھر بھی وہ مخلوق کے کام میں مصروف رہتا ہے، یعنی اس کا مصروف ہونا ایسے ہی عجیب بات ہے جیسے کوئی شخص بیمار نہ ہو اور پھر نالہ کرے (۲۰۲/۱)

بہر ایں فرمودہ رحمان اے پسر!　　　کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ اے پسر!

بیٹا! اسی لئے (اس) مہربانِ حقیقی نے (سورۂ رحمٰن میں) آیہ کُلَّ یَوْمٍ الخ فرمائی ہے، یعنی وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں ہے، یہاں اُوپر والے شعر کی دلیل قرآن سے دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں ہے۔ (۲۰۲/۱)

ہر کہ او از اصلِ فطرت خوب زاد　　　آئینہء در پیش او باید نہاد

جو شخص اصل فطرت سے خوب صورت پیدا ہوا ہو، اس کے روبرو آئینہ رکھنا چاہیے۔ (۳۲۹/۱)

عاشقِ آئینہ باشد روئے خوب　　　صیقل جاں آمد از تقویٰ القلوب

(ہاں ہاں) ایک خوب صورت شخص ہی آئینے کا دلدادہ ہو سکتا ہے (نہ کہ بدصورت) روح کا صیقل ہونا (جس سے وہ آئینہ بن جاتی ہے) دلوں کے تقویٰ سے (میسّر ہو سکتا) ہے۔ (۳۲۹/۱)

باز آں جاں چونکہ محوِ عشق گشت　　　یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ آمد بعد کشت

پھر جب وہ (انسانی) جان عشق (حق) میں مستغرق ہو گئی تو وہ گندم بوئے جانے کے بعد یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (کا مصداق) بن گئی۔ (۳۳۰/۱)

جس میں مجازی عشق کا مادہ نہ ہو، وہ عشقِ حقیقی کے قابل نہیں ہوتا

عشق مجازی غیراللہ کی ہر چیز سے محبت کو کہا جا سکتا ہے اور اگر اللہ کی محبت بھی شامل ہو اور غیراللہ سے بھی محبت ہو تو یہ بھی اللہ کی ہی محبت کے ضمن میں ایک محبت کہلائے گی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق ایک روایت ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب وہ چھوٹے سے بچے تھے تو انہوں نے حضرت سے سوال کیا کہ ''ابا جان کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟'' والدِ گرامیؓ نے فرمایا کہ ''ہاں ہے!'' پھر پوچھا کہ ''کیا آپ کو میرے بھائی حسنؓ سے بھی محبت ہے؟'' تو فرمایا: ''ہاں ہے۔'' پھر پوچھا کہ ''کیا آپ کو ہماری امیؓ سے محبت ہے؟'' تو آپ نے فرمایا: ''ہاں ہے!'' پھر پوچھا: ''کیا آپ کو ہمارے ناناً سے محبت ہے؟'' تو فرمایا: ''ہاں ہے!'' حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑے ادب سے پوچھا ''ابا جان! کیا یہ محبت ہے یا کباڑ خانہ ہے؟'' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیٹے کو اُٹھایا اور ان کا ماتھا چوما اور پھر فرمایا کہ بیٹا! یہ محبت اگرچہ ان تمام لوگوں سے ہے جن کے تم نے نام لئے مگر یہ سب ایک ہی کی محبت کہلائے گی۔'' (کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں تمام محبتیں شامل ہیں جن کا اس نے حکم بھی دیا ہے۔) کسی سے محبت اللہ کے لیے ہو تو ہر ایک محبت اللہ کی محبت کا درجہ رکھے گی۔

اس جگہ اس بیان کا منشا یہ ہے کہ جب ایک بچہ اپنے اردگرد کے رشتہ داروں سے محبت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس بچے میں محبت کا جذبہ موجود ہے اور جب وہ اس میں ترقی کرے گا تو عشقِ الٰہی تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جن لوگوں کو کسی سے محبت نہیں تو اُن میں محبتِ الٰہی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو لوگ عشقِ مجازی کے قابل نہیں وہ عموماً عشقِ الٰہی سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ الاّ ماشاء اللہ۔ سرِ دلبراں میں ہے کہ بغیر عشق انسان بے لطف اور مزدور کی سی زندگی کاٹتا ہے۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است

(عشقِ مجازی سے منہ نہ موڑو)

عام انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دُنیا کی محبت کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو محبت کی مٹی اس کے خمیر میں ملی ہوتی ہے مگر بقدرِ استطاعت، کبھی یہ محبت دُنیا کے حسین انسانوں سے میل رکھنے لگتی ہے اور کبھی دُنیا والوں کی محبت سے یکدم چھلانگ لگا کر خدا کی محبت کی طرف آ لپکتی ہے۔ عموماً ہوتا بھی ایسا ہی ہے کہ بندہ (اپنی شہوانی خصلت کے سبب) عورتوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ان میں سے بعض انسان تو ایسے ہیں کہ انہیں کوئی حادثہ یا کوئی برگزیدہ ہستی چشمِ زدن میں اللہ تعالیٰ کے عشق کی طرف موڑ دیتی ہے اور خدا اس کی نظر میں محبوب، مرغوب اور مطلوب بن جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کبھی دھوکے باز اور مکار لوگوں کے رویّے سے تنگ آ کر بالآخر سمجھ لیتا ہے کہ اس دنیا میں دل لگانے کے قابل کوئی نہیں، پھر وہ لوگ

تھک ہار کر اللہ کی محبت کی طرف رغبت کرنے لگتے ہیں۔ ایسی حالتوں کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ "اَلْمَجَازُ قَنْطَرَةُ اَلْحَقِيْقَةِ" یعنی مجازی عشق حقیقی عشق کے لئے ایک پل کا کام دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا جامیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است　　　　که آں بہرِ حقیقت چارہ سازی است

عشق سے منہ نہ موڑو، اگرچہ مجازی عشق ہی (کیوں نہ) ہو کیونکہ مجازی عشق بھی حقیقی عشق کی طرف چارہ سازی کرتا ہے۔ (جامیؒ)

انجیل میں آیا ہے کہ دُنیا کی طرف سے قطع تعلق رہ کر انسان اللہ سے محبت نہیں کر سکتا، کیونکہ تم ایک ایسے انسان سے محبت نہیں کر سکتے جس کو تم نے نہ دیکھا ہو تو پھر ایسے خدا سے کیسے محبت کر سکتے ہو جس کو تم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اس بات کا توڑ قرآن مجید کی ابتدائی آیات میں ہی آ گیا ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے، جس میں شک و شُبہ کی گنجائش نہیں اور یہ ان متقیوں کو ہدایت دیتی ہے جو بغیر دیکھے غیب کی باتوں پر اعتبار اور یقین رکھتے ہیں۔ حضرت غنی کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

زفیضِ عشق دلہائے مخالف مہر باں گردد　　　　زآتشِ رشتہائے شمع باہم یک زباں گردد

عشق کے فیض سے مخالفت رکھنے والے دل مہربان ہو جاتے ہیں، آگ کے باعث شمع تمام رشتوں کو یکساں کر دیتی ہے۔ (تائب)

موم در دامنِ دریائے کرم عنبر شد　　　　کفر در عشق محال است کہ ایماں نشود

دریائے کرم میں موم عنبر بن جاتا ہے، ایماں کی سنگت مل جائے تو یہ محال ہے کہ کفر عشق میں تبدیل نہ ہو۔ (تائبؔ)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشق سب کا استاد ہے، اس نے ہزاروں ذروں کو اتحاد بخشا ہے۔

آفریں بر عشق کُلِّ اوستاد　　　　صد ہزاراں ذرّہ را داد اتحاد

عشق کو آفریں ہے جو (اتحاد رکھنے میں) استادِ کامل ہے، اس نے لاکھوں ذرّوں کو متحد کر دیا ہے۔ (۳۴۹/۲)

ولیؔ نامی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا

کمالاتِ محبت

محبت کا ڈھنگ اگر کسی کو آتا ہے تو اس کے لئے ہر پست کو بلند، تلخ کو شیریں اور ناکام کو کامیاب بنانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جس گھرانے میں محبت کا جادو چلتا ہے اس کے رہنے والے جنتِ فردوس کی سی زندگی گزارتے ہیں اور کم آمدنی میں خوش و خُرم رہتے ہیں۔ مولاناؒ کے پیش کردہ ایک لطیف نکتے پر غور فرمائیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ جب کسی گھرانے کے لوگ محبت کی زندگی گذارتے ہیں تو ان کا طریق محبت کرنا ہو جاتا ہے۔ ایک مزدور دن بھر اپنی کمر پر بوجھ اُٹھا کر کام کرتا ہے اور ایک لوہار اپنی دکان کی بھٹی میں منہ سر کالا کرنے کے بعد نہایت خوشی سے

گھر کو لوٹتا ہے تا کہ اپنی گھر کی محبوبہ کو خوش کرے اور سامانِ حیات مہیا کر سکے۔ یہ کاروبارِ حیات جو صبح سے شام تک چلتا ہے اس میں یہی عشق کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے، ورنہ کون ہے جو کسی کی خاطر اپنے آپ کو پریشانی اور مصیبت میں ڈالے۔ یہ سب عشق کی بدولت ہے۔ عشق ایک رُوحانی چیز ہے اور یہ ایسی جنس نہیں کہ جس کو بازار سے خرید لیا جائے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مال و دولت اور دنیا کی چیزیں سب مردہ ہیں، مگر ان سب کے حصول کی کوشش زندہ لوگوں کے لئے ہوتی ہیں۔ جب عشق کا مقصود کسی زندہ کے لئے ہے تو عشق کو ایسی ہستی کے ساتھ لگانا ضروری ہے جو سراپا حیات اور حیات بخش ہو۔ ثابت ہوا کہ محبت کا واسطہ حیاتِ ابدی کے ساتھ ہے۔ اسی لئے مولاناؒ نے فرمایا ؎

عشقِ آں زندہ گزیں کو باقی است　　وز شرابِ جاں فزایت ساقی است

اس کا عشق اختیار کرو جو زندہ ہے اور جو روح افزا شراب پلانے والا ساقی ہے۔ (۵۴/۱)

ہر کرا با مردہ سودائے بود　　بر امید زندہ سیمائے بود

جو کسی بے جان کا عاشق ہوتا ہے اس کی اُمید کسی زندہ چہرے کے لئے ہوتی ہے۔ (۶۲/۳)

بر امیدِ زندۂ کن اجتہاد　　کو نگردد بعد روزے دو جماد

زندہ کی اُمید پر کوشش کر، جو دو دن بعد جماد نہ بن جائے۔ (۶۲/۳)

دُنیا کی محبتیں متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ نفرت محبت میں اور محبت نفرت میں تبدیل ہو جایا کرتی ہے۔ بچہ روتا ہے اور اسکول جانے سے ڈرتا ہے اور جب انس ہو جائے تو مکتب اور معلّم کی محبت پیدا ہو جاتی ہے ؎

انس تو با شیر و با پستاں نہ ماند　　نفرتِ تو از دبیرستاں نہ ماند

دودھ اور پستان سے تیری محبت نہ رہی، مکتب سے اب تیری نفرت نہ رہی۔ (۲۳/۵)

دُنیا میں کسی کا حسن ذاتی نہیں، جہاں حسن نظر آتا ہے وہاں حسنِ ازلی کا پرتو ہے۔ حسین چیز وہی ہے جس پر آفتاب ازلی کی کرنیں پڑتی ہیں، جہاں سے شعاع ہٹ گئی وہاں اس چیز کا عارضی حسن غائب ہو گیا۔ مجنوں نے ایک دن اللہ سے شکایت کی کہ الٰہی! تو نے مجھے لیلیٰ کے عشق میں گرفتار کر کے رسوائے زمانہ کر دیا ہے تو جواب ملا۔ ؎

عشقِ لیلیٰ نیست ایں کارِ من است　　حسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است

یہ لیلیٰ کا عشق نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا کام ہے، لیلیٰ کا حسن ہمارے رخسار کا ہی عکس ہے۔ (غیر مثنوی)

علامہ اقبالؒ نے بھی فرمایا ہے کہ تم جانتے ہو کہ عشق کہاں سے آیا ہے، پھر اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ یہ مصطفٰے ﷺ کے آفتاب کی ایک شعاع ہے ؎

می نہ دانی عشق و مستی از کجا ست　　ایں شعاعِ آفتابِ مصطفٰے ﷺ است

تم نہیں جانتے کہ یہ عشق اور مستی کہاں سے آئی ہے، یہ آفتابِ مصطفٰے ﷺ کی ایک شعاع ہے۔ (پس۔ چہ۔ ۸۶۴)

عارف رومیؒ فرماتے ہیں، بعض اکابر صوفیاء اپنے مریدوں کو خصوصی علم، کشف و کرامات اور عبادت کے خاص انداز ذہن نشین نہیں کرواتے اور وہ ایک عمومی تعلیم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے بندوں سے محبت کرو، عبادت اور صوم و صلوٰۃ کے علاوہ ذکر و اذکار میں زیادہ کوشش کرو وغیرہ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مرید کا فہم کھل جائے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ محبت وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر تلخی کو شیریں بنا دیتی ہے، مسِ خام کو سونا بنا دیتی ہے اور محبت ہی غم کی دوا اور مرض کی شفاء ہے، محبت کانٹوں کو پھول اور سرکے کو شراب بنا دیتی ہے، محبت میں پھانسی کے تختے پر چڑھنے والا خود کو تختِ عزت پر بلند ہوتا ہوا دیکھتا ہے، پتھر دل اس سے پسیجتے ہیں اور غم خوشی میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جس گھر میں محبت ہو وہ گھر روشن ہو جاتا ہے۔ صائب نے عشق کی تعریف میں بہت کلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کفر میں بھی عشق کی دولت مل جائے تو یہ محال ہے کہ وہ ایمان میں تبدیل نہ ہو جائے ؎

ع کفر در عشق محال است کہ ایماں نشود

''مثنوی مولانا رومؒ'' میں سے محبت کے متعلق کچھ اشعار (باترجمہ) پیش کئے جا رہے ہیں اور ان کے مطالب بھی اشعار کے ساتھ ساتھ بآسانی سمجھ آ جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

از محبت تلخہا شیریں شود — از محبت مسّہا زرّیں شود

محبت کی وجہ سے کڑوی چیزیں میٹھی ہو جاتی ہیں، محبت سے مختلف تانبے سونا بن جاتے ہیں۔ (۱۵۳/۲)

از محبت دُردہا صافی شود — وز محبت دردہا شافی شود

محبت سے تلچھٹیں صاف ہو جاتی ہیں اور محبت سے درد شفا بخشنے والا بن جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت خار ہا گل می شود — وز محبت سرکہا مل می شود

محبت سے کانٹے پھول بن جاتے ہیں اور محبت سے سرکے شراب بن جاتے ہیں۔ (۱۵۳/۲)

از محبت سجن گلشن می شود — بے محبت روضہ گلخن می شود

محبت سے قیدخانہ چمن بن جاتا ہے، بغیر محبت کے باغ بھٹی بن جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت نار نورے می شود — وز محبت دیو حورے می شود

محبت سے آگ نور بن جاتی ہے اور محبت سے جن حور بن جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت سنگ روغن می شود — بے محبت موم آہن می شود

محبت سے پتھر تیل بن جاتا ہے، بغیر محبت کے موم لوہا بن جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت حزن شادی می شود — وز محبت غُول ہادی می شود

محبت سے غم خوشی بن جاتا ہے اور محبت سے چھلاوا راہبر بن جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت نیش نوشے می شود وز محبت شیر موشے می شود

محبت سے ڈنگ شہد بن جاتا ہے، محبت سے شیر چوہا بن جاتا ہے یعنی بے ضرر ہو جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت سُقم صحت می شود وز محبت قہر رحمت می شود

محبت سے بیماری تندرستی بن جاتی ہے اور محبت سے قہر رحمت ہو جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت خار سوسن می شود وز محبت خانہ روشن می شود

محبت سے کانٹا سوسن (پھول) بن جاتا ہے اور محبت سے گھر روشن ہو جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

از محبت مردہ زندہ می شود وز محبت شاہ بندہ می شود

محبت سے مردہ زندہ ہو جاتا ہے اور محبت سے شاہ غلام بن جاتا ہے۔ (۱۵۳/۲)

ایں محبت ہم نتیجہ دانش ست کے گزافہ بر چنیں تختے نشست

یہ محبت بھی سمجھ کا نتیجہ ہے، بکواسی ایسے تخت پر کب بیٹھ سکتا ہے؟ (۱۵۴/۲)

دانشِ ناقص کجا ایں عشق زاد عشق زاید ناقص اَما بر جماد

ناقص عقل نے یہ عشق کب جنا ہے؟ ناقص (عقل) عشق پیدا کرتی ہے لیکن پتھر سے۔ (۱۵۴/۲)

کفرِ فرعونے و ہر گبرِ عنید جملہ از نقصانِ عقل آمد پدید

فرعون کا کفر اور ہر سرکش کا کفر، سب عقل کی کمی سے رونما ہوا ہے۔ (۱۵۴/۲)

مجازی صورتوں کے عشق سے باز رہو

صورتوں کے عشق کا انجام رُسوائی ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صورت نہیں اس لئے اس خدائے قدوس سے عشق کرو، خواہ اس جہاں میں یا اگلے جہاں میں ہو۔ انسان صورتوں سے محبت کرتے ہیں اور جب ان کا معشوق مر جائے تو اس کو چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ فانی ہے۔ محبت صرف خدائے زندہ کی روا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے اور جو اس کے ساتھ پیوست ہو جائے اس پر موت بھی حرام ہے۔ عشق کرنے سے پہلے معلوم کرو کہ کوئی تمہارا معشوق بننے کے قابل ہے کہ نہیں۔ یاد رکھو کہ محبت کرنے کے قابل صرف خدا کی ذات ہے، باقی سب دھوکہ ومکر وفریب ہے۔ ایک اور پہچان یہ ہے کہ جس کا عشق حسن اور صفات میں تبدیل نہیں ہوتا وہ ہمیشہ بے بدل ہے اس لئے وہی ذات پیار کیے جانے کے قابل ہے۔

ہیں رہا کُن عشقہائے صورتی نیست بر صورت نہ بر روئے ستی

خبردار! صورت کے عشقوں کو چھوڑ دو، وہ (عشق) بیوی کے چہرہ اور صورت پر نہیں ہے۔ (۷۷/۲)

آنچہ معشوقست صورت نیست آں　　　　خواہ عشق ایں جہاں خواہ آں جہاں

جس سے عشق ہے وہ صورت نہیں ہے، خواہ اِس جہاں (عالمِ ناسوت) کا عشق ہو یا اُس جہاں (عالمِ ملکوت) کا۔
(۲/۷۷)

آنچہ برصورت تو عاشق گشتۂ　　　　چوں بروں شد جاں چرایش ہشتۂ

جس کی صورت پر تُو عاشق ہو رہا ہے، جب (اُس کی) جان نکل گئی تو اس کو کیوں چھوڑا ہے۔ (۲/۷۷)

صورتش برجاست ایں سیری زچیست　　　　عاشقا وا جو کہ معشوق تو کیست

اس کی صورت موجود ہے یہ دل بھرتا کیوں ہے؟ اے عاشق! ڈھونڈ کہ تیرا معشوق کون ہے۔ (۲/۷۷)

آنچہ محسوس ست گر معشوق است　　　　عاشقستے ہر کہ اورا حس ہست

اگر محسوس چیز ہی معشوق ہے تو جس میں بھی حسِ ہے وہ عاشق ہے۔ (۲/۷۷)

چوں وفا آں عشق افزوں می کند　　　　کے وفا صورت دگرگوں می کند

جب وفاداری عشق بڑھاتی ہے، (تو) وفا صورت میں کب تغیر کرتی ہے۔ (۲/۷۷)

عشقِ حقیقی حقیقتِ ظہور، ذاتِ حق بلاحجاب تعینات کو کہتے ہیں (سرِ دلبراں) حقیقت کا استعمال مجاز کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ یہاں حقیقت سے مراد ہے باطن، مجاز سے مراد ظاہر ہے۔ اگر عالمِ شہادت مجاز ہے تو عالمِ مثال حقیقت ہے، اسی طرح عالمِ مثال اگر مجاز ہے تو عالمِ ارواح حقیقت ہے۔ عالمِ ایان عالمِ ارواح کے مقابل میں حقیقت ہے۔ چونکہ ذات مبدع ہر چیز کی حَقِیْقَةُ الْحَقَائِقِ ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ "حَقِیقَةُ کَلِّ شیٍ ھُوَ الْحَقُّ (یعنی ہر چیز کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہے)، بندے کی ذات حق تعالیٰ میں گم ہو جائے تو بندہ اپنی حقیقت کو پا لیتا ہے۔ (سردلبراں)

محبت کی قسمیں :

محبتِ ذاتی سب سے ارفع و اعلیٰ و اتم قسم کی محبت ہے، جسے نہ زوال آتا ہے نہ تغیر نہ تبدل۔ یہاں وجود مجازی بحرِاحدیت میں گم ہو جاتا ہے اور تمام اسما و صفات رنگِ وحدت اختیار کر لیتے ہیں۔ (سردلبراں)

محبتِ حقیقی محبتِ حقیقی نہ آمد کی چیز ہے نہ آورد کی بلکہ اس کی پھینک مختلف لوگوں کے لئے مختلف روزنوں (جھروکوں) سے کی جاتی ہے۔ اس کے چار دروازے ہیں (جن کی تفصیل میں جانا یہاں ضروری نہیں، البتہ مختصر بیان ملاحظہ فرمائیں)۔

۱۔ مبتدیوں کی محبت کا صدور عالمِ شہادت میں مشاہدۂ حسّی کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ طالبوں کی ابتدا ہے۔

۲۔ متوسطین کے لئے محبت کا ظہور نفس کے ذریعے ہوتا ہے۔ نفس جمالِ افعال کی خصوصیات کا مشاہدہ عالمِ غیب اور عالمِ مثال سے کرتا ہے اور یہ مشاہدہ محبت کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنتا ہے۔

۳۔ منتہیوں میں مکاشفاتِ قلبی محبت کے اعلیٰ ترین رُخ کو وجود میں لاتی ہے۔ یہ مقربین کا مقام ہے۔
۴۔ منتہیوں میں روحِ قدسی کے مطالعہ سے محبت کا ایک اور ہی اعلیٰ رُخ طلوع ہوتا ہے۔ یہ صدیقین کا مقام ہے۔

عشقِ ذات اس عشق میں ذات سے سروکار رہتا ہے اور تمکین و استقلال اور قرار و ثبات میں عاشق متمکن ہوتا ہے۔ جمال ہو یا جلال ہر حال میں عاشق ذات سے لطف اندوز ہوتا ہے اور بسا اوقات جمعیت خاطر رہتی ہے۔ جب تک عاشق محوِ مطلق نہیں ہو جاتا اور تعینِ خودی سے تجاوز نہیں کرتا اس وقت تک دردِ طلب اور سوزِ عشق باقی رہتا ہے۔
(سردلبراں)

درد درد اس قلق اور سوزشِ درُونی کو کہتے ہیں جو عاشق فراقِ محبوب اور آرزوئے وصال میں محسوس کرتا ہے۔ عشق وہی ہے جس میں درد کی چاشنی ہو (جسے علامہ اقبالؒ نے ھاؤ ھُو کی کیفیت سے ظاہر کیا ہے) انسان کے لئے درد و عشق دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ موجبِ ترقی درد ہے۔ عشق بدوں درد موصل بہ مطلوب نہیں۔ موصل بہ مطلوب جو چیز ہے وہ درد ہے۔

کفر کافر را و دیں دیندار را ذرّہٗ دردت دلِ عطّار را

کفر کافر کو اور دیندار کو دین مبارک ہو۔ آپ کے درد کا ایک ذرّہ عطار کے دل کے لئے (کافی ہے)۔ (عطّار)

مقامِ عشق محبت کی انتہائی اور اکمل ترین کیفیت و صورت کا نام عشق ہے۔ سب سے اعلیٰ و ارفع عشق بجز ذاتِ حق کے اور کس کے ساتھ ہوسکتا ہے؟ ؎

در ہر چیز نظر کردم غیر از تو نمی بینم غیر از تو کسے باشد، حقا چہ مجال است ایں

میں ہر چیز میں نظر کرتا ہوں تو تیرے سوا اب کچھ نہیں دیکھتا، تیرے سوا کوئی نظر نہیں آتا، سچ ہے کہ کسی کی بھی یہ مجال نہیں۔
(غیر مثنوی)

عشق و محبت کو شراب سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جو مستی اچانک سالک کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ جلوۂ محبوب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مستی عشق، محبت، ذوق، سکر، وجد، معرفت سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ تجلیٔ افعالی وہ ہے جو حق تعالیٰ صورِ مظاہرِ حسی کی کھڑکیوں میں سے اپنے آپ کو عالمِ مثال کی کسی نہ کسی چیز میں ظاہر فرماتا ہے۔ اس تجلی کا سالک پر اثر شراب کی طرح ہوتا ہے۔ سردلبراں میں ہے کہ عبادت بلاعشق کے بیکار ہے اور عشق بغیر عبادت ناتمام ہے۔ زہدِ خشک سے بدتر دُنیا میں کوئی آزار نہیں۔ سلوک کا دار و مدار عشق پر ہے، عشق نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا ہونا ممکن نہیں۔ عشقِ مجازی اور حقیقی پر مولانا رومیؒ کا کچھ کلام اُوپر دے دیا گیا ہے۔ اس کے بعد عشقِ حقیقی کی شان میں بیان کیا گیا مولانا کا کلام آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں، جو کچھ معارف اور معانی اس کلام میں موجود ہیں وہ بھی دے دیئے گئے ہیں۔

عشقِ حقیقی کی خصوصی باتیں

عام طور پر مشہور ہے کہ عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود (یعنی عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے) اسی لئے دنیا کی بڑی بڑی عشق والی جوڑیوں میں عورت کا نام پہلے آتا ہے۔ مثلاً لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور سوہنی مہیوال وغیرہ۔

دوسری بات جو ان عاشقوں میں نظر آتی ہے کہ ان کی محبت پر اللہ تعالیٰ کی محبت کا عکس ہوتا ہے، جس طرح فرمایا ؎

عشقِ لیلیٰ نیست ایں کارِ من است حسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است

یہ لیلیٰ کا عشق نہیں یہ تو میرا کام ہے، لیلیٰ کا حُسن میرے چہرے کا عکس ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان لوگوں کا عشق کبھی نفس کی مُراد پوری ہونے پر ختم نہیں ہوتا اور وہ بغیر ملاپ ہی مر جاتے ہیں، لہٰذا ان کا عشق کامیاب رہتا ہے۔ عشقِ مجازی میں چونکہ نفسانی عمل کا دخل یعنی ملاپ ہو جاتا ہے، لہٰذا نفسانی مُراد پوری ہونے کی تکمیل کی وجہ سے ایسا عشق کبھی وفا پر جا کر ختم نہیں ہوتا۔ اکثر میاں بیوی کا لڑائی جھگڑا اسی لیے رہتا ہے کیونکہ اکثر لوگوں کی محبت نفسانی مراد پوری کرنے کے لیے ہوتی ہے الا ماشاء اللہ۔

پانچواں باب

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

(کمالاتِ عشق)

انسانی کمالات کا حصول عشق سے ہی ممکن ہے

عشق ایک ایسا سمندر ہے جس میں غوطہ زن ہونے والے طرح طرح کے کمالات اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ شخص نہایت خوش قسمت ہے جس کو عشق کا ایک ذرہ ہی مل جائے۔ حقیقتاً ایسے ذرّے کا متحمل ہونا بھی کسی کسی کا کام ہے۔ روایات میں ہے کہ ایک شخص نے اللہ تعالیٰ سے عشق کا ایک ذرّہ مانگا اور اس کے شیخ و مرشد نے بھی اس کی سفارش کی تو اس کو ایک ذرّۂ عشق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا۔ اس عطا کے بعد اس کا یہ حال ہوا کہ وہ دنیا چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں میں نکل گیا اور تڑپتا پھڑکتا رہا۔ آخر اس کے پیر نے اللہ تعالیٰ سے اس کی حالت معتدل کرنے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس عشق کے ایک ذرّے کا ہزارواں حصہ اسے دیا گیا تو پھر کہیں وہ برداشت کرنے کے قابل ہوا۔

بہت سی کتابوں میں عشق کا بیان آیا ہے لیکن ہر ایک اپنی بات کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ جس کی سمجھ میں جو کچھ آیا لکھ دیا لیکن ابھی بھی یہ بیان تشنۂ تکمیل ہے۔ مولانا رومیؒ نے اس مضمون کو نبھانے کی کوشش کی مگر وہ بھی یہ کہہ کر رہ گئے کہ ؎

کاشکے ہستی زبانِ داشتے تا زمستاں پردہا برداشتے

کاش! انسانی ہستی کوئی زبان رکھتی تا کہ عاشقوں کے پردوں کو اُٹھایا جا سکتا۔ (۴۴۸/۳)

ہرچہ گوئی اَیدمِ ہستی ازاں　　　　پردہٗ دیگر بُرو بستی بداں

اے (انسانی) وجود کی گفتگو تو جو کچھ بتاتی ہے سمجھ لے کہ اس پر ایک دوسرا پردہ تُو نے ڈال دیا۔ (۴۴۸/۳)

نیچے دیئے گئے کچھ اشعار کا مثنوی سے انتخاب کیا گیا ہے، ان اشعار سے عشق کی بہت سی کیفیات ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر ان اشعار کو ہی سمجھ لیا جائے تو یہ مولاناؒ کے تخیلات کی کافی حد تک ترجمانی کر دیتے ہیں۔ آپ بھی پڑھیں اور اس کے معانی میں اُترنے کی کوشش کریں۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
(اے عشق خوش رہو کہ تم مبارک جنون ہو)

عارف رومیؒ نے عشق کے موضوع پر کثرت سے والہانہ اور حکیمانہ انداز میں کلام کیا ہے اور بہ تکرار اس کی تمام خوبیوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں عشق کا سودا سما جائے اور وہ اپنی تمام بیماریوں، مشکلات اور پریشانیوں کا علاج عشق کے ذریعے ہی کر سکیں کیونکہ عشق مشکل کُشا ہے اور جو بھی مصیبت یا علّت انسان کو لاحق ہو تو اس کا علاج بآسانی ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولاناؒ ہر شخص کے لئے عشق کا حصول نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور اس کو اپنانے کی تاکید کرتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　　اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

خوش رہ ہمارے اچھے جنون والے عشق، اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب۔ (۳۳/۱)

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما　　　　اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

اے عشق تو ہمارے غرور اور عزت کی دوا ہے اور تو ہمارے لئے افلاطون اور حکیم جالینوس ہے۔ (۳۳/۱)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہر بیماری خواہ جسمانی ہو یا روحانی، اس کا علاج عشق کی وساطت سے ہوسکتا ہے اور انسانی زندگی کے باقی تمام شعائر و شرائع ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کے تمام مصائب کو دُور کرنے والا عشق ہی ہے۔ علامہ اقبالؒ جو مولانا رومیؒ کو اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں، نے بھی عشق کے موضوع پر بہت کلام کیا ہے جو ہم اپنی ایک الگ کتاب میں **"عقل و عشق اور علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی"** کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ علامہؒ نے بھی فرمایا ہے ؎

اقباؔل تیرے عشق نے سب بَل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بعض ظاہر پرست علماء محبت کو مصدرِ حیات اور مقصودِ حیات نہیں سمجھتے اور اسلام کو اپنے زاویۂ نگاہ سے ماپتے ہیں، لہٰذا عقائد کی گتھیاں سلجھانے کے لئے دست و گریبان رہتے ہیں ؎

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

چونکہ حقیقت کو نہیں سمجھتے اس لئے افسانوی معنی اختیار کرتے ہیں۔

جسم خاک از عشق بر افلاک شد

(خاکی جسم عشق سے افلاک تک پہنچ جاتا ہے)

یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ انسان اگرچہ خاک کا پتلا ہے مگر اس میں طاقتِ پرواز اس قدر ہے کہ وہ ثریا کی بلندیوں سے بھی آگے پہنچ سکتا ہے۔ یہی بات علامہ اقبالؒ کو ان کے فلسفۂ خودی کی طرف لے جاتی ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پر عشقِ الٰہی کا اثر طُور کے پہاڑ پر ہوا تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے، گویا عشق پہاڑ کو ریت کی طرح پیس دیتا ہے۔ اگر جملہ انسانی کمال کی تفصیل بیان کی جائے تو وہ اس کتاب کی پہنچ سے باہر کی بات ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھنا درکار ہوں گی لیکن یہاں مولانا رومیؒ کا کلام اختصار سے ہی پیش کیا جا رہا ہے ؎

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد

خاکی جسم عشق کی وجہ سے ہی آسمانوں پر پہنچا، پہاڑ ناچنے لگا اور ہوشیار ہو گیا۔ (۱/۳۳)

عشق جانِ طُور آمد عاشقا　　طُور مست و خَرَّ مُوسیٰ صٰعِقًا

اے عاشق! عشق طور کی جان بنا، طور مست اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گرے۔ (۱/۳۴)

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ　　عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ

عشق سمندر کو دیگ کی طرح کھولا دیتا ہے، عشق پہاڑ کو ریت کی طرح پیس دیتا ہے۔ (۵/۲۷۸)

عشق بشگافد فلک را صد شگاف　　عشق لرزاند زمیں را از گزاف

عشق آسماں میں سو شگاف ڈال دیتا ہے، عشق زمین کو آسانی سے لرزا دیتا ہے۔ (۵/۲۷۸)

بادہ از ما است نے شد ما ازو

(شراب ہمارے عشق سے مست ہے نہ کہ ہم اس سے مست ہوئے)

شراب میں موجود جوش ہے تو وہ بھی ہمارے خون کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح انسان کی خاطر تمام چیزوں کو اس کی خدمت پر لگایا گیا ہے۔ ناصح کا شعر ہے ؎

یہ اپنے لہو کی گرمی ہے، ورنہ اے ناصح
نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل

مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

بادہ در جوشش گدائے جوشِ ماست　　　چرخ در گردش اسیرِ ہوشِ ماست

شراب جوش میں ہمارے (خون کے) جوش کی محتاج ہے، آسمان گردش میں ہمارے ہوش کا قیدی ہے۔ (۱/۳۳)

کوزۂ چشمِ حریصاں پُر نہ شد　　　تا صدف قانع نہ شد پُر دُر نہ شد

حریصوں کی آنکھ کا پیالہ نہ بھرا، جب تک سیپ نے قناعت نہ کی موتی سے نہ بھرا۔ (۱/۳۳)

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد　　　او زحرص و عیب کلّی پاک شد

جس کا جامہ عشق کی وجہ سے چاک ہوا، وہ حرص اور عیب سے بالکل پاک ہوا۔ (۱/۳۳)

ما چو زنبوریم و قالب ہا چو موم　　　خانہ خانہ کردہ قالب را چو موم

ہماری مثال شہد کی مکھی کی سی ہے اور اجسام بہ منزلہ موم کے ہیں، ہماری روح جسم پر اپنا تصرف اس طرح رکھتی ہے، گویا اس نے جسم کو موم کی طرح خانہ خانہ بنا رکھا ہے۔ (۱/۲۰۱)

جُملہ معشوق است و عاشق پردہ

(تمام مخلوق معشوق ہے اور عاشق پردہ ہے)

یہ سارا شعر کنایات پر مشتمل ہے۔ معشوق سے ذاتِ حق، عاشق سے مراد تمام ممکنات اور پردے سے مراد وجودِ ظاہری ہے۔ مردہ سے مراد کالعدم یا مردہ ہونا ہے۔ مولانا رومیؒ اس سے مراد وحدۃ الوجود لیتے ہیں کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے وجود کا ظہور ہے اور مخلوق ایک پردہ ہے۔ دوسرے شعروں میں آپ نے منع فرمایا ہے کہ وحدت الوجود کی بات عام آدمی کے لئے نہ کریں اور یہاں اس شعر میں خواص کے لئے لوگوں کو اسی طرف اشارہ ہے۔ ہر شعر کی مختصر تشریح نیچے کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو زندہ ہے اور دنیا کا نقش مٹ جانے والا ہے ؎

جملہ معشوق ست و عاشق پردہ　　　زندہ معشوق ست و عاشق مردہ

تمام کائنات معشوق (ذاتِ حق) ہے اور عاشق (مخلوق) پردہ ہے، معشوق زندہ ہے اور عاشق مردہ ہے۔ (۱/۳۴)

چوں نہ باشد عشق را پروائے اُو　　　اُو چو مرغے ماند بے پَر، وائے اُو

جب عشق کو اس کی پروا نہ ہو تو وہ بے پر کے پرندے کی طرح ہے، اس کے پر نہ ہونے پر افسوس ہے۔ (۱/۳۴)

یعنی عشق وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے اور عشق کی وجہ سے معشوق کی توجہ بھی اس کی طرف ہو جاتی ہے اور جب معشوق کو پروا نہ رہے تو وہ بے پر و بال رہ جاتا ہے۔

پَر و بال ما کمندِ عشق اُوست　　　مُو کشانش می کشد تا کوئے دوست

ہمارے بال و پر اس کے عشق کی کمند ہیں اور کمند سے اس کے بال کھینچتی ہوئی اس کو دوست کے کوچہ تک لے جاتی ہے۔ (۱/۳۴)

عشق خواہد کایں سخن بیروں رود　　آئینہ ات غماز نبود چوں بود

عشق چاہتا ہے کہ یہ بات ظاہر ہو، تیرا آئینہ غماز نہ ہو تو پھر یہ کیوں کر ہو؟ (۳۴/۱)

عشق تو چاہتا ہے کہ خدا کا نور مخلوق تک پہنچ جائے مگر جب آئینۂ ضمیر عکس نُما نہ ہو تو یہ بات کیسے ہو سکتی ہے؟

آئینہ ات دانی چرا غماز نیست　　زانکہ زنگار از رخش ممتاز نیست

جانتا ہے تیرا آئینہ غماز کیوں نہیں ہے، اس لئے کہ زنگ اس کے چہرے سے علیحدہ نہیں ہوا ہے۔ (۳۵/۱)

جب تک دل کے آئینے سے زنگار دور نہ کیا جائے اس وقت تک آئینہ عکس نما نہیں ہوتا۔

دردِ عشق پر ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے درس نہیں دیا

حضرت ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کامل عاشق تھے اور درس کے بھی ماہر تھے لیکن دردِ عشق کا انہوں نے کبھی درس نہ دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ عشق کی کیفیت کو گفتی نہیں کہتے تھے، جس کی کیفیت حال سے ہو، وہ قال میں نہیں آتی اور پھر طلبا کے درس میں عشق پر بات نہیں ہوا کرتی ۔

آں طرف کہ عشق می افزود درد　　بوحنیفہؒ و شافعیؒ درسے نکرد

جس پہلو سے عشق نے درد بڑھایا ہے، ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ نے سبق نہیں پڑھایا۔ (۳۶۶/۳)

عاشقاں را ہر زمانے مُرد نیست　　مردن عشاق خود یک نوع نیست

عاشقوں کی ہر گھڑی ایک موت نہیں (بلکہ کئی موتیں ہیں)، عاشقوں کی موت ایک قسم کی نہیں ہے، ایک موت کی جگہ اسے کئی جانیں ملتی ہیں۔ (۳۶۶/۳)

او دو صد جاں دارد از جانِ ہدٰی　　واں دو صد را می کند ہر دم فدا

وہ نورِ ہدایت سے دو سو جانیں رکھتا ہے اور ان دو سو کو ہر وقت قربان کرتا ہے اور ہر زماں از غیب جانِ دیگر است کا قائل ہے۔ (۳۶۶/۳)

ہر کہ در خلوت بہ بینش یافت راہ　　او ز دانشہا نجوید دستگاہ

جس نے خلوت میں بصیرت کا راستہ پا لیا وہ علوم میں مہارت کا طلب گار نہیں ہوتا۔ (۳۶۸/۳)

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
(عشق اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتا ہے)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عشق ہر چیز کو سوائے اللہ کے جلا دیتا ہے، اس عشق میں ''لا'' کی تلوار سے ہر چیز کاٹ دی جاتی ہے ۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت　　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
عشق وہ شعلہ ہے، جب روشن ہو گیا تو جو کچھ معشوق کے علاوہ ہے، سب جل گیا۔ (۶۹/۵)

تیغ ''لا'' در قتلِ غیرِ حق براند　　　در نگر زاں پس کہ بعدِ ''لا'' چہ ماند
اس نے لا کی تلوار اللہ کے سوا پر چلا دی، غور کرو کہ ''لا'' کے بعد کیا رہ گیا؟ (۶۹/۵)

ماند إلّا اللہ باقی جملہ رفت　　　شاد باش اے عشق شرکت سوز زفت
''إلّا اللہ'' رہ گیا، باقی سب فنا ہو گیا، اے عشق شرکت کو جلانے والے زبردست! تو خوش رہ۔ (۶۹/۵)

تو بیک خواری گریزانی زعشق　　　تو بجز نامے چہ میدانی زعشق
تُو ایک ذلت کی وجہ سے عشق سے بھاگ جانے والا ہے، تُو عشق کے نام کے سوا کیا جانتا ہے۔ (۱۲۲/۵)

عشق را صد ناز و استکبار ہست　　　عشق با صد ناز می آید بدست
عشق کے سینکڑوں ناز اور بڑائیاں ہوتی ہیں، عشق سینکڑوں نازوں سے ہاتھ آتا ہے۔ (۱۲۲/۵)

عشق چوں وافی ست وافی میخرد　　　در حریفِ بیوفا می ننگرد
عشق چونکہ وفادار ہے، وفادار کا خریدار ہے، بے وفا مدِ مقابل کی طرف نظر نہیں کرتا۔ (۱۲۲/۵)

عاشقاں را شُد مدرس حسنِ دوست
(عاشقوں کا استاد حسنِ دوست ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عاشق کے لئے محبوب کا حسن ہی سب کام کرتا ہے، کبھی وہ پیغام رسانی کے لئے مائل ہوتا ہے تو کبھی وہ ہوا کو قاصد بناتا ہے اور کبھی کسی شخص کو یہ منصب سونپتا ہے مگر ہر طرف اس کو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ کبھی وہ عشق کو بلائے بے درماں اور کبھی اس کو مدارِ زندگی سمجھتا ہے۔ کبھی وہ فنا کے مقام تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے وجود کو بھلا دیتا ہے۔ کبھی وہ وحشت میں تنہا بیٹھ کر گریہ و زاری کرتا ہے اور بے سروسامانی اس کے لئے راحت بن جاتی ہے۔ جب کوئی عشقِ حقیقی کی راہ پر آنے لگے تو حسنِ دوست ہی عاشق کا استاد بن جاتا ہے اور اسی سے اسے رہنمائی ملتی ہے۔

عاشقاں را شُد مدرس حُسنِ دوست　　　دفتر و درس و سبق شاں رُوئے اوست
محبوب کا حُسن ہی عاشقوں کا مدرس بن گیا ہے، ان کی کتاب، درس اور سبق اس کا چہرہ ہوتا ہے۔ (۳۶۷/۳)

درسِ شاں آشوب و چرخ و زلزلہ　　　نے زیارات ست و باب و سلسلہ
ان کا سبق، شور، رقص اور جوش ہے، نہ کہ زیارات، باب اور سلسلہ۔ (۳۶۷/۳)

عشقِ را با پنج و شش را کار نیست　　　مقصدِ او جُز کہ جذبِ یار نیست
عشق کو اعداد سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اس کا مقصد تو یار کے ساتھ جذب کے سوا اور کچھ نہیں۔ (۱۵/۶)

چھٹا باب

عشقِ آں زندہ گزیں کو باقی است

(عشق کو ایسی چیز پر لگاؤ جو سراپا حیات ہو)

عارف رومیؒ فرماتے ہیں کہ روزمرہ کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے لوگ بہت محنت، مزدوری اور مشقت کے کام کرتے ہیں۔ ایک مزدور بوجھ اس لئے اُٹھاتا ہے کہ جب وہ مزدوری کی رقم گھر لے کر جائے گا تو وہ ایک محبوبہ کا دل خوش کرے گا۔ ایک لوہار اپنے کپڑے اور چہرہ سیاہ کر رہا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ گھر کی حور کے لئے سامانِ حیات مہیا کرے۔ ایک دکاندار صبح سے شام تک گھٹنا ٹیک کر دکان پر بیٹھتا ہے تا کہ اپنے گھر کے محبوبوں کے لئے ضرورت اور زیبائش کے سامان مہیا کر سکے۔ یہ سب کوششیں مادی ہیں اور یہ انسان کی پستی کے عالم سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن عشق کے باعث یہ سب کوششیں بلند ہو کر رُوحانی عالم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ محبت سے کام کیے جائیں تو یہ عالمِ رُوحانی کا جزو بن جاتے ہیں کیونکہ محبت کوئی مادی چیز نہیں۔ اسلام نے ان کاموں کو اور اپنی عورتوں اور اولاد کی ضروریات کو مہیا کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ حدیث پاک ہے:

اَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ اللهِ (کسب کرنے والا اللہ کا دوست ہے)

گھر میں اگر اچھی رفیقۂ حیات ہو تو زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اور جھونپڑی بھی محلاتِ شاہی سے افضل ہو جاتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

تلخ از شیریں لباں خوش می شود　　خار از گلزار دلکش می شود

شیریں لب والوں سے کڑوا میٹھا ہو جاتا ہے اور چمن کی وجہ سے کانٹا دلکش ہو جاتا ہے۔ (۶۲/۳)

اے بسا از نازنیناں خار کش　　　بر امیدِ گلعذار ماہ وش

بہت سے نازوں کے پالے کانٹے چننے والے ہیں، گلاب جیسے رخسار، چاند جیسے چہرے والے (معشوق) کی اُمید پر۔ (۶۲/۳)

اے بسا حمّال گشتہ پشت ریش　　　از برائے دلبر مہ روئے خویش

بہت سے بوجھ اُٹھانے والوں کی کمر زخمی ہے، اپنے چاند جیسے مکھڑے والے معشوق کے لئے۔ (۶۲/۳)

کردہ آہن گر جمالِ خود سیاہ　　　تا کہ شب آید ببوسد روئے ماہ

لوہار نے اپنا حسن کالا کیا ہے تا کہ رات آئے تو چاند جیسے منہ والی کا بوسہ لے۔ (۶۲/۳)

خواجہ تا شب بر دکانے چار میخ　　　زانکہ سروے در دلش کردست بیخ

خواجہ رات تک دُکان میں قیدی بنا رہتا ہے اس لئے کہ ایک سروقد نے اس کے دل میں جڑ کر لی ہے۔ (۶۲/۳)

آں دروگر روئے آوردہ بچوب　　　بر امیدے خدمتِ مہ روئے خوب

وہ بڑھئی لکڑی کی طرف متوجہ ہے، خوبصورت ماہ رو کی خدمت کی اُمید پر۔ (۶۲/۳)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مال و اسباب تمام مردہ اور جماد ہیں لیکن ان کے حصول کی کوشش کسی زندہ ہستی کے لئے ہے، اگر انسان کا مقصد یہی ہو کہ تمام کام فرمانِ الٰہی کے ماتحت ہوں تو یہ کام عبادت بن جاتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دُنیاوی کوششوں کو ایسی ہستی کے ساتھ کیوں نہیں لگاتے جو سراپا حیات اور حیات بخش ہیں۔ دُنیا کی تمام چیزیں فانی ہیں۔ اصل محبت جسمِ فانی کی محبت نہیں۔ اپنی محبت کو حیاتِ ابدی سے وابستہ کریں جو پائیدار محبتوں کے لیے جامع ہے۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ گھر بار کے لئے کام کرنا بھی عبادت ہے مگر اس عبادت کی بہتر شکل اس میں ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی عبادت کے رنگ میں ہو تا کہ دُنیاوی کام بھی عبادت کا درجہ حاصل کر لیں ؎

ہر کرا با مردہ سودائے بود　　　بر امیدِ زندہ سیمائے بود

جو کسی بے جان کا عاشق ہوتا ہے وہ زندہ چہرے والے کی اُمید پر ہوتا ہے۔ (۶۲/۳)

بر امیدِ زندۂ کُن اجتہاد　　　کو نگردد بعد روزے دو جماد

زندہ کی اُمید پر کوشش کر جو دو روز کے بعد جماد نہ بنے۔ (۶۲/۳)

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است　　　وز شرابِ جاں فزایت ساقی است

اس زندہ کا عشق اختیار کر جو سدا رہنے والا ہے اور جان فزا شراب سے تجھے سیراب کرنے والا ہے۔ (۵۴/۱)

انسان کی انسان سے محبت اگرچہ لازوال ہے مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر یہ محبت ظاہری ہو تو اس میں زوال آ ہی جاتا ہے، مثلاً ماں باپ سے محبت، جب اولاد بڑی ہو جائے تو اکثر اوقات کم ہو جاتی ہے۔ بچہ اسکول میں جانے سے گھبراتا ہے لیکن جب بڑا ہوتا ہے تو بچے کو زبردستی اسکول لے جانے والی بات اچھی نہیں لگتی۔ مولاناؒ

فرماتے ہیں کہ ؎

انس تو با شیر و با پستاں نماند | نفرتِ تو از دبیرستاں نماند

دودھ اور پستان کے ساتھ تیری محبت نہ رہی، مکتب سے تیری نفرت نہ رہی۔ (۶۳/۳)

فرماتے ہیں کہ دُنیا کی کوئی چیز اپنا حسنِ ذاتی نہیں رکھتی اور جہاں بھی کوئی حسن ہے وہ حسنِ ازلی کا پرتو ہے، حسنِ ازلی وہ ہے جس پر آفتابِ ازلی کی شعاعیں پڑ رہی ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ؎

آں شعاعے بود بر دیوارِ شاں | جانب خورشید وارفت آں نشاں

ان کی دیوار پر وہ ایک کرن تھی، وہ نشانی سورج کی جانب لوٹ گئی۔ (۶۳/۳)

عشق تو بر ہرچہ آں موجود بود | آں زوصفِ حق چو زر اندود بود

جس موجود پر تیرا عشق تھا وہ اللہ تعالیٰ کی صفت سے ملمع شدہ تھی۔ (۶۳/۳)

چوں زرے بااصل رفت و مس بماند | وز زریٔ خویشتن مفلس بماند

جو سونا اصل کی طرف چلا گیا، تانبا رہ گیا اور وہ اپنے سونے پن سے خالی رہ گیا۔ (۶۳/۳)

اصل عشق خدا کا ہی عشق ہے

فانی چیز کا عشق بھی فانی ہے لیکن معشوقِ حقیقی تو حیّ و قیوّم اور دائم ہے، اس کا عشق ابدی ہے۔ عشق تو ایک بلند پایہ چیز ہے۔ فانی چیز کا عشق ناپائیدار ہوتا ہے کیونکہ فانی چیز فنا ہو کر واپس نہیں آسکتی۔ جب ایک چیز کا وصل اس کے فنا ہونے کے بعد عقلاً و عادۃً محال ہے تو اس کا عشق بھی فضول ہے۔ غنچۂ گلِ نو شگفتہ کی بہار جو بلبل کے شیدا ہونے کی شیفتگی کے باعث چند روزہ ہے لیکن زندہ عشق اس کے معاملے میں تازہ رہتا ہے ؎

عشقِ زندہ در روان و در بصر | ہر دمے باشد زغنچہ تازہ تر

زندہ (معشوق یعنی حیّ و قیوم) کا عشق ہے (یہی) ہر دم جان و بینائی میں غنچہ سے بڑھ کر تازہ رہتا ہے۔ (۵۴/۱)

عشق آں زندہ گزیں کو باقی ست | وز شرابِ جانفزایت ساقی ست

(اے طالب) اس زندہ (معشوق حقیقی) کا عشق اختیار کر جو سدا سلامت ہے اور جو (محبت کی) جان فزا شراب تجھ کو پلانے والا ہے۔ (۵۴/۱)

اس ذات پاک کا عشق اختیار کرو، جس کے عشق سے تمام انبیاء معزّز و ممتاز ہوئے۔ عشقِ مجازی میں دل و دماغ کی ابتری اور کاوشِ جاں مضر ہے مگر عشقِ حقیقی جانفزا اور رُوح پرور ہے، اس میں بے انتہا رُوحانی ترقیاں ہیں، بخلاف اس کے مخلوق کا عشق باعثِ ذلت و خواری ہے۔

بے شک بارگاہِ خدا کی شان بلند ہے۔ اس کا عشق انسان کو عالی مرتبہ بنا دیتا ہے اور انسان حقیر کی وہاں باریابی ایک مشکل امر ہے مگر تم مایوس نہ ہو۔ وہ کریم و کارساز خود اپنے بندوں کو رسائی عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

جو میری طرف بالشت بھر قریب ہوتا ہے، میں اس کی طرف گز بھر قریب ہو جاتا ہوں۔ (مشکوۃ شریف)

عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء یافتند از عشق او کار و کیا

اس کا عشق اختیار کر کہ تمام نبیوں نے اس کے عشق سے عزّو شرف پایا۔ (۵۴/۱)

عاشقاں جامِ فرح آنگہ کشند کہ بدست خویش خوباں شاں کُشند

عاشق خوشی کا جام اس وقت پیتے ہیں جب کہ معشوق اپنے ہاتھ سے ان کو قتل کرتے ہیں۔ (۵۴/۱)

گر خضرؑ در بحر کشتی را شکست صد درستی در شکستِ خضرؑ ہست

اگرچہ خضرؑ نے سمندر میں کشتی توڑ دی (لیکن) خضرؑ کے توڑنے میں سو درستیاں تھیں۔ (۵۵/۱)

وہم موسیٰؑ باہمہ نور و ہنر شد ازاں محجوب تو بے پر مپر

باوجود تمام نور و ہنر کے موسیٰؑ کا خیال اس تک نہ پہنچا، تو بھی بے پر کی نہ اڑا۔ (۵۵/۱)

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست نائب ست و دست او دستِ خدا ست

وہ (خداوندِ عالم) جو جان عطا کرتا ہے اگر مار ڈالے تو روا ہے (اور اس کے حکم سے بچے کو مارنے والا خضر) اس کا نائب ہے اور اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ (۵۴/۱)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وفا اور جفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔

اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ ''اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ'' (اے پیغمبر ﷺ) جو لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، وہ خدا ہی سے بیعت کر رہے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ (الفتح:۱۰) دستِ خدا کے معنی قدرتِ خدا بھی ہو سکتے ہیں، اس صورت میں یہ مجاز مرسل ہوگا ؎

او بہ نسبت با صفاتِ حق فناست درحقیقت در فنا اورا بقاست

انسان حق تعالیٰ کی صفات کے ساتھ منسوب ہو کر فانی (معدوم) ہے مگر حقیقت میں اُسے (اسی) فنا کے اندر بقائے (دوام حاصل) ہے (پس اس کی بقا تو تمام موجودات کی بقا سے افضل ہے پھر وہ معدوم کیسا؟) (۵۰/۴)

جملہء ارواح در تدبیرِ اوست جملہٗ اشباح ہم در تیرِ اوست

تمام ارواح اس (فانی فی اللہ و باقی بہ بقاء اللہ) کی تدبیر (وتصرف) میں ہیں (کیونکہ وہ حق تعالیٰ کا مرأۃ ومظہر ہے اور) تمام اجسام اس کے زیرِ اثر ہیں (کیونکہ وہ خَلِیفَةُ اللّٰہِ فِي الْاَرْضِ ہے) (۵۰/۴)

گرچہ از لذات بے تاثیر شد لذتے بود او و لذت گیر شد

اگرچہ وہ (مختار بااختیار اللہ) لذّاتِ (دنیویہ) سے خالی ہو گیا مگر یہ ترکِ لذت بھی ایک لذت تھی اور اس سے وہ لذت گیر ہوا۔ (۵۰/۴)

حضرت داؤد علیہ السلام کا لوگوں کو عشقِ الٰہی کی رِقّت سے مارنا

حضرت داؤد علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کا ارادہ کیا مگر جب اس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو وہ منہدم ہوگیا، اسی طرح کئی بار اس کو تعمیر کیا مگر وہ ہر بار منہدم ہو جاتا تو خداوند تعالیٰ کی جناب میں اس کی شکایت کی۔ وحی آئی کہ ''اس مکان کی تعمیر اس شخص کے ہاتھ سے تکمیل پا کر قائم نہیں رہ سکتی جس نے خون ریزیاں کی ہوں۔'' (یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام وعظ فرماتے تو بہت سے لوگ رِقّت کے باعث فوت ہو جاتے۔ اس کی طرف اشارہ ہے) عرض کیا کہ ''الٰہی! کیا یہ خون ریزیاں تیری راہ میں نہیں ہوئیں۔'' فرمایا ''ہاں! میری راہ میں ہوئیں'' یعنی وہ جرم نہ تھیں بلکہ موجبِ ثواب تھیں۔ اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ جہادِ فی سبیل اللہ اور قصاص میں خون ریزی اگرچہ ادائے فرض ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان پر شفقت اور نشاطِ انسانیہ کی حفاظت اہم ہے اور ہدم نشاطِ انسانیہ تعمیر بیت اللہ کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ مولاناؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ہلاک مخلوق غیر انسان اِنہدامِ بیت کا باعث تھی، یہ قصوص کے بیان سے منافی نہیں جس میں نشاطِ انسانیہ کو اس کے ہدم کا باعث ٹھہرایا ہے۔ شاید دونوں سبب موثر ہوں لیکن یہ ہدم انسانیہ اقویٰ ہے کیونکہ انسان بھی بیت اللہ ہے۔ (انتہیٰ کلام بحرالعلوم) اس سے مراد یہ ہے کہ زیرِ بحث قتل اگرچہ غلط نہ تھے مگر اللہ تعالیٰ کی شفقت نے ان کو پسند نہ فرمایا۔ ایک جگہ فرمایا کہ اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ لوگوں کو عذاب دینا پسند نہیں فرماتا۔

گفت مغلوب تو بودم مستِ تو دستِ من بربستہ بود از دستِ تو

عرض کیا (الٰہی) میں (اس وقت تیرے عشق سے) تیرا مغلوب (اور) تیرا مست ہوتا تھا، میرے ہاتھ تیرے دستِ قدرت سے بندھے ہوئے تھے، اس لیے مجھ سے یہ ناحق خون ہو جاتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب حق تعالیٰ کی محبت میں زبور پڑھتے تو انسان اور دیگر جاندار شدتِ اثر سے مر جاتے، حتیٰ کہ حضرت داؤد علیہ السلام بھی اتنا روتے کہ زبور پڑھتے پڑھتے زمین پر گر جاتے اور گھنٹوں بے ہوش رہتے۔ جب ہوش میں آتے تو لوگوں کا نام لے لے کر پوچھتے کہ فلاں فلاں زندہ ہیں یا مر گئے۔ (۴/۴۹)

چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

(عشق کے بیاں سے میں شرمندہ ہو جاتا ہوں)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشق کا پیدا ہونا زاریٔ دل سے ہوتا ہے اور یہ عشق کی بیماری ایسی ہے کہ ایسی بیماری اور کوئی نہیں۔ عشق ایک ایسی مشین ہے جس سے خدا کے بھید معلوم ہوتے ہیں، (اصطرلاب) عاشقی خواہ مجازی ہو یا حقیقی، دونوں ہی خدا تک پہنچا دیتی ہیں۔ عشق ایک ایسی بیماری ہے کہ یہاں زبان اور قلم بے بس ہو جاتے ہیں یعنی اس کے احوال بغیر کسی کی وساطت کے خود بخود کھل جاتے ہیں۔

عاشقی پیداست از زاریٔ دل نیست بیماری چو بیماریٔ دل

دل کی زاری سے عاشقی پیدا ہوتی ہے، دل کی بیماری کے برابر (کوئی) بیماری نہیں۔ (۱/۴۳)

علتِ عاشق زعلتہا جداست عشق اُصطرلابِ اسرارِ خداست

عاشق کا مرض (سارے) امراض سے نرالا ہے، عشق خدا کے بھیدوں کا اُصطرلاب یعنی آلہ ہے۔ (۱/۴۳)

عشق وہ آلہ ہے جس سے اسرارِ معرفت معلوم ہوتے ہیں، اس لئے اصطرلاب کہلاتا ہے۔ (یہ ایک آلے کا نام ہے جس سے سورج کی بلندی اور ستاروں کی گردش وغیرہ کا حال دریافت کیا جاتا ہے)۔

عاشقی گر زیں سر و گر زاں سر است عاقبت مارا بداں شہ رہبر ست

عاشقی خواہ اِدھر کی (مجازی) ہے یا اُدھر کی (حقیقی) ہے، انجام کار ہم کو اس شاہِ محبوب کی طرف لے جاتی ہے (یعنی اللہ کی طرف لے جاتی ہے)۔ (۱/۴۳)

ہرچہ گویم عشق را شرح و بیاں چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

عشق کی تفصیل و بیاں (خواہ) کتنی ہی کروں جب عشق میں آتا ہوں تو اس (بیاں) سے شرمندہ ہوتا ہوں۔ (۱/۴۳)

گرچہ تفسیر زباں روشنگرست لیک عشقِ بے زباں روشن ترست

اگرچہ زبان کی تشریح (مطلب پر) روشنی ڈالنے والی ہے لیکن عشق تو زبان کے بغیر (خود ہی) خوب روشن ہے۔ یعنی عشق میں زبان کھولنے کی ضرورت نہیں، اس کے سب حالات منکشف ہو جاتے ہیں۔ (۱/۴۳)

چوں قلم اندر نوشتن می شتافت چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت

جب قلم (مختلف مضامین کے) لکھنے میں تیزی سے مصروف تھا تو جونہی عشق پر آیا (وہ) قلم خود بخود شق ہو گیا۔ (۱/۴۳)

عاشق کے کردار اور گُفتار سے عشق کی مہک آتی ہے

اگر عاشق کفر کی بات کہے گا تو اس میں بھی دین کی بُو آئے گی۔ اس کے شک کی بات بھی ایسی ہو گی کہ اس میں یقین کی مہک نظر آئے گی، اگر عاشق سچا اور مخلص ہے تو مجازی عشق بھی اسے سچ کی طرف لے جاتا ہے ؎

باغ سبزِ عشق کو بے منتہاست جز غم و شادی در و بس میوہاست

عشق کا بھرا بھرا باغ جس کی انتہا نہیں، اس میں غم و شادی سے جداگانہ بے شمار میوے ہیں۔ (۱/۲۰۰)

عاشقِ تصویرِ وہم خویشتن کے بود از عاشقانِ ذوالمنن

اپنی وہمی تصویر کا عاشق (خداوند) ذوالمنن کے عاشقوں میں سے کب ہو سکتا ہے؟ (۱/۲۹۱)

عاشقِ آں وہم گر صادق بود آں مجازش تا حقیقت مے کشد

(تاہم) اگر اس وہم کا عاشق بھی بااخلاص ہو تو (وہ مجاز) اس کو حقیقت (ذاتِ عشق) کی طرف لے جا سکتا ہے۔ (۱/۲۹۱)

ہر چہ گوید مرد عاشق بوئے عشق   از دہانش مے جہد در کوئے عشق

(لیکن) عاشق جو کچھ کہتا ہے اس کے منہ سے عشق کے نکات کی ہی خوشبو عشق کے کوچے میں مہک اُٹھتی ہے۔ (۳۰۳/۱)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ہم عاشق لوگ ہیں اور عاشق لوگ کوئی ناول نویس یا افسانہ نگار تو ہوتے نہیں کہ لوگوں کا دل بہلانے کے لئے دنیا جہاں کی کہانیاں لکھنے بیٹھیں بلکہ وہ جو کچھ سوچتے ہیں اور لکھتے ہیں اس سے عشقِ الٰہی کی خوشبو مہکتی ہے۔

ور بگوید کفر آید بوئے دیں   آید از گفتِ شکش بوئے یقین

اگر وہ کفر کی بات بھی کہے تو اس سے دین کی خوشبو آئے گی، اس کے شک (یعنی کشف و الہام) سے بھی یقین کی مہک اُٹھے گی۔ (۳۰۳/۱)

آں کفش را صافی و محقوق داں   ہمچو دشنامِ لبِ معشوق داں

وہ کلام جو عوام کی سمجھ میں نہیں آ رہا اس کو صاف دریا کی جھاگ کی طرح صاف ستھرا سمجھ، گویا یہ معشوق کے منہ کی گالی ہے۔ (۳۰۳/۱)

ملتِ عشق از ہمہ ملت جدا ست

(عشق کی ملت تو ہر ملت سے جُدا ہوتی ہے)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک گڈریے کا قصہ بہت مشہور ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عشق میں اس قدر سرگرداں تھا کہ ایک روز وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں خود کو حاضر سمجھ کر کچھ عجیب انداز سے گویا تھا اور کہہ رہا تھا "اے اللہ! اگر تُو میرے سامنے آئے تو میں تمہاری ٹانگیں دباؤں، تمہارے پیروں کی میل صاف کروں، تمہارے سر سے جوئیں نکالوں وغیرہ۔ ادھر سے جب موسیٰ علیہ السلام گذرے تو وہ اس گڈریے سے سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ "او بے وقوف! اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں سے منسوب کر رہے ہو جو اس کے شایانِ شان نہیں۔ ایسی باتیں کرنے سے تو تم خدا کی بارگاہ میں سخت گستاخی کے جرم میں گرفتار ہو گئے ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر گڈریا بہت پریشان ہوا کہ وہ خدا کی بارگاہ میں سخت گستاخی کا مرتکب ہو چکا ہے، چنانچہ وہ آہ و زاری کرنے لگا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ جونہی موسیٰ علیہ السلام چند قدم آگے بڑھے تو فوراً ان پر وحی الٰہی کا نزول ہوا اور کہا گیا کہ "اے موسیٰؑ! وہ شخص میری محبت میں گفتگو کر رہا تھا مگر تم نے اسے میرے ساتھ گفتگو کرنے سے منع کر دیا اور اسے مجھ سے جدا کر دیا ہے جب کہ تمہیں تو میں نے لوگوں کو اپنے سے ملانے کے لئے بھیجا تھا۔ اس کی یہ محبت اس کی عقل کے مطابق درست تھی جو تیری نظر میں معیوب تھی۔" فرمایا کہ "اے موسیٰؑ! اللہ تعالیٰ کے لئے جو تعریف تُو بیان کرتا ہے عین ممکن ہے وہ میری شان کے لائق نہ ہو بلکہ میری شان کے لائق تو الفاظ ادا ہو ہی نہیں سکتے۔ جاؤ اور اس شخص کو مجھ سے دوبارہ

ملا دو۔" مولانا رومیؒ نے یہ واقعہ یوں لکھا ہے ۔

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا — بندۂ مارا چرا کردی جدا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ میرے بندے کو مجھ سے جدا کیوں کر دیا۔ (۱۷۳/۲)

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

تم تو لوگوں کو مجھ سے ملانے کے لئے آئے ہو، ان کو مجھ سے جدا کرنے نہیں آئے ہو۔ (۱۷۳/۲)

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم — ہر کسے را اصطلاح دادہ ایم

ہر شخص کو ایک خاص سیرت عطا کی گئی ہے اور ہر ایک کو جداگانہ اصطلاح دی گئی ہے۔ (۱۷۳/۲)

در حقِ اُو مدح و در حقِ تو ذم — در حقِ او شہد و در حقِ تو سم

اس کے حق میں تو یہ مدحت تھی اور تیرے مطابق یہ برائی تھی، اس کے لئے تو یہ (گفتگو) شہد تھی اور تیرے لئے یہ زہر تھی۔ (۱۷۳/۲)

ما بروں را ننگریم و قال را — ما دروں را بنگریم و حال را

ہم ظاہر کو نہیں دیکھتے اور نہ قال کو، ہم تو اندر کی بات کو دیکھتے ہیں اور حال کو۔ (۱۷۴/۲)

موسیا آداب داناں دیگر اند — سوختہ جاں وِرد آناں دیگر اند

اے موسیٰ! دانا لوگوں کے آداب اور ہوتے ہیں، دل جلوں اور سوختہ روح کے آداب دوسری طرح کے ہیں۔ (۱۷۴/۲)

اللہ تعالیٰ کی شان میں خواہ کوئی کتنی ہی تعریف کرے وہ بھی کم ہے۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور حقیقت کو قطعاً اس کی شان کے مطابق بیان نہیں کر سکتا۔ جو بات حکماء اور اہل نظر کہتے ہیں وہ بھی ایسے ہی ہے جیسے چرواہے نے خدا کے متعلق بیان کیا۔ بہترین الفاظ ملتِ عشق کے ہیں جو تمام ملتوں اور مذہبوں سے جدا ہیں۔ عاشقوں کا مذہب اور ملت صرف عشق ہے، رسمِ قبلہ تو کعبہ سے باہر والوں کے لئے ہے اور جب کوئی کعبہ کے اندر چلا جائے تو رسمِ قبلہ ختم ہو جاتی ہے، جدھر چاہو منہ کر لو۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ خون پلید شے ہے اور اس کے مقابلے میں پانی شرعی اعتبار سے پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے مگر پھر بھی شہید کا نجس خون پاکیزہ پانی سے بہتر ہے۔ اسی طرح کئی گناہوں کے کام نیکی کے کاموں سے اولیٰ تر ہو جاتے ہیں ۔

خوں شہیداں را ز آب اولیٰ ترست — ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

شہیدوں کا خوں پانی سے لامحالہ بہتر ہوتا ہے، یہ غلطی سینکڑوں ثواب کے کاموں سے بہتر ہے۔ (۱۷۴/۲)

ملتِ عشق از ہمہ ملت جدا ست — عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

عشق کی ملت تو ہر ملت سے جدا ہوتی ہے، عاشقوں کا مذہب اور ملت تو خدا ہے۔ (۱۷۴/۲)

ہاں و ہاں گر حمد گوئی و سپاس ہمچو نافرجام آں چوپاں شناس

خبردار، خبردار! تو جو شکر گزاری اور تعریف کرے اس نالائق گڈریے کی سی سمجھ۔ (۱۷۷/۲)

حمد تو نسبت بہ تو گر بہتر است لیک آں نسبت بحق ہم ابتر ست

تیرا تعریف کرنا اگرچہ تیرے نزدیک بہتر ہے لیکن خدا کے نزدیک وہ بھی کم تر ہے۔ (۱۷۷/۲)

دَر دُرونِ کعبہ رسمِ قبلہ نیست چہ غم ار غواص را پا چپلہ نیست

کعبہ کے اندر قبلہ کی کوئی جہت نہیں (جدھر چاہو نماز پڑھو)، غوطہ خور کے پاس اگر نعلین نہیں ہیں تو کیا غم ہے۔ (۱۷۴/۲)

ہمچو کورہ عشق را سوزیدنے ست ہر کہ اُو زیں کور باشد کودنے ست

بھٹی کی طرح عشق کا کام تو جلا دینا ہے، جو شخص اس سے بے بہرہ ہے، وہ نااہل ہے۔ (۱۳۹/۲)

برگِ بے برگی تُرا چوں برگ شُد جان باقی یافتی و مرگ شد

جب بے سروسامانی تیرا سامان بن گئی تو تجھے ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی مل گئی اور موت جاتی رہی۔ (۱۳۹/۲)

لعل را گر مُہر نبود باک نیست عاشق از دریائے غم غمناک نیست

لعل پر اگر ٹھپہ نہیں، پرواہ نہیں ہے، عاشق غم کے دریا سے غمگیں نہیں ہوتا۔ (۱۷۵/۲)

نبض عاشق بے ادب بر می جَہد خویش را در کِفّۂ شہ می نہَد

عاشق کی نبض بلا لحاظِ ادب تڑپتی ہے، اپنے آپ کو شاہ کے پلڑے میں رکھتی ہے۔ (۳۵۲/۳)

ایں قیاس ناقصاں برکارِ رب جوششِ عشق ست نز ترکِ ادب

اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ناقصوں کا یہ قیاس ادب کو ترک کرنے کی وجہ سے نہیں ہے، عشق کا جوش ہے۔ (۳۵۲/۳)

عشق چوں دعویٰ جفا دیدن گواہ چوں گواہت نیست شُد دعویٰ تباہ

عشق دعویٰ ہے اور تکلیف برداشت کرنا گواہ ہے جب تیرے پاس گواہ نہیں ہے تو دعویٰ برباد ہے۔ (۳۸۲/۳)

عاشق آنم کہ ہر آں آنِ اوست عقل و جاں جاندارِ یک مرجانِ اوست

میں اس کا عاشق ہوں کہ ہر ملکیت جس کی ملکیت ہے، عقل اور جان اس کے لب سے جاندار ہیں۔ (۳۹۳/۳)

لیک مَیلِ عاشقاں لاغر کند میل معشوقاں خوش و بافر کند

لیکن عاشقوں کا عشق ان کو لاغر کرتا ہے، معشوقوں کا عشق ان کو حسین اور باشوکت بنا دیتا ہے۔ (۴۲۲/۳)

ساتواں باب

گر نبودے عشق ہستی کہ بُدے

(اگر عشق نہ ہوتا تو دُنیا کا وجود کب ہوتا)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشق نہ ہوتا تو کوئی وجود نہ ہوتا، کیونکہ یہ سب عشق کے جذبے سے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کھانا کھاتا ہے تو وہ کھانا بھی جسم بن جاتا ہے۔ روٹی عشق اور خواہش سے ہی بنتی ہے، ورنہ روٹی کا راستہ جان تک کب ہوتا۔ عشق مردہ جان میں جان ڈال دیتا ہے اور جو جان فانی تھی اس کو حیاتِ جاوداں عطا کرتا ہے۔

وہ اہلِ عقل جس کا دل روشن ہے، سمجھتا ہے کہ مجھ میں اور لیلیٰ میں فرق نہیں ہے۔ میں کون ہوں؟ لیلیٰ! اور لیلیٰ تو کون ہے؟ میں! ہم دو روحیں ہیں جو ایک قالب میں آ گئی ہیں۔

گر نبودے عشق ہستی کہ بدے — کہ زدے ناں بر تو و تو کہ شدے

اگر عشق نہ ہوتا تو وجود کب ہوتا، روٹی تجھے کب ملتی اور تو کب ہوتا۔ (۵/۲۰۵)

مطلب یہ کہ تم عشق کا سُراغ نہ پانے سے یہ نہ سمجھ لینا کہ عشق سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ اگر عشق نہ ہوتا تو آفرینش کہاں ہوتی اور روٹی تم کو کیونکر حاصل ہوتی اور کب تمہارا عین بنتی۔

نان تو شد از چہ؟ زعشق و اشتہے — ورنہ ناں را کے بدے تا جاں رہے

روٹی تم سے مل کر تمہارا جزو بدن بن گئی، کس سبب سے؟ عشق اور خواہش سے، ورنہ روٹی کو جان میں راستہ ملنا کب ممکن تھا۔ (۵/۲۰۵)

داند آں عقلے کہ او دل روشنے ست　　　　درمیانِ لیلے و من فرق نیست

اس اہلِ عقل کو جو روشن دِل ہے، خوب معلوم ہے کہ مجھ میں اور لیلیٰ میں فرق نہیں۔ (۲۰۵/۵)

من کیم؟ لیلیٰ! و لیلیٰ کیست من　　　　ما دو روحیم آمدہ در یک بدن

میں کون ہوں؟ لیلیٰ ہوں اور لیلیٰ کون ہے؟ میں ہوں، ہم دو روح ہیں جو ایک بدن میں ہیں۔ (۲۰۵/۵)

لحمِ عاشق را نبارد خورد دو
(عاشق کا گوشت درندے نہیں کھاتے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کوئی درندہ عاشق کے گوشت کو کھا نہیں سکتا۔ عشق کا معاملہ ایسا ہے کہ نیک و بد عاشق کو پہچانتے ہیں، بھیڑیے اور شیر وغیرہ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ عاشق دُنیاداروں کی سی جبر و تعدّی کی خصلت سے پاک ہو چکا ہے اور وہ عشقِ الٰہی سے پُر ہے۔ ایسے عاشقوں کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، حتیٰ کہ تیر تفنگ اس کو نقصان نہیں دیتے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ عاشقوں کا گوشت اور چربی درندوں کے لیے زہر کا سا اثر رکھتے ہیں۔
ایک چشم دید واقعہ نور پور کانگڑے میں ایک شخص سے سنا ہے کہ نور پور میں بہت زیادہ بندر تھے۔ ایک شخص نے کڑاہی میں بہت سا دودھ ڈالا اور اس میں زہر ملا دیا تا کہ بندر اس کو پی کر مر جائیں۔ کچھ دیر بعد بہت سے بندر آ گئے اور دودھ پینے کے لئے آگے ہوئے ہی تھے کہ ایک بڑا بندر آیا اور اس نے باقی تمام بندروں کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے ہٹا دیا، جس کا مطلب تھا کہ ٹھہر جاؤ! اس کے بعد اس بندر نے دودھ کو سُونگھ کر اعلان کیا کہ اس میں زہر ہے، ابھی اِسے نہ پیئو۔ وہ بندر جا کر ایک جڑی بوٹی کی لکڑی لایا اور اس لکڑی سے دودھ کو ہلایا جس نے زہر کو جذب کر لیا اس کے بعد وہ سب دودھ پینے لگے اور کوئی بندر نہ مرا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کو زہر کی علامات کا علم ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ عاشق کا بدن اُن کے لیے زہر ہے۔

اس کے علاوہ ہم تو یہ بھی کہیں گے کہ زمین اور کیڑے مکوڑوں کو بھی اس بات کا علم ہوتا ہے کہ بندۂ مومن اگر مر جائے اور زمین میں دفن کر دیا جائے تو اس کی نعش کو نہ زمین کھاتی ہے اور نہ کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں اور نہ ہی اُسے سانپ ڈستے ہیں۔ سائنسدانوں نے تجزیہ کیا ہے کہ یہ بات سچ ہے (اور راقم الحروف بھی جسم کو سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ کس انسان کے جسم میں ایسا مادہ موجود ہے جس کی وجہ سے اسے کوئی جانور کھا نہیں سکتا۔) یہ ولیوں کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ ایسی روایات مطالعہ میں آئی ہیں کہ کسی نیک آدمی پر شیر نے حملہ کیا اور اس نے شیر سے کہا ''خبردار! میں رسول اللہ ﷺ کا عاشق ہوں تو شیر نے اسے کچھ نہیں کہا۔ پہاڑی لوگ جہاں شیر عام ہوتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ اگر شیر کو کچھ نہ کہو تو وہ بھی کچھ نہیں کہتا (سوائے MAN EATER کے) اور اگر کوئی شیر کو گالی دے تو وہ گالی دینے والے پر فوراً جھپٹتا ہے۔ جانور اچھی بُری بات میں تمیز کرتے ہیں۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہر وہ جزو جس میں عشق نہ ہو وہ عشق کی خوراک بن جاتی ہے۔ دونوں جہاں عشق کے آگے ایک دانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں عشق ہو وہ ہر چیز پر اثرانداز ہوتا ہے تو کوئی اس کو کیسے نقصان پہنچائے۔ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ دانہ مرغ کو کھا جائے یا آخور گھوڑے کو کھا جائے ؎

لحمِ عاشق را نبارد خورد دد عشق معروف ست پیشِ نیک و بد

درندہ عاشق کے گوشت کو نہیں کھا سکتا، عشق ہر نیک و بد مخلوق کے آگے ظاہر ہے کہ وہ متحمل ضرر نہیں ہوتا۔ (۵/۲۷۷)

کایں شدست از خوے حیواں پاک پاک پُر زعشق و لحم و شحمش زہر ناک

شیر و گرگ جیسے درندوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ (عاشق) جانداروں کی (سی قہر و غضب اور جبر و تعدّی) خصلت سے بالکل پاک ہو چکا ہے، وہ عشق سے پُر ہے اور اس کا گوشت اور چربی (درندوں کے لیے) زہر ہے۔ (اس لئے درندے مجنوں پر دانت نہیں چلا سکتے تھے) (۵/۲۷۷)

ہر کہ جز عشق ست شد ماکولِ عشق دو جہاں یکدانہ پیشِ نولِ عشق

بلکہ ہر جزو جو عشق کے سوا ہے عشق کی خوراک بن جاتی ہے، دونوں جہان عشق کی چونچ کے آگے ایک دانہ کی مثال ہیں۔ (۵/۲۷۷)

دانۂ مر مرغ را ہرگز خورد؟ کاہداں مر اسپ را ہرگز چرد؟

(سوچو کہ) کیا کوئی دانہ مرغ کو کھا سکتا ہے؟ کیا آخور گھوڑے کو چر سکتا ہے؟ (ہرگز نہیں، پس عشق کو کوئی چیز کیونکر ضرر پہنچا سکتی ہے، جب کہ عشق خود ہی ہر چیز پر اثرانداز ہے)۔ (۵/۲۷۷)

عشق چوں وافی ست وافی می خرد

(عشق وفادار ہے اور وفادار کا خریدار ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عاشق بن جاؤ اور خوبیوں والے خدا کی جستجو کرو۔ خدا سب سے زیادہ جلیل اور جمیل ہے، اس کو جمیل خوبیوں والے ہی تلاش کر سکتے ہیں، جسے عشق کا آبِ حیات مل جائے تو اُسے اِس دنیا کے آبِ حیات کی کیا ضرورت ہے؟ فرماتے ہیں کہ عقل تو موت سے ڈرتی ہے اور عشق اس پر چیتے کی طرح لپکتا ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ مٹی کا معمولی سا ڈھیلہ تو بارش کے پانی سے بہہ جائے لیکن پتھر کو کب پانی میں ڈھل جانے کا کوئی خوف ہے۔ فرماتے ہیں کہ عشق میں وفا شرطِ اوّل ہے اور عشق صرف وفا والوں کو ہی طلب کرتا ہے۔ وہ بے وفا کو تو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھتا ؎

عاشقے شو شاہدِ خوبے بجو صید مرغابی ہمی کن جُو بجُو

پس تم عاشق بن جاؤ اور اس شاہد (حقیقی تعالیٰ شانہٗ) کی جستجو کرو جو سب سے زیادہ جمیل ہے اور کسی مرشدِ کامل کو دریائے احدیت کی شناوری میں مثل مرغِ آب نہر بہ نہر دستیاب کرتے پھرو۔ (۵/۳۲۶)

آبِ عشقِ تو چو مارا دست داد　　　آبِ حیواں شد بہ پیشِ ما کساد

جب سے تیرے عشق کا آبِ حیات ہمیں حاصل ہوا تو دنیا کا آبِ حیات ہمارے سامنے بیکار ہو گیا۔ (۴۲۲/۵)

عقل لرزاں از اجل و اں عشق شوخ　　　سنگ کے ترسد زباراں چوں کلوخ

عقل موت سے ڈرتی ہے اور عشق بے باک ہے (وہ موت سے نہیں ڈرتا)، پتھر بارش سے مٹی کے ڈھیلے کی طرح کب ڈرتا ہے۔ (۴۲۲/۵)

عشق چوں وافی ست وافی میخرد　　　در حریفِ بے وفا می ننگرد

عشق چونکہ (خود) وفادار ہے اس لئے وفادار کا طالب ہے، بے وفا رفیق کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا۔ (۱۲۲/۵)

بندگی کن تا شوی عاشق لعل

(عبادت کرو تاکہ تم لعل جیسے عاشق بن سکو)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عاشق بننا چاہتے ہو تو اس کا خاص ذریعہ بندگی ہے اور بندگی کی کثرت سے عشق پیدا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ بندگی کرنا انسان کے اختیار کی بات ہے، یہ نہیں کہ بندگی کرنا ممکن نہ ہو، بلکہ کوئی چاہے تو چپ چاپ وہ دل کو بندگی سے منور کر سکتا ہے، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایسے عاشق کے نزدیک مٹی اور سونا برابر ہو جاتا ہے۔ ''کشف المحجوب'' میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ شخص کسی درخت کے نیچے سے گذرا تو اللہ تعالیٰ سے کہنے لگا ''الٰہی! میں حجامت کروانا چاہتا تھا مگر تین دن سے تو نے مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ کیا آپ اپنے دوستوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟'' ایک اور شخص جو درخت سے شہتوت کے پتے اُتارنے کے لئے درخت کے اُوپر بیٹھا تھا، اس نے یہ بات سُنی اور دیکھا کہ اس جگہ جتنے پتھر اور ڈھیلے پڑے ہوئے تھے سب سونا بن گئے۔ ہر طرف سونا ہی سونا دیکھ کر وہ درویش بولا ''الٰہی! تجھ سے تو بات کرنا بھی مشکل ہے اگر ایسی کوئی بات کر دے تو آپ ایسا جواب دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ شخص وہاں سے آگے گذر گیا۔ اس حکایت کا مطلب سمجھانے کے لئے داتا صاحبؒ نے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا بزرگ کے سامنے مٹی اور سونا دونوں ہی یکساں تھے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

بندگی کن تاشوی عاشق لعل　　　بندگی کسب ست آید در عمل

بندگی کرتے جاؤ تاکہ تم عاشق بن جاؤ، یہ بندگی (اپنے اختیار کی چیز ہے اور) کسب (پر موقوف) ہے اور عمل میں آ سکتی ہے (بخلاف اس کے عشق عطیۂ حق ہے)۔ (۲۷۷/۳)

پیشِ اُو یکساں شدہ بد خاک و زر　　　زر چہ باشد کہ نہ بد جاں را خطر

اس کے نزدیک مٹی اور سونا برابر ہو گئے تھے، سونا کیا ہوتا ہے انہیں تو اپنی جان کا بھی خیال نہیں رہتا۔ (۲۷۶/۵)

پیر عشقِ تست نے موئے سپید　　　دستگیرِ صد ہزاراں ناامید

پیر (سے مراد) تمہارا عشق ہے، نہ کہ سفید بال (عشق) لاکھوں نااُمید لوگوں کا دستگیر ہے۔ (۳۳۰/۵)

شمع چوں در نار شد کلی فنا
(شمع جب آگ میں فنا ہوگئی)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی کو فنا حاصل ہو جائے تو رسول ﷺ کی طرح اس کا سایہ بھی اُٹھ جائے گا۔
شمع جب سر سے پاؤں تک شعلہ بن گئی تو اس کے گرد سائے کا گذر بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح فنا حاصل کرنے کے بعد سالک بھی اپنے لئے شمع کی طرح بے سایہ ہو جائے گا۔ مولاناؒ نے اس کی وضاحت طویل دلائل سے کی ہے، جس کا بیان ممکن نہیں۔

چوں فناش از فقر پیرایہ شود　　　　او محمدؐ وار بے سایہ شود

جب سالک کی فنا فقر سے آراستہ ہو جائے تو وہ محمد ﷺ کی طرح بغیر سایہ ہو جاتا ہے۔ (۵/۷۷)

شمع چوں گردد زبانہ پاؤ سر　　　　سایہ را نبود بگردِ او گذر

شمع جب کہ سر سے پاؤں تک شعلہ بن گئی، اس کے گرد سائے کا گذر نہ ہوگا۔ (۵/۷۷)

گفت از بہر فنایت ریختم　　　　گفت من ہم در فنا بگریختم

(شمع ساز نے شمع سے کہا) میں نے تجھ کو فنا کے لئے بنایا ہے، وہ بولی (اے لو) میں بھی فنا میں کود پڑی، اسی طرح سالک اپنی فنا سے مسرور و شادماں ہے۔ (۵/۷۷)

ایں شعاعِ باقی آمد مُفتَرَضْ　　　　نے شعاعِ شمعِ فانیِ عَرَضْ

یہ سالک کے لیے فنا فی اللہ کے انوار کی شعاع کے لئے ایک مثال فرض کی گئی ہے، (یہاں) فانی و ناپائیدار شمع کی شعاع (بذاتِ خود مقصود) نہیں۔ (۵/۷۷)

شمع چوں در نار شد کُلّی فنا　　　　نے اثر بینی زشمع و نے ضیاء

شمع جب آگ میں بالکل فنا ہوگئی تو تم نہ تو کوئی نشان شمع کا دیکھو گے اور نہ روشنی کا کیونکہ روشن آگ ہوتی ہے موم بذاتِ خود روشن نہیں، اس طرح فانی فی اللہ باقی باللہ ہو جاتا ہے۔ (۵/۷۷)

عاشقے کز عشق یزداں خورد قوت
(عاشق وہ ہیں جن کی غذا عشقِ مولا ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عاشق وہ لوگ ہیں جو عشق مولا کی غذا کھاتے ہیں۔ وہ لوگ نہ تو جنت کے لئے اور نہ ہی جہنم سے بچنے کے لئے عبادت کرتے ہیں بلکہ صرف اللہ کو ہی چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے خوراک بھی ملتی ہے اور اللہ کی رضا بھی۔ اگر کوئی عبادت کے عوض جنت چاہے تو گویا یہ بات ایسے ہی ہوئی کہ کوئی جبرائیل امین ہو اور چور بھی ہو۔ اس جہاں میں مجازی عشق والے بھی اپنے محبوب کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتے۔ مجنوں اپنی لیلیٰ کے بدلے میں پورے جہاں کی بادشاہی ایک پتے کے برابر بھی نہ سمجھتا تھا۔

مومنے باشم سلامت جوئے من　　　زانکہ ایں ہر دو بود حظِ بدن

میں سلامتی کا طالب ہوں، میں مومن بنوں گا کیونکہ یہ دونوں چیزیں بدن کا حصہ ہیں۔

ہشت جنت گر در آرم در نظر　　　ور کنم خدمت من از خوفِ سقر

اگر میں آٹھ بہشتوں کو نظر میں لاؤں اور پھر میں دوزخ کے خوف سے عبادت کروں تو میں (عاشق نہیں بلکہ) ایک مومن طالبِ نجات ہوں گا کیونکہ یہ دونوں جسم کا حصہ ہیں اور عاشق جسم و جاں کی پرواہ نہیں کیا کرتے۔ (۲۷۶/۵)

عاشقے کز عشقِ یزداں خورد قوت　　　صد بدن پیشش نیرزد ترہ توت

جس عاشق نے حق تعالیٰ کے عشق میں غذا کھائی ہے اس کے آگے سو بدن بھی شہتوت کے پتّے کے برابر (وقعت نہیں رکھتے) شاید کوئی پست نظر یہ کہے کہ اگر عاشقِ الٰہی کے نزدیک بدن ایسا ہی ناچیز ہے تو پھر ان کے شیخ صاحب نے اپنا بدن قائم کیوں رکھا ہے۔ (۲۷۶/۵)

عاشقِ عشقِ خدا وانگاہ مزد　　　جبرئیلِ مؤتمن آنگاہ دزد

خدا کے عشق میں عاشق ہو اور پھر اگر اطاعت و عبادت کے عوض میں بہشت چاہے تو (وہ تو پھر خدا کا عاشق نہ ہوا بلکہ بہشت کا عاشق ہوا) یہ تو وہی بات ہوئی کہ جبرئیلؑ امین (ہونے کا دعویٰ ہو) اور پھر چور (بھی) ہو۔ (۲۷۶/۵)

عاشقِ آں لیلیٰء کور و کبود　　　ملکِ عالم پیشِ او یک ترہ بود

عاشقانِ حق کے تو کیا ہی کہنے، عاشقانِ مجازی بھی ایسے خود غرض نہیں ہوتے، چنانچہ اس بے نور اور سیاہ فام لیلیٰ کا عاشق (مجنوں اس قدر مستغنی تھا کہ) دُنیا بھر کی بادشاہی اس کے سامنے ایک پتے کے برابر تھی۔ (۲۷۶/۵)

آنکہ ارزد صید را عشقت و بس

(ہاں جو شکار کرنے کے لائق ہے، وہ صرف خدا کا عشق ہے)

صوفی وہ ہے جس کو پاکیزگی اور طہارتِ نفس حاصل ہو، نہ کہ لباسِ صوفیاء پہننے والا ہو۔ فرماتے ہیں کہ عشق کو اپنا شکار بناؤ، نہ کہ تم خود شکار بن جاؤ۔

ہست صوفی آنکہ شد صفوت طلب　　　نہ لباس صوف و خیاطی و دَب

صوفی وہی ہے جو پاکیزگی و طہارتِ نفس کا حامل ہو، نہ کہ لباسِ رنگین و منقش کا طلب گار ہو۔ (۴۸/۵)

حقیقی صوفی باصفا وہی ہیں جو اپنے وجود سے حرص و تکبر، حسد و غصہ، کینہ و بغض، ریاکاری اور شیطانی وسوسے اور شہوت اور تمام برے خیالات اور خلافِ شرع کاموں کو ترک کر دیں اور صبر و تحمل، استقامت، عاجزی و انکساری، قوتِ برداشت اور حسنِ اخلاقِ محمدی ﷺ پر پابند ہوں، وہ بھی رضائے الٰہی کی خاطر۔

آنکہ ارزد صید را عشقست و بس　　　لیک او کے گنجد اندر دامِ کس

مگر ہاں جو شکار کرنے کے لائق ہے وہ عشقِ حقیقی ہے، (اگر کرنا ہے تو اس کا شکار کر) لیکن وہ ایسا کہاں جو ہر کسی

کے دام میں آ سکے۔ (۵۲/۵)

تو مگر آئی و صید او شوی دام بگذاری بدام او روی

ہاں تُو خود ہی اس کا شکار ہو جا، اپنا حال چھوڑ کر اس کے دام میں گرفتار ہو جا۔ (۵۶/۵)

تیری فلاح و بہبود ہی اس میں ہے کہ تُو خود اس عشق کا شکار ہو تا کہ وہ تجھ کو شکار کرے کیونکہ اس میں لطف ہے اور وصالِ الٰہی کا مخفی راز ہے۔

عشق ہو تو ہر چیز پر قابو پایا جا سکتا ہے

دُنیا کا عشق دُنیا کے خرافات پر عاشق ہے اور اس کے بہکانے سے انسان کا رُکنا ممکن نہیں، جب تک اصل عشق رُوبکار نہ ہو جائے۔ جب تک انسان کے عقائد استحکامِ یقین سے مضبوط نہ ہو جائیں وہ اصل عشق کی طرف توجہ نہیں کر سکتا اور یہ چیز کسی شیخ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ پیٹ کی پوجا سے باز نہیں آتے وہ کبھی بھوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری کتاب ''تہذیبِ نفس'' میں بھوک پر ایک پورا باب لکھ دیا گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی بھوک پر ایک مختصر باب موجود ہے، جس کے مطالعہ کے بعد بھوک کے فوائد سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ انسان کی بہت سی بیماریاں عادات کو بدلنے سے درست ہو جاتی ہیں۔

دیو بر دنیا ست عاشق کور و کر عشق را عشقِ دگر بُرّد کمر

دیو یعنی شیطان دُنیا کی (خرافات) پر عاشق ہے اور اس کے عشق میں اندھا اور بہرہ ہو گیا ہے۔ یہ عشق اس سے منقطع نہیں ہوگا، جب تک کہ اس کو دوسرا عشق نہ ہو یعنی خدا کا عشق اس کو توڑ سکتا ہے۔ (۴۱/۵)

نفسِ امّارہ اس دنیا کے عجائبات و غرائبات اور لذائذ و حظائظ میں مستغرق ہے اور اس کا دل ان پر ریجھ گیا ہے۔ جب تک اس کو دوسرا عشق نہ لگے اس کے پنجے سے وہ چھٹکارا نہیں پا سکتا، اس لئے تمام خلافِ شرع کاموں سے منہ موڑ کر حضور ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

از نہانخانہ یقین چوں مے چشید اندک اندک عشق رخت آنجا کشید

جب وہ یقین کے مخفی خانہ سے شرابِ ایقان پیئے گا تو خود بخود آہستہ آہستہ اس کا اسبابِ راحت و سکون وہاں پر پہنچ جائے گا۔ (۴۱/۵)

جب اس کو ایقان و یقینِ کامل کی دولت نصیب ہو گی تب اس دُنیا کا اسبابِ سکون و راحت وہ خود ہی نچھاور کر دے گا۔ وہ عشقِ باطل سے عشقِ حقیقی کی لذّت سے ہم کنار ہو گا اور دُنیا کے عشق اور ان کی خواہشات کو ترک کر دے گا۔

يَا حَرِيْصَ الْبَطْنِ عَرِّجْ هٰكَذَا اِنَّمَا الْمِنْهَاجُ تَبْدِيْلُ الْغِذَا

اے پیٹو! اس طرح ترقی کر (جیسا کہ کہا گیا ہے کہ) سوائے بدل ڈالنے غذا کے، تیری ترقی مقاصد کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔ (۴۱/۵)

يَا مَرِيضَ الْقَلْبِ عَرِّجْ لِلْعِلَاجِ　　　جُمْلَةُ التَّدْبِيرِ تَبْدِيلُ الْمِزَاجِ

اے دل کے مریض علاج کی سوچ کیونکہ جُملہ تدبیروں کا واحد حل تبدیلئ مزاج ہے۔ (۴۱/۵)

اے حریصِ شکم! جسم اور روح کی غذاؤں میں تبدیلی پیدا کر کیونکہ جن غذاؤں کو تو نے اپنے لئے پسند کیا ہوا ہے وہ ان میں بالیدگی ونشوونما اور ارتقاء پیدا نہیں کرتی بلکہ وہ مریض بنا رہی ہیں کیونکہ تیری روح علیل وسقیم ہے۔ ان خلافِ شرع کاموں سے پرہیز کر تاکہ روح کو تقویت ملے اور وصالِ حقیقی حاصل ہو۔

اَيُّهَا الْمَحْبُوسُ فِي رَهْنِ الطَّعَامِ　　　سَوْفَ تَنْجُوا اِنْ تَحَمَّلْتَ الْعِظَامَ

اے نان ونفقہ کے مرہون و پابندِ سلاسل! بہت جلد تُو نجات پائے گا اگر تُو نے مصائب وشدائدِ عظیمہ پر صبر کیا۔ (۴۱/۵)

بھوک کی برداشت میں بے شمار انعام واکرام منجانب اللہ مخفی ہیں، اگر تو نے اس کو برداشت کر لیا اور بھوک میں اس کی رضا وخوشنودی کی تلاش جاری رکھی اور اس کی رحمت کا اُمیدوار رہا تو یقیناً تُو نے اپنے دامن کو مراد سے بھر لیا ہے اور اپنی حیات کے مقصد کو پا لیا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم فرشتوں کی طرح تسبیح کو غذا بناؤ گے تو تم بھی عذاب سے بچ جاؤ گے۔ عبادت میں ترقی کرتے کرتے ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ عابد کی عبادت ہی اس کی غذا بن جاتی ہے، جیسا کہ فرشتوں کی غذا اُن کی عبادت ہے۔

عاشق آزادی نخواہد تا ابد
(عاشق کبھی آزادی نہیں چاہتا)

عام انسان قسمت سے ہر وقت ڈرتا ہے اور اس کی مشکلات سے آزادی چاہتا ہے مگر عاشق کبھی کسی چیز سے آزادی نہیں چاہتا۔ بندہ ہمیشہ خِلعت اور انعام کا جویا رہتا ہے مگر عاشق محض اپنے دوست کا یعنی اللہ کا دیدار چاہتا ہے۔ اہلِ عشق کو خدا کے عشق کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔

بندہ آزادی طمع دارد زجد　　　عاشق آزادی نخواہد تا ابد

بندہ پیدائشی طور پر قسمت سے آزادی کا لالچ رکھتا ہے، عاشق کبھی آزادی نہیں چاہتا۔ (۲۷۷/۵)

بندہ دائم خلعتِ و ادرار جوست　　　خلعتِ عاشق ہمہ دیدار اُوست

بندہ ہمیشہ خِلعت اور انعام کا جویا ہے، عاشق کا سب انعام دوست کا دیدار ہے۔ (۲۷۷/۵)

در نگنجد عشق در گفت و شنید　　　عشق دریائیست قعرش ناپدید

عشق کہنے اور سننے میں نہیں آتا، عشق وہ دریا ہے جس کی گہرائی نامعلوم ہے۔ (۲۷۷/۵)

عشق کے دریا کی گہرائی معلوم نہ ہونے پر ایک باب بھی اس کتاب میں لکھ دیا گیا ہے۔

آٹھواں باب

صید بودن خوشتر از صیاد یست

(شکار ہونا شکاری بننے سے بہتر ہے)

عشق کے دام میں گرفتار ہو جاؤ

عشق کا تعلق پروانے کی طرح سوزِ عشق میں جلنا ہے، لہٰذا اگر عشق مطلوب ہے تو عشق کے شکار ہو جاؤ اور دُنیا کے دوسرے کاموں کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ نہ کرو۔ عشق کے دام میں گرفتار ہو جاؤ، نہ کہ خود عشق کے شکاری بن جاؤ۔

عشق تو یہ کہتا ہے کہ صیاد ہونے کی بجائے تم خود صید ہو جاؤ یعنی عشق کے دام میں آ جاؤ۔ چاند سورج کے سامنے لاشئے ہو جاتا ہے، اس لئے اس کی روشنی سے چمکتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز وصوم کی خوبی عقل کی وجہ سے ہی بنتی ہے، لہٰذا عقل جو تم استعمال کرتے ہو، نماز اور روزہ سے بہتر ہے۔ (کتاب الاذکیاء)

بر درم ساکن شو و بیخانہ باش　　　دعویٔ شمعی مکن پروانہ باش

گھر بار چھوڑ کر میرے دروازہ پر رہ جا اور بے خانہ ہو جا، شمع ہونے کا دعویٰ نہ کر، پروانہ ہو جا۔ (۵۲/۵)

پس نکو گفت آں رسول ﷺ خوش جواز　　　ذرّۂ عقلت بہ از صوم و نماز

پس خوب کہا ہے ان پاک روشن رسول ﷺ نے کہ تیرے لئے ذرہ بھر عقل روزہ ونماز سے بہتر ہے۔ (۵۶/۵)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ لوگ آپس میں کس بات کے ساتھ فضیلت حاصل کرتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''عقل کے ساتھ۔'' میں نے عرض

کیا: ''آخرت میں کس بات سے فضیلت حاصل کریں گے؟'' فرمایا: ''عقلِ سلیم کے ساتھ۔'' میں نے عرض کیا: ''کیا وہ اپنے اپنے عملوں کا بدلہ نہیں پائیں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہؓ! وہ اللہ کی دی ہوئی عقل کی حد کے مطابق ہی تو عمل کریں گے اور عطا شدہ عقل کے اندازے پر ان کے اعمال ہوں گے اور اعمال کے مطابق وہ بدلہ پائیں گے اور فرمایا: اپنے حسنِ اخلاق کی بدولت انسان روزہ دار اور نمازی کا درجہ پاتا ہے۔''

(کتاب الاذکیاء لابن الجوزی)

زانکہ عقلت جوہرست ایں دو عرض — ایں دو در تکمیل آں شد مفترض

کیونکہ تمہاری عقل جوہر ہے اور یہ دونوں (نماز روزہ) عرض ہیں، یہ دونوں اس کی تکمیل میں فرض مقرر کئے گئے ہیں۔ (۵۶/۵)

تا جلا باشد مراں آئینہ را — کہ صفا آید زطاعت سینہ را

تا کہ اس عقل کے آئینے کے لئے اطاعت جلا بن جائے کیونکہ سینے کو طاعت سے صفائی حاصل ہوتی ہے۔ (۵۶/۵)

لیک گر آئینہ از بن فاسد ست — صیقل آں را دیر باز آرد بدست

لیکن اگر آئینہ اصل سے خراب ہے تو اس پر جلا مدتِ مدید کے بعد آتی ہے۔ (۵۶/۵)

آنکہ ارزد صید را عشق ست و بس — لیک او کے گنجد اندر دامِ کس

مگر ہاں جو شکار کرنے کے لائق ہے، وہ عشق ہے، اگر کرنا ہے اس کا شکار کر لیکن وہ ایسا ہے کہ وہ کب کسی کے دام میں آسکے۔ (۵۲/۵)

تو مگر آئی و صید او شوی — دام بگذاری بدام او روی

ہاں تو خود ہی اس کا شکار ہو جا، اپنا خیال چھوڑ کر اس کے دام میں گرفتار ہو جا۔ (۵۲/۵)

تیری کامیابی اس میں ہے کہ تو خود اس عشق کا شکار ہو تا کہ وہ تجھ کو شکار کرے۔ اپنے دام کو چھوڑ کر اس کے دام میں پھنس کیونکہ اس میں لطف ہے یعنی اپنے اندر اتنی خوبیٔ روحانیت اور جمال پیدا کر کہ حسن خود منتظر رہے۔

عشق میگوید بگوشم پست پست — صید بودن خوشتر از صیادیست

عشق میرے کان میں آہستہ آہستہ کہہ رہا ہے کہ صیادی سے صید ہونا بہتر ہے۔ (۵۲/۵)

گول می کن خویش را و غرّہ شو — آفتابی را رہا کن ذرہ شو

اے سالک خود کو اس بارگاہِ حسن و عشق میں مجنوں و دیوانہ بنا اور ایسا نحیف و ضعیف و کمزور ہو جا، جیسے پہلی رات کا چاند ہوتا ہے جو کہ باوجود نورانیت کے شمس کے سامنے ہیچ و لاشئے ہے۔ ہاں اپنے آپ کو درخشندہ و تابندہ آفتابِ عالم بنانے کے خیال کو ترک کر دے کیونکہ تو اس کی لمعات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ذرۂ حقیر بننے کی کوشش کر تا کہ اس آفتابِ معرفت کی شعاعیں و لمعات تجھ پر پڑ کر تجھے چمکا دیں اور تیری قبر کو نورِ الٰہی سے منور اور زندہ کر دیں۔ (۵۲/۵)

بردرم ساکن شود بیخانہ باش دعویٰ شمعی مکن پروانہ باش

گھر بار چھوڑ کر میرے دروازہ پر آ جا، پروانہ ہو، شمع ہونے کا دعویٰ مت کر۔ (۵۲/۵)

اے طالبِ حق سالک! اگر تو راہِ عشق میں قدم رکھتا ہے تو حسنِ ازل کا یہ تقاضا ہے کہ گھر بار سب کچھ چھوڑ اور جُملہ اسبابِ راحت و آرام اور عیش و عشرت کو ترک کر کے راہِ حق کے دروازہ پر پڑا رہ۔ اپنا اُٹھنا بیٹھنا جاگنا سب کچھ اس کی راہ میں کر دے اور مثل پروانہ کے قربان ہو۔

تا بہ بینی چاشنیٔ زندگی سلطنت بینی نہاں در بندگی

تب تُو زندگی کا لطف اُٹھائے گا اور دیکھے گا کہ بندگی میں کیسی سلطنت پوشیدہ تھی۔ (۵۲/۵)

اس کی بندگی میں تجھے حقیقی زندگی کا مزہ معلوم ہو گا، اس کی بندگی میں سرداری و فرمانروائی کے مزے پوشیدہ ہیں، بجز خدا کی اطاعت کے کچھ نہیں ہے۔ تُو اپنے ان پھٹے پرانے کپڑوں میں بادشاہ ہوگا، لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرے گا، ہزارہا دل تیرے حسنِ عشق میں گرفتار ہوں گے، آخرت میں بھی تجھے انعام و کرام سے اور دیدارِ الٰہی سے نوازا جائے گا۔

نعل بینی باژ گونہ در جہاں تختہ بنداں را لقب گشتہ شہاں

اے سالک! اس دُنیا کا اُلٹا کارخانہ ہے جو لوگ کہ مقید و محبوس پھانسی پر چڑھنے والے ہیں ان کا نام بادشاہ رکھا ہے۔ (۵۲/۵)

اے سالک! دُنیا کے لوگوں کی عجیب اُلٹی فکر ہے کہ جو لوگ بادشاہ و سلطان ہیں، ان کو فقیر و گدا کے نام سے پکارتے ہیں اور جو دُنیا کی حرص و لالچ میں محبوس ہیں اور اس کی محبت میں گرفتار ہیں ان کو بادشاہ کہتے ہیں، حالانکہ بادشاہ وہی ہونے چاہئیں دُنیا جن کے پیچھے پھرتی ہے، نہ کہ وہ جو دُنیا کے پیچھے سرگرداں ہیں۔

اندر آں جز عشقِ یزداں کار نیست

(عاشق کے دِل میں خُدا کے عشق کے سوا کوئی کام نہیں)

عاشق کے دل کے گھر میں خلوت ہوتی ہے، جس میں نہ کوئی تگ و دو اور نہ کوئی خیال ہوتا ہے۔ یہ تو جنت ہی کا خاصہ ہے۔ دل میں اگر کچھ رہتا ہے تو خیالِ یار ہی رہتا ہے۔ عاشق کا گھر خدا کے نور سے بھر گیا ہے۔ اس گھر میں نیک و بد کی جگہ نہیں۔ خانۂ دل میں اللہ کے سوا کوئی خیال نہیں آتا اور اگر کچھ خیال آئے تو کسی فقیر کے خیال کا عکس ہوتا ہے جو ہر وقت مانگتے رہتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ جب تک غیر کی کدُورت تنکا بھر بھی پائی جائے کشف نہیں ہوسکتا اور ہر چہرے کا عکس نظر نہیں آتا۔ مفلس شخص کے دل میں دُنیاوی کیچڑ کے سوا اور کیا ہوتا ہے، بس اسی سے دل مکدّر ہو جاتا ہے۔ یہ دل اس وقت مکدّر ہوتا ہے جب انسان کو ہر وقت کھانے پینے اور سونے کا کثرت سے خیال آئے۔ نہر میں مٹی مل جائے تو

مکدّر ہو جاتی ہے۔

او بگفتے خانۂ دل خلوت است خالی از گدیہ مثالِ جنت است

عاشق کہتا ہے کہ دل کا گھر خالی ہے، جو سوال سے خالی ہو وہ جنت کی طرح ہوتا ہے۔ (۲۸۵/۵)

اندر او جُز عشقِ یزداں کار نیست جز خیالِ وصلِ او دیّار نیست

اس (دل) میں خدا کے عشق کے سوا کوئی کام نہیں، اس کے وصل کے خیال کے سوا کوئی رہنے والا نہیں۔ (۲۸۵/۵)

خانہ را من رُفتم از نیک و بد خانہ ام پُر گشت از عشقِ احد

میں نے گھر کو ہر نیک و بد سے صاف کر لیا، میرا گھر خداوند یکتا کے نورِ عشق سے بھر گیا ہے۔ (۲۸۵/۵)

ہر چہ بینم اندرو غیرِ خدا آنِ من نبود، بود عکسِ گدا

میں اس (خانۂ دل) میں حق کے سوا جو کچھ دیکھتا ہوں وہ میرا نہیں ہوتا بلکہ کسی فقیر (سائل) کا عکس ہوتا ہے۔
(۲۸۵/۵)

تا نماند تیرگی و خس درو تا امیں گردد نماید عکس رُو

تاکہ اس میں خیالاتِ غیر کی کدُورت تنکا بھر باقی نہ رہے، حتیٰ کہ وہ بیرونی عکوس کا امانت دار ہو جائے اور اس میں ہر چہرے کا عکس نظر آنے لگے۔ (۲۸۵/۵)

جز گِلابہ در تنت کو اے مُقِل آبِ صافی کن ز گِل اے خصمِ دل

اے مفلس! تیرے بدن میں دُنیوی خیالات کے کیچڑ کے سوا اور ہے ہی کیا؟ اے دل کے دشمن! جلدی دریائے قلب کو مٹی سے صاف کر (آگے فرماتے ہیں کہ قلب کن چیزوں سے مکدّر ہوتا ہے)۔ (۲۸۵/۵)

تو برآنی ہر دمے کز خواب و خور خاک ریزی اندریں جو بیشتر

تو ہر وقت اس بات پر آمادہ ہے کہ سونے اور کھانے کی کثرت سے اس نہر (قلب) میں زیادہ سے زیادہ مٹی ملائے اور اس کو مکدّر کرے۔ (۲۸۵/۵)

نواں باب

انبیاء میں تخصیصِ عشق

پس مر اُو را زانبیاء تخصیص کرد
(پس آپ ﷺ کو انبیاء میں سے مخصوص کیا گیا)

تمام مخلوق (آسمان، زمین، دریا، سبزہ زار وغیرہ) کو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے وجود مبارک کے لئے پیدا فرمایا کیونکہ آپ کی ذات کامل ترین عشق کے ساتھ موصوف تھی اور آپ کی دلچسپی کے لئے مخلوق کو گوناں گوں کیفیاتِ عشق کا مظہر بنانا داخلِ حکمت تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر آپ کا وجود مبارک نہ ہوتا تو میں یہ کائنات پیدا نہ کرتا۔ (مستدرک للحاکم) میں نے آسمان کو اس لئے بلند کیا کہ آپ کے عشق کی بلندی کو معلوم کرے۔ زمین کو میں (اللہ تعالیٰ) نے اس لئے ناچیز بنایا کہ تم عاشق کی خواری کا سُراغ لگاؤ۔ یہ بلند اور مضبوط پہاڑ عاشقوں کے وصفِ ثابت قدمی کے متعلق خبر دیتے ہیں ۔

منتہی در عشق چوں او بود فرد   پس مر اورا زانبیاء تخصیص کرد

چونکہ آپ عشق (حق) میں کامل اور یکتا تھے، اس لئے (حق تعالیٰ نے) آپ کو (اس فضیلت کے لئے) انبیاء سے مخصوص فرمایا، آگے حدیثِ قدسی مندرجہ بالا کا ترجمہ فرماتے ہیں۔ (۲۷۸/۵)

گر نبودے بہرِ عشقِ پاک را   کے وجودے دادمے افلاک را

چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا، اے میرے محبوبِ پاک! اگر تم عشقِ پاک کے لیے (مخلوق) نہ ہوتے تو میں افلاک کو

کب موجود کرتا۔ (۲۷۸/۵)

من بداں افراشتم چرخِ سنی تا عُلوِ عشق را فہمی کنی

میں نے آسمان کو اس لئے اُونچا بنایا ہے تاکہ آپ کے عشق کی بلندی کو معلوم کرے۔ (۲۷۸/۵)

خاک را من خار کردم یکسری تا زذُلِ عاشقاں بوے بری

خاک کو میں نے بالکل ناچیز بنایا ہے تاکہ تم عاشقوں کی خواری کا سُراغ لگاؤ۔ (۲۷۸/۵)

با تو گویند ایں جبالِ راسیات وصفِ حالِ عاشقاں اندر ثبات

یہ محکم پہاڑ تم کو عاشقوں کے حال کا وصف اور ان کی ثابت قدمی کے متعلق بتاتے ہیں۔ (۲۷۸/۵)

بردہٗ ویراں خراج و عشر نیست

(اُجڑے گاؤں پر خراج اور عشر نہیں ہوتا)

عاشق کو مسلسل سختیوں اور مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ ایک عاشق رات دن عشق میں جلتا ہے۔ ان حالات کی بناء پر مولاناؒ فرماتے ہیں اگر وہ کسی وجہ سے کوئی خطا بھی کر بیٹھے تو شریعت اس کو معذور سمجھتی ہے، جیسا کہ جس جگہ پر کوئی آفت (سیلاب، خشک سالی یا انتہائی گرمی) گُزر چکی ہو تو اس کو ویران گاؤں سمجھ کر خراج اور عشر معاف کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عاشق خطا کی بات بھی کہہ دے تو اسے بُرا نہ کہو کیونکہ شہید اگرچہ خون سے لت پت ہوتا ہے پھر بھی اسے غسل دینا خلافِ شریعت ہے۔

چوں زگرگی وارھد محرم شود چوں سگِ کہف از بنی آدم شود

جب وہ بھیڑیوں کے سے اوصاف سے پاک ہو جائے تو پھر (انسان) محرم ہو جاتا ہے اور اصحابِ کہف کے کتے کی طرح بنی آدم (کے قبیل) سے ہو جاتا ہے۔ (۲۰۰/۵)

چوں محمد ﷺ را ابوبکرؓ نکو دید و صدقش گفت ھذٰا صادقٌ

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو نیک سیرت انسان تھے، حضرت محمد ﷺ اور آپ کے صدق کو دیکھا تو وہ پکار اُٹھے کہ یہ سچے ہیں۔ (۲۰۰/۵)

چوں ابوبکرؓ از محمد ﷺ بُردہ بو گفت ھذٰا لَیْسَ وَجْہُ کَاذِبٌ

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت محمد ﷺ کی بُو پائی تو بول اُٹھے کہ یہ چہرہ مبارک جھوٹا نہیں۔ (۲۰۰/۲)

آتشے از عشق در جاں بر فروز سر بسر فکر و عبارت را بسوز

عشق کی آگ (اپنی) جان میں روشن کرو (اور) فکر (عبارت) اور عبارت (آرائی) کو بالکل آگ لگا دو۔ (۱۷۴/۲)

عاشقاں را ہر زماں سوزیدنیست بردہٗ ویراں خراج و عشر نیست

عاشقوں کو (چونکہ) ہر لحمہ (آتشِ عشق میں) جلنا (قسمت میں لکھا) ہے، اس لئے ان پر آداب کی پابندیاں لازم نہیں

دیکھو) اجاڑ گاؤں پر خراج اور عشر نہیں ہوتا۔ (۱۷۴/۲)

ور خطا گوید وُرا خاطی مگو گر بود پُرخوں شہید آں را مشو

اگر وہ عاشقِ حق کوئی غلط بات کہہ بیٹھے تو اس کو خطاوار نہ کہو (جیسے کہ حکم ہے کہ) اگر شہید خون آلود ہو تو بھی اس کو مت دھو کیونکہ شہید پر غسل نہیں ہوتا۔ (۱۷۴/۲)

رسول اللہ ﷺ کو لولاک کا رُتبہ عشق کے باعث ملا

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشق حضور ﷺ کا ساتھی تھا اور اسی وجہ سے آپ کے لیے "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" کا خطاب آیا (یعنی آپ ﷺ نہ ہوتے تو میں کائنات نہ بناتا) آپ ﷺ کا عشق تمام افراد سے زیادہ تھا، اسی لئے یہ فضیلت عطا فرمائی تاکہ آپ ﷺ عشق کی بلندیوں کو سمجھ لیں اور پھر آپ کے لئے سب کچھ مسخر کر دیا جائے ؎

با محمد ﷺ بود عشقِ پاک جفت بہرِ عشق اورا خدا لولاک گفت

پاک عشق محمد ﷺ کا ساتھی تھا، عشق کی وجہ سے خدا نے آپ ﷺ کے بارے میں لولاک فرمایا۔ (۲۷۸/۵)

گرگ و خرس و شیر داند عشق چیست

(خونخوار جانور بھی جانتے ہیں کہ عشق کیا ہے)

ہر جاندار خواہ انسان ہو یا حیوان، عشق کی رمق سے واقف ہے۔ دیکھئے! کتا انسان کا کتنا ہمدرد اور وفادار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔ جو شخص عشق سے خالی ہے وہ تو کتوں سے بھی بدتر ہے۔ میاں محمد بخشؒ نے فرمایا ؎

جس دے دل وِچ عشق نہ رچیا کتے اس تھیں چنگے
مالک دے گھر راکھی کردے صابر بھکے ننگے

فرماتے ہیں کہ اصحابِ کہف کا کتا اسی لئے جنت میں جائے گا کہ اس نے اصحابِ کہف کی سنگت اختیار کی ؎

گرگ و خرس و شیر داند عشق چیست کم زسگ باشد کہ از عشق او تہی ست

بھیڑیا، ریچھ اور شیر جانتا ہے کہ عشق کیا ہے، جو شخص عشق سے خالی ہے وہ کتے سے کم ہوتا ہے۔ (۲۰۵/۵)

اس بات پر روایات ملتی ہیں کہ جب کوئی خونخوار جانور کسی صحابی یا نیک آدمی پر لپکتا تو وہ اسے کہتے کہ خبردار ہمیں کچھ نہ کہنا، یہ جسم رسول اللہ ﷺ پر عاشق ہے۔ اس قدر کہنے سے خونخوار جانور ان کو کوئی نقصان نہ پہنچاتا بلکہ ایسے جانور تو اُن بزرگوں کے قدموں پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے عاشق ہیں۔

گر رگے عشقے نبودے کلب را کے بجستے کلب کہفِ قلب را

اگر کتے میں عشق کی رگ نہ ہوتی تو کتا اہلِ دل کے غار کو کب ڈھونڈتا۔ (۲۰۵/۵)

ہم زجنس او بصورت چوں سگاں　　گر نشد مشہور ہست اندر جہاں

اس کے ہم جنس بھی کتوں کی صورت دنیا میں ہیں، اگرچہ مشہور نہیں ہوئے ہیں لیکن ہیں۔ (۲۰۵/۵)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں وجود عشق کی وجہ سے ملا ہے، ہر چیز عشق اور خواہش سے بنی ہے۔ انسان جب روٹی کھاتا ہے تو یہ اس کے جسم کا حصہ بن جاتی ہے، عشق کی غذا جب مل جائے تو انسان جاوداں ہو جاتا ہے ؎

عشق نانِ مردہ را جاں می کند　　جاں کہ فانی بود جاویداں کند

عشق ہی مردہ روٹی کو جان دار بناتا ہے، جو جان فانی ہے اس کو جاوداں بنا دیتا ہے۔ (۲۰۵/۵)

بوئے فقر آید ازاں خوش دمدمہ

(اس خوش گفتاری سے فقر کی بو آتی ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں عاشق کی بیماریاں سب بیماریوں سے الگ تھلگ ہیں۔ عاشق لوگ خوشی کا جام اس وقت پیتے ہیں جب معشوق ان کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے۔ ان کے عشق کے درخت موسم بہار اور خزاں دونوں میں سرسبز رہتے ہیں۔ اگر اپنے محبوب کی طرف سے ان کو تکلیف پہنچے تو اس میں راحت محسوس کرتے ہیں اور ایسی باتیں زبان سے نکالتے ہیں کہ جن سے فقر کی بُو آتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت آئے تو اپنی جیب سے قرآن کی یہ آیت نکال کر پڑھتے ہیں اور رقص کرتے ہیں ؎

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا　　اور آپ صبر فرمایئے اپنے رب کے حکم سے،
(الطور۔۴۸)　　پس آپ بلا شبہ ہماری نظروں میں ہیں۔

عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

عِلّتِ عاشق زعلتہا جداست　　عشق اُصطُرلابِ اَسرارِ خداست

عاشق کی بیماری تمام بیماریوں سے جدا ہے، عشق خدا کے بھیدوں کا اصطرلاب یعنی ماننے والا آلہ ہے۔ (۴۳/۱)

عاشقاں جام فرح آنگہ کشند　　کہ بدست خویش خوباں شاں کشند

عاشق لوگ (سچی) خوشی کا پیالہ اس وقت پیتے ہیں جب کہ معشوق ان کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کرتے ہیں۔ (۵۴/۱)

درج ذیل شعر میں اس بات پر اشارہ ہے کہ جو کوئی اوّلین اور آخریں یعنی حضور ﷺ کا عاشق ہے تو ایسے لوگوں کے عشق میں گم ہو جانے سے عشق کی بات بنتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ عشق تو رسول اللہ ﷺ کے عشق کی ایک شعاع ہے۔

غرق عشقے شو کہ غرق ست اندریں　　عشقہائے اوّلین و آخریں

اس عشق میں غرق ہو جاؤ، جس میں سب اوّلین و آخرین کے عشق غرق ہیں۔ (۱۹۷/۱)

عاشقی زیں ہر دو حالت برترست　　　بے بہار و بے خزاں سبز و ترست

(کیونکہ) عاشقی ان دونوں حالتوں سے اعلیٰ ہے، وہ بہار وخزاں کے تعلق کے بغیر ہی سبز وشاداب ہے۔ (۲۰۰/۱)

گشت ایں دُشنام نامطلوبِ اُو　　　خوش زبہرِ عارضِ محبوبِ اُو

اس کی یہ نامرغوب گالی اس کے پیارے مکھڑے (سے نکلنے) کی وجہ سے پیاری لگتی ہے۔ (۳۰۳/۱)

گر بگوید فقہ فقر آید ہمہ　　　بوئے فقر آید ازاں خوش دمدمہ

(عاشق) اگر فِقہ کا مسئلہ بھی لکھے گا تو ساری بات فقر کی نکلے گی، اس کی خوش گُفتاری سے فقر کی بُو آتی ہے۔
(۳۰۳/۱)

بلکہ چوں آب ست و ہر قطرہ ازاں　　　ہم سرست و پا و ہم بے ہر دوآں

بلکہ وہ (فکرِ عشق) کے پانی کی طرح ہے جس کے ہر قطرے کے لئے ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی اور دونوں کی نفی بھی صحیح ہے یعنی بغیر سروپا بھی ہے۔ (۳۰۴/۱)

باطلاں را چہ رُباید باطلے　　　عاطِلاں را چہ خوش آید عاطلے

(کیوں نہ ہو) بے ہودہ لوگوں کو کون سی چیز لبھاتی ہے؟ بے ہودہ چیز، لغو لوگوں کو کیا شے اچھی لگتی ہے؟ لغو شے۔
(۲۰۰/۲)

زانکہ ہر جنسے رباید جنسِ خود　　　گاؤ سوئے شیر نر کے رو نہد

کیونکہ ہر جنس کو اپنی جنس (بطور میلان) جذب کرتی ہے، (بھلا ایک) بیل (کسی) شیر کی طرف کب رُخ کرے گا۔
(۲۰۰/۲)

گرگ بر یوسف کجا عشق آورد　　　جز مگر از مکر تا اُورا خورد

بھلا بھیڑیا یوسف پر کہاں عاشق ہوسکتا ہے، سوائے فریب کے تاکہ اس کو کھا جائے یہی وجہ شیر کے بیل کی طرف رُخ کرنے کی ہوسکتی ہے۔ (۲۰۰/۲)

مولاناؒ عشق کے گہرے نکات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ قصہ بغیر ترتیب کے کہہ دیا ہے، جیسا کہ عاشقوں کا خیال بے سروپا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عاشق کا خیال بے سروپا ہوتا کیونکہ وہ ازل سے بھی پہلے کا ہے، وہ انتہا بھی نہیں رکھتا کیونکہ وہ ابد سے وابستہ ہے۔ اس کا یہ فکر پانی کی طرح ہے، جس کا ہر قطرہ سر اور پیر بھی رکھتا ہے اور بغیر سروپا بھی ہے۔ اگر قطرے کو دریا سے الگ کرلو تو اس کی ابتدا اور انتہا ہے اور اگر الگ نہ کرو تو اس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ عاشق کا تعلق چونکہ ذاتِ خداوندی سے ہے، جو ازلی اور ابدی ہے، لہٰذا اس کے معاملے کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ اگر اس قطرے کو علیحدہ نہ کرو تو اس قطرے کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ یہی حال عشق کا ہے۔

دسواں باب

عشق دریائیست قعرش ناپدید

(عشق وہ دریا ہے جس کی گہرائی معلوم نہیں)

مازعشقِ شمس دینؒ بے ناخنیم

(ہم شمس دینؒ کے عشق سے بے بس ہو رہے ہیں)

گذشتہ مضمون میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب اہلِ عشق کو مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو پڑھتے ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''تم صبر کرو اپنے رب کے حکم سے، پس تم بلاشبہ ہماری نظروں کے سامنے ہو'' (الطور:۴۸) تو ان کی ڈھارس بندھ جاتی ہے بلکہ ان میں سے بعض پر حالتِ وجد طاری ہو جاتی ہے۔ اس پر مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ صحیح عاشق تو وہ ہے جس کا غم اس کو غمزدہ کرنے کی بجائے دل کی خوشی میں اضافہ کرنے لگے تو سمجھ لو کہ وہ مرادِ عشق تک پہنچ گیا پھر اس کی رُوح میں گُل وسوسن پیدا ہونے لگیں گے۔ (کچھ بزرگ اہلِ بلا میں سے ہوتے ہیں، جو اس وقت خوش ہوتے ہیں جب ان پر بلائیں نازل ہوں۔ اس کے لیے کشف المحجوب دیکھیں)۔

حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہم عشق شمس تبریزؒ سے بے بس ہو رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں۔ اس سلسلے میں معلوم ہونا چاہیے کہ سالکین کاملین کی دو حالتیں ہوتی ہیں، ایک فنا اور ایک بقا۔ فنا میں بزرگ تصرّف نہیں کرتے کیونکہ اگر کریں تو اس سے ان کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر بقا میں کبھی یہ بزرگ

تصرّف کر سکتے ہیں اور کبھی نہیں کر سکتے بقا کی حالت میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کو تصرّف کی اجازت ہوتی ہے (ان کی اجازت کی حالت میں بھی کبھی ان کو تصرّف کرنے کا خاص حکم ہوتا ہے اور کبھی حکم نہیں ہوتا، یعنی تصرّف کرنے یا نہ کرنے پر اختیار ہوتا ہے) انبیاء کرام علیہم السلام کو تصرّف سے نفرت ہوتی ہے کیونکہ معجزہ دکھانے میں ان کی توجہ خدا سے ہٹ جاتی ہے اور یہ ان حضرات کو گوارہ نہیں۔ بعض انبیاء پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ تصرّف کرتے رہتے ہیں اور خدا سے بھی نظر نہیں ہٹاتے اور وہ کسی کی بیماری کا علاج بھی کر دیتے ہیں اور کوئی ان کے قدموں میں شفا کے لیے آ گرتا ہے۔ مولاناؒ کا یہ کہنا کہ ہم شمس دینؒ کے عشق میں بے بس ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مولاناؒ غلبۂ عشق میں دوسرا کام نہیں کر سکتے (جیسا کہ غالب نے بھی یہ کہا کہ "عشق نے غالب نکما کر دیا، ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے") مولانا رومیؒ یہ کہتے ہیں کہ بزرگوں میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ وہ اندھوں کو بینا کر سکتے ہیں مگر آپ زیادہ تر عشقِ شمس تبریزؒ میں ہی غرق رہتے تھے ؎

چوں زغم شادیت افزودن گرفت　　روضۂ جانت گل و سوسن گرفت

جب غم تمہاری خوشی بڑھانے لگے تو تمہاری روح کے باغ میں (علوم و معارف کے) گل و سوسن پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے۔ (۱۳۹/۲)

ایں چنیں ذوالنون مصریؒ را فتاد　　کاندرو شور و جنونِ نو بزاد

اسی طرح حضرت ذوالنون مصریؒ کو ایک واقعہ پیش آیا تھا جس سے ان میں ایک (تازہ) ولولۂ عشق اور نیا جنون پیدا ہوا۔ (۱۴۰/۲)

شور چنداں شد کہ تا فوقِ فلک　　می رسد از وے جگر ہا را نمک

ان کے جنونِ عشق کی شورش اس قدر بڑھ گئی کہ زمین سے لے کر آسمان کے اُوپر تک (کی مخلوق کے) کلیجوں پر اس سے نمک پاشی ہوئی ہے۔ (۱۴۰/۲)

ہیں منہ تو شورِ خود اے شورہ خاک　　پہلوئے شورِ خداوندانِ پاک

خبردار! اے نکمّی مٹی (کے ہم رُتبہ آدمی) تم اپنے غوغائے عشق کو ان حضرات پاک ذات کے شور (عشق) کے برابر نہ سمجھو۔ (۱۴۰/۲)

ما زعشقِ شمسؒ دیں بے ناخنیم　　ورنہ ما آں کور را بینا کنیم

ہم حضرت شمس تبریزؒ کے عشق سے بے بس ہو رہے ہیں، ورنہ ہم ہی اس اندھے کو (بحکمِ خدا) بینا بنا دیتے ہیں۔ (۱۱۶/۲)

اپنی روح کو خدا کا راستہ دکھاؤ

مثنوی میں کئی اور مقامات پر بھی مولاناؒ فرماتے ہیں (جس کا ذکر اس کتاب میں بھی کر دیا گیا ہے) کہ اگر فکر

منجمد ہو جائے تو جاؤ ذکر کرو۔ ایک حدیث میں ہے کہ فکر کی ایک گھڑی ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر ہے۔ جب فکر کھل گیا تو راستہ بھی کھل جاتا ہے اور راستہ وہ ہوتا ہے جو خدا تک پہنچا دے۔ ذکر سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی یاد میں کھو کر اس کا عشق پیدا کرو۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ عاشقی تو زاریٔ دل سے پیدا ہوتی ہے اور یہ زاری انسان کے دل کی تمام بیماریوں کا علاج کر دیتی ہے ؎

آئینہ کز زنگ و آلائش جداست　　پُر شعاعِ نورِ خورشیدِ خداست

وہ آئینہ جو زنگ اور میل سے دور ہے، وہ خدا کے نور کے آفتاب کی شعاعوں سے بھرا ہے۔ (۱/۳۵)

آئینے سے جب زنگ دور ہو جائے تو یہ خورشیدِ خدا سے جگمگا اُٹھتا ہے۔

رو، تو زنگار از رخِ اُو پاک کن　　بعد ازاں آں نور را ادراک کن

جاؤ اپنے دل کے رُخ کو زنگ سے صاف کرو اور اس کے بعد اس نور کو حاصل کرو۔ (۱/۳۵)

یعنی ذکر سے یہ زنگ دُور کرو پھر دیکھو کہ اس نور کا اِدراک کیسے نہیں ہوتا۔

ایں حقیقت را شنو از گوشِ دل　　تا بروں آئی بکلّی زآب و گل

اس حقیقت کو دل کے کان سے سن، تاکہ تو پانی اور مٹی سے بالکل نکل آئے۔ (۱/۳۵)

یعنی علائقِ سفلیہ کو دِل سے دُور کرو کیونکہ یہ انسان کو عالمِ قدس کی سیر سے دُور رکھتے ہیں۔

فہم گر دارید جاں را رہ دہید　　بعد ازاں از شوق پا در رہ نہید

اگر سمجھ رکھتے ہو تو روح کو راستہ دو، اس کے بعد شوق سے راستہ پر چلو۔ (۱/۳۵)

یعنی روح کی پرواز تب ہی ہو سکتی ہے جب تمہاری راہ کھل جائے۔

عاشقی پیدا ست از زاریٔ دل　　نیست بیماری چو بیماری دل

دل کی بیماری سے عاشقی ظاہر ہوتی ہے، دل کی بیماری جیسی کوئی بیماری نہیں ہے۔ (۱/۴۳)

یعنی یہ عاشقی دل میں آہ و زاری سے پیدا ہوتی ہے، دل کی بیماری سے بڑھ کر کوئی بیماری نہیں۔

عشق دریائیست قعرش ناپدید

(دل دریا سمندروں ڈھونگے کون دِلاں دیاں جانے ھُو)

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سچے عاشقِ رسول ﷺ تھے۔ جب کبھی کوئی خونخوار جانور ان کی طرف آتا تو وہ کہہ دیتے کہ خبردار! یہ جسم حضور ﷺ پر قربان ہو چکا ہے، ایسا کہنے سے وہ جانور ان پر حملہ نہ کرتا بلکہ ایسے واقعات روایات میں آتے ہیں کہ شیر جیسے موذی جانور بزرگوں کے قدموں میں باادب بیٹھ جاتے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں اگر وہ جانور اولیائے کرام علیہم السلام کے جسموں کو کھا جائیں تو وہ مر جائیں گے۔

فرماتے ہیں کہ دونوں جہاں عشق کی چونچ کا ایک دانہ ہے اور عشق ایک سمندر ہے جس کی گہرائی معلوم نہیں ہوسکتی، یہ ایک ایسا دریا ہے کہ اس میں کئی سمندر سما سکتے ہیں کیونکہ سمندر مکان ہے اور انسان کا دل لامکانیت کا درجہ رکھتا ہے، جب ایک سمندر کے قطروں کا شمار ممکن نہیں تو محبت کے دریا کو کون ماپ سکتا ہے ؎

دو جہاں یکدانہ پیشِ نولِ عشق — ہرچہ جز عشق ست شد ماکولِ عشق

جو عشق کے سوا ہے وہ عشق کی غذا ہے، عشق کی چونچ کے لئے دونوں جہاں ایک دانہ ہیں۔ (۵/۲۷۷)

بندگی کسب ست آید در عمل — بندگی کن تاشوی عاشق لعل

عبادت کر، تاکہ تو عاشق بن جائے، عبادت کسب ہے، عمل سے آجاتی ہے۔ (۵/۲۷۷)

عشق دریائیست قعرش ناپدید — در نگنجد عشق در گفت و شنید

عشق کہنے اور سننے میں نہیں سماتا، عشق وہ دریا ہے جس کی گہرائی معلوم نہیں۔ (۵/۲۷۷)

ہفت دریا پیشِ آں بحرست خُرد — قطرہ ہائے بحر را نتواں شمرد

سمندر کے قطروں کو شمار نہیں کیا جاسکتا، اس سمندر کے سامنے ساتوں دریا چھوٹے ہیں۔ (۵/۲۷۷)

چوں نباشد عشق کزوے نیست بد
(عشق کے بغیر چارۂ کار ہی نہیں)

ایک منٹ کے لئے اگر یہ سوچ لیا جائے کہ دُنیا میں عشق سرے سے ہی موجود نہیں تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ تمام دُنیا کا کاروبار بند ہوکر ہر چیز ناکارہ ہو جائے گی۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عشق زمانے کی ہر شے میں ہی نہیں بلکہ ہر ذرہ عشق کے باعث ہی قائم ہے۔ اگر ہم سائنس کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ پتھر کے اندر موجود ذرّات میں بھی کششِ ثقل کی طاقت موجود ہے اور اسی کشش کے باعث پورا نظامِ شمسی بلکہ نظامِ کائنات چل رہا ہے۔ ایک ستارہ یا سیارہ ہر دوسرے پر ثقل انداز ہوتا ہے اور تمام ستارے ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہیں اور ایک Balance یعنی توازن قائم ہونے کی وجہ سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک شخص دوسرے کا محتاج ہے اور اگر یہ محتاجی نہ ہوتی تو ماں اپنے بیٹے سے اور بیٹا اپنے والدین، اساتذہ اور دیگر بزرگوں سے محبت نہ کرتا۔ عشق کی مذکورہ بالا اہمیت کے پیشِ نظر دُنیا کے میوہ جات اور کھیتیاں سرسبز نہ نظر آتیں۔ بادلوں میں مختلف کرنٹ کی وجہ سے ہی موسم پیدا ہوتے ہیں (منفی اور مثبت ذرات) اگر یہ کرنٹ (عشق) موجود نہ ہوتا تو کوئی کسی سے سروکار نہ رکھتا ؎

اے عجب من عاشقِ ایں ہر دو ضِد — عاشقم بر قہر و بر لطفش بجِد

میں اس کے قہر اور مہربانی پر واقعی عاشق ہوں، تعجب ہے میں ان دو اضداد کا عاشق ہوں۔ (۱/۱۸۱)

چوں نباشد عشق کزوے نیست بُد　　　　عشقِ من بر مصدر ایں ہر دو شد

میرا عشق ان دونوں کے منبع سے ہے، عشق نہ ہو تو اس سے چارہ نہیں ہے۔ (۱/۱۸۱)

عشق و رقّت زاید از لقمہ حلال　　　　علم و حکمت زاید از لقمہ حلال

حلال کے لقمہ سے علم اور دانائی زیادہ ہوتی ہے، عشق اور دل کی نرمی حلال لقمہ سے بڑھتی ہے۔ (۱/۱۸۷)

باغِ سبزِ عشق کو بے منتہاست　　　　جز غم و شادی درو بس میوہاست

عشق کا سبز باغ جو دائمی ہے، اس میں غم اور خوشی کے علاوہ بہت سے میوے ہیں۔ (۱/۲۰۰)

عاشقی زیں ہر دو حالت برترست　　　　بے بہار و بے خزاں سبز و ترست

عاشقی ان دونوں حالتوں سے بلند و بالا ہے (وہ) بے بہار اور بے خزاں سبز اور تر ہے۔ (۱/۲۰۰)

گر محبت فکرت و معنے ستے　　　　صورت صوم و نمازت نیستے

اگر محبت، فکر اور باطنی معاملہ ہی ہوتا تو پھر تیری نماز اور روزے کی ضرورت نہ رہتی، یعنی معدوم ہو جاتی۔ (۱/۲۷۹)

بے غرض نبود بگردش در جہاں　　　　غیرِ جسم و غیرِ جانِ عاشقاں

دُنیا میں گردش بے غرض نہیں ہوتی ہے، سوائے عاشقوں کے جسم اور جان کے۔ (۱/۲۹۵)

عاشقانِ کل نہ ایں عشاقِ جزو　　　　ماند از کل آنکہ شد مشتاق جزو

کل کے عاشق نہ کہ یہ جزو کے عاشق، جو جزو کا عاشق ہوا وہ کل سے (دور) رہ گیا۔ (۱/۲۹۶)

آنکہ ارزد صید را عشق ست وبس

(جو شکار کرنے کے قابل ہے وہ صرف خدا کا عشق ہے)

حضرت میاں محمدؒ فرماتے ہیں کہ لوگ تو جیتنا چاہتے ہیں مگر جو خود ہار مان لے تو اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

جتن جتن لوکی کھیڈن تے تُو ہارن کھیل فقیرا
جتن دا مُل کوڈی پے سی ہارن دا مُل ہیرا

تصوف کا یہ اصول ہے کہ خود کو لوگوں کی خدمت پر لگاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جس کو تم اللہ کی طرف آتے ہوئے دیکھو تو تم اس کے خادم بن جاؤ اور اس کے پیروں پر اپنا سر ڈال دو۔ مولاناؒ نے بھی ایک شعر میں اس حدیث کا مضمون بیان کیا ہے اور درج ذیل حدیث سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے طالب کے سامنے اپنا سر ڈال دو۔ حدیث یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی۔

يَا دَاوُدُ اِذَا رَأَيْتَ لِيْ طَالِباً　　　　اے داؤدؑ! جب تو میرے کسی طالب کو
فَكُنْ لَهٗ خَادِماً　　　　دیکھے تو اس کا خادم بن جا۔

اس حدیث کے مطابق حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ طالبِ دین کے آگے اپنا سر رکھ دو۔

ہر کرا بینی طلبگار اے پسر یار او شو پیشِ او انداز سر

اے بیٹا! تو جس کو طالبِ خدا دیکھے، اس کا دوست بن جا اور اس کے سامنے سر رکھ دے۔ (۱۴۵/۳)

کز جوارِ طالباں طالب شوی وز ظلالِ غالباں غالب شوی

طلب گاروں کے قریب تُو طلب گار بن جائے گا اور (نفس پر) غالب لوگوں کے سایہ میں تو غالب بن جائے گا۔ (۱۴۵/۳)

عشقِ بینایاں بود برکانِ زر لا جرم ہر روز باشد بیشتر

عقل مندوں کا عشق سونے کی کان جیسا ہوتا ہے اور وہ لامحالہ ہر روز بڑھتا رہتا ہے۔ (۱۰۸/۶)

عشقِ ربانی ست خورشیدِ کمال امرِ نورِ اوست خلقاں چوں ظلال

خدائی عشق کمال کا سورج ہے اور عالمِ امر اس کا نور ہے، عالمِ خلق اس کے ظلال یعنی سایوں کی طرح ہے۔ (۱۰۹/۶)

عاشقی و توبہ یا امکانِ صبر ایں محالے باشد اے جاں بس سطبر

عاشقی میں توبہ یا صبر کا امکان، اے جان! یہ بہت عظیم محال ہوتا ہے۔ (۱۰۸/۶)

آنکہ ارزد صید را عشق ست و بس لیک او کے گنجد اندر دامِ کس

جو شکار کرنے کے قابل ہے، وہ صرف عشق ہے لیکن وہ کب کسی کے جال میں پھنستا ہے؟ (۵۲/۵)

تو مگر آئی و صیدِ اُو شوی دام بگذاری بدامِ اُو روی

ہاں تُو آ اور اس کا شکار بن جا، اپنا جال چھوڑ اور اس کے جال میں گرفتار ہو جا۔ (۵۲/۵)

عشق میگوید بگوشم پست پست صید بودن خوشتر از صیادیست

میرے کان میں عشق آہستہ آہستہ کہتا ہے، شکاری بننے سے شکار بن جانا بہتر ہے۔ (۵۲/۵)

گیارھواں باب

(اے عشق) ہر کجا تو بامنی من خوشدلم

(اے عشق تو جہاں میرے ساتھ ہے، میرا دل خوش ہے)

مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ ایک عاشق کے لئے سب سے بہتر جگہ وہ ہے، جہاں اس کا دلبر (محبوب) موجود ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جہاں عشق کو اس کی غذا ملے، وہی اس کے لیے بہتر ہے۔ اللہ کے بندوں کو جہاں اللہ کا دیدار ملے وہیں وہ خوش رہتے ہیں۔ اگر جہنم میں بھی اللہ کا دیدار ملے تو وہ جگہ جنتُ الفردوس سے بہت بہتر ہے، اگر جہنم میں اللہ کا دیدار میسر ہو تو جہنم کا عذاب کوئی حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ ہر بلا اور مصیبت کا علاج تو ہو سکتا ہے مگر خدا سے حجاب میں ہونے کا عذاب جہنم کے عذاب سے بھی بدتر ہے۔ عشق کی زندگی ہو تو تمام تکلیفیں ختم ہو جاتی ہیں۔ پیدا ہونے سے پہلے انسان عالمِ ارواح میں تھا تو اس کو ہمہ وقت اللہ کی طرف توجہ میسر تھی مگر دُنیا میں آنے سے اس کی توجہ مال، اولاد، مکان اور خورد ونوش کی طرف مبذول ہوگئی۔ محبوبین کی اَرواح دُنیا میں بھی عشقِ الٰہی کی وجہ سے ہمہ وقت اللہ کی طرف متوجہ رہتی ہیں۔ ایسے لوگ جو عشقِ الٰہی میں گرفتار ہوں اُن کو جنت میں نہیں بلکہ عالمِ ھُو میں جگہ دی جاتی ہے، جہاں کوئی پھل، پھول اور انہار دیکھنے میں نہیں آتے بلکہ وہاں ہمہ وقت اللہ کا دیدار اس کے عاشقوں کو میسر رہتا ہے ؎

گفت معشوقے بعاشق کاے فتیٰ   تو بغربت دیدۂ بس شہرہا

ایک معشوق نے عاشق سے کہا، اے نوجوان! تو نے مسافرت میں بہت سے شہر دیکھے ہیں۔ (۳۶۳/۳)

پس کدامیں شہر زانہا خوشترست   گفت آں شہرے کہ دروے دلبرست

ان میں سے کون سا شہر بہتر ہے؟ اس نے کہا، وہ شہر جس میں معشوق ہے۔ (۳۶۳/۳)

ہر کجا یوسفے باشد چو ماہ　　جنت است آں ارچہ باشد قعرِ چاہ

جہاں چاند جیسا یوسف ہو وہاں جنت ہے، خواہ کنویں کی گہرائی میں ہو۔ (۳/۳۶۴)

شد جہنم با تو رضوان و نعیم　　بے تو شد ریحان و گل نارِ جحیم

تیرے ساتھ جہنم رضوان اور نعمت بن گئی، تیرے بغیر ریحان اور پھول دوزخ کی آگ بن گئے۔ (۳/۳۶۴)

ہر کُجا تو با منی من خوشدلم　　ور بود در قعرِ گورے منزلم

جہاں تُو میرے ساتھ ہے میں خوش دل ہوں، خواہ میری منزل قبر کے گڑھے میں ہو۔ (۳/۳۶۴)

خوشتر از ہر دو جہاں آنجا بود　　کہ ترا بامن سر و سودا بود

دونوں جہاں سے زیادہ اچھی جگہ وہ ہے جہاں تجھے میرا خیال و جنون ہو۔ (۳/۳۶۴)

کسی شاعر نے کہا ہے ''اَظْلَمُ الْاَشْیَاءِ دَارُالْحَبِیْبِ بِلاَ حَبِیْبٍ'' یعنی سب سے زیادہ اندھیرے والی چیز حبیب کا وہ گھر ہے جس میں حبیب موجود نہ ہو۔

عشق را پانصد پر است از عرش تا تحت الثریٰ

(عشق کے پانچ سو پَر ہیں عرش سے تحت الثریٰ تک)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشق ایک خدائی وصف ہے، اس میں خوف و ہراس، رنج وغم اور خوشی کی کوئی جگہ نہیں، یعنی ایک عاشق متصف بہ اوصافِ خدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وصف بھی عشق ہے کیونکہ اس نے کائنات اور حضور ﷺ کو جذبۂ محبت کے بغیر نہیں پیدا کیا ''کُنْتُ کَنْزاً مَّخْفِیًّا'' والی حدیث میں ہے کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا تو میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ اس حدیث کی تشریح بہت طوالت طلب ہے اور یہ کتاب اس کی متحمل نہیں۔ اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے بالِ جبرائیل میں لکھا ہے ؎

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیّلات میں　　میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

تُو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینہء کائنات میں

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس قدر تصرفات عطا فرمائے کہ ہر جگہ اس کی خاکِ راہ بن گئی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایک عاشق کو پانچ سو پَر عطا کئے اور ہر پَر آسمان کی بلندی سے تحت الثریٰ تک جا سکتا ہے۔ یہ دُنیا والے ایسے عاشق (انسان) کی گردِ راہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

عشق وصف ایزدست اما کہ خوف　　وصفِ بندہ مبتلائے فرج و جوف

عشق اللہ کی صفت ہے لیکن خوف شرم گاہ اور پیٹ میں مبتلا بندے کی صفت ہے۔ (۵/۲۲۳)

پس محبت وصفِ حق داں عشق نیز　　خوف نبود وصفِ یزداں اے عزیز

پس محبت کو اللہ تعالیٰ کی صفت سمجھ اور عشق کو بھی، اے پیارے! خوف اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں ہوتی۔ (۲۲۳/۵)

شرحِ عشق ار من بگویم بر دوام　　صد قیامت بگذرد و آں نا تمام

میں اگر مسلسل عشق کی شرح کروں تو سو قیامتیں گذر جائیں تو بھی وہ ناتمام رہے گی۔ (۲۲۳/۵)

زانکہ تاریخِ قیامت را حدست　　حد کجا آنجا کہ وصفِ ایزدست

کیونکہ قیامت کی تاریخ محدود ہے، اس کی انتہا کہاں جو خدا کی صفت ہے۔ (۲۲۴/۵)

عشق را پانصد پَر ست و ہَر پَرے　　از فرازِ عرش تا تحت الثّریٰ

عشق کے پانچ سو پر ہیں اور ہر پر عرش کی بلندی سے زمین کے نیچے تک ہے۔ (۲۲۴/۵)

زاہدِ باترس می تازد بپا　　عاشقاں پرّاں تر از برق و ہوا

خوف زدہ زاہد پاؤں سے دوڑتا ہے، عاشق بجلی اور ہوا سے زیادہ تیز اُڑنے والے ہیں۔ (۲۲۴/۵)

کے رسند ایں خائفاں در گردِ عشق　　کاسماںرا فرش سازد دردِ عشق

یہ ڈرنے والے عشق کی گرد تک کہاں پہنچ سکتے ہیں کیونکہ عشق کا درد آسمان کو فرش بنا دیتا ہے۔ (۲۲۴/۵)

پس چہ باشد عشق دریائے عدم　　در شکستہ عقل را آنجا قدم

عشق کیا ہے؟ فنا کا دریا ہے، وہاں عقل کے پاؤں شکستہ ہیں۔ (۴۴۷/۳)

عقل حیراں کہ چہ عشق ست وچہ حال　　کہ فراقِ او عجب تر یا وصال

عقل حیران تھی کہ عشق کیا ہے اور اس کا کیا حال ہے کہ اس میں ہجر زیادہ تعجب خیز ہے یا وصل۔ (۴۴۷/۳)

عشق از اوّل چرا خونی بود　　تا گریزد آنکہ بیرونی بود

عشق شروع سے خونی کیوں ہوتا ہے؟ تا کہ وہ بھاگ جائے جو اجنبی ہوتا ہے۔ (۴۵۰/۳)

توبہ ِکرم و عشق ہمچوں اژدہا　　توبہ وصفِ خَلق و آں وصفِ خدا

توبہ کیڑا ہے اور عشق اژدہا کی طرح ہے، توبہ مخلوق کی صفت ہے اور عشق خدا کا وصف ہے۔ (۱۰۸/۶)

عشق زاوصافِ خدائے بے نیاز　　عاشقی بر غیر اُو باشد مجاز

عشق بے نیاز خدا کے اوصاف میں سے ہے، اس کے غیر سے عاشقی مجاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ (۱۰۸/۶)

آفتابی را رہا کن ذرّہ شو

(سورج بننے کو چھوڑ، عشق کا ذرّہ بن جا)

عشق میں سوچنے اور جائزہ لینے تک نوبت نہیں آتی، بلکہ فوراً نارِ نمرود میں کود جانے کی رسم دیکھنے میں

آتی ہے۔ جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشقِ ابراہیمؑ نے آتشِ نمرود میں فوراً چھلانگ لگا دی جب کہ انسانی عقل آج بھی ان کے اس عمل پر حیران ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی دُنیا میں اگر حکومت ہے تو صرف عشق کی، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے بے ہودہ پن ہے ؎

گول میکن خویش را و غرہ شو — آفتابی را رہا کن ذرّہ شو

اپنے آپ کو بے وقوف بنا لے اور فریفتہ بن جا، سورج بننے کو چھوڑ، ذرّہ بن جا۔ (۵۲/۵)

بر درم ساکن شو و بیخانہ باش — دعویٰ شمعی مکن پروانہ باش

میرے دروازے پر پڑ جا اور بے گھر بن جا، شمع بننے کا دعویٰ نہ کر، پروانہ بن جا۔ (۵۲/۵)

تا بہ بینی چاشنیء زندگی — سلطنت بینی نہاں در بندگی

تاکہ تو زندگی کا لطف دیکھے اور بادشاہی کو غلامی میں چھپا ہوا دیکھ سکے۔ (۵۲/۵)

عاشقاں را شادمانی و غم اوست — دستِ مزد و اُجرتِ خدمت ہم اوست

عاشقوں کی خوشی اور غم وہی ہے، مزدوری کا ہاتھ اور خدمت کی اُجرت بھی وہی ہے۔ (۶۹/۵)

غیرِ معشوق ار تماشائی بود — عشق نبود ہرزہ سودائی بود

وہ اگر معشوق کے غیر کا تماشائی ہے تو عشق نہیں ہے بلکہ بے ہودہ اور دیوانہ ہے۔ (۶۹/۵)

اصلِ عشق مُردن است و نیستی

(عشق کی اصل مر جانا اور فنا ہونا ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشق کی اصل مرنے کے لئے تیار رہنا اور عشق میں فنا ہو جانا ہے۔ ایسی زندگی میں بقائے دوام ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جہاں جان دے دینا باعثِ عزت ہے، موت سے ڈرنا بزدلی ہے۔ جو شخص عشق میں زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اطاعت کے علاوہ سب کچھ غلامی یا کفر ہے ؎

گفت معشوق ایں ہمہ کردی و لیک — گوش بکشا پہن و اندر یاب نیک

معشوق نے کہا، یہ سب کچھ تو نے کیا لیکن کان کھول لے اور خوب سمجھ لے۔ (۱۳۱/۵)

کانچہ اصلِ اصلِ عشق ست و ولاست — آں نکردی آنچہ کردی فرعہاست

جو دوستی اور عشق کی جڑ کی جڑ ہے تو نے وہ نہیں کیا، جو کچھ کیا وہ شاخیں ہیں۔ (۱۳۱/۵)

گفتش آن عاشق بگو کاں اصل چیست — گفت اصلش مردنست و نیسی ست

اس سے عاشق نے کہا، فرمایئے! وہ جڑ کیا ہے؟ اس نے کہا، اس کی جڑ مرنا اور فنا ہونا ہے۔ (۱۳۲/۵)

تو ہمہ کردی نمردی زندہٗ ہیں بمیر ار یارِ جاں با زندہٗ

تُو نے سب کچھ کیا، تُو مرا نہیں زندہ ہے، ہاں مر جا اگرچہ جان کو فنا کرنے والا تیرا دوست ہے۔ (۱۳۲/۵)

گر بمیری زندگی یابی تمام نام نیکوئے تو ماند تا قیام

اگر تو مر جائے گا اور مکمل زندگی حاصل کرلے گا تو حشر تک تیرا نیک نام زندہ رہے گا۔ (۱۳۲/۵)

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی کفر باشد پیش او جز بندگی

جو شخص عشق میں زندگی حاصل کرلے اس کے نزدیک غلامی کے علاوہ ہر چیز کفر ہے۔ (۱۹۱/۵)

ہست برپائے دلم از عشق بند سود کے دارد مرا ایں وعظ و پند

میرے دل کے پاؤں میں عشق کی بیڑی ہے پھر مجھے یہ وعظ اور نصیحت کہاں مفید ہوسکتی ہے؟ (۱۹۶/۵)

مقصدِ اُو جز کہ جذبِ یار نیست

(عشق کا مقصد رضائے یار کے سوا کچھ نہیں)

مولاناؒ نے فرمایا کہ عشق کا قبلہ خدا ہے اور باطل کا قبلہ شیطان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گو عبادات کو واجب قرار دیا ہے مگر اصل عبادت اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ اگر انسان کا سر نماز میں جُھک گیا تو کیا حاصل، اصل بات تو دل کے پاک ہونے کے بعد اللہ کے سامنے دل کو جھکانے میں ہے اور انسان یہ سمجھے کہ "قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (یعنی بے شک آپ یہ کہیں کہ میری نماز وقربانی، میرا زندہ رہنا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے۔ (الانعام:۱۶۲)

پیر عشقِ تست نے ریشِ سپید دستگیرِ صد ہزاراں نااُمید

عشق تیرا پیر ہے، نہ کہ سفید داڑھی، جو لاکھوں مایوسوں کا دستگیر ہے۔ (۳۳۰/۵)

عشق صورتہا بسازد در فراق تا مصوّر سر کند وقتِ تلاق

عشق جدائی میں تصویریں بناتا ہے، یہاں تک کہ ملاقات کے وقت تصویر رُونما ہو جاتی ہے۔ (۳۳۰/۵)

عشق بحرے آسماں بر وے کفے چوں زلیخا در ہوایِ یوسفؑ

عشق ایک سمندر ہے، آسمان اس پر ایک جھاگ ہے، جیسے کہ زلیخا، یوسفؑ کے عشق میں تھی۔ (۳۸۷/۵)

دورِ گردونہا زموجِ عشق داں گر نبودے عشق بفسردے جہاں

آسمانوں کی گردش عشق کی موج سے سمجھ، اگر عشق نہ ہوتا تو جہاں ٹھہر جاتا۔ (۳۸۷/۵)

عشق را با پنج و باشش کار نیست مقصد او جز کہ جذبِ یار نیست

عشق کو پانچ اور چھے سے کوئی واسطہ نہیں ہے، یار کی توجہ کے سوا اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ (۱۵/۶)

قبلہٗ عاشق حق آمد اے پسر قبلہٗ باطل بلیس ست اے پدر

اے بیٹا! عاشق کا قبلہ خدا ہے، اے باوا! باطل کا قبلہ شیطان ہے۔ (۱۹۲/۶)

بارھواں باب

در دلِ عاشق بجز معشوق نیست

(عاشق کے دل میں اپنے محبوب کے سوا کوئی نہیں)

قرآن مجید کی آیات اور احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کا دھیان ہر لمحہ اللہ کی طرف رہتا ہے اور جو کسی سے محبت کرتا ہے تو اکثر اوقات اس کا ذکر اس کے ہونٹوں پر رہتا ہے۔ درج ذیل آیت میں اللہ کے بندوں کا اس کی محبت سے غافل نہ ہونے کا ذکر ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ. (النور:۳۷)

یعنی اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ تجارت اور خرید و فروخت ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے بندے تجارت اور خرید و فروخت میں بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ یہ بندے ذِکر میں ہمہ وقت مشغول رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اللہ کی یاد سے ایک لمحہ کے لئے غافل ہوئے تو وہ مُرتد ہو جائیں گے۔ عاشقِ خدا بھی اسی کی یاد سے اپنے دلوں کو معمور رکھتے ہیں۔ مجنوں کے متعلق بھی مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ وہ لیلیٰ کا نام اس لیے لیتا ہے کہ اس سے اس کے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ ''اَلا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' (الرعد:۲۸) یعنی یاد رکھو کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔ یہ اوصاف ایک عاشق پر بھی صادق آتے ہیں ؎

لاابالی عشق باشد نے خرد   عقل آں جوید کزاں سُودے برد

بے پرواہ عشق ہوتا ہے نہ کہ عقل، عقل وہ تلاش کرتی ہے جس سے وہ نفع اُٹھا سکے۔ (۱۹۸/۶)

عشق را در پیچشِ خود یار نیست　　　محرمش در دہ یکے دیّار نیست

پیچ و تاب میں عشق کا کوئی دوست نہیں ہے، اس کا محرم گاؤں میں کوئی رہنے والا نہیں ہے۔ (۶/۱۹۹)

نیست از عاشق کسے دیوانہ تر　　　عقل از سودائے او کورست و کر

عاشق سے زیادہ دیوانہ کوئی نہیں ہے، عقل اس کے جنون میں اندھی اور بہری ہے۔ (۶/۱۹۹)

یک دمِ ہجراں بَر عاشق چو سال　　　وصلِ سالِ متصل پیشش خیال

عاشق کے نزدیک ہجر کا ایک لحہ ایک سال جیسا ہے، سال بھر کا مسلسل وصل اس کے لئے ایک خیال ہے۔ (۶/۲۶۰)

در دلِ عاشق بجز معشوق نیست　　　درمیاں شاں فارق و مفروق نیست

عاشق کے دل میں معشوق کے سوا کچھ نہیں ہے، ان کے درمیان جدا کرنے والا اور جدائی کا سبب پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ (۶/۲۶۱)

عشق مستقی ست مستقی طلب　　　درپئے ہم این و آں چوں روز و شب

عشق پیاسا ہے اور پیاسے کا طلب گار ہے، یہ اور وہ، دن اور رات کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے ہیں۔ (۶/۲۶۱)

با دو عالم عشق را بیگانگی

(عشق کو دونوں عالموں سے اجنبیت ہے)

یہ بات مسلّم ہے کہ مشاہدہ ہو جائے تو یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مداریوں کی طرح کوئی کرشمے (بذریعہ کلام یا ہپناٹزم) دکھائیں تو ان کی بات عوام پر چھا جاتی ہے۔ عشق والوں کی بات میں دکھاوا نہیں ہوتا کیونکہ دُنیا کی دولت کی ان کو پرواہ نہیں ہوتی۔ عشق کو تو دونوں جہانوں سے اجنبیت ہوتی ہے۔ عشق والے تو اپنے اندر کی سینکڑوں دیوانگیوں کی وجہ سے دُنیا سے لاتعلق رہتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

با جمالِ جاں چو شد ہم کاسہء　　　باشدش زاخبار و دانش تاسہء

جو روح کے حسن کا ہم پیالہ بن گیا، اس کو خبروں اور علم و دانش سے نفرت ہو جاتی ہے۔ (۳/۳۶۸)

دید بر دانش بود غالب فزا　　　زاں ہمی دنیا بچربد عامہ را

آنکھوں سے دیکھ لینا عقل پر غالب ہوتا ہے، اسی لئے دُنیا عوام پر چھا جاتی ہے۔ (۳/۳۶۸)

زانکہ دنیا را ہمی بینند عَین　　　واں جہانے را ہمی دانند دین

کیونکہ وہ دُنیا کو اصل اور حقیقت سمجھتے ہیں اور اس عالم کو اُدھار سمجھتے ہیں۔ (۳/۳۶۸)

لیک شمع عشق چوں آں شمع نیست　　　روشن اندر روشن اندر روشنیست

لیکن عشق کی شمع اس شمع کی طرح نہیں ہے، وہ روشن، در روشن، در روشن ہے۔ (۳/۳۷۴)

کرد فضلِ عشق انساں را فضول　　زیں فزوں جوئی ظلوم ست و جہول

عشق کی بڑائی نے انسان کو فضول بنا دیا، اسی بڑھی ہوئی جستجو کی وجہ سے وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ (۴۴۳/۳)

با دو عالم عشق را بیگانگی　　اندرو ہفتاد و دو دیوانگی

عشق کو دونوں جہانوں سے اجنبیت ہے، اس میں بہتر (۷۲) دیوانگیاں ہیں۔ (۴۴۷/۳)

کورم از غیر خدا بینا بدو

(میں خدا کے غیر سے نابینا ہوں اور خدا سے بینا ہوں)

درجِ ذیل اشعار میں بھی عاشق کی کیفیات بیان کی گئی ہیں، فرماتے ہیں کہ اللہ کے عاشقوں کو غیر اللہ کی خبر نہیں ہوتی اور وہ تو ہمہ وقت معیتِ خدا میں رہتے ہیں۔ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص فرائض کے ادا کرنے کے بعد زائد (نفلی عبادت) ذوق وشوق سے کرے تو اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور اس کی زبان خدا کی زبان بن جاتی ہے (حدیث کافی طویل ہے) عاشق کو ہمہ وقت خدا سے کام رہتا ہے

میروم یعنی نمی ارزد بداں　　عشقِ جاناں کم نداں از عشقِ ناں

میں چلتا رہوں گا، یعنی (یہ چلنا) اس (محبوب) کے برابر نہیں، محبوب کے عشق کو روٹی کے عشق سے کم نہ سمجھ۔ (۱۹۵/۳)

سال و مہ رفتم سفر از عشقِ ماہ　　بے خبر از راہ و حیراں در الٰہ

چاند کے عشق میں سالوں اور مہینوں میں نے سفر کیا، راستہ سے بے خبر تھا اور اللہ تعالیٰ میں محو تھا۔ (۱۹۵/۳)

تو مبیں ایں پائے ہا را بر زمیں　　زانکہ بر دل میرود عاشق یقیں

تو ان پاؤں کو زمین پر نہ سمجھ کیونکہ عشق واقعۃً دل (کے بل) پر چلتا ہے۔ (۱۹۵/۳)

کورم از غیرِ خدا بینا بدو　　مقتضائے عشق ایں باشد بگو

میں خدا کے غیر سے نابینا اور خدا سے بینا ہوں، بتا! عشق کا یہی مقتضاء ہے۔ (۲۲۹/۳)

کوریِ عشق است ایں کوریِ من　　حُب یُعْمِی و یُصِمّ ست اے حَسن

میرا اندھا پن عشق کا اندھا پن ہے، بھلے (یہ) محبت اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (کا مصداق ہے)۔ (۲۲۹/۳)

ور بگوید کفر آید بوے دیں

(اگر عاشق کفر کی بات کرتا ہے تو اس میں ایمان کی بُو آتی ہے)

مولاناؒ نے اس موضوع پر بہت سے اشعار لکھے ہیں، ایک جگہ فرمایا ہے کہ اگر پلید آدمی دین کو پکڑے تو اس کو بھی پلید کر دیتا ہے اور اگر کوئی نیک آدمی بُری چیز کو پکڑے گا تو اس کو بھی دین میں تبدیل کر دے گا۔ ایک جگہ فرمایا کہ یہ مشکل ہے کہ ایک عاشق اگر کفر کو پکڑے تو اسے مسلمان نہ کر دے (کفر در عشق محال است کہ ایماں نشود)

حضرت جنیدؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''اگر کوئی مسلمان چاہے کہ گرجا میں چلا جائے تو کیا وہ جا سکتا ہے؟'' فرمایا: ''ہاں! جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہاں سے ایک دو کو مسلمان کر کے ساتھ لے آئے۔'' ؎

چونکہ جزوے عاشقِ جزوے شود   زود معشوقش بکلِّ خود رود

جب کوئی جزو، کسی جزو کا عاشق ہوتا ہے تو اس کا معشوق بہت جلد اپنے کُل کی طرف چلا جاتا ہے۔ (۲۹۶/۱)

عشق شنگِ بے قرارِ بے سکوں   چوں درآرد کلِّ تن را در جنوں

شوخ، بے چین، بے قرار عشق کس طرح سارے بدن کو جنون میں مبتلا کر دیتا ہے۔ (۲۹۸/۱)

گر بگوید فقہ فقر آید ہمہ   بُوے فقر آید ازاں خوش دمدمہ

اگر وہ فِقہ کی بات کرتا ہے تو سب فقر ہو جاتا ہے، اس کی خوش گُفتاری سے فقر کی خوشبو آتی ہے۔ (۳۰۳/۱)

ور بگوید کفر آید بوئے دیں   آید از گفتِ شکش بُوئے یقیں

اگر وہ کفر کی بات کہتا ہے تو دین کی خوشبو آتی ہے، اس کے شک کی بات سے بھی یقین کی خوشبو آتی ہے۔ (۳۰۳/۱)

عاشقاں را کار نبود باوجود
(عاشقوں کو وجود سے کوئی کام نہیں ہوتا)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عاشقوں کو غذا رُوح کے ذریعے ملتی ہے۔ ان کے نزدیک جسم لباسِ غیر ہے اور وہ اس کو اُتار پھینکتے ہیں۔ عاشق کی غذا اس کا عشق ہے۔ سچا عاشق وجود کا پابند نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اللہ والے کبھی کہیں اور کبھی کہیں نظر آتے ہیں۔ معراجِ رسول ﷺ بھی اس کی ایک مثال ہے کہ آپ اس وجود کو ترک کر کے دوسرے وجود کے ساتھ معراج پر گئے۔ حضور ﷺ کا قول ہے کہ ''اَجْسَادُنَا اَرْوَاحُنَا وَ اَرْوَاحُنَا اَجْسَادُنَا'' یعنی ہمارے جسم ہماری رُوح کی کیفیت رکھتے ہیں اور ہماری رُوح ہمارے جسم کی صورت رکھتی ہے ؎

عاشقاں را کار نبود با وجود   عاشقاں را ہست بے سرمایہ سود

عاشقوں کو وجود سے واسطہ نہیں ہوتا ہے، عاشقوں کا نفع بغیر سرمایہ کے ہوتا ہے۔ (۲۹۱/۳)

عاشقاں اندر عدم خیمہ زدند   چوں عدم یکرنگ و نفسِ واحدند

عاشقوں نے عدم میں خیمہ لگایا، وہ عدم کی طرح یکساں اور یک جان ہو گئے۔ (۲۹۱/۳)

نزد عاشق درد و غم حلوا بود   لیک حلوا برخساں بلوا بود

عاشق کے لئے درد اور غم حلوا ہوتا ہے لیکن کمینوں کے لئے حلوا مصیبت ہوتا ہے۔ (۲۹۲/۳)

عشق باشد لوت پوتِ جانہا   جوع ازیں رویست قوت جانہا

عشق جانوں کے لئے قسم قسم کا کھانا ہوتا ہے، اس لحاظ سے بھوک رُوحوں کی غذا ہے۔ (۲۹۳/۳)

تیرھواں باب

عشق بر مردہ نباشد پائدار

(عشق مُردوں کو راس نہیں آتا)

ایک بہت مشہور شعر ہے "عاشقی زندہ دِلی کا نام ہے، مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں" عشق کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ بڑی بڑی شخصیتوں کو عشق کے معاملے میں کورا یا اندھا پایا گیا ہے۔ اہلِ عشق میں اِس قدر صلاحیتیں جمع ہو جاتی ہیں کہ بڑے بڑے عاقلوں کو ان کے سامنے بات کرنے کی طاقت نہیں رہتی۔ منقول ہے کہ کافروں کی ایک مجلس میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ جا کر بیٹھ گئے۔ اس مجلس کا پنڈت جب آیا تو تقریر نہ کر سکا۔ آخر اس نے پوچھا کہ کیا اس جگہ کوئی غیر مذہب کا آدمی تو نہیں بیٹھا؟ حضرتؒ نے اس جگہ حاضر ہونے کا اعتراف کیا۔ اس کافر نے کہا کہ اگر میرے چند سوالوں کا جواب دے دو تو میں مسلمان ہو جاؤں گا اور پھر آپ نے اس کے تمام سوالوں کا جواب دیا تو وہ مسلمان ہو گیا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

پُوزبندِ وسوسہ عشق ست و بَس ورنہ کے وسواس را بست ست کس

وسوسے کے لئے مچکا عشق ہی ہے اور بس، ورنہ وسوسہ کو کس نے بند کیا ہے؟ (۳۲۶/۵)

عاشقے شو شاہدِ خوبے بجو صید مرغابی ہمی کن جو بجُو

عاشق بن اور حسین معشوق تلاش کر، نہر در نہر مرغابی کا شکار بھی کرتا رہ۔ (۳۲۶/۵)

عشق برد بحث را اے جان و بس کو زگفت و گو شود فریادرس

اے جان! عشق بحث کو کاٹ دیتا ہے کیونکہ وہ گفتگو کے معاملے میں فریادرس بن جاتا ہے۔ (۳۲۷/۵)

حیرتے آید زعشق آں نطق را   زہرہ نبود کہ کند او ماجرا

عشق سے گویائی پر حیرت طاری ہو جاتی ہے، اس کو پتہ نہیں رہتا کہ وہ کیا گفتگو کرے۔ (۵/۳۲۷)

پس نیاری ہیچ جنبیدن زجا   تانگیرد مرغِ خوبِ تو ہوا

تو جگہ سے ہل نہ سکے گا تا کہ تیرا حسین پرندہ ہوا نہ پکڑ لے۔ (۵/۳۲۷)

عشق بر مُردہ نباشد پائدار   عشق را بر حَیّ جاں افزاے دار

مُردے سے عشق پائیدار نہیں ہوتا، زندہ جان بڑھانے والے سے عشق کر۔ (۵/۳۳۰)

عشقِ عاشق جانِ اُو را سوختہ

(عاشق کے عشق نے اس کی جان کو جلا ڈالا)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عام دُنیادار تو رُخ اور رُخسار کی زیبائش اور حسنِ دُنیا میں رات دن اُلجھے رہتے ہیں مگر ایک عاشق کو عشق کے نصاب سے ہی فرصت نہیں ملتی، رُوحانیت کے معاملہ میں کچھ دروس اور اسباق اِس قدر جان طلب ہیں کہ وہ بے چارہ اپنی جان کو ہلاک کر دیتا ہے، مثلاً ذکر کے سیکھنے کے لئے احکامات وصول کر کے ان کے مطابق ذکر کرنا اور اس میں نفس کی آلودگیوں کو ختم کرنا ایک بہت محنت طلب امر ہے، جس میں اس کی جان پگھل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ غذا اور غذائیت کا حساب اِس قدر طویل ہے کہ کھانا کتنا کھایا جائے اور کہاں سے کھایا جائے اور اس کو ہضم کرنے کے اسباب کو زیرِ غور رکھا جائے۔ خواب اور شب بیداری کا تعین کرنا، نفس کی ہر حرکت پر نگاہ رکھنا، یہ تمام ایسے امور ہیں جن میں بہت احتیاط اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رضا کا خیال رکھنا ایک اچھا خاصا نصاب ہے، جس سے عاشق کو اپنی جان پگھلانا ہوتی ہے۔

عشقِ معشوقاں دو رُخ افروختہ   عشقِ عاشق جانِ اُورا سوختہ

معشوقوں کے عشق نے دونوں رُخسار روشن کر دیئے ہیں، عاشق کے عشق نے اس کی جان جلا ڈالی ہے۔ (۳/۴۲۲)

کَہربا عاشق بشکلِ بے نیاز   کاہ می کوشد دراں راہِ دراز

کَہربا، بے نیازی کے ساتھ عاشق ہے، تنکا اس (عشق) میں دراز راستہ طے کرتا ہے۔ (۳/۴۲۲)

ایں رہا کن عشق آں تشنہ دہاں   تافت اندر سینۂ صدرِ جہاں

اس کائنات کے باہمی عشق کو چھوڑ کر اس پیاسے کا عشق جہاں کے سینے میں چمک اُٹھا۔ (۳/۴۲۲)

دودِ آں عشق و غمِ آتشکدہ   رفتہ در مخدوم او مُشفِق شدہ

اس عشق کا دُھواں اور بھٹی کا غم مخدوم کو پہنچا، وہ مہربان ہو گیا۔ (۳/۴۲۲)

بس شکنجہ کرد عشقش بر زمیں　　خود چرا دارد زاوّل عشق کیں

اس کو عشق نے زمیں پر شکنجے میں کس دیا ہے، نامعلوم عشق اِبتداء ہی سے دُشمنی رکھتا ہے۔ (۴۵۰/۳)

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　گوئے گشتن بہرِ او اولیٰ بود

اللہ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کم کیسے ہوسکتا ہے، گیند کی طرح خدا کے لئے لڑھکنا تو زیادہ مناسب ہے۔ (۱۵۵/۴)

علامہ اقبالؒ نے بھی عشق اور عقل کے مقابلے میں بہت کچھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر راقم الحروف نے ایک کتاب **''عقل و عشق اور علامہ اقبالؒ کا فلسفۂ خودی''** کے نام سے لکھی ہے، جو عنقریب ورطۂ اشاعت میں آنے والی ہے۔ اس کتاب سے زیادہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہاں کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

عقل عیّار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے　　عشق بیچارہ نہ زاھد ہے، نہ مُلّا نہ حکیم
ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق　　عقلِ انسانی ہے فانی، زندہ و جاوید عشق

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل　　عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

نگہ اُلجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں　　خِرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں

خِرد سے راہرو روشن بصر ہے　　خِرد کیا ہے، چراغِ راہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟　　چراغِ راہگذر کو کیا خبر ہے؟

چودھواں باب

عقل اور عشق

(عقل اور عشق کا باہمی تعلق)

چوں بعشق آمد قلم برخود شگافت
(قلم جب عشق کو بیان کرے تو وہ شق ہو جاتا ہے)

عشق ایک مصدرِ حیات، وجہِ تکوین و اِرتقائے کائنات ہے۔ عشق ہر ہستی کی رَگ و پَے میں جاری، حجر و شجر، حیوان و انسان پر کسی نہ کسی رنگ میں طاری ہے۔ عقلِ جزوی جب عشق کی شرح بیان کرتی ہے تو ایسے ہوتی ہے جیسے گدھا دلدل میں پھنس کر ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور جس قدر کوشش کرتا ہے اتنا ہی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اس کا تعلق وجدان سے ہے بیان سے نہیں۔

ہرچہ گویم عشق را شرح و بیاں ۔۔۔ چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

میں عشق کی تشریح اور بیان جو کچھ کرتا ہوں، جب عشق میں پڑتا ہوں تو اس سے شرمندہ ہوتا ہوں۔ (۱/۴۳)

گرچہ تفسیرِ زباں روشنگر است ۔۔۔ لیک عشق بے زباں روشن تر است

اگرچہ زبان کی تشریح روشنی ڈالنے والی ہے لیکن بے زبان عشق زیادہ روشن ہے۔ (۱/۴۳)

چوں قلم اندر نوشتن می شتافت ۔۔۔ چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت

چونکہ قلم لکھنے میں مصروف تھا اور جونہی عشق پر پہنچا قلم خود چرِ گیا۔ (۱/۴۳)

چوں سخن در وصفِ ایں حالت رسید　　　ہم قلم بشکست وہم کاغذ درید

جب اس حالت کے بیان کی بات آئی تو قلم ٹوٹ گیا اور کاغذ بھی پھٹ گیا۔ (۴۳/۱)

عقل در شرحش چو خر در گل بخفت　　　شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

عقل اس کی شرح میں مٹی میں پھنسے ہوئے گدھے کی طرح ہوگئی، عشق اور عاشقی کی شرح بھی عشق نے ہی کی ہے۔ (۴۳/۱)

ایمانِ تقلیدی اور عقل دونوں کی نارسائی

مولانا فرماتے ہیں کہ عقل اِستدلالی یا جُزوی حقائقِ حیات کے لئے یقین آور نہیں۔ مُقلد لوگ بلا سوچے سمجھے پہلوؤں کے اعمال اور اقوال کے نقال ہیں، ان میں نہ بصیرت ہے، نہ حکمت۔ دوسرا گروہ استدلالی ہے۔ اس گروہ والے استدلال سے کام لیتے ہیں جو کہ حقیقت تک راہ نمائی نہیں کرتی۔ یہ لوگ وجدانِ حیات پا ہی نہیں سکتے کیونکہ ان کا علم ظنی ہوتا ہے اور ظن کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ استدلالی لوگوں کی مثال اندھوں کی سی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ رستہ چل لیتے ہیں مگر ان کی راہ نُمائی آنکھوں والے کر دیتے ہیں، ورنہ اگر صرف اندھے ہی ہوتے تو سب مر کر فنا ہو جاتے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اگر عالمِ رُوحانی کے دیدہ وَر نہ ہوتے تو یہ مقلّد کس کی تقلید کرتے۔ اگر انبیاء اور اولیاء کے الہامات اور وِجدانات نہ ہوتے تو مردِ حکیم کا استدلال ان کو راستہ نہ دکھا سکتا۔ استدلالی جو بھی راستہ ہے وہ کسی دیدہ وَر کی روشنی میں چلتا ہے۔ بعض کورانہ تقلید کرنے والوں کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ بعض اندھے مرد اُن بینا کی راہ نمائی میں چلنے والے کے شکرگذار ہونے کی بجائے انہی پر لاٹھی برسانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ اِستدلالی اندھوں کا حال ہے تو مقلّدین کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اہل بصیرت پر لٹھ چلانے لگتے ہیں۔

مادی علم والے انفس اور آفاق کے منکر ہوئے ہیں اگر یہ اس انفس اور آفاق کی جھلک دیکھ لیں تو قائل ہو جائیں۔ ابلیس نے بھی آدم علیہ السلام کو مٹی کا ایک پتلا سمجھا تھا اس لئے وہ سجدے سے انکار کر بیٹھا۔ وہ مسخرِ کائنات اور عالمِ اشیاء کا علم رکھنے والے آدم کی ماہیت کو نہ دیکھ سکا۔ فطرت لامتناہی عالمِ مادی میں بھی نظر آتی ہے۔ سورج جو کچھ روشنی دیتا ہے اپنے باطن سے پا لیتا ہے، اس کی روشنی کم نہیں ہوتی۔ مولانا فرماتے ہیں جس طرح سورج کو باطن سے انرجی ملتی ہے، اسی طرح انسان کو بھی غیب سے نئی طاقتیں ملتی رہتی ہیں۔ زندگی کا مقصد مسلسل جدوجہد اور پیروی ہے۔ بیشہء عالم میں انسان ایک شکاری ہے ؎

جان فشاں اے آفتابِ معنوی　　　مر جہانِ کُہنہ را بنما نوی

اے رُوحانی سورج جاں فشانی کر، پرانی دُنیا کو تُو نئی دُنیا بنا دے۔ (۲۴۰/۱)

منطقی عقل اور عشق کی عقل

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ منطقی استدلال اور جزوی عقل کو کسی تسلی بخش فیصلے پر نہیں پہنچا سکتے۔ حقیقت اسی حرفِ عشق سے پیدا ہوسکتی ہے۔ عشق کے پاس اپنی ایک عقل ہے جو ہمارے معقولات سے ہزار درجے زیادہ حقائق کو واضح کر سکتی ہے۔ جزوی عقل تو انسان کے لئے دُنیاوی کاروبار اور روزی اور مادی ماحول میں زندگی بسر کرنے کا ایک آلہ یا وسیلہ ہے۔ یہ وہ عقل نہیں جس سے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ کنہء حیات تک پہنچنا استدلالی عقل کا کام نہیں۔ جب عشق انسان کی رُوح میں بس جائے تو بحث مباحثہ اور مناظرہ ختم ہو جاتا ہے۔ عاشق اس لئے خاموش رہتا ہے کہ اس کے منہ سے بیش بہا موتی زمین پر نہ گر جائیں۔ رسول ﷺ کے اصحاب ایسے ہوتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر کوئی قیمتی پرندہ آن بیٹھا ہے اور یہ خطرہ رہتا تھا کہ ذرا سی جنبش کی تو سر سے اُڑ جائے گا ؎

پس نیاری ہیچ جنبیدن زجا تانگیرد مُرغِ خوب تو ہَوا

پس اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ قیمتی پرندہ ہوا سے اُڑ جائے۔ (۳۲۷/۵)

عالمِ رُوحانی اور عقلِ خالص الفاظ کے محتاج نہیں

رُوحانی عالم الفاظ و بیاں کا عالم نہیں۔ عقلِ خالص بھی رُوحانی عالم کی چیز ہے، لوگوں نے اسے الفاظ کا محتاج سمجھ لیا ہے اور کہتے ہیں کہ اگر الفاظ نہ ہوں تو عقل بھی صفر ہو جائے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ رُوحانی عقل کا دریا الفاظ کی پن چکی چلاتا ہے کیونکہ مادی دُنیا میں اس کی ضرورت رہتی ہے اور اگر اس پن چکی کی ضرورت نہ رہے، تب بھی یہ دریا بدستور رواں رہتا ہے ؎

ناطِقہ سُوئے دہاں تعلیم راست ورنہ خود آں آب را جوئے جُداست

(قوتِ گویائی) منہ میں (تمہاری) تعلیم کے لئے ہے، ورنہ اس پانی کی نہر علیحدہ (دل میں) ہے۔ (۳۲۳/۱)

می رَود بے بانگ و بے تکرار ہا تَحتَهَا الاَنهَارُ تا گلزار ہا

وہ (پانی) جاری ہے بغیر شور اور نزاع کے، ان چمنوں تک جن کے نیچے نہریں ہیں۔ (۳۲۳/۱)

مولاناؒ دعا کرتے ہیں کہ الٰہی! میری رُوح کو پھر اس مقام میں لے جا جہاں کلام الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا، اس مقام کو لوگ عدم کہتے ہیں۔ حیاتِ جاودانی وہیں ہے، ہمارے خیالات اور وجود کا سرچشمہ اور مصدر وہی عالم ہے۔ انسان کے خیالات اسی لئے پریشان رہتے ہیں کہ وہ عدم کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ہیں، روحِ انسان کو اس سے تسلی نہیں ہوتی ؎

اے خدا جاں را تو بنما آں مقام کاندرو بے حرف می روید کلام

اے خدا! رُوح کو وہ مقام دکھا دے جس میں بغیر حروف کے کلام پیدا ہوتا ہے۔ (۳۲۳/۱)

تا کہ سازد جانِ پاک از سر قدم   سوئے عرصہ دور پہنائے عدم

تا کہ پاک روح سر کے بل جائے، اس میدان کی جانب جو وسیع اور معدوم ہے۔ (۱/۳۲۳)

عرصہ بس باکشاد و بافضا   دیں خیال و ہست یابد زونوا

وہ میدان (عالمِ غیب) جو وسیع اور پُرفضا ہے، یہ (عالم) مثال اور (عالم) شہود اس سے سازو سامان پاتا ہے۔ (۱/۳۲۳)

تنگ تر آمد خیالات از عدم   زاں سبب باشد خیال اسبابِ غم

عالمِ مثال عدم (عالمِ غیب) سے چھوٹا ہے، اسی وجہ سے عالمِ مثال غم کا سبب بنتا ہے۔ (۱/۳۲۳)

حس و رنگ کی ہستی تو اتنی ہے کہ اہلِ دل کو زنداں (قید خانہ) محسوس ہوتی ہے، امر کا لفظِ ''کُن'' عالمِ امر میں ایک فعل بسیط تھا لیکن عالمِ خلق میں آکر وہ کاف اور نون (کُن) کا مرکب بن گیا۔

عشق و عقل کی مزید وضاحت

کسی مذہب کی اچھائی اس میں ہے کہ وہ محبت کو عالمگیر بنائے یعنی اپنوں اور غیروں میں کوئی تمیز نہ کرے، محبت کا ہر فرد حقدار ہے۔ دوسرا معیار جو کسی قوم میں ہونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم عقل کو خالص بنائے اور اس کو ترقی دے تا کہ عقل مطلوبہ معیار تک پہنچ سکے۔ مولانا کے سینکڑوں اشعار اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ عشق اور عقل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور ان کا باہم رابطہ یوں ہے کہ محبت سے صحیح دانش پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عقل جب شہوات یا جذبات کی غلام نہ ہو یا نفسِ امارہ کی محکوم نہ ہو تو ایسی عقل عشق کی طرف رہبری کرتی ہے۔ حقیقی علم بے تأثر نہیں ہوسکتا۔ وہ تاثیر جس کو محبت کہتے ہیں، معرفتِ کائنات اور عرفانِ حیات کا ہی سرچشمہ ہے اور جس محبت کو اندھا کہا جاتا ہے وہ ایک محدود اور خام چیز ہے۔ پختگی کے بعد وہ منیر اور مستنیر ہو جاتی ہے۔ ناقص محبت اور ناقص دانش نے محبت اور دانش کو بدنام کر رکھا ہے ؎

ایں محبت ہم نتیجہ دانش است   کے گزافہ بر چنیں تختے نشست

یہ محبت بھی سمجھ کا نتیجہ ہے، بکواس ایسے تخت پر کب بیٹھ سکتا ہے۔ (۲/۱۵۴)

دانشِ ناقص کجا ایں عشق زاد   عشق زاید ناقص اما بر جماد

ناقص عقل نے یہ عشق کب جنا ہے، ناقص عقل عشق پیدا کرتی ہے لیکن پتھر سے۔ (۲/۱۵۴)

ناقص محبت جامد اشیاء پر گرتی ہے اور فانی چیزوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے، فانی چیزوں پر حسن عارضی طور پر ہوتا ہے، جس طرح دھوپ دیوار پر کچھ دیر آئی اور چلی گئی۔ حسنِ ازل کی چمک تو چند لمحوں کے لئے ہوتی ہے۔ ذوق کا شعر ہے کہ ہستیٔ ناپائیدار کا ہنگامہ گرم ہوتا ہے اور برق اتنی دیر کے لئے ہوتی ہے، جس طرح شرار کا تبسم ؎

ہنگامہ گرم، ہستیٔ ناپائدار کا   چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ہستیٔ گرم کا ہنگامہ ناپائیدار ہوتا ہے، گویا یہ بجلی کی چمک ہے جس طرح شرار کا تبسم۔ (ذوق)

دانشِ ناقص نداند فرق را لا جرم خورشید داند برق را

دانشِ ناقص فرق نہیں جان سکتی، بے شک سورج تو برق کو جان سکتا ہے۔ (۱۵۴/۲)

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی امتیازی خصوصیت اس کی عقل ہے، ورنہ جسم اور جان تو گدھے میں بھی ہوتی ہے۔ حادثاتی نقائص، مثلاً کوئی لولا یا لنگڑا ہو تو وہ نقص لاعلاج ہے مگر عقلِ ناقص کا علاج ہو سکتا ہے، بشرطیکہ معالج صحیح ہو۔ لنگڑے اور لولے کو لوگ لعن نہیں کرتے کیونکہ وہ لاعلاج ہے مگر احمق کو ضرور بُرا کہتے ہیں کیونکہ وہ علاج سے گریز کرتا ہے ۔

نقصِ عقلست آں کہ بد رنجوریست موجب لعنت سزائے دوریست

بُری بیماری عقل کی کمی ہے، جو لعنت کا سبب اور دُور رہنے کے قابل ہے۔ (۱۵۴/۲)

زانکہ تکمیل خردہا دور نیست لیک تکمیل بدن مقدور نیست

کیونکہ عقلوں کی تکمیل بعید نہیں ہے لیکن بدن کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ (۱۵۴/۲)

زانکہ ناقص تن بود مرحومِ رحم نیست بر مرحوم لائق لعن و زحم

اس لئے کہ ناقص جسم قابلِ رحم ہوتا ہے، قابلِ رحم لعنت و زحمت کے لائق نہیں۔ (۱۵۴/۲)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہر فرعون اور جھگڑالو کافر کا کفر نقصانِ عقل ہی کے باعث ہے اس لئے وہ بدنام ٹھہرتا ہے ۔

کُفرِ فرعونے و ہر گبرِ عنید جُملہ از نقصانِ عقل آمد پدید

فرعون اور ہر سرکش کافر کا کفر عقل کی کمی سے رُونما ہوا ہے۔ (۱۵۴/۲)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عقلمند وہ ہے جو حقیقی چیزوں پر نظر رکھتا ہے اور بے وقوف آدمی ناپائیدار چیزوں کو چمٹتا ہے۔ ایسے دھوکے حرص اور ہوس کی وجہ سے ہوتے ہیں جو انسان کو جہنم میں لے جاتے ہیں، مثلاً ایک شعر میں آپؒ نے فرمایا کہ دریا کی جھاگ پر اگر کوئی گھوڑا دوڑا دے تو وہ ڈوب جائے گا، اسی طرح اگر کوئی بجلی کی چمک میں خط لکھنا چاہے تو وہ بے وقوف ہوگا، عاقبت اندیش وہ شخص ہے جو حقیقت کو پہچانے۔ فرماتے ہیں کہ نفس تو عاقبت کو نہیں دیکھتا اور گناہ میں کُود جاتا ہے ۔

''عقل کو مغلوبِ نفس اُو نفس شُد'' عقل جو نفس سے مغلوب ہو جائے، وہی نفس ہے۔

اِستدلال سے عشق کا کام نہیں چلتا

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عقل استدلال سے کام لیتی ہے اور استدلال سے عشق کا کام نہیں چل سکتا، چنانچہ عشق کے لئے استدلال کی کوشش فضول ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ ایک مرغ کی دوستی کسی اونٹ سے ہوگئی اور مرغ نے اونٹ کو بار بار اپنے گھر آنے کی دعوت دی، چنانچہ اونٹ اُس کے گھر آیا اور اس کے ڈربے پر ایک پاؤں رکھا تو

چھت گر گئی۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے علوم و فنون اور دُنیاوی عقل، عشق و عرفان کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ فرماتے ہیں کہ "خانۂ مرغ است عقل و ہوش ما" یعنی ہماری عقل و ہوش ایسے ہی ہے کہ جس طرح مرغ کا خانہ، اگر اونٹ کو بلاؤ گے تو یہ خانہ تباہ ہو جائے گا، اس لئے مناسب نہیں کہ حماقت میں ایسے مہمان کو دعوت دے جو اس کا صفایا کر دے ۔

چوں بخانہ مرغ اشتر پانہاد خانہ ویراں گشت و سقف اندر نہاد

جب مرغ کے دڑبے میں اونٹ نے پیر رکھا تو اس کا دڑبہ ویران ہو گیا اور چھت بیٹھ گئی۔ (۳/۴۴۲)

فرماتے ہیں کہ عشقِ الٰہی بہتر (۷۲) فرقوں سے الگ مسلک ہے اور دین کا جوہر یہی ہے۔ اصل یہ ہے اور باقی سب فروع (شاخیں) ہیں۔ عشق کا رابطہ اللہ کے ساتھ ہونا بندگی ہے اور امورِ سلطنت سے ممکن نہیں۔ بندگی سے عشق پیدا ہوتا ہے اور اگر کوئی بندگی میں ہی اُلجھ کر رہ جائے (یعنی عشق پیدا نہ ہو سکے) تو عاشقی اس سے رُوپوش ہو جائے گی۔ عشق کی ایسی کوئی زبان نہیں جس سے وہ کسی غیر عاشق پر اس کی حقیقت واضح کر سکے، جو طرزِ بیان اختیار کرو گے وہ حقیقتِ عشق کو بے نقاب کرنے کی بجائے اور بھی حجاب پیدا کر دے گا۔

با دو عالمِ عشق را بیگانگی اندرو ہفتاد و دو دیوانگی

عشق کو دونوں جہاں سے اجنبیت ہے، اس میں بہتر (۷۲) دیوانگیاں ہیں۔ (۳/۴۴۷)

غیر ہفتاد و دو ملت کیشِ اُو تختِ شاہاں تختہ بندے پیشِ او

اس کا مذہب بہتر (۷۲) ملتوں کے علاوہ ہے، اس کے سامنے شاہوں کا تخت کاٹھ کا تختہ ہے۔ (۳/۴۴۷)

مطربِ عشق ایں زند وقتِ سماع بندگی بند و خداوندی صُداع

عشق کا گویا سماع کے وقت یہ بجاتا ہے کہ غلامی قید ہے اور آقائی دردِ سر ہے۔ (۳/۴۴۷)

بندگی و سلطنت معلوم شُد زیں دو پردہ عاشقی مکتوم شُد

جب غلامی اور حکومت محسوس ہونے لگی تو ان دونوں پردوں میں عاشقی چھپ گئی۔ (۳/۴۴۷)

کاشکے ہستی زبانے داشتے تا زمستاں پردہ ہا برداشتے

کاش! عشق زبان رکھتا تاکہ عاشقوں کے پردے اُٹھا دیتا۔ (۳/۴۴۸) (تشبیہات رومیؒ ص۔۳۱۹)

ہرچہ گوئی ایدمِ ہستی ازاں پردۂ دیگر برو بستی بداں

اے (انسانی) وجود کی گفتگو تو جو کچھ بتاتی ہے، سمجھ لے اس پر تُو نے ایک دوسرا پردہ ڈال دیا ہے۔ (۳/۴۴۸)

عشق چھپانے سے چھپایا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی ایسی کوشش ہو تو اس کی مثال یوں ہے، جیسے روئی میں انگارے رکھ دیئے جائیں۔ شراب کا نشہ اگرچہ دوسروں کو معلوم نہیں ہوتا مگر شرابی کے اطوار سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شرابی ہے۔ میخور کو کبھی سیری نہیں ہوتی۔ یہ نشہ دائمی ہوتا ہے کیونکہ وہ شراب کی ہیشگی کا خواہشمند رہتا ہے، اس لئے عرب

میں اس کا نام مدام ہے۔ اگر شراب تیز ہو تو بوتل کو توڑ دیتی ہے۔ عشق کی شراب بھی ایسی ہی ہوتی ہے کہ اس کی طلب دُنیاوی شراب سے زیادہ ہوتی ہے ؎

زاں عرب بنہاد نامِ مے مدام زانکہ سیری نیست مے خور را مدام

اس لئے عربوں نے شراب کا نام مدام رکھا ہے کیونکہ شراب نوش کو کبھی سیری نہیں ہوتی ہے۔ (۳/۴۴۹)

عشق جوشد بادۂ تحقیق را او بود ساقی نہاں صدیق را

عشق تحقیق کی شراب کو جوش دیتا ہے، وہ دوست کے لئے مخفی ساقی ہوتا ہے۔ (۳/۴۴۹)

چوں بجوئی تو بتوفیقِ حسن بادہ آبِ جاں بوَد ابریق تن

جب تو اچھی توفیق کے ذریعہ تلاش کرے گا تو شراب روح کے لئے آبِ (حیات) اور جسم جام بن جائے گا۔ (۳/۴۴۹)

چوں بیفزائد مئے توفیق را قوتِ مے بشکند ابریق را

جب وہ (عشق) توفیق کی شراب کو بڑھاتا ہے تو شراب کی تیزی جام کو توڑ دیتی ہے۔ (۳/۴۴۹)

لوگ کوشش پیہم سے جان چراتے ہیں اور نادر مثالوں سے استدلال کرتے ہیں، مثلاً فلاں نے کہا کہ کھیتی باڑی سے کیا ہوتا ہے، فلاں نے کھیتی باڑی کی مگر سب فصل ضائع ہو گئی۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں نے غوطہ زنی کی اور کوئی موتی نہ نکلا، ایسی کوششیں لغو ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ عبادت بھی ذریعہ نجات نہیں، ابلیس نے لاکھوں سال سجدے میں سر مارا مگر ایک سجدہ نہ کرنے سے ملعون ہو گیا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یہ بہانہ خوری ہے، کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ فلاں شخص کے گلے میں لقمہ اٹک گیا اور مر گیا تو ایسا شخص کھانا کھانا کیوں بند نہیں کرتا۔ نادر مثالوں پر عمل کرنا بے عملی کا بہانہ ہے، ایسے نادرات بہت کم ہوتے ہیں۔

پندرہواں باب

کہ ز دِل تا دِل یقیں روزن بود

(یقیناً ایک دل دوسرے کے لئے جھروکا ہے)

عشق میں دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے

عارف رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ دو شخصوں کے جسم الگ الگ ہوں مگر دلوں میں تو مکانی بُعد نہیں ہوتا۔ وہ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ ایک کمرے میں اگرچہ دو شمعیں روشن ہوں لیکن ان کی روشنیاں ایک دوسرے کی روشنی سے ملی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ ناقابل تقسیم ہیں۔

کہ ز دل تا دل یقیں روزن بود   نے جدا و دور چوں دو تن بود

اس لئے کہ یقیناً ایک دل دوسرے کے لئے جھروکا بناتا ہے، وہ دو جسموں کی طرح دُور اور الگ نہیں ہوتے۔
(۴۱۷/۳)

متصل نہ بود سفالِ دو چراغ   نورِ شاں ممزوج باشد در مساغ

دو چراغوں کے ٹکڑے ملے ہوئے نہیں ہوتے، ان کی روشنی پھیلاؤ میں ملی جلی ہوتی ہے۔ (۴۱۷/۳)

اگر عشق نفسانی خواہشات کی پوجا کے لئے نہ ہو تو جس طرح عاشق معشوق کا طالب ہوتا ہے، معشوق بھی عاشق کا جویا ہوتا ہے۔

ہیچ عاشق خود نباشد وصل جُو   کہ نہ معشوقش بود جویائے اُو

کوئی عاشق کسی کے وصل کا خود بخود طالب نہیں ہوتا، جب تک اس کا معشوق اس کا طالب نہ ہو۔ (۴۱۷/۳)

مولاناؒ فرماتے ہیں، اسی طرح اگر تمہارے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو جائے تو یہ سمجھ لو کہ خدا کے دل میں بھی تمہاری محبت موجود ہے، جس طرح تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اسی طرح خدا سے رابطۂ محبت یک طرفہ نہیں ہوتا۔ خدا اگرچہ تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو پیکرِ صدق و صفا تھے، کی خدا کے ہاں ایسی محبت نہیں ہو سکتی جو کہ ایک عام انسان سے محبت ہو۔ حضرت رابعہ بصریؒ کا قول ہے کہ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ خدا تم سے راضی ہے یا نہیں تو پہلے اپنے آپ کو دیکھو کہ تم بھی خدا سے راضی ہو یا نہیں، اگر تم خدا سے راضی ہو تو جان لو کہ خدا بھی تم سے راضی ہے۔ رابعہ بصریؒ نے سنا کہ ایک شخص دُعا میں کہہ رہا تھا ''اے خدا! تُو مجھ سے راضی ہو جا۔'' رابعہ بصریؒ نے فرمایا کہ ''تم کو شرم نہیں آتی کہ خدا کو کہہ رہے ہو کہ مجھ سے راضی ہو جا، تم خدا سے راضی کیوں نہیں ہو جاتے؟'' مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

در دل تو مہرِ حق چوں شد دوتو　　　　ہست حق را بے گماں مہرے بتو

اگر تیرے دل میں خدا کی محبت دوگنی ہوگئی تو بے شک خدا کو بھی اتنی ہی محبت تم سے ہوگی۔ (۳/۴۱۸)

ہیچ بانگِ کف زدن آید بدر　　　　از یکے دستِ تو بے دستِ دگر

اس وقت تک تالی کی آواز نہیں آئے گی، جب تک تیرے ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ نہ ٹکرائے۔ (۳/۴۱۸)

فرماتے ہیں کہ عشق کا جذبہ ہمہ گیر ہے، جو جمادات سے لے کر اللہ تعالیٰ تک سب کو بمطابق مدارج بقدرِ فرق پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ خدا میں بھی بندوں سے عشق کا جذبہ موجود ہے۔ پانی اور پیاس کا تعلق ہے کہ جب پیاسا پانی کو طلب کرتا ہے تو پانی بھی پیاسے کی طلب میں رہتا ہے (مگر کنواں چل کر نہیں جا سکتا بلکہ پیاسے کو کنویں پر آنا پڑتا ہے)۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے بنا دیئے ہیں ؎

جُملہ اجزائے جہاں زاں حکمِ پیش　　　　جفت جفت و عاشقانِ جفت خویش

اس ازلی حکم کی وجہ سے دُنیا کے تمام اجزاء جوڑے جوڑے ہیں اور اپنے جوڑے کے عاشق ہیں۔ (۳/۴۱۸)

ہست ہر جزوے با عالم جفت خواہ　　　　راست ہمچوں کہربا و برگِ کاہ

دُنیا کی ہر چیز جوڑے کی خواہش مند ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہربا (بجلی) اور گھاس کا تنکا۔ (۳/۴۱۸)

اگر ہم اجرامِ فلکیہ کو دیکھیں تو ان میں بھی وہی رشتہ جفت جفت پایا جاتا ہے۔ ایک دوسرے میں کشش کا پایا جانا نظامِ فلکیات کو چلا رہا ہے۔ بجلی آسمان سے چمکتی ہے تو سبزہ ہرا ہوتا ہے۔ لوہے اور مقناطیس میں کیسا باہمی جذب ہے۔ آسماں ہمارے کرۂ ارض کو مرحبا کہہ رہا ہے ؎

آسماں گوید زمیں را مرحبا　　　　با توام چوں آہن و آہن ربا

آسماں زمیں کو کہتا ہے خوش آمدید! میں ترے ساتھ ہوں جس طرح لوہا اور مقناطیس ہے۔ (۳/۴۱۸)

آسماں سے سورج کی گرمی زمین کو فائدے پہنچا رہی ہے۔ اس پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ زمین سے بہت سی

جاندار چیزیں پیدا ہوتی ہیں، گویا آسماں مرد ہے اور زمین عورت ہے ؎

آسماں مرد و زمیں زن در خرد　　ہرچہ آں انداخت ایں می پرورد

آسماں مرد ہے اور زمین عورت ہے، جو آسمان ڈالتا ہے وہ زمین پرورش کرتی ہے۔ (۳/۴۱۸)

ویں زمیں کدبانویہا می کند　　بر ولادات و رضاعش می تند

عقلاً یہ زمین بیوی کا کام کرتی ہے، جننے اور اس کو دودھ پلانے میں لگی رہتی ہے۔ (۳/۴۱۹)

سورج کی گرمی سے بہت سے کام نکلتے ہیں، سورج کی گرمی ایک طاقت ہے جو زمین کو متواتر مل رہی ہے۔ ہوا بھی آسمان سے بادلوں کے ذریعے سمندر کے پانی کو لے کر چلتی ہے اور جہاں جہاں حکمِ الٰہی ہو یعنی جہاں ضرورت ہو برستا ہے۔ ؎

چوں نماند گرمیش بفرستد اُو　　چوں نماند تری و نم بدہد اُو

جب اس (زمین) میں گرمی نہیں رہتی تو (آسماں) اس کو بھیجتا ہے، جب تری اور نمی نہیں رہتی تو وہ عطا کرتا ہے۔
(۳/۴۱۸)

میلِ ہر جزوے بجزوے ہم نہد　　زاتحادِ ہر دو تولیدے جہد

ہر جزو میں دوسرے جزو کی طرف میلان رکھا ہے، دونوں کے اکٹھے ہونے سے تولید ہوتی ہے۔ (۳/۴۱۹)

ہر یکے خواہاں دگر را ہمچو خویش　　از پئے تکمیلِ فعل و کارِ خویش

ہر ایک دوسرے کو اپنی (جان کی) طرح چاہتا ہے، اپنے فعل اور کام کے مکمل کرنے کے لئے۔ (۳/۴۱۹)

عاشق میں محبت ہے، خوف نہیں

عارف رومیؒ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ زاہد عابد ہر دم خوف و ہراس میں رہتے ہیں اور عاشق لوگوں پر خوف طاری نہیں ہوتا، اس لئے وہ زاہد کی نسبت خدا تک جلد پہنچ جاتے ہیں۔ عارف رومیؒ زاہد اور عاشق میں فرق بیان کرنے کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک عورت کے گھر میں ایک خوبصورت کنیز تھی، جس کو اس عورت کا خاوند بہت پسند کرتا تھا مگر وہ عورت ان دونوں کو ملنے نہیں دیتی تھی۔ ایک دن وہ عورت غسل کے لئے شہر کے حمام میں گئی تو کنیز کو بھی ساتھ لے گئی مگر چونکہ وہ گھر میں اپنا سنگار بکس بھول گئی تھی اس لئے کنیز کو بھیجا کہ جا اور سنگار بکس لے آ۔ وہ کنیز خود بھی اس عورت کے خاوند سے ہمکنار ہونا چاہتی تھی، لہٰذا چشم زدن میں وہ گھر پہنچ گئی۔ کچھ دیر بعد عورت کو خیال آیا کہ اس نے یہ کیا ظلم کیا کہ ان دونوں کو یک جا ہونے کا موقع دے دیا، اس لئے اس نے فوراً غسل کیا اور اس خوف سے بھاگی کہ دونوں کوئی گڑبڑ نہ کریں۔ جب وہ عورت گھر پہنچی تو اس کے خاوند اور کنیز نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اس مثال میں مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کنیز پر جذبۂ عشق غالب تھا، اس کا عشق اس کو کشاں کشاں اپنے یار کے پاس لے گیا۔ دوسری طرف عورت پر خوف طاری تھا مگر خوف میں وہ بات کہاں جو عشق

والی کنیز پر طاری تھا۔

مذکورہ مثال دے کر مولاناؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی طرف جانے والے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک عاشق اور دوسرے وہ جن پر خوفِ خدا طاری ہوتا ہے۔ زاہد خوف سے راہ طے کرتا ہے مگر عاشق کو اس سے ہزار گنا زیادہ ترقی ہوتی ہے۔ اس راہ میں زاہد جو خوف سے راہ طے کرتا ہے، ایسی غلطی کر سکتا ہے جو اُوپر بیان ہوئی کیونکہ اس نے عبادت سے جذباتِ سفلی کو دبائے رکھا اور جذباتِ سفلی کو فنا نہ کیا مگر عاشق اپنے عشق سے تمام جذبات کو سوخت کر دیتا ہے۔ عشق میں بال برابر خوف نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اولیاء کے لئے قرآن نے فرمایا کہ

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس:۶۲)	سنو! اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

کہا جاتا ہے ''خدا داری چہ غم داری'' یعنی اگر خدا رکھتے ہو تو پھر غم کس بات کا ہے۔ محبت میں وصف حق ہے اور خوف کو صفاتِ حق میں کوئی دخل نہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی خوف نہیں) جب محبتِ حق ہو تو چونکہ محبت بھی صفتِ حق ہے اور اگر یہ بندے میں پیدا ہو جائے تو اس میں خوف کا کوئی شائبہ نہیں رہتا۔ مولاناؒ مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

آں زعشقِ جاں دوید و ایں زبیم　　عشق کو و بیم کو فرقِ عظیم

وہ رُوح کے عشق سے بھاگی اور دوسری خوف سے، عشق کہاں اور خوف کہاں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ (۲۲۳/۵)

سیرِ عارف ہر دمے تا تختِ شاہ　　سیرِ زاہد ہر مہے یک روزہ راہ

عارف ہر دم خدا کے عرش کی سیر کرتا ہے اور زاہد کی سیر ہر ماہ میں ایک روز کا راستہ طے کرتی ہے۔ (۲۲۳/۵)

ترس موئے نیست اندر پیشِ عشق　　جملہ قربانند اندر کیشِ عشق

عشق کے سامنے ایک بال برابر بھی خوف نہیں ہوتا، عشق کے مسلک میں ہر چیز قربان کر دی جاتی ہے۔ (۲۲۳/۵)

عشق وصفِ ایزد است أما کہ خوف　　وصفِ بندہ مبتلائے فرج و جوف

عشق تو اللہ کی صفت ہے لیکن خوف شرم گاہ اور پیٹ میں مبتلا بندے کی صفت ہے۔ (۲۲۳/۵)

عشق را پانصد پر است و ہر پرے　　از فرازِ عرش تا تحت الثّرے

عشق کے پانچ سو پر ہوتے ہیں اور ہر پر تحت الثریٰ سے عرش تک پہنچتا ہے۔ (۲۲۴/۵)

زاہد باترس می تازد بپا　　عاشقاں پرّاں تر از برق و ہوا

خوف زدہ عارف پاؤں سے دوڑتا ہے اور عاشق لوگ بجلی اور ہوا سے بھی تیز چلتے ہیں۔ (۲۲۴/۵)

کے رسند ایں خائفاں در گردِ عشق　　کآسماں را فرش سازد دردِ عشق

ڈرنے والے عاشق کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے کیونکہ عشق کا درد آسماں کو فرش بنا لیتا ہے۔ (۲۲۴/۵)

عشق کتابوں سے نہیں بلکہ صحبت سے ملتا ہے

عارف رومیؒ نے بارہا اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ عشق کتابوں، فقہ، تفسیر اور حدیث کے درسوں سے نہیں آتا بلکہ یہ اولیائے کرام کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان کتابوں سے عشق حاصل کر لیتا ہے تو اس میں اصل بات مدرّس کی رُوحانی قوت کا اثر ہوتا ہے لیکن چونکہ ایسے علماء بہت کم نظر آتے ہیں جو ولایت کا درجہ رکھتے ہوں، اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے مدرسوں اور کتابوں سے علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہماری تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بزرگ کی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو اس بزرگ کی رُوح اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ یہ توجہ روحانی نوعیت کی چیز ہے ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن   روئے دل را جانبِ دلدار کن

سو کتابیں اور سو ورق نذرِ آتش کر دو اور اپنے دل کے چہرے کو کسی دل والے کی طرف کر دو۔ (غیر مثنوی)

مولاناؒ نے یہ بات اس لئے کہی کہ مقلّد کا دین کتابی اور روایتی ہوتا ہے لیکن محقق اور عارف کے رُوحانی حقائق اس کی ذات سے نور حاصل کئے ہوتے ہیں اور ذاتی تجربہ کے باعث ہوتے ہیں۔ اگر عشق کا علم درس و تدریس سے حاصل ہوسکتا تو امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ جو بہت بڑے محدث، فقیہ اور محقق کا درجہ رکھتے تھے، اس کے متعلق ضرور لکھتے کہ عشق درسوں سے بھی پیدا ہوتا ہے انہوں نے کبھی عشق کا درس نہیں دیا ؎

آں طرف کہ عشق می افزود درد   بوحنیفہؒ و شافعیؒ درسے نہ کرد

جس طرح کہ عشق دردِ دل میں اضافہ کرتا ہے، امام ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ نے درس نہیں دیا۔ (۳/۳۶۶)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عاشق سمرقند و بخارا کی طرف جاتا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ وہ سبق پڑھنے کے لئے جا رہا ہے بلکہ وہ تو ایک ایسے دوست کی تلاش میں ہے کہ جو اسے عشق الٰہی کی باتیں بتلائے۔ اس حالت میں اُستاد اور کتبِ فقہ اس کے لئے دوست کا کام دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ طریقت میں صحبت کا بہت اُونچا مقام ہے ؎

گرچہ ایں عاشق بخارا می رود   نے بہ درس و نے بہ اُستا می رود

اگرچہ ایک عاشق بخارا کی طرف جاتا ہے، وہ نہ تو درس کے لئے جاتا ہے اور نہ اُستاد کے لئے۔ (۳/۳۶۷)

عاشقاں را شد مدرس حسنِ دوست   دفتر و درس و سبق شاں روئے اوست

عاشقوں کا مدرس تو حسنِ دوست ہے، اس کی کتابیں، درس اور سبق اس کے دوست کا چہرہ ہے۔ (۳/۳۶۷)

درس شاں آشوب و چرخ و زلزلہ   نے زیادات ست و باب و سلسلہ

اس کا درس شور و رقص اور جوش ہے، اس کا مقصد نہ تو زیادات اور نہ کسی سلسلہ یا باب کی کتابوں کے لئے ہوتا ہے۔ (زیادات امام محمد کی فقہ کی مشہور کتاب ہے) (۳/۳۶۷)

''زیادات'' امام محمد کی فقہ کی کتاب میں فِقہ کے ابواب ہیں اور اس میں جزووں کا ایک دوسرے پر موقوف ہو کر موجود ہونا ہوتا ہے، جیسے انتسابِ سلسلۂ حدیث۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ محدث تو راویوں کے ثقہ یا غیرثقہ ہونے کے چکر میں اُلجھے رہتے ہیں، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہوتا، رُوحانی وجدان تو براہِ راست خدائے زندہ کا فیضان ہے۔ ''بحرالعلوم'' میں ہے کہ ؎

تَاْخُذُوْنَ الْعِلْمَ عَنْ مَیِّتٍ وَّ تَقُوْلُوْنَ حَدَّثَنَا فُلَانٌ. وَاِذَا قِیْلَ لَکُمْ اَیْنَ هُوَ؟ قُلْتُمْ قَدْمَاتَ وَنَحْنُ نَأْخُذُ مِنَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَایَمُوْتُ'' (بحرالعلوم)

(تم مُردوں سے علم حاصل کرتے ہو اور کہتے ہو کہ فلاں نے یہ بات بیان کی اور جب پوچھا جائے کہ وہ کہاں ہے؟ تو تم کہتے ہو کہ وہ وفات پا چکا ہے اور ہم (تو علم کو) اَلْحَیُّ وَلَا یَمُوْتُ (یعنی اللہ تعالیٰ) سے حاصل کرتے ہیں)۔

اس سلسلے میں کہ اللہ کے خاص بندے براہِ راست اللہ سے حدیث سنتے ہیں، ایک نہایت خوبصورت واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک دن ایک شخص حضرت ابوبکر الکتانیؒ کے پاس گیا اور کہا کہ ''تم خانہ کعبہ کے پرنالے کے نیچے بیٹھے رہتے ہو اور فلاں عالم کے درسِ حدیث میں کیوں نہیں جاتے، جو خانہ کعبہ کی عمارت کے فلاں حصے میں بیٹھ کر درس دیتا ہے۔'' حضرت الکتانیؒ نے پوچھا کہ ''وہ کس کی روایت سے حدیث بیان کرتے ہیں۔'' اس شخص نے کہا کہ ''وہ عبدالرزاق اور فلاں فلاں کی روایت سے حدیث کہتے ہیں۔'' حضرت ابوبکر الکتانیؒ نے کہا کہ ''مجھے وہاں جانے کی ضرورت نہیں، مجھے تو وہ روایات یہیں بیٹھے بیٹھے مل جاتی ہیں۔'' پوچھا! ''آپ سے کون حدیث بیان کرتا ہے؟'' فرمایا ''حَدَّثَنِیْ قَلْبِیْ عَنْ رَّبِّیْ'' یعنی خدا تعالیٰ میرے دل پر حدیث بیان کرتا ہے۔'' اس پر اس شخص نے کہا کہ ''اس کا کیا ثبوت ہے کہ خدا تمہارے دل پر حدیث بیان کرتا ہے۔'' الکتانیؒ نے کہا کہ ''اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم خضر علیہ السلام ہو۔'' حضرت خضر علیہ السلام ان کی اس بات سے بہت حیران ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ''رُوئے زمین پر کوئی ولی ایسا نہیں کہ جسے میں نہیں جانتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ الکتانیؒ کو میں نہیں جانتا تھا اور اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا۔'' حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ نے فرمایا ہے ؎

تا کہ با زیارت مقابر عمر گذارنی اے فسردہ   یک گربہء زندہ پیش عارف بہتر ز ہزار شیر مردہ

اس حالت میں قبروں کی زیارت کرنے میں تمہاری عمر گذارنے پر افسوس ہے کہ ایک عارف کے سامنے زندہ لومڑی کا ہونا ہزار مُردہ شیروں سے بہتر ہے۔ (غیر مثنوی) مُردہ شیروں سے مراد عام قبریں ہیں نہ کہ کامل بزرگوں کی قبریں۔ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ جو شخص ایک معمولی زندہ ولی کی زیارت نہیں کرتا، وہ اگر بڑے بڑے بزرگوں

کی قبور کی بلامشاہدہ زیارت کرے تو اس پر افسوس ہے، خواہ اس دُنیا کی بات ہو یا رُوحانی دُنیا کی، انسان کو یقین دید سے پیدا ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے "شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ" (یعنی دیکھی بات سنی ہوئی بات کے برابر کیسے ہو سکتی ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مشاہدہ کا درجہ اہل مجاہدہ سے بہت بلند ہے۔ اہلِ مجاہدہ تو مقامِ تفریق میں ہوتے ہیں اور اہلِ مشاہدہ مقام جمع میں۔ روایات میں ہے کہ ایک بار حضرت بوعلی سینا حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ کے پاس آئے اور اپنے حقائقِ فلاسفہ تین گھنٹے تک حضرت ابوالخیرؒ کو سناتے رہے لیکن یہ سب کچھ سننے کے بعد حضرت ابوالخیرؒ نے فرمایا: "آنچہ تو دانی من می بینم" یعنی جو کچھ تم جانتے ہو میں اس کا مشاہدہ بھی کرتا ہوں۔ (رابطہء شیخ)

ہم اپنی تصنیف "جنیدؒ و بایزیدؒ" میں ایک کافی طویل واقعہ کشف المحجوب کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں مگر اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ اس جگہ روایت کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابومسلم حضرت ابوالخیرؒ کی زیارت کے لئے بہت طویل سفر کرنے کے بعد ان کی قیام گاہ پر پہنچے تو سفر کی وجہ سے نہایت تھک چکے تھے اور اُن کے بدن کے کپڑے بوسیدہ حالت میں تھے، دیکھا کہ حضرت ابوالخیرؒ تخت پوش پر سفید لباس میں ملبوس سو رہے ہیں، ایک تکیہ آپ کے سر کے نیچے ایک دائیں طرف اور ایک پاؤں کے نیچے تھا۔ یہ نقشہ دیکھ کر انہوں نے دل میں کہا کہ جس کی زیارت کے لئے میں یہاں آیا ہوں، اس سے زیادہ مجاہد اور عابد تو میں خود ہی ہوں، مجھے ان کی زیارت سے کیا فائدہ ہوگا۔ کچھ دیر بعد حضرت ابوالخیرؒ بیدار ہوئے تو ابومسلم کو مخاطب کر کے کہا: "اے ابومسلم! تم نے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ تکبر کرنے والا ولی اللہ بھی ہو سکتا ہے۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو مقام مشاہدہ میں رکھا ہے اور تم ابھی مقامِ مجاہدہ میں ہو۔ مقامِ مجاہدہ سے مقامِ مشاہدہ بہت بلند ہوتا ہے۔ یہ گفتگو سن کر ابومسلم بہت شرمندہ ہوئے اور معافی کی درخواست کے بعد عرض کرنے لگے کہ وہ یہاں تین چار دن گذارنے کی نیت سے آئے تھے لیکن اب آپ کی بات سُن کر مجھ میں یہاں رہنے کی تاب نہیں رہی۔ مجھے اجازت عنایت فرمائیں کہ میں واپس چلا جاؤں۔

یہ دُنیا چونکہ لوگوں کو نظر آتی ہے اس لئے وہ اس پر مرتے ہیں

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ آخرت کو دیکھ لیں تو اس دُنیا کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھیں۔ فرماتے ہیں کہ نبی، ولی اور عارف دید سے فیضیاب ہوتے ہیں، اس لئے ان کو استدلال اور کتابی دانش کی ضروت نہیں رہتی۔ ایمانِ غیب تو بیرونِ در لوگوں کے لئے ہوتا ہے، جس کو خدا سے خلوت نصیب ہوگئی تو ہر چیز اس کے لئے حاضر ہے، اس کا سینہ کھول دیا جاتا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دُنیاوی حسن اور اشیاء پر لوگ اس لئے مرتے ہیں کہ ان کو اس دنیا کی چیزوں کی دید حاصل ہو جاتی ہے جب کہ دینی حقائق ان کے لئے شنید کا درجہ رکھتے ہیں اس لئے اس طرف دھیان نہیں کرتے۔ وہ دُنیا کو نقد اور دین کو اُدھار سمجھتے ہیں ؎

ہر کہ در خلوت بہ بینش یافت راہ　　او ز دانش ہا نہ جوید دستگاہ

جس نے خلوت میں بصیرت کا راستہ پا لیا، وہ علوم میں مہارت کا طلب گار نہیں ہوتا۔ (۳/۳۶۸)

با جمالِ جاں چو شد ہم کاسئہ باشدش زاخبار و دانش تاسئہ

جو رُوح کے حسن کا ہم پیالہ بن گیا، اس کو خبروں اور علم سے نفرت ہوتی ہے۔ (۳/۳۶۸)

دید بردانش بود غالب فزا زاں ہمی دنیا بچربد عامہ را

آنکھوں سے دیکھ لینا عقل پر غالب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دُنیا عوام پر چھا جاتی ہے۔ (۳/۳۶۸)

زانکہ دنیا را ہمی بینند عین واں جہانے را ہمی دانند دین

کیونکہ وہ دُنیا کو اصل اور حقیقت سمجھتے ہیں اور اس عالم کو اُدھار سمجھتے ہیں۔ (۳/۳۶۸)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ لوگ دُنیا کی نعمتوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے مگر یہ بات ضرور ہے کہ اس دُنیا کی نعمتیں محض باطل اور عبث نہیں کیونکہ دُنیا کی نعمتوں کو اسلام نے حرام قرار نہیں دیا۔ اس دُنیا کی نعمتیں عالمِ رُوحانی کے باغ کے مقابلے میں ایک قفس کی طرح ہیں، اس پنجرے کا آب و دانہ بھی کھلی فضا کا حصہ ہے۔ انبیاء اس قفسِ عنصری میں رہتے ہوئے بھی اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ یہ عالمِ بالا کے باغ سے آ رہا ہے۔ جب اس پنجرے سے پرندے رہا ہوتے ہیں تو اصلی باغ کی طرف خوش خوش پرواز کرتے ہیں ؎

اُو نہ داند کو رطوباتے کہ ہست آں مدد از عالمِ بیرونی است

وہ نہیں سمجھتا کہ جو رطوبتیں ہیں وہ بیرونی دُنیا کی مدد سے ہیں۔ (۳/۳۷۸)

آں چناں کہ چار عنصر در جہاں صد مدد دارد زشہرِ لامکاں

جس طرح دُنیا میں چاروں عنصر لامکاں کے شہر سے سینکڑوں مددیں پاتے ہیں۔ (۳/۳۷۸)

آب و دانہ در قفس گر یافتہ است آں زباغ و عرصۂ در تافتہ است

اگر پنجرے میں پانی اور دانہ موجود ہو تو وہ باغ اور میدان سے رُونما ہوا ہے۔ (۳/۳۷۸)

جان ہائے انبیاء بینند باغ زیں قفس در وقتِ نقلان و فراغ

انبیاء کی جانیں باغ کو دیکھتی ہیں، اس پنجرے سے منتقل اور فارغ ہوتے وقت۔ (۳/۳۷۹)

علامہ اقبالؒ نے بھی عشق پر بہت اشعار لکھے ہیں، وہ لکھتے ہیں ؎

صحبت از علم کتابی خوشتر است صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

علمِ کتابی سے صحبت زیادہ خوش آئند ہے، آزاد مردوں کی صحبت آدم گری کرتی ہے۔ (اقبالؒ)

می نہ روید تخم دل از آب و گل بے نگاہے از خداوندانِ دل

دل کا بیج مٹی اور پانی سے نہیں کھلتا، خداوندانِ دل کے بغیر نہیں کھلتا۔ (اقبالؒ)

اندر ایں عالم نیرزی با خسے تانیاویزی بہ دامانِ کسے

اس دُنیا میں تمہاری قیمت ایک تنکے جتنی بھی نہیں، جب تک تو کسی اللہ کے بندے کے دامن سے نہ چپک جائے۔ (اقبالؒ)

سولہواں باب

عشقِ اُو پیدا و معشوقش نہاں

(اُس کا عشق ظاہر ہے اور معشوق پوشیدہ ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ ہر روز سورج کا جلوہ دکھاتا ہے اور وہی سورج اس کے چہرے کا نقاب بھی ہے۔ اس کو تلاش کرنے کے لئے سر اور دھڑ کی بازی نہیں لگائی جاتی بلکہ تن، من اور دھن لگانا ہوتا ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا، اُس کی دُنیا کی ہر چیز پر اس کے تصرّف سے عیاں ہونے والی ہر چیز سے نمودار ہوتا ہے، جو دُنیا میں باقاعدہ دیکھا جاتا ہے۔ کون سی جگہ ہے جہاں اللہ کے جلوے بکھرے ہوئے نظر نہیں آتے، جب وہ زمین اور آسمانوں کا نور ٹھہرا تو کون سی چیز ہے جہاں اس کی جلوہ ریزیاں نظر نہیں آتیں، اس کا نور اور اس کی ذات کے مخفی انوار بھی ہر چیز میں محسوس کئے جاتے ہیں۔ جب ہم وضو کریں تو ہمیں اس کے ظاہری عمل سے ظاہر کی صفائی نظر آتی ہے مگر وضو کے عمل کے بعد ہمیں ایک رُوحانی مسرت محسوس ہوتی ہے، وہ اس کا باطنی اثر ہے۔ یہی مسرت ہے جس سے اس عمل کے باطنی اثرات کا علم ہوتا ہے۔ یہ باطنی انوار اُسی خدا کے باطنی جلوے ہی تو ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ خدا کا ایک ظاہر ہے لیکن وہ خود پوشیدہ ہے۔ ایسے عشق میں ایک ایسی کھڑکی بنائی جاتی ہے جس کے باعث دوست کے حُسن کی روشنی سے اس کا سینہ روشن ہو جائے۔ اس کھڑکی سے ہمہ وقت اپنے محبوب کا چہرہ دیکھتے رہو اور یہ کوئی مشکل بات نہیں، اگر کوشش کرو گے تو پا لو گے ۔

عشق ورزی آں دریچہ کردن ست　　　کز جمالِ دوست سینہ روشن ست

عشق کرنا وہ کھڑکی بنانا ہے جس کے باعث دوست کے حسن سے سینہ روشن ہوتا ہے۔ (۲۹۸/۶)

ایں بدست تست بشنو اے پسر　　پس ہما رہ روئے معشوقہ نگر

پس ہمیشہ معشوقہ کا رُخ دیکھتا رہ، اے بیٹا! سن لے کہ یہ تیرے قبضہ میں ہے۔ (۳۹۹/۶)

جبرئیلے گشت و آں دیوے بمرد　　دیو اگر عاشق شود ہم گوے برد

شیطان اگر عاشق ہو گیا تو اس نے بھی بازی جیت لی، وہ جبرائیل بن گیا اور اس کا وہ شیطان مر گیا۔ (۳۴۹/۶)

آفتاب آں روے را ہمچوں نقاب　　یار آمد عشق را روز آفتاب

عشق کے لئے دن میں، یار سورج کی طرح ہے اور سورج اس چہرے کا نقاب بھی ہے۔ (۳۸۸/۶)

با یکے سر عشق نتواں باختن　　با دو پا در عشق نتواں تاختن

عشق میں دو پاؤں سے نہیں دوڑا جا سکتا، ایک سر سے عشق کی بازی نہیں کھیلی جا سکتی۔ (۴۴۲/۶)

یار بیروں فتنہء اُو در جہاں　　عشقِ اُو پیدا و معشوقش نہاں

اس کا عشق ظاہر ہے اور معشوق پوشیدہ ہے، یار (کائنات سے) باہر ہے اور اس کا جہاں میں فتنہ ہے۔ (۷۷/۲)

عاشق دُنیا اور آخرت کے لئے عبادت نہیں کرتا اور نہ خوف سے تقویٰ اختیار کرتا ہے

جو عبادت دُنیا یا آخرت کے لئے کی جائے یا آخرت کے عذاب کے خوف سے جو تقویٰ اختیار کیا جائے تو ایسی عبادت اور تقویٰ سے انسان کو معمولی فائدہ ضرور پہنچتا ہے مگر وہ نچلی سطح تک رہتا ہے۔ رُوحانی ترقی تو اس حالت میں ہوتی ہے کہ جب عمل بے غرض ہو۔

جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

مولاناؒ نے ایک عاشقِ الٰہی کا واقعہ لکھا ہے کہ اللہ نے اس کو عبادت کے اجر میں کونین کے خزانے دینے کی خوشخبری دی مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں تو فقط تیرا طالب ہوں اگر میں نے جنت کے شوق میں یا جہنم کے خوف سے عبادت کی ہے تو میں فاسق ہوں، میں لذّت پرست اور سلامت جو مومن نہیں ہوں ؎

عرضہ کردہ بود پیشِ شیخِ حق　　گنج ہائے خاک تا ہفتم طبق

خدا نے زمین سے ساتویں آسمان تک کے خزانے شیخِ حق کے سامنے پیش کئے تھے۔ (۲۷۶/۵)

ور بجویم غیرِ تو مَن فاسقم　　شیخ گفتا خالقا من عاشقم

شیخ نے کہا کہ اے خالق میں تیرا عاشق ہوں، اگر میں ترے سوا کچھ طلب کروں تو میں فاسق ہوں۔ (۲۷۶/۵)

ور کنم خدمت من از خوفِ سقر　　ہشت جنت گر در آرم دَر نظر

اگر میں آٹھوں جنتوں کو نظر میں لاؤں اور میں جہنم کے خوف سے عبادت کروں تو بھی فاسق ہوں۔ (۲۷۶/۵)

زانکہ ایں ہر دو بود حظِ بدن　　مومنے باشم سلامت جوئے من

میں سلامتی کا طالب ہوں (اس لئے) ایک مومن بنوں گا کیونکہ یہ دونوں چیزیں (جنت اور جہنم) بدن کے لئے

ہیں۔ (۵/۲۷۶)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عاشق کے لئے سب سے بڑی نعمت خدا کا عشق ہے اور اس کے مقابلے میں بدن اور لذات گھاس پھوس کے برابر ہیں۔ عاشق خدا ہو اور عبادت اور خدمت کی اُجرت مانگے تو یہ ایسی نامعقول بات ہے کہ جیسے جبرائیل امین جیسی ہستی ہو اور چور بھی بن جائے۔

عاشقے کز عشق یزداں خورد قوت صد بدن پیشش نیرزد ترہ توت

وہ عاشق جس نے خدا کے عشق کی خوراک کو حاصل کیا، اس کے آگے سینکڑوں بدن شہتوت کے پتوں کی قیمت بھی نہیں رکھتے۔ (۵/۲۷۶)

عاشقِ عشق خدا وانگاہ مزد جبرائیلِ مؤتمن آنگاہ دُزد

عشقِ خدا کا عاشق اور پھر مزدوری کرے؟ یہ ایسے ہی ہے کہ امانت دار جبرائیل اور پھر چور بھی ہو۔ (۵/۲۷۶)

عاشق دُنیا کی ہر چیز کو جلا دیتا ہے۔ قیس عامری کو لیلیٰ کے سوا کچھ کام نہ تھا، وہ دشت کے درندوں سے بھی نہ ڈرتا تھا کیونکہ عاشق تھا اگر درندے کو اس کا علم بھی ہو جاتا ہے تو اس کا احترام کرتا ہے۔ دونوں جہانوں کی نعمتیں تو اس کے لئے عشق کی چونچ میں ایک دانے کی حیثیت سے زیادہ نہیں۔ عاشق ان کی لپیٹ میں کیسے آ سکتا ہے۔ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ دانہ مرغ کو کھائے اور گھاس گھوڑے کو کھالے۔

ہرچہ جز عشق است شد ماکولِ عشق دو جہاں یک دانہ پیشِ نولِ عشق

جو عشق کے سوا ہے وہ عشق کی غذا ہے، عشق کی چونچ کے لئے دونوں جہاں ایک دانہ ہیں۔ (۵/۲۷۷)

دانہء مر مرغ را ہرگز خورد کاہداں مر اسپ را ہرگز چرد

دانہ مرغ کو کبھی کھاتا ہے؟ گھاس (آخور) کبھی گھوڑے کو کھاتا ہے؟ (۵/۲۷۷)

عاشق کا بدن بھی بدن نہیں بلکہ نور بن جاتا ہے، حق کے عالم میں بدن کا کیا کام اور مادی جنت و دوزخ کا کیا مقام ہے۔

انبیاء و اولیاء کے عشق سے تمام دُنیا متاثر ہے

عارف رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مردِ مومن کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر طاقت عطا کی ہے کہ اس کے اثر سے اس دُنیا کی ہر چیز متاثر ہو سکتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ'' (لقمان:۲۰) (تمہارے لئے زمین اور آسماں کی ہر چیز مسخر کر دی ہے) تو دُنیا کی یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش کو اُن اولیائے کرام کے صدقے برساتا ہے اور زمین پر سبزہ ان ہی کے طفیل اُگتا ہے (بِهِمْ یُمْطَرُوْنَ وَبِهِمْ یُرْزَقُوْنَ) مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پھول کے گوش میں کچھ بات کہی تو وہ خنداں ہو گیا۔ ایک سرکنڈے میں شکر بھر کر اسے نیشکر بنا دیا۔ فرماتے

ہیں کہ جس نے سرو کے درخت کو سیدھا کیا، جس نے نرگس ونسرین میں رنگ و بُو اور جمال کی جنت پیدا کر دی، جس نے خاک سے گُل وگلزار بنائے، جس نے زبان میں جادو کی تاثیر پیدا کی، جس نے کان میں سونے اور جواہرات کی آفرینش کی، کیا وہ کسی عاشق کے اندر عشق اور ذوقِ دیدار پیدا کرنے سے عاجز ہے، کیا وہ انسانوں میں اعلیٰ اور بلند درجے کا عرفان پیدا نہیں کرسکتا؟ آپ نبی آخرزماں ﷺ کو دیکھیں کہ جن کی صحبتِ کرم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی بے مثال ہستیوں کو رہتی دُنیا تک ایک ناقابلِ فراموش انسان بنا دیا اور جن کی برکت سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آج بھی آسمانِ دنیا میں ستارے بن کر چمک رہے ہیں، ایسی ہستیوں کو اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کا کرتا دھرتا اور مالک بنا دیا۔ اس بیان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کے تصرف کی حکایات اس کتاب میں کئی مقامات پر بیان ہوچکی ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

چوں دھانم خورد از حلوائے او　　چشم روشن گشتم و بینائے او

جب کہ میرا منہ اس کا حلوہ کھا چکا ہے تو میں روشن چشم اور اس کو دیکھنے والا بن گیا ہوں۔ (۳۹۳/۳)

آنچہ گل را گفتِ حق خندانش کرد　　با دلِ من گفت صد چندانش کرد

جو کچھ اللہ نے پھول سے کہا اور اس کو شگفتہ کر دیا، میرے دل سے کچھ کہا اور اس کو سوگنا کر دیا۔ (۳۹۳/۳)

آنچہ زد بر سرو و قدش راست کرد　　وآنچہ از وے نرگس و نسرین بخورد

وہ بات جو سرو پہ نازل کی اور اس کا قد سیدھا کر دیا اور وہ جو اس سے نرگس اور نسرین نے حاصل کی۔ (۳۹۳/۳)

مر زباں را داد صد افسوں گری　　وانکہ کاں را داد زرِّ جعفری

جس نے زبان کو سو جادو سکھائے، جس نے کان کو جعفری سونا عطا کیا۔ (۳۹۳/۳)

بردلم زد تیر و سودائیش کرد　　عاشقِ شکر و شکر خائیش کرد

اس نے میرے دل پر تیر مارا اور اس کو مجنوں بنا دیا، شکر اور شکر خوری کا عاشق کر دیا۔ (۳۹۳/۳)

انبیائے کرام علیہم السلام چٹانوں کی طرح ہر مشکل اور مصیبت کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے سامنے لوگ مٹی کے ڈھیلے ہوتے ہیں۔ پتھر میں سختی تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی اور اینٹوں کو اگرچہ انسان نے بنایا مگر ان کی تقدیر ہر مردِ مومن کے سامنے ہیچ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی اُستواری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کا پُشت پناہ ہوتا ہے۔ ایک مجاہد بے دھڑک بادشاہوں سے ٹکرا جاتا ہے (جیسے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر اور جہانگیر جیسے بادشاہوں کا مقابلہ کیا) شہنشاہِ زمانہ ان کے سامنے بھیڑوں کی طرح ہوتے ہیں اور بکروں کو خواہ وہ کتنے ہی ہوں، ذبح کرنے سے کون سا قصائی گھبراتا ہے ؎

ہر پیمبر سخت رُو بُد در جہاں　　یک سوارہ کوفت بر جیشِ شہاں

ہر پیغمبر دُنیا بھر میں بہادر ہوا، اس نے بادشاہوں کے لشکروں کو تنہا شکست دی ہے۔ (۳۹۴/۳)

یک تنہ تنہا بزد بر عالمے رُو نگردانید از ترس و غمے

اس نے کسی غم اور خوف سے منہ نہیں موڑا، تنِ تنہا ہی وہ پورے عالم پر ٹوٹ پڑا۔ (۳۹۴/۳)

سنگ باشد سخت رُو و چشم شوخ او نترسد از جہانِ پُر کلوخ

پتھر سخت رو اور نڈر ہوتا ہے، وہ جہان بھر کے ڈھیلوں سے نہیں ڈرتا۔ (۳۹۴/۳)

گوسفنداں گر بُروں اند از حساب زانبہے شاں کے بترسد آں قصاب

بکریاں اگرچہ شمار سے باہر ہوں، قصائی ان کی کثرت سے کب ڈرتا ہے۔ (۳۹۴/۳)

کاں کلوخ از خشت زن یک لخت شد سنگ از صنعِ خدائی سخت شد

ڈھیلا اینٹ پاتھنے والے سے مجسم بنا ہے، پتھر خدائی کاری گری سے سخت ہوا ہے۔ (۳۹۴/۳)

جس دِل میں عشق ہو وہاں حقیقی دین ہے

خشک زاہدوں کی سی عبادت جس میں عشقِ خدائے تعالیٰ اور رسول ﷺ نہ ہو، وہ عبادت بارگاہِ الٰہی میں بہت معمولی مقام رکھتی ہے۔ عاشقانِ الٰہی اور عاشقانِ رسول ﷺ والی عبادت کا ذکر اس کتاب میں متعدد بار ہو چکا ہے۔ مولانا رومیؒ کے مطابق عشق ہی سرچشمۂ صداقت ہے۔ جہاں عشق ہو وہاں دین کی حقیقت موجود ہوتی ہے اور اگر عشق نہیں تو دین محض تقلید و روایت ہے، جس سے انسان کے باطن کو فیض نہیں پہنچتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایک شریعت وہ ہے جو خاص و عام سب کے لئے ہے، دوسری شریعت وہ ہے کہ جس کو عاشق خود اپنے لئے وضع کرتا ہے۔ اسی لئے مولاناؒ نے فرمایا کہ ''ملت عشق از ہمہ ملت جدا ست'' (یعنی عشق کا مذہب تمام ادیان سے جدا ہے) وہ سمجھ جو عاشق کے لئے رَوا ہے وہ غیر عاشق کے لئے جائز نہیں۔ محبِّ خدا، خدا کا عاشق اور معشوق ہوتا ہے۔ معشوق کے منہ سے گالی بھی پیاری لگتی ہے۔ حافظؒ نے فرمایا ہے ؎

بدم گفتی و خورسندم، عفاک اللہ نکو گفتی جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

تُو نے بُری بات کی تو میں خوش ہوں، اللہ تجھے معاف کرے خوب اچھی بات کی، لعل جیسے لبوں سے تلخ کلامی شکر کی طرح اچھی لگتی ہے۔ (حافظؒ)

شیخ سعدیؒ نے بھی اسی طرح فرمایا ہے ؎

حکایت از لبِ شیریں دہاں سیم اندام تفاوتے نہ کند گر دعا است و دشنام

نازک اَندام کے ہونٹوں سے حکایت کا سننا اچھا لگتا ہے، وہ دعا دے یا گالی اس میں کوئی فرق نہیں۔ (سعدیؒ)

صائب کا شعر بھی ایسا ہی ہے، فرماتے ہیں ؎

دشنامِ یار جانِ دگر می دہد مرا ایں زہرِ پرورش بہ شکر می دہد مرا

محبوب کی گالی مجھے نئی جان دیتی ہے، یہ زہر جو وہ مجھ کو دیتا ہے شکر میں پلا ہوا ہے۔ (صائب)

کاملے گر خاک گیرد زر شود
(کامل اگر خاک بھی پکڑ لے تو سونا بن جاتا ہے)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ عشق اگر کفر کو بھی ہاتھ ڈالے گا تو اس کو بھی ملّتِ اسلامیہ میں تبدیل کر دے گا اور اگر کوئی بے دین شخص اچھی چیز کو پکڑے گا تو اس کو بھی بے دینی میں تبدیل کر دے گا ؎

جہل آید پیش او دانش شود　　　جہل شد علمے کہ در ناقص رود

عاشق کے سامنے جہالت کی بات آئے تو وہ عقل کی بات ہو جاتی ہے، وہ علم جہالت بن جاتا ہے جو ناقص کے پاس جائے۔ (۱/۱۸۵)

ہر چہ گیرد علتی علت شود　　　کفر گیرد کاملے ملت شود

بیمار جس چیز کو پکڑے، بیماری بن جاتی ہے، کامل شخص کفر اختیار کرتا ہے تو بھی وہ دین بن جاتا ہے۔ (۱/۱۸۴)

مردِ عارف کفر کی بات کو جب عشق کی آگ پر ڈالتا ہے تو اس کو خالص کر دیتا ہے اور جب وہ بظاہر کوئی فِقہ کے علاوہ بات کرتا ہے تو اس میں بھی فِقہ کی بو آتی ہے ؎

کاملے گر خاک گیرد زر شود　　　ناقص ار زر بُرد خاکستر شود

کامل شخص اگر خاک کو پکڑے گا تو سونا بنا دے گا، ناقص شخص اگر سونا پکڑے گا تو اس کو بھی خاک بنا دے گا۔ (۱/۱۸۴)

ہر چہ گوید مردِ عاشق بوئے عشق　　　از دہانش می جہد در کوئے عشق

عاشق انسان جو کچھ عشق کے بارے میں کہتا ہے، خوشبو عشق کے کوچہ میں اس کے منہ سے مہک جاتی ہے۔ (۱/۳۰۳)

گر بگوید فقہ فقر آید ہمہ　　　بوئے فقر آید ازاں خوش دمدمہ

اگر وہ فقہ کی بات کرتا ہے تو وہ سب فقر ہوتا ہے، اس کی خوش گُفتاری سے فقر کی خوشبو آتی ہے۔ (۱/۳۰۳)

ور بگوید کفر آید بوئے دیں　　　آید از گفت شکش بوئے یقیں

اگر وہ کفر کی بات کہتا ہے تو دین کی خوشبو آتی ہے، اس کے شک کی بات (الہام) سے بھی یقین کی خوشبو آتی ہے۔ (۱/۳۰۳)

مرزا غالب نے فرمایا ہے ؎

دولت بہ غلط نہ رسد از سعی پشیماں نہ شو　　　کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

دولت غلط جگہ نہیں جاتی، کوشش سے پشیمان نہ ہو جاؤ اگر کافر نہیں بن سکتے تو لامحالہ مسلمان بن جاؤ۔ (غالب)

کفِ کژ کز بحرِ صافی خاست است　　　اصلِ صاف آں فرع را آراست است

پاؤں ٹیڑھا نظر آنا صاف پانی کا خاصہ ہے، صاف ہونے کی اصل نے اس فرع کو آراستہ کر دیا۔ (۱/۳۰۳)

آں کفش را صافی و محقوق داں　　　ہمچو دشنامِ لبِ معشوق داں

ٹیڑھے نظر آنے والے پاؤں کو صحیح اور محقوق سمجھ، محبوب کے منہ کی گالی کی طرح میٹھا سمجھ۔ (۱/۳۰۳)

گشت ایں دشنام نامطلوب اُو　　　خوش زبہرِ عارضِ محبوب او

یہ گالی اس کی مطلوب نہیں ہوتی مگر محبوب کے چہرے کی وجہ سے عاشق خوش ہوتا ہے۔ (۳۰۳/۱)

عارف رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مردِ مومن کو کہیں سونے کا بت مل جائے تو وہ اس کو کسی بت پرست کے لئے نہیں چھوڑے گا بلکہ اس کو آگ میں ڈال کر صاف ستھرا کرنے کے بعد کسی اچھے مصرف میں لائے گا ؂

گر بتِ زرّیں بہ یابد مومنے　　　کے ہلد اورا پئے سجدہ کنے

اگر کوئی مومن سونے کا بت پالے تو اس کو سجدہ کرنے والے کے لئے کب چھوڑے گا۔ (۳۰۳/۱)

بلکہ گیرد اندر آتش افگند　　　صورتِ عاریتش را بر کند

بلکہ اس کو لے کر آگ میں ڈال دے گا، اس کی عارضی ہیئت کو توڑ دے گا۔ (۳۰۳/۱)

ذاتِ زرّش دادِ ربانیت ست　　　نقش بت بر نقدِ زر عاریت است

اس کا اصل سونا ہونا خدا کا دین ہے، نقد سونے پر بت کی تصویر عارضی ہے۔ (۳۰۴/۱)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب باغ میں موسم خزاں آجائے تو کانٹے خوش ہوتے ہیں کہ اب ان کو حقیر سمجھنے والے پھول باقی نہیں رہے یا یوں سمجھئے کہ دُنیا ایک ظلمت کدہ ہے۔ بدکار آدمی تو یہی خواہش کرے گا کہ ہمیشہ اندھیرا ہی رہے تاکہ حسین اور بدشکل میں تمیز نہ ہو سکے۔ اندھیرے میں سب برابر ہوتے ہیں مگر جب قیامت آئے گی تو اندھیرے دُور ہو جائیں گے اور حقیقت آشکار ہو جائے گی، نیک اور بد میں تمیز ہو جائے گی، بدکاروں کو الگ کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

"وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ" (یٰس:۵۹)　　　اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔

اس دُنیا کی خزاں کے بعد قیامت کے روز بہار آئے گی اور پھولوں اور کانٹوں میں فرق واضح ہو جائے گا۔ اچھے اور بدکار میں فرق واضح ہو جائے گا۔ اس دن مسلمانوں کے اعمال پہچانے جائیں گے۔ ایسی قیامت کا خواہاں مومن خوش کردار ہی ہو گا ؂

پس قیامت روزِ عرضِ اکبر است　　　عرض او خواہد کہ بازیب و فراست

قیامت (کا دن) بڑی پیشی کا دن ہے، پیشی وہ چاہے گا جو شان و شوکت والا ہے۔ (۳۰۶/۱)

چوں نہ دارد روئے ہمچوں آفتاب　　　او نہ خواہد جز شب ہمچوں نقاب

جو شخص آفتاب جیسا چہرہ نہ رکھتا ہو، وہ نقاب کی طرح رات کے سوا کچھ نہ چاہے گا۔ (۳۰۶/۱)

خار بے معنی خزاں خواہد خزاں　　　تا زند پہلوئے خود با گلستان

بے حقیقت کانٹا خزاں ہی خزاں چاہتا ہے تاکہ گلستان سے وہ پہلوتہی کر سکے۔ (۳۰۶/۱)

پس خزاں او را بہار است و حیات　　　یک نماید سنگ و یاقوت زکات

اس کے لئے خزاں، بہار اور زندگی ہے جو پتھر اور قیمتی یاقوت کو یکساں دکھاتی ہے۔ (۳۰۶/۱)

حصہ سوئم

سترھواں باب

شیخ نورانی زراہ آگہ کند

(شیخ نورانی راہوں سے آگاہ کرتا ہے)

اولیاء کا فیضانِ صحبت، احترام اور پیروی

زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اولیائے کرامؒ کا گروہ اسلام کو عام لوگوں میں رائج کرتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ مولانا رومؒ کی خواہش ہے کہ اولیائے کرامؒ طریقت میں دلچسپی رکھنے والے خواص کو بھی ولایت کے نہایت بلند مقام پر لا کھڑا کریں۔ آپ اس بات کا تأثر دیتے ہیں کہ جو لوگ اولیائے کرامؒ سے رُوحانی روشنی اَخذ کرتے ہیں اور ان کی صحبت میں کچھ وقت گزارتے ہیں وہ اس قدر علم حاصل کر لیتے ہیں کہ اپنی تمام مشکلات اور مصائب کا حل وہ خود تلاش کر سکتے ہیں اور یہ لوگ "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" (سنو! بیشک اولیاء اللہ کو نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یونس:۶۲) کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

"مثنویٔ معنوی" میں بیعت کا کسی کامل، مکمل اور اکمل شیخ سے حاصل کرنا واجب قرار دیا گیا ہے کیونکہ شیخ طریقت ان تمام امور کی تربیت دیتا ہے جو اسلام میں فرائض یا واجبات کا حکم رکھتے ہیں، اس لئے ان کا طریقہ سیکھنا بھی واجب ہے جو بیعت میں سکھایا جاتا ہے۔

کسی شیخ کی بیعت اختیار کر کے سالکِ طریقت کو ان تمام قوانینِ الٰہی کا علم حاصل ہو جاتا ہے، جس سے انسان دُنیا اور آخرت میں امن اور سکون کی زندگی گزار سکتا ہے۔ مولانائے رومؒ نے اس حقیقت کو اپنے اشعار میں بہت دلچسپ رنگ میں پیش کیا ہے کہ اولیائے کرامؒ ان اختیارات اور قوتوں کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی بیان

کرتے ہیں کہ اولیائے کرامؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر قوت عطا فرمائی ہے کہ وہ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لا سکتے ہیں۔ آپ اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ زندگی کا سفر بغیر پیر و مُرشد کی رہنمائی کے طے نہیں ہو سکتا۔ ان کے ساتھ جو بھی منسلک ہو گیا وہ سنگِ خارا ہوتے ہوئے بھی لعل و زمرد بن جاتا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لا کھڑا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پیرِ طریقت وہ ہوتا ہے جو خود بھی احکامِ شریعت کا پابند ہو اور جو ان کے ساتھ منسلک ہو جائے وہ بھی اس مقام پر آ جائے۔ کوئی شخص پیر و مُرشد کی رہنمائی کے بغیر طریقت کا سفر شروع نہیں کر سکتا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آج تک کوئی شخص ان بزرگوں کی صحبت کے بغیر ولایت مطلوبہ کے رُتبے تک پہنچ نہیں سکا۔ فرماتے ہیں پیرِ روشن ضمیر اس وقت سے موجود ہیں جب یہ دُنیا نہ تھی۔ رسول ﷺ اس دُنیا میں آنے سے پہلے بھی رسول تھے۔ (بحوالہ حدیث حضرت جابر)

حضرت مولانائے رومؒ کا یہ فرمان ہے کہ ایسے عاقل اور کامل پیر کے سائے میں آ جاؤ، جس کی صحبت میں رہ کر تم راہِ راست سے پھر نہ جاؤ۔ فرماتے ہیں کہ یہ اس لئے ہے کہ اللہ کا خاص بندہ (مرشد) تمہاری دستگیری کرتا ہے اور تمہیں بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے کی سعادت کے ہمراہ کر دیتا ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ پیرِ کامل وہ ہے جو مرید کو روٹی کی فکر سے آزاد کروا دے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونے کے قابل بنا دے، اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ شیخ کا دامن جلد اور بلا تامّل پکڑ لو۔

مولانائے رومؒ فرماتے ہیں کہ یہ اولیاء اللہ اپنے وقت کے اسرافیل ہیں کیونکہ مردہ دل لوگوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ یہ اولیائے کرامؒ آسمان کی سیڑھی ہیں، جو رُوحانی ترقی کے مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کا بھی انکشاف کرتے ہیں کہ جیسے بغیر کمان کے تیر نہیں چل سکتا ایسے ہی بغیر اولیاء کے مرید آسمانِ طریقت پر کیسے جا سکتا ہے، لہٰذا مشائخ سے دُوری تباہی کا سبب بنتی ہے۔ مولانائے رومؒ نے مذکورہ بالا فوائد کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اگر تم ولایت کے مقام سے آشنائی حاصل کرنے کے بعد مشائخ کی مخالفت کرو گے تو ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ شیخ کے پاس بیٹھنا بھی عبادت ہے بلکہ شیخ کی موجودگی میں نفلی عبادت کا کرنا بھی مستحسن نہیں کیونکہ شیخ کے چہرے کو دیکھنا بذاتِ خود ایک بہت بڑی عبادت ہے۔ ان کی صحبت سے بہتر فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص خدا کی ہم نشینی اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کو کہہ دو کہ وہ اولیائے کرامؒ کے پاس بیٹھے، اس طرح ان کو خدا کی ہم نشینی میسر ہو جائے گی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے ہی مریدین کو اسباق ملتے ہیں۔ یہ قول بھی بہت مشہور ہے کہ اگرچہ پیر و مرشد کوئی کلام بھی نہ کرے تو بھی اس کے پاس بیٹھنا بہتر اور فائدہ مند ہے، کیونکہ اولیائے کرامؒ ایسے سبق بھی دیتے ہیں جن کا محض قلب سے تعلق ہے، گفتار سے نہیں۔ ایسے سبق کو وہ بے گفتہ سبق کہتے ہیں، یعنی بغیر بات چیت کے سبق حاصل کرنا، جو مریدین ایک گھڑی کے لئے ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں انہیں سینکڑوں سالوں کی بے ریا عبادت سے زیادہ ثواب ملتا ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ کسی مردِ حکیم سے حکمت (یعنی طریقت) کو تلاش کرو کیونکہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ جس کو حکمت مل گئی تو سمجھ لو اس کو خیرِ کثیر مل گئی۔ ایسی صحبت سے عقل کے اندھے بھی بینا اور علیم ہو جاتے ہیں۔ اولیائے کرامؒ کے دل مسجد کی طرح ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ موجود ہے اور سب مخلوق اس کی طرف ہی سجدہ کرتی ہے۔ اس سے رجوع کرنا بہت بڑی بات ہے۔

مولاناؒ کا کہنا ہے کہ پیر ایسی ہستی ہے کہ جس کے تبرکات پاس رکھنے سے بھی مریدین کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ملتی ہے اور پیر جہاں بھی ہو، مریدین کی دُور سے بھی مدد کر سکتا ہے۔ وہ جب چاہے، جہاں چاہے پہنچ سکتا ہے اور اس کا ہاتھ بھی مریدوں سے دُور نہیں (بشرطیکہ پیر صحیح پیر ہو اور مرید بھی صحیح مرید ہو) حضرت خالدؓ بن ولید نے اپنی ٹوپی میں موئے مبارک رکھ لیا تھا اور پھر ہر جنگ میں اس کی برکت سے فتحیاب ہوئے۔ ایک بار دورانِ جنگ یہ ٹوپی کفار کے علاقے میں رہ گئی تو آپؓ نے دوبارہ حملہ کر کے ٹوپی حاصل کی، جس کی وجہ سے بہت سے صحابیؓ بھی شہید ہوئے۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ)۔ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کے تبرک کے باعث (جو ایک خرقہ کی صورت محمود کو دیا تھا) سومنات کا مندر فتح ہوا۔ ایسی لاکھوں روایات ہیں جو تنگیٔ قرطاس کی وجہ سے بیان نہیں کی جا سکتیں۔

رُوحانیت اور تصوّف کا مضمون ایسا ہے کہ جو آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ ہی معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن میں درج ہے، جو ایک رُوحانی علم کی نشان دہی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام کے حکم کے تابع چلے، اسی طرح تم بھی اپنے مرشد کے تابع بن کر رہو۔ بہت سی مستند کتابوں میں ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ پہلی بار جب حج کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں ایک بزرگ کے ہاں قیام کیا۔ اس بزرگ نے پوچھا کہ اے بایزیدؒ کس کام کے لئے گھر سے نکلے ہو تو آپ نے حج کا ذکر کیا۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ کتنے پیسے ساتھ لائے ہو۔ انہوں نے عرض کی کہ دو سو درہم ہیں۔ فرمایا: تم اس وقت حج کے قابل نہیں ہو۔ لاؤ یہ رقم مجھے دے دو اور میرے گرد سات چکر کاٹ لو تو تمہارا حج ہو جائے گا۔ آپ نے ایسا ہی کیا اور کہا کہ واقعی میں اس وقت حج کے قابل نہ تھا اور اس شیخ سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ حضرت مولانائے رومؒ نے فرمایا کہ جو لوگ مشائخ کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ اپنی ہلاکت کو دعوت دیتے ہیں۔ ایک مقام پر منکرینِ طریقت کے متعلق آپ نے سخت کلام لکھا ہے اور ان کو کہا ہے کہ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو جو اتنی بڑی بڑی ہستیوں سے ٹکر لینا چاہتے ہو۔ تم تو ایمانِ شیخ کے معاملے میں کافر ہو اور تمہاری حیثیت ایک معمولی کانٹے سے بھی بدتر ہوگی۔ اگر تم جنت میں جاؤ تو وہاں تمہیں اپنے علاوہ ذلیل کانٹا کوئی بھی نہیں ملے گا۔

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں رُوحانی، وَجدانی اور فلسفیانہ انداز میں تصوّف کے تمام موضوعات کو مستند طریقے سے واضح کیا ہے اور آپ کا اندازِ تحریر اس قدر خوب صورت اور وَجدانگیز ہے کہ عشاق اس کو پڑھ کر سر دُھنتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ بذاتِ خود مولانا رومؒ کے عاشق تھے اور ان کو اپنا مرشد تسلیم کرتے تھے۔ راقم الحروف ان دونوں کو اپنے

پیشوائے طریقت سے کم تصور نہیں کرتا بلکہ میرے پیشوا بھی ان کو اور تمام صوفی شاعروں کو اپنا پیشوائے ذوق تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا رومؒ کی خدمات پر ایک مضمون ہماری ایک عنقریب چھپنے والی تصنیف ''سرمایۂ ملت'' میں شامل کیا گیا ہے۔ شائقین حضرات اس کے مطالعہ سے یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہماری ایک اور تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' کے نام سے عنقریب چھپنے والی ہے، جس میں تصوّف اور اس کے مختلف موضوعات پر اچھی خاصی تفصیل دی گئی ہے۔ اس کتاب میں مولانا رومیؒ کا کافی کلام شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ دونوں کتابوں سے قارئین کو اچھا خاصا مواد حاصل ہوسکتا ہے۔ آخر میں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مولانا رومیؒ کا کلام جو چھ جلدوں پر پھیلا ہوا ہے اس کا احاطہ کرنا زیرِ نظر مختصر سی تحریر میں ممکن نہ تھا، اس لئے آئندہ صفحات میں صرف ان اشعار کو شامل کیا گیا ہے جو بہت مشہور ہیں اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بن چکے ہیں۔ یہ اختصار اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ ایک چھوٹی سی تحریر میں طالبانِ طریقت کی دلچسپی اور گرمیٔ طبع کا سامان مہیا ہو سکے۔

جہاں تک تصوّف اور رُوحانی دُنیا کا تعلق ہے کچھ لوگوں میں چند منکرینِ طریقت کے باعث یہ تاثر پھیل چکا ہے کہ آج کل تصوّف وغیرہ کی انسان کو ضرورت نہیں۔ یہ صوفیوں نے خواہ مخواہ ایک اضافی مضمون بنا لیا ہے۔ ایسے لوگ تو شاید مذہب کو بھی ایک اضافی مضمون سمجھ کر مذہب کے عملاً منکر ہیں، چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو چند بزرگانِ اسلام کے اقوال کے مطابق مُردہ اور نامراد ہیں۔ اگر ہم اوّل زمانۂ اسلام سے آج تک انسانی زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اولیائے کرامؒ میں سے کسی نے بھی تصوّف کو بے فائدہ مضمون نہیں سمجھا بلکہ لاکھوں اولیائے عظامؒ اس تصوّف کے ساتھ ہر زمانے میں منسلک رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے ناموں کو شمار کیا جائے تو ایک اچھی خاصی تحریر بن جائے گی، چنانچہ اگر کوئی شخص ان اولیائے کرامؒ کا منکر ہے تو اللہ تعالیٰ بھی ان لوگوں سے اِعراض کئے ہوئے ہے۔ جہاں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ اور مختلف سلاسل کے دیگر بزرگ طریقت پر عمل پیرا رہے، جن کے مقامات اس قدر بلند تھے کہ ان کے سامنے منکرینِ طریقت گھاس کے تنکے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ مولاناؒ ایسے لوگوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جیسے کسی شیر کی دُم کے ساتھ کوئی چوہا کھیل رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان کے اس انکار کے عمل سے شیر جیسے انسان کی زندگی پر کیا اثر ہوسکتا ہے۔ جن لوگوں کے حصے میں نیک سعادت اور خوش بختی لکھی جا چکی ہے وہ عملِ طریقت کو اپنا رہے ہیں، باقی لوگ ازلی محرومی اور بدبختی میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے خیالات سے دُور رہنے کی سعادت عطا فرمائے اور اپنے نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدقے درویشانہ طریقوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

راہبرِ راہِ شریعت آں بود

(راہبر راہِ شریعت وہ ہوتا ہے)

مثنوی میں رُوحانی دُنیا کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تو ایک طویل مضمون ہے، لیکن اختصار کی خاطر یہ کہہ دینا

کافی ہے کہ پیروں کے وجود کو ثابت کرنے اور رُوحانی زندگی کی افادیت کے دلائل کے سلسلے میں مولانا رومیؒ کے درج ذیل اشعار عقیدت مندوں کے لئے کافی ہیں۔ انسانوں پر نازل ہونے والے مصائب اور پریشانیوں کا ذکر الگ مضمون میں شامل کیا جا چکا ہے اور یہ بیان بھی ہو چکا ہے کہ مصائب انسانوں کے کرتوتوں کی وجہ سے نازل ہوتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کا فیضان نیک انسانوں پر ان کے نیک اعمال کے باعث نازل ہوتا ہے۔ انسانوں کی زندگیاں بالعموم غموں اور مصائب سے دوچار رہتی ہیں اور اس دُنیوی زندگی کے علاوہ اُخروی زندگی کا دُرست ہونا انسانوں کے اعمال پر انحصار کرتا ہے۔ ایسی حالت میں انسانوں کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اپنی دُنیوی زندگیوں کو ٹھیک حالت میں گزار کر دونوں جہانوں کی مشکلات سے نجات حاصل کریں۔ مولانا رومیؒ کا خیال ہے اگر انسان خود کو کسی شیخ کامل کے حوالے کر دے تو مشکلات کی درستی متصوّر ہو سکتی ہے۔ آپ اس حقیقت پر دلائل پیش کرتے ہیں کہ ایک راہبر کسی انسان کی زندگی کو مطلوبہ کامیابیوں سے ہمکنار کر سکتا ہے اور اس کے دونوں جہانوں کی نعمتوں کا ضامن بن سکتا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں ـ

شیخ نورانی زرہ آگہ کند بَاسُخن ھم نور رَا ہمرہ کند

شیخ نورانی اللہ کی راہ سے آگاہ کرتا ہے، اپنے کلام کے ساتھ نور کو بھی ہمراہ کر دیتا ہے۔ (۲۵۳/۵)

از حدیثِ شیخ جمعیت رسد تفرقہ آرد دمِ اہلِ حسد

شیخ کی باتوں سے سکون ملتا ہے، جب کہ اہلِ حسد کے کلام سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ (۳۴۶/۲)

چونکہ دستِ خود بہ دستِ اُو نہی پَس زدستِ آکلاں بیروں جہی

جب تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتا ہے تو گمراہوں کے پنجے سے نکل جاتا ہے۔ (۸۳/۵)

راہبر راہِ طریقت آں بود کو بہ احکامِ شریعت می رود

راہِ طریقت کا راہبر وہ ہوتا ہے جو خود بھی طریقت کی راہ پر چلتا ہے۔ (مثنوی حصہ دوم)

گر نباشد در عمل ثابت قدم چوں رہاند خلق را از دستِ غم

اگر وہ عمل میں ثابت قدم نہ ہو تو مخلوق کو غم سے رہائی کیسے دلا سکتا ہے۔ (حصہ دوم)

دست زن در دامنِ ہر کو ولی ست خواہ از نسلِ عمرؓ خواہ از علیؓ ست

جو بھی ولی اللہ ہو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دو، خواہ حضرت عمرؓ کی نسل سے ہو یا حضرت علیؓ کی نسل سے۔ (حصہ دوم)

گر تو گوئی نیست پیرے آشکار تو طلب کُن در ہزار اندر ہزار

اگر تُو کہتا ہے کہ کوئی پیر نظر ہی نہیں آتا، تو تُو اس کو لاکھوں میں تلاش کر۔ (حصہ دوم)

زانکہ گر پیرے نہ باشد در جہاں نے زمیں بر جائے ماند نے مکاں

یہ اس لئے کہ اگر دُنیا میں کوئی پیر نہ رہے تو یہ زمین اور آسمان اپنی جگہ پر نہیں رہ سکتے۔ (حصہ دوم)

دست گیرد بندۂ خاصِ اللہ طالباں را می برد تا پیش گاہ

اللہ کے خاص بندے دستگیری کرتے ہیں، طالبانِ الٰہی کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں۔ (۳۱۱/۱)

گر تو سنگِ خارا و مرمر شوی چوں بہ صاحب دل رسی گوہر شوی

اگر تُو سخت پتھر اور سنگِ مرمر بھی ہو تو جب کسی صاحبِ دل پیر کے پاس پہنچے گا تو گوہر بن جائے گا۔ (۱۰۱/۱)

چوں شدی دور از حضورِ اولیاء درحقیقت گشتۂ دور از خدا

جب تُو پیروں کی حاضری سے دُور ہو گیا تو حقیقتاً تُو خدا سے دُور ہو گیا۔ (۲۱۴/۲)

آنکہ واقف گشت بر اسرارِ ہُو سِرِّ مخلوقات چہ بود پیش اُو

جب شیخ خدا کے اِسرار سے واقف ہو تو پھر مخلوق کے راز اس کے سامنے کیا ہیں۔ (۱۴۸/۲)

اشعار کی تشریح

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ کا تعلق اللہ سے ہونے کی وجہ سے مرید کا تعلق بھی نورانی راستے سے ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ شیخ اپنے کلام کے ساتھ ساتھ اپنی گفتگو کے الفاظ میں بھی ایک نُور روانہ کر دیتا ہے، اس لئے مریدوں پر اس کے الفاظ کے علاوہ اس کا نور بھی اثر کرتا ہے جو کہ عام لوگوں کے کلام میں نہیں ہوتا، لہٰذا پیر کی بات اوروں سے سراسر مختلف ہو جاتی ہے۔ اس نُور کی وجہ سے شیخ کی بات کا اثر مرید کے دل میں سکون کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جب کہ عام دُنیاداری کی بات میں انتشار اور بے سکونی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں جب تم نے اپنا ہاتھ پیر کے ہاتھ میں دے دیا تو سمجھ لو کہ گمراہ لوگوں کے چنگل سے نکل گئے ہو اور ان کے شر سے محفوظ ہو گئے ہو۔ فرماتے ہیں کہ رہبرِ شریعت وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتا ہے اور عملِ شریعت سے اس کے نُور میں اور بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے (کلمہ لاالٰہ کے پڑھنے سے ایک کافر اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور مسلمان اگر اس کو بار بار پڑھے تو ہر بار پڑھنے سے اس کے درجات بلند ہوتے ہیں) فرماتے ہیں کہ اگر وہ عملِ شریعت کی راہ پر نہ چلے تو وہ مقبولِ بارگاہِ الٰہی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے کرامؒ کی دعاؤں سے مخلوقات کو رنج وغم سے نجات ملتی ہے۔ اگر پیر مقبولِ الٰہی نہ ہو تو ان سے ملنے والوں کو عذابِ جہنم سے نجات ملنے کا کام بھی نہیں ہو سکتا (اگر کچھ لوگوں کے دُنیاوی کام نہیں ہوتے تو یہ ان کے اعتقاد کی کمزوری اور پیر کے احکامات کو نہ ماننے کی وجہ سے ہے) مذکورہ بالا حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد ضروری ہے کہ انسان کسی ولی اللہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دے (شرط یہ ہے کہ وہ پابندِ شریعت ہو اور جعلی پیر نہ ہو)۔ نیک بندہ خواہ کسی نسل سے ہو اس کو ولی اللہ سمجھو۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں تو آج تک کوئی پیر نہیں ملا تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ پیر نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے کسی پیر کی تلاش ہی نہیں کی (دیکھیئے ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' کی ابتدا میں امام غزالیؒ کا قول ''کہ کسی کو ہدایت کیوں نہیں ملتی'')۔ ایسے شخص کو کہیں کہ وہ لاکھوں کروڑوں میں سے پیر کو تلاش کرے، پیر ضرور مل جائے گا کیونکہ اگر کوئی پیر نہ

رہے تو یہ دُنیا اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتی، گویا یہ دُنیا پیروں کے دم سے ہی چل رہی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے قدموں کی برکت سے بارش نازل کرتا ہے اور انہیں کی وجہ سے زمین سبزہ اُگاتی ہے۔ (مشکوٰۃ)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء بندوں کی دستگیری کرتے ہیں (یعنی جب بیعت کرتے ہیں) تو ان کو اللہ کی بارگاہ میں لا کھڑا کرتے ہیں اور مرید وصلِ الٰہی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ ان اولیائے کرامؒ میں اتنی رُوحانی قوت ہوتی ہے کہ خواہ کوئی کتنا ہی سنگدل اور گنہگار کیوں نہ ہو، پیر اسے توبہ کروا کر اللہ کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پتھر دل کو گوہر بنا دیتے ہیں۔ یہ داستان بہت طویل ہے کہ ایسے ویسے لوگ کیسے کیسے بزرگ بن گئے بلکہ جو لوگ ان باتوں کے قائل نہیں (جیسے کہ اس زمانے میں بہت سے منکرینِ اولیاء کہا کرتے ہیں) تو ایسے لوگ پیروں سے دُور رہنے کے باعث خدا سے دُور رہتے ہیں اور ایسے منکرین اہلِ اللہ کے فیض سے تمام عمر محروم رہتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ہر کہ شد محرمِ دل در حرمِ یار بماند — ہر کہ ایں کار نہ دانست در انکار بماند

جو شخص اپنے دل کا محرم ہو جاتا ہے وہ اپنے یار کے حرم میں رہتا ہے اور جو اس کام کو نہیں جانتا وہ اپنے انکار کی وجہ سے ہی مارا جاتا ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جب اولیاء اللہ خدا کے رموز و اسرار اور قوانینِ الٰہی سے واقفیت رکھتے ہیں تو پھر مخلوقات کے کام ان کے سامنے کیا مشکل ہیں؟ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ جو آسمانوں پر پرواز کر سکتا ہے اس کے لئے زمین پر چلنا کیا مشکل ہے۔ مولانا رومیؒ کے درج ذیل شعر کا مطلب یہی ہے ؎

آنکہ بر افلاک رفتارش بود — بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

جو آسمانوں پر محوِ پرواز ہے زمین کی مسافتیں اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ (۲/۱۴۸)

ایک مقام پر مولاناؒ فرماتے ہیں کہ چڑیا کے پیٹ میں کتنی انتڑیاں اور کتنا مال موجود ہے، یہ علم تو ایک باز کے سامنے ایک معمولی معمولات میں شامل ہے۔ مذکور بالا بحث سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان کے لئے ایک مرشدِ کامل ہونے کی سخت ضرورت ہے۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر
(پیر کو پکڑو کہ یہ سفر بے پیر طے نہیں ہو سکتا ہے)

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں اس بات کا اظہار فرمایا ہے کہ طریقت کا راستہ کسی پیر کے بغیر طے نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی یہ کوشش کرے بھی تو اُسے اس راہ میں بہت سی آفتوں اور خوف و خطر کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر — ہست بس پُر آفت و خوف و خطر

طریقت کا سفر طے کرنے کے لئے کسی پیر کا توسل اختیار کرو کیونکہ اس کے بغیر (سلوک اور طریقت کا) سفر (نفس

اور شیطان کی) بڑی آفات اور خوف و خطر سے لبریز ہے۔ (۳۰۸/۱)

مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ اوّل تو یہ راستہ آج تک کسی نے پیر کی رہنمائی کے بغیر طے ہی نہیں کیا اور اگر کسی نے کوئی منزل حاصل کی ہو تو وہ پیرانِ عظام میں سے کسی کی توجہ کے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادِر ایں رہ برید ہم بعونِ ہمتِ مرداں رسید

ایسا کم ہے کہ کسی نے اس راہ کو تنہا طے کیا ہو اور اگر کیا ہوگا تو وہ بھی بزرگوں کی توجہ (مدد) سے ہی پہنچا ہوگا۔ (۳۱۲/۱)

ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل'' میں دائمی حضور کا مضمون مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ طویل مدت کے بعد ایسے مشائخ آتے ہیں جو کہ اپنے زمانے کے لوگوں کی دستگیری کرتے ہیں، بشرطیکہ وہ ان مشائخ کے متعلق ٹھیک عقیدہ رکھتے ہوں۔ کچھ لوگ جو ان اولیاء کے منکر نہیں ہیں ان کو بھی یہ اولیاء مدد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اویسی طریقہ بھی موجود ہے، جس میں وصال یافتہ مشائخ غیبی طور پر معتقدین کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی اویسی سلسلے کے بزرگ ہی طریقت کے اسباق دیتے ہیں، اگر ایسا ہے تو پھر کوئی پیر کسی شخص کی رہنمائی کر کے اس کو کسی مقام پر کیوں نہیں پہنچا سکتا۔

مشائخ عظام کا متفقہ طور پر یہ خیال ہے کہ راہِ طریقت کو طے کرنا کسی پیر و مرشد اور پیرِ راہدان کے بغیر بہت مشکل ہے اور ایسی بے راہ روی میں منزلوں کا طے کرنا نہایت پُرخوف اور پُرخطر ہے۔ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے فرمایا ہے کہ خواہ کوئی کتنی ہی عبادت اور ریاضت کرے لیکن شیطان اس کو کسی بھی مقام پر پہنچنے سے پہلے گمراہ کر سکتا ہے اور اس کی گردن مروڑ سکتا ہے۔ میاں محمدؒ نے بھی فرمایا ہے کہ ؎

راہ دے راہ دے ہر کوئی آکھے تے میں وی آکھاں راہ دے
بنا مرشدوں تینوں راہ نہیں لبھنا مُروے سیں وچ راہ دے

شیطان انسان کو کس طرح گمراہ کرتا ہے

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا وہ قصہ بہت مشہور ہے کہ جس میں شیطان نے ان کو جب وہ طریقت کی انتہائی منزلوں پر پہنچ چلے تھے تو اس وقت شیطان نے حائل ہو کر گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اللہ تعالیٰ اور ان کے مُرشد کی توجہ نے انہیں بچا لیا۔ قصہ یوں ہے کہ آپؒ نے چالیس سالہ عبادت میں پچیس سال تک عشاء کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی (یعنی اتنا عرصہ شب بیداری کے باوجود) اور سترہ (۱۷) سال تک سوائے ایامِ ممنوعہ کے پے در پے روزے رکھے۔ اس وقت جب کہ آپ ابھی صحرا میں ہی تھے تو ایک دن ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس گرم موسم میں ٹھنڈے پانی کا کوزہ اگر مل جائے تو آپ اپنی پیاس بجھائیں۔ یہ خیال دل میں آتے ہی آپ نے دیکھا کہ بادل چھا گئے اور ٹھنڈے پانی کا ایک کوزہ ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ دل میں خیال کیا کہ شاید یہ اللہ کی طرف سے میری ریاضتوں کا انعام ہے۔ ابھی پانی پیا ہی نہ تھا کہ بادلوں سے ایک نورانی چہرہ نظر آیا اور

فوراً یہ نِدا آئی کہ ''اے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ! تم نے عبادت کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہم تمہاری ریاضت سے بہت خوش ہوئے ہیں، لہٰذا آج کے بعد ہم نے تمہارے لئے ہر قسم کی عبادت کو معاف کر دیا ہے۔'' حضرت نے یہ سوچا کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اس قدر عبادتوں کے بعد بھی عبادت معاف نہیں ہوئی تو مجھے عبادت معاف کرنے والا سوائے شیطان کے اور کون ہوسکتا ہے۔ آپ نے اسی وقت لاحول پڑھا تو وہ پانی کا کوزہ بادل اور نورانی چہرہ فوراً غائب ہو گیا، جو شیطان نے دھوکہ دینے کے لئے نمودار کیا تھا۔ ان سب چیزوں کے غائب ہونے کے بعد شیطان نے آواز دی کہ ''اے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ! تم اپنے علم کی وجہ سے بچ گئے ہو، ورنہ اس مقام سے میں نے بہت بڑے بڑے اولیائے کرامؒ کو دھوکا دے کر گمراہ کر دیا ہے۔'' آپ نے فرمایا ''اِدفَعْ یَالَعِیْن'' (اے لعین دفع ہو جا!) مجھ کو میرے علم نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل نے تمہارے پھندے سے بچایا ہے۔ ہماری تصنیف ''سنتِ مبارکہ'' کے صفحہ نمبر ۲۲۸ پر علامہ اقبالؒ کے چند اشعار کی تشریح کی گئی ہے کہ شیطان نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا کہ الٰہی! اس انسان کی صحبت نے مجھے خراب کر دیا ہے، میں اسے جو بھی حکم دیتا ہوں اس کو میری تابعداری میں ذرّہ برابر رکاوٹ نہیں رہتی بلکہ فوراً ہتھیار پھینک دیتا ہے۔ اس نے کہا اے بارِ خدایا! میں اس انسان سے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے تو ایسے شخص درکار ہیں، جو مجھ سے مقابلہ کریں اور پھر ان کی شکست میں مجھے مزہ آئے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تو اپنے مرشد اور خدا کی توجہ کے باعث بچ گئے مگر بہت سے لوگ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے اور بہت سے ایسے ہوئے ہیں کہ شیطان کے کہنے سے پیغمبر یا نبی بننے کا دعویٰ کیا (کیونکہ شیطان نے ان کو بار بار کہا کہ تم ہی نبی ہو) بہت سے لوگ آج کل بھی شیطان کے بہکاوے میں آتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں کہ جو یہ کہتے ہیں کہ اگر عبادت کا حق ادا کر دیا جائے تو ''ولی سے عبادت اُٹھ جاتی ہے۔'' بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ عبادت صرف حضورِ قلب سے ہوتی ہے اور اگر دل اللہ کے حضور میں آ جائے تو پھر نماز روزہ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ (معاذاللہ)

پس بہر دستے نشاید داد دست

(پس ہر ہاتھ میں ہاتھ نہیں دے دینا چاہیے)

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جہاں اچھے لوگ رہتے ہیں وہاں جعلی لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ بہت سے ڈاکٹر، حکیم، دکاندار اور پیر وغیرہ لُٹیرے بھی ہوتے ہیں، غرضیکہ ہر پیشہ میں دو نمبر بندے موجود رہتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دیہاتوں میں جب فصل گیہوں یا گنا وغیرہ پک جاتی ہے تو بٹیر پکڑنے والے کھیتوں میں جا کر ایک بہت لمبا رسا ڈال کر فصل کے بٹیروں کو ایک کونے کی طرف سے گھیر کر دوسرے کونے میں لے آتے ہیں، جہاں بٹیر باز بٹیروں کی آواز نکالتا ہے۔ کھیت میں موجود بٹیر اس بٹیر باز کی آواز سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ

ادھر کوئی بٹیر موجود ہے کیونکہ اس کی آواز اور اصل بٹیر کی آواز میں کچھ نمایاں فرق نہیں ہوتا۔ جب کھیت کے بٹیرے آگے آتے ہیں تو بٹیر باز کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عین اسی طرح جعلی پیر ایسی وضع قطع بنا لیتے ہیں کہ لوگ ان کے دھوکے میں آ کر ان سے بیعت ہو جاتے ہیں، یہ بات عام سننے میں آئی ہے کہ بڑے شہروں میں لوگ اپنے آشناؤں کو اپنے جعل پن کا اعتراف کرواتے ہیں اور ان کو بھی جعلی پیر بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل'' میں ایک باب ''پیرِ راہ دان کی پہچان'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ قارئین اس کی طرف رجوع فرمائیں۔ مولانا رومیؒ نے اس موضوع پر کافی کلام کیا ہے اور فرمایا ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ بیعت کرتے وقت اس بات کی تحقیق کر لیں کہ انہوں نے کسی جعلی پیر کے ہاتھ میں ہاتھ تو نہیں دے دیا ؎

چوں بسے ابلیس آدمؑ روئے ہست   پس بہر دستے نشاید داد دست

چونکہ بہت سے ابلیس آدمی کی صورت (رکھتے) ہیں، پس (بیعت کے لئے) ہر ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے (مبادا کوئی ابلیس ہو) مطلب یہ ہے کہ اُوپر مُرشد سے بیعت کرنے کی ترغیب دی تھی، اب اس میں پیر کو اختیار کرنے میں احتیاط کی تاکید کرتے ہیں۔ (۱/۶۲)

زانکہ صیّاد آورد بانگِ صفیر   تا فریبد مُرغ را آں مُرغ گیر

اس لئے کہ کبھی شکاری (بھی) پرندے کی سی آواز نکالا کرتا ہے، تاکہ وہ مرغ گیر کسی پرندے کو دھوکا دے کر جال میں پھنسائے۔ (۱/۶۳)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ صوفی نُما شکاریوں سے بچنا چاہیے، جن کا شیوہ بھولے بھالے لوگوں کو اپنے دامن میں پھنسانا ہے ؎

بشنود آں مرغ بانگِ جنسِ خویش   از ہَوا آید بیابد دام و نیش

(چنانچہ) وہ پرندہ جب اپنے ہم جنس کی آواز سنتا ہے تو ہوا سے اُتر آتا ہے (آخر جال کے پھندے) اور (چھری کا) زخم برداشت کرتا ہے۔ (۱/۶۳)

چونکہ شریف اور سادہ لوح افراد ان لوگوں کی میٹھی میٹھی باتوں اور سبز باغوں میں پھنس جاتے ہیں اور ان صوفی نما پیروں کے دھوکے میں آ کر نقصان اُٹھاتے ہیں۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی ست   کارِ دُوناں حیلہ و بے شرمی ست

(مگر) مردانِ حق (آفتاب ہوتے ہیں جن) کا کام روشنی (ہدایت) اور گرمی (عشق) دینا ہے (اور مکار لوگ کمینے ہیں تو کمینوں کا کام فریب و بے حیائی ہے۔ (۱/۶۳)

مولانا رومؒ سچے مرشد اور جھوٹے پیر کی شناخت کے لئے ایک طریقہ بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ جس میں عشقِ الٰہی کی گرمی پائی جاتی ہو، وہ سچا پیر ہے۔ اس طرز کے پیروں کو دیکھ کر صاحبِ بصیرت اور اہلِ علم باشعور

لوگ ان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ان کی روشنی سے لوگ ہدایت پاتے ہیں، لہٰذا ایسا مرشد متقی و صالح اور قرآن و سنت کے علوم کا واقف اور صوم و صلوٰۃ اور احکامِ شریعی کا پابند ہوگا اور کامل اولیاء اللہ سے اس کو نسبت ہوگی۔ اس کے عقیدت مند اہل محبت لوگوں کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جائے گی۔ اس لئے محبِ حق کو شیخ کی پہچان مشکل نہیں ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ جہنم میں خیمہ لگا کر بیٹھ رہنا آسان ہے، اس بات سے کہ شریعت کا ایک عمل معلوم کر کے اس پر عمل کیا جائے (کشف المحجوب)۔ اس کے برعکس پیرِ باطل، زَر طلب اور زَن طلب ہوتا ہے۔ ایسا مرشد جنت اور عیش وعشرت کی بات تو کرتا ہے مگر احکاماتِ خداوندی کی نافرمانی کرتا ہے۔

تا غلاف اندر بود باقیمت ست ۔۔۔ چوں بروں شد سوختن را آلت است

جب تک (لکڑی کی تلوار) غلاف میں چھپی ہوتی ہے، قیمتی سمجھی جاتی ہے اور جب باہر آتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ جلانے کے کام کی چیز ہے۔ (۱/۱۰۰)

آج بھی بہت سے گمراہ کُن پیر موجود ہیں

اس زمانے میں بھی ایسے لوگ راقم الحروف سے ملے ہیں جو کہتے ہیں کہ "نَعُوْذُ بِاللّٰهِ" رسول اللہ ﷺ نے بھی صرف دل کی نماز ادا کی ہے، قیام و رکوع اور سجود والی نماز کہاں اور کب ادا فرمائی ہے۔ اس شخص کو راقم الحروف نے یہ کہا کہ پھر مسجدِ نبوی ﷺ اور دیگر مسجدوں کی کیا ضرورت تھی، یہ مسجدیں کس لئے بنیں؟ رسول اللہ ﷺ نے جس طریقے سے نمازیں ادا کی ہیں، ان کا ثبوت احادیث اور کتبِ اسلامیہ سے ملتا ہے۔ تم کون ہو اور کس فرقے سے تعلق رکھتے ہو؟ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ ان بے دینوں کی راہ پر لگ جاتے ہیں، حالانکہ ان سب کے عقائد قطعاً غلط اور بے بنیاد ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام اولیائے کرامؒ جو آج تک گذر چکے ہیں، ایسا ہی کرتے مگر کسی ایک بزرگ نے بھی ان کی راہ اختیار نہیں کی۔ یہ لوگ مردود اور دین کے چور ہیں۔ کشف المحجوب میں بھی ان کے متعلق یہی کہا گیا ہے۔ ہمارے عوام میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ ان کو اگر کوئی دین میں آسانی دے دے تو فوراً اس دین کو قبول کر لیتے ہیں۔ میرے ایک بھتیجے نے جو بہت بڑا افسر ہے، مجھے کہا کہ چچا جان ایسا دین بنائیں جو ان کی مرضی کے مطابق آسان ہو۔ ان کو معلوم نہیں کہ قرآنِ کریم نے دینِ اسلام کو آسان دین کہا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی جعلی پیروں سے بیزاری

علامہ اقبالؒ نے انہی بے دینی عقائد کو دیکھ کر خانقاہی تصوّف کو بُری طرح رَد فرمایا ہے، کیونکہ ایسے عقائد خانقاہوں میں سکھائے جانے لگے تھے اور یہ سکھانے والے اپنے آپ کو پیر کہلاتے تھے۔ اپنی تصنیف **"تشکیلِ بیعت"** میں ہم نے یہ کھول کھول کر بیان کیا ہے کہ دشمنانِ اسلام (یہود اور نصاریٰ وغیرہ) نے اسلام کو مٹانے کے لئے جعلی پیروں کا ڈھونگ رچا رکھا تھا تا کہ لوگ اس قسم کی طریقت کو دیکھ کر اسلام سے متنفر ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج

لوگ بیعت کے نام سے بیزار ہیں اور لطف یہ ہے کہ کچھ ٹھیکیدارانِ اسلام نے لکھ کر یہ فتوے دے دیئے ہیں کہ جب ہدایت قرآن اور حدیث کی صورت میں موجود ہے تو پھر بیعت کی کیا ضرورت ہے۔ راقم الحروف کا ایک قریبی عزیز بھی یہی بات کہنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس کو ان خیالات سے ہٹایا گیا اور اس کے سامنے بیعت کی ضرورت پر لیکچر دیا تو مطمئن ہو گیا اور پھر اس کو اپنے پیر صاحب سے ۱۹۹۴ء میں بیعت کروا دیا گیا۔ ہمارے یہ عزیز کسی غلط بندے کے زیرِ اثر تھے اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کافروں اور عیسائیوں کو بھی ان کے نیک اعمال کا اجر ملے گا۔ کچھ بے سمجھ لوگ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ آج کے عیسائی بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُمّتی ہیں، اس لئے یہ دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ یاد رہے کہ حضور ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد ان کو نہ ماننے والے لوگ مسلمان نہیں ہیں اور جو مسلمان نہیں ان سے نیک اعمال قبول نہیں کیئے جائیں گے، البتہ ان کی نیکیوں کی وجہ سے ان کے عذابِ جہنم میں کچھ تخفیف ضرور کر دی جائے گی۔ علامہ اقبالؒ اگرچہ جعلی پیروں کے سخت خلاف تھے مگر آپ نے اصلی پیروں کا بہت احترام کیا ہے اور فرمایا ہے ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی اِرادت ہو تو دیکھ ان کو یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے ان کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ہر ذِی عقل انسان یہ سمجھتا ہے کہ ان غلط پیروں نے جو کچھ اسلام میں رَخنہ اندازیاں کی ہیں ان کی سزا جہنم کے سوا کچھ نہیں، تاوقتیکہ وہ توبہ کر کے صحیح راہ پر نہ آ جائیں مگر کچھ لوگ ابھی تک ان کی اتباع میں لگے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ایسے لوگوں کی نشاندہی درج ذیل اشعار میں فرمائی ہے اور اس نظم کا نام ہے ''پنجابی مسلمان'' ؎

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا ہو کھیل مریدی کا تو ہَرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندہ کوئی صیّاد لگا دے یہ شاخِ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد

بیعت کرنے کی یہ داستان بہت طویل ہے کہ جس کے ذریعے غیر مسلموں نے اسلام کو تباہ کرنے کی اَنتھک کوشش کی اور یہ مسئلہ آج بھی بڑی شدت سے جاری ہے۔ مسلمان جان بوجھ کر دھوکہ کھائے جا رہے ہیں، حالانکہ اقوامِ مغرب اور شیطان کے حربے اتنے واضح ہیں کہ اگر کوئی ذرا سی بھی عقل رکھتا ہو تو ان سے بچ سکتا ہے۔ ان کی غلط روش نے علامہ اقبالؒ کو بہت کچھ کہنے پر مجبور کر دیا۔ آپ کا اس سلسلے میں لکھا گیا پورا کلام تو یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا، لیکن نیچے دیئے گئے کچھ اشعار سے آپ کے دل کا حال معلوم ہوتا ہے ؎

مومن است و پیشہء او بتگری دین و عرفانش سراپا کافری

مومن ہیں مگر ان کا پیشہ بت گری ہے، ان کا دین و عرفاں سراپا کافری ہے۔

مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے　　محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق　　کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

ہماری تصنیف ''شاہیں کا جہاں اور'' میں مُلّا اور صوفی کی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

ہیں مرو تنہا، زرہبر سر مپیچ

(خبردار تنہا نہ چلنا اور راہبر سے منہ نہ موڑنا)

مولانا رومیؒ کے درج ذیل اشعار کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ آج کل کچھ سڑکیں ایسی ہیں جن پر چلنے سے انسان منزل پر پہنچ جاتا ہے مگر ایسے راستے بھی ہیں جہاں منزل کا تعین نہیں ہے۔ ان راہوں پر تنہا چلنا خطرے سے خالی نہیں ہے

آں رہے کہ بارہا تو رفتہء　　بے قلاوز اندر آں آشفتہء

دیکھو! جس راہ پر تم بارہا چل چکے ہو، بسا اوقات اس میں رہبر کے نہ ہونے سے پریشانی اُٹھا چکے ہو۔ (۱/۳۰۸)

پس رہے را کہ ندیدستی تو ہیچ　　ہیں مرو تنہا زرہبر سر مپیچ

پس جس راستہ کو تم نے کبھی بھی نہ دیکھا ہو (اس پر)، تنہا ہرگز نہ چلنا (اور اپنے) راہبر سے اِنحراف نہ کرنا۔ (۱/۳۰۸)

ہر کہ او بے مرشدے در راہ شد　　او زغولاں گمرہ و در چاہ شد

جو شخص کسی مرشد کے (توسّل) کے بغیر راہِ سلوک پر چل پڑا، وہ اکثر شیاطین (کے اغوا) سے گمراہی کے کنویں میں گرا۔ (۱/۳۰۸)

مولانا رومیؒ مزید دلائل پیش کرتے ہیں کہ ایسے لوگ جو مرشد کے بغیر راہِ طریقت کے قائل ہیں، وہ سب شیطان کے بہکاوے میں آ چکے ہیں۔ ایسے شیاطین سے ہر شخص کو محفوظ رہنے کی ضرورت ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ بغیر مرشد کے تمہیں شیطان کی گونج پریشان رکھے گی۔

گر نباشد سایہء پیر اے فضول　　بس ترا سرگشتہ دارد بانگِ غول

اے فضول آدمی! اگر تمھارے سر پر مرشد کی توجہ و تعلیم کا سایہ نہ ہو تو شیطان (کے خطرات و وساوس) کی آواز (جو تمھارے دل میں گونجتی رہے گی) تم کو بہت پریشان رکھے گی۔ (۱/۳۰۹)

غولت از رہ افگند اندر گزند　　از تو داہی تر دریں رہ بس بُدند

شیطان تم کو صراطِ مستقیم سے بہکا کر گزند (ہلاکت) میں ڈال دے گا۔ اس راستہ میں بہت سے لوگ تم سے بھی زیادہ ہوشیار گام پسپا ہو چکے ہیں (جن کو شیاطین نے گمراہ و ہلاک کیا ہے)۔ (۱/۳۰۹)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں صحیح راستے کا علم نہ ہو سکے تو جو نفس حکم دے اس کا اُلٹ کرو۔ شہنشاہ اورنگزیب کا علاج ایک ہندو نے کیا جو نفس کے کہنے کے خلاف عمل کرتا تھا۔ (چند اشعار کے بعد یہ واقعہ لکھ دیا گیا

ہے)۔ عورتوں سے معذرت کے ساتھ مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ عورتیں جو مشورہ دیں، ان سے مشورہ لے کر اس کا اُلٹ کریں۔ غالباً اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ عورتیں چونکہ جذباتی فیصلے کرتی ہیں تو جذباتی فیصلوں کی تائید کرنا مناسب نہیں ہوتا ۔

گر ندانی رہ ہر انچہ خر بخواست عکسِ آں کن خود بود آں راہِ راست

اگر تم راستہ معلوم نہ کر سکو تو (یہ تدبیر مناسب ہے کہ) جو کچھ (یہ) خر (نفس) تقاضا کرے، اس کے خلاف کرو کہ وہی سیدھا راستہ ہے۔ (۳۰۹/۱)

شَاوِرُوْهُنَّ پس آنگہ خَالِفُوْا اِنَّ مَنْ لَّمْ یَعْصِهِنَّ تَالِفُ

پہلے عورتوں سے مشورہ کرو پھر اس مشورے کے خلاف کرو کیونکہ جو شخص ان کے خلاف نہ کرے گا وہ تباہ و برباد ہوجائے گا۔ (۳۰۹/۱)

او چناں پیرست کش آغاز نیست با چناں دُرِّ یتیم انباز نیست

(یوں تو) وہ ایسا پیر ہے کہ اس کا آغاز ہی نہیں اور ایسے یکتا موتی کا کوئی ثانی نہیں۔ (۳۰۸/۱)

قرآن مجید میں ان لوگوں کا ذکر آیا ہے جو گمراہی کے راستے پر چلے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب میں مبتلا کیا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ بے راہ لوگوں سے عبرت پکڑو ۔

از نُبی بشنو ضلالِ رہرواں کہ چہ شاں کرد آں ابلیسِ بدرواں

راہ (مذہب) پر چلنے والوں کی گمراہی (کا حال) قرآن سے معلوم کرو کہ بدذات ابلیس نے ان کی کیا گت بنائی۔ (۳۰۹/۱)

صد ہزاراں سالہ رہ از جادہ دور بردشاں و کردشاں زادبارِ عُور

(شیطان نے) ان کو راہِ راست سے لاکھوں سال کی مسافت پر دُور جا ڈالا اور ان کو بدبختی کے ساتھ دولتِ ایمان سے ننگا کر دیا۔ (۳۰۹/۱)

اُستخوانہا شاں ببیں و موئے شاں عبرتے گیر و مراں خر سوئے شاں

تم ان کی ہڈیاں اور بال (وغیرہ نشاناتِ باقیات دیکھو) اور ان کے حیرت ناک انجام سے عبرت پکڑو اور گدھے (نفس) کو ان کی راہ پر نہ لے چلو۔ (۳۰۹/۱)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ'' (یعنی زمین پر چلو پھرو اور دیکھو پیغمبروں کے جھٹلانے والوں کا کیا کیا خراب انجام ہوا) (النحل:۳۶)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ نفس کا گدھا بھی انسان کو غلط راہوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کو گدھے کی طرح کان سے پکڑ کر صحیح راستے کی طرف لے جاؤ اور جو یہ کہے اس کا اُلٹ کرو تو بچ جاؤ گے۔

حکایت شہنشاہ اورنگزیب کے زمانے میں ایک ہندو تھا، جو اپنے نفس کے ہر حکم سے اُلٹ چلتا تھا اور نفس کی اس لڑائی کی وجہ سے اس میں یہ طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ جب وہ بیمار کو دیکھتا تو بیمار تندرست ہو جاتا۔ ایک بار اورنگزیب بیمار ہوا تو شاہی حکیموں سے علاج کے باوجود ٹھیک نہ ہوا۔ آخر دربار والوں نے اس ہندو کو بلایا اور علاج کے لئے کہا۔ اس کے علاج سے اورنگزیب ٹھیک ہو گیا۔ جب اورنگزیب کو یہ قصہ معلوم ہوا تو اُس نے ہندو کو بلا کر کہا کہ ہم تمہیں انعام دینا چاہتے ہیں اور سب سے بہتر انعام یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ہندو نے کہا کہ میں ہرگز یہ انعام قبول نہ کروں گا۔ اورنگزیب نے کہا دیکھو تم ہمیشہ اپنی مرضی کے خلاف عمل کرتے ہو تو اپنی مرضی کے خلاف اسلام بھی قبول کرو، چنانچہ وہ شخص مسلمان ہو گیا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کو قابو میں رکھو ؎

گردنِ خر گیر و سوئے راہ کش　　　سوئے رہباناں و رہ دانانِ خوش

(بلکہ اپنے) خر (نفس) کی گردن پکڑ کر اس کو سیدھے راستہ پر لے جاؤ، یعنی ان لوگوں کی طرف جو راہِ حق پر چلتے ہیں اور راہ سے خوب واقف ہیں۔ (۳۰۹/۱)

ہیں مہل خر را و دست از وے مدار　　　زانکہ عشق اوست سوئے سبزہ زار

خبردار! (اس) نفس کو کھلا نہ چھوڑو اور اس سے ہاتھ نہ اُٹھاؤ کیونکہ اس کا میلان لذاتِ نفسانیہ کے سبززار کی طرف ہے۔ (۳۰۹/۱)

گر یکے دم تو بہ غفلت واہلیش　　　او رود فرسنگہا سوئے حشیش

اگر تم اس کو غفلت کے ساتھ ایک لمحے کے لئے کھلا چھوڑ دو گے تو گھاس کی طرف کوسوں دُور نکل جائے گا۔ (۳۰۹/۱)

دشمنِ راہ است خر مستِ علف　　　اے بسا خر بندہ را کردہ تلف

جو گدھا گھاس (کے شوق) کا مست ہو، وہ راستہ کا دشمن ہے (اس لئے وہ اس راستے پر ٹھیک طور سے نہیں چلتا) چنانچہ بہتیرے مطیعانِ خر کو اس نے ہلاک کیا ہے۔ (۳۰۹/۱)

لیک بر شیری مکن ہم اِعتمِید　　　اندر آ در سایہء نخلِ امید

لیکن اپنی شیر مردی پر ہی اعتماد نہ کرو، بلکہ کسی کامل اکمل اطہر کی صحبت میں آؤ۔ (۳۱۰/۱)

ہر کسے گر طاعتے پیش آورند　　　بہرِ قربِ حضرتِ بیچون و چند

ہر شخص عبادت پیش کرے، بے مثال اور بے نظیر رب کے دربار کی قربت کے لیے۔ (۳۱۰/۱)

تو تقرب جو بعقل و سرِ خویش　　　نے چو ایشاں بر کمال و برِّ خویش

تو تم اپنی عقل (معرفت) اور کیفیتِ باطن (یعنی محبت) سے قُرب حاصل کرو، نہ کہ ان لوگوں کی طرح محض اپنے کمالِ (اعمال) اور نیکی پر بھروسہ کرو۔ (۳۱۰/۱)

پیر را بگزیں و عینِ راہ داں
(پیر کو پکڑو اور اس کو عینِ راہدان سمجھو)

درج ذیل اشعار میں مولانا رومیؒ پھر انہی دلائل کا اعادہ کر رہے ہیں، یعنی جو لوگ پیر کی بتائی ہوئی راہ پر نہیں چلتے وہ اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل نہیں کر سکتے ۔

بر نویس احوالِ پیرِ راہ داں   پیر را بگزین و عینِ راہ داں

مرشد واقفِ طریقت کا حال لکھو اور لوگوں کو ہدایت کرو کہ پیر کی بیعت کرو اور اس کو عین (راہِ سلوک) سمجھو۔ (۱/ ۳۰۸)

راہِ سلوک کی منازل طے کرنے میں پیر کامل کا توسّل اس قدر موثر ہے کہ گویا پیر کی معیت اختیار کر لینا ہی راستہ پا لینا ہے۔ ایک طالب تاوقتیکہ کسی پیر و مرشد کو راہبر نہ بنا لے، خواہ کتنی ہی عبادت کرے اور کتنے ہی اشغال و اعمال میں منہمک رہے، عموماً منزلِ مقصود سے دُور رہتا ہے، جیسے کہ وہ طریقت کے راستے پر آیا ہی نہیں ۔

پیر تابستان و خلقاں تیر ماہ   خلق مانندِ شب اند و پیر ماہ

کامل پیر کی مثال موسمِ گرما (یعنی ایامِ بہار کی سی ہے) اور باقی مخلوق کی مثال موسمِ خزاں کی سی ہے، مخلوق گویا (کالی) رات ہے اور پیر چاند۔ (۱/ ۳۰۸)

جس طرح موسمِ بہار، خزاں کی بربادی و بے رونقی کو سرسبزی و شادابی سے بدل دیتا ہے اور چاند رات میں تاریکی کے بعد روشنی پھیلا دیتا ہے، اسی طرح پیرِ کامل بھی لوگوں کے اخلاقی اور رُوحانی زیغ و اعوجاج (کھوٹ اور ٹیڑھا پن) کو استقامت و راستی سے بدل دیتا ہے ۔

کردہ ام بختِ جواں را نام پیر   کو زحق پیرست نہ از ایام پیر

میں بخت جوان کو پیر کہہ رہا ہوں کیونکہ وہ (پیر) حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، نہ کہ سن و سال (عمر) کے لحاظ سے۔ (۱/ ۳۰۸)

چونکہ پیر کے معنی فارسی میں بڈھے اور عمر رسیدہ کے ہیں، چنانچہ پیری اور شیخیت دونوں عموماً مشترک المعنیٰ ہیں، یعنی مشائخ طریقت اکثر عمر رسیدہ ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عمر بھر مجاہدات اور اشغال و اعمال میں مصروف رہ کر آخر عمر میں کمالِ مطلوب پر فائز ہوتے ہیں یا اگر وسط عمر میں بھی فائز بکمال ہوتے ہیں تو بھی عموماً ہر شیخِ طریقت کو پیر کہتے ہیں۔

اندر آ در سایۂ آں عاقلے
(اس عارفِ کامل کے سائے میں آ جاؤ)

یہ حقیقت بیان کرنے کے بعد کہ شیخ کامل سے انسان کو کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں

کہ ایسے عارف اور صاحبِ اوصاف پیر کے سائے میں آ جانا بہت سُودمند ہے تاکہ انسان ایسے کامل مرشد کے عطا ہونے والے فیوض و برکات سے محروم نہ رہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو ان کا قرب حاصل کرنا چاہیے اور ان کی اطاعت سے منہ نہیں پھیرنا چاہیے کیونکہ وہ انسانی زندگی کے ہر کانٹے کو پھول میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اندھوں کی آنکھوں کو نور عطا کر سکتے ہیں۔ اُن کا سایہ ہمہ گیر فوائد مرتّب کرتا ہے اور اُن کی روح نہایت بلند پرواز ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بزرگ مریدوں کی دستگیری کرتے ہیں اور طالبانِ راہِ طریقت کو اللہ کی بارگاہ میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان میں اس قدر خوبیاں موجود ہیں جو بیان میں نہیں آ سکتیں ؎

تو درآ در سایۂ آں عاقلے　　　　کش نتاند برد از راہ ناقلے

تم اس عارفِ کامل کے سائے میں آ جاؤ، جس کو راہِ راست سے پھیرنے کی روایت نہیں ملتی۔ (۳۱۰/۱)

مطلب یہ ہے کہ وہ اہلِ کمال اپنی تمکین و تحقیق کی بدولت اپنے عقائد و اعمال پر ایسے مستقیم و مستقل ہیں کہ کوئی شیطان ان کو اغوا اور گمراہ نہیں کر سکتا اور ایسی کوئی روایت نہیں مل سکتی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر اُس کے کرم سے صبر و تحمل اور استقامت سے ثابت قدم رہتے ہیں ؎

پس تقرب جو بدو سوئے اِلٰہ　　　　سر مپیچ از طاعتِ اُو ہیچ گاہ

پس اس کے وسیلے سے حق تعالیٰ کی طرف تقرب تلاش کرو، اس کی اطاعت سے کسی وقت پہلوتہی نہ کرو۔ (۳۱۰/۱)

زانکہ او ہر خار را گلشن کند　　　　دیدۂ ہر کور را روشن کند

کیونکہ وہ مشکلاتِ راہِ طریقت کے ہر کانٹے کو (کامیابی کا) باغ بنا سکتا ہے، ہر اَندھے (گمراہ کے دِل کی آنکھوں کو بصیرت و ہدایت کے نور سے) روشن کر سکتا ہے۔ (۳۱۰/۱)

ظلِ اُو اندر زمیں چوں کوہِ قاف　　　　روحِ او سیمرغ بس عالی طواف

اس کا سایہ زمین میں کوہ قاف کے سایہ کی طرح ہمہ گیری کے ساتھ پڑتا ہے، اس کی رُوح نہایت بلند چکر لگانے والا سیمرغ ہے۔ (۳۱۱/۱)

مطلب یہ ہے کہ اسی طرح اہلِ اللہ کا سایہ اہلِ جہاں پر غالب اور محیط ہے بلکہ کوہ قاف اور اس کے سایہ کا محیط عام ہونا تو ایک شاعرانہ تخیل ہے، لیکن اولیاء کا سایہ فی الواقع تمام عالم کے لئے پناہ یا حِصار اور حمایت ہے بلکہ پوری کائنات کے لیے باعثِ فخر اور باعثِ رحمت ہے۔

دستگیرد بندۂ خاصِ الٰہ

(اللہ کا بندۂ خاص دستگیری کرتا ہے)

کسی چیز کی حقیقت تو چھپی رہ سکتی ہے مگر کسی شخص کے ظاہر کا علم ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اسی طرح

پیرِ روشن ضمیر کی کیفیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اصل پیر کی باتیں اور فضائل رفتہ رفتہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ محض ظاہری صورت پر ہی فیصلہ نہیں کر لینا چاہیئے بلکہ اس کے معنی تلاش کرنا ضروری ہے کیونکہ معنی صورت کے لئے پر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک اچھے پیر کی صفات خود بخود عیاں ہو جاتی ہیں ۔

دستگیرد بندۂ خاصِ اِلٰہ طالباں را می برد تا پیشگاہ

وہ (طالبانِ رشد و ہدایت) کا دستگیر ہے، اللہ تعالیٰ کا خاص بندہ ہے جو طالبوں کو (خدا کی) درگاہ تک پہنچا سکتا ہے۔
(۳۱۱/۱)

گر بگویم تاقیامت نعتِ او ہیچ آں را غایت و مقطع مجو

اگر میں اس کی مدح وستائش کے گیت قیامت تک بھی گاتا رہوں تو اس کے اختتام اور اتمام کی کبھی اُمید نہ رکھو۔
(۳۱۱/۱)

مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسانِ کامل کے معارف و حالات برابر بدلتے رہتے ہیں اور مومن مسلمان ہر لحہ ترقی کرتا رہتا ہے اس لئے شیخ کامل کے درجات عام ولیوں سے بھی زیادہ بلند ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا پہلے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ حقیقی مرشد کی کیا صفات ہوتی ہیں۔ ایک پیر کامل میں جو باتیں پائی جاتی ہیں ان میں شریعت کی پابندی، شکل اور صورت میں اور اعمالِ فقہ میں بھی اس کا علم ہونا ضروری ہے۔ پیر کی نیّت کیا ہے؟ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیا وہ مال جمع کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟ ایک اچھے پیر کے ہر عمل سے اس کا نیک ہونا ظاہر ہو جاتا ہے، عموماً لوگ یہ باتیں نہیں دیکھتے۔ اسی طرح کسی دوست کو بیعت ہوتے ہوئے دیکھ کر دوسرے ساتھیوں کو بھی ساتھ ہی بیعت نہیں کر لینا چاہیئے، عموماً لوگ تقلید کرتے ہیں اور بغیر تفتیش کے بیعت ہو جاتے ہیں۔ ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل اور تربیت'' کے آخری حصہ میں ''مرشدِ راہداں کی تلاش'' کے عنوان سے ایک اچھے پیر کی علامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے ۔

سِرِّ پنہاں ست اندر صد غلاف ظاہرش بائُست و باطن بر خلاف

راز تو صد غلاف میں چھپا ہوا ہوتا ہے، اس کا ظاہر تیرے ساتھ ہوتا ہے اور باطن برخلاف یعنی نظر نہیں آتا۔ (۶۵/۱)

گفت، جانم از مُحبّاں دور نیست لیک بیروں آمدن دستور نیست

بولا، میری جان دوستوں سے دُور نہیں لیکن باہر نکلنے کی (خدا کی طرف سے) اجازت نہیں ہے۔ (۸۶/۱)

آنچہ با معنی ست خوش پیدا شود وآنچہ بیمعنی ست خود رُسوا شود

جو بامعنی ہے وہ اچھا ہو جاتا ہے اور جو بے معنی ہے وہ خود رُسوا ہو جاتا ہے۔ (۱۰۰/۱)

رو بمعنی کوش اَے صورت پرست زانکہ معنی بر تنِ صورت پَرست

اے صورت پرست جا، معنی کی کوشش کر، کیونکہ معنی صورت کے لئے بمنزلہ پر کے ہیں۔ (۱۰۰/۱)

اے مبارک خندہ اش کو از دہاں   می نماید دِل چو دُر از دُرجِ جاں

(اے مخاطب) اس شخص کی خندہ روئی مبارک ہے، جو ہنس مکھ صورت سے اپنا موتی کا سا دل جان کے صندوقچے سے نمایاں کر رہا ہے۔ (۱/۱۰۰)

مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا میں تم کو تم میں سے اچھے لوگوں کا پتہ نہ بتاؤں؟'' تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: ''کیوں نہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں بہت اچھے لوگ وہ ہیں کہ جب ان کا دیدار کیا جائے تو اللہ یاد آ جائے۔''

روح کو تیغِ آبدار کی طرح صفاتِ حسنہ کے ساتھ صیقل اور چمکدار بنانا مطلوب ہے۔ اس کا سامان اولیاء اللہ کے پاس ہے ان کی صحبت کو اکسیر جانو ؎

تیغ در زرّاد خانہ اولیاء ست   دیدنِ ایشاں شما را کیمیا ست

جو تلوار تجھے چاہیے، وہ اولیاء اللہ کے اسلحہ خانہ میں موجود ہے، ان (اولیاء) کی زیارت تمھارے حق میں کیمیا ہے۔ (۱/۱۰۱)

مطلب یہ ہے کہ روح کو تیغ آبدار کی طرح صفاتِ حسنہ کے ساتھ صیقل اور چمکدار بنانا مطلوب ہے تو اس کا سامان اولیاء اللہ کے پاس ہے، ان کی صحبت کو اکسیر سمجھو۔

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں   ہست دانا رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ

گر انارے میخری خنداں بخر   تا دہد خندہ زدانہ او خبر

تمام داناؤں نے بس یہی ارشاد فرمایا ہے، دانا (فی الواقع) اہلِ عالم کے لئے (بمنزلہ) رحمت ہے۔ (یہ سمجھ لو کہ) تُو انار خریدے تو کِھلا ہوا لے کیونکہ کھلنا اس کے دانے کی (شرینی کی) علامت ہے۔ (۱/۱۰۱)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح انار شیریں اپنے دانوں کو نمایاں کر دیتا ہے، اسی طرح جو بزرگ باکمال اور اللہ کے سچے بندے ہوتے ہیں ان کے باطنی کمالات اور قلبی انوار ان کے ظاہری آثار سے نمایاں ہوتے ہیں، مثلاً ان میں پیغمبری اخلاق پائے جاتے ہیں، ان کی صحبت سے دل کو سکون وطمانیت حاصل ہوتی ہے، ان کی گفتار و کردار سے اخلاص وحقانیت ٹپکتی ہے اور ان کی باتوں سے تابعین (مریدین) کے دلوں میں محبتِ الٰہی اور بے رغبتیٔ دُنیا پیدا ہوتی ہے وغیرہ، پس ایسے بزرگوں کو اپنا ہادیٔ رہنما، مقتدا اور پیشوا بنانا چاہیئے ؎

انار خنداں باغ را خنداں کند   صحبتِ مردانت از مرداں کند

تروتازہ انار (سارے) باغ کو تروتازہ بنا دیتا ہے۔ مردانِ حق کی صحبت تم کو مرد بنا دے گی۔ (۱/۱۰۱)

دامن او گیر زوتر بے گماں

(شیخ کا دامن بلا تامّل پکڑ لو)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ مرشد آسمان کی سیڑھی ہے، اگر تم رُوحانی دُنیا میں جانا چاہتے ہو تو اس سیڑھی سے

چڑھ جاؤ۔ تیر چلانے کے لئے کمان کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ مرشد کی سیڑھی بھی کمان ہی کی طرح ہے۔ خدا کا خاص بندہ یعنی مرشد خدا کا سایہ ہوتا ہے، جو اس جہان کے اعتبار سے مردہ ہوتا ہے اور خدا کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے زندہ ہوتا ہے۔ مشہور قول ہے کہ "مُوتُوا قَبلَ اَنْ تَمُوْتُوا" یعنی مرنے سے پہلے ہی مر جاؤ۔ چنانچہ مرشد اس دُنیا میں ہی مر چکا ہوتا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایسے پیر کی کمان کے بغیر تیر کیسے چل سکتا ہے ؎

از کماں تیر پرّاں از کہ گردد؟ آسماں نردبانِ پیر باشد

آسماں کی سیڑھی پیر ہے، تیر کس سے چلتا ہے؟ کمان سے۔ (۳۹۵/۶)

سایۂ یزداں بود بندہ خُدا مردہ ایں عالم و زندۂ خدا

خدا کا (خاص) بندہ (یعنی مرشدِ کامل) خدا کا سایہ ہوتا ہے، جو اس جہان (کے تعلقات) سے مُردہ اور خدا کے تعلقات سے زندہ ہوتا ہے۔ (۷۳/۱)

دامنِ او گیر زو تر بے گماں تا رہی از آفتِ آخر زماں

جلدی اور بلا تامّل اس (مرشد) کا دامن پکڑ لے، تاکہ آخری زمانے کی آفت سے نجات پا لے۔ (۷۳/۱)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں آخری زمانے سے اگر عمر کی آخری ساعت مراد ہے تو اس کی آفت سکراتِ موت اور فتنۂ ابلیس ہے، اگر قُربِ قیامت مراد ہے تو اس کی آفت دجال اور یاجوج و ماجوج ہیں اور اگر محشر مراد ہے تو اس کی آفت میزان اور حساب و کتاب ہے۔ تینوں جگہ مرشدِ کامل کا فیض مومن و مخلص مرید کی دستگیری کرے گا۔ موت کے وقت کلمہ توحید زبان پر جاری ہو جائے گا، قربِ قیامت میں دجال وغیرہ کے سامنے وہ توحید پر قائم رہے گا اور محشر میں مرشد کی شفاعت سے نجات ہو جائے گی۔ اپنے شیخ سے اعتقاد مستقل کرنا چاہیئے، ورنہ شیطان تباہ کر دیتا ہے ؎

چیست توحیدِ خدا آموختن خویشتن را پیشِ واحد سوختن

بتاؤ! توحیدِ حق عمل میں لانے کی کیا صورت ہے؟ (لو ہم سے سنو) اپنے آپ کو واحد کے آگے فنا کر دینا (توحید ہے)۔ (۳۱۵/۱)

مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان کو اپنے وجود کا احساس ہے، وہ جَمَالِ لَم یَزَلْ کی دولتِ مشاہدہ سے بہرہ ور نہیں ہوتا، یعنی حقیقی توحید کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اگر تم چاہو کہ دن کی طرح روشن ہو جاؤ تو اپنی ہستی کو جو رات کی طرح (تاریک) ہے، فنا کر دو، اپنی ہستی کو اس ہستی نواز کی ہستی میں اس طرح گُھلا دو جس طرح تانبا کیمیا میں ڈھل جاتا ہے۔

تم نے اس کا دامن مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ یہ ساری خرابی دو ہستیوں پر (نظر) کرنے سے ہے۔ مطلب یہ کہ تم جو اپنی شخصیت و ذات کے احساس اور اپنے کمالِ دعویٰ میں گرفتارِ انانیت ہو تو اسی وجہ سے لذتِ توحید کے

اصلی و حقیقی ذوق سے محروم ہو اور اس ساری خرابی کی بنیاد یہ ہے کہ تم نے خدا کی ہستی کے ساتھ اپنی بھی ہستی مان رکھی ہے، اگر خدا کی عظمت اور جلال تمہاری نظر پر غالب ہو جاتا تو تم کو اپنے وجود کا احساس اور خود بینی کا خیال ہی نہ رہتا ۔

گر ہمی خواہی کہ بفروزی چو روز ہستیِ ہمچوں شبِ خود را بسوز

اگر تو چاہتا ہے کہ دن کی طرح منور ہو جائے تو اپنی رات جیسی ہستی کو جلا ڈال۔ (۱/۳۱۵)

علامہ اقبالؒ نے بھی اس بات کو انوکھے انداز میں فرمایا ہے ۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہ وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

ہستیت در ہستِ آں ہستی نواز ہم چو مِس در کیمیا اندر گداز

وجود عطا کرنے والے کے وجود میں اپنے وجود کو تانبے کی طرح کیمیا میں پگھلا دے۔ (۱/۳۱۵)

در من و ما سخت کردستی تو دست ہست ایں جملہ خرابی از دو ہست

من و ما یعنی ''ہم اور تم'' کو تو نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے، ان وجودوں کی وجہ سے یہ ساری خرابی ہے۔ (۱/۳۱۵)

عرفا فرماتے ہیں! ''لَا تَصْحَبْ مَنْ يَقُوْلُ قَصْعَتِيْ اَوْ نَعْلِيْ '' (اس شخص کی صحبت میں مت رہو جو کہے، میرا پیالہ یا میری جوتی) کیونکہ ان الفاظ میں ''اَنا'' کی بُو موجود ہے۔ (الکواکب الدریہ للمناوی)

ہر کہ باشد شیر اسرار و امیر او بداند ہرچہ اندیشد ضمیر

جو شخص اسرار کے میدان کا شیر اور سردار ہوتا ہے (یعنی مرشدِ کامل) وہ دل کی بات تاڑ لیتا ہے۔ (۱/۳۱۷)

یہاں سے اس مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ اہل حق اپنے صفائے باطن سے دوسرے کے مافی الضمیر کو معلوم کر لیتے ہیں، لہٰذا ان کے حضور میں دل کو شکوک و وسواس اور سوءِ ظن سے پاک رکھنا چاہیے ۔

ہیں نگہدار اے دلِ اندیشہ خُو دل زاندیشہ بَدی در پیشِ او

اے دل جو وسواس کا عادی ہے، خبردار! اس کے آگے بُرا خیال کرنے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ۔ (۱/۳۱۷)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جنگل کا شیر جب کسی جانور کو بے ادبی کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی کھال کھینچ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسے بے ادب کا مر جانا ہی بہتر ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ کوئی بندہ اس کی ذات میں فنا نہیں ہوتا تو اس انسان کی ہستی کی ارتقاء کا دعویٰ فضول سمجھا جاتا ہے۔ درج ذیل اشعار شیر کی مثال دے کر لکھے گئے ہیں ۔

چوں ندیدش مغز و تدبیرش رشید درسیاست پوستش از سرکشید

شیر نے جب اس میں (قابلیت کا) مغز اور تدبیر صالح نہ پائی تو سیاست (سزا) میں اس کی کھال کھینچ لی۔ (۱/۳۱۸)

گفت چوں دید منت از خود نبرد ایں چنیں جاں را بباید زار مُرد

(اور) کہا جب میرے دیدار سے بھی تیری خودی نہ گئی تو ایسی جان کو ذلیل ہو کر مرنا چاہیے۔ (۱/۳۱۸)

ایک برتر و اعلیٰ و افضل ہستی کے سامنے اپنی ہستی کا دعویٰ کیا معنی رکھتا ہے؟ جب محبوبِ حقیقی جلوہ گر ہو تو اپنی ہستی کو فنا کر دینا چاہیئے۔

چوں نگشتی فانی اندر پیشِ من　　　　فرض آمد مر ترا گردن زدن

جب تو میرے حضور میں محو (و بے خود) نہ ہوا تو تیری گردن مارنا میرا فرض تھا۔ (۱/۳۱۸)

گرچہ غالب دارم اندر بذلِ فضل　　　　گاہ گاہے ہم کنم از عدل فضل

میں نے اگرچہ عنایت فرمائی، میں فضل و کرم کو غالب رکھتا ہوں لیکن کبھی کبھی انصاف کو بھی فضیلت دیتا ہوں۔ (۱/۳۱۹)

مطلب یہ ہے کہ میں اپنے فضل و کرم سے اکثر گنہگاروں کو بخش دیتا ہوں مگر کبھی کبھی مصلحت اس کی بھی متقاضی ہو جاتی ہے کہ عدل و انصاف کے ساتھ مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے (فقہ میں بعض اوقات قاضی کو کسی مجرم کے قتل کا اختیار دیا گیا ہے) ۔

کُلُّ شَیءٍ ہَالِکٌ جز وجہِ اُو　　　　چوں نہٖ در وجہِ اُو ہستی مجو

(اس خالقِ کائنات) کی ذات پاک کے سوا باقی ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، جب تم (فنا ہو کر) اس کی ذات میں (شامل) نہیں (ہوئے) تو ہستی کی اُمید نہ رکھو۔ (۱/۳۱۹)

مولانائے رومؒ فرماتے ہیں کہ تمام موجودات اس کی ذات پاک میں فنا و محو ہے اور ہستیٔ حقیقی سے بہرہ ور وہی ہے جو اس میں فنا ہو جائے، جس کو بقاباللہ کہتے ہیں، لیکن جو اس میں فنا نہ ہو اس کا دعویٔ ہستی فضول و لغو ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تلوار چلانے کا ڈھنگ

کشف المحجوب میں ہے کہ حضرت جنیدؒ کے پاس ایک شخص آیا جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے تھا۔ حضرت نے دریافت کیا کہ تمہارے جدِامجد دو قسم کی تلوار چلاتے تھے، ایک تو کافروں پر اور دوسری نفس کے خلاف، بتاؤ تم کون سی تلوار چلاتے ہو تو یہ سن کر وہ شخص بے ہوش ہو گیا۔ آپ نے اس شخص کو بہت سی نصیحتیں فرمائیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنا وصف اور شعار مولانا رومیؒ نے درج ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔ چند اشعار دیئے جا رہے ہیں ۔

بُخلِ من لِلّٰہ عطا لِلّٰہ و بس　　　　جملہ لِلّٰہ ام نیم من آنِ کس

(پس) میرا بُخل بھی اللہ ہی کے لئے ہے اور عطا بھی اللہ ہی کے لئے ہے، غرض میں سب کا سب اللہ ہی کے لئے ہوں اور کسی کا تابع نہیں ہوں۔ (۱/۳۸۶)

لِلّٰہ آنچہ می کنم تقلید نیست　　　　نیست تخییل و گماں، جُز دید نیست

جو کچھ میں اللہ کے لئے کرتا ہوں وہ تقلید نہیں ہے اور محض خیال وظن بھی نہیں ہے (کہ قوتِ نظریہ سے استدلال کر کے عمل کرتا ہوں) بلکہ یہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ (۱/۳۸۷)

گر ہمی پرّم ہمی بینم مطار ور ہمی گردم ہمی بینم مدار

(پس) اگر میں اُوپر اُڑتا ہوں تو مجھے پرواز کی جگہ نظر آتی ہے اور اگر کبھی ایک ہی جگہ گھومتا ہوں تو مجھے گھومنے کی جگہ نظر آتی ہے۔ (۳۸۷/۱)

حق کے ساتھ کامل ہونے کی بدولت مجھے اعلیٰ درجہ کا نورِ بصیرت حاصل ہے اور تمام حقائق مجھ پر منکشف ہوتے رہتے ہیں۔

وَر کشم بارے بدانم تا کجا ماہ ہم و خورشید پیشم پیشوا

اور اگر کبھی کوئی بوجھ اُٹھا کر چلتا ہوں تو یقیناً جانتا ہوں کہ کہاں تک (لے جانا ہوگا)، میں بمنزلہ چاند ہوں اور آفتاب (فیضِ حق) کو اپنا پیشوا دیکھتا ہوں۔ (۳۸۷/۱)

بارکشی سے اعمال و اشغال کو برداشت کرنا مراد ہے یعنی میں اپنے احوال کے تبدّل اور اعمال کے تحمّل میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ کون سا حال اور کون سا عمل مناسب ہے ؎

گر یکے را سر بِبُرد از بدن صد ہزاراں سر برآرد در زمن

اگر وہ (مرشدِ کامل لذاتِ جسمانیہ کے) ایک سر کو بدن سے کاٹ ڈالتا ہے تو اس کے عوض فوراً لذاتِ رُوحانیہ کے لاکھوں سر پیدا کر دیتا ہے۔ (۳۹۳/۱)

دانہء مردن مرا شیریں شدست بَلْ هُمْ اَحْيَاءٌ پئے من آمدست

موت کا دانہ میرے لئے شیریں بنایا گیا ہے۔ یہ دانہ شیریں حیاتِ جاوید کا ذریعہ ہے اور بَلْ هُمْ اَحْيَا (یعنی وہ زندہ جاوید ہیں، یہ وصف میرے حق میں آیا ہے)۔ (۳۸۹/۱)

پیرِ روشن ضمیر اس وقت سے ہیں، جب یہ دُنیا نہ تھی

رسول اللہ ﷺ کا پیدائش سے پہلے نبی ہونا حدیثِ جابرؓ سے ثابت ہے، رُوحوں کا دُنیا سے پہلے موجود ہونے کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ پیدائش سے پہلے بھی رسول ﷺ نبوت پر فائض تھے، اسی لئے اولیاء کا پیدائش سے پہلے ولی ہونا کوئی بہت بڑی بات نہیں۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ پیرِ روشن ضمیر اس وقت سے ہیں، جب یہ دُنیا قائم نہ تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اب لوگوں نے ان کو پیر بنا دیا ہے بلکہ یہ اس وقت سے چلے آ رہے ہیں جب یہ عالم نہ تھا اور ان کی اَرواح دریائے معرفت میں غرق تھیں۔ اقلیمِ طریقت کے لاکھوں بڑے بڑے پیر ہیں جو اُس عالمِ بالا میں ہی منصبِ ولایت پر سرفراز تھے۔ ان کے نام رشکِ حق کی وجہ سے مخفی رہے ہیں۔ کوئی درویش اور کوئی اہلِ اللہ بھی ان کے ناموں کو ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اِنَّ اَوْلِيَائِىْ تَحْتَ قَبَائِىْ لَا يَعْرِفُوْنَهُمْ غَيْرِىْ'' ترجمہ: بے شک میرے اولیاء میری قبا کے نیچے ہیں، انہیں میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔)

اس موضوع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آج بھی اولیائے کرامؒ کے اسمائے مبارک کو لوگوں سے چھپائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک الگ مضمون ہماری تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں بھی دیا گیا ہے۔ یہ چھپانا اس لیے ہے کہ ولایت کی شرط ہی کتمان (چھپائے جانے) پر رکھی گئی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوباتِ شریف میں مکتوب نمبر ۱۲۳ (دفتر سوئم، حصہ دوئم) میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی پیدائش سے پہلے ہی اس رُتبے پر فائز تھے، جو وہ دُنیا میں رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فیض جو رُوحانی دُنیا میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس کی ابتدا رسول اللہ ﷺ سے ہوتی ہے اور قربِ ولایت کے بزرگوں کے منبعِ فیض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے دونوں قدم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک سر (کندھوں) پر ہیں اور حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرات حسنینؓ اس مقام میں ان کے شریک ہیں۔ حضرت مجدّد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جس کو بھی فیض و ہدایت راہِ قرب سے پہنچی، حضرت علی کرم اللہ وجھہ کے ذریعہ سے پہنچی کیونکہ وہ اس راہ کے آخری نقطہ کے نزدیک ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور ختم ہوا تو یہ عظیم منصب ترتیب وار حضرات حسنینؓ کے سپرد ہوا اور ان کے بعد یہی منصب آئمہ اثنا عشرۃ میں سے ہر ایک کو ترتیب وار ملا۔ جس کو بھی فیض ملا، ان کے ذریعے ملا، یہاں تک کہ نوبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچی۔ ان کے بعد مجدّدِ وقت تک یہ منصب پہنچتا ہے، جیسے چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ (''اَلْقَمَرُ مُسْتَفِیْضٌ مِنَ الشَّمْسِ'' یعنی چاند سورج سے مستفید ہوتا ہے)۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا یہ قول بالتفصیل ہماری تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں دے دیا گیا ہے، جس میں رُوحانی فیضان کے دو راستوں کا ذکر آتا ہے۔ یہ کتاب جلد ہی زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے والی ہے۔ ان دو طریقوں میں پہلا راستہ اللہ سے براہِ راست فیض حاصل کرنے سے متعلق ہے، جس میں انبیاء کرامؑ اور ان کے طفیل سے ان کے چند ایک اصحاب شامل ہوتے ہیں اور دوسرا راستہ اولیائے کرامؒ کی راہ کے ذریعہ باقاعدہ بیعت کرنے سے منسلک ہے، جس میں شیخ کا واسطہ موجود ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس بات پر بھی گفتگو کی ہے کہ چند ارواح ایسی بھی ہیں جنہوں نے اپنی پیدائش سے پہلے ہی کچھ کام انجام دیئے ہیں۔ مثلاً حضرت بابا آبریزؒ کا قول ہے کہ جب آدم علیہ السلام کے جسدِ خاکی کے لئے مٹی گوندھی جا رہی تھی تو اس میں پانی ڈالنے کا کام انہی کے سپرد کیا گیا تھا۔ حضرت امام غزالیؒ کی پیدائش سے قبل ان کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوئی۔ ان کی یہ گفتگو رسول اللہ ﷺ کی معراج سے واپسی پر چھٹے آسمان پر رسول اکرم ﷺ کی موجودگی میں ہوئی (جواہر البحار)۔ اس ملاقات میں ایک حدیث پر گفتگو ہوئی جس میں حضور ﷺ کی اُمت کے بعض ولیوں کا درجہ بنی اسرائیل کے نبیوں کے ہم پلہ ہونے کا ذکر ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مثل ہیں۔'' اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں، جس میں اپنی پیدائش سے پہلے کچھ اولیائے کرامؒ کے افعال کا ذکر ہے۔ ان روایات سے معلوم

ہوتا ہے کہ اولیائے کرامؒ کا وجود اس دُنیا میں آنے سے پہلے ہی موجود تھا۔ ارواح کا پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا بھی روایات میں آیا ہے (مکتوباتِ ربانی)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی اس پر گواہ ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔ "کُنتُ نَبِیًّا وَّآدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" (ترمذی شریف) مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

پیر ایشانند کایں عالم نبود — جانِ ایشاں بود در دریائے خود

یہ اس وقت سے پیر (روشن ضمیر چلے آتے) ہیں جب کہ یہ عالم نہ تھا، (اور) ان کی روح دریائے معرفت میں (غرق) تھی۔ (۲/۹۸)

صد ہزاراں پادشاہانِ مہاں — سرفرازانند زاں سوئے جہاں

لاکھوں بڑے بڑے شاہِ طریقت بھی ہیں کہ جو اس عالم کی جانب سے سرفراز ہیں۔ (۲/۹۸)

نام شاں از رشکِ حق پنہاں بماند — ہر گدائے نامِ شاں را بر نخواند

ان کا نام رشکِ حق کی وجہ سے مخفی رہا ہے، کوئی درویش اہلِ اللہ بھی ان کا نام ظاہر (کرنے کی جرأت) نہیں کرسکتا۔ (۲/۹۸)

حقِ آں نور و حقِ نورانیاں — کاندراں بحر اند، ہمچو ماہیاں

قسم ہے اس نور کی اور قسم ہے ان نورانی بزرگوں کی، جو اس بحر (نور) کی گویا مچھلیاں ہیں۔ (۲/۹۹)

مثنوی میں مولاناؒ اس سلسلے میں بہت سے رموز کو آشکار کرتے ہیں۔ (اس کے لئے مثنوی سے رجوع کریں)۔

یا بگلبن وصل کن ایں خاررا — وصل کن با نار نورِ یار را

یا اپنے اس خار (وجود) کو (باغِ عرفان کے) بوٹے (یعنی شیخِ کامل) سے ملا لو، (اور اپنی) آتش (وجود) کے نور کو یار سے ملا لو۔ (۲/۱۲۷)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ پیر پیدائش سے پہلے باخبر تھے۔ ان کا اس دُنیا میں آکر تمہاری ہر بات سے خبردار ہونا اور اینٹ میں بھی حقائقِ خفیہ کو دیکھ لینا اس طرح ہے، جس طرح تم آئینے میں دیکھ لیتے ہو۔

آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں — پیر اندر خشت بیند پیش ازاں

جو کچھ تم آئینے میں (اس کے صیقل ہونے کے بعد) نمایاں دیکھتے ہو، پیر اس کو اینٹ میں (یا لوہے کی صیقل شدہ پلیٹ میں) اس سے پہلے (کہ وہ صیقل ہو یا اس سے پہلے کہ تم دیکھو) دیکھ لیتا ہے۔ (۲/۳۰)

شیخ نورانی زراہ آگہ کند

(شیخ نورانی راہ سے آگاہ کرتا ہے)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ کامل شیخ مریدوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والی راہ سے آگاہ کرتا ہے اور مریدوں

کے سوالات کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ جواب کے الفاظ میں اپنی رُوحانیت کا نور بھی شامل کر دیتا ہے، جس سے نہ صرف یہ کہ مرید کے دل کو تسلی ہو جاتی ہے اور مرید کی رُوحانی کیفیت میں تبدیلی آ جاتی ہے بلکہ اس کو ایسی نئی نئی باتیں بتلاتا ہے کہ اس کی رُوح کا بیدار ہو جانا ممکن ہو جاتا ہے اور مرید رُوح کی تازگی حاصل کرتا ہے۔ شیخ کے الفاظ میں جو نور پایا جاتا ہے وہ اور لوگوں کی باتوں میں ہرگز نہیں مل سکتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب ایسا موقع شیخ فراہم کر دے تو پھر تم بھی کوشش کرو کہ اس کی باتوں کو دل میں جگہ دو کہ ایسی کیفیت کے ملتے ہی تمہیں بھی ایسی گویائی حاصل ہو جائے اور تم دوسرے لوگوں پر اثرانداز ہو کر ان کی اِصلاح کے قابل ہو جاؤ۔ جو چیز دوشاب میں انگور یا چھوہارے کے رس میں جوشائی جائے اس میں دوشاب کا رنگ محسوس ہوتا ہے۔ اُونچی جگہ سے اچھے اثرات ہی مرتّب ہوتے ہیں۔ آسمان سے بارش اور نور کی بارش ہوتی ہے، نہ کہ مٹی کی۔ گندا پانی جو پرنالے سے آتا ہے وہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ شیخ کی باتوں سے اپنے دل کو مزین کرو تاکہ تم ہر شیخ سے اسرارِ قلبی اور رُوحانیت حاصل کر سکو۔ مولاناؒ ایک حدیث کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ شیخ اپنے وقت میں نبی کا ہم نشیں ہوتا ہے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ سے نبوت کا نور حاصل کیا ہوتا ہے اور وہ صاحبِ حکمت اور باخبر ہوتا ہے جیسا کہ ''منہج القویٰ'' اور ''لطائف القویٰ'' ص ۱۳۰ میں دیا گیا ہے کہ ''اَلشَّيْخُ فِيْ قَوْمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِيْ اُمَّتِهٖ'' (ایک کامل آدمی کا وجود اس طرح ہوتا ہے، جیسے نبی اپنی اُمت میں ہوتا ہے)۔ یہاں مولاناؒ کے کچھ اور اشعار یاد آتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ شیخ رفتہ پیش　　　چوں نبی باشد میانِ قومِ خویش

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ شیخ پیشرو اپنی امت کے اندر مثل نبی کے ہوتا ہے۔ (۳/۱۷۸)

شیخ نورانی زراہ آگہ کند　　　باسخن ہم نور را ہمراہ کند

(انوارِ کمال سے) نورانی (بن جانے والا) شیخ (ہی) راہ (وصول) سے آگاہ کرتا ہے، وہ اپنے جواب کے الفاظ میں (سوال کرنے والے کے لیے) نور کو شامل کر دیتا ہے۔ (۵/۲۵۳)

جہد کن تا مست و نورانی شوی　　　تا حدیثت را شود نورش روی

کوشش کرو کہ تم (شیخ) نورانی کے (شوق) میں مست ہو جاؤ تاکہ تمہاری تقریر کے ساتھ اس کا نور جاری ہو جائے۔ (۵/۲۵۳)

از جزر، وز سیب، و بہ وزگردگاں　　　لذتِ دوشاب یابی تو ازاں

گاجر اور سیب اور بہی اور اخروٹ میں سے، (جو چیز دوشاب یعنی انگور کے رس میں جوشائی گئی ہو) اس سے تم دوشاب کی لذت پاؤ گے۔ (۵/۲۵۴)

ہرچہ گوئی باشد آنہم نور پاک　　　کاسماں ہرگز نبارد غیرِ پاک

(پھر) جو کچھ کہو گے وہ بھی نور پاک ہوگا، کیونکہ (تمھاری طبیعت میں بلندی پیدا ہو جائے گی) اور بلند آسمان نور

برساتا ہے۔ (۲۵۴/۵)

آسماں شو، ابر شو، باراں ببار ناوداں بارش کند، نبود بکار

پس تم بلندیٔ طبع اور فیض رسانی میں آسمان بن جاؤ، بادل بن جاؤ، مینہ برساؤ (مینہ بھی وہ جو پاک اور طاہر ہو) ورنہ پرنالہ بھی تو پانی برساتا ہے اور وہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ (۲۵۴/۵)

چوں بدادی دستِ خود دردستِ پیر پیر حکمت کو حکیم ست و خبیر

جب تم اپنا ہاتھ (مرشد) کامل کے ہاتھ میں دے دو گے تو (دیکھ لو گے کہ) وہ پیر حکمت و دانائی کا (معلم) ہے کیونکہ وہ صاحبِ حکمت ہے اور باخبر ہے۔ (۸۳/۵)

پس مصفا کن درونِ خویش را تا بدانی سرّ ہر درویش را

پس تم اپنے باطن کو صاف کرو، تاکہ ہر درویش کے رازِ دل کو معلوم کرسکو۔ (۲۸۶/۵)

کو نبیٔ وقتِ خویش ست اے مرید زاں کہ زو نورِ نبی آمد پدید

کیونکہ اے مرید وہ (مرشدِ کامل) اپنے عہد کا نبی ہے، اس لئے کہ اس سے صاف طور پر نبی کا نور ظاہر ہوتا ہے۔ (۸۳/۵)

مردہ پیشِ اُو کشی زندہ شود چرک در پالیز رویندہ شود

اے منکر یا مریدِ بے اخلاص! اگر اپنا مال جو مثل مردہ ہے، اخلاص کے ساتھ اس کے حضور میں پیش کردو گے تو وہ زندہ ہوجائے گا، جس طرح گندگی باغ کے اندر کھاد کی صورت میں پڑ کر سبزہ اُگاتی ہے۔ (۲۳۹/۵)

فقر خواہی آں بہ صحبت قائم است
(طریقت چاہتے ہو تو وہ صحبت سے آتی ہے)

علم کا تعلق اقوال اور کتابی باتوں سے ہے مگر طریقت اور فقر کا تعلق صحبت سے ہے۔ دانش ایک رُوحانی چیز ہے جو مرشد کی رُوح سے مرید کی رُوح کو ملتی ہے۔ صنعت و حرفت کا سیکھنا فعلی یعنی عملی کام کرنے سے آتا ہے۔

علم آموزی طریقش قولی است حرفت آموزی طریقش فعلی است

اگر تم علم سیکھو تو اس کا طریقہ زبانی تقریر کا ہے، جو اُستاد سے سُن کر سمجھا اور یاد کیا جاتا ہے۔ اگر تم کوئی حرفت کا پیشہ سیکھو تو اس کا طریقہ عملی ہے کیونکہ وہ تکرارِ عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ (۱۱۲/۵)

فقر خواہی آن بصحبت قائم است نے زبانت کار می آید نہ دست

اگر تم درویشی سیکھنا چاہو تو وہ شیخ کی صحبت پر موقوف ہے، یہاں نہ زبان کام آتی ہے نہ ہاتھ یعنی یہاں قولی و فعلی دونوں قسم کی تعلیم بے کار ہے۔ (۱۱۲/۵)

دانشِ آں را ستاند جاں زجاں نے زراہِ دفتر و نے از زباں

اس مشرب کے علم کو مرید کی روح مرشد کی روح سے سینہ بہ سینہ حاصل کرتی ہے، وہ کتاب اور زبان سے حاصل

نہیں ہوتا۔ (۵/۱۱۳)

دانش انوار ست در جانِ رجال ٭ نے ز راہِ دفتر و نے قیل و قال

فقر و سلوک کی دانش (ایک قسم کے) انوار ہیں، (جو) مردانِ حق کی صحبت سے حاصل ہوتے ہیں، یہ باتوں اور تقریروں سے حاصل نہیں ہوسکتے۔ (۵/۱۱۳)

دست را مسپار جز در دستِ پیر
(پیرِ کامل کے سوا کسی کو اپنا ہاتھ نہ دو)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کے ایسے پیرِ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دو جس کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ فرمایا ہے۔ اس میں اس حدیثِ قدسی کا حوالہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بندہ جب فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کی کثرت سے میرا قُرب حاصل کر لے تو میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کام کرتا ہے، اس کے پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے وغیرہ (یہ حدیث طویل ہے) جب کوئی شخص ایسے پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے تو اللہ تعالیٰ نے اسے حفاظت کی ضمانت دی ہے تو پھر تم شیاطین کے پھندوں سے باہر آجاؤ گے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ انسان کی عقل نے بچوں کی طرح کی عادتیں اختیار کر رکھی ہوتی ہیں، جو پیر کی رہنمائی سے ٹھیک ہوسکتی ہیں ۔

ہین گریز از جوقِ اکّالِ غلیظ ٭ سوئے او کہ گفت ہستیمت حفیظ

خبردار! زیادہ کھانے والوں سے بھاگو، اس کی طرف آؤ کہ جس نے کہہ دیا ہے کہ ہم تمہاری حفاظت کرنے والے ہیں۔ (۵/۸۲)

یا بسوئے آنکہ او ایں حفظ یافت ٭ گر نتانی سوئے آں حافظ شتافت

یا اس (مردِ کامل) کی طرف (رجوع کرو) جس نے (خدا کی عنایت سے) یہ (قوت) حفاظت حاصل کر لی ہے، اگر تم اس حافظِ (حقیقی) کی طرف نہیں جا سکتے تو اس بزرگ کا وسیلہ ہی غنیمت سمجھو۔ (۵/۸۲)

دست را مسپار جز در دستِ پیر ٭ حق شد است آں دست او را دستگیر

اس شعر کی ترکیب دو طرح ہوسکتی ہے۔

۱۔ اپنا ہاتھ پیرِ کامل کے سوا ور کسی کے ہاتھ میں نہ دو، کیونکہ پیر کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔

۲۔ اپنے ہاتھ کو کسی کامل پیر کے ہاتھ کے سوا کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ دو، کیونکہ پیر کے ہاتھ کا خدا دستگیر ہے۔ (۵/۸۳)

پیرِ عقلت کودکی خو کردہ است ٭ از جوارِ نفس کاندر پردہ است

تمہاری عقل کے پیر نے بچگانہ عادت ڈال رکھی ہے، اس نفس کے پڑوس کی وجہ سے جو پردے میں ہے۔ (۵/۸۳)

عقل کامل را قریں کن با خرد تا کہ باز آید خرد زاں خوئے بد

عقلِ کامل کو اپنی عقل کا ساتھی بنا لے تاکہ عقل اپنی بُری عادت سے باز آ جائے۔ (۱/۸۳)

مطلب یہ ہے کہ مرشدِ کامل کی عقل کو (اپنی) عقل کے ساتھ شامل کر لو، تاکہ (تمہاری) عقل اس بچپن کی خوئے بد سے باز آ ئے۔ اپنی عقل کی رہنمائی پر بھروسہ نہ کرو بلکہ کسی بزرگ سے بیعت کر کے راہِ ہدایت حاصل کرو۔

دست تو از اہلِ آں بیعتِ شود کہ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ بود

(پھر) تمہارا ہاتھ ان بیعت (رضوان) کرنے والوں میں سے ہو جائے گا جن کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہونا کہا گیا ہے۔ (۱/۸۳)

چوں کہ دستِ خود بدستِ او دہی پس زدستِ آکلاں بیروں جہی

جب تم اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ (بیعت کے لئے) دے دو گے، (اور اس کی ہدایات پر عمل بھی کرو گے) تو پھر تم (شیطان، نفس امارہ اور وساوس و خواطر وغیرہ کے) درندوں سے صاف بچ جاؤ گے۔ (۱/۸۳)

بر درِ حق کوفتن حلقہ وجود

(نماز اللہ کے دروازے پر مراد مندی کی کنڈی کھٹکھٹانا ہے)

فرماتے ہیں کہ سجدے اور رکوع میں بار بار جانے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے دروازے پر کُنڈی کھٹکھٹاتا ہے اور آخر نماز اس کے لئے اقبال مندی کا سر نکالتی ہے، اس لئے کُنڈی کھٹکھٹاتے ہی رہنا چاہیے، جو کوئی شخص ایسا کرتا رہے گا وہ بزرگی کو پہنچ جائے گا، اس لئے کھانے پینے میں اِسراف سے منع کیا گیا ہے مگر محنت، عبادت اور عاجزی کے لئے ممانعت نہیں کیونکہ خیر کی باتوں میں اِسراف ہوتا ہی نہیں ہے۔

گفت پیغمبر رکوع ست و سجود بر درِ حق کوفتن حلقہ وجود

پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ رکوع و سجود کرنا حق تعالیٰ کے دروازے پر مُراد مندی کی کُنڈی کھٹکھٹانا ہے۔ (۵/۲۰۹)

حلقۂ آں در ہر آنکو می زند بہر او دولت سرے بیروں کند

جو شخص اس دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹاتا ہے، اس کے لئے دولت یعنی اقبال مندی سر نکالتی ہے۔ (۵/۲۰۹)

کار میکن گوش ماں از بہرِ آب اندک اندک دور کن خاک و تراب

کام کیے جاؤ، کوشش کرتے رہو، پانی کے لئے کان لگائے رہو اور زمین کی تھوڑی تھوڑی مٹی دُور کرو (تاکہ اندر سے پانی نکل آئے۔ (۵/۲۰۹)

ہر کہ رنجے دید گنجے شد پدید ہر کہ جدّے کرد در جدّے رسید

جس شخص نے سچی محنت سے تکلیف اُٹھائی اس کے لئے خزانہ ظاہر ہوگیا، جس شخص نے کوشش کی وہ بزرگی کو پہنچ گیا۔ (۵/۲۰۹)

نان خورے را گفت حق لَاتُسْرِفُوْا نور خوردن را نگفت ست اِکتَفُوا

روٹی کھانے والے کو تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِسراف نہ کرو، مگر نور (کی غذا) کھانے کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ بس کرو۔ (۵/۲۷۵)

مراد یہ ہے کہ اِسراف میں خیر نہیں ہوتی اور خیر میں تو کوئی اِسراف ہی نہیں۔

رستمی گر بایدت خنجر بگیر
(اگر رستم بننا چاہتے ہو تو خنجر پکڑ لو)

جو لوگ بُلندیوں پر جانا چاہتے ہیں ان کو نیکی کے کاموں کی طرف آنا چاہئے۔ خنجر وہ لوگ پکڑتے ہیں جو رستم بننا چاہیں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر وہ چادر اوڑھ کر ذلت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر عادت نیکی کی طرف مائل نہیں تو سلوک والی زندگی کی رفتہ رفتہ عادت ڈالو کیونکہ عادت کو جس طرح بنانا چاہو بن جاتی ہے ؎

رستمی گر بایدت خنجر بگیر ور بحیزی مائلی چادر بگیر

اگر تجھ کو رستم بننے کی آرزو ہے تو خنجر پکڑ لے اور اگر تو ہیجڑا بننے کی طرف مائل ہے تو چادر اوڑھ لے۔ (۵/۲۵۷)

یکدو گامے رو تکلف ساز خوش تا ترا عشقش کشد اندر برش

(راہِ سلوک کی محرومی پر) ایک دو قدم چلو (اگر با آسانی نہیں چل سکتے تو) خوب تکلف سے کام لو تاکہ رفتہ رفتہ بخوبی چلنے لگو اور اس کا عشق تم کو اپنی گود میں لے لے۔ (۵/۲۵۷)

تاکے از جامہ زناں ہمچوں زناں در صفِ مرداں درآ ہمچوں سناں

کب تک عورتوں کی طرح پہننے اور کھانے سے (تعلق رکھو گے) نیزہ کی ساتھ (اب) مردوں کی صف میں بھی آؤ۔ (۵/۲۵۷)

مُطرب آں خانقاہ گو تاکہ تفت دف زند کہ خر برفت و خر برفت

اس خانقاہ کا مطرب کہاں ہے (جس کے صوفیوں نے ایک مسافر صوفی کا گدھا بیچ کھایا تھا) تاکہ وہ سرگرمی کے ساتھ دف بجا بجا کر گائے کہ "گدھا گیا گدھا گیا۔" (۵/۲۵۷)

مولاناؒ نے ایک صوفی کا قصہ بیان کیا ہے کہ جس نے اپنے گدھے کو ایک خانقاہ میں رات بسر کرنے کے لئے باندھ دیا تھا، خانقاہ کے ایک صوفی نے اس گدھے کو بازار لے جا کر فروخت کر دیا اور خوب کھانا کھایا اور پھر قوالی منعقد کروائی۔ قوال نے ازراہِ مذاق یہ مصرعہ کہا "خر برفت و خر برفت" صوفی کے نوکر کو جب گدھے کے چوری ہونے کا علم ہوا تو اس نے قوالی کی مجلس میں آ کر اپنے مالک کے سامنے شور کیا کہ "خر برفت"۔ اس وقت صوفی جو گدھے کا مالک تھا، وہ بھی قوال کے ساتھ گا رہا تھا کہ "خر برفت، خر برفت" نوکر نے سمجھا کہ گدھے والے کو معلوم

ہے کہ گدھا چلا گیا ہے، چنانچہ وہ خاموش ہو گیا۔ قوالی ختم ہو گئی، سب صوفی چلے گئے تو اس کے بعد صوفی کو علم ہوا کہ اس کا گدھا چوری ہو گیا ہے مگر اس وقت جب سب جا چکے تھے، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مولاناؒ کہتے ہیں کہ صوفی قوالوں کی تقلید میں کہتا رہا کہ "خر برفت، خر برفت" اس طرح وہ بیچارا مارا گیا۔ فرماتے ہیں کہ نفس اور شیطان کی تقلید سے بچو، ورنہ تم بھی نقصان اُٹھاؤ گے۔

زندگی انسان کے اعمال سے متاثر ہوتی ہے

اس سے پہلے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ پیرِ راہدان کی کیا صفات ہیں اور وہ مریدوں کے مصائب کو کس طرح دفع کرتا ہے، قارئین کے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ مصائب کس طرح نازل ہوتے ہیں اور ان کا رُوحانی علاج کیا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں بہت سے مشکل مقامات آتے ہیں، ان میں سے کچھ تو دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ رُوحانی دُنیا میں نمودار ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ دُنیاوی مصائب اور مشکلات کے لئے سرگرداں رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے دُنیاوی مصائب دفع ہو جائیں۔ ان مصائب کو دفع کرنے کے لئے لوگ صبح سے شام تک سرتوڑ کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں مگر اس کے برعکس رُوحانی طور پر ان پریشانیوں کے دُور کرنے کے لئے کوئی شخص (اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ) پریشان نظر نہیں آتا کیونکہ رُوحانی پریشانیوں کے علاج کو وہ ضروری خیال نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رُوحانی معاملات انسان کی توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ لوگ یہ محسوس نہیں کرتے کہ رُوحانی بیماریوں کو دُور کرنا بھی انسان کی دُنیاوی اور اُخروی بیماریوں کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ کوئی بیماری جو انسان کو لاحق ہوتی ہے اس کا حملہ پہلے رُوح پر ہوتا ہے اور پھر اس کے کچھ دیر بعد جسم بھی متاثر ہو جاتا ہے یعنی رُوح کے بعد بیماری جسم پر بھی حملہ کر دیتی ہے۔ کچھ رُوحانی بیماریاں انسانی اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں اور یہ اخلاقی بیماریاں ان کو جہنم میں لے جاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دُنیاوی بیماریاں اور اُخروی بیماریاں سب رُوح کے ذریعے انسانوں پر نازل ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان دُنیا اور آخرت میں پریشانیوں سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ نیکیوں اور فیضانِ الٰہی کا اثر بھی انسانی زندگی پر رُوح کے ذریعے سے ہوتا ہے، حتیٰ کہ جو فیضان اور رحمتوں کا نزول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے وہ بھی رُوح کے ذریعے سے انسانوں پر ہوتا ہے اور پھر جسموں پر اثرانداز ہوتا ہے۔

مصائب کے نازل ہونے کی اصل وجوہات انسان کے اعمال کی نوعیت پر انحصار کرتی ہیں۔ اگر عمل اچھے ہیں تو اس سے بُرے اثرات مرتّب نہیں ہوتے اور اگر کچھ مصائب اس کے باوجود نازل ہوں تو ان کا نازل ہونا انسان کے درجات کو بلند کر دیتا ہے۔ عام تکالیف بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ (اس فلسفہ کی شرح بہت طویل ہے)۔ ہماری تصنیف **"اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ"** کے ایک باب میں اِن شاء اللہ بداعمالیوں کے نازل ہونے کی وجوہات اور ان کو دفع کرنے کے ذرائع بیان کیے جائیں گے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ. (الروم:۴۱) سمندروں اور خشکیوں میں (جو) فساد ظاہر ہوتا ہے (وہ) انسانوں کے کرتوتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مذکورہ آیت کے برعکس قرآن اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا فائدہ بھی تم ہی کو ہوگا۔ (دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ۷)

اسرافیلِ وقت اند ایں اولیاء

(اولیاء اللہ اپنے وقت کے اسرافیل ہیں)

آج وہ زمانہ ہے کہ ہر طرف گمراہی کا دَور دَورہ ہے اور اگر قدرے نیکی کے آثار نظر آتے ہیں تو یہ سب اولیائے کرامؒ کے قدموں کی برکت سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اس کام کے لئے پیغمبروں کو ارسال کیا اور ان کے بعد یہ کام اولیائے کرامؒ کے سپرد کیا گیا۔ وہ لوگوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کر جہنم کی آگ سے نکال کر جنت کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسی ایسی مثالیں آئی ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولیائے کرامؒ بندوں کو عصیاں کی زندگی سے نکال کر ایک نئی زندگی عطا کر دیتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ذہن میں شرقپور شریف کے واقعات میں سے چند واقعات ذہن میں آ رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔ دیگر بزرگوں کے متعلق بھی ایسی بہت سی روایات کتابوں میں ملتی ہیں۔

پہلا واقعہ: پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے زمانے میں ایک انگریز نُما مسلمان جو سگریٹ کا ایجنٹ تھا، میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے دربار میں آیا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو اس شخص نے نئی قسم کے سگریٹ آپ کے آگے پیش کئے اور کہا کہ آپ بھی یہ سگریٹ پئیں اور لوگوں کو بھی پینے کے لئے کہا کریں۔ حضرت میاں صاحبؒ نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا، جس سے اس کی ہیٹ اور سگریٹ دُور جا گرے۔ وہ شخص اُٹھ کر چلا گیا اور پھر تین سال کے بعد آیا تو اس نے سادہ اسلامی لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے منہ پر لمبی داڑھی تھی۔ جب آپ (میاں صاحبؒ) نے دریافت فرمایا کہ یہ کون صاحب ہیں تو اس نے اپنا سگریٹ والا واقعہ سنایا اور عرض کیا: "پہلے آپ نے مجھے ایک تھپڑ مارا تھا تو میری زندگی بدل گئی اب ایک اور تھپڑ دوسری طرف بھی ماریں تاکہ میری آخرت بھی سنور جائے۔"

دوسرا واقعہ: اسلامیہ کالج لاہور کے ایک پروفیسر صاحب جو دہریہ تھے، ان کو میرے ایک دوست صوفی برکت علی افسر ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ لاہور نے کہا کہ آج اتوار ہے، چلو! آپ کو شرقپور شریف میں حضرت میاں شیر محمدؒ جو ایک بہت بڑے بزرگ ہیں، سے ملائیں۔ اس نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تو ایسے ہر شخص کو، حتیٰ کہ اسلام کو بھی نہیں مانتا (ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں جو مسلمان کے گھر پیدا ہوئے اور خدا کو نہیں مانتے) کہنے لگے کہ زیارت کو میں مانتا نہیں مگر ہاں چلو تمہارے ساتھ گاؤں کی زندگی کا کچھ لطف ہی اُٹھانے کے لیے چلے جائیں گے۔

وہاں پہنچے تو میاں صاحبؒ سے ان کی کوئی بات نہ ہوئی۔ فقط میاں صاحبؒ کے کمرے میں بیٹھے رہے لیکن کچھ دیر بعد عصر کی نماز پڑھی جانے لگی تو وہ بھی شرم کے مارے نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ جب شرقپور شریف سے واپسی پر بس میں بیٹھے تو مغرب کی نماز سے پہلے پروفیسر صاحب بس کے ڈرائیور کو کہنے لگے کہ یہاں کوئی مناسب جگہ ملے تو بس کو روک لینا اور جب تک سب لوگ نماز پڑھ نہ لیں، اس وقت تک بس آگے نہیں چلے گی۔

تیسرا واقعہ: تیسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دہریہ علامہ اقبالؒ سے خدا کے نہ ہونے پر تین دن تک بحث کرتا رہا تو آخر علامہ اقبالؒ نے اسے کہا کہ چلو تمہیں ایک مردِ قلندر سے ملائیں، وہ تمہیں شاید خدا کے بارے میں کوئی ثبوت دیں۔ چنانچہ جب میاں صاحبؒ کے آستانے میں داخل ہوئے تو میاں صاحبؒ نے بغیر کسی گفتگو کے اس فلسفی دہریہ کی کمر پر ہاتھ مارا اور کہا: ''کیوں بھئی بیلیا رب ہیگا کہ نہیں'' وہ دہریہ بے ساختہ بول اُٹھا کہ ''ہاں جی میں مانتا ہوں کہ خدا ہے۔'' کہتے ہیں کہ اس پر علامہ اقبالؒ نے یہ شعر کہا ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

میاں صاحبؒ کے اور بہت سے واقعات مطالعہ میں آئے ہیں، جن کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں۔ مولانا رومؒ نے کئی ایسے واقعات کی تحقیق کے بعد فرمایا ہے ؎

ہیں کہ اسرافیل وقت اند اولیاء
مردہ را زیشاں حیات ست و نما

یاد رکھو کہ اولیاء اسرافیلِ زمانہ ہیں (کیونکہ) مردہ (دلوں) کو ان سے زندگی اور نشوونما حاصل ہوتی ہے۔ (۲۱۲/۱)

جانہائے مردہ اندر گورِ تن
بر جہد زآوازِ شاں اندر کفن

بدنوں کی قبر میں مردہ (وار غافلو تمہاری جان بے حس پڑی ہوئی) رُوحیں ان (اولیاء) کی آواز (یعنی فیض تعلیم کے اثر) سے کفن (یعنی حجابِ غفلت) کے اندر حرکت کرنے لگتی ہیں۔ (۲۱۲/۱)

ان اشعار کے بعد مولانا رومیؒ نے اور بھی بہت سے اشعار لکھے ہیں جو جلد اوّل (مطبوعہ الفیصل بک ڈپو) کے ترجمہ میں صفحہ نمبر ۲۱۳ پر پڑھے جا سکتے ہیں۔

از حضورِ اولیاء گر بگسلی

(اگر مشائخ سے تو دُور رہے گا)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی میں کوئی برائی ہے تو اولیائے کرام سے دُوری کے باعث ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی درخت خشک ہو گیا ہو تو اس کی خشکی انفاس طیبہ سے دُوری کی وجہ سے ہوگی۔ (مکّہ کا بے آب و گیاہ صحرا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی برکتوں سے سرسبز ہو گیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی درخت ذکر بند کر دے تو اس پر آرا چلا دیا جاتا ہے، جو انسان ان بزرگوں سے فوائد حاصل نہ کر سکا تو یہ اس کی بدقسمتی ہے اور ان سے دُوری کی وجہ سے بہت

سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی کی عقل ناقص ہے تو کوئی کامل العقل نیک مرشد تلاش کر لے تو اس کا جزو (ایک حصہ) اس کے ساتھ ملنے سے کل کی شکل اختیار کر لے گا۔

گر درخت خشک باشد در مکاں — عیبِ آں از بادِ جاں افزاید آں

اگر کسی جگہ کوئی درخت خشک ہو جاتا ہے تو اس کا وہ عیب رُوحانی ہوا سے (دوری کے سبب) بڑھ جاتا ہے۔ (۱/۲۲۴)

باد کارِ خویش کرد و بروزید — آنکہ جانے داشت بر جانش گزید

(انفاسِ اولیاء کی) ہوا نے اپنا کام کیا اور چلی گئی، جس شخص میں (استعداد کی) جان (اور صلاحیت کی رُوح) تھی اس نے اس کو (اپنی) جان پر (بھی) ترجیح دی۔ (۱/۲۲۴)

آنکہ جامد بود خود واقف نشد — وائے او جانے کہ او عارف نشد

اور جو ٹھوس (طبیعت کا آدمی) پتھر تھا، اس کو خبر بھی نہ ہوئی، اس (تاریک) جان پر افسوس ہے جس کو نورِ معرفت حاصل نہ ہوا۔ (۱/۲۲۴)

مرشد کو تلاش کرنے سے یہ مقصود ہے کہ وہ نفسانی خامیوں کو دُور اور ناقص عقل کو حلیۂ کمال سے مزین کر دے گا۔

گر تُرا عقلے ست جزوی در نہاں — کامل العقلے بجو اندر جہاں

اگر تمہارے اندر عقل ناقص (و خام) ہے تو دُنیا میں کوئی (مرشد، ہادی یا پیشوا) کامل العقل اور باکمال تلاش کرو۔ (۱/۲۲۵)

از حضور اولیاء گر بگسلی — تو ہلاکی زانکہ جزوی نے کلی

اگر تو اولیاء کی حاضری سے علیحدہ رہے گا تو تُو برباد رہے گا کیونکہ تو جُزو ہے کُل نہیں۔ (۲/۲۰۹)

جزوِ تو از کُلِّ او کُلّی شود — عقلِ کُل بر نفس چوں غُلّے شود

تیری کمی اس کے کمال کی بدولت پوری ہو جائے گی، کامل عقل نفس (کو قابو میں رکھنے) کے لئے طوق کا کام دے گی۔ (۱/۲۲۵)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم اللہ سے اور پیر سے کتنا ہی دُور ہو جاؤ تب بھی ان کی طرف اپنا دھیان رکھو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی غلط فہمی سے مرشد خاموش ہو جائے تب بھی اپنا دھیان اس کی طرف مرکوز رکھو۔ اگر تم پیغمبر یا بزرگ نہیں ہو تو اس راستے کے مسافر بن کر راستہ طے کرو کہ کسی منزل تک پہنچ جاؤ۔ اگر تم بادشاہ بھی ہو تو کسی شیخ کی ملکیت بن کر چلو تاکہ تم گمراہی سے نکل کر کسی مرتبے تک پہنچ جاؤ۔ کسی کی اتباع میں لگے رہو گے تو آخرکار منزل پر پہنچ ہی جاؤ گے۔

گر چہ دُوری دور می جنباں تو دُم حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وَجُوْهَكُمْ

اگر تم ان سے دُور ہو تو دُور ہی سے اپنی دُم ہلاتے (یعنی اظہارِ محبت کرتے) رہو، جہاں (بھی) تم رہو (وہیں سے) ان کی طرف اپنا رُخ رکھو۔ (۳۱۵/۲)

چوں شوی دور از حضور اولیاء در حقیقت گشتہء دور از خدا

جب تُو اولیاء کی حاضری سے دُور ہو گیا، گویا حقیقتاً تُو خدا سے بھی دُور ہو گیا۔ (۲۱۴/۲)

طریقت کا یہ قاعدہ ہے کہ حصولِ فیض کے لئے بُعدِ مکانی کچھ مانع نہیں۔ عقیدت و ارادت شرط ہے، خواہ تم کہیں بھی ہو۔ اپنی ارادت ان بزرگوں سے متعلق اور اپنا دل ان کی طرف متوجہ رکھو، اس طرح بھی کام بنتا ہے۔ دُم ہلانے کے استعارہ میں مرید کو کتے سے تشبیہ دی ہے اور اپنے پیرِ طریقت کے کوچے کا کتا ہونا بھی مایۂ صدافتخار ہے۔ دوسرے مصرعے میں کعبہ شریف کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ سورہ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۴۴ میں ہے کہ "(اے مسلمانو) جہاں کہیں تم ہو، پھیر لیا کرو اپنے منہ اس (قبلہ) کی طرف" پیرِ طریقت بھی قبلہ ہے اور اس کی جانب روئے اِرادت رکھنے کے لئے یہ استعارہ کوئی مبالغہ نہیں۔

چوں پیمبر نیستی پس رو براہ

(جب تم رہنما نہیں ہو تو کسی کے تابع بن جاؤ)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم خود راہبر نہیں تو کسی راہبر کی اتباع اختیار کرو، اگر تم خود کامل نہیں ہو تو اکیلے میں دکان نہ کھولو، اگر کوئی آزاد بندہ ہونے کے قابل نہیں ہے تو کسی آزاد مرد کی غلامی کرے۔

چوں پیمبر نیستی پس رَو بَراہ تا رسی از چاہ روزے سُوئے جاہ

جب تم پیغمبر (اور رہنما) نہیں ہو تو (راہرو بن کر کسی کی اتباع میں) راستہ طے کیا کرو تا کہ تم ایک دن (گمراہی کے) کنویں سے (نکل کر) عزت والے مرتبہ (ارشاد و مشیخیت) تک پہنچ جاؤ۔ (۳۲۴/۲)

تو رعیت باش چوں سلطاں نہء تگ مراں چوں مردِ کشتیباں نہء

جب تُو بادشاہ نہیں ہے تو رعیت ہی بن جا، جب تُو (ماہر) جہازراں نہیں ہے تو (کشتی کو) گہرائی میں نہ چلا۔ (۳۲۴/۲)

جب مرشد ہونے کی قابلیت نہ ہو تو مرید ہی بن جانا چاہیئے، اگر مشکلاتِ طریق سے آگاہی اور ان سے بچنے کی استعداد نہیں ہے تو نہایت احتیاط سے راہِ سلوک طے کرنا چاہیئے۔

چوں نہء کامل دکاں تنہا مگیر دست خوش می باش تا گروی خمیر

جب تُو کامل نہیں ہے تو اکیلا دکان نہ کھول، بلکہ کسی دستگیر کا تختۂ مشق بن جا تا کہ اس کی تربیت سے تو خمیر بن جائے۔ (۳۲۴/۲)

جب تم میں کوئی کمال پیدا نہیں ہوا تو ابھی سے اپنے آپ کو کامل سمجھ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بناؤ بلکہ ہمیشہ شیخ کی اتباع کرو اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کرو کہ تربیت کی کٹھالی میں وہ جس طرح چاہے تم کو پگھلائے اور جس سانچے میں چاہے ڈھال دے۔ تمہارے اندر کاملین میں شامل ہونے کی استعداد اس طرح پیدا ہو جائے گی جس طرح آٹے میں خمیر ہو کر روٹی کی صورت اختیار کرنے کی صلاحیت آ جاتی ہے۔

چونکہ آزادیت نابد بندہ باش ہیں مپوش اطلس برو درژندہ باش

جب تجھ میں آزادی (وحریت کی قابلیت) نہیں تو (کیوں خواہ مخواہ اصرارِ نامدار کی ریس پر مرتا ہے۔ غلام بن کر رہ، ارے! (امرا کی ریس میں) اطلس مت پہن! جا گدڑی میں (گزر اوقات کر)۔ (۳۲۴/۲)

ور بگوئی مشکل استفسار گو با شہنشاہاں تو مسکیں وار گو

اگر تم کوئی مشکل (اُن سے) کہنے لگو تو (بطور) استفسار کہو (اور ان) شہنشاہوں کے ساتھ مسکین کی طرح بولو۔
(۳۲۴/۲)

ایک مسکین کو بادشاہ کے ساتھ بے تکلف اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی جرأت نہیں ہوتی بلکہ خاص ضرورت اور مجبوری کے وقت سوال کیا کرتا ہے، وہ بھی نہایت ادب وعزت سے اور ڈرتے ڈرتے۔ پس ان سلاطینِ اقلیم ولایت سے بات چیت کرنے میں مرید کو بھی یہی انداز اختیار کرنا لازم ہے، تکبر نہ کرنا چاہئے بلکہ اپنے آپ کو کسی دوسرے بڑے انسان کا تابع رکھنا چاہئے۔

خدمتِ اکسیر کن مس وار تو جور میکش اے دل از دلدار تو

(پس لازم ہے کہ) تانبے کی طرح اکسیر کی خدمت کرو (اور سونا بن جاؤ) اے دل! دلدار کی سختی برداشت کر تو بھی دولتِ وصال سے بہرہ مند ہو جائے گا۔ (۳۲۶/۲)

کیست دلدار؟ اہلِ دل نیکوبداں کو چو روز و شب جہانست از جہاں

دلدار کون ہے؟ اہلِ دل خوب یاد رکھو، جو دن اور رات کی طرح دُنیا سے گریز کرتا رہے۔ (۳۲۶/۲)

دن کا رات سے پہلے رخصت ہو جانا اور دن سے پہلے رات کا چلے جانا، گویا دُنیا کو خیر باد کہہ جانا ہے۔ اسی طرح اولیاء کرامؒ دل سے دُنیا اور دُنیا کے سازو سامان کو ترک کر دیتے ہیں۔

عیب کم گو بندۂ اللہ را متہم کم کن بدُزدی شاہ را

اللہ کے (مخلص بندے کی عیب جوئی مت کرو اور بادشاہ پر چوری کی تہمت مت لگاؤ)، ورنہ تم تمام ناچیز لوگوں میں ناچیز سے ناچیز بن جاؤ گے اور ہر شیطان ذلیل کے تابع ہو جاؤ گے۔ (۳۲۶/۲)

ایک دِل بَرداشتہ فقیر کی پکار

مثنوی میں ایک دل برداشتہ فقیر کا واقعہ لکھا گیا ہے، اسے نیچے بیان کیا جا رہا ہے لیکن کشف المحجوب میں یہ

روایت بہت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے جو ہم اپنی تصنیف ''حسنِ نماز'' کے صفحہ نمبر ۷۹۹ پر دعا کے باب میں لکھ چکے ہیں۔ اس واقعہ کو حضرت ذوالنون مصریؒ نے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک کشتی میں سوار ہوا تو اس کشتی میں ایک نہایت خوبصورت جواں بھی بیٹھا ہوا تھا، اس کے چہرے پر عبادت کے اثرات اس قدر زیادہ تھے کہ میں اس سے بات کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ کشتی میں کسی کا موتی چوری ہوگیا ہے اور لوگ اس درویش کی تلاشی لینا چاہتے ہیں تو میں نے بھی اس درویش سے تلاشی لینے کی بات کی۔ اس نے کھڑے ہو کر کچھ اشعار پڑھے جو ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں اور نیچے بھی لکھے گئے ہیں۔ اشعار کے پڑھتے ہی یکایک سمندر سے لاتعداد مچھلیاں نمودار ہوئیں، جن میں سے ہر ایک کے منہ میں ایک ایک موتی تھا۔ اس درویش نے ایک موتی لے کر کشتی والوں کو دے دیا۔ جب یہ واقعہ دیکھا تو اہلِ کشتی نے اس درویش سے اظہارِ عقیدت کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ درویش کشتی سے باہر سمندر میں پیر رکھ کر سمندر کی سطح پر چلنے لگا اور لوگ دیکھتے رہ گئے۔

مثنوی میں یہ قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک درویش کشتی کے اندر تھا، جس نے سامان مردمی کو اپنا پشت پناہ بنا رکھا تھا۔ کسی شخص کی اشرفیوں کی تھیلی گم ہوگئی۔ وہ درویش سو رہا تھا۔ سب کی تلاشی لی گئی مگر پتہ نہ چلا۔ اشرفیوں کے مالک نے وہ درویش بھی لوگوں کو دکھایا تاکہ وہ اس سونے والے فقیر کی بھی تلاشی لیں، کشتی کے مالک نے اُسے جگا دیا اور کہا کہ اس کشتی میں نقدی کی ایک بھری ہوئی تھیلی گم ہوگئی ہے۔ ہم نے سب کی تلاشی لے لی ہے اور تم بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ مہربانی فرما کر گدڑی اُتارو اور ننگے ہو جاؤ تاکہ لوگوں کے شکوک تم سے رفع ہو جائیں۔ یہ سُن کر بزرگ جوش میں آ گیا اور دُعا کی کہ اے الٰہی! یہ کمینے لوگ تیرے غلام پر تُہمت لگاتے ہیں تو کوئی مناسب حکم بھیج۔ یہ دُعا فارسی اور عربی میں تھی اور اس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے

گفت یارب بر غلامت را خساں   متہم کروند حکمے در رساں

درویش نے کہا: یاالٰہی! ان کمینوں نے تیرے غلام پر تُہمت لگائی ہے، تو ان پر اپنا حکم بھیج۔ (۳۲۷/۲)

يَا غِيَاثِىْ عِنْدَ كُلِّ كُرْبَةٍ   يَا مُعَاذِىْ عِنْدَ كُلِّ شِدَّةٍ

اے ہر مصیبت کے وقت میرے فریاد رس! اے ہر مصیبت کے وقت میری پناہ! (۳۲۷/۲)

يَا مُجِيبِىْ عِنْدَ كُلِّ دَعْوَةٍ   يَا مَلَاذِىْ عِنْدَ كُلِّ مِحْنَةٍ

اے میری ہر دُعا کے قبول کرنے والے! اے ہر مشقت کے وقت میرے ملجا! (۳۲۷/۲)

جب اس تہمت سے درویش کے دل کو دکھ پہنچا تو فوراً اس گہرے دریا میں سے لاکھوں مچھلیوں نے ہر طرف سے سر نکالے، بحالیکہ ہر ایک کے منہ میں ایک موتی اپنی گرانبہائی میں ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر قیمتی، موجود تھا کیونکہ وہ خدا کی طرف سے تھا جو شرک سے پاک ہے۔ اس بزرگ نے چند موتی مچھلیوں سے لے کر کشتی میں ڈال دیئے اور پھر جست لگا کر ہوا کی کرسی بنائی اور اس پر بیٹھ گئے۔ کشتی والے یہ کرامت دیکھ کہ نہایت متحیرّ ہوئے اور

پکارنے لگے کہ یا حضرت! یہ اعلیٰ مقام آپ کو کیونکر بخشا گیا۔ انہوں نے طنزاً کہا کہ فقیر پر جھوٹی تہمت لگانے اور حقیر چیز کے لئے حق تعالیٰ کو ناراض کرنے سے۔ ایک مقام پر مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ پیر خواہ کسی وقت میں بھی تم کو نظر آئے، اس سے استفادہ کرو بلکہ اگر شیخ بوڑھا ہو تو پرانی شراب کی طرح وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے، لہٰذا پیر کی تلاش میں ہر وقت لگے رہو۔

خود قوی تر می بود خمرِ کہن

(فیضانِ حق بڑھاپے میں سبقت لے جایا کرتا ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب بھی کسی پیر کا فیض ملے تو اس کو حاصل کرو۔ بڑھاپے میں اللہ کا فیض سبقت لے جاتا ہے۔ جب بھی فیض ملے تو اسے ہوشیار ہو کر حاصل کرنا چاہیئے۔ بڑھاپے میں جسم اگرچہ کمزور ہو جائے مگر رُوحانیت زیادہ ترقی پر ہوتی ہے، اس لیے مولاناؒ نے ایک جگہ فرمایا ''پیر بڈھا ہونا چاہیے بڈھا''۔

خواہ نورِ از اولیں بستاں بجاں خواہ از نورِ پسیں فرقے مداں

خواہ پہلے (چراغ) کا نور (دل) جان سے حاصل کر یا پچھلے (چراغ) کا، اس میں کوئی فرق نہ سمجھ۔ (۲۱۴/۱)

گفت پیغمبرؐ کہ نفحتہائے حق اندریں ایام می آرد سبق

پیغمبر (علیہ السلام) نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیض ان ایامِ (عمر) یعنی بڑھاپے میں سبقت لے جایا کرتے ہیں۔ (۲۱۵/۱)

گوشِ ہش دارید ایں اوقات را در ربائید ایں چنیں نفحات را

پس ان اوقات میں ہوش کر کے کان لگائے رکھو اور اس قسم کی معطّر ہواؤں یعنی ہدایت کی دعوتوں کو قبول کرتے رہو۔ (۲۱۵/۱)

نفحہء آمد شمارا دید و رفت ہر کرا می خواست جاں بخشید و رفت

ایک خوشبو (پیغمبر کی تعلیمِ شریعت) کا زمانہ تو آیا اور تم کو دیکھ کر چلا گیا، جس نے اس کو طلب کیا اس کو وہ (ابدی) زندگی بخش کر گزر گیا۔ (۲۱۵/۱)

نفحہء دیگر رسید آگاہ باش تا ازیں ہم وانمانی خواجہ تاش

اب دوسری خوشبو (یعنی اولیاء اللہ کا عشق آموزِ عہد) آ گیا ہے، اے پیر بھائی! ہوشیار رہنا تا کہ تم اس سے بھی محروم نہ رہو۔ (۲۱۵/۱)

او چناں پیرست کش آغاز نیست باچناں دُرِّ یتیم انباز نیست

وہ ایسا پیر ہے کہ اس کا آغاز ہی نہیں اور ایسے دُرِّ یتیم کا کوئی ثانی نہیں۔ (۳۰۸/۱)

چونکہ پیر کی شان اس شانِ پیغمبری کا ایک پَرتو ہے کہ "کُنتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ" یعنی میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم (علیہ السلام) پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ کلیدِ مثنوی میں تحریر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیر قدیم الوجود ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ اللہ کے علم میں سب کا سعید و متقی ہونا ازل سے موجود ہے۔ پس سعادتِ معلومہ بعلم قدیم ازلی کے اعتبار سے اسے قدیم کہہ دیا، گو پیر قدیم نہیں مگر اس کی سعادت قدیمی ہے۔

خود قوی تر می بود خمرِ کہن　　　خاصہ آں خمریکہ باشد مِنْ لَّدُنْ

شراب جتنی پرانی ہو وہ اور بھی طاقتور ہو جاتی ہے، خاص کر وہ شراب (معرفت) جو حق تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ (۳۰۸/۱)

مطلب : پیر اگر بوڑھا ہے تو اس کے ضعفِ جسمانی سے ضعفِ رُوحانی کا شبہ نہ کرو کیونکہ اضمحلال جسم تو اور بھی تقویتِ رُوح کا باعث ہوتا ہے، جس طرح شراب پرانی ہو کر زیادہ مؤثر اور قوی ہو جاتی ہے ؎

خود قوی تر می شود خمرِ قدیم　　　آں کہن تر بہتر اے شیخِ علیم

اے شیخ دانا! پرانی شراب تو بڑی طاقتور ہوتی ہے اس لئے وہ جتنی پرانی ہو اتنی ہی اچھی ہے۔ (۳۰۸/۱)

مطلب : چونکہ بڑھاپے میں تجربہ اور تابعین کے حالات کے متعلق بصیرت زیادہ ہو جاتی ہے، لہٰذا بڑھاپے میں قوتِ رُوحانی تنزل نہیں بلکہ ترقی کرتی ہے۔

شیخ کا سبق بغیر آلۂ زبان بھی ہوتا ہے

مولانا رومیؒ کو اس بات کا یقین ہے کہ شیخ اپنے مریدوں کو بغیر کسی آلۂ سماعت کے جسے وہ "بے گفتہ سبق" کا نام دیتے ہیں، رُوحانی اسباق دے سکتے ہیں۔ اس موضوع پر مصنف کی کتاب "رابطۂ شیخ" (صفحہ ۱۲۸) میں بے گفتہ سبق کے نام سے ایک مضمون ہے، جس کا مطالعہ زیادہ تفصیل مہیا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ شیخ نورِ حق کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مشائخ پہلے ہونے والے اور بعد میں آنے والے بہت سے واقعات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تجربہ کار شکاری کا تجربہ یوں ہوتا ہے کہ وہ صحرا میں چند گام (قدم) ہرن کے پاؤں کے نشانات پر چلتا ہے اور پھر اپنی طاقتِ مشام (سونگھنے کی طاقت) سے کام لیتا ہے اور ہرن کو تلاش کر کے اس کا شکار کر لیتا ہے۔

اولیائے کرامؒ کا قول ہے کہ جب انسان کا دل بیدار ہو جائے تو اس کو مشاہدہ کی قوت مل جاتی ہے اور اس قوت سے وہ بہت سے کام لیتا ہے اور ہر چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ جب ایک سفر کے دوران خرقان کی سرزمین پر پہنچے تو وہاں ایک جگہ پر بیٹھ گئے اور اپنے مریدوں سے فرمانے لگے کہ مجھے یہاں سے ایک مردِ کامل کی خوشبو آ رہی ہے، جو اس شہر میں آج سے تین سو سال کے بعد پیدا ہوگا اور جس کا نام ابوالحسن ہوگا اور اُن کے مقام اور اوصاف کے متعلق بہت تفصیل سے بیان فرمایا۔ پھر واقعی تین سو سال کے بعد ان کا ظہور ہوا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جن اولیائے کرامؒ کے دل بیدار ہوں ان کے لئے بُعد زمانی اور مکانی کچھ معنی نہیں رکھتا۔ آپ نے فرمایا کہ

صحابہ کبارؓ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بیداریٔ دل کی صفت عطا فرمائی تھی، اسی لئے آپ کو بہت سے علوم بھی دیئے گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر امت میں ایک محدّث ہوتا ہے اور میری امت کے محدّث حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور خاص طور پر صحابہ اربعہ کے بہت سے مشاہدات کا ذکر مستند کتابوں میں آیا ہے، جو ان کی قلبی بیداری کی علامت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس سلسلے میں جو اشعار لکھے ہیں، ان میں سے چند ملاحظہ فرمایئے ؂

مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
(ب۔ج۔۳۲۹)

علامہ اقبالؒ کا یہ فرمان کہ صحرا میں آہوئے تاتاری (ہرن) کا نشان اس وقت تک نہیں ملتا جب تک مشام تیز یعنی "Strong smelling power" نہ ہو۔ یہ طاقت اولیائے کرامؒ کو دل کی بیداری سے ہی ملتی ہے۔

نیچے جو اشعار مولانا رومیؒ نے ارشاد فرمائے ہیں ان کے معنی بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؂

دید ہر چشمے کہ دید از نور ہُو
فقر را از چشم و از سیمائے اُو

جس نے نورِ حق کی آنکھ سے نظر کی ہے اس نے درویشی کا ان کی (یعنی حضرت صلاح الدینؒ کی) آنکھ اور پیشانی سے مشاہدہ کرلیا۔ (۱۳۴/۲)

با مریداں دادہ بے گفتے سبق
شیخ فعال ست بے آلت چو حق

شیخ آلہ (کلام و سماعت) کے (استعمال کے) بغیر تعلیمی اثر ڈال سکتا ہے، جیسے حق تعالیٰ (بلا آلات یا وسائط مؤثر و متصرف ہے) وہ مریدوں کو بلا تکلم سبق دیتا ہے۔ (۱۳۴/۲)

مہر او گہ ننگ سازد گاہ نام
دل بدستِ او چو مومِ نرم رام

(مرید کا) دل اس کے دستِ تصرف میں نرم موم کی طرح مسخر ہو جاتا ہے۔ اس (پیر) کی مُہر کبھی اس پر قبض (ناگوار نقش) بناتی ہے کبھی بسط (پسندیدہ شہرت والا نقش)۔ (۱۳۵/۲)

باز آں نقشِ نگیں حاکیِ کیست؟
مہرِ موش حاکیِ انگشتری ست

وہ (نقش رنگیں انگوٹھی بنانے والے) زرگر کے تخیل کا عکس یعنی (حاکی) ہے، جس کی ایک ایک کڑی دوسری میں پیوست ہے، مراد یہ کہ یہ نقش کس کا عکس ہے۔ (۱۳۵/۲)

سلسلہ ہر حلقہ اندر دیگرست
حاکیِ اندیشۂ آں زرگرست

(وہ نقش) سنار کے خیال کا عکس ہے، ہر حلقہ کا سلسلہ دوسرے میں (جڑا ہوا) ہے۔ (۱۳۵/۲)

آپ کے کلام سے یہ مراد ہے کہ مرید کے دل پر پیر کے تصرّفات کا اثر پڑتا ہے اور پیر کے تصرفات منجانب اللہ ہیں۔

ایں صدا در کوہِ دلہا بانگِ کیست؟ گہ پُر است از بانگ کہ گاہے تہی ست

دلوں کے پہاڑ میں یہ گونج کس کی آواز سے ہے؟ کہ اس آواز سے کبھی یہ پہاڑ پُر ہیں اور کبھی خالی۔ (۱۳۵/۲)

ہرکجا ہست او حکیم ست اوستاد بانگِ او زیں کوہِ دل خالی مباد

(یہ آوازِ غیب) جہاں بھی ہو (یعنی جس دل میں بھی ہو) وہ (دل) حکیم و اُستاد ہے، خدا کرے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی آواز اس دل کے پہاڑ سے جُدا نہ ہو۔ (۱۳۵/۲)

جاں پذیرفت و خرد اجزائے کوہ ما کم از سنگیم آخر اے گروہ؟

افسوس کہ پہاڑ کے اجزا تو جان اور عمل قبول کر لیں، کیا آخر ہم پتھروں سے بھی ناکارہ ہو گئے؟ (کہ ہم پر آثارِ فیضان نمودار نہیں ہوتے)۔ (۱۳۵/۲)

ہر کہ دید آں مرہم از زخم ایمن ست ہر بدے کایں حُسنِ دید او محسن ست

جس نے وہ مرہم پایا وہ زخم سے محفوظ ہے، جس بُرے آدمی نے بھی یہ حسن (اعمال) حاصل کرلیا، وہ نیکوکار بن گیا۔ (۱۳۶/۲)

اے تنِ آلودہ بگردِ حوض گرد پاک کے گردد بُرونِ حوض مرد

اے (الائشِ عصیاں سے اپنے) وجود کو آلودہ رکھنے والے! حوض (یعنی پیرِ طریقت) کے پاس آمدورفت رکھو (جو تیری اس آلائش کو دھو ڈالے) بھلا حوض سے باہر (رہنے والا) آدمی کب پاک ہوسکتا ہے؟ (۱۳۸/۲)

زانکہ دل حوضے ست لیکن در کمیں سوئے دریا راہِ پنہاں دارد ایں

کیونکہ (شیخ کا) دل (گو بظاہر) ایک حوض ہے لیکن خفیہ طور پر، یہ (حوض اپنے اندر) دریائے (احدیت) کی طرف ایک چھپی مُوری رکھتا ہے۔ (۱۳۸/۲)

جس طرح ایک چشمہ والی جھیل جو اندرونِ ارض بے پایاں پانی سے مدد پاتی ہے اور اس سے ندی نالے بہہ نکلتے ہیں، اپنے غیرمحدود پانی کے سبب کسی قسم کی آمیزش سے متغیر نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح شیخ کے دل کا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، چنانچہ وہ ظاہری و باطنی نجاسات سے متغیر نہیں ہوسکتا، یعنی شیخ کی پاکیزگی بے پایاں ہوتی ہے اس لئے وہ زائل نہیں ہوتی ؎

دزدی کن از دُر و مرجانِ جاں اے کم از سگ از درونِ عارفاں

جان کا موتی اور مونگا چُرا لے عارفوں کے دل میں سے، اے عارفوں میں کتے سے کمتر۔ (۱۴۳/۲)

(وہ شخص جو فضائلِ اخلاق سے بے بہرہ ہونے میں) کتے سے بھی کم (ہے) اُسے (یہ موقع غنیمت سمجھ کر)

عارف لوگوں کے باطن سے رُوحانی زر و جواہرات اخذ کرنے چاہئیں، یعنی اخلاق کے پاکیزہ موتی چراؤ اور جب تم کوئی بوجھ اُٹھاتے ہو تو کوئی نفیس بوجھ اُٹھاؤ۔

در دُرونِ دل درآید چوں خیال　　پیشِ شاں مکشوف باشد سِرِّ حال

(کسی کے) دل کے اندر جب کوئی خیال آتا ہے تو ان (اہل اللہ) کے سامنے کل حالت کا بھید منکشف ہو جاتا ہے۔ (۱۴۸/۲)

یعنی اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو موقع وضرورت کے مطابق ان کو مخفی بات معلوم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ دلوں کے جاسوس ہوتے ہیں۔

خدا کا فیض عام ہے لیکن قبولِ فیض بقدرِ استعداد ہے

اس طویل وعریض بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کا فیض تو ہر جگہ ہے کیونکہ اس کی رحمت ہر شے پر محیط ہے لیکن اس قرب کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء کو یہ قرب، وحی اور عشق پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کا نور ہے۔ (النور:۳۵) یہ نورِ خدا تو ہر طرف پھیلا ہوا ہے مگر کچھ لوگ اس سے فیض حاصل کرتے ہیں اور کچھ لوگ موقع ضائع کر دیتے ہیں۔ پہاڑوں پر سورج چمکتا ہے تو اس سے کوئلہ بنتا ہے اور کہیں سونا اور لعل بنتے ہیں۔ سورج کی روشنی سے درختوں کی نشوونما ہوتی ہے اور ہری شاخیں اس قُرب سے پھل پھول پیدا کرتی ہیں اور سُوکھی ٹہنیاں مزید سُوکھ کر اِیندھن کا کام دیتی ہیں۔

قربِ حق و رزق بر جملہ است عام　　قربِ وحی و عشق دارند ایں کرام

خدا کا قُرب اور رِزق سب پر عام ہے، وحی اور عشق کا قُرب اہلِ کرم انبیاء اور اولیاء کرام پر ہوتا ہے۔ (۷۶/۳)

قرب بر انواع باشد اے پدر　　می زند خورشید بر کہسار و زر

اے بزرگ والد! قرب بہت اَنواع کا ہوتا ہے، سورج پہاڑوں پر چمکتا ہے اور سونے پر بھی چمکتا ہے۔ (۷۶/۳)

لیک قربِ ہست با زر شید را　　کہ ازاں نبود خبر مر بید را

لیکن سونے کے ساتھ سورج کا قُرب بھی ہے، بید کے درخت کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ (۷۶/۳)

شاخِ خشک و تر قریبِ آفتاب　　آفتاب از ہر دو کے دارد حجاب

درخت کی خشک اور تر شاخ سورج کے قریب ہوتی ہے، سورج ان دونوں سے حجاب نہیں رکھتا۔ (۷۶/۳)

لیک کو آں قربتِ شاخِ طری　　کہ ثمار پختہ ازوے می خوری

لیکن کہاں طری والی شاخ کی یہ قربت کہ تُو اس سے پکے ہوئے پھل کھاتا ہے۔ (۷۶/۳)

بنگر ایں کاں شاخِ خشک از قربِ خور　　غیرِ خشکی می برد چیزے دگر

دیکھ کہ شاخِ خشک نے سورج کی شعاع سے سوائے خشکی کے کیا چیز حاصل کی۔ (۷۶/۳)

اگر بغور معائنہ کیا جائے تو بڑی بڑی گدیوں پر بیس سے پچاس لاکھ (۲۰ سے ۵۰ لاکھ) مرید بیعت ہوتے ہیں لیکن ان لاکھوں مریدوں میں سے دس یا بیس (۱۰ یا ۲۰) مرید ہی ایسے دکھائی دیتے ہیں جن میں رُوحانیت کا کمال کسی حد تک قابلِ قدر معیار پر نظر آتا ہے، باقی سب عام قابلیت کے مالک ہوتے ہیں۔ قابلیت یا قبولِ فیضان کی اِستعداد کا حساب ایسے ہی ہوتا ہے، جیسے عام لوگ ایک تکون کا اکثر حصہ ہوتے ہیں۔ تکون کے اُوپر والے سرے میں چند اشخاص ہوتے ہیں اور تکون کی Base پر بنیادی سطح سے کم اِستعداد والے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دفاتر میں سالانہ رپورٹوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ خاص معیاری (out standing) لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور متوسط اور نچلے درجے (Average) میں آنے والے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پیر یا شیخ تو ایک ہی ہے مگر قابل اور اہلِ استعداد مرید کوئی کوئی ہوتے ہیں کیونکہ ہر مرید کی اِستعداد ایک جیسی نہیں ہوتی۔ محنتی لوگ عبادت اور اذکار میں زیادہ توجہ دیتے ہیں، اس لیے ان کا نام دُنیا بھر میں چمک جاتا ہے۔ ایسے لوگ ریاضت اور عبادت میں بھی بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں، اس لئے ان پر اللہ تعالیٰ کا کرم بھی خاص ہو جاتا ہے۔ محنت نہ کرنے والے لوگ دعاؤں اور تعویذوں پر ہی نظر رکھتے ہیں اور کام یا محنت بالکل نہیں کرتے۔ ایسے لوگ کچھ نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے۔ دعا کے ساتھ کوشش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کو ایسی دعا کرتے نہیں دیکھا کہ انہیں روٹی اور سالن بغیر آگ اور دیگر سامان کے پکا پکایا مل جائے۔

پاک لوگوں کو اپنے جیسا نہ سمجھو

مشہور ہے کہ جو کوئی جیسا ہوتا ہے، اوروں کو بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے مولانا رومیؒ نے ایک بقال (سبزی اور کریانے والے) کی کہانی لکھی ہے کہ اس نے اپنی دکان پر ایک طوطا پال رکھا تھا جو بہت ذہین تھا اور لوگوں سے باتیں بھی کرتا تھا۔ جب مالک دکان سے گھر جاتا تو طوطا دکان کی حفاظت کرتا اور لوگوں کو کہتا کہ مالک یہاں نہیں ہے، چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بلی چوہے کے پیچھے بھاگی تو طوطا اپنی جان بچانے کے لئے اُوپر اڑا اور بادام روغن کی شیشیاں گرا دیں۔ جب مالک آیا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے اس کو کسی ایسی چیز سے مارا جس سے وہ گنجا ہو گیا اور اس صدمے میں طوطے نے بولنا ترک کر دیا۔ مالک طوطے کو بہت پیار کرتا رہا مگر وہ راضی نہ ہوا، کبھی وہ طوطے کو لوگوں کے سامنے کرتا کہ شاید لوگوں سے ہی کچھ بات کرے مگر اس کی ناراضگی ختم ہونے کو نہ آئی۔ ایک دن اس دکان کے سامنے سے ایک فقیر گزرا جس کا سر گنجا تھا۔ اس کو دیکھ کر طوطا بول اُٹھا کہ اے بابا کیا تُو نے بھی کسی کا روغن گرا دیا تھا، جس کی سزا میں تجھے بھی گنجا کر دیا گیا۔ طوطے کی بات کو سُن کر دکان پر موجود لوگ ہنسنے لگے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اکثر لوگوں کو بھی ایسے ہی خیالات آتے ہیں اور کسی کے ظاہر کو دیکھ کر فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ دیکھنے میں شِیر اور شیر ایک ہی طرح کے الفاظ نظر آتے ہیں

مگر ان دونوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ بھڑ اور شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوستے ہیں مگر بھڑ میں زہر پیدا ہوتا ہے اور مکھی میں شہد پیدا ہوتا ہے۔ دو قسم کے ہرن ایک قسم کا گھاس کھاتے ہیں لیکن ایک مینگنیاں بناتا ہے اور دوسرا کستوری۔ کھارا پانی اور میٹھا پانی دیکھنے کو ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں مگر دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ انسان ظاہری اعمال کی ہم صورتی کے باعث غلط فیصلہ کر لیتے ہیں اور پاک لوگوں کو بھی اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ مولانؒا فرماتے ہیں ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ باشد در نوشتن شیر و شِیر

پاک لوگوں کے کام کو اپنے پر قیاس نہ کر، اگرچہ لکھنے میں شیر (درندہ) اور شِیر (دودھ) یکساں ہیں۔ (۱/۵۸)

شِیر آں باشد کہ مرد اورا خورد — شیر آں باشد کہ مردم را درد

شِیر (دودھ) تو وہ ہے جس کو آدمی پیتا ہے اور شیر وہ ہے جو آدمیوں کو پھاڑتا ہے۔ (۱/۵۸)

جُملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے زابدالِ حق آگاہ شد

اس وجہ سے پورا عالم گمراہ ہو گیا، بہت کم کوئی خدا کے ابدال سے واقف ہوا۔ (۱/۵۸)

ہمسری با انبیاء برداشتند — اولیاء را ہم چو خود پنداشتند

انہوں نے نبیوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر دیا اور اولیاء کو اپنے جیسا سمجھ لیا۔ (۱/۵۸)

گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

یہ کہا کہ ہم بھی انسان ہیں اور وہ بھی انسان ہیں، ہم اور وہ سونے اور کھانے کے پابند ہیں۔ (۱/۵۸)

ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ — ہست فرقے درمیاں بے منتہیٰ

اندھے پن سے وہ یہ نہ سمجھے بلکہ ان دونوں میں بے انتہا فرق ہے۔ (۱/۵۸)

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب — زیں یکے سرگیں شد و زاں مشکِ ناب

دونوں قسم کے ہرنوں نے گھاس اور پانی کھایا پیا، اس ایک کا گوبر بنا اور دوسرے کا خالص مشک۔ (۱/۵۸)

ہر دو صورت گر بہم ماند رواست — آبِ تلخ و آبِ شیریں را صفا است

دونوں صورتیں اگر ایک جیسی ہیں تو ٹھیک ہے، نمکین اور شیریں پانی میں صفائی موجود ہے۔ (۱/۵۷)

مولانؒا فرماتے ہیں کہ فرعون کے جادوگروں کے کرتب اور موسیٰؑ کے معجزے دیکھنے میں لوگوں کو ایک جیسے لگتے تھے مگر ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مولانؒا نے بہت طویل کلام کیا ہے، جس کا خلاصہ یہی ہے کہ عام طور پر مومن اور منافق ایک جیسے ہی لگتے ہیں، عام آدمی اور ولی میں ظاہری طور پر تمیز کرنا مشکل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اولیائے کرامؒ کو اللہ نے لوگوں سے اپنی چادر کے نیچے چھپا کر رکھا ہے، غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خدا کو تو پہچاننا بہت آسان ہے مگر اولیاء اللہ کو پہچاننا زیادہ مشکل ہے کیونکہ خدا تو اپنی کارکردگی سے پہچانا جاتا ہے مگر ولی کو کوئی کیسے

پہچان سکتا ہے، جو کہ دیکھنے میں تمہارے ہی جیسا ہے۔

ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نیک کام وہ ہے کہ جس پر تیرے نفس کو اطمینان ہو اور تیرے دل کو تسلّی ہو اور بُرا کام وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور ترے سینے میں تردّد ڈالے، اگرچہ لوگ تجھے اس کے کرنے کا فتویٰ دیں۔'' اس کے بعد مولانا رومیؒ نے ایک مثال اور دی ہے کہ اگر کھانے کے لقمے میں کوئی تنکا آ جائے تو زبان اسے محسوس کر کے رَد کر دیتی ہے۔ اسی طرح حسِ رُوحانی اگر زندہ ہو تو معمولی سے شَر کا شائبہ بھی محسوس کر لیتی ہے۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

((اولیاء اللہ کو) کوئی خوف اور غم نہیں ہوتا)

قرآن کریم نے نجات یافتہ، خدا رسیدہ اولیاء اللہ کی یہ صفت بار بار دُہرائی ہے کہ یہ لوگ خوف وحزن سے بالاتر ہوتے ہیں، نہ وہ کسی چیز سے ڈرتے ہیں اور نہ مبتلائے غم ہوتے ہیں۔ انبیائے کرامؑ اور اولیاء کرامؒ اگرچہ اس دُنیا میں ہر حالت میں خوف وحزن سے دُور نہیں رہتے کیونکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء اور اولیاء جامۂ بشریت میں بشری تقاضوں سے بَری نہیں ہوتے۔ عام لوگوں جیسا غم البتہ ان کو نہیں ہوتا، مثلاً مال کے گم ہونے کا غم، دُنیا کے سامنے ذلیل ہونے کا خوف۔ عام لوگ اس بات پر شاکی ہوتے ہیں کہ ان کو ایسا غم کیوں ہوا۔ کسی ولی اللہ کو اس کے بچے کے فوت ہونے کا غم تو ضرور ہوتا ہے کیونکہ یہ بات فطری تقاضا ہے مگر اولیاء دُنیاداروں کی طرح ماتم نہیں کرتے اور غمزدہ نہیں ہوتے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر ان ولیوں کو کسی دُشواری میں مبتلا دیکھو کہ وہ تمہاری طرح پیچ وتاب کھا رہے ہیں تو جان لو کہ ان کا غم تو ایسے ہوتا ہے جیسے پہاڑوں میں آواز گونجتی ہے اور گذر جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ؎

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر | شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں | میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے | مومن کہ یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اولیا اللہ کی حالت ہر وقت ایک جیسی نہیں ہوتی، کبھی عارضی طور پر میلانِ بشریت میں حقیقت رُوپوش ہو جاتی ہے اور کبھی انشراح صدر میں زمین و آسمان کے حقائق آشکار ہوتے ہیں۔ کبھی حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے کنویں میں گرانے کا ظاہری علم نہیں ہوتا اور کبھی ان کے کُرتے کی خوشبو دُور سے سونگھ کر اعلان کر دیتے ہیں کہ مجھے اس کے کُرتے کی خوشبو آ رہی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالت کا علم تو ہوتا ہے مگر ظاہر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔ ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کبھی تو میں عرشِ اعلیٰ کی بلندیوں پر ہوتا ہوں اور کبھی اپنے پاؤں کی پشت کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ (سعدیؒ)

ایک روایت میں ہے کہ کسی نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کبھی تو آپ کو اپنے فرزند کو کنویں میں ڈالنے کا علم نہ تھا اور کبھی کُرتے کی خوشبو دُور سے سُونگھ کر بتا دیتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ہر وقت ہم ایک ہی حالت میں رہیں تو عالم بشریت سے پاک ہو جائیں مگر تقاضائے مشیت یہ نہیں ہے

یکے پُرسید ازاں گم کردہ فرزند کہ اے روشن گہر پیرِ خرد مند

ایک شخص نے ان سے پوچھا، جس نے اپنا بیٹا گم کر دیا تھا کہ اے روشن حال والے عقلمند پیر۔ (غیر مثنوی)

زمصرش بوئے پیراہن شمیدی چرا در چاہِ کنعانش ندیدی

تو نے مصر سے اپنے بیٹے کے کُرتے کی خوشبو تو سُونگھ لی، مگر اس کو کنعان کے کنویں میں گراتے ہوئے کیوں نہ دیکھا۔ (غیر مثنوی)

گفت احوالِ ما برقِ جہاں است دمے پیدا دمِ دیگر نہاں است

کہا کہ ہمارے احوال دُنیا کی بجلی کی طرح ہوتے ہیں، ایک لمحہ میں ظاہر ہوتے ہیں اور دوسرے میں غائب۔ (غیر مثنوی)

اگر درویش بر حالے بماندے سرِ دست از دو عالم برفشاندے

اگر درویش ایک حالت پر ہی رہے تو وہ فوراً دونوں عالموں (بَشریت اور نُورانیت) سے باہر نکل جائے۔ (غیر مثنوی)

اولیاء اطفال حق اند اے پسر

(اے بیٹے! اولیاء اللہ کو حق تعالیٰ کا کنبہ ہی سمجھو)

اولیاء اللہ کو حق تعالیٰ کے بیٹے سمجھنے سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے کوئی بیٹا چن لیا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کسی کے بیٹوں کا احترام کیا جاتا ہے، ان کا بھی اسی طرح احترام کرنا لازم ہے۔ پیروں کے مرید بھی پیروں کی رُوحانی اولاد ہی تسلیم کی جاتی ہے۔

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں ایک داستان لکھی ہے کہ کچھ لوگ لمبے سفر پر تھے، ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہ تھا، وہ درختوں کے پتے کھا کر گذارا کرتے رہے۔ آخر وہ ایک ایسی جگہ پر آئے جہاں ہاتھی بہت زیادہ پائے جاتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے ان کو بتایا کہ جب تم اس شہر سے نکلو گے تو جنگل میں تمھیں بہت سے ہاتھیوں کے بچے پھرتے ہوئے نظر آئیں گے مگر تم کبھی ایسا نہ کرنا کہ ان بچوں میں سے کسی کو پکڑ کر اپنے کھانے کے کام میں لے آؤ کیونکہ ان بچوں کے باپ اور دیگر ہزاروں ہاتھی اس بچے کو پکڑنے کے فوراً بعد تم پر یک جا حملہ کر دیں گے

اور تمہیں پاؤں کے تلے روند ڈالیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہاتھیوں نے ان سب کو پیروں میں روند ڈالا۔ اس کے بعد مولانا رومیؒ بات کو اس طرف لاتے ہیں کہ جس طرح ہاتھی اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح ولیوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرتا ہے، گویا ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے کنبہ کی مثل سمجھتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اولیائے کرامؒ اللہ تعالیٰ کے اطفال کی مانند ہیں۔ چنانچہ جو ان سے بُرا سلوک کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتا ہے ؎

اولیاء اطفال حق اند اے پسر — در حضور و غیبت آگاہ با خبر

اے لڑکے! اولیاء، اللہ کا کنبہ ہیں، وہ ان کی موجودگی اور غیر حاضری میں ان سے باخبر ہے۔ (۲۲/۳)

از برائے امتحاں خوار و یتیم — لیک اندر سر منم یار او ندیم

وہ آزمائش کے لئے بے وُقعت اور یتیم ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں در پردہ ان کا ساتھی ہوں۔ (۲۳/۳)

پُشت دارِ جملہ عصمتہائے من — گوئیا ہستند خود اجزائے من

میری تمام حفاظتوں پر ان کا بھروسہ ہے، گویا وہ میرے ہی ٹکڑے ہیں۔ (۲۳/۳)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر خدا کسی کو رُسوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کو پاک لوگوں کی طرف طعن کرنے پر مائل کر دیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کی عیب پوشی کرنا چاہے تو بروں کے عیوب کو بھی ڈھانپ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ اپنے پیارے بندوں پر لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ان کو رُسوا کریں، یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ کے ولی لوگوں سے چھپے رہیں، کہیں ان کو کوئی پہچان نہ سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے ولی میری چادر کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد

(جب خدا کسی کی پردہ دری کرنا چاہتا ہے)

دُنیا میں کتنے ایسے واقعات رُونما ہو چکے ہیں کہ لوگوں نے بزرگوں کی بے ادبی کی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی گرفت کا عذاب نازل فرمایا۔ فرعون چالیس سال تک حضرت موسیٰؑ کی مخالفت پر کمر بستہ رہا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے اسے دریا میں غرق کر دیا اور رہتی دُنیا تک اسے نشانِ عبرت بنا کر لندن کے عجائب گھر میں اس کی لاش کو محفوظ کر دیا، لیکن لوگ پھر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ڈاکٹر مائیکل بوکائیل کو حکومتِ انگلستان نے فرعون کی لاش کو درست کرنے کا فریضہ سونپا تو اس نے فرعون کا قصہ سنا اور پھر قرآن کا خود مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس نے پورے قرآن کو غور سے پڑھا اور ایک کتاب لکھی جس کا نام ''بائبل، قرآن اور سائنس'' (Bible, Quran and Science) ہے۔ اس کتاب میں اس نے اس بات کا اقرار کیا کہ قرآن میں جو باتیں لکھی ہیں ان کو کئی سو سالوں کے بعد سائنس دانوں نے درست تسلیم کر لیا ہے۔ (ہماری تصنیف ''نشانِ منزل''

میں صفحہ نمبر ۶۲ پر اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے) اس کے اس بیان سے اسلام کی حقانیت کا علم ہوتا ہے۔

ایسے واقعات تو ہزاروں کی تعداد میں ملیں گے مگر ایک واقعہ راقم الحروف کے دفتر کے قریب ہوا، جو جیل کی پرانی بلڈنگ سے منسلک ہے، قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک درویش (مسلمان) لاہور جیل کی دیوار کے موڑ پر بیٹھا تھا۔ اس کو کھانسی آئی تو اس نے بلغم کو اپنے بائیں طرف پھینکا۔ اتفاق سے ایک ہندو شخص اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ کونے کی دوسری طرف سے نمودار ہوا اور وہ بلغم اس کی بیوی کی ساڑھی پر گرا۔ اس ہندو کو غصہ آیا، اُس نے درویش بابا کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ وہ جوڑا ابھی جیل کی دیوار کے دوسرے کونے تک ہی پہنچا تھا کہ اس کی بیوی کو شدت گرمی سے Sun Stroke ہو گیا اور وہ زمین پر گر کر مر گئی۔ وہ ہندو اس درویش کے پاس آیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ اس کی بیوی کو زندہ کر دیا جائے مگر درویش نے کہا، اے بھائی! تمہاری بیوی کی ساڑھی پر میں نے بلغم پھینکا تو تمہیں غصہ آ گیا اور تم نے مجھے ایک تھپڑ رسید کیا، اسی طرح تمہارے مارنے کا عمل ہمارے خدا کو بھی گوارا نہ ہوا تو اس نے تمہاری بیوی کو مار دیا۔ اس میں میرا تو کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

ہماری تصنیف ''جنید و بایزید'' کے محیر العقول واقعات کے باب میں ایک قصہ لکھا گیا ہے کہ خلیفۂ وقت نے اپنی ایک نہایت خوبصورت لونڈی حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس اس لئے بھیجی کہ وہ معلوم کرے کہ جنید بغدادیؒ کس کردار کے انسان ہیں۔ وہ لونڈی بہت خوبصورت تھی اور سنگھار سے آراستہ تھی۔ حضرت جنیدؒ نے آنکھوں کو نیچے جھکا لیا اور پھر ایک لمبی سی سانس لے کر منہ کو اُوپر اُٹھایا اور لونڈی کی طرف دیکھا تو وہ فوراً مر گئی۔ ہماری مذکورہ کتاب سے معلوم ہوگا کہ (یہ قصہ بہت طویل ہے مگر مختصراً یہ کہ) جب خلیفۂ وقت نے اپنی لونڈی کے مرنے کی خبر سنی تو حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس آ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو آپؒ نے فرمایا ''خلیفہ صاحب! آپ نے یہ کیا کیا کہ اپنی لونڈی کو میرے پاس بھیجا اور میری عمر بھر کی کمائی کو تباہ کرنا چاہا۔'' پھر فرمایا کہ ''اس لونڈی کو میں نے نہیں مارا بلکہ خداوندِ قدوس کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے تمہاری لونڈی کی جان لے لی۔ میں اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ کسی کو مار سکوں۔'' یہ بات سُن کر خلیفہ واپس چلا گیا۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی کے کلام میں بوُعلی قلندرؒ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ بوعلی قلندرؒ کا ایک مرید شرابِ عشق میں مست تھا اور کسی کام سے بازار گیا تو حاکمِ شہر کے کارندوں نے اس کو ہنٹر لگائے اور راستے سے ہٹا دیا کیونکہ بڑے حاکم کی سواری آ رہی تھی۔ جب مرید واپس آیا تو بوعلی قلندرؒ سے شکایت کی۔ آپ جلال میں آ گئے اور کاغذ و قلم منگوا کر بادشاہِ وقت کو خط لکھا کہ تمہارے عمّال نے ہمارے درویش کو بلاوجہ زَد و کوب کیا ہے، ان کے عمل پر کوئی گرفت کریں، ورنہ کل سورج نکلتے ہی تمہاری حکومت کسی اور کے حوالے کر دی جائے گی۔ سلطان نے امیر خسرو کو بھیج کر معذرت کی، ایسا نہ کرنے پر اس کی گرفت ہو سکتی تھی۔

یہ تمام واقعات اس نوعیت کی مثالیں ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی رُسوائی چاہتا ہے تو اولیاء کے طعن پر

اس کو مائل کر دیتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　میلش اندر طعنہ پاکاں برد

جب اللہ تعالیٰ کسی کی رُسوائی چاہتا ہے، تو اس کو پاک لوگوں پر طعن کرنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ (۱/۱۱۰)

جو شخص انبیاء وصحابہ کرامؓ اور اولیائے کرامؒ سے بُغض رکھتا ہے تو اس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے اور کئی امراض اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے ہر کام سے یعنی عمر، رزق، صحت اور آل اولاد سے خیر و برکات چھین لی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس سے اپنی رحمت اور خیر و برکات چھین لیتا ہے اور وہ ذلیل وخوار ہو کر مرتا ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پوشد عیبِ کس　　کم زند در عیبِ معیوباں نفس

جب خداوند تعالیٰ کسی شخص کی عیب پوشی چاہتا ہے تو وہ شخص معیوب لوگوں کے عیب میں بھی کلام نہیں کرتا۔ (۱/۱۱۰)

یعنی لوگوں کے عیب و نقائص سے زبان بند رکھنا اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم کی علامت ہے۔ عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی کی شرمناک بات دیکھے پھر اس کی پردہ پوشی کرے تو اس کا اجر اس شخص کے برابر ہے جو ایک زندہ گاڑی ہوئی لڑکی کو نکال کر مرنے سے بچالے۔''

چوں خدا خواہد کہ ماں یاری کند　　میلِ مارا جانبِ زاری کند

جب اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمانا چاہتا ہے تو عجز و انکساری پر ہم کو مائل کر دیتا ہے۔ (۱/۱۱۰)

جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوتا ہے، وہ ہر وقت توبہ و استغفار اور عجز و انکساری اور احکاماتِ شرعی پر گامزن ہوتا جاتا ہے۔

اے خنک چشمیکہ او گریانِ اوست　　وے ہمایوں دل کہ او بریانِ اوست

اے (مخاطب) وہ آنکھ ٹھنڈی ہے جو اس (محبوب حقیقی کے لئے روتی ہے اور اے (مخاطب) وہ دل مبارک ہے جو اس کی سوزشِ عشق سے بریاں یعنی جل بھن رہا ہے۔ (۱/۱۱۰)

اس سے مولاناؒ کی مراد یہ ہے کہ جس شخص کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنسو جاری ہوں، اگرچہ مکھی کے سر کے برابر (چھوٹے چھوٹے) ہی ہوں اور وہ شخص پھر اپنے رُخسار پر کچھ تری پائے تو اللہ تعالیٰ اس کے جسم کے ان حصوں کے لئے آتش دوزخ حرام کر دیتا ہے۔

مشائخ کی مخالفت میں ہلاکت ہے

پیغمبرانِ خدا کی مخالفت حقیقتاً خدا کی مخالفت ہے اور اولیائے کرامؒ کی مخالفت پیغمبرِ خدا اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہے، کیونکہ ان کا سلسلۂ حصولِ کسب و کمال ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہے۔ جو لوگ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو مانتے ہیں اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کو نہیں مانتے وہ کافر اور بے دین ہیں۔ خدا کو تو ہر مذہب والا تسلیم کرتا ہے، اس کے ساتھ ہی اگر وہ تثلیث کا حامی ہو یا رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلام کرے تو وہ اسلام سے خارج ہے۔

آپ ﷺ کی شان کے خلاف ایک حرف بھی کہنا تضییعِ ایمان ہے۔ کچھ لوگ خدا کو بڑا دکھانے کے لئے رسولوں کو بہت نیچے کھینچ کر لے آتے ہیں۔ نعوذ باللہ خدا سے کسی انسان یا پیغمبر کا مقابلہ تو ویسے ہی ناممکن ہے، چنانچہ یہ کہہ دینا ٹھیک نہیں کہ فلاں بات کہنے سے لوگ رسول اللہ ﷺ کو خدا سے بڑا بنا دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب خدا کی شان کی بلندی کسی کو نہیں معلوم تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص نے رسول اللہ ﷺ کو خدا سے بڑا قرار دے دیا۔ رسول ﷺ کی جو چاہو تعریف کرو، تب بھی وہ خدا سے بڑے نہیں ہوں گے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کو ''رؤف اور رحیم'' کا نام دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ نام رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ : ۱۲۸ میں فرمایا ہے ''بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ'' کہ رسول اللہ ﷺ مومنین کے لئے رؤف اور الرحیم ہیں۔ حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ نے ''مدارج النبوۃ'' میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں میں سے ساٹھ نام رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمائے ہیں۔ انبیاء کرامؑ یا اولیاء کرامؒ کے متعلق غلط الفاظ کا استعمال کرنا اصل میں خدا یا اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرنا ہے۔ اولیاء کرامؒ کے خلاف بات کرنا حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہے اور کفر میں شامل ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اولیاء کرامؒ اللہ تعالیٰ کے اطفال ہیں، چنانچہ جس نے ان سے برا سلوک کیا تو اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو جاتا ہے، جو لوگ اولیاء کرامؒ کی مخالفت کرتے ہیں وہ خود اپنے آپ کو اُن سے زیادہ عاقل اور زِیرک خیال کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ لوگ خدا کے دریائے کمال کا ایک قطرہ بھی دیکھ لیں تو وہ اپنے ہُنر اور کمال کے سبو کو توڑ ڈالیں ؎

ور بدیدے قطرہ از دجلہ خُدا   آں سبُو را او فنا کردے فنا

اگر کوئی شخص خدا کے دریائے (کمالات) کا ایک قطرہ بھی دیکھ لے تو اپنے (محدود فضل و ہنر کے) سبو کو توڑ پھوڑ کر نابود کر دے۔ (دجلہ یعنی دریا) (۳۰۱/۱)

آنکہ دیدندش ہمیشہ بیخودند   بیخودانہ بر سبو سنگے زدند

اور جن لوگوں نے اس کے (دریائے کمالات کے قطرہ) کو دیکھا ہے، وہ ہمیشہ بے خود ہیں، انہوں نے بے خودوں کی طرح (اپنی ہستی کے) گھڑے پر پتھر مارا ہے۔ (۳۰۱/۱)

مطلب : جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے کمالات کا انکشاف ہو گیا ہے وہ اپنی ہستی کے دعوے سے دست بردار ہو گئے ہیں اور انہوں نے ریاضت و مجاہدہ سے اپنے وجود کو ذوقاً وجدان کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

وہ آدمی جان لیتا ہے تو سو جانیں دے بھی دیتا ہے، وہ (انعام) دے گا کہ تمہارے خیال میں بھی نہ آئے۔ (۵۶/۱)

پشت دارِ جملہ عصمتہائے من   گوئیا ہستند خود اجزائے من

میری تمام حفاظتوں پر ان کا بھروسہ ہے، گویا وہ میرے ہی ٹکڑے ہیں۔ (۲۳/۳)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر خدا کسی کو رُسوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کو پاک لوگوں کی طرف طعن کرنے پر مائل کر دیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کی عیب پوشی کرنا چاہے تو برے لوگوں کے عیبوں کو بھی چھپا لیتا ہے۔ مولاناؒ لکھتے ہیں کہ شیر بھیڑیئے اور لومڑی کے ساتھ شکار پر گیا تو شکار کے تقسیم کرنے پر بھیڑیئے نے جھگڑا کیا۔ شیر نے کہا کہ میں تم کو نیست و نابود کر کے دُنیا میں عبرت کا نشان بناؤں گا۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ خاصانِ خدا کی گستاخی اور بدگمانی کرنا ایسا ہی موجبِ خسران ہے۔

وارہانم چرخ را از ننگِ تاں　　تا بماند در جہاں ایں داستاں

میں (تم کو نیست و نابود کر کے) آسمان کو تمہاری ذلت سے نجات دلاؤں گا تاکہ یہ واقعہ دُنیا میں (ایک عبرتناک، حیرت انگیز) یادگار رہ جائے۔ (۱/۳۱۷)

شیر با ایں فکر میزد خندہ فاش　　بَر تبسّم ہائے شیر ایمن مباش

شیر اُن خیالات میں ظاہر (داری کے طور پر) ہنستا تھا، (مگر اے مخاطب) شیر کی مسکراہٹوں کو نہ بھولنا اور نڈر نہ ہو جانا۔ (۱/۳۱۷)

ایں چنیں ظنِ خسیسانہ بمن　　مر شمارا بُود ننگانِ زمن

کیا تم میرے حق میں اس قسم کے کمینوں کا سا خیال رکھتے تھے، تم زمانہ بھر کے لئے باعثِ عار ہو۔ (۱/۳۱۷)

ظَانِّیْنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوْءِ را　　گر نہ بُرّم سر بود عینِ خطا

اگر میں اللہ کے حق میں بَدگمانی کرنے والوں کا سر کاٹ کر نہ دَھر دوں تو میری بڑی غلطی ہوگی۔ (۱/۳۱۷)

مطلب یہ ہے کہ خاصانِ خدا کی شان میں بَدگمانی کرنا ایسا ہی موجبِ خسران ہے، جیسے حق تعالیٰ کی جناب میں، کیونکہ ان کے افعال بھی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں، اگرچہ دقیق ہونے کے سبب عوام کی نظر ان کی حکمت کا ادراک نہ کر سکے یا عناد کی وجہ سے کوئی اس کو ادراک کرنے کی کوشش نہ کرے۔

دیدنِ دانا عبادت ایں بود
(اللہ کے ولی کی دید بھی عبادت ہے)

ابنِ ماجہ کی کتاب ''زہد'' میں ایک حدیث شریف نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اُن کی پہچان یہ ہے کہ اُن کو دیکھ کر خدا یاد آ جائے۔ وہ حدیث یہ ہے ''اَلَّذِیْنَ اِذَا رُأُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ'' مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ایسے ولی اللہ کی دید بھی عبادت ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اولیائے کرامؒ کا قول لکھا ہے کہ

سایۂ رہبر بہ است از ذکرِ حق

رہبر کا سایہ ذکرِ حق سے بہتر ہے۔

یہ قول ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل'' میں حوالے کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ایک خاتون نے راقم الحروف سے ٹیلیفون پر استفسار کیا کہ آپ نے یہ قول کیسے لکھ دیا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ میرا قول نہیں بلکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان سے پہلے بزرگوں کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ اگرچہ ذکرِ الٰہی بہت بڑی بات ہے مگر شیخ کے سامنے کوئی نفلی عبادت نہیں کی جا سکتی کیونکہ تمام نفلی عبادتوں سے پیر کے چہرے کو دیکھنا فائدے کے اعتبار سے بہتر ہے۔ اس کی وضاحت یوں بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص نے ذکر کا طریقہ کسی شیخ سے اخذ نہیں کیا تو اس کے ذکر کا اتنا فائدہ نہیں جتنا کہ شیخ سے ذکر سیکھنے سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ شیخ کو دیکھنے سے (اس کے انوار حاصل کرنے سے) بھی فائدہ ہوتا ہے، پیر کو دیکھنے کی یہ بہتری فائدے کے اعتبار سے ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں کی پہچان بھی اُوپر بیان ہوئی ہے کہ جب ان کو دیکھو تو خدا یاد آ جاتا ہے، اگر خدا کی یاد اُنہیں دیکھنے سے ہی آ جائے تو اس کی صحبت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا کو یاد کرنا ہی تو ذکر کی اصل ہے۔ روایات میں ہے کہ ایک شخص بیٹھا ذکر کر رہا تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اس کے قریب سے گذرے تو فرمایا کہ یہ شخص کیا بک بک چق چق کر رہا ہے۔ اس کے بعد حضرت بایزید بسطامیؒ نے اس کو ذکر سکھایا تو اس کو ذکر کی اہمیت کا علم ہوا۔ ہر ذکر کرنے والا ایک جیسا نہیں ہوتا۔ جو ذکر کسی شیخ سے اخذ کیا جائے اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان فرق ظاہر کرنے کے لیے اور بہت سی باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے، لہٰذا طوالت کے خوف سے اس بات کو یہیں چھوڑا جا رہا ہے۔

ہر کہ اُو بنہاد ناخوش سنتے ۔۔۔ سُوئے اُو نفریں رَوَد ہر ساعتے

جس شخص نے کوئی بُری رسم قائم کی، ہر وقت اس پر لعنت پڑتی رہتی ہے۔ (۱/۱۰۳)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ صاحبِ عقل کے لئے یہ اصول ہونا چاہیئے کہ وہ ہماری طرح مردانِ حق کے قدموں کی خاک بن جائے۔ مردانِ حق کی علامت یہ ہے کہ جن کو دیکھ کر خدا یاد آ جائے۔

خاک شو مردانِ حق را زیرِ پا ۔۔۔ خاک بر سَر کن حَسَد را ہمچو ما

مردانِ خدا کے قدموں کی خاک ہو جاؤ (اور) ہماری طرح حسد پر مٹی ڈالو۔ (۱/۷۵)

دیدنِ دانا عبادت ایں بود ۔۔۔ فتحِ ابوابِ سعادت ایں بود

عالم کو دیکھنا بھی ایک عبادت ہے، اس سے نیک بختی کے دروازے کھل جانا سعادت ہے۔ (۱/۶۲)

روئے ہر یک مے نگر میدار پاس ۔۔۔ بوکہ گردی تو زخدمت بُو شناس

(مذکورہ دونوں قسم کے عارفوں میں سے) ہر ایک کا دیدار کرتے رہو یا ادب رکھو، شاید خدمت گزاری کی بدولت ہی عرفان کی راہ نکال لو۔ (۱/۶۲)

یک زمانے صحبتے با اولیاء
(کچھ دیر اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا)

مثنوی مولانا رومؒ کا یہ شعر زباں زدِ خاص و عام ہے، جس میں مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ اولیائے کرامؒ کی مختصر صحبت صدسالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ تم اگرچہ کتنے ہی گنہگار کیوں نہ ہو جب کسی صاحبِ دل کامل ولی کی صحبت میں آ جاؤ گے تو گوہر نایاب بن جاؤ گے۔ انسان کا دل دُنیا کی رنگینیوں اور دلفریبیوں کی طرف تو جاتا ہے مگر اولیاء کرامؒ کی طرف مائل نہیں ہوتا کہ اولیائے کرامؒ کی صحبت دارین کی سعادت عطا کرتی ہے، اس لئے اپنے دل کو ان کی طرف مائل رکھیں۔

صحبتِ اولیا کے متعلق ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل'' اور ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ مذکورہ بالا کتب کے مطالعہ سے شیخ کی صحبت سے جو متعدد فوائد مرتب ہوتے ہیں، ان کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ صحبت ایک ایسی صفت ہے کہ جس سے صحابہ کرامؓ کو متصف کیا گیا ہے۔ کوئی شخص کتنی ہی زیادہ عبادت کرے مگر ایک صحابی کا درجہ اس سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے، بعد کے زمانے کے قطب اور ابدال وغیرہ ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے کہ کچھ لوگ حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق گستاخانہ کلام کرتے ہیں، ان کو صحابہ کرامؓ کی رِفعت کا علم نہیں۔ فرمایا کہ حضرت امیر معاویہؓ تو ایک جلیل القدر صحابی تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی صحابی کے گھوڑے کے پاؤں کی خاک جو جہاد کی راہ میں جاتے وقت اُڑتی ہے، اس کا اتنا درجہ ہے کہ اگر وہ خاک مجھ پر پڑ جائے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری بخشش ہوگئی۔

صحبت کی خوبی اس قدر بلند ہے کہ اولیاء کی صحبت میں بیٹھنے والوں پر اولیائے کرامؒ کے جسم سے نکلنے والی شعاعوں کا فیض اثر کرتا ہے۔ ان اولیاء کی خاموشی میں بھی یہ شعاعیں مریدوں کے جسموں پر فیضان کا سمندر بہا دیتی ہیں بلکہ اگر شیخ مرید سے لاکھوں میل دُور ہو تب بھی یہ شعاعیں بذریعہ انعکاس مرید تک پہنچ سکتی ہیں اور ان شعاعوں کا حصول بذریعہ مراقبہ ہوتا ہے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اولیائے کرامؒ کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو اولیائے کرامؒ کی گفتگو سے وہ فائدہ پہنچتا ہے، جو کتابوں اور دیگر اُستادوں سے حاصل ہونا ممکن نہیں، لہٰذا مرید چند دنوں کی صحبت میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پیر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کے ہمراہ ایک نور بھی ہوتا ہے اور اس کی باتوں میں ان کے تجربے سے حاصل کردہ علوم اس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظوں میں مل جاتے ہیں۔ یہ الفاظ اسرارِ خداوندی ہوتے ہیں ۔

یک زمانے صُحبتِ با اَولیاء بہتر از صدسالہ طاعت بے ریا

(کچھ دیر اولیاء اللہ) کی خدمت میں حاضر ہونا سو برس کی بے ریا (یعنی خالص) اطاعت سے (فضیلت میں) بڑھ

کر ہے۔ (۱/۱۰۱)

گر تو سنگِ خارہ و مرمر بوی   چوں بصاحب دِل رسی گوہر شوی

اگرچہ تُو سنگِ خارہ اور سنگِ مرمر ہے، مگر جب تُو صاحبِ دل کے پاس پہنچے گا تو موتی بن جائے گا۔ (۱/۱۰۱)

مہر پاکاں درمیانِ جاں نشاں   دل مَدِہ اِلّا بمہرِ دل خوشاں

پاک لوگوں کی محبت (اپنی) جان میں جما لے (یہ وہ لوگ ہیں جو دُنیا سے بے غم ہیں) کسی کی محبت میں دل نہ دے، اس حصولِ کمال کے لئے کسی باکمال کا ارادت مند بننا چاہیے، نہ کہ ناقص و نااہل کا۔ (۱/۱۰۱)

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست   سوئے تارِیکی مرو خورشیدہا ست

نااُمیدی کے کوچہ میں نہ جا، اُمیدوں کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اندھیرے کی طرف نہ جا (ہدایت کے) سورج درخشاں ہیں، طالبوں کو اُمید رکھنی چاہیے کہ خدا کے فضل سے کوئی نہ کوئی کامل اُن کی دستگیری کے لئے نمودار ہو جائے گا۔ (۱/۱۰۱)

دل ترا در کوئے اہلِ دل کشد   تن ترا در حبسِ آب و گل کشد

دل تجھ کو اہلِ دل کے کوچے میں لے جانے کا مقتضی ہے، جسم تجھ کو علائقِ جسمانیہ کی قید میں ڈالنے کا متقاضی ہے۔ (۱/۱۰۱)

مولانا رومؒ پہلے ہی یہ فرما چکے ہیں کہ تم کو روشن ضمیر لوگوں کی صحبت میں جانا چاہیئے۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ تمہارے اندر خود ایسے متضاد جذبات موجود ہیں، جن میں سے بعض کا میلان اہلِ اللہ کی صحبت کی طرف ہے اور بعض کی کشش لذاتِ جسمانیہ کی طرف ہے۔ درج ذیل اشعار میں مولانا رومؒ نے ایک سفیر کی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

دید آں مرشد کہ او ارشاد داشت   تخمِ پاک اندر زمینِ پاک کاشت

مرشد (یعنی حضرت عمرؓ) نے دیکھا کہ وہ ایلچی اِستعداد رکھتا ہے (اس لئے اس کے) پاک دل کی زمین میں (اسرارِ معرفت کا) پاک بیج بو دیا۔ (۱/۱۶۹)

مرد گفتش کاے امیرالمومنین   جاں زبالا چوں در آمد بر زمین

اس شخص نے آپ سے سوال کیا ہے کہ اے امیر المومنین! رُوح عالمِ بالا (یعنی عالمِ امر سے زمین یعنی عالمِ خلق) میں کیوں کر آ گئی؟ (۱/۱۶۹)

مرغِ بے اندازہ چوں شُد در قفَس   گفت حق بر جاں فسوں خواند و قصص

لاتعداد پرندے پنجرے میں کیسے آ گئے، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے رُوح پر افسوں اور افسانے پڑھ دیئے۔ (۱/۱۶۹)

موم و ہیزم چوں فدائے نار شُد ذاتِ ظلمانی اُو انوار شُد
موم اور جلانے کی لکڑی جب آگ پر فدا ہوگئی، تو اس کی تاریک ذات (سراپا) انوار بن گئی۔ (۱/۱۷۸)

سنگِ سُرمہ چونکہ شد در دید گان سنگ بینائی شُد اینجا دیدہ باں
سُرمے کا پتھر جب آنکھوں میں پڑا تو یہاں (آ کر پتھر) بینائی بن گیا، (اور) بینائی کا پتھر آنکھوں کا محافظ ہوگیا۔ (۱/۱۷۸)

مطلب یہ ہے کہ کامل کی صحبت سے ناقص بھی کامل بن جاتا ہے۔

اے خنک آں مرد کز خود رستہ شد در وجودِ زندہٗ پیوستہ شد
اے مخاطب مبارک باد کے قابل ہے وہ آدمی، جو اپنے آپ سے نکل گیا ہو اور کسی زندہ دل یعنی مرشدِ کامل کا شریکِ صحبت ہوگیا ہو۔ (۱/۱۷۸)

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست
(پیر کا ہاتھ دُور والوں کے لئے کوتاہ نہیں ہوتا)

یہ مضمون کہ پیر کا ہاتھ دور دراز رہنے والے لوگوں کے لئے کوتاہ (چھوٹا) نہیں، بہت مخصوص کمالات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کے متعلق اولیائے کرامؒ کی زندگیوں کے لاتعداد واقعات شاہد ہیں۔ ایسے تمام واقعات کا قلمبند کرنا طوالت کے خوف سے ممکن نہیں، البتہ چند ایک واقعات پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔

اولیائے کرامؒ کے لئے یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں، خود بھی حاضر ہو سکتے ہیں اور دُور دراز علاقوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی امداد بھی کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ بات کہ آپ نے مسجد میں جمعۃ المبارک کے وعظ میں فوجی جرنیل حضرت ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آواز دی کہ ساریہ! پہاڑی کی طرف دیکھو۔ حضرت ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آواز سنی اور پہاڑی کے پیچھے کافروں کے لشکر کو دیکھا اور انہیں حملہ کرنے سے روک دیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سینکڑوں میلوں سے اس لشکر کو ملاحظہ فرما رہے تھے اور اس کی خبر ساریہؓ کو دے دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ شیخ کا ہاتھ دُور دراز بیٹھے ہوئے لوگوں سے کوتاہ نہیں۔ تصوف کی دُنیا میں یہ بات بھی مصّدق ہے کہ اولیاء کرامؒ کے لئے مسافتیں اور فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے اور زمانی بُعد بھی ان کے لئے کوئی بُعد نہیں۔ تصوف میں نزدیک اور دُور کوئی معنی نہیں رکھتے۔ زمان (یعنی وقت) پر بھی ان کو دسترس حاصل ہے۔ حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ نے مکتوباتِ شریف میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں (یعنی بلند مقام سے دیکھو تو) ماضی مستقبل اور حال ایک ہی صورت کے حامل نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں نقطے ایک سیدھی لکیر میں حسبِ ذیل صورت میں دکھائی دیتے ہیں اور ماضی مستقبل کی طرف جا رہا ہے۔

ماضی حال مستقبل

← ← ←

اب سائنس نے بھی مان لیا ہے کہ اس دُنیا کے قطروں سے باہر جائیں تو بیک وقت ماضی حال اور مستقبل ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں (اس کا مفصل ذکر ہماری تصنیف ''رابطہء شیخ'' میں دے دیا گیا ہے) لہٰذا موجودہ دَور نے یہ واضح کر دیا ہے کہ نزدیک یا دُور اور زمانے کے اختلاف کی بات اولیاء کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

راقم الحروف کی تصنیف ''رابطہء شیخ'' میں کتاب کے آخر میں ایک باب ''اولیاء کی امداد حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی امداد ہوتی ہے'' کے نام سے شامل کر دیا گیا ہے۔ اس میں مستند کتابوں کے حوالے سے اولیائے کرامؒ کا اپنے مریدوں کی مدد کرنے پر بہت طویل عبارتیں لکھی گئی ہیں، جس کے مطالعہ سے زیرِغور باب کا سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بخاری شریف میں موجود ایک حدیثِ قدسی کا حوالہ دینا بھی ضروری ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ کا بندہ فرائض کی ادائیگی کرنے کے بعد نفلی عبادت میں زیادہ حصہ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے بندے کا ہاتھ بن جاتا ہے، جس سے وہ کام کرتا ہے، اس کی زبان اللہ کی زبان اور اس کے قدم اللہ کے قدم بن جاتے ہیں۔ اس حدیث سے تو ظاہر ہو گیا کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے فعل کا آلہ بن جاتا ہے تو پھر اس سے یہ بات بعید نہیں کہ وہ دُور اور نزدیک کی باتوں کو نہ سُن سکے اور دیکھنے کے ساتھ ساتھ مدد نہ کر سکے۔ اللہ کی اس مدد کو جو شیخ کو حاصل ہوتی ہے، مولانا رومیؒ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ ''دست اُو جُز قبضۂ اللہ نیست'' یعنی اس کا ہاتھ اللہ کی نصرت کے سوا کچھ نہیں۔

روایات میں ہے کہ جب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اولیائے کرامؒ کو فرمایا کہ ان کا پیر (قدم) تمام اولیاء کی گردنوں پر ہے تو سب نے اسے تسلیم کیا مگر ایک شخص نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو کہا کہ تمہارا قدم میری گردن پر نہیں ہے تو آپؒ نے فرمایا کہ جاؤ تمہاری گردن پر سور کا قدم ہوگا۔ آخر ایسا ہی ہوا اور وہ ولایت سے معزول ہو گیا۔ قصہ یوں ہے کہ ایک دن وہ ایک یہودی لڑکی کی محبت میں یہودی مذہب قبول کرنے لگا تو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے مریدوں سے فرمایا کہ پہلے تو وہ ولایت سے معزول ہوا تھا اور اب وہ مذہبِ اسلام سے بھی خارج ہو رہا ہے۔ لوگوں نے حضرت شیخؒ سے عرض کی کہ آپ اس پر رحم فرمائیں اور اس کو اس آفت سے بچا لیں۔ آپ اس وقت وضو فرما رہے تھے، پانی کا ایک چھینٹا اس کی طرف مارا، جہاں پر سینکڑوں میل کی مسافت پر وہ یہودیت کے مذہب کو قبول کرنے ہی والا تھا۔ جب اس نے چھینٹے کا اثر محسوس کیا تو فوراً یہودیوں کو چھوڑ کر بھاگ آیا اور اس طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس کو ایک طویل مسافت سے یہودی مذہب قبول کرنے سے بچا لیا۔ ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں مگر ان کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ راقم الحروف کی اپنی بہت سی باتیں تجربے میں آئی ہیں، جن کا ذکر اس جگہ بیان کرنا مناسب نہیں کیونکہ اس میں خود پسندی کا شائبہ لازم آتا ہے۔ حال ہی کا ایک واقعہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر لکھا جا رہا ہے کہ راقم الحروف کے ایک مرید (ذوالفقار علی) نے بتایا کہ ایک رات وہ گھر کی چھت پر سونے کے لئے لیٹا تو ایک جن اس کے سینے پر آ بیٹھا اور اس کی کوشش کے باوجود ایک انچ بھی نہ سرک سکا۔ مجبور ہو کر اس

نے راقم الحروف کو آواز دی تو اس نے دیکھا کہ راقم الحروف ایک منٹ سے پہلے ہی وہاں جا پہنچا۔ راقم الحروف کو دیکھ کر وہ جن نیچے اُتر گیا اور کہنے لگا کہ تم کو میں ان کی خاطر چھوڑ رہا ہوں۔ راقم الحروف کو اس واقعہ کا بذاتِ خود علم نہیں ہوا، جس کا مطلب یہ ہے کہ کئی کام مرشد کی رُوح خود پہنچ کر انجام دے سکتی ہے اور ان حالات میں مرشد کو علم بھی نہیں ہوتا۔ حضرت عبیداللہ احرار نے ایسے کئی واقعات بیان کئے ہیں جو مکتوباتِ شریف میں مطالعہ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ جن والا واقعہ سینکڑوں لوگوں نے ذوالفقارعلی سے خود سنا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تین میل کے فاصلے سے چیونٹی کی آواز سنی اور جب وہاں پہنچے تو اس کو اپنے ہاتھ پر رکھا۔ حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ، اسماعیل شاہ صاحبؒ، مولانا قاسم موہڑویؒ اور دیگر بہت سے بزرگوں کی ایسی کرامات کتابوں میں مذکور ہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست　　　دستِ او جز قبضہء اللہ نیست

مرشد کا ہاتھ دُور والوں سے کوتاہ نہیں کیونکہ اس کا ہاتھ اللہ کی قدرت کے علاوہ کچھ نہیں۔ (۳۱۲/۱)

مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات ایک صاحبِ صلاحیت پیر کی مرید کے لئے نسبت کافی سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مرید کو کچھ مدت تک پیر کی خدمت میں حاضر رہنے اور تصفیۂ باطن (تزکیۂ قلب) کے لئے اس کے زیرِ ہدایت اشغال و اعمال بجا لانے کا موقع میسر نہ ہوا ہو تو بھی دُور ہی سے پیر کی توجہ اس کے باطن کی اِصلاح کرتی ہے۔ انبیاء و اولیاء کا ہاتھ اللہ کے ہاتھ سے جدا نہیں تو جب اللہ کے دستِ قدرت کے لئے بعید و قریب سب یکساں ہیں تو اولیاء کرامؒ کا دستِ تصرف بعید والوں پر کیوں موثر نہ ہوگا۔

غائباں را چوں چنیں خلعت دہند　　　حاضراں از غائباں لاشک بہند

جب وہ دُور والوں کو ایسی خلعت (فیضان) عطا فرماتے ہیں تو حاضرین بے شک غائبوں سے بہتر خِلعت پانے والے ہیں۔ (۳۱۲/۱)

غائباں را چوں نوالہ مے دہند　　　پیشِ مہماں تاچہ نعمتہا نہند

جب وہ غیر حاضروں کو (فیضِ باطنی کا) لقمہ دیتے ہیں تو وہ اپنے پاس حاضر مہمانوں کے آگے (فیوضِ رُوحانیہ کی) کیا کیا نعمتیں نہ رکھتے ہوں گے، لہٰذا اہلِ کمال کے انتساب اور ان کی خدمت کی حاضری کو سعادتِ دارین کا وسیلہ سمجھنا چاہیئے۔ (۳۱۲/۱)

کو کسے کو پیشِ شہ بندد کمر　　　با کسے کو ہست از بیرونِ در

کہاں وہ شخص جو بادشاہ کے حضور میں کمرِ خدمت باندھ لے اور کہاں وہ جو دروازہ سے باہر کھڑا ہو۔ (۳۱۲/۱)

اگر کوئی شخص اللہ کی طرف بغیر مرشد کے راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں بھی کوئی شیخ مدد کرتا ہے، خواہ وہ مرشد نزدیک ہو یا دُور۔ آپؒ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را بُرید ہم بعونِ ہمتِ مرداں رسید

جو شخص شاذ و نادر اس راہِ سلوک کو تنہا ہی طے کر گیا ہے تو وہ بھی مردانِ حق کی دُعا اور توجۂ باطن کی مدد سے منزل مقصود کو پہنچا ہے۔ (۳۱۲/۱)

طالبِ حکمت شو از مردِ حکیم
(کسی مردِ حکیم سے حکمت تلاش کرو)

علمائے کرام اور مشائخ عظام یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو دُنیاوی زندگی میں فضول اور لغو کاموں میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اپنی زندگی میں کی جانے والی نیکیاں ہی انسان کے لئے سرمایۂ آخرت ہیں۔ اگر اس زندگی کو اس راہ پر لگا دیا جائے جو خدا اور رسول ﷺ کو پسند ہے تو انسان دُنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکتا ہے، ورنہ وہ دُنیا پر ایک بوجھ کی مانند اپنی عمرِ عزیز کو گنوا دے گا۔ زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے کسی دانا اور حکیم کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان اپنی مراد کو پہنچے۔ اگر ایسا مردِ حکیم (یعنی جس کو اللہ نے حکمت عطا کی ہو) مل جائے تو انسان میں علم دین کے چشمے پھوٹ نکلیں گے اور طالبوں کو اس طرح ایک کامیاب ابدی زندگی ہاتھ آ جائے گی۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

طالبِ حکمت شو از مردِ حکیم تا ازو گردی تو بینا و علیم

مردِ حکیم سے حکمت طلب کرو، تاکہ تم اس سے صاحبِ بصیرت اور بڑے دانا بن جاؤ۔ (۱۳۴/۱)

آبِ عذبِ دیں ہمی جوشد ازو طالباں را زاں حیات ست و نمو

دین کا شیریں پانی اس سے پھوٹ کر نکلتا ہے، جس سے طالبوں کو (ابدی) زندگی اور پھلنا پھولنا نصیب ہوتا ہے۔ (۱۳۳/۱)

فرماتے ہیں کہ انسان دُنیا میں خواہ کتنا ہی کمال حاصل کر لے، وہ اس سے نہ تو یہ زندگی سنوار سکتا ہے اور نہ آخرت میں اس کو کچھ حاصل ہوگا۔ شیخِ کامل ہی ایسے مردانِ حق ہیں جو حصولِ علم اور حکمت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ دُنیا کے عاشق لوگ تو ایسے ہیں جیسے غلاف میں لکڑی کی تلوار ؎

در یکے گفتہ کہ استادے طلب عاقبت بینی نیابی در حسب

ایک (دفتر) میں کہا کہ مرشد تلاش کر، (محض) ذاتی فضائل کی بدولت عاقبت بینی حاصل نہ ہوگی۔ (۸۰/۱)

ہم نشینِ اہلِ معنی باش تا ہم عطایابی و ہم باشی فتیٰ

اہلِ معنی کا ہم نشین ہو تاکہ (ان کے فیضِ صحبت سے فضائلِ اخلاق کا) انعام بھی پائے اور جوانمرد (عارف) بھی بن جائے۔ (۱۰۰/۱)

جانِ بے معنی دریں تن بے خلاف   ہست ہمچوں تیغ چوبیں در غلاف

بے شک بے معنی جان اس بدن میں ایسی ہے، جیسے ایک لکڑی کی تلوار غلاف میں۔ (۱/۱۰۰)

مرد باش و سُخرۂ مرداں مشو   رو سرِ خود گیر و سرگرداں مشو

مرد بن اور لوگوں کا بیگاری نہ بن جا، (اپنی ذاتی تحقیق سے) خود اپنی فکر کر اور پریشان نہ ہو۔ (۱/۸۰)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اٹلی کا ایک سفیر آیا، جس نے آپؓ کی صحبت میں اسلام کی باتوں کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی عظمت کا معتقد ہو گیا۔ فرماتے ہیں جو شخص مردِ خدا نہیں، اس سے ایسے کام بعید از قیاس ہیں بلکہ وہ تو انسان کی قابلیتوں کو ختم کر دیتا ہے ؎

غیرِ مردِ حق چو ریگِ خشک داں   کابِ عُمرت را خورد او ہر زماں

جو شخص مردِ خدا نہیں اس کو خشک ریت سمجھو، جو ہر دم تمہارے آبِ عمر کو جذب کیے جا رہا ہے۔ (۱/۱۳۴)

منبعِ حکمت شود حکمت طلب   فارغ آید اُو زِتحصیل و سبب

طالبِ حکمت، حکمت کا سرچشمہ بن جاتا ہے (اور وہ) تحصیل (کے درجۂ طریق) اور حصولِ علم کے اسباب (ظاہری) سے فارغ ہو جاتا ہے۔ (۱/۱۳۴)

شیخِ کامل بود و طالبِ مشتہی   مرد چابک بود مرکب در گہی

اِدھر پیر یعنی حضرت عمرؓ کامل تھے۔ (اُدھر) مرید (یعنی سفیر) ہمہ تن شوق تھا، مردِ شہسوار چالاک اور سواری تیار تھی۔ (۱/۱۶۹)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اور جعلی پیروں میں بہت فرق ہے، اس لئے کوشش کرو کہ تم اپنے مقام پر پہنچ جاؤ، ورنہ پھر باہر ہی لٹکے رہو گے۔ جب تک اپنے شیخ کی سختیاں برداشت نہ کرو گے تو تمہارے دل کا آئینہ صیقل یعنی چمکدار نہیں ہو سکتا، اگر تم مرشد کی سخت و نرم گفتگو کو برداشت کرو گے تو ایک دن تم بھی یگانۂ روزگار بن جاؤ گے ؎

فرق بسیارست ناید در حساب   آں زاہلِ کشف و ایں زاہلِ حجاب

(ان دونوں میں) بہت فرق ہے جو حساب میں نہیں آ سکتا، وہ اہلِ کشف میں سے ہے اور یہ اہلِ حجاب میں سے۔ (۱/۳۱۲)

جہد آں کن تا رہے یابی دُروں   ورنہ مانی حلقہ وار از در بروں

(اے طالب) کوشش کرو تا کہ تم کو اندر جانے کا راستہ مل جائے، ورنہ تم زنجیر کی طرح باہر کے باہر رہو گے۔ (۱/۳۱۲)

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش   سست و ریزندہ چو آب و گل مباش

جب تم نے پیر بنا لیا تو نازک دل نہ رہو، گارے کی طرح سست اور بکھر جانے والا نہ ہو۔ (۱/۳۱۲)

مطلب یہ کہ مرید کو چاہیے کہ متحمل مزاج اور صابر و شاکر اور جفاکش بن جائے، پیر جو کچھ حکم دے اس پر اپنا مال و جان، آل و اولاد قربان کر دے ؎

نرم گوید سخت گوید خوش بگیر　　　تا کند بر جملہ میرانت امیر

وہ کوئی آسان (کام کا) حکم دے یا سخت (مجاہدہ کرنے کو) کہے، خوشی سے قبول کرو تاکہ تمہیں وہ سب بزرگوں کے سرداروں کا سردار بنا دے۔ (۳۱۲/۱)

ور بہر زخمے تو پُر کینہ شوی　　　پس کُجا بے صیقل آئینہ شوی

اور اگر تم ہر مشقت (مجاہدہ) پر کُڑھنے لگو (تو اتنا سوچو) کہ صیقل ہوئے بغیر آئینہ کیونکر بن سکتے ہو۔ (۳۱۲/۱)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ بے نُور اور کھردرے لوہے نے سوہان کی متواتر خراش اور آلۂ صیقل کی پیہم رگڑ کے صدمات سہہ کر یہ درجہ حاصل کیا ہے کہ وہ نورٌ علیٰ نور بن گیا۔ تم بھی اگر اپنے قلب کو مصفا اور رُوح کو منور بنانا چاہتے ہو تو صبر و تحمل کے ساتھ سوہانِ ریاضت اور مشکل مجاہدہ کے صدمات برداشت کرو۔ اس کے بغیر رُوح اور قلب آئینہ نہیں بن سکتے۔ ''اخلاقِ جلالی'' میں لکھا ہے کہ بعض حکماء اوباش لوگوں کو اس غرض سے نقد انعام دیتے تھے کہ وہ ان کو بَرملا گالیاں دیا کریں تاکہ ان کا نفس ذلیل ہو۔

از حدیثِ اولیاء نرم و درشت　　　تن مپوشاں زانکہ دینت را ست پشت

اولیاء کرامؒ کی نرم و سخت باتوں سے پہلوتہی نہ کر، کیونکہ وہ تمہارے دین کے پشت پناہ ہیں۔ (۲۲۵/۱)

گرم گوید سرد گوید خوش بگیر　　　تا زگرم و سرد بجہی وز سعیر

(خواہ وہ) گرم فرمائیں یا سرد کہیں خوشی خوشی قبول کرو تاکہ تم (دُنیا میں) مصائب و نوائب سے اور (آخرت میں) عذابِ جہنم سے نجات پاؤ۔ (۲۲۵/۱)

مطلب یہ ہے کہ بزرگانِ دین کی ہر شیریں و تلخ بات کو گوشِ توجہ سے سُننا اور حُسنِ قبول کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیئے تاکہ وہ تمہاری اِصلاح کے لئے درسِ ہدایت بنے۔

گرم و سردش نو بہارِ زندگی ست　　　مایہء صدق و یقین و بندگی ست

ان کا گرم و سرد (کہنا) زندگی کی نوبہار ہے، (ان کا یہ کہنا) صدق و یقین اور بندگی کا سرمایہ ہے۔ (۲۲۵/۱)

زانکہ زاں بستانِ جانہا زندہ است　　　زاں جواہر بحرِ دل آگندہ است

کیونکہ ان (کے ملفوظات) سے اَرواح کے باغ تر و تازہ ہوتے ہیں، ان جواہرات (کے گرانمایہ اقوال) سے دل کا دریا پُر ہو جاتا ہے۔ (۲۲۵/۱)

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا

(جو اللہ کی ہم نشینی چاہتا ہے)

مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم نشین ہونا چاہتا ہے، اسے کہو کہ وہ اولیاء اللہ کے ساتھ بیٹھے۔

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا ہے کہ ''اولیائے کرامؒ کے ساتھ ایک گھڑی بیٹھنا سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔'' حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوباتِ شریف میں لکھا ہے کہ ''سایۂ راہبر بہ است از ذکرِ حق'' (یعنی پیر کا سایہ ذکرِ حق سے بہتر ہے) آپؒ نے فرمایا ہے کہ مذکورہ مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو اولیائے کرامؒ کے فیض اور صحبت سے محروم ہے، اسے ذکرِ حق سے وہ مراتب حاصل نہ ہوں گے جو فوائد کسی شیخ کی صحبت میں بیٹھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ گویا صحبت شیخ ایک اناڑی ناتجربہ کار انسان کے لئے فائدے کے اعتبار سے ذکر سے بہتر ہے۔

مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ تمہارا فکر یا تصورِ شیخ رُوح کی فکر ہے۔ تمہارا نقد کھوٹا ہے اور اس کا نقد کھرا ہے۔ تمہارا شیخ کے ساتھ اس قدر اتحاد ہونا چاہیئے کہ اس میں اور تم میں کوئی فرق نہ رہے۔ ان کی خدمت میں لگے رہو، ورنہ تمہارا وہی حال ہوگا جیسے اژدھے کے منہ میں ریچھ کا حال، اگر مردِ خدا اس کی مدد کو نہ پہنچتا تو یقیناً وہ ہلاک ہو جاتا۔ اسی طرح نفس کے پنجے سے نجات کا ملنا شیخ کی تعلیمات کے اثر سے ممکن ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ''اِنَّ الشَّیْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ کَذِئْبِ الْغَنَمِ یَأْخُذُ الشَّاۃَ وَالْقَاصِیَۃَ وَالنَّاحِیَۃَ'' یعنی شیطان انسان کا بھیڑیا ہے جس طرح بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے۔ وہ الگ چرنے والی، دور رہ جانے والی اور کنارہ کشی کرنے والی بکری کو پکڑ کر لے جاتا ہے۔ (مسند احمد)

فکرِ تو نقش ست و فکرِ اوست جاں   نقدِ تو قلب ست ونقدِ اوست کاں

تمہارا فکر تصویر ہے اور اس کا فکر روح ہے، تمہارا نقد کھوٹا ہے اور اس کا نقد مدنی (یعنی کھرا) ہے۔ (۱۹۳/۲)

او توئی خود را بجو در اُوئے اُو   گو د گو گو فاختہ شو سُوئے اُو

(شیخ میں اور تم میں یہاں تک اتحاد ہو کہ گویا) وہ تم ہی ہو، پس اپنے آپ کو اس کی ہستی میں تلاش کرو اس کو اپنا نصب العین بنا کر فاختہ کی طرح گوگو بولا کرو۔ (۱۹۳/۲)

ور نخواہی خدمت ابنائے جنس   در دہانِ اژدہائی ہمچو خرس

اور اگر تم حضرات اہلِ اللہ کی خدمت کرنا نہ چاہو گے تو (یاد رکھو) تمہاری وہی مثال ہے جیسے اژدھے کے منہ میں ریچھ۔ (۱۹۳/۲)

پیر کی خدمت سے کنارہ کشی کرنے والا مرید شیطان کا شکار ہو جاتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ دُنیا کے آلام اور غموں میں تمہارا سرخم نہ کیا جائے تو کسی بزرگ کے پاؤں میں آ جاؤ، اگرچہ تم بادشاہ ہو تب بھی اپنے مرتبے کا خیال نہ کرو اور ان کی ہم نشینی اختیار کرو تا کہ اللہ تعالیٰ کی ہم نشینی میسر ہو۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خُدا   گو نشیند در حضورِ اولیا

جو شخص خداوند تعالیٰ کا ہم نشین بننا چاہے، اسے کہو کہ وہ اولیاء اللہ کے حضور میں بیٹھے۔ (۲۰۹/۲)

سر نخواہی کہ رود تو پائے باش　　در پناہِ قطبِ صاحب رائے باش

اگر تم چاہتے ہو کہ سر نہ جائے تو ہمہ تن پاؤں بن جاؤ اور کسی قطب صحیح الرّائے کی پناہ میں رہو۔ (۱۹۳/۲)

گرچہ شاہی خویش فوقِ او مبیں　　گرچہ شہدی جز نباتِ او مچیں

اگر چہ تم بادشاہ ہو مگر اپنے آپ کو اس (اُستاد یا شیخ) سے فائق نہ سمجھو، اگر چہ تم شہد ہو (مگر) اسی کے فیض کی شکر چنتے رہو۔ (۱۹۳/۲)

تمہارا مرتبہ علم میں استاد سے اور کمالاتِ باطن میں شیخ سے بڑھ جائے گا مگر اپنے آپ کو کبھی بھی اس پر ترجیح نہ دو بلکہ اس کو اپنے آپ سے افضل سمجھو اور اس کی اتباع کرو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے ؎

اے خدا ایں سنگدل را موم کن　　نالہء او را خوش و مرحوم کن!

الٰہی! اس سنگدل (مرید) کو رقّت و نرمی میں مثلِ موم بنا دے! اس کے گریہ کو مبارک اور باعثِ رحمت بنا دے۔ (۱۹۴/۲)

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

(جو خدمت کرتا ہے، وہی مخدوم بنتا ہے)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ طریقت میں بجز خدمتِ خلق اور کوئی چیز نہیں۔ اس میں عبادات کا مقصد یہی ہے کہ بندہ خدمت کرنے کے قابل ہو جائے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست　　بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

طریقت سوائے خدمتِ خلق کے اور کچھ نہیں اور یہ تسبیح، مصلّٰی اور گودڑی کا نام نہیں ہے۔

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ عبادت اللہ کی ہوتی ہے اور خدمت اس کی مخلوق کی، اگرچہ یہ دونوں کام اللہ کے لئے ہوتے ہیں مگر خدمت رایگاں نہیں جاتی۔ عبادت کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ کوئی بھی اس کے معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا۔ پھر بھی عبادت خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، ضائع ہو سکتی ہے۔ مگر خدمت خواہ کتنی ہی حقیر یا معمولی کیوں نہ ہو، مقبول ہوتی ہے اور رَد نہیں کی جاتی۔

خدمت کے مقام کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرامؑ کو خدمت کے لئے مامور فرمایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی ''اے داؤد! جب تو میرے لئے کسی کو طالب دیکھے تو اس کا خادم بن جا۔'' یَا دَاوٗدُ اِذَا رَاَیْتَ لِیْ طَالِبًا کُنْ لَهٗ خَادِمًا (حدیثِ قدسی)

مولانا رومؒ نے اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے ؎

ہرکرا بینی طالب اے پسر　　یار او شو پیش او انداز سر

اے بیٹے! اگر تو کسی کو میرا طالب دیکھے تو اس کا دوست بن جا اور اس کے سامنے اپنا سر رکھ دے۔

روایات میں ہے کہ حضرت علی فارمدیؒ مسجد میں آئے۔ اس وقت حضرت ابوالقاسم قشیریؒ غسل خانے میں غسل فرما رہے تھے تو انہوں نے غسل خانے میں دو ڈول پانی کے ڈال دیئے۔ جب مسجد میں گئے تو حضرت ابوالقاسمؒ نے مصلی پر بیٹھ کر دریافت فرمایا کہ غسل خانے میں پانی کس نے ڈالا تھا۔ حضرت ابوعلی فارمدیؒ فرماتے ہیں کہ میں چُپ رہا، حتیٰ کہ جب آپ نے تین بار پوچھا تو میں نے عرض کی کہ میں نے پانی ڈالا تھا۔ فرمایا کہ اتنی خدمت پر آپ نے ستر سال (۷۰) کی عبادت کا ثواب حاصل کر لیا ہے۔

مشائخ کا قول ہے کہ جو بھی خدمت کرتا ہے وہ مخدوم بن جاتا ہے پھر لوگ اس کی خدمت کرنے لگتے ہیں ۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد — آں کہ خود را دید او محروم شد

جو بھی خدمت کرتا ہے وہ مخدوم بن جاتا ہے، جس نے اپنے آپ کو دیکھا تو وہ محروم رہ گیا۔ (مشائخ)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ اور اسلام کی مال و منال سے اور دیگر طریقوں سے اس قدر خدمت کی کہ حضور ﷺ فرمایا کرتے کہ اگر کوئی دُنیا میں چلتا پھرتا مردہ دیکھنا چاہتا ہے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے جو صدیقیت کی وجہ سے محشر میں لوگوں کے سردار ہوں گے۔ آپ کا ایمان اس قدر کامل تھا کہ پوری اُمت کے ایمان سے بڑھ کر آپ اکیلے شخص کا ایمان تھا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ۔

ہر کہ خواہد کو بہ بیند در زمیں — مردہ را می رود ظاہر چنیں

جو چاہے کہ زمین پر دیکھے مردے کو، جو بظاہر چل رہا ہے۔ (۶/۸۷)

سر ابوبکرِ تقی را گو بہ بیں — شد زصدیقی امیر المحشریں

کہہ دو کہ وہ متقی ابوبکرؓ کو دیکھ لے، جو صدیقیت کی وجہ سے حشر والوں کے سردار ہوں گے۔ (۶/۸۷)

اندر ایں نشأۃِ نگر صدیق را — تا بحشر افزوں کنی تصدیق را

تو اس زندگی میں صدیق کو دیکھ لے تا کہ حشر کی تصدیق میں اضافہ کر سکے۔ (۶/۸۷)

خواجگاں ایں بندگیہا کردہ اند

(آقاؤں نے درویشوں کی غلامیاں کی ہیں)

طریقت میں جو لوگ اولیائے کرامؒ کی خدمت کرتے ہیں تو ان کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ یہ خدمت کا موقع اُنہیں نصیب ہوا ہے۔ ایک شخص کسی خلیفۂ وقت کی مجلس میں حاضر ہوا تو دورانِ گفتگو خلیفہ نے کہا کہ تم بہت بداخلاق انسان ہو، تو اس نے کہا کہ میں بداخلاق کیسے ہو سکتا ہوں جب کہ مجھے حضرت جنیدؒ کی مجلس آدھے دن کے لئے حاصل کرنے کا موقعہ مل چکا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ جو شخص جنید بغدادیؒ کی مجلس میں رہا ہو وہ بداخلاق نہیں ہو سکتا۔

روایات میں ہے کہ جب رسولِ اکرم ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ شریف کے قرب و جوار میں ہی تھے تو ایک جگہ لوگوں کا ہجوم ہو گیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ساتھ تھے اور لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ

یہی ہیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بات کا احساس ہوا تو آپ پنکھا لے کر حضور ﷺ کو جھلنے لگے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ تو اُن کے خادم ہیں۔ (رسولِ عربیؐ سیرت کی کتاب)

بزرگوں نے اسی طرح اپنے بزرگوں کی خدمت کی تا کہ ان کو خدمت یا غلامی کا شرف حاصل ہو جائے۔

خواجگاں ایں بندگیہا کردہ اند تا گماں آید کہ ایشاں بردہ اند

(اسی طرح سلسلہ طریقت یا درویشی میں) آقاؤں نے فقیروں کی غلامیاں کی ہیں، تا کہ (دیکھنے والوں کو) یہ گمان ہو کہ (یہ حضرات) غلام ہیں۔ (۱۴۹/۲)

مولانا رومیؒ کے اس قول سے یہ مراد ہے کہ جو فی الحقیقت آقا ہوئے ہیں انہیں خاکساری کا طریقہ آتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے ہوئے ہیں اور بندے سے بندگی کے سوا اور کچھ وقوع میں نہیں آتا۔ اس کے بعد مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم بھی کمالِ لازوال کے خواہاں ہو تو پختہ ہو جاؤ، پھر تم بھی خامی سے دُور رہو گے اور حضرت برہان الدین محققؒ کی طرح سراپا نور بن جاؤ گے۔ اگر تم اپنے آپ سے نکل گئے تو خود کو دیکھنے سے بچ جاؤ گے اور برہان الدین ثانیؒ یا پھر صلاح الدین زرکوب بن جاؤ گے۔

ہیچ انگورے دگر غورہ نشد ہیچ میوہ پختہ باگورہ نشد

کوئی انگور (پک چکنے کے بعد) دوبارہ کچا نہیں بن سکتا، کوئی میوہ دوبارہ خام نہیں ہوسکتا۔ (۱۳۴/۲)

پختہ گرد و از تغیر دور شو رَو چو بُرہانِ محققِ نور شو

اگر تم بھی کمالِ لازوال کے خواہاں ہو تو پختہ ہو جاؤ اور پھر تغیر (خامی) سے دور ہو جاؤ گے، جاؤ حضرت برہان الدین محقق کی طرح (سراپا) نور بن جاؤ (جس پر دوبارہ ظلمت کی دسترس نہیں ہوسکتی)۔ (۱۳۴/۲)

چوں زخود رستی ہمہ برہاں شدی چونکہ گفتی بندہ ام سلطاں شدی

جب تم اپنی خودی سے چھوٹ جاؤ گے تو مجسم برہان الدین (ثانی) بن جاؤ گے جب تم (کمالِ عبودیت پر فائز ہونے کے بعد) کہو گے کہ میں بندہ ہوں تو اس وقت تم (اقلیمِ ولایت کے) سلطان ہو جاؤ گے۔ (۱۳۴/۲)

ور عیاں خواہی صلاح الدین نمود دیدہا را کرد بینا و کشود

اگر علانیہ (اس کا ثبوت) چاہتے ہو تو شیخ صلاح الدین (زرکوب) نے دکھا دیا ہے کہ انہوں نے آنکھوں کو بینا کر دیا ہے۔ (۱۳۴/۲)

درتنِ کنجشک چہ بود برگ وساز

(چڑیا کے پوٹے میں کون سی بڑی چیز ہے)

ایک بزرگ کے سامنے عام لوگوں کی کیا حیثیت ہے، ایک بڑا عالم فاضل انسان جو آسمان پر چل سکتا ہے اس کے لئے مخلوقات کے بھید معلوم کرنا کیا مشکل ہے؟ اس حقیقت پر احادیث بھی وارد ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جب

اولیاء کرامؒ کے پاس جاؤ تو دل میں ایسی کوئی بُری بات لے کر نہ جاؤ کیونکہ وہ دل کی بات کو بھی جانتے ہیں (مشائخ کا قول ہے کہ "اِنَّھُمْ جَوَاسِیْسُ الْقُلُوْبِ" اولیاء دلوں کے جاسوس ہیں)۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

درتنِ گُنجشک چہ بود برگ و ساز　　که شود پوشیدہ آں بر عقلِ باز

چڑیا کے بدن میں کہاں کا (بے پایاں) ساز و سامان ہوتا ہے، جو باز کی عقل سے پوشیدہ رہے۔ (۲/۱۴۸)

اولیاء حضرات بہ منزلہ شہباز ہیں اور عوام گویا چڑیا ہیں۔ باز جس چڑیا کو چاہے چیر پھاڑ کر اس کے اندر کا سب دانا دُنکا معلوم کر سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ معاملہ کیا مشکل ہے۔ اسی طرح یہ حضراتِ اولیاء، لوگوں کے خواطر اور ضمائر معلوم کر سکتے ہیں۔

آنکہ واقف گشت بر اسرارِ ہُو　　سرِّ مخلوقات چہ بود پیشِ اُو

جو (بزرگ) ذاتِ باری تعالیٰ کے اسرار سے واقف ہو جائے، اس کے سامنے مخلوقات کا بھید معلوم کرنا کیا (مشکل) ہے۔ (۲/۱۴۸)

آنکہ بر افلاک رفتارش بود　　بر زمین رفتن چہ دشوارش بود

جس (باکمال) کی رفتار آسمانوں پر ہو، اس کو زمین پر چلنا کیا مشکل ہے۔ (۲/۱۴۸)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ان بزرگوں کی طاقت کا اندازہ عام انسان نہیں لگا سکتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اگرچہ انسان ہی تھے مگر ان کے ہاتھ میں لوہا بھی موم بن جاتا تھا۔ حضرت لقمان علیہ السلام اپنے دُنیاوی آقا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ خود مولانا رومیؒ اپنے مرید حسام الدینؒ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ ان کے اس احترام کے باعث بعض لوگ حسام الدین کو ہی پیر سمجھتے تھے، جب کہ حسام الدینؒ مولانا رومیؒ کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ سردی کی راتوں کو دو بجے بھی اگر وضو کرنا ہوتا تو اپنے گھر جا کر وضو کرتے، حالانکہ ان کا گھر مولاناؒ کے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے متعلق مولانا رومؒ کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

در کفِ داؤد کآہن گشت موم　　موم چہ بود در کفِ اُو اے ظلوم

(جب) حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا بھی موم (کی طرح نرم) ہو گیا تو اے ظالم! اس ہٹ دھرم موم (کی) کیا (حقیقت) ہے، جو ان کے ہاتھ میں نرم نہ ہو۔ (۲/۱۴۸)

بود لقماں بندہ شکلِ خواجۂ　　بندگی بر ظاہرش دیباجۂ

(غرض) حضرت لقمان خواجہ کی شکل میں غلام تھے، غلامی ان کے ظاہر (حال) کی صرف ایک عنوان تھی۔ (۲/۱۴۹)

مسجدے کاں اندرونِ اولیاء ست

(وہ مسجد جو اولیاء کے دل میں ہوتی ہے)

حضرت سلطان باہوؒ نے ایک عارف کے دل کے متعلق فرمایا ہے کہ اس میں سمندر سے بھی گہرا پانی ہے ؎

دل دریا سمندروں ڈُوہنگے کون دلاں دیاں جانے ھُو
وچے بیڑے، وچے جھیڑے، وچے ونجھ موہانے ھُو
چوداں طبق دِلے دے اندر تنبو وانگوں تانے ھُو
جو دلدا محرم ہووے باھُو سویو رب پچھانے ھُو

ان اشعار کی تشریح تو بے حد طوالت طلب ہے، مگر مختصراً یہ ہے کہ دل کی باتوں کو سمجھنا کوئی آسان بات نہیں۔ اس میں بیڑے اور کشتیاں ہیں، جن میں سواری کی جاتی ہے اور کشتی میں بیٹھ کر قدرت کے مناظر کی بھی سیر ہوتی ہے۔ اس دل میں دُنیا کے فساد جھگڑے اور مصائب بھی نظر آتے ہیں اور ان مشکلات کوحل کرنے کے راستے بھی اس کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ اس دل میں چودہ طبق (ناسوت، ملکوت، جبروت، لاھوت اور ھُو کے علاوہ اور بھی بہت سے طبقات ہیں) جن کا عارف اپنے دل میں نظارہ کرتا ہے۔

دل دریا سمندروں ڈونگا غوطہ مار غواصی ھُو
جے دریا ونج نوش نہ کیتا رہ سی جان پیاسی ھُو
ہر دم نال اللہ دے رکھن ذکر فکر کچھ آسی ھُو
اس مرشد تھیں زن بہتر باھُو جو فند فریب لباسی ھُو

ان اشعار سے مراد یہ ہے کہ یہ چودہ طبقات دل میں شامیانوں کی طرح اُوپر نیچے پھیلے ہوئے ہیں اور جو لوگ دل کے محرم ہیں، وہی لوگ اپنے رب کے محرم اور اس کو پہچاننے والے ہیں۔

اُوپر دیے گئے اشعار میں آپؒ نے فرمایا ہے کہ اس سمندر میں غوطہ لگا کر قدرت کے کارخانوں کی غواصی کرو، جس نے اس دریا سے پانی نہیں پیا اور غواصی نہیں کی تو وہ رُوح کے مناظرِ قدرت اور ملکوتِ سموات کے علم سے بے بہرہ رہے گا۔ جو گنہگار لوگ ہیں وہ ذکر وفکر نہیں کر سکتے اور وہ ان سمندروں کے خزانوں سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ اس لئے بے بہرہ رہتے ہیں کہ ان کے پیر صرف لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور ان کو ان کے اِسرار کی کچھ خبر نہیں دیتے۔

دلوں کی دُنیا کو سمجھنا بہت مشکل امر ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ اولیائے کرامؒ جو کچھ دیکھتے ہیں، اپنے اندر (دل میں) ہی دیکھتے ہیں کیونکہ دلوں کی دُنیا میں ہر شے موجود ہے۔ انسان اگر اپنے اندر رُوحانی قوت اس حد تک پیدا کر لے تو اس کو انفس (انسانی دل میں نظر آنے والا ظاہر اور باطن) اور آفاق (یعنی کائنات میں جو کچھ ظاہر و باطن ہے) کی سیر ہو سکتی ہے اور ان سے بطریق کشف وشہود آگاہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ عالم حقیقتِ انسانی کا ہی تفصیلی مظہر ہے، اس لئے جو آفاق میں تفصیلی طور پر موجود ہے وہ انفس میں اجمالی (یعنی مختصر طور پر) دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تمام کائنات میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، اسے اللہ تعالیٰ

نے مختصر خلاصے کی طرح انسان کے اندر بھی منعکس کر دیا ہے اور اگر بصیرت قلبی ہو تو اپنے اندر ہر اس چیز کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو آفاق میں موجود ہے اور جو اس اجمالی شے کا ملاحظہ کر سکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو پہچاننے لگتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ زندگی سراسر اسی مجاہدے اور کوشش کا نام ہے۔ حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جو کچھ اولیاء کے دلوں کے اندر موجود ہے وہ ایک دُنیاوی مسجد میں کہاں ہے۔ اولیائے کرامؒ کے دلوں میں ہر چیز موجود ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بھی موجود ہے اور تمام لوگ اسی خدا کی طرف سجدہ کرتے ہیں۔ وہ مسجد جس میں اللہ موجود ہے، وہ اولیائے کرامؒ کے دلوں میں موجود رہتی ہے ؎

ابلہاں تعظیمِ مسجد میکنند ‏ ‏ ‏ در جفائے اہلِ دل جدّ میکنند

بے وقوف لوگ مسجد کی تعظیم کرتے ہیں (کیونکہ یہ خانۂ خدا ہے) اور اہلِ دل کو ستانے پر کمر بستہ ہیں۔ (۲/۲۹۳)

جو لوگ ان اولیائے کرامؒ سے گستاخانہ انداز سے پیش آتے ہیں ان کو معلوم ہی نہیں کہ ان کے باطن میں کون بس رہا ہے اور کس کی تجلی سے ان کے انوار درخشاں ہیں، اگر وہ یہ جانتے تو ان کو یہ جرأت نہ ہوتی۔

آں مجاز ست ایں حقیقت اے خراں ‏ ‏ ‏ نیست مسجد جُز درونِ سروراں

اے گدھو! وہ مجاز ہے، یہ حقیقت ہے، بزرگوں کے دل کے علاوہ اور کوئی مسجد نہیں ہے۔ (۲/۲۹۳)

مسجدے کاں اندرونِ اَولیاء ست ‏ ‏ ‏ سجدہ گاہِ جملہ است آنجا خدا ست

وہ مسجد جو اولیاء کے باطن میں ہے، تمام (مخلوق) کے لئے سجدہ گاہ ہے، (کیونکہ) وہاں خدا (کے انوار جلوہ فگن) ہیں۔ (۲/۲۹۳)

اندرونِ اولیاء مسجد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اولیاء کرامؒ کے قلوب کی یہ حیثیت ہے کہ اس کی ہر شے تابع ہوتی ہے، یہی کیفیت بعض مرتبہ بہ شکلِ سجدہ نظر آتی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان حضرات کے قلوب تو وہ ہیں جن کے لئے تمام مخلوق کو تابعِ فرمان بنا دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم ظاہری بیت اللہ کی اس قدر عظمت کرتے ہیں اور دل کے اس حقیقی بیت اللہ کے ساتھ یہ افسوس ناک برتاؤ۔ افسوس صد افسوس ہوتا ہے۔ (کلید مثنوی)

کم نگردد فضلِ اُستاد از عُلُو ‏ ‏ ‏ گر اَلِف چیزے ندارد گوید اُو

کسی استاد کی بزرگی (شاگرد کی) برتری سے کم نہیں ہو جاتی، اگرچہ وہ (کسی بچے کو پڑھاتے وقت) یہ کہے۔ الف خالی (ب کے نیچے ایک نقطہ اور ت کے اُوپر دو نقطے) (۲/۳۱۲)

اگر ایک بچے کو سبق سمجھانے کے لئے ابتدا سے ہی فاضلانہ تقریریں شروع کر دیں تو بس وہ پڑھ چکا، بلکہ صحیح طریقہ تعلیم یہی ہے کہ بچے کو سبق پڑھاتے وقت تھوڑی دیر کے لئے خود بچہ بن جائیں اور اسی کی سی سادہ گفتگو، چھوٹے فقرے اور آسان بولی استعمال کی جائے۔

آں مُریدِ شیخ بد گوینده را　　آں بکفر و گمرہی آگنده را

گفت تو خود را مزن بر تیغِ تیز　　ہیں مکن با شاہ و با سلطاں ستیز

شیخ کے اس مرید نے اس معترض بدگو، لبریزِ کفر و گمراہی کو کہا تو اپنے آپ کو تیز تلوار سے نہ بھڑا (وہ کاٹ کر رکھ دے گی) خبردار! بادشاہ و سلطان سے جنگ نہ چھیڑ۔ (ورنہ پس جائے گا)　(۳۱۲/۲)

حوض با دریا اگر پہلو زند　　خویش را از بیخِ ہستی بر کند

یہ قاعدہ ہے کہ اگر حوض دریا سے ٹکرائے گا تو اپنی ہستی کو برباد کرلے گا (تُو ایک حوض ہے اور وہ دریا ہے)۔ (۳۱۲/۲)

نیست بحرے کو کراں دارد کہ تا　　تیرہ گردد اُو زمُردارِ شما

مگر وہ ایسا دریا نہیں ہے جس کا کوئی کنارہ ہو، تاکہ تمہارے مردار سے اس کا پانی گدلا ہو جائے۔　(۳۱۲/۲)

کفر را حدست و اندازہ بداں　　شیخ و نورِ شیخ را نبود کراں

کفر کی ایک تو حد اور ایک انداز ہوتا ہے (مگر) سمجھ لے کہ شیخ اور شیخ کے نور کی کوئی انتہا نہیں۔　(۳۱۲/۲)

پیش بیحد ہرچہ محدودست لاست　　كُلُّ شَيءٍ غَيْرَ وَجْهِ اللهِ فناست

اس ذات (بے حد و غایت) کے سامنے ہر چیز محدود ہے، نابود ہے (یعنی) ہر چیز جو اللہ کے سوا ہے فانی ہے۔
(۳۱۲/۲)

جب اس بندۂ خاص کو حق تعالیٰ کے ساتھ اصطلاحاً اتحاد و عینیت حاصل ہوگئی اور وہ متخلق باخلاق اللہ ہو چکا تو جس طرح حق تعالیٰ کے سامنے ہر چیز فانی و نابود ہے، اس بندے کے لئے بھی تمام اُمور حتیٰ کہ معاصی بھی فانی و نابود ہیں۔ لہٰذا وہ ان کی وجہ سے عاصی نہیں کہلا سکتا اور نہ اس پر اس کے احکام ظاہر جاری ہو سکتے ہیں "یاد رکھو ہر چیز اللہ کے سوا باطل ہے اور ہر نعمت ضرور زائل ہونے والی ہے۔"

کفر و ایماں نیست آنجائیکہ اوست　　زانکہ اُومغزست ایں دو رنگ و پوست

جس مقام پر وہ (فائز) ہے وہاں کفر نہیں ہے کیونکہ وہ تو مغز ہے اور یہ دونوں (یعنی کفر و ایمان) رنگ اور پوست ہیں۔
(۳۱۲/۲)

پھل کا رنگ اور پوست باہر ہی باہر ہوتا ہے، مغز اندر سے صاف اور سفید نکلتا ہے۔ اسی طرح یہ حضرات جس مقام پر اس وقت ہیں، وہاں کفر و ایمان کا دخل نہیں یعنی کفر اور ایمان افعالِ عباد سے ہیں اور یہ بزرگ بوجہ عینیت ان افعالِ عباد سے بے تعلق ہو چکے ہیں بلکہ خود ان کے افعال بھی اصطلاحاً افعالِ حق قرار پا چکے ہیں، لہٰذا ان کو اس مرتبہ میں نہ کافر کہہ سکتے ہیں نہ مومن اور نہ ان پر احکام ظاہری جاری ہو سکتے ہیں۔ حضرت بلّھے شاہؒ نے اسی لئے فرمایا تھا "نہ میں مومن وچ مسیتی، نہ میں کافر وچ پلیتی" مولاناؒ فرماتے ہیں۔

آں امیر از بندگانِ شیخ بود شیخ را بشناخت و سجدہ کرد زود

وہ امیر شیخ کے غلاموں میں سے تھا (جو آپ کے ایامِ سلطنت میں آپ کا مملوک تھا) اس نے شیخ کو پہچان لیا اور فوراً شاہی آداب بجا لایا۔ (۳۰۲/۲)

شیخ واقف گشت از اندیشہ اش شیخ چوں شیر ست و دلہا بیشہ اش

شیخ بھی اس کے خیال سے آگاہ ہو گئے (کیونکہ) شیخِ کامل شیر کی مانند (ہوتا) ہے اور لوگوں کے دل (گویا) اس کے جنگل ہیں کہ ان میں پھرتا اور اُن کے خیالات سے آگاہ ہوتا رہتا ہے۔ (۳۰۳/۲)

چوں رَجَا و خوف در دلہا روَاں نیست مخفی بر وےٴ اسرارِ نہاں

(شیخ) اُمید و غم کی طرح (لوگوں کے) دلوں میں چلتا رہتا ہے، (حتیٰ کہ دلوں کے) چُھپے بھید بھی اس پر مخفی نہیں رہتے۔ (۳۰۳/۲)

شیخ کو لوگوں کے دلوں کا علم باعلامِ حق ہوتا ہے نہ کہ بالاستقلال، ورنہ ایسا عقیدہ مبنی بر کفر ہوگا۔ نیز شیخ کی یہ حالت احیاناً ہوتی ہے نہ کہ دائماً اور بالاستمرار، ورنہ یہ عقیدہ بھی خلافِ اسلام ہے۔

دیدنِ آخر لقائے اصل بد

(آخری (مرشد) کو دیکھنا گویا اصل (حضور ﷺ) کو دیکھنا ہے)

ایک حدیث شریف میں حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''خوشی کی خبر ہے اس شخص کے لئے، جس نے میری زیارت کی یا میرے صحابی یا تابعین یا تبع تابعین کی زیارت کی ہو۔'' آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ مَنْ رَّاٰنِیْ فَقَدْ رَاٰنِیْ ''یعنی جس نے مجھے دیکھا، اس نے مجھے ہی دیکھا'' (الکامل امام ابنِ عدی جلد۴ ص ۱۵۵۱) ایک حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر کرتا ہے جس کا دل دُنیا سے خالی ہو اور پھر اس کی طرف جو اس شخص کے دل میں ہو اور پھر قرابت دار جو اس کے دل میں ہوں۔''

مشائخِ کرام اور مولانا رومیؒ کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ سلسلۂ بیعت کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ ایک شخص اگر کسی شیخ کی بیعت کرتا ہے تو شیخ کا ہاتھ بھی اس کے بیعت کرنے والے شیخ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، حتی کہ آخری شیخ کا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں سلسلہ وار ہاتھ میں ہاتھ ہونے سے یہ مراد ہے کہ سلسلۂ بیعت میں سب سے آخری شخص کا ہاتھ بھی گویا رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے مثال اس طرح دی ہے کہ ایک شمع سے اگر ایک چراغ جلایا جائے تو پھر اس طرح ہزاروں چراغ در چراغ جلائے جائیں تو آخری دیئے میں پہلی شمع کی روشنی موجود ہوتی ہے۔ اس مثال سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ روشنی کی ابتدا ہی جب حضور ﷺ کی شمع سے ہوئی تو گویا سب سے آخری بیعت کرنے والے کے چراغ میں حضور ﷺ کی شمع کی روشنی موجود رہتی ہے۔

گفت طُوبیٰ مَنْ رَّاٰنِیْ مُصْطَفٰی ﷺ   وَالَّذِیْ یُبْصِرُ لِمَنْ وَّجْھِیْ یَرایٰ

حضرت مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "طُوبیٰ مَن رَاٰنِیْ اَوْ رَاٰیٰ مَن رَاٰنِیْ" یعنی مبارک ہے وہ شخص جو میری زیارت کرے یا اس شخص کی زیارت کرے جس نے میری زیارت کی ہو۔ (۲۱۴/۱)

چُوں چراغے نورِ شمع را کشید   ہر کہ دید اں را یقین آں شمع دید

جب ایک چراغ نے کسی شمع سے نور حاصل کیا ہو تو جس نے اس (چراغ) کو دیکھا تو یقیناً اس نے پہلی شمع کو دیکھا۔ (۲۱۴/۱)

مطلب یہ ہے کہ اسی طرح اگر سو چراغوں تک بھی روشنی ایک دوسرے سے منتقل ہوتی جائے تو آخری (چراغ) کو دیکھنا سب سے پہلے چراغ کو دیکھنے کے برابر ہوگا۔

نکتہ! اسی طرح بیعتِ طریقت کے مشہور چاروں سلاسل میں سے کسی سلسلے کے بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی تو گویا اس نے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک کے ساتھ ملایا کیونکہ اس نے اپنے پیر کے ہاتھ سے ہاتھ ملایا ہے اور اس کے پیر نے اپنے پیر کے ہاتھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ اسی طرح یہ سلسلہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے آنحضرت ﷺ تک پہنچتا ہے، پس اس مرید نے ایسے ہاتھ کو چھوا ہے جو توارثاً رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک کو چھونے کی فضیلت حاصل کر چکا ہے۔ "فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" تم جدھر منہ کرو گے اللہ کے چہرے کو ہی دیکھو گے۔ مراد یہ ہے کہ "دید پیر دید کبریا" یعنی پیر کو دیکھنا اللہ کو دیکھنا ہے کیونکہ بیعت کا منتہا اللہ تعالیٰ پر ختم ہوتا ہے۔

ہمچنیں تا صد چراغ از نقل شُد   دیدنِ آخر لقائے اصل بُد

اسی طرح اگر وہ (روشنی) سو چراغوں میں منتقل ہو تو آخری کا دیکھنا اصل کے دیکھنے کے برابر ہے۔ (۲۱۴/۱)

خواہ از نورِ پسیں بستاں تو آں   ہیچ فرقے نیست خواہ از شمع داں

خواہ اس روشنی کو تم آخری (چراغ کے) نور سے حاصل کرو یا شمع سے دونوں صورتوں میں سمجھو، کوئی فرق نہیں۔ (۲۱۴/۱)

ہمچو موسیٰؑ زیرِ حکمِ خضرؑ رو

(موسیٰؑ کی طرح خضرؑ کے حکم پر چلو)

ایک شعر میں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے خضر علیہ السلام کے پاس حکمت اور رُشد کی باتیں سننے کے لئے گئے تھے تو خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ "تم ہماری باتوں کو سمجھ نہیں سکو گے۔" فرمایا کہ "اگر میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو میری باتوں میں سے کسی بات میں دخل نہ دینا، یہاں تک کہ میں خود ان باتوں کے متعلق تم کو بتاؤں۔" موسیٰ علیہ السلام نے یہ شرط قبول کر لی مگر

تین واقعات میں سے تینوں پر وہ صبر نہ کر سکے اور تینوں باتوں پر سوالات کئے اور باوجود وعدہ کرنے کے صبر نہ کر سکے۔ تیسری بار حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ''آپ صبر نہ کرسکیں گے اس لئے آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ حقیقت یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے اعتراضات اس لئے کئے تھے کہ وہ کام شریعتِ ظاہر کے خلاف تھے، پھر بھی کسی حکمت کے تحت وہ جائز بھی تھے یا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت وہ ٹھیک تھے۔ ان واقعات کا اظہار علامہ اقبالؒ نے یوں فرمایا ہے ؎

علمِ موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش ''کشتیءِ مسکین'' و ''جانِ پاک'' و ''دیوارِ یتیم''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ تینوں واقعات باعثِ حیرت تھے مگر علم حاصل کرنے کے لئے آپ نے خضر علیہ السلام کی پیروی کو قبول کیا۔ اسی طرح مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ طریقت میں جب پیر پکڑو تو موسیٰ علیہ السلام کی طرح اس کے حکم کو بلا چوں و چرا تسلیم کرو۔ مرشدِ کامل خواہ کچھ کرے اور اس کے اقوال و افعال گو بظاہر موردِ اعتراض ہی ہوں، مرید کو لازم ہے کہ ان پر معترض نہ ہو بلکہ اسے ان کی تاویل و توجیہ مرشد سے دریافت کرکے اپنے دل کو مطمئن کر لینا چاہیئے کیونکہ بعید نہیں کہ ان افعال و اقوال کی تہ میں ایسی مصالح مضمر ہوں، جن کا نظرِ ظاہر سے ادراک نہیں ہوسکتا، جیسے حضرت خضر علیہ السلام نے غریب ملاحوں کی ایک کشتی توڑی اور آگے جا کر ایک معصوم بچے کو قتل کر ڈالا، گو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر میں ان کے یہ دونوں فعل بموجبِ شریعت موردِ اعتراض تھے مگر ان کی تہ میں عجیب حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ کشتی کے توڑنے میں یہ حکمت تھی کہ اس وقت ایک ظالم بادشاہ کے حکم سے تمام ملاحوں کی کشتیاں جنگ کے لئے ضبط ہونے والی تھیں، مگر جب ان غریب ملاحوں کی کشتی کو شاہی ملاح نے دیکھا تو اس کشتی کو شکستہ دیکھ کر چھوڑ گیا۔ بچے کو مار ڈالنے میں یہ نکتہ ملحوظ تھا کہ وہ بچہ بڑا ہو کر ایک بَدکار اور بداعمال جوان بننے والا تھا اور اس کے والدین نیک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فرزندِ ناخلف کے شر سے بچا لیا اور اس کی جگہ ایک نیک صالح فرزند عطا فرمایا۔ اسی طرح کاملین کا بھی ہر فعل کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس پر حیران اور بَدگمان نہیں ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اس واقعہ کو مولانا رومؒ اپنے اشعار میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

گرچہ کشتی بشکند تو دم مَزَن گرچہ طفلے را کُشد تو مُو مکن

اگرچہ وہ کشتی کو توڑ ڈالنے والے ہوں تو تم دم نہ مارو، وہ کسی بچے کو مار ڈالنے والے ہوں تو تم رنج نہ کرو۔ (۳۱۱/۱)

دستِ اورا حق چو دستِ خویش خواند تایَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ براند

اللہ تعالیٰ نے اُن کے ہاتھ کو (بواسطہ رسول اللہ ﷺ کے) اپنا ہاتھ فرما دیا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہونے کا حکم مترتب کیا۔ (۳۱۱/۱)

از ہمہ طاعات اینت لائق است سبق یابی بر ہرآں کو سابق ست

یہ تمہارے لئے تمام طاعتوں سے زیادہ مناسب ہے کہ تم ہر پیش قدمی کرنے والے سے آگے بڑھ جاؤ گے۔ (۳۱۱/۱)

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو ہمچو موسیٰ زیرِ حکمِ خضرؑ رَو

جب تم کسی کے مرید ہو جاؤ تو ہمہ تن تسلیم بن جاؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت خضر علیہ السلام کے حکم میں چلو۔ (۳۱۱/۱)

صبر کن بر کارِ خضر اے بے نفاق تا نہ گویدٔ خضرؑ رو ھٰذا فِرَاق

اے مخلص! تم خضر (مرشد) کے کام پر صبر کرو تا کہ وہ یوں نہ کہدے کہ جاؤ اب تمہارا ہم سے فراق ہے۔ (۳۱۱/۱)

گر خِضر در بحر کشتی را شکست صد درستی در شکستِ خِضر ہست

اگر خضر علیہ السلام نے دریا میں کشتی کو توڑ ڈالا تھا (تو) خضر کے توڑ ڈالنے میں بھی سینکڑوں مرتیں (مخفی) ہیں۔ (۵۵/۱)

وہم موسیٰ با ہمہ نور و ہنر شُد ازاں محجوب تو بے پر مپر

(اس کا راز تم کیا سمجھو) خود موسیٰؑ کا نورانی اور خوبیوں بھرا خیال بھی اس کے سمجھنے میں در پردہ رہا، (پس) تم بے پر کی نہ اُڑاؤ۔ (۵۵/۱)

جب قدرت کے مخفی اسرار کا یہ عالم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولُو العزم پیغمبر اپنے سے کم رُتبہ نبی خضر علیہ السلام کے فعل کی حکمت کو نہ سمجھ سکے تو تم کم رُتبہ ہو کر بڑے لوگوں کے اسرار کا انکار کیوں کرتے ہو۔

حضرت خضر علیہ السلام کے علم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم ظاہراً و باطناً افضل و اکمل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علمی نور و ہنر کی شان بمقابلہ حضرت خضر علیہ السلام کے بڑھ کر تھی اور جبھی تو ان کا اسرارِ خضریہ سے خالی الذّہن ہونا باعثِ عبرت ہے، ورنہ اگر حضرت خضر علیہ السلام کا علم اعلیٰ یا واسع ہوتا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ادنیٰ و اقلِ علم پر غالب آ جاتا تو ہمارے لئے کوئی مایۂ عبرت نہ تھا۔ یہ کہنا کہ مذکورہ روایت کی رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام علمِ باطن میں حضرت خضر علیہ السلام سے کم ثابت ہوئے، یہ محض سوء فہم ہے۔ جب شریعت علم ظاہر و باطن کا مجموعہ ٹھہری تو کوئی رسول اولوالعزم جو صاحبِ شریعت ہو، جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے، علم باطن میں کسی نبی سے پیچھے نہیں رہ سکتا لیکن قتل بھی اور شکستِ کشتی اور تعمیرِ جدار (دیوار) کی حکمتوں میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لاعلم رہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک رسول صاحبِ شریعت کے لئے یہ امر ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام جزئیات کی حکمتوں پر حاوی ہو۔ حضرت خضر علیہ السلام بعض جُزوی حالات میں اصلاح الناس پر مامور تھے۔ بعض علماء صوفیہ اب بھی ایسے ہیں کہ جن کو منفرد واقعات کے متعلق خاص انکشافات و الہامات ہو جاتے ہیں اور یہ مقام حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے رسول گرامیِ قدر و صاحبِ کتاب و عاملِ شریعت کے مقام سے افضل نہیں ہو سکتا۔

دست حق میراندش زندہش کند زندہ چہ بود جانِ پائندہش کند

(تو اس بچے) کو اللہ کا ہاتھ ہی مارتا ہے (اور) اس کو زندہ کرتا ہے، زندہ کیا (بلکہ) اس کو ابدی زندگی بخشتا ہے۔ (۳۱۲/۱)

ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہؓ سمیت حج کرنے کی نیت سے مکہ معظمہ کا قصد کیا، چونکہ جنگ اور معرکہ کا ارادہ نہ تھا اس لئے کوئی سامانِ جنگ ساتھ نہ لیا بلکہ صرف قربانی کے اونٹ ہمراہ لئے اور سفر بھی ذیقعد کے مہینے میں کیا، جس میں عرب ہرگز جنگ نہیں کرتے تھے اور ہر ایک دشمن بلا مزاحمت مکے میں آنے جانے کا مجاز سمجھا جاتا تھا۔ جب مکہ نو میل رہ گیا تو آپ ﷺ نے مقامِ حدیبیہ میں قیام فرمایا اور حضرت عثمان بن عفانؓ کو سفیر بنا کر اہلِ مکہ کے پاس بھیجا کہ آپ کے آنے کی اُنہیں اطلاع پہنچائیں اور مکہ میں آنے کی ان سے اجازت حاصل کریں۔ حضرت عثمانؓ کے جانے کے بعد مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ قریش نے ان کو قتل کر دیا ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بے سر و سامان جمعیت سے جان نثاری کی بیعت لی کہ اگر قریش سے لڑنا پڑے تو ثابت قدم رہیں گے۔ اس بیعت کا ذکر قرآنِ مجید میں سورہ الفتح میں آیا ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ''یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ'' کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے، چونکہ حضرت خضر علیہ السلام پیغمبر تھے تو ان کا ہاتھ بھی اللہ کا ہاتھ ہوا، لہٰذا ان کا ایک بچے کو قتل کرنا گویا خود اللہ کا فعل ہے جو قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتا، پھر فرماتے ہیں کہ ایسے ہاتھ سے قتل ہونا گویا جی اُٹھنا ہے۔ راہِ سلوک کے طے کرنے کے لئے کسی مرشدِ کامل کی رہنمائی ضروری ہے۔ صرف اپنی رائے و قیاس سے طریقت کو بجا لانے کی کوشش کرنا اور کتبِ تصوف کا مطالعہ کرکے اشغال و اعمالِ سلوک میں مصروف ہونا غیر مفید بلکہ بعض اوقات مضر و مہلک ہوتا ہے۔

حسد   نبود   اگر   تو   امتحانِ   رسد   کے   مارا   کردیم   کامتحاں

جادوگروں نے کہہ دیا کہ حضرت! ہم نے آپ کی آزمائش کی تھی کہ آپ جادوگر ہیں یا نبی اور یہ غلطی ہم سے کم بخت حسد نے کروائی، حسد نہ ہوتا تو ہمیں آپ کی آزمائش سے کیا سروکار تھا۔ (۱۲۶/۳)

الٰہ   درگاہِ   الخاص   خاصُ   تو   اے   خواہ   عذر   مارا   و   شاہیم   مجرم

(ہم شاہِ حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ) کے مجرم ہیں، آپ ہمارے لئے عذر خواہی فرمایئے، آپ تو درگاہِ خدا کے خاص الخاص (مقرب) ہیں۔ (آپ کی سفارش کیوں نہ قبول ہوگی) (۱۲۶/۳)

زدند   می   سر   زمیں   بر   موسیٰ   پیشِ   شدند   نیکو   زماں   در   و   کرد   عفو

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو) معاف کر دیا تو فوراً وہ اچھے ہو گئے (اور بطور عذر مزید) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگے جھکے اور دوہرے ہونے لگے۔ (۱۲۶/۳)

عدد   بے   فضلِ   و   الطاف   ترا   اے   بد   کردیم   ما   کہ   ما   از   گزر   در

اور کہتے تھے کہ یا حضرت! ہم سے درگزر فرمایئے، بے شک ہم نے بُرا کیا، آپ کی تو مہربانیاں اور بخششیں بے شمار ہیں۔ (۱۲۶/۳)

گفت موسیٰ عفو کردم اے کرام گشت بر دوزخ تن و جاں تاں حرام

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے شریفو! میں نے معاف کیا، تمہارے جسم و جاں پر آگ حرام ہے۔ (۱۲۶/۳)

موسیٰ و فرعون در ہستیء تُست باید ایں دو خصم را در خویش جُست

موسیٰ اور فرعون خود تمہاری ہستی کے اندر موجود ہیں، ان دونوں حریف طاقتوں کو خود اپنے اندر تلاش کرو۔ (۱۲۷/۳)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں، چنانچہ تمہاری روحِ انسانی موسیٰ علیہ السلام ہے، عقل معاد ہارون ہے، قرآن مجید عَصا ہے، نورِ توحید یدِ بیضا ہے، نفسِ امارہ فرعون ہے، عقلِ معاش ہامان ہے، فسق و فجور اور عصیان وطغیان کے خیالات جادوگر ہیں۔ اگر تم موسیٰ (روح) کا اتباع کرو گے تو عقل معاد کو مشیر بناؤ گے، عصا قرآن اور یدِ بیضا کو نور اور نورِ توحید کو برحق سمجھو گے اور فرعونِ نفس کی تحقیر و تذلیل کرو گے، عقلِ معاش کی گرویدگی سے بچو گے، فسق و فجور کے خیالات سے دل کو پاک رکھو گے تو واصل باللہ ہو جاؤ گے اور اگر اس کے خلاف کرو گے تو تمہاری کشتیء نجات کا خداحافظ۔

تا قیامت ہست از موسیٰ نتاج نور دیگر نیست دیگر شُد سراج

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس نور کا سلسلہ قیامت تک کے لئے چل رہا ہے۔ نور سب میں ایک ہے، دوسرا نہیں۔ ہاں! چراغ دوسرا ہو جاتا ہے۔ (۱۲۷/۳)

مولانا رومیؒ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اژدھا کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ جادو کرنا حرام ہے لیکن اس جادو کے فعل سے دو جادوگر جو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے کے لئے بلائے تھے، اسلام کے شرف سے مشرف ہو گئے۔ ان کا قصہ بہت دلچسپ اور رُوحانی معیار کا حامل ہے مگر اس جگہ اس کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ دونوں جادوگروں کو معلوم ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں، لہٰذا توبہ کی اور اسلام قبول کر لیا، مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

بعد ازاں شُد اژدہا و حملہ کرد ہر دو آں بگریختند و روئے زرد

اس کے بعد (وہ لاٹھی) اژدہا بن گئی اور حملہ آور ہوئی، وہ دونوں بھاگ گئے اور اُن کے چہرے فق تھے۔ (۱۲۵/۳)

رو در افتادن گرفتند از نہیب غلط غلطاں منہزم در ہر نشیب

وہ ڈر کے مارے بھاگتے ہوئے لوٹ پوٹ ہو کر گڑھوں میں گرنے لگے۔ (۱۲۵/۳)

پس یقیں شاں شد کہ ہست از آسماں زانکہ می دیدند حَدِّ ساحراں

تب ان کو یقین ہو گیا کہ (یہ طاقت) عالمِ بالا سے ہے، کیونکہ وہ جادوگروں (کی طاقت کی حد کو دیکھتے (اور پہچانتے) تھے۔ (۱۲۵/۳)

پس ازیں رو علمِ سحر آموختن نیست ممنوع و حرام ممتَہَن

(مولانا رومیؒ فرماتے ہیں) پس اس پہلو سے (کہ جادوگروں کی طاقت و قدرت کا اندازہ لگانے کے لئے جادو کا علم سیکھنا ممنوع، حرام اور ذلیل کام نہیں (ہاں اس کا غلط استعمال حرام ہے)۔ (۱۲۵/۳)

مولانا رومیؒ کا یہ قول ایک فتویٰ کی صورت رکھتا ہے۔ فتاویٰ شامی جلد سوم باب المرتد میں لکھا ہے کہ جادو بلااختلاف حرام ہے اور اس کو مباح سمجھنا کفر ہے۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ جو جادوگر صرف تجربہ کے لئے جادو کرے اور اس کا معتقد نہ ہو وہ کافر نہیں۔ مثنوی بحرالعلوم کی جلد اوّل میں لکھا ہے کہ جادو سیکھنا اہلِ حرب کے جادوگر کا مقابلہ کرنے کے لئے فرضِ کفایہ ہے اور میاں بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے لئے حرام ہے۔

بہر تمیزِ حق از باطل نکوست سحر کردن شد حرام اے مرد دوست

حق اور باطل میں تمیز کرنے کے لئے (جادو سیکھنا) اچھا ہے، ہاں اے دوست! جادو کرنا حرام (اور کرنے والا کافر اور واجب القتل ہے)۔ (۱۲۶/۳)

بعد ازاں اِطلاق و تپ شاں شد پدید کارِ شاں تانزع و جاں کندن رسید

اس کے بعد ان دونوں جادوگروں کو دست لگ گئے اور بخار چڑھ گیا، (حتیٰ کہ) ان کی حالت نزع اور جان کنی تک پہنچ گئی۔ (۱۲۶/۳)

پس فرستادند مردے در زماں سوئے موسیٰ از برائے عذرِ آں

تب انہوں نے فوراً ایک آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اس کے عذر کے لئے بھیجا۔ (۱۲۶/۳)

مولانا رومیؒ ایک اور قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بادشاہ کو اپنی کنیز سے بہت محبت تھی وہ اچانک بیمار ہوگئی اور بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ بادشاہ اللہ کے سامنے گڑگڑایا تو اللہ نے اس کے پاس ایک طبیب بھیجا، جس نے معلوم کیا کہ وہ لڑکی ایک زرگر (سُنار) سے محبت کرتی ہے۔ یہ بات اس نے لڑکی کی نبض سے پہچانی اور طبیب نے لڑکے کے شہر اور محلے کا پتہ کروایا۔ اس لڑکے کو بلایا گیا تو لڑکی ٹھیک ہوگئی۔ معلوم کیا گیا کہ یہ لڑکے کی کس چیز پر عاشق ہے؟ تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکی اس کے بالوں پر عاشق ہے۔ لڑکے کے بال کٹوا دیئے گئے تو لڑکی نے اس سے نفرت کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد الہامِ خداوندی کے تحت اس طبیب نے لڑکے کو مروا دیا۔ یہ فیصلہ شہوت کے تحت نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے الہام سے ہوا۔ (قاضی کو شریعت نے اجازت دی ہے کہ کسی بُری بات کے مرتکب کو عام سزا دے یا پھانسی کا حکم دے)۔

گرنبودے کارش اِلْہامِ اِلٰہ اُو سگے بُودے درانندہ نہ شاہ

اگر اس (بادشاہ) کا کام الہام (پر مبنی) نہ ہوتا تو (فی الواقع) وہ ایک پھاڑ کھانے والا کتا ہوتا، نہ کہ بادشاہ۔ (۵۵/۱)

بادشاہ نے وہ خون نفسانی خواہش سے نہیں کیا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ تم سُنار کے متعلق بدگمانی اور جھگڑا چھوڑ دو کہ وہ بادشاہ کی کنیز پر عاشق تھا اور پھر اس نے زرگر کو قتل کرا دیا، جو کنیز کا محبوب تھا۔ اس سے کہیں اس غلط فہمی میں نہ پڑ جانا کہ بادشاہ نے محض رقیبانہ حسد میں اپنی شہوت پرستی کے خیال سے زرگر کو ہلاک کیا کیونکہ بادشاہ تو ایک صالح اور مرد پاکباز تھا۔ اس پر ایسا گمان ہی بے جا ہے۔ باقی رہی نوعیتِ واقعہ، سوسینکڑوں ایسے واقعات ہماری نظر

سے گزرتے ہیں کہ ہم ان کی ظاہری صورت سے کچھ قیاس کرتے ہیں مگر نفس الامر میں اس کا سلسلۂ اسباب کچھ اور ہوتا ہے۔ انسان معمولی سے معمولی واقعات کی حقیقت فہمی سے عاجز ہے تو وہ خدا کی بڑی بڑی حکمتوں کو کیا سمجھے، یعنی اگر زرگر کو محض اپنے نفس کی خاطر قتل کیا ہوتا تو اس کا یہ فعل اس کتے کے فعل سے مشابہ ہوتا جو کسی بے گناہ کو پھاڑ کھاتا ہے۔

پاک بود از شہوت و حرص و ہوا　　　نیک کرد اُو لیک نیکِ بدنما

وہ نفسانی خواہش اور حرص و ہوا سے پاک تھا، اس نے جو کچھ کیا اچھا کیا، لیکن ایسا اچھا جو (بظاہر) بُرا لگتا ہے۔ (۵۵/۱)

گر تو اہلِ دل نہٖ بیدار باش
(اگر تو اہلِ دل نہیں تو دل کی بیداری حاصل کرو)

ایک حدیثِ مبارکہ میں یہ مفہوم دیا گیا ہے کہ انسان دُنیاداری کے کاموں میں لغو حرکات اور گفتگو میں مصروف رہتا ہے تو شیطان اس کے دل میں چونچ رکھ دیتا ہے اور اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے اور جب انسان ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو جائے تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل سے نکال لیتا ہے۔ ایسے دل کو جو ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو ''دلِ بیدار'' کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا کلام پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے مگر مضمون کے اعتبار سے اس جگہ پھر نقل کیا جا رہا ہے۔ تفصیل کے لئے اس کتاب میں ہمارا مضمون ''انسانی زندگی انسان کے اعمال سے متاثر ہوتی ہے'' کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ شعر حسبِ ذیل ہیں ؎

دلِ بیدار فاروقیؓ ، دلِ بیدار کرّاری　　　مَسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا　　　ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک　　　نہ میری ضرب ہے کاری، نہ تیری ضرب ہے کاری

(ب۔ج۔۳۲۹)

ان اشعار کی تشریح اس قدر خوبصورت ہے کہ اس میں رُوحانیت کے بہت سے معاملات اور کیفیات کا مزہ آتا ہے۔ علامہؒ نے فرمایا ہے کہ جب تک دلِ بیدار پیدا نہ کیا جائے، اس وقت تک نہ تیری کوشش اور محنت کام آئے گی اور نہ ہی میری کوئی کوشش کام آ سکتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک انسان خود اپنے چراغِ دل کو نہیں بھڑکائے گا، اُس وقت تک اس پر رُوحانیت کا رنگ ہرگز نہیں چڑھ سکتا۔ راقم الحروف نے ایک دن علامہ اقبالؒ کے مزار پر کشف القبور کے ذریعے سے کچھ احوال معلوم کئے۔ علامہ اقبالؒ نے بیداریٔ دل کے لئے ہمیں یہ نصیحت فرمائی کہ میرا شعر تمہارے چہرے کے سامنے میرے مزار کی دیوار پر لکھا ہوا ہے، اس پر عمل کریں، وہ آپ کے حال کے مطابق ہے۔ مراقبہ کے بعد جب دیکھا تو وہ شعر حسبِ ذیل تھا ؎

چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم   در این زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند

میں نے اپنا چراغ (دل) خود ہی بھڑکایا ہے کہ اس زمانے میں دستِ کلیم (بزرگوں کا ہاتھ) آستین میں چھپا ہوا ہے۔

(اقبالؒ) (ز۔ع۔۵۱۸)

اس شعر سے بھی وہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ بزرگوں کا ہاتھ جب کسی زمانے میں مریدوں کے دلوں پر لگایا جاتا تھا تو ان کے قلوب جاری ہو جاتے تھے مگر اب بزرگوں کا یہ دستور نہیں رہا، چنانچہ علامہ کی بات پر عمل کیا تو کامیابی حاصل ہوئی۔ کبھی کسی زمانے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ پیر و مرشد اگر ایک بار مرید کی طرف دیکھ لیتے تو ان کا معاملہ درست ہو جاتا۔ حافظ شیرازیؒ کا درج ذیل شعر بھی انہی معنوں کی غمازی کرتا ہے ؂

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشہء چشمے بما کنند

وہ لوگ جو اپنی ایک نظر سے خاک کو کیمیا بنا دیتے ہیں، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اپنی ایک نظر ہماری طرف کریں۔

(حافظ شیرازیؒ)

روایات میں ہے کہ فخرالدین رازیؒ ایک دن رُوحانی کیفیت میں اپنے گھر سے باہر آئے تو دروازے کے سامنے ایک کتا بیٹھا ہوا تھا۔ آپ کی ایک نظر اس پر پڑی تو وہ کتا سرمست ہو گیا اور جھومتا ہوا قبرستان کی طرف نکل پڑا۔ وہ کتا جدھر سے بھی گذرا، اس علاقے کے کتے اس کے پیچھے چلنا شروع ہو گئے۔ جب وہ کتا قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا تو تمام کتے اس کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ مولانا رومیؒ کے ایک شعر میں اس واقعہ کا بھی ذکر ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوباتِ شریف میں مذکورہ حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دل ایک نورانی چیز ہے، مگر گندے خیالات اور بُرے اعمال سے اس پر سیاہی کے دھبے لگ جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے، پھر ذکرِ الٰہی کی ضربیں لگانے سے اس کی سیاہی یا زنگ بالکل دُور ہو جاتا ہے اور دل نورانی ہو جاتا ہے۔ یہی دل دلِ بیدار کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس انسانی نفس جس کا مقام انسان کی ناف سے ذرا نیچے ہوتا ہے، اس کی اصل (اصلیت) نورانی نہیں بلکہ خباثت پر ہے اور خبث اس کی ذاتی صفت ہے۔ فرماتے ہیں نفس کو کسی طریقے سے ٹھیک نہیں کر سکتے کیونکہ اس کو جتنا رگڑو گے اس کے اندر سے خبث ہی نکلتا نظر آئے گا، البتہ اگر نفس کو ذکر کے ذریعے رُوح کے تابع کر دیا جائے تو پھر یہ اپنی سرکشی اور بغاوت سے باز آ جاتا ہے۔ طریقت میں ذکر اسی لئے کیا جاتا ہے کہ نفس رُوح کے ماتحت رہ کر عمل کرے۔ ذکر کا طریقہ جو شیخ اپنے مریدوں کو بتاتا ہے اس میں نفس کو رُوح کے تحت کرنے کا طریقہ بھی بتایا جاتا ہے۔ راقم الحروف نے نفس کے موضوع پر "تہذیب نفس" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی ہے، جو اِن شاء اللہ جلد ہی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے اور اِن شاء اللہ اس کتاب کے ساتھ ساتھ ہی شائع ہو جائے گی۔ بیداریٔ دل پر مولاناؒ فرماتے ہیں ؂

ور دلت بیدار شد میخسپ خوش　　نیست غائب ناظرت از ہفت و شش

اگر تمہارا دل بیدار ہو جائے تو مزے سے سوتے رہو پھر بحالتِ خواب بھی تمہاری نظر ہفت (افلاک) اور شش (جہات) سے غائب نہ ہوگی۔ (۱۲۵/۳)

گفت پیغمبر کہ خسپد چشم من　　لیک کے خسپد دلم اندر وسن

روحِ کائنات و معلمِ کائنات حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن نیند میں میرا دل کب سوتا ہے۔ (۱۲۵/۳)

حضور پاک ﷺ نے فرمایا ہے "عَینَایَ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ عَنْ رَبِّیْ" یعنی میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل پروردگار کی طرف سے غافل نہیں ہوتا ۔

شاہ بیدار ست و حارسِ خفتہ گیر　　جاں فدائے خفتگانِ دل بصیر

فرض کرو کہ پہرہ دار سو گیا لیکن بادشاہ تو جاگتا ہے، (پھر کیا خطرہ ہے) ان سونے والوں پر جن کا دل بیدار ہوتا ہے، جان قربان کر دینی چاہیے۔ (۱۲۵/۳)

وصفِ بیداریٔ دل اے معنوی　　می نگنجد در ہزاراں مثنوی

اے معنے دان! دل کی بیداری کا بیان ہزاروں مثنوی کی کتابوں میں بھی نہیں سما سکتا، (لہٰذا اس کو یہیں چھوڑ کر اصل قصہ چھیڑنا چاہیے)۔ (۱۲۵/۳)

چوں بدیدندش کہ خفت است او دراز　　بہر دُزدیٔ عصا کردند ساز

جب اُن دونوں (جادوگروں) نے انہیں دیکھا کہ وہ پاؤں پسارے سو رہے ہیں تو عصا کو چرانے کی تیاری کرنے لگے۔ (۱۲۵/۳)

ساحراں قصدِ عصاَ کردند زُود　　کز پسِش باید شدن واں را ربُود

جادوگروں نے جلدی عصا کا قصد کیا کہ ان کے پیچھے جانا چاہیئے اور پھر (اسے) اُڑا لینا چاہیئے۔ (۱۲۵/۳)

اندکے چوں پیشتر کردند ساز　　اندر آمد آں عصا در اہتزاز

جوں ہی تھوڑا سا آگے بڑھنے لگے تو وہ لاٹھی حرکت میں آ گئی۔ (۱۲۵/۳)

آنچناں بر خود بلرزید آں عصا　　کاں دو بر جا خشک گشتند از وجا

وہ لاٹھی اس طرح خود بخود جُھرجھری لینے لگی کہ وہ دونوں مارے خوف کے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ (۱۲۵/۳)

ایں چراغِ شمس کو روشن بود　　نز فتیلہ و پنبہ و روغن بود

دیکھو! یہ سورج کا چراغ جو روشن رہتا ہے، بتی، روئی اور تیل سے (روشن) نہیں (بلکہ اُس کی روشنی من جانب اللہ ہے)۔ (۱۵/۳)

سقفِ گردُوں کو چنیں دائم بود نز طناب و استنے قائم بود

آسمان کی چھت جو یوں ہمیشہ سے (قائم) ہے، یہ رسی اور ستون سے قائم نہیں (بلکہ بامرِ حق قائم ہے)۔ (۱۵/۳)

قوتِ جبریلؑ از مطبخ نبوُد بُود از دیدارِ خلاقِ ودود

اسی طرح جبریل علیہ السلام کی یہ طاقت (کہ وہ لمحہ بھر میں آسمانوں کے اُوپر سے دُنیا پر وحی لے آتے تھے) کسی باورچی خانہ (کے گوناگوں کھانوں کے تناول) سے نہ تھی بلکہ رُوحانی قوت تھی (جو عالم کو پیدا کرنے والے اور مہربان خدا کے دیدار کی برکت سے حاصل ہوئی تھی)۔ (۱۵/۳)

جب قرآنِ پاک کے یہ کلمات نازل ہوئے کہ "ذِی قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْن" (یعنی جبرائیل علیہ السلام طاقت ور ہے اور مالکِ عرش بریں یعنی خدا کی جناب میں اس کا بڑا درجہ ہے۔ (التکویر:۲۰) آپ ﷺ نے جبریلؑ سے استفسار فرمایا کہ کائنات کی ہر شے کو میری رحمت سے حصہ ملا ہے، یہ بتاؤ کہ تمہیں میری رحمت سے کیا ملا ہے تو اس پر انہوں نے جواب دیا میں نے اپنے دونوں بازوؤں کے زور سے قومِ لوط کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ اس شعر میں جو دیدارِ اخلاق کو قوتِ جبریلؑ کی عِلت قرار دیا ہے تو لفظ "عِنْدَذِیْ الْعَرش" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ہمچنیں ایں قُوتِ اَبدال حق ہم زحق داں نز طعام و نز طبق

اسی طرح ان اولیاء اللہ کی قوت (جن میں تم بھی شامل ہو) حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھو، نہ کہ طعام اور طعام سے لبریز تھال سے۔ (۱۶/۳)

جسم شانرا ہم زنُور اسرشتہ اند تا زرُوح و از ملک بگذشتہ اند

ان کے جسم کو بھی نور سے بنایا گیا ہے، حتیٰ کہ وہ (انسانی) رُوح اور فرشتوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ (۱۶/۳)

چونکہ مُوصُوفی باوصافِ جلیل زآتشِ نمرود بگذر چُوں خلیلؑ

چونکہ تم متخلق باخلاق اللہ ہو، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ سے بچ کر نکل جاؤ۔ (۱۶/۳)

ایں سِفال و ایں فتیلہ دیگرست لیک نُورش نیست دیگر زاں سرست

خوب سمجھ لو کہ مٹی کا چراغ اور یہ بتی تو بدل جاتی ہے، لیکن اس کا نور نہیں بدلتا۔ (وہ) اپنی جانب سے (ایک ہی نور) ہے۔ (۱۲۸/۳)

چونکہ دُنیا قیامت تک قائم رہے گی، قیامت تک کے لئے موسیٰ علیہ السلام کے قدم بہ قدم چلنے والے پیدا ہوں گے اور یہ ولایتِ موسیٰؑ کے وارث ہوں گے (اس سے موجودہ بنی اسرائیل کی قوم مراد نہیں) کیونکہ ہر ولی کسی نہ کسی نبی کے قدم پر ہوتا ہے، پس وہ نورِ ولایت جو موسیٰؑ میں تھا، سلسلہ وار قائم ہے اور قائم رہے گا۔ قیامت تک کے لئے حضرت موسیٰؑ سے سبقِ نصیحت موجود ہے، انفس میں بھی اور آفاق میں بھی ۔

گر نظر در شیشہ داری گُم شَوی　　زانکہ از شیشہ است اَعداد و دُوئی

اگر تم نے نور کو مدِّ نظر نہ رکھا بلکہ شیشہ میں نظر جمائے رہے تو گمراہ ہو جاؤ گے کیونکہ شیشہ سے تعداد اور دوئی پیدا ہوتی ہے۔ (۱۲۸/۳)

وَر نظر بر نُور داری وارہی　　از دوئی و اعْدَادِ جسم اے مُنْتَہی

اگر تُو نُور پر نظر رکھے گا تو نجات پا جائے گا، اے باکمال! جسم کی دوئی اور تعداد سے۔ (۱۲۸/۳)

از نظر گاہ است اے مغزِ وجود　　اِختلافِ مومن و گبر و جُہود

اے خلاصۂ کائنات! نقطۂ نظر کی وجہ سے ہے، مومن، آتش پرست اور یہودی کا اختلاف۔ (۱۲۸/۳)

(یعنی اگر تم نور پر نظر رکھو گے تو اے باکمال! تم جسم کی اثنیتِ دوئی اور تعداد (کے جھگڑے) سے چھوٹ جاؤ گے۔ اے طالب (جو اپنے حسنِ لیاقت سے گویا خلاصۂ مخلوقات ہے) مسلمانوں، آتش پرستوں اور یہودیوں کا (مذہبی) اختلاف ان کے نقطۂ نظر ہی کے سبب سے تو ہے)۔ حقیقت تو ایک ہے مگر اس کو ادراک کرنے والوں کی نگاہیں مختلف ہیں پھر طریقِ ادراک بھی مختلف ہے۔ وہ اپنے اپنے طریق سے اس حقیقتِ واحد کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں اور اس سے مختلف نتیجے نکالتے ہیں۔ پس یہی باعث ہے اختلافِ مذاہب کا۔

اے ضیاء الحق حُسام الدیں بیار　　ایں سُوم دفتر کہ سُنّت شد سہ بار

اے ضیاء الحق حسام الدین اب یہ تیسرا دفتر بھی چھیڑ دو، کیونکہ تین بار کلام کرنا سنت ہے۔ (۱۵/۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باقی حکایت کو مولاناؒ آگے بیان فرماتے ہیں ؎

جانِ بابا! چونکہ ساحر خواب شُد　　کار اُو بے رونق و بے آب شد

جب وہ جانِ پدر جادوگر سو جاتا ہے تو اس کا کام بے رونق اور بے اثر ہو جاتا ہے (بخلاف اس کے معجزہ میں فرق نہیں آتا)۔ (۱۲۴/۳)

ہر دو از گورش رواں گشتند و تفت　　تا بمصر از بہرِ آں پیکار زفت

(یہ منکر) دونوں اس کی قبر پر سے (اُٹھ کر) فوراً اس سنگین معرکہ کے لئے مصر کو روانہ ہو گئے۔ (۱۲۴/۳)

بہر نازش بستہ او دو چشمِ سر　　عرش و فرشش جملہ در زیرِ نظر

انہوں نے بطورِ (ناز) سر کی دونوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں لیکن دل کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان کی نظر میں عرش و فرش اور تمام کائنات تھی۔ (۱۲۴/۳)

مولانا رومؒ اس ضمن میں دو آدمیوں کا ذکر فرماتے ہیں، ایک وہ شخص جس کا دل سو رہا ہو اور آنکھیں بیدار ہوں، دوسرا وہ شخص جس کا دل بیدار ہو اور آنکھیں سوتی ہوں ؎

اے بسا بیدار چشم و خُفتہ دل　　خود چہ بیند چشمِ اہل آب و گلِ

ارے بہتیرے لوگ جاگتی آنکھ اور سوتے دل والے ہیں، بھلا آب وگل وغیرہ عناصر میں مقید رہنے والوں کی آنکھ کیا دیکھ سکتی ہے۔ (۱۲۴/۳)

وانکہِ دل بیدار دارد چشم سر　　گر بخسپد بر کشاید صد بَصر

(اور بخلاف اس کے) جوشخص بیدار دل رکھتا ہے، اگر اس کے سر کی (ظاہری) آنکھیں سو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اس کی سو بینائیاں کھل جاتی ہیں۔ (۱۲۵/۳)

گر تو اہلِ دل نۂ بیدار باش　　طالب دل باش و دَر پیکار باش

اگر تم اہلِ دل نہیں ہو تو بیدار رہو، دل کے طالب بنو اور (نفس و شیطان سے) جنگ کرو۔ (۱۲۵/۳)

دِلِ بیدار حاصل کرنے کے لئے عبادات و طاعات میں شب بیداری اختیار کرو اور نفس اور شیطان جو راحت طلبی اور شہوت پسندی کی ترغیب دیتے ہیں، ان کو ترک کرو اور نفس کو مجاہدات و ریاضات سے مغلوب کرو، پھر ان تکالیف کا نتیجہ راحت نکلے گا (یعنی دل بیدار ہو جائے گا)۔

رَو بجو اقبال را از مقبلے

(جاؤ کسی مقبول بندے سے اقبال طلب کرو)

عزت اور اقبال مندی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے خزانوں سے ہی ملتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ والوں کا ادب کیا جائے۔ دل کی خوراک نُورانی اسباق ہیں اور یہ کسی دل والے سے ہی ملیں گے۔ مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ کسی اللہ والے کا دامن تھام لو تاکہ تم اس کی بزرگی اور بلندی پالو، کیونکہ نیک آدمیوں کی صحبت سے تم نیک بن سکتے ہو اور اگر بُروں کی صحبت میں جاؤ گے تو بُرے بن جاؤ گے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ انجیل میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف لکھی ہوئی ہے (اور اسی طرح قرآن، تورات اور زبور میں بھی) لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلی اُمتوں کے لوگ دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لئے آپ کا نام مبارک لے کر فتح طلب کرتے تھے مگر جب آپ مبعوث ہو گئے تو انہوں نے آپ کی مخالفت کی۔

طائفہ نصرانیاں بہرِ ثواب　　چوں رسیدندے بداں نام و خطاب

عیسائیوں کی ایک جماعت ثواب کے لئے جب حضور ﷺ کے نام اور خطاب پر پہنچتے۔ (۱۰۲/۱)

بوسہ دادندے برآں نامِ شریف　　رُونہادندے بداں وصفِ لطیف

اس مبارک نام کو بوسہ دیتے، اس پاک ذات کی تعریف پر بطورِ تعظیم منہ رکھ دیتے۔ (۱۰۲/۱)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ان کی نسلوں کے بڑھنے کے ساتھ نامِ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ان کا ساتھی اور مددگار بن

گیا لیکن ان کا ایک دوسرا گروہ اس نامِ مبارک کی بے حُرمتی کرنے لگا تو وہ ذلیل اور خوار ہو گیا۔ وہ خود بھی محروم ہو گیا اور مذہب کے آداب سے بھی محروم ہوا۔ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کا نامِ مبارک ہی اس قدر مبارک اور مدد کرنے والا ہو تو آپ ﷺ کے نور کا خود اندازہ کرلو۔

نام احمدؐ چوں چنیں یاری کُند　　تا کہ نُورش چُوں مددگاری کُند

جب حضرت محمد ﷺ کا نامِ مبارک ہی ایسی مدد کرتا ہے تو خیال کرو کہ آپ ﷺ کا نورِ پاک کس قدر مدد کر سکتا ہے۔ (۱/۱۰۳)

انجیل میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نامِ مبارک درج تھا۔ اس میں آپ ﷺ کے اوصاف جسمانیہ اور شکل و شمائل کا ذکر بھی درج تھا اور آپ ﷺ کے جہاد کرنے اور روزہ رکھنے اور کھانے پینے کا حال بھی لکھا تھا۔ نامِ مصطفیٰ ﷺ کی تعظیم کرنے والے لوگ فتنے اور خوف سے امن میں رہے۔ وہ لوگ احمد ﷺ کے نامِ پاک کی پناہ میں آ کر امیروں کی خانہ جنگی اور وزیروں کے شر سے امن میں رہے۔

رسول اللہ ﷺ کا نامِ پاک جو سریانی زبان میں انجیل کے اندر آیا ہے، اس کا ٹھیک ترجمہ احمد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو رسول اللہ ﷺ کے اسی نامِ مبارک کے ساتھ آپ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ''اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں (یہ کتاب) تورات جو مجھ سے پہلے نازل ہو چکی ہے میں اس کی بھی تصدیق کرتا ہوں (ایک اور) پیغمبر کی خوشخبری سناتا ہوں، جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام احمد ہوگا۔'' (سورۃ الصف: ۶)

ہیں غِذاے دل بِدِہ از ہمدلے　　رُو بجُو اِقبال را اَز مقبلے

ہاں! کسی دل والے سے لے کر دل کو خوراک دے، جا! کسی نصیبہ والے سے نصیبہ تلاش کر۔ (۱/۱۰۱)

دست زَن در ذیل صاحب دولتے　　تا زِافضالش بیابی رِفعَتے

کسی صاحبِ دولت کا دامن پکڑ، تاکہ اس کی بزرگی (کی بدولت) تو سربلندی حاصل کرے۔ (۱/۱۰۲)

صحبتِ صالح ترا صالح کُند　　صحبتِ طالِح ترا طالح کُند

نیک کی صحبت تجھ کو نیک بنا سکتی ہے، بدبخت کی صحبت تجھ کو بدبخت بنا سکتی ہے۔ (۱/۱۰۲)

نسل ایشاں نیز ہم بسیار شُد　　نورِ احمدؐ ناصر آمد یار شُد

ان کی نسل بھی بڑھ گئی۔ حضرت احمد ﷺ کا نورِ مبارک (ان کا) مددگار ہُوا (اور) ساتھی بن گیا۔ (۱/۱۰۲)

طالبِ کمال کے لئے اَخیار و اَبرار کی صحبت میں رہنا اور ان سے ارادت و عقیدت رکھنا لازم ہے، یعنی جب رسولِ خدا ﷺ کے نامِ پاک کے ساتھ حسنِ اعتقاد رکھنے اور اس کی تعظیم بجا لانے کی یہ برکت ہے کہ مفسدوں کے فساد اور مکاروں کے مکر سے امن رہتا ہے تو خود نام والے کی صحبت سے مستفیض ہونے اور اس کی تعظیم بجا لانے

میں کیا کچھ برکات و کرامات نہ ہوں گی۔ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام مبارک ہی حفاظت کے لئے مضبوط قلعہ ہے تو آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک کتنی محافظ ہوگی۔

غلامیٔ اولیاء

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ انسان جب اللہ تعالیٰ کے احکام کا سختی سے پابند ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کے لئے ساری مخلوق اور زمین و آسمان کے درمیان کی ہر چیز غلام ہو جاتی ہے۔ قرآن میں لکھا ہے کہ "اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّافِیۡ السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِیۡ الۡاَرۡضِ" یعنی تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا جو کچھ آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہے (لقمٰن: ۲۰) اس موضوع پر بے شمار آیات اور روایات شاہد ہیں کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نیابتِ الٰہی کا تاج پہنا دیتا ہے تو اس کی ہر شے پر حکمرانی ہو جاتی ہے۔ جب آدم علیہ السلام کو جنت سے دُنیا میں بھیجا گیا تو جبریل علیہ السلام نے دُنیا پر اللہ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کی اتباع تمام مخلوق پر واجب ہونے کا اعلان کیا اور ہر ایک نے اس کو تسلیم کیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ہے کہ آسمان کی تمام مخلوقات آپ ﷺ کی مطیع اور تابع ہے۔

مولانا رومیؒ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال پیش کرتے ہیں کہ اُنہیں آگ میں پھینکا گیا تو آگ نے آپ کو نہیں جلایا بلکہ روایات میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ نارِ نمرود میں میرا جو وقت گذرا ہے، اس سے زیادہ آرام دہ وقت میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

گردد آتش بر تو ہم بَرد و سَلام　　　اے عناصر مر مزاجت را غلام

(تو پھر) تم پر بھی آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جائے گی، (اے حسام الدین آگ، پانی وغیرہ) عناصر تمہارے مزاج کے غلام رہیں گے (سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۶۹ میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق ذکر کیا ہے)۔ (۱۶/۳)

مولانا رومؒ سورہ انبیاء کی مذکورہ آیت کو نقل فرماتے ہیں کہ ہم نے حکم دیا کہ اے آگ تو ابراہیمؑ پر ٹھنڈک اور راحت بن جا۔ مزاج کے لئے عناصر کے غلام بن جانے سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کے مزاج میں آگ سے جل جانے اور پانی میں غرق ہونے کی خاصیت ہو، اس پر آگ اور پانی حرق و غرق کا اثر نہ پہنچائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اے حسام الدین جب تک تم عناصر میں محبوس ہو، اس وقت تک ان کی تاثیرات سے متاثر اور ان کے احکام کے تابع ہو لیکن جب تم عناصر سے بالاتر ہو گئے تو وہ تمہارے مطیع اور فرمانبردار ہو جائیں گے بلکہ کائنات کی ہر چیز تمہاری تابع ہوگی۔ کشف المحجوب میں ہے کہ حضرت ابراہیم ادھمؒ ایک مرتبہ ایک جنگل سے گزرے تو ان کو سخت پیاس محسوس ہوئی۔ ایک مقام پر ایک چرواہا ملا تو آپؒ نے اس سے پانی طلب کیا تو اس نے کہا کہ یہاں تو دودھ ہے، پانی کہاں ہے۔ آپؒ نے پانی پر اصرار کیا تو چرواہا اُٹھا اور ایک پتھر پر عصا مارا تو پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ ابراہیم ادھمؒ یہ بات دیکھ کر بہت حیران ہوئے تو چرواہے نے ان کی حیرانگی دیکھ کر کہا کہ اس میں حیرانگی کی بات نہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا اطاعت گزار ہو تو ہر چیز اس کی تابعدار ہو جاتی ہے۔

اے دَریغا عرصۂ اَفہام خلق سخت تنگ آمد ندارد خلق حَلق

ہائے افسوس! مخلوق کے فہموں کی وُسعت سخت تنگ ہے (ان کو اسرار کیا سنائے جائیں) مخلوق کا حلق (رموز و اسرار کے لقمے) نگلنے کے قابل نہیں ہے۔ (۱۶/۳)

ایں مزاجت درجہانِ مُنبَسِطْ وصفِ وحدت را کنوں شُد مُلتَقِط

تمہارا یہ مزاج اس وسیع عالمِ اَرواح میں وحدت کے وصف کا جامع ہو رہا ہے۔ (۱۶/۳)

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ مزاج ایک کیفیت ہے، جو عناصر کی متضاد کیفیات سے مرکب ہے لیکن اَرواح میں حیاتِ ذاتیہ ہے جو مزاج کے ساتھ مشروط نہیں۔ جب رُوحانیت غالب ہو جاتی ہے اور جسم لطیف ہو جاتا ہے تو کیفیات سے تضاد اُٹھ جاتا ہے۔ اس طرح مزاج کیفیتِ واحدہ ہو جاتا ہے اور جب ولی اللہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اَرْوَاحُنَا اَجْسَادُنَا کا مصداق ہوتا ہے، پھر اکثر اولیاء اس مقام سے نزول کرتے ہیں اور بعض اس مقام پر مقیم رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت الیاس علیہ السلام اس مقام میں مستقر ہیں جو جسم کے ساتھ زندہ ہیں اور ان کے جسم میں رُوحانیت کی صفت پیدا ہو چکی ہے۔ یہی مراد ''ایں مزاجت در جہانِ منبسط'' سے ہے (بحرالعلوم) اے حسام الدین تمہارا جسم عالمِ اَرواح میں وحدت اختیار کر چکا ہے اور اس کے اجزا کا تضاد مرتفع ہو گیا ہے۔

بے بَصری کے باعث اہلِ دل کو حقیر نہ سمجھو

اللہ والے دُنیاوی شان وشوکت اور امارت نہ ہونے کی وجہ سے معمولی انسان معلوم ہوتے ہیں مگر ان کو معمولی نہ سمجھنا چاہیئے، یہ لوگ ذرۂ بے مقدار دکھائی دیتے ہیں اور دیکھنے میں یہ گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں مگر اس گھاس پھوس کے نیچے ایک دریا رواں ہے، جہاں تم نے ان کی تحقیر کی اور ان کو گھاس پھوس سمجھ کر پاؤں رکھا تو تم وہیں ڈوب جاؤ گے۔

اینت خورشید نہاں در ذرّۂ شیر نر در پوستین برّۂ

یہ ایک ذرے میں مخفی سورج ہیں، یہ بکری کے بچے کی کھال میں شیر (نر) ہیں۔ (۲۶۷/۱)

اینت دریائے نہاں در زیرِ کاہ پا بر ایں کہ ہیں منہ بااشتباہ

یہ لوگ گھاس کے نیچے مخفی دریا کی طرح ہیں، کہیں شبہ میں ان پر پیر نہ رکھ دینا۔ (۲۶۷/۱)

حضرت بایزیدؒ کو ایک شیخ کا کہنا کہ میرے گرد سات چکر کاٹ لو

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بایزیدؒ ایک مرتبہ حج کے لئے روانہ ہوئے، آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ انہیں کوئی خضرِ وقت مل جائے۔ فرماتے ہیں کہ راستے میں انہیں ایک بزرگ ملے۔ اس بزرگ میں بہت سی خوبیاں دیکھیں۔ حضرت بایزیدؒ سمجھے کہ ان کا درجہ قطبِ وقت سے کسی طرح کم نہیں ہے اور ان سے تواضع اور ادب سے

پیش آئے۔ اس بزرگ نے آپ سے سفر کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے اپنے ارادۂ حج کا اظہار کیا۔ بزرگ نے دریافت کیا کہ آپ گھر سے حج کے لئے کتنا خرچ لے کر چلے ہیں تو حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ ان کے پاس چاندی کے دو سو درہم ہیں۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ ابھی تم حج کرنے کے قابل نہیں ہو، میرے گرد سات بار طواف کرو اور اس کو حج سے بہتر سمجھو۔ فرمایا کہ یہ درہم جو تم لائے ہو مجھے دے دو اور جان لو کہ تمہاری مراد پوری ہوگئی۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے (ایک حدیث کے مطابق) مجھے کعبے سے زیادہ فضیلت عطا فرمائی ہے۔

مذکورہ بالا بزرگ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو تو ایک بار میرا گھر کہا ہے اور مجھ کو ستر مرتبہ میرا بندہ کہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ بزرگ بہت نحیف اور غربت کی حالت میں تھے اور اس کے علاوہ کثیر العیال بھی تھے۔ آپ نے وہ رقم ان کو دے دی۔ حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس شیخ سے بہت فیض حاصل ہوا اور میں اس وقت واقعی حج کے قابل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ" (یعنی میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کرو) (البقرہ: ۱۲۵) چنانچہ حاجی کے دل کا گھر پاک ہونا چاہیئے۔

بایزیدؒ اندر سفر جُستے بسے   تا بیابد خضر وقتِ خود کسے

(غرض) حضرت بایزیدؒ سفر میں بہت تلاش کرتے کہ کوئی (بزرگ) جو اپنے زمانہ کا خضرؑ (ثانی) ہو مل جائے۔ (۲۱۶/۲)

دید پیرے باقدے ہمچوں ہلال   یافت در وَے فرّ و گفتارِ رجال

آخر انہوں نے ایک پیر (مرد) دیکھا جس کا قد ہلال کی طرح (جھک گیا) تھا (اور) اس میں (راہِ حق) کے مردوں کا جلال اور اُن کی سی گفتگو تھی۔ (۲۱۶/۲)

دیدہ نابینا و دل چوں آفتاب   ہمچو فیلے دیدہ ہندوستان بخواب

(ظاہری) آنکھیں نابینا تھیں اور دل (کی آنکھیں) سورج کی طرح روشن تھیں، اس ہاتھی کی طرح جس نے ہندوستان کو خواب میں (دیکھنے کے بعد اپنے اصل مقام کا) مشاہدہ کیا ہو (اس لئے مست و مسرور تھا)۔ (۲۱۶/۲)

چشم بستہ خفتہ بیند صد طرب   چوں کشاید آں نبیند اے عجب

سونے والا آنکھیں بند کئے ہوئے صدہا عجائبات دیکھتا ہے، جب (آنکھیں) کھولتا ہے تو پھر ان کو نہیں دیکھ پاتا یہ عجب بات ہے۔ (۲۱۶/۲)

بس عجب در خواب روشن میشود   دِل دُرونِ خواب روزن میشود

(سونے والے پر) بہت سے عجائبات جو نمایاں ہو جاتے ہیں (تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) دل حالتِ خواب میں (عالمِ غیب کی طرف) روشندان بن جاتا ہے۔ (۲۱۶/۲)

آنکہ بیدارست و بیند خواب خوش　　عارف ست اُو خاکِ او در دیدہ کش

(بخلاف اس کے) جو (مردِ حق) بیدار ہے اور (بحالتِ بیداری) اچھا خواب دیکھتا ہے تو وہ عارف ہے، اس (کے پاؤں) کی خاک کو (سرمہ بنا کر) آنکھوں میں لگاؤ۔ (۲/۲۱۶)

بایزیدؒ اورا چو از اقطاب یافت　　مسکنت بنمود و در خدمت شتافت

بایزیدؒ نے جب ان (بزرگ) کو قطب پایا تو (ان کے سامنے) عاجزی کی اور (ان کی) خدمت (کی بجاآوری) میں سعی کرنے لگے۔ (۲/۲۱۶)

پیشِ اُو بنشست و مے پُرسید حال　　یافتش درویش و ہم صاحب عیال

(بایزیدؒ) اس کے سامنے بیٹھے اور حال پوچھا تو ان کو غریب اور عیال دار پایا۔ (۲/۲۱۶)

گفت عزم تو کُجا اے بایزید　　رُخت غربت را کجا خواہی کشید

(اس بزرگ نے) پوچھا، اے بایزیدؒ! تمہارا قصد کہاں کا ہے؟ (اپنا) سامانِ سفر کہاں لے جاؤ گے۔ (۲/۲۱۶)

گفت عزمِ کعبہ دارم از وَلہ　　گفت ہیں با خود چہ داری زادِ رَہ

بایزیدؒ نے کہا (آج) شوق سے کعبہ کا قصد کر رہا ہوں، فرمایا: یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ راستے کا خرچ کیا کچھ ہے۔ (۲/۲۱۶)

گفت دارم از درم نقرہ دویست　　نک بہ بستہ سخت بر گوشہ رویست

بایزیدؒ نے کہا، میرے پاس چاندی کے دو سو درہم ہیں، دیکھئے چادر کے کونے میں مضبوط بندھے ہوئے ہیں۔ (۲/۲۱۶)

گفت طَوفے کُن بگردم ہفت بار　　وِیں نکو تر از طوافِ حج شمار

(اس بزرگ نے کہا) تم میرے گرد سات بار طواف کرو اور اس کو طوافِ حج سے بہتر سمجھو۔ (۲/۲۱۶)

واں درم ہا پیشِ من نہ اے جواد　　داں کہ حج کردی و حاصل شد مراد

اور (اے سخی) ان درہموں کو جو تمہارے پاس ہیں، میرے سامنے رکھ دو پھر سمجھ لو کہ تم نے حج کر لیا اور (تمہاری) مراد پوری ہوگئی۔ (۲/۲۱۶)

عمرہ کردی عُمر باقی یافتی　　صاف گشتی بر صفا بشتافتی

اگر تم میرا طواف کر لو (تو پھر گویا) تم نے عمرہ کر لیا اور اس کی بدولت لازوال عمر پا لی اور تمام نفسانی آلائشوں سے پاک ہوگئے (اور گویا تم) کوہِ صفا پر (بھی) دوڑ لئے۔ (۲/۲۱۷)

حقِ آں حقیکہ جانت دیدہ است　　کہ مرا بر بیتِ خود بگزیدہ است

(قسم ہے اس حق تعالیٰ کی جس کی تجلیات) کا تمہاری رُوح نے مشاہدہ کیا ہے کہ اس نے مجھے اپنے خانہ کعبہ پر فضیلت بخشی ہے۔ (۲/۲۱۷)

احادیث میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے کعبہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ بے شک حق تعالیٰ نے تجھے شرف بخشا ہے مگر ایک مومن کا خون تجھ سے زیادہ اشرف ہے۔ (ترمذی شریف)

دل بدست آور کہ حجِ اکبر ست — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتراست

خانہ کعبہ بھی بے شک مظہرِ تجلیاتِ حق ہے مگر جو تجلیات انسانِ کامل پر وارد ہوتی ہیں وہ کعبہ پر نہیں ہوتیں۔ (غیر مثنوی)

چُوں مرا دیدی خدا را دیدۂ — گردِ کعبہ صِدق بر گردیدۂ!

جب تم نے میری زیارت کر لی تو (بس گویا) خدا کو دیکھ لیا (اور) کعبہ مبارک کے گرد طواف کر لیا۔ (۲/۲۱۷)

چونکہ مجھ کو حق تعالیٰ کے ساتھ اصلی اتحاد حاصل ہے اس لئے میرا دیدار گویا حق تعالیٰ کا دیدار ہے اور میرا طواف ایک طرح حقیقی کعبہ کا طواف ہے۔

خدمت من طاعت و حمدِ خُداست — تا نہ پنداری کہ حق از من جُداست

میری خدمت کرنا خداوند تعالیٰ کی اطاعت اور حمد (کے برابر) ہے، خبردار! یہ نہ سمجھنا کہ حق تعالیٰ مجھ سے جُدا ہے۔ (۲/۲۱۷)

چشم نیکو باز کن درمن نِگر — تا بہ بینی نورِ حق اندر بشر

اچھی طرح آنکھیں کھول کر مجھے دیکھو تا کہ تمہیں حق تعالیٰ کا نور انسان میں نظر آ جائے۔ (۲/۲۱۷)

کعبہ را یکبار بَیتِی گفت یار — گفت یَاعَبدِی مرا ہفتاد بار

کعبہ کو تو (اس) محبوبِ حقیقی نے صرف ایک مرتبہ میرا گھر کہا ہے (اور) مجھ کو ستر مرتبہ میرا بندہ کہہ کر پکارا ہے۔ (۲/۲۱۷)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ" اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کو کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو، طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔ (البقرہ : ۱۲۵) مطلب یہ کہ کعبہ کو صرف ایک مرتبہ بیتی کہہ کر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور مجھے ایک مرتبہ چھوڑ ستر مرتبہ عبدی کہہ کر یہ شرف بخشا گیا ہے، جو میرے کعبہ سے افضل ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔

بایزیدؒا کعبہ را دریافتی — صد بہا وَ عز و صد فر یافتی

(پس) اے بایزید! تم کو کعبہ مل گیا (اب) تمہیں (من اللہ) سو سو رونق، عزت اور شوکت حاصل ہوئی۔ (۲/۲۱۷)

بایزیدؒ آں نکتہا را ہوش داشت — ہمچو زرّیں حلقہ اش در گوش داشت

حضرت بایزیدؒ نے ان نکتوں کو (خوب) یاد رکھا (اور) سونے کی بالی کی طرح ان کو کان میں ڈال لیا۔ (۲/۲۱۷)

آمد از وے بایزیدؒ اندر مزید منتہیٰ در منتہیٰ آخر رسید

اس (تعلیم) سے حضرت بایزیدؒ کو (پیش از پیش) ترقی حاصل ہوئی (اور) وہ آخری سے آخری (درجۂ کمال) کو پہنچ گئے۔ (۲/۲۱۷)

حضرت بایزیدؒ پہلے بھی کامل تھے مگر اب ان بزرگ کے فیضِ صحبت سے اکمل الکاملین اور سلطان العارفین بن گئے، یہاں تک کہ آپ نے اولیاء اللہ کی خدمت وصحبت سے فیض حاصل کرنے کی تاکید کی تھی۔

بر نیائی با وے و استیزِ اُو رَو بِرِ یارے بگیر آمیزِ او

اگر تم اس کے مقابل اور اس کی مخالفت کی طاقت نہیں رکھتے تو پھر کسی مرشد کے پاس جاؤ اور اس کی رفاقت اختیار کرو۔ (۲/۲۱۹)

اگر خود اتنی طاقت نہ ہو کہ نفس کے مکر وفریب کو سمجھ کر اس کی مخالفت کرو اور اس پر غالب آؤ تو پھر کسی محققِ کامل کا اتباع اختیار کرو، جو طالبوں کو مکائدِ نفس وشیطان سے بچا کر صراطِ مستقیم پر چلانے کی ہمت رکھتا ہو۔

از بروں پیرست و در باطن صبی کیانند است آں ولی و آں نبی

ظاہر میں وہ بوڑھا ہے اور باطن میں بچہ ہے (جانتے ہو) وہ کیا ہے؟ وہ ولی ہے، وہ نبی ہے۔ (۲/۲۹۲)

مولانا رومیؒ نے بڈھے کے لفظ سے پیر کو اور جگہوں پر بھی تعبیر کیا ہے، خواہ وہ عمر میں نوجوان ہی ہو۔ لفظِ پیر ہر نبی اور ولی پر صادق آتا ہے۔ پیرانِ طریقت بڑھاپے کے باوجود متحمل مزاج ہوتے ہیں اور خدا کی طرف یکسوئی اختیار کئے ہوتے ہیں۔ پیروں کی مثال بچوں سے بھی دی جاتی ہے کیونکہ وہ کمالاتِ باطن میں نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بچے کی ماں کی بجائے اللہ تعالیٰ ان کی کفالت کرتا ہے اور وہ بغض وکینہ سے پاک رہتے ہیں۔ وہ دُنیا کی دلچسپیوں سے منسلک نہیں رہتے اور دُنیا کی دیگر تمام خواہشات سے بے تعلق رہتے ہیں۔

حضرت بایزیدؒ کی ایک بزرگ کی صحبت کے بعد حج کی کیفیات

حضرت بایزید بسطامیؒ نے مذکورہ بالا بیان کے مطابق اپنے حج کا زادِراہ اس بزرگ کو دے دیا اور حج کے بغیر ہی واپس چلے گئے۔ اس بزرگ سے ان کو بہت رُوحانی فوائد حاصل ہوئے اور اس کے بعد آپ نے کئی حج کئے اور ان میں محسوس کی گئی کیفیات آپ نے متعدد بار بیان فرمائی ہیں۔

حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ میں تین مرتبہ حج پر گیا اور ہر بار ایک نئی کیفیت محسوس ہوئی، جس کا ذکر ہماری تصنیف ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں کیا گیا ہے۔ یہاں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک مقام پر فرمایا کہ ''حرم وہ جگہ نہیں جہاں مجاہدہ ہوتا ہے بلکہ وہ جگہ ہے جہاں حق تعالیٰ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کی تعظیم کی جاتی ہے۔'' آپ نے فرمایا ''وہ بندہ جس کے لئے جہان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قربت، محبت، اُنس اور خلوت کا باعث بنتی نظر نہیں آتی تو اس بندہ کو اللہ تعالیٰ کی دوستی کی ہوا بھی نہیں پہنچی اور جہاں بندے پر مکاشفے کا دروازہ کھل جائے تو اس کے دل کی

آنکھ بھی کھل جاتی ہے۔ ایسے شخص کے لئے تمام چیزیں حرم کعبہ بن جاتی ہیں۔'' فرماتے ہیں کہ ''جب بندہ حجاب میں ہوتا ہے، یعنی جب اس کے دل کی آنکھ بند ہو جائے تو اس وقت اس کے لئے حرم کعبہ میں سب سے زیادہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔'' کسی شاعر نے کہا ہے ''اَظْلَمُ الْاَشْیَاءِ دَارُالْحَبِیْبِ بِلاَحَبِیْبِ'' (کشف المحجوب) تمام چیزوں سے تاریک ترین چیز محبوب کا وہ گھر ہے جس میں محبوب نہ ہو۔ دوستی کے مقام میں دوست کا مشاہدہ اور اس کی رضا کی قدر و قیمت ہوتی ہے، نہ کہ عمارت کی۔

حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں، عشاق اپنے حبیب کے پردوں میں گم رہتے ہیں کیونکہ محبت محبوب کے وجود کو ثابت کرتی ہے اور دوسرے وجود کا ہونا دوئی کا تقاضا کرتا ہے۔ اصل توحید دوئی کا وجود نہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں پہلی بار حج کو گیا تو صرف اللہ تعالیٰ کا گھر ہی نظر آیا اور گھر والا نظر نہیں آیا تو میں سمجھ گیا کہ حج مقبول نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں یہ کہا کہ ایسے پتھر تو میں نے کئی بار دیکھے ہیں۔ دوسری مرتبہ حج پر گیا تو اللہ کے گھر کو دیکھا اور گھر والے کو بھی دیکھا، میں سمجھ گیا کہ حقیقتِ توحید ابھی منکشف نہیں ہوئی کیونکہ قدیم (یعنی اللہ) کے ساتھ حادث (یعنی بیت اللہ) بھی نظر آ رہا ہے۔ فرمایا، تیسری بار گیا تو تمام کا تمام جلوۂ خداوندی نظر آیا، نہ بیت اللہ تھا اور نہ کچھ اور، اس پر آواز آئی ''اے بایزیدؒ! اگر تو خود کو بھی نہ دیکھتا تو یہ شرک نہ ہوتا۔ اب جب کہ تو تمام عالم کو اپنے ساتھ دیکھ رہا ہے تو یہ شرک ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے توبہ کی اور توبہ کرنے سے بھی توبہ کی کیونکہ توبہ کرنے والا اپنے وجود کو مان کر توبہ کرتا ہے اور اپنا وجود ثابت کرنا شرک ہے۔ آپ نے ایک بار اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ آپ تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے تو جواب ملا، ''از خود گزشتی رسیدی'' یعنی تو اپنے آپ سے نکل گیا تو پہنچ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ طریقت میں اپنے وجود کو ثابت کرنا شرک کی طرح ایک درجہ رکھتا ہے۔

پس ہلاکِ نار نورِ مومن است

(مومن کا نور جہنم کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے)

جب ذکرِ الٰہی کیا جاتا ہے تو مومن کے دل میں ایک ایسی حرارت پیدا ہوتی ہے جو جہنم کی آگ سے بھی ستر گنا تیز ہے۔ اس دُنیا کی آگ کا درجۂ حرارت تقریباً ۱۸۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ ہے اور جہنم کی آگ کا اندازہ لگائیں کہ وہ اس آگ سے بھی ستر گنا تیز ہے۔ اس بات کی تصدیق اس حدیث سے ہوتی ہے کہ مومن جب پل صراط سے گذرے گا تو جہنم اس کو کہے گی کہ اے مومن! جلدی گذر جا تاکہ ایسا نہ ہو کہ کہیں تیرا نور میری آگ کو بجھا دے۔ جس حدیث کا مولانا رومیؒ نے مثنوی میں اشارہ کیا ہے وہ یوں ہے کہ

تَقُوْلُ النَّارُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ جُزْیَامُؤْمِنُ فَقَدْ اَطْفَاَنُوْرُکَ لَهَبِیْ (امام سیوطی ج ۱ ص ۱۳۲)

آگ مومن سے کہے گی ''اے مومن گذر جا کیونکہ تیرے نور نے میری آگ کو بجھا دیا۔''

مصطفےٰ فرمود از گفتِ جحیم　　کو بہ مومن لابہ گر گردد زبیم

حضورﷺ نے دوزخ کا قول (نقل) فرمایا ہے کہ وہ اپنے سرد ہو جانے کے خوف سے مومن سے خوشامد کرے گی۔ (۱۲۸/۲)

گویدش بگذر زمن اے شاہ زود　　ہیں کہ نورت سوزِ نارم را ربود

کہے گی اے شاہ! مجھ پر سے جلدی گذر جا، دیکھو کہ تمہارے نور نے میری آگ کے سوز کو اُڑا دیا ہے۔ (۱۲۸/۲)

اس دُنیا میں ہم کو C.G.S سسٹم (یعنی سینٹی گریڈ گرام اور سیکنڈ سسٹم) سے واسطہ ہوتا ہے اور جب روشنی (Light) کی رفتار کی جگہ نور کا سسٹم دیکھا جائے تو اس کی کیفیت اور دُنیا کی روشنی کے سسٹم کے اعداد وشمار میں بہت زیادہ فرق ہے۔ سورۃ المعارج میں ہے کہ ملائکہ زمین سے آسمان کا سفر ایک لمحہ میں طے کرتے ہیں، جب کہ یہ راستہ دُنیا کے اعتبار سے پچاس ہزار سال کی مسافت پر ہے۔ اس لئے نوری مسافت اور نوری اوقات دُنیا کی مسافت اور اوقات سے بالکل مختلف ہیں بلکہ ہر ستارے کے ٹائم میں بہت زیادہ فرق ہے۔ زمین کا ایک سال اگر ۳۶۵ دن کا ہے تو دُنیا کے سالوں کے اعداد وشمار کے حساب سے عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، سیٹرن، یورینس، نیپچون اور پلوٹو کا ایک سال بالترتیب ۸۸ دن، ۲۲۵ دن، ۳۶۵ء۲۵ دن، ۲۸۲ء۹ دن، ۱۱ء۸ سال، ۲۹ء۵ سال، ۸۴ء۸ سال، ۱۶۴ سال اور ۲۴۸ سال کے برابر ہیں۔ آئن سٹائن نے جو نور کی سپیڈ کا فارمولا پیش کیا ہے، اس نے کہا ہے کہ اگر ہم نور کے حساب سے یعنی نور کی رفتار سے زمین کے گرد چکر لگائیں تو اپنے مقام سے چلنے سے پہلے ہی واپس آ جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نور کی رفتار روشنی کی رفتار سے بے حد زیادہ ہے۔ اگر نور کے ذریعے زمین سے آسمان کا فاصلہ ایک لمحہ میں طے ہوتا ہے تو زمین کے گرد چکر لگانے کے لئے نور کے سسٹم سے ماپا ہی نہیں جا سکتا اور ایسے معلوم ہوگا کہ جیسے ہم چلنے سے پہلے ہی پہنچ گئے ہیں۔ رفتار، فاصلے وغیرہ کا نقشہ ہماری تصنیف **"نشانِ منزل"** صفحہ نمبر ۶۹ پر دیا گیا ہے۔ (روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے جب کہ نور کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا)۔

پس ہلاکِ نار نورِ مومن ست　　زانکہ بے ضد دفعِ ضد لایمکن ست

پس آتش (ذمائم) کا بجھانا (مطلوب ہوتو) مومنِ کامل کا نور (اس کو بجھاتا) ہے کیونکہ ضد کے بغیر ضد کا دفع کرنا ممکن نہیں ہے۔ (۱۲۸/۳)

نار ضِد نُور باشد روزِ عدل　　کاں زقہر انگیختہ شد ویں زفضل

آگ کا نور کی ضد ہونا قیامت کے دن (ظاہر) ہوگا کیونکہ وہ قہرِ الٰہی سے بھڑکی ہوئی ہے اور یہ اس کے فضل سے پیدا ہوا ہے۔ (۱۲۸/۲)

گر ہمے خواہی تو دفعِ شرِّ نار آبِ رحمت بر دلِ آتش گُمار

اگر تم (موجبات) آتش کے شر کو دفع کرنا چاہتے ہو، تو (تعلق شیخ سے) آبِ رحمت کو (اس) آگ کے اندر ڈال دو، وہ بجھ جائے گی۔ (۱۲۸/۲)

چشمۂ آں آبِ رحمت مومن ست آبِ حیواں روحِ پاکِ محسن ست

اس آبِ رحمت کا چشمہ مومن (یعنی پیرِ کامل) ہے (اور اس) محسن کی پاک روح (سراسر) آبِ حیات ہے (کہ انسان اس سے سیراب ہو کر زندہ و جاوید ہو جاتا ہے)۔ (۱۲۸/۲)

حسِّ و فکرِ تو ہمہ از آتش ست حسِّ شیخ و فکرِ او نورِ خوش ست

تیری حِس اور تیرا فکر (شہواتِ نفسانیہ میں مصروف ہونے کے باعث) آتشِ دوزخ کے قبیل سے ہے، (بخلاف اس کے) شیخ کی حِس اور اس کا فکر (ہدایت و ارشاد کا) عُمدہ نُور ہے۔ (۱۲۸/۲)

آبِ نورِ اُو چو بر آتش چکد چک چک از آتش برآید خوش جہد

(اس مرشدِ کامل) کے نور کا پانی جو (اس) آتش (ذمائم) پر گرتا ہے تو آگ سے چڑ چڑ کی (آواز) نکلتی ہے (اور) وہ آگ بالکل بجھ جاتی ہے۔ (۱۲۸/۲)

چوں کند چک چک تو گویش مرگ و درد تا شود ایں دوزخِ نفسِ تو سرد

جب وہ آگ بجھتے وقت چڑ چڑ کرنے لگے، تو اس کو کہہ (کہ تجھے) موت اور درد (نصیب ہو) تاکہ تیرے نفس کا یہ دوزخ ٹھنڈا ہو جائے۔ (۱۲۸/۲)

چُونی اے عیسیٰؑ زدیدارِ یہود چُونی اے یوسفؑ زاخوانِ حَسُود

(اے عیسیٰؑ (نفسِ شیخ) یہود (صفتِ مرید) کے دیکھنے سے آپ کے مزاج کیسے ہیں؟ اے یوسفؑ (کی طرح جمالِ معنیٰ سے متصف بزرگ) ان برادرانِ یوسف (جیسے بے وفا مریدوں کی بدسلوکی سے) آپ کا کیا حال ہے؟ (۱۸۳/۲)

مولاناؒ مریدوں کی بدسلوکی سے ہر شیخ کی دلجوئی کرتے ہیں۔ شیخ و مرید کا معاملہ خاص خدائی معاملہ ہے، جس کو نفس اور مقتضیاتِ نفس سے کوئی تعلق نہیں اور اس میں رنج و کدُورت عناد و خصومت اور بغض و حسد کا کچھ دخل نہیں۔ بعض اوقات ایک شیخِ کامل اور اس کے مرید بااخلاص میں شکر رنجی ہو جاتی ہے۔ اس امکان کی بناء پر مولانا رومیؒ شیخ و مرید کی باہمی ناچاقی کا نقشہ کھینچ کر بیان کر رہے ہیں۔ شیخ کامل بھی معصوم عن الخطا نہیں ہوتا بلکہ کمالاتِ باطن کے باوجود بہ تقاضائے بشریت اس کا تنگ مزاج و زُود رنج ہونا ممکن ہے۔ علاوہ اس کے شیطان جو بندے کا دُشمن ہے، خصوصاً شیخ و مرید کے معاملے کو مکدر و ناخوشگوار کرنا اس کا مقصد اوّلین ہے، تاکہ بندے کو قربِ حق حاصل نہ ہو اور خود شیطان درگاہِ حق سے راندہ ہو چکا ہے۔ شیطان اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بندے کو بہکا کر کسی طرح قربِ حق سے محروم کر دے، اس لئے وہ شیخ اور مرید میں نفاق ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر شیخ کامل و مکمل اور اخلاقِ پیغمبری سے بہرہ مند ہو تو ایسے حالات میں وہ خود از راہِ شفقت و مروّت اصلاحِ ذات کی کوشش کر کے مرید کو اس مصیبت سے بچا لیتا ہے۔

ور نمے تانی بلعبہ لطف پر عُرضہ کن بیچارگی بر چارہ گر

اگر تم اس پر عمل نہ کر سکو تو مہربانی کر کے کعبہ کی طرف پرواز کرو، (اپنی) بے چارگی کو چارہ گر پر پیش کرو۔ (۱۹۰/۲)

عاجزی کے ساتھ اس سے دُعا کرو اگر ریاضات و مجاہدات کی طاقت و فرصت نہیں تو خیر، حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

سامری وار آں ہنر در خود چو دید او زِموسیٰ از تکبّر سر کشِید

(اس مغرور کا حال) سامری کی طرح ہے، جس نے اپنے اندر (بچھڑا بنانے اور آواز پیدا کرنے کا) ہنر جو دیکھا تو اَز راہِ تکبر موسیٰ علیہ السلام سے سرکشی کی۔ (۱۹۲/۲)

سعادت مندی یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے استاد اور مرشد کا ممنونِ احسان سمجھے، خواہ خود کمالات کے کسی درجے پر فائز ہو جائے مگر ان سے اپنا تعلق منقطع نہ کرے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ" جو لوگوں کا شکر ادا نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کرتا، لہٰذا استاد و شیخ سے ہرگز قطع تعلق نہ کرے۔ اس کی بڑی نحوست پڑتی ہے۔ ایک ذرا سے ہنر کی بناء پر مرید اپنے آپ کو سامری جادوگر کی طرح شیخ سے مستغنی بلکہ ان سے برتر نہ سمجھے۔

کیست کافر؟ غافل از ایمانِ شیخ
(کافر کون ہے؟ شیخ کے ایمان سے غافل)

اس سلسلہ میں راقم الحروف سب سے پہلے یہ حقیقت پیش کرنا چاہتا ہے کہ مشائخِ عظام کے نزدیک بیعت کرنا واجب ہے۔ اس پر بہت سے استدلال ہماری تصنیف "تشکیلِ بیعت" میں دیئے گئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ واجبات کا درجہ فرائض کے بعد ہوتا ہے اور فرائض اور واجبات میں معمولی سا فرق ہے۔ واجب کا انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا اور پھر جس پر اجماعِ امت (یعنی مومنوں کا اکثر حصہ متفق) ہو تو وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس راہ پر رسول اللہ ﷺ نے خود عمل کیا اور یہ سنتِ مؤکدہ بھی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس راہ پر تمام کے تمام مشائخ نے بھی عمل کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانے سے اب تک جس قدر مشائخ ہو چکے ہیں (جن میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، جنیدؒ و بایزیدؒ، امام شعرانیؒ، معین الدین چشتیؒ، فریدالدین گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاءؒ، پیر مہر علی شاہؒ، مولانا قاسم موہڑویؒ اور میاں شیر محمد شرقپوریؒ جیسی ہستیاں شامل ہیں) وہ سب بیعت کے عمل کو واجب سمجھتے رہے ہیں اور آج ایک غیر رُوحانی معمولی شخص کے کہنے سے یہ سلسلۂ بیعت منقطع ہونے کی کوئی وجہ

نہیں ہوسکتی۔ قرآن کی آیات اور احادیث بیعت کے جواز پر موجود ہیں۔ اس بیعت سے انکار کرنے والا صرف دشمنانِ اسلام کا پٹھو ہوسکتا ہے۔ اس بات کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب **"تشکیلِ بیعت"** میں مکمل طور پر کر دی ہے۔ اس قدر اہمیت والے عمل کو بُرا کہنے والا کوئی دیندار آدمی تو نہیں ہوسکتا، اس لئے مولاناؒ نے فرمایا کہ پیر کی ہستی اور شیخ کی ذات کی بیعت کو نہ ماننے والا کافر سے کم نہیں اور شیخ کی زندگی سے بے خبر شخص مردہ ہے، زندہ نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو لوگ ان بزرگوں کو نہیں مانتے تو وہ خود نقصان اُٹھاتے ہیں اور سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ ان کے فیض سے محروم اور عمر بھر رُوحانیت سے خالی رہتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

ہر کہ شد محرمِ دل در حرمِ یار بماند　　و آنکہ ایں کار نہ دانست در انکار بماند

جو بھی دل کا محرم ہوا وہ اپنے یار کے حرم میں رہتا ہے اور جو اس کام کو نہ سمجھا وہ اپنے انکار میں مارا گیا۔

مولاناؒ کے کچھ اشعار نیچے دیئے جا رہے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

کیست کافر؟ غافل از ایمانِ شیخ　　کیست مُردہ؟ بےخبر از جانِ شیخ

کافر کون ہے؟ شیخ کے ایمان سے غافل! مردہ کون ہے؟ شیخ کی جان سے بے خبر۔ (۲/۳۱۳)

تن سے جسم اور جان سے رُوح مراد ہے یعنی لوگ اس حقیقی سِرّ یعنی رُوح کو تو دیکھتے ہی نہیں صرف ظاہری سر یعنی دھڑیا جسم کو دیکھتے ہیں اور اسی پر حکم لگاتے ہیں، حالانکہ ان کے اس ظاہری سر میں اور اس سِر میں بُعْدَالْمَشْرِقَیْن ہے اور گویا یہ سِر اس سر کے مقابلے میں لائقِ نفرت اور کافر ہے۔ نہیں، نہیں! بلکہ کافر وہ ہے جو شیخ کے کمالاتِ باطن سے غافل ہے اور مُردہ وہ ہے جو شیخ کی حیاتِ طیّبہ سے نابلد ہے۔ شیخ کامل ایمان و کفر دونوں سے بالاتر ہے، ان سے وہ موصوف نہیں ہوسکتا۔ اب یہ ارشاد ہے کہ شیخ کے ایمان سے غافل ہونے والا کافر ہے تو پھر شیخ ایمان سے کیونکر موصوف ہوا۔ یہاں شیخ کے ایمان سے مراد تصدیقِ عیانی ہے اور پیچھے جس ایمان کی نفی کی گئی تھی وہ ایمانِ تقلیدی تھا، جو عیان و شہود کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔

جاں نباشد جُز خبر در آزموں　　ہر کرا افزوں خبر جانش فُزوں

آزمائش میں علم حاصل نہ ہونے کے سوا اور کسی چیز سے جان ثابت نہیں ہوتی، جس کا علم بڑھا ہوا ہے اس کی جان بڑھی ہوئی ہے۔ (۲/۳۱۳)

جانِ ما از جانِ حیواں بیشتر　　ازچہ! زاں رُو کہ فزوں دارد خبر

دیکھو ہماری جان (چوپایہ) جانوروں کی جان سے بڑھ کر ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ہماری جان زیادہ علم رکھتی ہے۔ (۲/۳۱۳)

حیوانات کو صرف جزئیات کا علم ہے اور انسان کو کُلّیات کا بھی علم ہے، جس طرح ایک انسان اپنے قوی دشمن سے کوئی چوٹ کھا کر فرار ہوتا ہے، اسی طرح ایک جانور بھی لاٹھی کی ضرب کھا کر بھاگ جاتا ہے کیونکہ یہاں ایک

اور محسوس موثر ہے، جس سے متاثر ہونے میں انسان اور یہ (جانور) دونوں برابر ہیں۔ علی ہذاالقیاس جس طرح دُور سے لاٹھی اُٹھانا انسان کے لئے موجب خوف و حذر ہے اسی طرح حیوان کے لئے بھی باعثِ فرار ہے، کیونکہ یہاں ایک امر یعنی توقع اذیت مؤثر ہے اور اس میں بھی دونوں مساوی ہیں۔ جب چھت کے شہتیر کے ٹوٹنے کی آواز آئے تو انسان فوراً بھاگ جائے گا مگر چوپایہ کی طبیعت میں کوئی امر بھاگ جانے کا محرک نہ ہوگا، اس مقام پر خوف و حذر کا باعث ایک امرِ کل ہے اور وہ یہ ہے کہ جب چھت کا شہتیر ٹوٹتا ہے تو ضرور ساری چھت زمین پر آگرتی ہے اور اس کے نیچے دب کر ہلاک ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ انسان مدرکِ کلیات ہے، اس نے اس امر کل کا ادراک کر لیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ چوپایہ مدرکِ کلیات نہیں، صرف محسوسات و فتوحات کا ادراک کر سکتا ہے اس لئے اسے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا اور کھڑا رہا۔ اس سے انسان کے علم کا حیوان کے علم سے بہ مدارج زیادہ ہونا ثابت ہوا۔ جب ہمارا علم ان کے علم سے بڑھ کر ہے تو ہماری زندگی بھی ان کی زندگی سے افضل و برتر ہوگی۔

اگرچہ بعض خاص اعتبارات سے انسان ملائکہ سے افضل ہے مگر علم اور احاطۂ معلومات کے لحاظ سے عامہ بشر سے ملائکہ بڑھ کر ہیں کیونکہ انسان میں حسِ حیوانی ہے، حسِ ملکی نہیں جب کہ فرشتوں میں حسِ ملکی ہے، حیوانی نہیں اور حسِ ملکی ادراکِ حسیات میں حسِ حیوانی سے بڑھ کر ہے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ ملائکہ انسان سے افضل ہیں یا انسان ملائکہ سے افضل ہیں۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو پیدا فرمایا تو ملائکہ نے عرض کیا ''اے پروردگار! تُو نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو کھاتے ہیں، پیتے ہیں، نکاح کرتے ہیں اور سوار ہوتے ہیں، پس ان کے لئے دُنیا مخصوص کر دے اور ہمارے لئے آخرت۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے جس کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی رُوح پھونکی ہے، اسے میں اس مخلوق کے برابر نہیں بناؤں گا جو صرف کن کے کہنے سے موجود ہوگئی (مشکوٰہ) ابن الاعرابی کہتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ انسان اور ملائکہ کرامات اور قربت میں برابر نہیں ہیں بلکہ انسان کی بندگی بڑھ کر ہے۔ (حاشیہ مشکوٰۃ)

حضرت ابراہیم ابنِ ادہمؒ نے بادشاہت چھوڑ دی

حضرت ابراہیم ابنِ ادہمؒ نے بادشاہت چھوڑ کر فقیری اختیار کی۔ قصہ اِن شاء اللہ کسی دوسرے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ فقیری کے دنوں میں آپ دریا کے کنارے پر اپنی گوڈری سی رہے تھے کہ ادھر سے ان کی بادشاہی کے زمانے کا سینئر وزیر آیا اور انہیں اس حالت میں دیکھ کر دل میں کہا کہ یہ شخص بہت بڑی سلطنت کا مالک تھا مگر اس نے کیا کیا ہے کہ فقیروں کا سا حال بنا رکھا ہے۔ جب وہ آپ کے قریب پہنچا تو حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ نے اسے بلایا اور اس کے سامنے اپنی سوئی دریا میں پھینک دی اور پھر حکم دیا کہ میری سوئی لاؤ۔ اس پر بہت سی مچھلیاں سونے کی سوئیاں اپنے منہ میں لے کر حاضر ہوئیں مگر آپ نے فرمایا کہ میں اپنی لوہے کی سوئی چاہتا ہوں تو ایک مچھلی وہ سوئی لے کر حاضر ہوئی۔ وہ وزیر یہ معاملہ دیکھ کر حیران ہوگیا۔ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ اصل حکومت تو یہ ہے پہلی

حکومت تو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی ۔

چوں نفاذِ امرِ شیخ آں میر دید زآمدِ ماہی شدش وجدے پدید

جب اس امیر نے شیخ کا حکم (یہاں تک) چلتا دیکھا (کہ مچھلی ان کی سوئی لے کر حاضر ہوگئی) تو مچھلیوں کی آمد سے اس پر ایک وَجد طاری ہوگیا۔ (۳۱۴/۲)

گفت آہ ماہی زپیراں آگہ است شُہ تنے را کو لعینِ درگہ است

تب اس نے کہا (اللہ اکبر) مچھلیاں تو پیروں کو پہچانتی ہیں (آدمی نہیں پہچانتے) افسوس ہے اس شخص پر جو (اس) درگاہ سے مردود ہوا۔ (۳۱۴/۲)

ماہیاں از پیر آگہ ما بعید ما شقی زیں دولت و ایشاں سعید

مچھلیاں (تو) پیر سے واقف (ہوں اور) ہم اس سے دور (ہوں) ہم تو اس دولت سے محروم ہوں اور یہ بہرہ ور ہوں۔ (۳۱۴/۲)

سجدہ کرد و رفت گریاں و خراب گشت دیوانہ زِعشقِ فتح باب

(پھر) وہ شاہی آداب بجا لایا اور روتا ہوا (بحال) خراب چل دیا اور دروازہ (دل کے) کھلنے کے اشتیاق سے دیوانہ ہوگیا۔ (۳۱۴/۲)

پس تو اے ناشُستہ رُو در چیستی؟ در نزاع و در حَسَد با کیستی؟

پس اے ناپاک منہ والے! تو کس (خیال) میں ہے؟ (ذرا سوچ تو سہی کہ) تو کس کے ساتھ جھگڑنے اور حسد (کرنے) میں (لگا ہوا) ہے؟ (۳۱۴/۲)

باذُمِ شیرے تو بازی میکنی بر ملائک ترکتازی میکنی

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو شیخ کی ہستی کے منکر ہیں، اُن کا یہ عمل ایسا ہے جیسے کوئی چوہا شیر کی دُم سے کھیل رہا ہے، (کیا تجھے اپنی عافیت درکار نہیں کہ) تو فرشتوں پر حملہ کر رہا ہے۔ (۳۱۴/۲)

بد چہ میگوئی تو خیرِ محض را ہیں ترفع کم شمُر ایں خَفض را

تو اس مجسم نیکی کو بُرا کہہ رہا ہے، خبردار! اپنی اس پستی (خیال) کو بلندی نہ سمجھ۔ (۳۱۴/۲)

تو اپنی اعتراض بازی کو بڑا کمال سمجھ رہا ہے کہ میں نے فلاں بزرگ کو یہ سوال کیا، ان کو جواب نہ آیا۔ یہ محض خبط ہے اور کوئی دلیل نہیں۔ خدانخواستہ اس فضول چھیڑ چھاڑ سے کسی بزرگ کو دُکھ پہنچ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ شیخ کو بد کہنا بالکل نازیبا ہے۔ پہلے تجھے شیخ اور بد میں تمیز کرنی چاہیے، جس سے ان دونوں میں تضاد معلوم ہو جائے گا۔ بد کی مثال تانبے کی سی ہے جو اِصلاح کا محتاج ہوتا ہے اور شیخ گویا کیمیا ہے جو خود مصلح ہے اور مصلح بھی وہ کہ جس کے کمالات غیر محدود ہیں۔ پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ بدی اور مشیخیت ایک ذات میں مجتمع ہوں ۔

مِس اگر از کیمیا قابل نبُد کیمیا از مِس ہرگز مس نشد

تانبا اگر کیمیا سے درست نہ ہو سکا (تو) کیمیا (بھی) تانبے (کے قرب) سے تانبا نہیں بنتا۔ (۳۱۴/۲)

درِ رُخ مہ عَیب بنی میکنی در بہشتے خار چینی میکنی

تُو چاند کے چہرے میں عیب بینی کر رہا ہے، تُو بہشت میں کانٹا تلاش کر رہا ہے۔ (۳۱۵/۲)

گر بہشت اندر روی تو خار جُو ہیچ خار آنجا نیابی غیر تُو

اگر تو بہشت میں کانٹا تلاش کرنے جائے گا تو اس میں اپنے سوا کوئی کانٹا نہ پائے گا۔ (۳۱۵/۲)

بزرگانِ دین میں عیب کیا تلاش کرتے ہو، اگر ان میں عیب ہے تو یہی ہے کہ تم جیسے نالائقوں سے اُن کو پالا پڑ گیا۔

عیبہا از ردِّ پیراں عیب شد غیبہا از رشکِ پیراں غیب شُد

معیوب اشیاء پیروں کے رَد کر دینے سے معیوب قرار پائیں (اور) اسرارِ غیب پیروں کی غیرت کی وجہ سے معرضِ خفا میں رہے۔ (۳۱۵/۲)

اسرارِ غیب پیروں کے منع اظہار کی وجہ سے مخفی کے مخفی رہ گئے اور معیوب کام پیروں کی غیرت کی وجہ سے جوان کاموں کو گوارا نہیں کرتی، معیوب ہی سمجھے گئے یعنی عیوب پیروں کے زائل کر دینے سے نابود ہو گئے اور مخفی اوصاف (جو بظاہر کمال سمجھے جاتے تھے) پیروں کی غیرت سے عیب قرار پائے۔ چھپے ہوئے اوصاف پیروں کے ناپسند کر دینے سے عیب بن گئے اور پھر عیب پیروں کی غیرت کی وجہ سے نابود ہو گئے۔

گر مریدے امتحاں کرد او خر است

(اگر مرید شیخ کا امتحان کرے گا تو گدھا ہے)

اپنے سے بڑے عالم کے علم کا امتحان کرنا ایک حماقت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو بہت بڑا عالم سمجھتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ'' یعنی ہر علم والے سے اُوپر علم والا ہے۔ (یوسف:۷۶)

حضرت بایزید بسطامیؒ کا ایک واقعہ ہماری تصنیف ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں بیان ہو چکا ہے کہ ایک بار آپ کے دل میں یہ معلوم کرنے کا خیال آیا کہ میرا مقام کتنا بلند ہے لیکن پھر آپ نے یہ محسوس کیا کہ یہ بات مناسب نہیں، چنانچہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دیا، ایک بار آپ ایک سفر کے دوران اپنے گھوڑے کو باندھ کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے، اتنے میں ایک اُونٹ والا آیا تو آپ نے اُونٹ کی طرف ایسی نظر ڈالی کہ اس کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ اس اُونٹ پر جو سوار تھا اس نے ٹیڑھی آنکھ کر کے حضرت کی طرف دیکھا اور کہا: ''اے بایزیدؒ! کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی وہ آنکھ جو کھلی ہے اس کو بند کر لوں اور جو آنکھ بند ہے اسے کھول دوں اور بایزیدؒ سمیت تمام

بسطام شہر کو زمین میں غرق کر دوں۔'' حضرت بایزید بسطامیؒ گھبرا گئے اور سوچنے لگے کہ یہ شخص تو بہت اُونچی شان رکھتا ہے۔ آپ نے اس سے بڑی نرمی سے دریافت کیا کہ ''تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'' اُونٹ والے نے کہا کہ ''جس دن تم اپنا مقام معلوم کرنا چاہتے تھے اس دن میں یہاں سے چار ہزار میل دُور تھا، تمہیں ایسی حرکتوں سے اجتناب کرنا چاہیئے اور تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر علم والے کے اُوپر ایک اور علم والا ہوتا ہے۔''

مولانا رومؒ نے مثنوی میں اپنے پیر کا امتحان کرنے کے متعلق یہ منطق پیش کی ہے کہ ایک ترازو (جو معمولی حیثیت رکھتا ہے) ایک پہاڑ کو کس طرح تول سکتا ہے۔ مرید کے مقابلے میں پیر کی مثال ایک پہاڑ کی طرح ہے۔ چنانچہ ایسا ترازو رکھنے والا پرلے درجے کا احمق ہے، جو پہاڑ کو یعنی اپنے پیر کو اس ترازو سے تولنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ حضور ﷺ کو یہ علم تھا یا یہ علم نہ تھا تو اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی یہ اوقات ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اتنی بڑی ہستی کے متعلق ایسی بات کہے، جب کہ اس کو خود اپنی اوقات کا کچھ علم نہیں۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ مرید کا مرشد کو آزمانا سخت بے ادبی ہے اور مرید کے لئے سخت نقصان کا باعث ہے اور اس سے اس کی ترقی رُک جانے بلکہ کیفیاتِ حاصلہ کے سلب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ شیخ جو پیشوا اور رہبر ہوتا ہے اگر مرید طریقت میں اپنے پیر کے مرتبۂ کمال کے متعلق امتحان کرے گا یا اس کے کمالات کا سراغ لگانے کی گستاخی کرے گا تو اس کی پاداش میں اپنی اِبتدائی پونجی بھی کھو بیٹھے گا۔

مرشد کا امتحان کرنا یا اس کے کاموں میں تصرف کرنے کے متعلق یہ سمجھو کہ تم ایک شاہِ عالی جاہ پر تصرّف کرنے کی جرأت کر رہے ہو۔ پیر ہی کے فیضان سے مرید کو کشف یا وجدان کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ کیا اسی کشف سے وہ پیر کا امتحان لے رہا ہے؟ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مرید مرشد کا امتحان کرے تو وہ گدھا ہے۔

شیخ را کہ پیشوا و رہبرست　　　گر مریدے امتحاں کرد اُو خرست

شیخ جو پیشوا اور رہبر ہے اگر کوئی مرید اس کا امتحان کرے تو (نرا) گدھا ہے۔ (۴/۴۷)

امتحانش گر کنی در راہِ دین　　　ہم تو گردی ممتحن اے بے یقیں

اگر تو (طریقت میں مرتبۂ کمال کے متعلق) اس کا امتحان کرے گا تو اے بے اعتقاد! تُو بھی شریعت میں سلامتی و ایمان کے متعلق آزمائش میں پڑ جائے گا۔ (۴/۴۷)

جرأتِ و جہلت شود عُریاں و فاش　　　او برہنہ کے شود زیں اقتباس

(اس جرأت سے) خود تیری گستاخی اور جہالت بے پردہ اور فاش ہو جائے گی، وہ اس تفتیش سے ننگا کب ہوگا۔ (۴/۴۷)

اصحابِ کہف (واقعہ کی روایت)

اصحابِ کہف کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے زمانے کے صوفی تھے۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں درج ذیل آیت میں آیا ہے:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰـهُمْ هُدًى (الکہف:۱۳) بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے نورِ ہدایت میں اضافہ کر دیا۔

۲۴۸ء میں جب روما کی سلطنت پر دقیانوس (DECIUS) متمکن ہوا تو اس نے عیسائیت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کیا۔ جب وہ ایشیاء کوچک کی سلطنت افیسس (EPHESUS) میں آیا تو لوگوں کو پکڑ کر مارنے لگا، اسی وجہ سے اس سلطنت کے چند نوجوان وہاں سے بھاگ کر قریب ہی ایک پہاڑ کی غار میں جا چھپے۔ وہاں ان کو نیند آ گئی اور وہ تین سو سال سے زائد عرصہ سوئے رہے۔ ان کو سونے کی مدت معلوم نہ ہو سکی۔ بھوک سخت لگ چکی تھی۔ اس وقت تک دقیانوس کے بعد کئی حکمران بدل چکے تھے۔

جب وہ بیدار ہوئے تو اس وقت بُت پرستی ختم ہو چکی تھی اور دینِ حق کی اشاعت ہو چکی تھی۔ اصحابِ کہف کو بھوک لگی تو ان کا ایک آدمی جو سب سے زیادہ ہوشیار اور دانا تھا، اس کا نام یملیخا تھا، اپنا بھیس بدل کر کھانا لانے کے لئے شہر گیا۔ پہلے تو شہر کی متغیّر شدہ حالت دیکھ کر حیران ہوا کہ کل شام تک کیا حالت تھی اور اب کیا سے کیا ہو گئی ہے، پھر جب وہ کسی دکان سے کھانا خریدنے لگا اور دکاندار کو نقدی دی تو لوگ ان پُرانے سکوں کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ لوگوں میں ان پُرانے سکوں کا چرچا ہونے لگا۔ سب کہتے تھے، ارے! یہ دقیانوسی سکہ ہے۔ (ہمارے محاورے میں جو پرانی چیز ہو اس کو دقیانوسی کہتے ہیں، وہ اسی واقعہ سے ماخوذ ہے) غرض لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی اجنبی اور غیر ملکی آدمی ہے۔ لوگ اس شخص کے گلے میں صافہ ڈال کر کھینچتے گھسیٹتے حاکمِ وقت کے پاس لے گئے۔ یملیخا اپنی اس حالتِ زار پر روتا تھا اور خصوصاً اس تصوّر سے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا کہ اب اس کو دقیانوس کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ وہ اِدھر سے اُدھر دیکھتا جاتا تھا کہ شاید میرا باپ بھائی وغیرہ یا کوئی رشتہ دار آ کر مجھے چھڑائیں گے مگر اس کو معلوم نہ تھا کہ آج کہاں ہیں دقیانوس اور کہاں ہیں اس کے بھائی بند؟ حاکمِ وقت ایک متقی پرہیزگار آدمی تھا، پہلے تو وہ یملیخا کی باتوں سے متعجب ہوا اور اس کو جھوٹا سمجھ کر دھمکانے لگا مگر جب اس سے پتے کی باتیں سنیں اور خصوصاً غار کا حال معلوم ہوا تو سمجھا کہ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ پر یقین دلانے کے لئے ہم کو دکھایا ہے۔ بادشاہ اپنے خدم و حشم سمیت غار کی طرف گیا اور صورتِ حال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو سجدۂ شکر بجا لایا۔ اصحابِ کہف پھر اپنی غار میں لیٹ گئے اور بدستور ان پر نیند غالب ہوگئی۔ اب وہ قیامت کے روز جاگیں گے۔ ضیاء القران میں ہے کہ تفسیرِ مظہری کے مطابق ان کے نام یہ ہیں:

(۱) یملیخا (۲) مکسلمینا (۳) مرطونس (۴) بینونس (۵) ساریونس (۶) ذونواس (۷) کشفیط طنونس اور

ان کے کتے کا نام قطمیر ہے۔ (ضیاء القرآن) اصحابِ کہف کے نام متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ نظر بد، آسیب، سایہ، جنات وغیرہ بلّیات اور آفات سے محفوظ رہنے کے لئے ان اسماء کا نقش استعمال ہوتا ہے۔ یہ قصہ قرآن مجید کی سورۃ الکہف میں تفصیل سے مذکور ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور تم دیکھتے ہو کہ جب آفتاب نکلتا ہے تو وہ دائیں جانب سے بچ کر نکل جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں جانب کتراتا ہے۔ کائنات کا شمسی اور فلکی نظام، ارض و فلک کے افعال طالبانِ حق کے خلاف نہیں ہو سکے ؎

خفتگانے کز خدا بُد کارِ شاں　　میل کردے آفتاب از غارِ شاں

وہ سونے والے (اصحابِ کہف) جن کا معاملہ خاص خدا کے ساتھ تھا، آفتاب بھی ان کے غار سے بچ کر نکلتا ہے۔
(۳۱۵/۱)

مطلب یہ ہے کہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں اصحابِ کہف ایسے مقبولِ حق ہوئے کہ آفتاب بھی ان کے لحاظ سے کنی کترا کر نکلنے لگا۔ اگر خرقِ عادت ہو تو ان کی مقبولیت کی غایت ظاہر ہے۔ اگر وضع غار ہی ایسی ہو تو مقبولیت کا یہ اثر ہوگا کہ ان کے قلب میں ایسے پُرامن غار میں پناہ گزین ہونا ہی الہام کے ذریعے تھا۔ (کلید) لہٰذا جب اصحابِ کہف نے کفر و شرک کی تمام باتوں سے الگ ہو کر اپنے آپ کو حوالۂ بخدا کر دیا تو خدا نے بھی ان کو تمام آفات سے بچا لیا اور آفتاب تک کو ان کی رعایت حال پر مامور کر دیا۔ کما قیل۔

خار جملہ لطف چوں گُل مے شود　　پیشِ جزوے کُو سُوئے کُل مے شود

اس جزو مخلوق کے آگے جو (اپنے) کُل (یعنی خالق) کی طرف رجوع کرتا ہے) کانٹا بھی پھول کی طرح پُرلطف بن جاتا ہے، یعنی جو بندہ اپنے مالک کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کے لئے تمام تکالیف و مصائب عین راحت بن جاتی ہیں۔ (۳۱۵/۱)

چیست تعظیمِ خدا افراشتن　　خویشتن را خوار و خاکی داشتن

خدا کی تعظیم سیکھنا کیا ہے؟ اس کے نام کو بلند کرنا (اور) اپنے آپ کو خاک و خار کی طرح حقیر و ناچیز بنا لینا ہے۔
(۳۱۵/۱)

مطلب یہ ہے کہ خدا کی تعظیم یہی نہیں کہ زبان سے نعرۂ تکبیر لگا لیا۔ جَلَّ جَلَالُهُ اور عَمَّ نَوَالُهُ یا اَللّٰهُ اَکْبَرُ کہہ لیا اور بس، نہیں! بلکہ حقیقی تعظیم یہ ہے کہ اس کا جلال اور اس کی عظمت انسان کے جسم پر اور رُوح پر اس قدر چھا جائے کہ وہ خود ایک سردار اور بادشاہ یا جرنیل ہوتے ہوئے بھی حقیر و ناچیز دکھائی دے ؎

ہر کہ مُرد اندر تنِ او نفسِ گبر　　مَرورا فرماں برد خورشید و اَبر

جس شخص کے جسم میں بے دین نفس مر گیا، سورج اور ابر اس کے فرماں بردار ہو جاتے ہیں۔ (۳۱۵/۱)

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" اور اس (اللہ) نے مسخر کر

دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (الجاثیہ:۱۳)، یعنی سورج، چاند وغیرہ اور تمام کائنات بحکمِ خداوند ہمارے کام میں لگے ہوئے ہیں، اگر چہ یہ تسخیرِ عام ہے مگر مقبولانِ حق اس میں مقصود اور دوسرے لوگ تابع ہیں۔ جیسے اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب مقصودِ کائنات، رُوح کائنات، نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ طلب کرو مجھ کو اپنے ضعیفوں میں، اس لئے کہ جو رزق تم کو دیا جاتا ہے یا فرمایا تم کو جو دشمنوں کے مقابلے میں مدد دی جاتی ہے وہ فقیروں، محتاجوں اور مظلوموں کی امداد و اعانت کی بدولت ہے۔ مراد یہ ہے کہ تمہارے ضعیفوں کی برکت سے یہ مدد دی جاتی ہے یا مظلوموں کی امداد سے میری رضا حاصل کرو اور ضعیفوں کی برکت، اس لئے فرمایا کہ ان میں اقطاب، اوتاد اور ابدال بھی ہوتے ہیں، جن کی بدولت بلاد وعباد کا نظم ونسق قائم ہے۔ (مظاہرِ حق)

چوں دِلش آموخت صبر افروختن — آفتاب اُورا نیارد سوختن

جب اس کا دل صبر کا چراغ رَوشن کرنا سیکھ جاتا ہے تو سورج بھی اس کو جلا نہیں سکتا۔ (۳۱۵/۱)

گُفت حق در آفتابِ منتجم — ذکر تَـزَاوَرُ كَذَا عَنْ كَهْفِهِم

چنانچہ (آفتاب) درخشاں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ "تَـزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَـقْـرِضُهُـمْ ذَاتَ الشِّـمَـالِ" (تو وہ ہٹ کر گذرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے)۔ (۳۱۵/۱)

شُد سرِ شیرانِ عالم جُملہ پَست — چُوں سگِ اصحاب را دادند دست

(جب کارکنانِ قضا و قدر نے) اصحابِ کہف کے کُتے کو غلبہ (معنوی) عطا فرمایا تو تمام شیرانِ عالم کا سر اس کے آگے جھک گیا۔ (۱۳۰/۱)

چہ زیانستش ازاں نقشِ نُفور — چونکہ جانش غرق شد در بحرِ نُور

(بھلا) اس (اصحابِ کہف کے کُتے) کو قابلِ نفرت صورت سے کیا نقصان ہے، جب کہ اس کی رُوح دریائے نور میں غرق ہو چکی۔ (۱۳۰/۱)

گفتِ پیغمبر کہ اَے طالبِ جَری — ہاں مکُن با ہیچ مطلوبے مَری

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے گستاخ مرید خبردار! کسی مرشد کی برابری نہ کرنا۔ (۱۸۴/۱)

گفتِ احمد گر نمی خواہی زلل — ہیں مکُن با ہیچ مطلوبے جَدَل

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا! اگر تو ذلت نہیں چاہتا تو کسی مطلوب یعنی مرشد سے جھگڑا مت کر۔ (۱۸۴/۱)

وَر تُو نَمرودی ست آتش در مَرو — رفت خواہی اوّل ابراہیم شو

تم میں ابھی نمرودی اوصاف موجود ہیں (اس لئے) آگ میں نہ جاؤ، (اگر) جانا ہی چاہو تو پہلے ابراہیمؑ بن

جاؤ۔ (۱/۱۸۴)

خویش را رنجور ساز و زار زار　　تا تُرا بیرون کُنند از اِشتہار

اپنے آپ کو (انکسار و تواضع سے) رنجوُر اور زار و نزار بنا لو تا کہ تم کو جاہ و مال کی شہرت سے نکال دیں۔ (۱/۱۷۸)

جانِ حیوانی ندارد اتحاد　　تو مجو ایں اتحاد از روحِ باد

حیوانی جان اتحاد نہیں رکھتی ہے، تُو یہ اتحاد ہوائی رُوح میں نہ تلاش کر۔ (۴/۵۲)

مولانا رومیؒ روحِ انسانی کی تعریف فرماتے ہیں کہ تمام حیوانات جن میں انسان، درندے، چرندے، طیُور و وحوش وغیرہ شامل ہیں، شعور اور روحِ حیوانی میں مشترک ہیں۔ شعور کے معنی اپنے فائدے اور نقصان اور راحت و زحمت کا احساس ہے اور روحِ حیوانی وہ ہے جس سے جسم زندہ ہے اور اس کے تصرف سے وظائفِ جسم پورے ہو رہے ہیں، پس یہ دونوں چیزیں انسان اور غیر انسان میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ عمل اور روحِ انسانی خاص انسان میں پائی جاتی ہے، باقی حیوان اس سے بہرہ مند نہیں۔ عقل کے خواص میں سے ایک ادراکِ کلیات اور حصولِ معارف بھی ہے، جس سے باقی حیوانات کو مطلق تعلق نہیں۔ انبیاء و اولیاء کی روح و عقل اور بھی اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے، جو انوارِ الٰہیہ ہونے کے لحاظ سے باقی تمام انسانوں کی روح و عقل سے ممتاز ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں، شعور اور روحِ حیوانی اگرچہ انسان اور باقی تمام حیوانات میں موجود ہے لیکن وہ ذریعہء اتحاد نہیں، بلکہ روحِ انسانی اور عقل ذریعہء اتحاد ہے اور انبیاء اور اولیاء کی روح و عقل تو واثق تر ذریعۂ اتحاد ہے، اس سے باہر عام انسان کی روح بھی متحد نہیں۔ روحِ حیوانی ایک جسمِ لطیف بخاری ہے کہ اس کی بقاء سانس اور ہوا پر موقوف ہے۔ روحِ انسانی اس سے الگ اور برتر چیز ہے جو خاص انسان میں پائی جاتی ہے، اس لئے روحِ حیوانی اتحاد نہیں رکھتی، اتحاد اگر ہے تو عقل اور روحِ انسانی میں ہے۔

باز غیر عقل و جانِ آدمی　　ہَست جانے در ولی و در نبی

پھر انسان کی عقل اور جان کے علاوہ، ولی اور نبی میں جان ہے۔ (۴/۵۲)

نار شہوت می نیارامد بآب　　زانکہ دارد طبع دوزخ در عذاب

شہوت کی آگ پانی کے ساتھ تسکین نہیں پاتی کیونکہ وہ عذاب میں دوزخ کی طبیعت رکھتی ہے۔ (۱/۳۷۶)

آتشِ شہوت کو نارِ دوزخ کے ساتھ مشابہ ہونے کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے ''حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ'' یعنی دوزخ شہواتِ نفس سے ڈھکا ہوا ہے۔ شیطان لاحول پڑھنے سے دفع ہو سکتا ہے مگر نفسِ شہوت پرست تو مارِ آستین ہے، کسی تدبیر سے دفع کرنا آسان نہیں۔ ظاہری آگ تو پانی سے بجھ سکتی ہے مگر شہوت کی آگ دوزخ تک لے جاتی ہے۔ آتشی مخلوق (شیطان) کے علاوہ یہ شہوت ایک اور آگ ہے جو انسان کے اندر گناہ اور لغزش کی اصل بناء ہے یا یوں کہو کہ اس آگ کے اندر گناہ و لغزش کی جڑ ہے۔

رُوح می بُردت سُوئے عرشِ بریں　　سُوئے آب و گِلِ شُدی در اسفلین

روح تو تجھے عرشِ بریں کی طرف لے جاتی ہے لیکن تو پانی اور مٹی کی طرف نچلے درجوں میں آ گیا۔ (۸۴/۱)

روح اگرچہ قیدِ جسم میں مقیّد اور علائقِ جسمانیہ میں محصور نظر آتی ہے مگر اُس کا اصلی مقام اعلیٰ و ارفع ہے، اس لئے وہ ان علائق سے آزاد ہونے اور اپنی اصل کی طرف واصل ہونے کی متقاضی ہے مگر انسان نے اس کو بارِ علائق کے نیچے دبا رکھا ہے جو اس کے لئے مانعِ ترقی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انسان میں دو قوتیں ودیعت کی ہیں۔ ایک قوتِ ملکیہ یعنی فرشتوں کے ساتھ مناسبت رکھنے والی طاقت اور اس کے پیدا ہونے کی صورت یہ ہے کہ روحِ حیوانی جو بدن انسان میں سرایت کیے ہوئے ہے، روحِ انسانی سے فیض یاب ہو اور وہ اس کے فیض کو قبول کرے۔ قوتِ ملکیہ کے علاوہ قوتِ نفسانیہ ہے اور یہ قوت نفسِ حیوانی سے پیدا ہوتی ہے، جو تمام حیوانات میں مشترک ہے۔ یہ قوت روحِ طبعی کے قویٰ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان دونوں قوتوں میں کھینچا تانی اور مزاحمت ہوتی رہتی ہے۔ قوتِ ملکی عروج چاہتی ہے اور بلندی کی طرف لے جاتی ہے مگر قوتِ بہیمی تنزل کی متقاضی ہوتی ہے اور پستی کی طرف کھینچتی ہے۔ اگر قوتِ بہیمی غالب آ جائے تو قوتِ ملکی دب جاتی ہے اور اگر قوتِ ملکی کا غلبہ ہو جائے تو قوتِ بہیمی ہار کر رہ جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روم کے سفیر نے بھی یہی سوال کیا تھا ۔

مرد گفتش کاے امیرالمومنین　　جاں زبالا چوں در آمد بر زمین

اس شخص نے آپ سے سوال کیا، اے امیر المومنین! روح عالمِ بالا (یعنی عالمِ امر) سے زمین (یعنی عالمِ خلق) میں کیوں آ گئی؟ (۱۶۹/۱)

روحِ مجرد کو جسم مادّی سے بلحاظِ اصل کوئی نسبت نہیں، پھر ان دونوں میں ارتباط کیوں ہو گیا۔ چونکہ روح عالمِ امر سے ہے اور عالمِ امر مادہ سے منزہ ہے۔ سفیر نے پوچھا یہ روح کا طائر جسم کے پنجرے میں، جو مادی ہے کیوں کر داخل ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے روح پر ''کُن'' کا افسون و افسانہ پڑھ دیا، اس لئے وہ جسم میں داخل ہو گئی۔ جسمِ عنصری کے ساتھ روح کا تعلق بحکم ''کُن'' ہوا۔

رُوحِ صالحؑ بر مثالِ اُشتریست　　نفسِ گمرہ مَردُرا چوں پۓ بَریست

روح (جو مثل) صالحؑ کے ہے۔ وہ شتر کی مثل (ایک چیز یعنی بدن) پر (سوار) ہے اور گمراہ (آدمی) کا نفس اس کے پٹھے کاٹنے والا ہے۔ (۲۶۸/۱)

حضرت صالحؑ اور ثمودؔ کی قوم کے قصے میں اشقیاء کے ذاتی معاملات کو سرسری سمجھ لینا اور آخر خود اپنی اس غلطی کا شکار ہو جانا مذکور ہے۔ اب علماء ان واقعات کو مقبولانِ حق اور اُن کے منکروں کے حالات پر چسپاں فرماتے ہیں کہ جس طرح موذیانِ ناقہ قہرِالٰہی سے نیست و نابود ہو گئے، اسی طرح خاصانِ حق کو ایذا دینے والے لوگ بھی تباہ

ہو جاتے ہیں۔ پس مقبولانِ الٰہی کی روح تو مثل صالح ؑ کے ہوئی اور تن مثلِ ناقہ کے ہے۔ سو روح تو ہمیشہ وصل میں ہے کہ اس کو کوئی ہلاک نہیں کر سکتا لیکن تن فاقہ و غم میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ روح آفتوں کا اثر قبول کرنے والی نہیں، اگر آفت آئے بھی تو اس کا اثر جسم پر ہوگا، روح پر نہیں اور نہ ہی آزار کا اثر قبول کرنے والی ہے کیونکہ وہ نورِ الٰہی ہے اور اللہ کا نور کفار سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔

جب روم کے سفیر نے یہ تر و تازہ الفاظ سُنے، جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کمالاتِ باطن کا ذکر تھا تو اس نے کہا کہ کہیں ایسا آدمی بھی دُنیا میں دیکھا گیا ہے جو جہاں میں رہ کر اس سے جان کی طرح پوشیدہ ہو۔ حیرت ہے کہ دُنیا میں ایسا شخص موجود ہے اور اس کا حال مخلوق سے روح کی طرح مخفی ہے، پھر وہ وزیر آپؓ کی زیارت کا اور بھی مشتاق ہو گیا۔ وہ سفیر برابر ان کو تلاش کرتا تھا۔ آخر تلاش کرنے والا مطلوب کو پا ہی لیتا ہے۔ چنانچہ ایک اعرابی عورت نے اس کو نو وارد دیکھ کر بتایا کہ وہ دیکھ خلیفہ ظِل اللہ لوگوں سے علیحدہ کھجور کے درخت کے سائے میں سو رہے ہیں۔ وہ سفیر وہاں آیا اور آپؓ سے دُور ہی کھڑا ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھتے ہی کانپنے لگا۔ اپنے دل میں کہنے لگا مجھ پر دیگر بادشاہوں سے کبھی ہیبت اور خوف طاری نہیں ہوا مگر اس آدمی کی ہیبت نے میرے ہوش گم کر دیئے ہیں۔ میں اکثر شیر اور چیتے کے جنگل میں بھی گیا ہوں اور ان کے خوف سے میرے چہرے نے رنگ نہیں بدلا۔ کیا بات ہے یہ شخص تو ہتھیار کے بغیر زمین پر سو رہا ہے مگر میرا جوڑ جوڑ اس کے رعب سے کانپ رہا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا ؎

ہیبتِ حق ست ایں از خلق نیست   ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست

(ہاں یہ) خدا کی ہیبت ہے، مخلوق کی ہیبت نہیں ہے، (یہ) اس (سونے والے) خرقہ پوش آدمی کی ہیبت نہیں ہے۔ (۱/۱۶۷)

یہ خوف، خدا کا خوف ہے، مخلوق کی ہیبت نہیں ہے، جو شخص خدا سے ڈرا اور پرہیز گاری اختیار کی تو اس سے جن اور انسان اور جو اس کو دیکھتا ہے، ڈرتا ہے۔

خدمت بے لوث ہو کر کرو

اسی باب میں ایک مضمون ''ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد'' کے عنوان سے گذر چکا ہے۔ یہاں خدمت کے موضوع پر مولانا رومیؒ کے مزید اشعار دیئے جا رہے ہیں۔ اس حقیقت کو جان لینا چاہیے کہ کسی کام میں مکر و حیلہ خلوص کو ختم کر دیتا ہے اس لئے اگر خدمت کی جائے تو خلوصِ نیت سے تاکہ انوارِ نبوت سے آپ کو بھی حصہ مل سکے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی خدمت بہتر جذبے کے ساتھ کی جائے تو اس کا اجر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ خدمت کرنے والا اپنے آپ کو کمترین اور خدمت گذار بنانے کے لئے خدمت کرے، فرعونیت والا خدمت کر ہی نہیں سکتا۔

بر خیال و حیلہ کم تَن تار را   کہ غنی رہ کم دہد مکار را

حیلہ کے خیال سے مکر وفریب کے تانے نہ تنو، کیونکہ خداوند غنی مکار کو بازیاب نہیں کرتا۔ (۵/۵۷)

مکر کُن در راہ نیکو خدمتے   تا نبوّت یابی اندر اُمّتے

حسنِ خدمت کی راہ میں تدبیر کرو تا کہ تم اُمتی ہوکر نبوت کے کمالات پاؤ۔ (۵/۵۷)

مکر کُن تاوارہی از مکرِ خود   مکر کُن تا فرد گردی از حسد

تدبیر کرو تا کہ تم اپنے مکر سے چھوٹ جاؤ اور تم حسد سے دور رہو۔ (۵/۵۷)

مکر کُن تا کمتریں بندہ شوی   در کمی اُفتی خداوندہ شوی

تدبیر کرو تا کہ تم سب سے کم رُتبہ غلام بن جاؤ، کمی میں پڑ جاؤ تو آقا بن جاؤ گے۔ (۵/۵۷)

روبہی و خدمت اے گرگِ کہن   ہیچ بر قصدِ خُداوندی مکُن

اے پرانے بھیڑیئے! تُو جو خوشامد اور خدمت کرتا ہے تو بزرگ بننے کی نیت سے ہرگز نہ کر (بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اللہ کے واسطے خدمت کر)۔ (۵/۵۷)

اہل اللہ کی خدمت اس نیت سے نہ کریں کہ ہم بھی ان کی اجازت سے پیر بن جائیں، کیونکہ یہ نیت موجب حرمان ہے بلکہ ان کی خدمت بے غرضی اور خلوص سے کی جائے پھر بفضلہٖ تعالیٰ کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ راقم الحروف نے ایک تبلیغی مجلس میں حاضرین سے کہا کہ طریقت کو اختیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہم تو اس راہ پر چلنے والوں کو مکمل تربیت دیتے ہیں اور کامیاب سالکین کو خلافت بھی دے دیتے ہیں۔ سامعین میں سے ایک شخص گھر چلا گیا اور دوبارہ اسی جگہ پر آکر اہلِ خانہ کو کہنے لگا کہ اگر تمہارے پیر صاحب مجھے خلافت دے دیں تو میں بیعت ہونے کو تیار ہوں۔ یہ شخص خودغرض لوگوں کی ایک مثال تھا ؎

آں زصیدی حسنِ صیّادی بدید   ویں زصیّادی غمِ صیدی کشید

اس عقلِ کُل والے نے شکار بن کر شکاری کی خوبی دیکھی اور اس نے شکاری پن سے شکار بن جانے والوں کا غم حاصل کیا۔ (۵/۵۷)

آں زخدمت نازِ مخدومی بیافت   ویں زمخدومی زراہِ عزّ بتافت

اس مردِ خدا نے خدمت کے ذریعہ مخدومی کی شان حاصل کی اور یہ دُنیادار مخدومی کے غرور کے باعث عزت کی راہ سے پھر گیا۔ (۵/۵۷)

آں زفرعونی اسیرِ آب شد   وزاسیری سبط از ارباب شُد

فرعون فرعونیت کی وجہ سے پانی میں غرق ہوگیا اور اسرائیلی قیدی ہو جانے کے باعث مخدوموں میں سے ہوگیا۔ (۵/۵۷)

لعبِ معکوس ست و فرزین بند سخت حیلہ کم کن کارِ اقبال ست و بخت

مخدومی حاصل کرنا اُلٹا کھیل ہے اور سخت گہری چال ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی حیلہ نہ کرو کیونکہ یہ نصیبہ اقبال کا معاملہ ہے، جو اپنے اختیار سے باہر ہے۔ (۵/۵۷)

روزِ محشر ہر نہاں پیدا شود

(محشر کے دن ہر پوشیدہ چیز ظاہر ہو جائے گی)

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجرموں کو الگ کر دے گا اور اس دن اُن کے جسم کے اعضا اپنے عمل کا خود بخود اِقرار کریں گے اور اپنے خلاف خود گواہی دیں گے۔ سورۂ یٰس آیت نمبر ۵۹ میں ہے "وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ" آج کے دن مجرمو الگ ہو جاؤ۔

روزِ محشر ہر نہاں پیدا شود هم زخود ہر مجرمے رسوا شود

قیامت کو ہر مخفی بات ظاہر ہو جائے گی، ہر گنہگار آپ سے آپ رُسوا ہو جائے گا۔ (۵/۲۲۵)

دست گوید من چنیں دزدیدہ ام لب بگوید من چنیں بوسیدہ ام

ہاتھ کہے گا میں نے یوں چوری کی ہے، لب کہے گا میں نے یوں بوسہ لیا ہے۔ (۵/۲۲۶)

پائے گوید من شدستم تامُنیٰ فرج گوید من بکردستم زنا

پاؤں کہے گا (ناجائز) مقاصد کی طرف گیا ہوں، شرم گاہ کہے گی میں نے زنا کیا ہے۔ (۵/۲۲۶)

چشم گوید کردہ ام غمزہ حرام گوش گوید چیدہ ام سُوء الکلام

آنکھ کہے گی میں نے حرام (طرز سے) اشارہ کیا ہے، کان کہے گا میں نے بری بات سُنی ہے۔ (۵/۲۲۶)

حصہ چہارم

اٹھارہواں باب

نفس اور اس کی سرکشی

نفس کی آفات کا علاج اور اس کی سرکشی کو قابو میں لانے کا طریقہ تقریباً تمام مشائخ نے اپنی تصنیفات میں عوام کے سامنے لانے کی کوششیں کی ہیں، جن کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک جامع تحریر راقم الحروف نے اپنی ایک تصنیف ''تہذیبِ نفس'' میں اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ لکھ دی ہے۔ نفس کی تمثیل مولانا رومیؒ نے ایک سانپ کے ساتھ دی ہے اور کہا ہے کہ سانپ نہایت مُوذی جانور ہے جو انسان کو تھوڑی ہی دیر میں ہلاک کر دیتا ہے۔ اس سانپ کا بہترین تدارک یہ ہے کہ اس کو قابو میں لا کر اس کے دانت توڑ دیئے جائیں۔

''کشف المحجوب'' میں بھی نفس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ نفس ایک سرکش گھوڑے کی طرح ہے، جسے جنگلی گھوڑے کی طرح محنت اور مشقت میں مبتلا کر کے مہذب کیا جاتا ہے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ نفس کی بے شمار آفات ہیں، جو انسان پر مختلف پہلوؤں سے حملہ کرتی ہیں۔ انسان کی شہوات کا رونما ہونا، بے شرمی اور بے غیرتی کے اعمال کا سرزد ہونا، چوری چکاری اور رشوت وغیرہ ایسی آفات ہیں کہ جو نفس کی شرارت سے ہی وجود میں آتی ہیں۔ نفس جب انسان پر غالب ہو جائے تو اس پر تمام اعمالِ حسنہ اور نیکیوں کے دروازے مسدود ہو جاتے ہیں۔ بے ایمانی، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، عورتوں کے ساتھ بے غیرتی پر آمادہ کرنا، سب نفس کی ریشہ دوانیوں میں شامل ہیں۔ ابلیس کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان کے باعث وہ لوگوں کی اخلاقی، معاشرتی اور رُوحانی زندگی تباہ کرتا ہے۔ شیطان کے حملے جو دیکھنے میں آتے ہیں، ان کا ذکر ہماری مذکورہ کتاب ''تہذیبِ نفس'' میں کر دیا گیا

ہے۔ تفصیل کے لیے اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

شیخ کی رُوحانی تربیت سے کیا ملتا ہے

شیخ سے توجہ باطنی ملے تو نفس کی اصلاح آسان ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں رُوح کی تقویت ہوتی ہے۔ نگاہِ شیخ میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ بندہ افکارِ شیخ سے سرمست ہو جاتا ہے اور اس کا تعلق عالمِ جبروت اور ملکوت سے ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؂

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

شیخ کی صحبت انسان کو نفسانیت سے دُور کرتی ہے اور اس سے مریدوں کی عقلوں اور رُوحوں پر شیخ کی رُوحانیت کا اثر ہوتا ہے۔ شیخ اپنے مریدوں کو اتباعِ شریعت کی تاکید کرتا ہے، جس سے مرید کی رُوح اور بدن کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس اتباع میں نماز کی پابندی، روزہ کی مشقت، جہاد کی طرف رغبت اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ترغیب سے نفس کی تربیت ہوتی ہے۔ تربیتِ شیخ میں شیخ ہوش در دم، نظر برقدم، سفر در وطن، یاد کرد، بازگشت، نگاہ داشت، یادداشت، وقوفِ مکانی اور وقوفِ عددی کے اسباق سکھاتا ہے، جو انسان کے نفس کے لئے اکسیر ہیں۔ مرید اگر کہیں بھی ہو تو رابطہ کے ذریعے وہ شیخ کی رُوحانیت سے دور نہیں ہوتا۔ شیخ کے ساتھ تعلق ایسے ہوتا ہے کہ گویا کسی مرید نے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا ہے۔ مضبوط کڑا سے مراد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے تو اس سے مرید کی رسی پیر کے ساتھ مل جاتی ہے اور پیر اس کو جذب کر کے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور پھر خدا سے ملا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؂

خاک شو مردانِ حق را زیرِ پا　　　خاک بر سَر کُن حَسد را ہمچوما

مردانِ حق کے قدموں کی خاک ہو جاؤ اور ہماری طرح حسد پر مٹی ڈالو۔　(۱/۷۵)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ تم نے جہنمی نفس کو باغ بنا لیا ہے مگر شیخ اس میں وفا کا بیج بو دیتا ہے۔

خدا اُسے ملتا ہے جو نفس سے عداوت رکھے

حضرت داوٗد علیہ السلام پر وحی کی گئی "اَنَا وُدِّیٌ فِیْ عَدَاوَۃِ النَّفْسِ" اے داوٗد! میں شیطان کی مخالفت میں رکھا گیا ہوں" (احیاء علوم الدین)۔ شیطان نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بہت سے ہتھکنڈے تیار کیے ہیں جن سے وہ لوگوں پر حملہ کرتا ہے۔ قرآن میں بھی اس عداوت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوا "وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" (اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے) (البقرہ:۲۰۸) اور ایک مقام پر آیا ہے کہ "وہ شخص جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک

(اُس کا) جنت ہی ٹھکانا ہے۔ (النّزعٰت:۴۰)

قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہر بُرائی کا سرچشمہ نفس ہے اور انسان کی آزمائش نفس کا مقابلہ کرنے پر ہی موقوف ہے۔ نفس بُرائی کا حکم دیتا ہے اور جو اس بُرائی سے بچ گیا، وہی فلاح پانے والا ہے۔

درجات کی بلندی نفس کی مخالفت میں ہے

راقم الحروف کا مضمون ''مقامِ آدم'' جو ہماری تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں شامل کیا گیا ہے، اس میں اس بات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے کہ انسانوں اور فرشتوں کی بلندی کس چیز پر اِنحصار کرتی ہے۔ فرشتے ہر وقت عبادت کرتے ہیں اور کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے مگر ان کے دَرجات بلند نہیں ہوتے۔ جو فرشتہ جس مقام پر پیدا کیا گیا ہے، وہ اسی مقام پر ہی تمام عمر گذار دیتا ہے کیونکہ ان کو نفس کی مزاحمت نہیں دی گئی۔ کسی فرشتے کی نہ تو بیوی ہے اور نہ بچے اور نہ اس نے کسی کے لیے روزی کمانا ہے اور نہ اس نے بیوی بچوں کی خاطر کچھ کام کرنا ہے۔ ایسی حالت میں نہ اس کو کسی سے سلوک کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی نوکری یا ملازمت کرنا ہوتی ہے، لہٰذا ایسی حالت میں ان کو نہ تو کسی چوری چکاری اور نہ ہی کوئی بُرائی کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ دَرجات کی بلندی تو انسان کے لیے رکھی گئی ہے، اگر کوئی انسان رشوت نہیں لیتا تو اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے اور وہ فرشتے جو زنا یا بدکاری کرنے پر قادر ہی نہیں تو ان کے درجے کیونکر بلند کیے جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ درجات اس وقت بلند ہوتے ہیں جب کسی بُری بات سے خود کو روکا جائے اور چونکہ یہ سعادت فرشتوں کو حاصل ہی نہیں تو ان کے درجات کس طرح بلند ہو سکتے ہیں۔ محنت کرنا، فقر و فاقہ برداشت کرنا تو انسان کے لیے ہے، اس لیے ان کے درجات بلند ہو سکتے ہیں۔ فرشتہ بیچارہ جس درجے پر پیدا ہوا اس ہی درجے پر تمام عمر رہے گا۔ انسان کی اس بلندیٔ درجات پر فرشتے رشک کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام میں لکھا ہے کہ فقر و فاقہ، ھاوھُو اور مصائب کا برداشت کرنا نہ تو خدا کے لئے ہے اور نہ ہی حور و فرشتہ کو اس کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

نفس کا قلبِ انسانی سے تعلق

قلبِ انسانی ایک نورانی چیز ہے اور اس میں ایک فرشتہ متعین ہے جو انسان کو نیکی کے کاموں کے لئے راغب کرتا ہے، لیکن جب دل نفس کی ہمسائیگی سے زنگ آلود ہو جاتا ہے تو دل میں بُرے خیالات اور بُرے کام کرنے سے سیاہ دھبے لگتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ دل گناہوں کی وجہ سے بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے دل کو صیقل کرنا چاہے تو اللہ کے ذکر کی ضرب لگاتا رہے جس سے ایک دن یہ دل بالکل سفید، شفاف اور چمکدار ہو جائے گا۔ نفس کا مقام انسانی ناف سے ذرا نیچے ہے اور نفس کی اصل خباثت پر قائم ہے اور قلب کی طرح ذکر کرنے سے نورانی نہیں ہوتا۔ نفس کی صفت خباثت پر رکھی گئی ہے اور اس کو جتنا بھی صاف کرنے کی کوشش کی جائے تب بھی یہ خبیث ہی

رہے گا۔ اس کا علاج بزرگوں نے اس بات پر رکھا ہے کہ نفس کو مشقت میں ڈالا جائے تو یہ تھک کر اپنی عادت کو بدل لیتا ہے اور انسان کی تابعداری میں آ جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغی اور سرکش گھوڑے کو سہاگے کی بھاری لکڑی کھینچنے کے لیے اس کے پیچھے باندھ دی جائے اور صبح سے شام تک اس کو بھگایا جائے تو کچھ دنوں کے بعد وہ گھوڑا تنگ آ جائے گا اور مالک کی تابعداری کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس آمادگی کے بعد مالک اس کی مزید تربیت کرتا ہے تو وہ مالک کے اشاروں پر بڑے بڑے کام کرنے لگتا ہے، مثلاً اونچی چھلانگ، لمبی چھلانگ اور زمین پر گرے ہوئے چابک کو اپنے منہ سے اُٹھا کر مالک کو دینا وغیرہ۔ اسی طرح نفس کو اگر شریعت کے کاموں میں مبتلا کیا جائے تو نفس اس میں موجود مشقت سے بھی تابعدار ہو جاتا ہے اور انسان کو بڑی بڑی کرامات کا مالک بنا دیتا ہے۔ بزرگوں کے تصرفات بھی نفس کی اصلاح کے بعد ہی نظر آتے ہیں۔

اگر قلب کی صفاء ذکر کے انوار سے متجلی ہو تو نفس کی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ قلب کی طرف ایک نظر اُٹھا کر بھی دیکھے۔ اگر قلب کی حالت زنگ آلودہ ہو تو نفس انسان کے دل پر شیر کی طرح غالب ہو جاتا ہے۔ اس لیے قلب کو ذکرِالٰہی سے متزکی اور متجلّی رکھنا ضروریاتِ تصوف میں سے ہے۔

رُوح اور نفس کا تعلق

ایک حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی انسان شیطان کی پیروی میں لگا رہے تو شیطان انسان کے دل میں اپنے پنجے گاڑے رکھتا ہے، اگر کوئی شخص دُنیاوی عیش وعشرت میں غرق رہے یا غیر شرعی گفتگو میں اُلجھا رہے تو اس کے دل میں شیطان اپنی چونچ رکھ دیتا ہے، جس سے انسان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے رہتے ہیں اور اگر کوئی شخص نیک گفتگو یا نیک کاموں میں لگا رہے تو شیطان اس کے دل سے اپنی چونچ نکال لیتا ہے۔

اگر کوئی انسان بُرے کاموں میں اُلجھا رہے تو اس کے بُرے اثرات اس کے دل پر مرتّب ہوتے رہتے ہیں اور رُوح کمزور اور نحیف ہو جاتی ہے۔ شیطان کی مدافعت کرنا ایسی رُوح کے بس سے باہر کی بات ہے۔ جب گناہوں کی تعداد بڑھتی رہے تو رُوح ایسے مرض میں گرفتار ہو جاتی ہے، جس کو ہم رُوحانی بیماری کہتے ہیں۔ کوئی شخص بیمار ہو تو پہلے وہ بیماری اس کی رُوح کو لگتی ہے اور پھر جسم پر منتقل ہو جاتی ہے۔ انبیاء کا مزاج معتدل ہوتا ہے، اس لیے ان کو کوئی بیماری لاحق نہیں ہوتی، ماسوا اس کے کہ ان کا امتحان لینا مقصود ہو۔

رُوحانی دُنیا کا ایک اور قانون ہے کہ رُوح اور بدن ایک دوسرے کی نقیض (اُلٹ) ہیں، جن کاموں کے کرنے سے بدن کمزور ہو جائے اُن سے رُوح طاقتور ہو جاتی ہے۔ رُوح کی طاقت نیک کاموں سے ہوتی ہے۔ بُرے کاموں سے رُوح کمزور اور بدن طاقتور ہو جاتا ہے، مثلاً روزہ رکھنے سے بدن کمزور ہوتا ہے تو رُوح کو طاقت ملتی ہے، اسی طرح زیادہ کھانے سے بدن طاقتور ہو جاتا ہے اور رُوح کمزور ہو جاتی ہے۔

جہاں نفس سرکش ہوتا ہے، وہاں خدا کا نور نہیں ہوتا

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا نفس جب تک لذتوں کی طرف مائل ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے اُخروی نعمتوں کی لذت نہیں چکھی۔ جب انسان اپنے آپ کو دُنیاوی کمال کی منزل پر دیکھتا ہے تو خود اس کا دُنیا کی آفات میں گھرا ہوا عمل اس کی حالت کی تکذیب کرتا ہے، کیونکہ اس نورِالٰہی کے دیدار کی علامات یہ ہیں کہ دھوکے کے جہان سے انسان کا بچاؤ ہو۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عورت کی بے وقوفی کی وجہ یہ ہے کہ اس پر حیوانیت کا وصف غالب ہوتا ہے کیونکہ وہ رنگ و بو پر بھروسہ رکھتی ہے۔ حیوان کا شعور حیات تک محدود ہے۔ انسان کی جزوی عقل بھی اگر غالب ہو جائے تو وہ عقلِ نفس کے مادہ کی شرارت کو سَلب کر دے گی اور عقل کُلی کا تو کیا ہی کہنا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ نفس انسان کی عقلِ جزوی پر غالب ہے۔ نفسِ امّارہ کو عقلِ کُلی سَلب کر لیتی ہے۔ نفس انتہائی بھوکا ہے اور صبر نہیں کر سکتا۔ مولانا رومیؒ کا کلام بہت طویل ہے، لہٰذا تنگیٔ قرطاس کی بناء پر مزید کلام کا پیش کرنا مشکل ہے۔ ضرورت مند اصحاب ہماری تصنیف ''تہذیبِ نفس'' کا مطالعہ کریں، جس کی ضخامت چھ سو (۶۰۰) صفحات سے زائد ہے اور عنقریب شائع ہونے والی ہے ؎

نفس تو تا مستِ نقل ست و نَبید ۔۔۔ دانکہ رُوحت خوشۂ غیبی ندید

تیرا نفس جب تک (دُنیا کی عیش اور) نقل وشراب سے مست ہے، یاد رکھ کہ تیری روح نے قُربِ حق کا غیبی خوشہ نہیں دیکھا۔ (۵/۲۵۰)

کہ علامات ست زاں دیدارِ نُور ۔۔۔ اَلتَّجَافِیْ مِنْکَ عَنْ دَارِ الْغُرُوْر

کیونکہ اس نور کا دیدار کرنے کی نشانیاں یہ ہیں کہ تجھ سے دھوکے کے گھر (دُنیا) سے کنارہ کشی عمل میں آئے۔ (۵/۲۵۰)

چوں بہ بیند نُورِ حق ایمن شود ۔۔۔ زاضطراباتِ شک او ساکن شود

جب وہ حقیقت (اللہ) کا نور دیکھ لیتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے، وہ شک کی بے چینیوں سے سکون پا جاتا ہے۔ (۵/۲۵۰)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ نفس کا گدھا کود اور پھاند رہا ہے، اس پر شریعت کا بوجھ ڈال کر اِسے اعتدال پر لاؤ۔ یہ ریاضت انسان کے لیے بہتر ہے۔ فرماتے ہیں، بدن دوزخ کا ایندھن ہے، اس کو کم کرو اور کوئی نئ لذت اس میں پیدا ہو جائے تو اسے بھی اکھاڑ پھینکو ؎

بارِ سنگیں بَر خرے کاں می جہد ۔۔۔ زود بر نہ پیش ازاں کو بر نہد

جو گدھا کود اور پھاند رہا ہے اس پر جلدی بھاری بوجھ رکھ دو (تاکہ وہ اعتدال پر رہے) جلدی رکھ دو، اس سے پہلے کہ وہ پھینکے۔ (۵/۱۴۵)

زہر تن را نافع ست و قند نَد　　　　تنِ ہُماں بہتر کہ باشد بے مَدد

ریاضات کا زہر بدن کے لیے مفید اور عیش و تنعّم کا قندِ مضر ہے، بدن کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس کو مدد نہ ملے۔ (۱۱۶/۵)

ہیزمِ دوزخ تن ست و کم کُنش　　　　وَر بروید ہیں تو از بُن بَرکَنش

بدن دوزخ کا ایندھن ہے اس کو کم کرو اور اگر اس میں لذتِ جسمانی کی کوئی نئی شاخ اُگ پڑے تو اسے جڑ سے اُکھاڑ دو۔ (۱۱۶/۵)

علم النفس

مثنوی (مولانا رومیؒ) میں علمِ نفس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، جس میں سے چند باتیں اس باب میں بیان کی جا رہی ہیں۔ ماہرینِ نفس اس دور میں تقریباً ان باتوں پر تحقیق کر رہے ہیں جو سائنسی حقائق مولانا رومیؒ نے کئی سو سال پہلے بیان فرمائے ہیں۔ مولاناؒ کے بیان کردہ حقائق آج بالکل درست ثابت ہو رہے ہیں۔ تحت الشعوری نفسیات کا ماہر فرائڈ کہتا ہے کہ "انسان کے اندر سرچشمۂ حیات شہوت ہے، جسے وہ "لبیڈو" کہتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ شہوت کا رُخ بدل جائے تو اخلاق اور رُوحانیت پیدا ہوتی ہے۔"

مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی امیر سے ایک گھوڑا طلب کیا تو اس امیر نے کہا کہ وہ سفید گھوڑا لے لو، مگر اس شخص نے کہا کہ وہ یہ گھوڑا لینے کو تیار نہیں، کیونکہ اس کو آگے کی طرف چلاؤ تو یہ پیچھے کی طرف چلنے لگتا ہے۔ امیر نے کہا کہ اس حالت میں اگر اس کی دُم گھر کی طرف کر دو گے تو یہ تمہیں گھر پہنچا دے گا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ آدمی ارتقائے حیات میں (ترقی کے لیے) آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر یہ نفس پیچھے کی طرف کھینچتا ہے، یہ رجعت اس کی فطرت ہے۔ فرماتے ہیں کہ شہوت کا رُخ بھی جسمانیت سے عقل اور رُوحانیت کی طرف پھیر سکتے ہیں اور یہی قوت عقل میں تبدیل ہوسکتی ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ زندگی کی تخلیقی قوت شہوت ہے اور اس کا رُخ بدن سے بدل کر رُوح کی طرف کر سکتے ہیں، اگر ایسا ہو تو انسان شریف بن سکتا ہے اور اگر بدن کی طرف جائز حدود میں رہے تو کوئی حرج نہیں مگر ان حدود سے بڑھ جائے تو انسان کو ذلیل کر دیتی ہے۔ شہوت بذاتِ خود نہ شریف ہے نہ ذلیل، پس اگر گھوڑے کی طرح اس کا رُخ پلٹ دو تو منزلِ مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

آں یکے اسپے طلب کرد از امیر　　　　گفت رواں اسپِ اشہب را بگیر

ایک شخص نے کسی امیر سے ایک گھوڑا طلب کیا، اس نے کہا کہ جاؤ وہ سفید گھوڑا لے جاؤ۔ (۱۲۲/۶)

گفت آں را مَن نہ خواہم گفت چوں　　　　گفت اُو واپَس روست و بس حروں

اس نے کہا کہ وہ اس گھوڑے کو لینا نہیں چاہتا، پوچھا کیوں؟ کہا کہ وہ پیچھے کی طرف آنے والا ہے۔ (۱۲۲/۶)

سخت پَس پَس می رود اُو سوئے بن گفت دُمّش را بسُوئے خانہ کُن

وہ دُم کی جانب بہت ہی پیچھے کو ہٹتا ہے، اس نے کہا کہ اس کی دُم کو گھر کی طرف کر دو۔ (۱۲۲/۶)

دُمِ ایں استورِ نفَست شہوتست زاں سبب پَس پَس رود آں خود پرست

تیرے اس جانور نفس کی دُم شہوت ہے، اس لیے وہ خود پرست واپسی کی طرف پلٹتا چلا جاتا ہے۔ (۱۲۲/۶)

شہوت اُورا کہ دُمّ آمد زبن اے مبدل شہوتِ عقبیٰش کُن

اس نفس کے گھوڑے کی شہوت کو جو اصل میں دُم میں اس طرح ہے، اے (مخاطب) اس کو آخرت کی شہوت میں تبدیل کر دے۔ (۱۲۲/۶)

چوں بہ بندی شہوتش را از رغیف سر کُند آں شہوت از عقلِ شریف

جب تو اس کی شہوت کو روٹی کی جانب سے بند کر دے گا تو وہ شہوت عقل شریف میں سر اُبھارے گی۔ (۱۲۲/۶)

ہمچو شاخے کش ببری از درخت سَر کند قُوت زشاخ اے نیک بخت

جس طرح کوئی درخت کی ایک شاخ کاٹ دے تو اے نیک بخت! اس کی قوت دوسری شاخوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ (۱۲۲/۶)

انیسواں باب

انسان کی رُوح کی قوت

حضرت مسیح علیہ السلام گدھے پر سوار ہوتے تھے۔ بہیمیت کے وقت انسان کا جسم بھی گدھے کی طرح ہوتا ہے، جس پر روح سوار ہوتی ہے۔ مسیح آشنا روح وہ ہے جو ترے جسم (یعنی جوف خر) کے اندر ہے اور تُو اپنے گدھے پن کی وجہ سے روح سے ناآشنا ہے۔ انسان جب اپنی روح کو پہچان لے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس کے اندر ملائکہ اور مسیح بالقویٰ موجود ہیں۔ (جب انسان کے دل میں خدا سما سکتا ہے تو باقی چیزوں کا سمانا کیا مشکل ہے) اس لیے مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان نہیں جانتا کہ اس کی روح کے ذرّے کے اندر ایک آفتاب مضمر ہے، اگر اس کی قوتیں آشکار ہو جائیں تو وہ ایسی ہیں کہ زمین و آسمان پاش پاش ہو جائیں (یہ قول بھی صوفیاء سے منسوب ہے کہ روح میں اس قدر طاقت ہے کہ اگر وہ چاہے تو زمین و آسمان کو ایک لقمہ میں نگل جائے) مادی ایٹم کا ذرہ جو ایٹم کی تاثیر رکھتا ہے، کس قدر تباہ کُن ہے اور اگر اسی طرح روح کی قوتیں بھی ظاہر ہو جائیں تو اس کے سامنے تمام مظاہر لاشئے ہیں۔

آفتابے در یکے ذرّہ نہاں ناگہاں آں ذرّہ بگشاید دہاں

انسان کی روح کے ایک ذرّہ میں آفتاب مضمر ہے، اگر وہ ذرہ اچانک منہ کھول دے۔ (۶/۴۴۰)

ذرّہ ذرّہ گردد افلاک و زمیں پیش آں خورشید چوں جَست از کمیں

آسمان اور زمین ذرّہ ذرّہ ہو جائے اُس سورج کے سامنے جب وہ کمین گاہ سے نکلے۔ (۶/۴۴۰)

ایں چنیں جانے چہ در خوردِ تن است ہیں بشوا اے تن ازیں جاں ہر دو دست

ایسی جان جسم کے کیا لائق ہے، خبردار! اے جسم اس جان سے دونوں ہاتھ دھو لے۔ (۲/۴۴۰)

اے ہزاراں جبرئیلؑ اندر بشر اے مسیحاں نہاں در جوفِ خر

خبردار! اس بشر میں تو ہزاروں جبرئیل ہیں، آگاہ ہو جا کہ گدھے کے پیٹ میں بہت سے مسیح پوشیدہ ہیں۔ (۲/۴۴۰)

شہوات سے خلاصی مشکل ہے

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی غلامی سے شہوات کی غلامی بدتر اور سخت تر ہے۔ آقا کبھی کسی کام سے خوش ہو جائے تو ایک لفظ آزادی کا کہہ کر اپنے غلام کو آزاد کر سکتا ہے مگر نفس کی غلامی سے نجات اتنی آسان نہیں۔ یہ نفس کی آزادی اس لیے مشکل ہے کہ انسان خود لذت کے کاموں میں نفس کی حکومت کو اور بھی زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے اور گناہوں سے چھٹکارا نہیں چاہتا۔ جب وہ خود ہی اس کنوئیں میں گرا ہے اور نکلنا بھی نہیں چاہتا تو کون اسے نکالے؟ ؎

بندۂ شہوت بتر نزدیکِ حق از غلام و بندگانِ مُسترق

اللہ کے نزدیک نفسانی خواہش کا غلام زیادہ بُرا ہے رقیق (باریک) بنائے ہوئے غلاموں سے۔ (۱/۳۸۷)

کایں بیک لفظے شود از خواجہ حُر وآں زید شیریں و میرد سخت مُر

اس لیے کہ وہ (غلام) آقا کے ایک لفظ سے آزاد ہو جاتا ہے مگر (نفس کا غلام) لذت میں جی کر سختی سے مرتا ہے۔ (۱/۳۸۷)

در چہے افتاد کورا غور نیست وآں گناہِ اوست جبر و جور نیست

وہ ایسے کنویں میں گرا جس کی تھاہ نہیں ہے، وہ اس کی خطا ہے، ظلم و زبردستی نہیں ہے۔ (۱/۳۸۷)

روح اور نفس کے تضادات

کچھ مشائخ کا بیان کشف المحجوب میں ملتا ہے کہ نفس کو مختلف شکلوں میں ہونے کا اختیار دیا گیا ہے۔ کسی نے نفس کو چوہے یا سانپ کی شکل میں دیکھا اور کسی نے لومڑی کی شکل میں دیکھا۔ ایک بزرگ نے نفس کی لومڑی کو پاؤں تلے کچل دیا لیکن جوں جوں اس کو کچلا جا رہا تھا وہ نفس اور بھی موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ نفس نے کہا کہ میں اللہ کی مخلوق ہوں، تم مجھے ختم نہیں کر سکتے اور تمہارے کچلنے سے میں نہیں مروں گا، لہٰذا تم مجھے ختم کرنے کی کوشش نہ کرو۔

مشائخ نے کہا ہے نفس کی عین کو بدلا نہیں جا سکتا، البتہ اس کو ذکر و اذکار کی محنت سے مہذّب کیا جا سکتا ہے۔ نفس کو جتنا رگڑنے کی کوشش کرو گے، اندر سے اس کی خباثت نکلتی رہے گی۔ اس لیے نفس کو عقل اور روح کے تابع کیا جاتا ہے اور اس نصب العین کو ذکر میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

روح اتنی عظیم چیز ہے کہ اس سے زیادہ عظیم چیز اللہ تعالیٰ نے نہیں بنائی، اگر روح چاہے تو تمام زمین اور

آسمان کو ایک لقمہ میں کھا جائے۔ اس کی صفت نوری ہے اور جتنا اس کو ذکر سے مصفّٰی کرو گے اتنی ہی منزکی اور صیقل ہوتی جائے گی اور اس پر اگر بداعمالیوں کی سیاہی چڑھ جائے تو تھوڑے سے ذکر سے ہی مصفا اور متجلّٰی ہو جائے گی، روح کی خوراک نیک عمل اور عبادات ہیں۔ نفس ذکر اور ریاضت سے دُبلا ہو جاتا ہے مگر روح عبادات سے طاقتور اور توانا ہو جاتی ہے۔

نار شہوت می نیارامد بآب　　　زانکہ دارد طبع دوزخ در عذاب

شہوت کی آگ پانی کے ساتھ تسکین نہیں پاتی کیونکہ وہ عذاب میں دوزخ کی طبیعت رکھتی ہے۔　(۱/۳۷۶)

آتشِ شہوت کی نارِ دوزخ کے ساتھ مشابہ ہونے کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے "حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ" یعنی دوزخ شہوات سے ڈھکا ہوا ہے۔ شیطان لاحول پڑھنے سے دفع ہوسکتا ہے مگر نفسِ شہوت پرست تو مارِ آستین ہے، اُسے کسی تدبیر سے دفع کرنا آسان نہیں۔ ظاہری آگ تو پانی سے بجھ سکتی ہے مگر شہوت کی آگ دوزخ تک لے جاتی ہے۔ اس آتشی مخلوق شیطان کے علاوہ یہ ایک اور آگ ہے، جس سے شہوت کی آگ مراد ہے جو انسان کے اندر گناہ ولغزش کی اصل بنا ہے یا یوں کہو کہ اس آگ کے اندر گناہ ولغزش کی جڑ ہے۔

نفس ایک گھوڑے کی طرح ہے، اگر اس کو گھوڑے کی طرح مشقت سے سدھایا جائے تو تابعدار ہو جاتا ہے جب کہ روح نورانی ہے، اس لیے عبادات اور ریاضت سے اپنی اصلی نورانی شکل میں لوٹ آتی ہے۔ نفس کی اگر تربیت ہو جائے تو یہ بڑے بڑے کام کرتا ہے۔ اس کو سواری بنا کر جہاں چاہو لے جاؤ، یہ سرکشی نہیں کرے گا۔

طہارت والے دل میں حرص اور مال کا کوئی مقام نہیں

قرآن مجید میں ہے کہ "اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝" غافل رکھا تمھیں زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی ہوس نے یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے ہو۔ (التکاثر: ۲۔۱) انسان بچپن سے لے کر لڑکپن، جوانی، کاروبارِ حیات کے ایام سے لے کر بڑھاپے تک اس مال کی حرص اور لالچ میں کھویا رہتا ہے، حتیٰ کہ وہ قبر تک جانے سے ایک لمحہ پہلے بھی اسی حال میں رہتا ہے کہ اس کو مال کی ہوس دامن گیر رہتی ہے۔

مذکورہ آیت کا مفہوم واضح ہے کہ انسان (اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ) زندگی کے تمام مراحل میں اس حرص و لالچ کی زد سے بچ نہیں سکتا۔ حرص ایک ایسی بیماری ہے، جس سے مرتے دم تک جان نہیں چھوٹتی۔ اس کا علاج قناعت ہی سے ہوسکتا ہے۔ نفس کی بیماری کا علاج شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے کہ اسے "یا قناعت پُر می کند یا خاکِ گور" (یعنی اس کو یا تو قناعت پُر کرتی ہے یا قبر کی مٹی)۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا پیٹ بھر جاتا ہے مگر نیت نہیں بھرتی۔ لوگ زیادہ کھانے سے قے کرتے ہیں یا اسہال میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس کے لیے کڑوی دوا بھی پینا ہوتی ہے۔ حکیم لوگ ایسی بیماریوں کے لیے پرہیز کی تلقین کرتے ہیں۔

ہنری فورڈ جس کی نئی کاروں کو ساخت کرنے کی ایک بہت بڑی فیکٹری تھی اور دُنیا کا سب سے زیادہ دولت مند انسان مانا جاتا تھا، اس نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ مجھے اپنی ذات کی خاطر کبھی دولت کی حرص لاحق نہیں ہوئی۔ میں اگر دس محلات بھی تعمیر کر لوں تو ایک سے زیادہ کمرے استعمال نہیں کر سکتا۔ ایک بستر سے زیادہ میرے سونے کے لیے درکار نہیں۔ شریفانہ قسم کے چند کپڑوں کے جوڑے میرے لیے کافی ہیں۔ اپنی ذات کے لیے اضافۂ دولت میرے کس کام آ سکتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک کوزہ میں سمندروں کا پانی ڈال دیا جائے تو پھر کوزے میں بقدرِ ظرف یعنی ایک کوزے سے زیادہ پانی نہیں بھرے گا لیکن حریص آدمی کی آنکھ کا کوزہ کبھی نہیں بھرتا۔

کوزۂ چشمِ حریصاں پُر نشد   تا صدف قانع نشد پُر دُر نشد

حریصوں کی آنکھ کا پیالا بھرتا نہیں ہے، جب تک سیپ نے قناعت نہ کی، موتی سے نہ بھرا۔ (۱/۳۳)

گوہر بننے کا فلسفہ پہلے پہل کسی نے اپنے خیالات کے مطابق لکھا تھا کہ بارش کا ایک قطرہ سیپ میں جائے تو وہ گوہر بنتا ہے لیکن اب سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ سیپ کے منہ میں ایک ریت کا ذرہ جاتا ہے اور سیپ کو اس ذرے کے باعث خلش یا خارش محسوس ہوتی ہے تو فطرت اس ذرّے پر ایک لعاب کا غلاف چڑھا دیتی ہے اور مذکورہ خارش ختم ہو جاتی ہے اور یہی سیپ کا لعاب خشک ہو کر موتی بن جاتا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ سیپ ایک قطرے یا ذرّے پر قناعت کرتا ہے اور اگر وہ منہ کھلا ہی رکھتا تو موتی نہ بنتا۔

مولانا رومیؒ نے سیپ کی مثال کے علاوہ پانی کی مثال بھی دی ہے کہ کشتی کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نیچے پانی ہو، اگر کشتی کے نیچے دس فٹ پانی ہو تو یہ کافی ہے اور اگر پانچ سو فٹ سے گہرا سمندر ہو تو وہ زیادہ پانی اس کے لیے فالتو ہے اور کشتی کو اس زائد پانی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ فرماتے ہیں کہ مال کا لالچ یا حرص اگر انسان کے دل میں داخل ہو جائے تو وہ زندگی کی خرابی کا باعث ہوتا ہے اور اگر پانی کشتی کے اندر چلا جائے تو کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔ زندگی کے حقیقی اور فطری مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بقدرِ ضرورت مال لازمی ہے۔ پیغمبروں اور اولیائے کرامؒ کو بھی بقدرِ ضرورت مال کی حاجت رہتی ہے لیکن یہ مال ان کے لیے ذریعۂ خیر ہے اور مال بذاتِ خود مقصودِ زندگی نہیں۔ دل کے اندر مال کا کوئی مقام نہیں۔ مال صالح انسان کے لیے رحمت ہے مگر غیر صالح انسان کے لیے زحمت اور آفت ہے ؎

مال را کز بہرِ دیں باشی حمول   نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ خواندش رسولؐ

وہ مال جو دین کے لئے باربردار کا کام کرے، اس کو رسول ﷺ نے بہترین اچھا مال قرار دیا ہے۔ (۱/۱۲۶)

آب در کشتی ہلاکِ کشتی ست   آب اندر زیرِ کشتی پُشتی ست

کشتی میں پانی ہونا کشتی کی تباہی ہے، کشتی کے نیچے پانی ہونا کشتی کے لئے مددگار ہے۔ (۱/۱۲۶)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر صفاتِ الٰہیہ کو اپنایا جائے، جیسا کہ فرمایا ہے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" (یعنی اللہ کی

صفات کو اپناؤ) تو یہ بات غایتِ حیات بن جاتی ہے اور اس کا راستہ عشقِ الٰہی ہے، جو تمام ادنیٰ، سفلی اور آنی جانی تمناؤں کو سوخت کر دیتا ہے۔ عشق تمام بیماریوں کا علاج ہے ؎

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد　　او زحرص و عیب کُلّی پاک شد

جس کا جامہ عشق کی وجہ سے چاک ہو گیا، وہ حرص اور عیب سے بالکل پاک ہو گیا۔ (۳۳/۱)

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

خوش رہ، ہمارے اچھے جنون والے عشق! اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب۔ (۳۳/۱)

مقصودِ حیات بلند رُوحانی مقامات تک پرواز کرنا ہے، جیسا کہ مولاناؒ نے فرمایا ''منزل ما کبریا ست'' یعنی ہماری منزل اللہ تعالیٰ کی بڑائی ہے۔ حرص و لالچ، حرصِ مال اور حبِّ جاہ کی وجہ سے اس پرواز میں رکاوٹ اور محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشق روح کی پرواز کے لیے کمند ثابت ہوتا ہے۔ روح کے پر اور بال بھی یہی عشق ہے جو انسان کو اُڑا کر کوئے یار میں پہنچا دیتا ہے ؎

پرّ و بالِ ما کمندِ عشقِ اُوست　　موکشانش می کشد تا کوئے دوست

ہمارے پر و بال اس کے عشق کی کمند ہیں، اس کے بال کھینچتے ہوئے اس کو دوست کے کوچہ تک لے جاتے ہیں۔ (۳۴/۱)

زندگی کے ہر کام میں انسان کا امتحان ہے
(نفسانی خواہشات کا امتحان)

عارف رومیؒ بڑی تفصیل کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ زندگی کا عام قانون یہ ہے کہ وہ ہر کام میں انسان کا امتحان لیتی ہے۔ انسان کسی دوسرے کے دلکش کام کو دیکھتا ہے تو خود بھی اسی طرح کرنا چاہتا ہے۔ جب اس کام میں مشکل مراحل آئیں اور کچھ ناکامی دکھائی دے تو کم ہمت لوگ مایوس اور بیزار ہو کر اس کی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ غالب کا شعر ہے ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

علامہ اقبالؒ نے بھی زندگانی کی حقیقت کے متعلق فرہاد کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کو شیریں

سے محبت تھی تو اس نے دودھ کی نہر نکالنے کے لیے سخت محنت شروع کی اور اس کی زندگی کا یہ تصور تھا کہ ''جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی'' ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں صفحہ ۶۴۹ پر علامہ کا فلسفہ خطر پسندی بھی ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ　　جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب　　اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی کا امتحان کرتے رہنے کے لیے فرمایا ہے۔ اس مضمون کو ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' کے صفحہ نمبر ۶۰۱ اور ۶۷۷ پر مطالعہ فرمائیں۔ مشہور ہے کہ باہمت لوگوں کا اصول یہ ہے کہ کوئی کام شروع کیا جائے تو پوری کوشش سے اس میں قدم رکھا جائے۔ ان کا قول ہے ''ہر چہ بادا باد، ما کشتی در آب انداختیم'' (جو ہونا ہے ہو جائے ہم نے کشتی دریا میں ڈال دی ہے)۔ مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کسی عورت پر عاشق ہو گیا تو محبوبہ نے وصال سے قبل حق مہر کا مطالبہ شروع کر دیا اور دروازہ بند کر لیا کہ جب تک مہر ادا نہ کرو گے ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔ عاشق صاحب وصل کو نقد سمجھتے تھے اور مہر کو ادھار مگر یہاں مطالبہ قبل از وصال شروع ہو گیا۔ یہ مہر اس بات کا استعارہ ہے کہ زندگی میں ہر مقصود کی کوئی نہ کوئی قیمت ہے اور یہ قیمت وفا و صبر اور رضا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

عاشقِ ہر پیشہ و ہر مطلبے　　حق بیالود اولِ کارش لبے

ہر مقصد اور ہر پیشہ کے عاشق کے ابتداء کار میں اللہ اس کے ہونٹ آلودہ کر دیتا ہے۔ (۴/۱۷)

چوں در اُفتادند اندر جُستجو　　بعد ازاں در بست و کابیں جست او

وہ جب جستجو میں تھک جاتا ہے تو اس کے بعد در بند کر دیتا ہے اور مہر کا مطالبہ کرتا ہے۔ (۴/۱۷)

ہر کسے را ہست امیدے برے　　کہ کشادندش دراں روزے درے

ہر شخص کے لیے اُمید کا پھل ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس معاملے میں ایک روز اس کے لیے دروازہ کھول دیتے ہیں۔ (۴/۱۷)

باز در بستندش و آں دَر پرست　　بر ہُماں اُمید آتش پا شُدست

پھر اس کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، وہ دَر کا پجاری اسی اُمید پر بے چین ہوتا ہے۔ (۴/۱۷)

آپ کا اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی کام شروع کرو تو پہلے اس کی آب و تاب اپنے اندر پیدا کرو اور پھر اللہ کا نام لے کر شروع کر دو۔ انسانی نفس آرام کا طلبگار ہے اور عشق اور محبتِ الٰہی کا پیشہ مردِ آہن کی کوشش اور استقامت چاہتا ہے۔ اگر لوگ رُوحانی زندگی کو شروع کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ان سے نفسانی خواہشات کا

امتحان لیا جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ و بایزیدؒ اور داتا گنج بخشؒ نے جس قدر محنت، جانفشانی اور استقامت سے کام لیا ہے تو اس کی مثال ملنا مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ایسے لوگ دیکھنے میں کم ہی آئے ہیں۔ اگر آپ بھی اس بات کو دل میں بٹھالیں اور ہمت سے لگ جائیں تو کوئی مشکل بات نہیں کہ آپ کو بھی کوئی اچھا مقام مل جائے۔ اگر داتا گنج بخشؒ نہ بن سکے تو کچھ نہ کچھ ہاتھ پلّے نظر آئے گا ؂

تو مگو اندر جہاں یک بایزیدؒے بود و بس　　　　ہر کہ واصل شد زجاناں با یزیدؒ دیگر است

تم یہ نہ کہو کہ بایزیدؒ ایک ہی ہوا ہے اور بس، ہر وہ شخص جو محبوب سے واصل ہوا، وہ بھی ایک بایزید ہے۔ (غیر مثنوی)

رَوْ بجو حق را واز دیگر مجو

(حق کو (شیخِ کامل سے) طلب کرو، کسی اور سے طلب نہ کرو)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ عقل اور نفس کی اِصلاح شیخِ کامل سے طلب کرو کیونکہ یہ اِصلاح ادھر سے ہی آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء صفات سمیت انسانِ کامل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ شخصی عقل نے عقلِ کل (اللہ کی عقل) کو بدنام کر دیا ہے۔ جب تک آخرت کی کامیابی نہ ہو دُنیا کی کامیابی عقلِ عیار و مکار کا کام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے۔ عقل کو ذرا سا صیقل کر لو تو یہی عقل عقلِ سلیم بن جاتی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ؂

واگزیں آئینہ گو اَکیَس است　　　　اندکے صیقل گری اُورا بس ست

وہ آئینہ اختیار کرو جو زیادہ زیرک ہے، اس کو تھوڑا سا صیقل کرنا ہی کافی ہے۔ (۵/۵۶)

ایں تفاوت عقل ہا را نیک داں　　　　دَر مراتب از زمین تا آسماں

عقلوں کی اس تفاوت کو جو اُن کے مراتب میں ہے زمین و آسمان تک خوب سمجھ لو۔ (۵/۵۶)

ہست عقلے ہمچو قرصِ آفتاب　　　　ہست عقلے کمتر از زہرہ و شہاب

ایک عقل روشنی کے لحاظ سے آفتاب کی مثل ہے اور ایک عقل زہرہ اور ٹوٹنے والے ستارے سے بھی کم تر ہے۔ (۵/۵۶)

ہست عقلے چوں چراغِ سر خوشے　　　　ہست عقلے چوں ستارہ آتشے

ایک عقل مست چراغ کی سی ہے، ایک عقل آگ کے شعلے کی سی ہے۔ (۵/۵۶)

زانکہ ابر از پیشِ اُو چوں واجہد　　　　نورِ یزداں بیں خِردہا بر دہد

کیونکہ جب (ماسوا اللہ کا) بادل سامنے سے اُٹھ جاتا ہے تو وہ آفتاب کی سی عقلیں اللہ کو دیکھنے والا نُور برساتی ہیں۔ (۵/۵۶)

یہ انبیاء اور اولیاء کی اَرواح مقدسہ کی عقل ہوتی ہے۔

عقلِ او مُشک ست و عقلِ خَلق بُو — عقل ہائے خلق عکسِ عقلِ اُو

مخلوق کی عقلیں اس کی عقل کی عکس ہیں، اس کی عقل مُشک ہے اور مخلوق کی عقل محض ایک خوشبو۔ (۵/۵۶)

عرش و کرسی را مداں کزوے جُداست — عقلِ کُل و نفسِ کُل مردِ خدا ست

عقلِ کُل اور نفسِ کُل خدا کا مرد ہے، عرش اور کرسی کو اس سے جدا نہ جانو۔ (۵/۵۷)

جو کچھ عقل میں ہے اس کی تفصیل نفسِ کُل میں ہے اور ان دونوں کا مظہر انسان کامل ہے۔

رو بجو حق را و از دیگر مجُو — مظہرِ حق ست ذات پاک اُو

اس پیر کی ذاتِ پاک حق کی مظہر ہے، حق کو اس سے طلب کرو اور کسی سے طلب نہ کرو۔ (۵/۵۶)

یعنی مردِ خدا جو انسانِ کامل ہے، مظہرِ حق ہے اس لیے کہ ذاتِ حق تمام اسماء و صفات سمیت انسانِ کامل میں ظاہر ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بیان عقلِ کل اور نفسِ کل کی صفت ہو یعنی عقلِ کل اور نفسِ کُل مظہرِ حق ہیں۔

کامِ دنیا مَرد را بے کام کرد — عقلِ جُزوی عقل را بدنام کرد

شخصی عقل نے عقل (کُل) کو بدنام کر دیا ہے، دُنیا کی کامیابی نے اس کو (عقبیٰ سے) ناکام رکھا۔ (۵/۵۶)

بیسواں باب

دریائے ہوس اور نفسیاتی مریض

مولاناؒ نے ہوس پرست انسان کی ایک مثال دی ہے کہ شکاری کبھی شکار کے سایہ پر ہی تیر چلاتا ہے یا کتا پانی میں اپنا عکس دیکھتا ہے کہ اس کی مثل ایک اور کتا منہ میں ہڈی لے کر کھڑا ہے تو غصہ میں اس کی ہڈی چھیننے کی کوشش کرتا ہے، ایسا کرنے سے اس کے اپنے منہ کی ہڈی بھی پانی میں گر جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ خودغرض اور ہوس کے اندھوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عالمِ انسانی بے انتہا خواہشوں کا سمندر ہے اور اس میں حرص و ہوا کے بندے ڈوب جاتے ہیں، صرف وہ لوگ بچ سکتے ہیں جو اس سمندر میں اس گھڑے کی طرح ہیں جس میں ہوا بھری ہو اور منہ بند ہو۔ ایسے گھڑے تو فقراء کے نفوس ہوتے ہیں اور اس میں جو ہوا ہے، نفحۂ الٰہی کی ہوا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ بہانہ تراشی کرتے ہیں کہ ہم فلاں کام نہیں کر سکتے اور کوئی نہ کوئی عذر پیش کرتے رہتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ "اِنْ تَمَارَضْتُمْ لَدَیْنَا تُمْرَضُوْا" یعنی اگر تم جھوٹ موٹ بیمار ہو جاؤ تو واقعی بیمار ہو جاؤ گے۔ ماہرینِ نفسیات نے ہزارہا انسانوں کا مشاہدہ کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بعض انسانوں کے جسمانی عوارض حقیقتاً نفسیاتی عوارض ہوتے ہیں اور نفس کا عذرِ لنگ انسان کو واقعی لنگڑا بنا دیتا ہے۔

ہر کہ ماند از کاہلی بے شُکر و صَبر او ہمی داند کہ گیرد پائے جَبر

جو کاہلی کی وجہ سے بے شکر اور بے صبر رہا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس نے جبر کا پایہ تھاما ہے۔ (۱۳۴/۱)

ہر کہ جبر آوردِ خود رنجور کرد　　تا ہماں رنجوریش در گور کرد

جو جبر کا بہانہ لاتا ہے خود کو غمزدہ کر لیتا ہے، حتیٰ کہ اس کا غم اس کو قبر میں لے جاتا ہے۔ (۱/۱۳۴)

گفت پیغمبرؐ کہ رنجوری بہ لاغ　　رنج آرد تا بمیرد چوں چراغ

پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ مذاق کی بیماری مرض پیدا کر دیتی ہے اور یہاں تک کہ اس رنج سے مریض چراغ کی طرح بُجھ جاتا ہے۔ (۱/۱۳۴)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح کوئی کانٹا انسان کی جلد کے نیچے چلا جائے تو اس کا نکلنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح کچھ باریک کانٹے دل میں چبھ کر بے حد خلش اور بے چینی پیدا کر دیتے ہیں۔ چونکہ یہ دل کے کانٹے نظر سے اوجھل ہوتے ہیں اور تحت الشعور میں چلے جانے کی وجہ سے شعور کی دَسترس سے باہر ہو جاتے ہیں، اس لئے انسان اِضطراب میں جتنے ہاتھ پاؤں مارے یہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے، جب تک کہ کوئی زبردست علم اور تجربے والا نفس کا طبیب اپنے علاج سے اسے درست نہ کرے۔ مولاناؒ نے لکھا ہے کہ ایک شہنشاہ کی ایک کنیز سخت بیمار ہوئی اور کوئی طبیب اسے ٹھیک نہ کر سکا تو ایک طبیبِ نفسیات کو بلایا گیا۔ اس نے بہت سی باتیں دریافت کیں اور ساتھ ہی نبض کی حرکت کو بغور دیکھتا رہا۔ آخر اس نے دریافت کر لیا کہ یہ ایک لڑکے کے عشق میں گرفتار ہے، جو فلاں شہر کا فلاں نامی لڑکا ہے۔ پہلے تو اس نے شہروں کے نام لیے اور پھر نبض کا اثر دیکھتا رہا، پھر محلوں اور گھروں کے نام گنوائے اور بالآخر اس نے لڑکے کا نام تلاش کر لیا، جس کے عشق میں وہ گرفتار تھی ؎

نرم نرمک گفت شہر تو کجاست　　کہ علاج اہلِ ہر شہرے جداست

حکیم نے نرمی سے پوچھا کہ تیرا شہر کہاں ہے؟ کیونکہ ہر شہر والے کا علاج جدا ہوتا ہے۔ (۱/۴۶)

وندراں شہر از قرابت کیستت　　خویشی و پیوستگی با چیستت

اور اس شہر میں تیری قرابت کس سے ہے؟ کس کو اپنا سمجھتی ہے اور کس سے پیوستگی (تعلق) ہے۔ (۱/۴۶)

دست بر نبضش نہاد و یک بیک　　باز می پُرسید از جَورِ فلک

ہر بات پوچھ کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھتا تھا پھر پوچھتا تھا کہ تم پر کیا ستم ہوئے ہیں۔ (۱/۴۶)

اس کے بعد مولاناؒ نے بہت سی فلسفے کی باتیں اشعار میں لکھیں اور بیان کیا ہے کہ انہوں نے لڑکی سے پوچھا کہ اس کو اس لڑکے کی کون سی چیز پسند ہے۔ لڑکی نے بتلایا کہ اس کے بال مجھے بہت پسند ہیں۔ طبیبِ نفسیات نے بادشاہ کو کہا کہ اس لڑکے کے بال منڈوا دیئے جائیں تو وہ لڑکی اس لڑکے سے نفرت کرنے لگے گی۔ یوں اس کا مکمل علاج ہو گیا۔ نفس کا علاج بھی کوئی حاذق حکیم ہی کر سکتا ہے، جو امراضِ نفس کے علاج سے آگاہ ہو اور وہ طبیب شیخِ طریقت ہے، نفس کی اصلاح پر ہم اس کتاب میں ایک پورا باب لکھ چکے ہیں۔ مولانا رومیؒ نے یہ علاج بیان کیا ہے کہ ''دامنِ آں نفس کش را سخت گیر'' یعنی اس نفس کو مارنے والے کا دامن مضبوطی سے تھام لو۔

ذوقِ مدح آفتِ نفس ہے

آفات میں سے ایک بڑی آفت اپنی مدح سننے کا چسکا ہے۔ اس سے تکبر اور غرور پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کا میٹھا زہر ہے۔ یہ بھی نفس کا دھوکا ہے کہ بندہ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی تعریف کا طلبگار نہیں ہے۔ کبھی بندہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ فلاں میری تعریف مجھے خوش کرنے کے لیے کر رہا ہے لیکن اگر کوئی برائی کرے تو انسان ناراض ہو جاتا ہے۔ اپنی تعریف سننے کا شوق رَفتہ رَفتہ رُوح میں سرایت کر جاتا ہے اور رُوحانی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے، اسی لیے کہتے ہیں پیر اپنی پوجا نہیں کرواتے بلکہ مرید اُن کی پوجا کرواتے ہیں ''پیراں نمی پرند و مریدان می پرانند'' (پیر خود نہیں اُڑتے مرید اُنہیں اُڑاتے ہیں) ؎

اُو چو بیند خلق را سرمستِ خویش　　　از تکبر می رود از دستِ خویش

وہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ مجھ پر سرمست ہیں تو وہ اپنے ہاتھ سے تکبر میں چلا جاتا ہے۔ (۲۰۵/۱)

اُو نداند کہ ہزاراں را چو اُو　　　دیو افگند است اندر آبِ جو

وہ نہیں جانتا کہ اس کی طرح ہزاروں کو شیطان نے نہر کے پانی میں پھینک دیا ہے۔ (۲۰۵/۱)

اس سلسلے میں مولانا رومؒ کے اور بھی بہت اشعار موجود ہیں، لیکن اختصار کی خاطر اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

اَفکار کا اثر زندگی پر

تن اور من دونوں کی صحت کا مدار افکار پر ہے۔ غمگین انسان فکر سے موم کی طرح پگھلتا ہے اور اچھے افکار سے روح اور جسم دونوں تر و تازہ رہتے ہیں۔ غیر صالح فکر خون کو پی جاتا ہے اور نیک افکار سے خون بڑھتا ہے۔ فکرِ صالح احوالِ بد کو بدل کر دل کو خوش کر دیتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اچھے اور بُرے خیالات سے مومن کو فائدہ پہنچتا ہے، جو نامساعد حالات پر صبر اور نعمت کے حصول پر شکر کرتا ہے اس کی نعمت میں اضافہ ہوتا ہے۔'' ایک مردِ خدا سے پوچھا گیا کہ زہریلا سانپ آپ کے سامنے کیسے مسکین بن جاتا ہے؟ فرمایا ''محبت کا اثر جادو ہے، حیوانوں پر بھی چلتا ہے، میں نے اس پر محبت کی نظر ڈالی تو وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگا۔'' اسی لیے کہتے ہیں کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے تو ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔ دوسروں سے محبت کا مطالبہ نہ کرو بلکہ خود ان سے محبت کرو تو سچی محبت اثر کیے بغیر نہیں رہتی، مسِ خام کو کندن بنانا خوش فکری کا نتیجہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

آدمی را فربہی ہست از خیال　　　گر خیالاتش بُود صاحب جمال

خیالات کی وجہ سے آدمی کی فربہی ہے، اگر اس کے تصورات جمال کے حامل ہوں۔ (۶۷/۲)

در خیالاتش نماید ناخوشے　　　می گدازد ہمچو مومِ آتشے

اگر اس کے خیالات ناخوشگواری ظاہر کریں تو آگ پر موم کی طرح پگھل جائے گا۔ (۶۷/۲)

درمیان مار و کژدم گر ترا　　با خیالاتِ خوشاں دارد خدا

اگر تجھے سانپ اور بچھوؤں کے درمیان عمدہ تصورات کے ساتھ خدا رکھے۔ (۶۸/۲)

مار و کژدم مر ترا مونس شود　　کاں خیالت کیمیائے مس شود

سانپ اور بچھو تمہارے غمخوار ہو جائیں گے کیونکہ وہ تیرے خیالات کے تانبے کے لئے کیمیا ہو جائیں گے۔ (۶۸/۲)

صبر شیریں از خیال خوش شدست　　کاں خیالاتِ فرح پیش آمد ست

صبر بھی اچھے خیال سے شیریں ہو جاتا ہے کیونکہ خوشی وہاں تازگی پیدا کرتی ہے۔ (۶۸/۲)

آں فرح آید زایماں در ضمیر　　ضُعفِ ایماں نااُمیدی و زحیر

ہر خوشی تمہارے ضمیر میں ایمان سے آتی ہے، ایمان کی کمزوری نااُمیدی اور ناخوشی ہے۔ (۶۸/۲)

اے بندۂ خاکی زمین کی طرح صبر کر
اور پستی سے افلاک کی طرف جا

دُنیا میں زمین پر طرح طرح کے حادثات، طوفان، سیلاب، زلزلے باد و باراں سے تباہی اور تمازتِ آفتاب کے علاوہ بہت سی آفات نازل ہوتی ہیں مگر یہ ان سب پر صبر کرتی ہے اور انسانوں، حیوانوں کو پالتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان جو کہ دھرتی سے پیدا ہوا ہے، اس کو بھی چاہیئے کہ اس سے سبق سیکھے ؎

گر شود ذرّاتِ عالم حیلہ پیچ　　باقضائے آسماں ہیچ است ہیچ

اگر تمام دُنیا کے ذرّے حیلہ گری کریں تو آسمان کے فیصلہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ (۵۴/۳)

چوں گریزد ایں زمیں از آسماں　　چوں کند اُو خویش را ازوے نہاں

یہ زمین آسمان سے کیسے گریز کرے یہ اپنے آپ کو اس سے کیسے چھپائے۔ (۵۴/۳)

ہرچہ آید ز آسماں سُوئے زمیں　　نے مفر دارد نہ چارہ نے کمیں

جو کچھ آسمان سے زمین پر آتا ہے (اس سے) نہ مفر ہے، نہ کوئی تدبیر ہے، نہ چھپنے کی جگہ۔ (۵۴/۳)

آتش از خورشید می بارد برو　　او بہ پیشِ آتشش بنہادہ رُو

سورج سے اس پر آگ برستی ہے، وہ اس کی آگ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے۔ (۵۴/۳)

او شدہ تسلیم اُو ایوب وار　　کہ اسیرم ہرچہ می خواہی بیار

وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح اپنے آپ کو اس کے سپرد کیے ہوئے ہے کہ میں قیدی ہوں، تُو جو چاہے کر۔ (۵۴/۳)

اے کہ جُزوِ ایں زمینی سر مکش　　چونکہ بینی حُکمِ یزداں دَر مکش

اے کہ تُو زمین کا جزو ہے سرکشی نہ کر، جب تو خدا کا حکم (آتا) دیکھے تو دروازہ بند نہ کر۔ (۵۴/۳)

چوں خَلَقْنَا کُمْ شُنیدی مِنْ تُرابٍ　　　　خاک باشی جُست از تو رُو متاب

جب کہ تُو نے ''ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا'' سن لیا ہے، اس نے تجھ سے خاک بن جانا طلب کیا ہے (اس لیے) رُوگردانی نہ کر۔ (۵۴/۳)

انسان کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور اس کی نسبتِ خاکی زمین کی طرف کھینچتی ہے

انسان کی ترکیب (بناوٹ) مٹی، آگ، ہوا اور پانی سے ہے۔ مٹی میں عاجزی ہے کیونکہ وہ سب کے قدموں کے نیچے آتی ہے۔ اس میں تین عناصر اور بھی شامل ہیں، اس لیے ان سب کی تاثیر جب ظاہر ہوتی ہے تو حرص، ہوس اور ہویٰ کی شکل انسان میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان چار عناصر مٹی، آگ، ہوا اور پانی کی تاثیر کے متعلق اگر بیان کیا جائے تو یہ ایک طویل داستان ہو جائے گی۔ اس جگہ محض یہ بات بیان کرنا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد درج ذیل حدیث میں آیا ہے۔

اَلْھَوٰی وَالْبَلَاءُ وَالشَّھْوَۃُ مَعْجُوْنَۃٌ بِطِیْنَۃِ اٰدَمَ　　　　حرص، آزمائش اور شہوت حضرت آدمؑ کی طینت میں گوندھی گئی ہیں۔

(العلل المتناھیة لابن الجوزی، ج۲، ص۲۸۹)

حضرت مخدوم علی الہجویریؒ فرماتے ہیں کہ ہر روز ہویٰ کا کتا تین سو ساٹھ بار لباسِ اُلوہیت پہن کر بندے کو گمراہی کی طرف بلاتا ہے۔ جب تک بندے کے باطن (قلب) میں معصیت (گناہ) کی جرأت نہ ہو تو معصیت ظاہر نہیں ہوتی اور ہوائے عصیاں ظاہر ہو جائے تو شیطان اسے اپنے جال میں لے کر مختلف قسم کے دل کو لبھانے والے گناہوں کی طرف لے جاتا ہے۔ گناہوں کی طرف لانے کے لیے شیطان بندے کے دل پر ظلمت (گناہ کی تاریکی) کی تجلّی کرتا ہے اور اسی کو وسواس کہتے ہیں (جس طرح قرآن نے فرمایا ''یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ'' کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے) (الناس:۵)۔

گناہ کی اِبتدا ہویٰ سے ہوتی ہے ''وَالْبَادِیُٔ اَظْلَم'' اور گناہ کی ابتداء کرنے والا بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ شیطان نے جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی کہ اب میں خدا کے بندوں کو اغوا کروں گا تو ارشاد ہوا کہ ''اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ ''یعنی تجھے میرے خالص بندوں پر کچھ غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ (الحجر:۴۲) ثابت ہوا کہ شیطان درحقیقت نفس کے ذریعے بندے میں ہوس پیدا کرتا ہے اور نفس کا کم و بیش اثر انسانوں پر رہتا ہے، لہٰذا حضور ﷺ نے فرمایا ''مَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ غَلَبَهُ الشَّیْطَانُ اِلَّا عُمَرَ فَاِنَّهٗ غَلَبَ شَیْطَانَهٗ'' یعنی تم میں سے نہیں کوئی مگر یقیناً شیطان اس پر غالب ہے اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ وہ شیطان پر یعنی اپنی ہویٰ پر غالب ہیں۔

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ یاد رکھو کہ ترکِ ہویٰ بندے کو امیر کرتی ہے اور اس کی اتباع اسیر بناتی ہے، جیسا کہ حضرت زلیخا نے اوّل ہویٰ کے اتباع کا اِرتکاب کیا تو امیر سے اسیر ہوگئی۔ یوسف علیہ السلام نے ترکِ ہویٰ فرمایا اسیر تھے مگر امیر ہو گئے۔ حضرت جنیدؒ سے پوچھا گیا "مَا الْوَصْلُ قَالَ تَرکُ اِرْتِکَابِ الْھَوٰی" یعنی وصل کیا ہے تو فرمایا کہ ہویٰ کا ترک کرنا اور جو اپنے آپ کو معظم ومکرم بنانا چاہے تو اسے کہہ دو کہ ہوائے تن کی مخالفت کرے۔ فرمایا کہ ناخن سے پہاڑ کو کھودنا آسان ہے اس سے کہ مخالفتِ ہویٰ کرے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے دیکھا کہ ایک شخص ہوا میں اُڑ رہا ہے جب اسے پوچھا کہ تم کو یہ درجہ کیسے حاصل ہوا تو کہنے لگا، ترکِ ہویٰ سے۔ حضرت محمد بن فضل بلخیؒ فرماتے ہیں کہ تعجب ہے اس بندے پر کہ جو ہویٰ کا متبع ہو اور جمالِ جمیل حاصل کرنا چاہتا ہو۔ فرماتے ہیں کہ نفس کی ایک صفت شہوت ہے۔ شہوت ایسی صفت کا نام ہے، جو اجزائے جسم میں پراگندہ ہے اور تمام حواس اس کے ساتھ ہیں اور بندہ ان کی نگہبانی پر مکلّف ہے۔ انسان ہر حس کے فعل کے ساتھ مسئول ہے (یعنی اس سے اس کی ہر حِس کے متعلق سوال کیا جائے گا) آنکھ کی شہوت دیکھنا، کان کی شہوت سننا، جسم کی شہوت چھونا اور دل کی شہوت سوچنا ہے۔ طالب کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی ان شہوات پر نگہبان اور حاکم ہو تاکہ ہویٰ کو بلانے والے حواس ازخود منقطع ہو جائیں۔ جو شخص شہوت و ہویٰ کی دلدل میں پھنس گیا وہ تمام جمال و وصال سے محروم ہوگیا۔ اس کو دُور کرنے میں بہت محنت کرنا ہوتی ہے کیونکہ اجناسِ ہویٰ وشہوت کا وارد ہونا متواتر ہوتا ہی رہتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو علی سیاہ مروزیؒ سے ایک روایت منقول ہے کہ وہ حمام میں سنت کے مطابق استرہ لے رہے تھے کہ انہوں نے دل میں کہا کہ یہ عضو متبعِ شہوت ہے اور یہی تجھے آفتوں میں مبتلا رکھتا ہے۔ اسے اپنے سے جدا کر دے تاکہ شہوتوں سے آزادی ہو جائے تو ایک غیبی آواز نے کہا، اے ابوعلی! ہماری ملکیت میں تصرف تو کرتے ہو لیکن ہماری موزوں کی ہوئی دُنیائے جسم میں کسی عضو سے دوسرا عضو ادنیٰ تر نہیں ہے۔ ہمیں ہماری عزت و جلال کی قسم! اگر تم نے یہ عضو اپنے سے جدا کیا تو تمہارے ہر بُنِ مو میں اس موجود شہوت سے سوگنا شہوت اور ہوائے نفسانی پیدا کر دیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبدیلیٔ صفت میں بہ توفیقِ الٰہی انسان کو اختیار حاصل ہے۔ احکام کو تسلیم کرنا اور اپنی قوتِ ارادی سے بہتری حاصل کرنے کا انسان کو اختیار حاصل ہے۔ جب تسلیمِ امر کی توفیق ہوگئی تو عصمت حاصل ہوگئی۔ یہ عصمتِ الٰہی بندے کو حفظ اور فنا کے نزدیک تر کر دیتی ہے۔ جب تک منجانب اللہ بندے کو قوت عطا نہ ہو تو کوئی کوشش اس کے لئے سُود مند نہیں۔ فرماتے ہیں یا تو انسان اتنی کوشش اور جدوجہد کرے کہ تقدیرِ الٰہی اس کے لئے بدل جائے یا خود تقدیرِ الٰہی کے خلاف کسی قوت کو حاصل کرے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ناممکن ہیں، یعنی کوشش سے اللہ کی توفیق کے بغیر تقدیر کا بدلنا ہرگز نہیں ہو سکتا اور کوئی کام بغیر تقدیر کے وجود میں نہیں آ سکتا۔ حضرت داتا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت شبلیؒ بیمار ہوئے تو طبیب نے

کہا کہ پرہیز کریں، فرمایا: کس چیز سے پرہیز کروں؟ کیا اس چیز سے جو اللہ نے بندے کے لیے روزی میں مقدر فرمائی ہے یا اس چیز سے جو میری قسمت میں ہی نہیں لکھی گئی، جو قسمت میں ہے اس کو روکنے کے لئے مجھ میں قوت نہیں اور یا تُو اس چیز سے پرہیز کرانا چاہتا ہے جو میری قسمت میں نہیں تو وہ مجھے پہلے ہی نہیں مل سکی۔ فرمایا "لِاَنَّ الْمُشَاهِدَ لاَ يُجَاهِدُ" یعنی جس کو خدا نے مشاہدہ عطا فرمایا ہے وہ مجاہدہ نہیں کرتا۔

شہوت سے عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے

انسان کو شہوت اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ وہ اپنا نفع نقصان بالکل بھول جاتا ہے۔ کوئی شخص کسی عورت سے ناجائز تعلقات رکھتے ہوئے بھی یہ سمجھتا ہے کہ کسی کو اس کی محبت کا علم نہیں، حالانکہ اس کے تعلقات دُنیا کے بہت سے لوگوں پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

زمانے بھر میں رُسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے راز داں تک ہے

مولانا رومیؒ نے عقل پر اس قسم کا پردہ پڑ جانے کی مثال دی ہے کہ ایک پہاڑی پر ایک جنگلی بکرا چر رہا تھا کہ اس کی نظر دوسری پہاڑی پر ایک بکری پر پڑی تو اس پر جنسی بھوک سوار ہو گئی۔ اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا اور سمجھنے لگا کہ ایک چھلانگ لگا کر وہ اس بکری پر قابو پا لے گا، حالانکہ دونوں پہاڑیوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ وہ کودا اور کھڈ میں جا گرا اور چور چور ہو گیا۔ شکاری (جو پہلے وہاں موجود تھے انہوں) نے اسے بھونا اور مزے سے کھایا۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جنسی مستی انسانوں کی عقل پر بھی اسی طرح پردہ ڈال دیتی ہے اور پھر وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو انہیں قعرِ مذلت میں لے ڈوبتی ہیں۔ فرماتے ہیں شکاری لوگ جنگلی بکروں کو اسی فریب سے پکڑتے ہیں۔ پہاڑی بکرے کو پکڑنا عام حالت میں بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ شہوت کے چکر میں آ کر احمق ہو جاتے ہیں۔ انسان کو بھی شہوت کے ذریعے شیطان پکڑتا ہے، اسی طرح بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان جو کسی سے بازی ہارنے کا خیال تک بھی نہیں لاتے مگر انہیں اپنی شہوت ہی پچھاڑ دیتی ہے ؎

رُستم اَرچہ با سَر و سَبلت بود　　　دامِ پا گیرش یقیں شہوت بود

رستم خواہ مع سر اور مونچھوں کے ہو، یقیناً شہوت اس کے پاؤں کا جال ہوتی ہے۔ (۸۶/۳)

بکرے کے دھوکہ کھانے کے متعلق اشعار تنگئ قرطاس کے باعث اس جگہ شامل نہیں کیے جا رہے۔

نفس بہانہ جُو

ایک سپیرا سانپوں کی تلاش میں پہاڑ پر گیا تو وہاں برف سے ٹھٹھرا ہوا ایک اژدہا دیکھا۔ سپیرا اس کو مردہ سمجھ کر بغداد شہر میں لے آیا تا کہ وہ لوگوں کو بتائے کہ اس نے ایک بہت بھاری اژدہا مارا ہے۔ جب اژدھا کو دھوپ

سے گرمی پہنچی تو وہ حرکت کرنے لگ گیا یعنی اُس میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب نفسِ امارہ کو اپنے اغراض پورا کرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ اژدھا کی طرح انسان کو دھوکا دیتا ہے کہ اب میں مر گیا ہوں، مجھ سے بُرے اعمال سرزد نہیں ہوتے اور انسان اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ نفس کو کبھی مُردہ نہ سمجھ لینا، یہ کبھی مُردہ نہیں ہوتا اگر اس نفس کو فرعون کا سا سامان اور اقتدار مل جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ کیسے سینکڑوں موسیٰؑ اور ہارونؑ کا راستہ روکتا ہے ؎

نفست اژدہاست اُو کے مُردہ است　　　از غمِ بے آلتی افسُردہ است

تیرا نفس اژدہا ہے وہ مُردہ کہاں ہے، ذرائع نہ ہونے کے غم میں ٹھٹھرا ہوا ہے۔ (۳/۱۰۸)

گر بیابد آلتِ فرعون او　　　کہ بامرِ اُو ہمی رفت آبِ جو

اگر وہ فرعون کے ذرائع پالے، جس کے حکم سے دریائے نیل کا پانی چلتا تھا۔ (۳/۱۰۹)

آنگہ اُو بنیادِ فرعونی کُنَد　　　راہِ صد موسیٰؑ و صد ہاروںؑ زند

اس وقت وہ فرعونی بنیاد بنائے گا، سینکڑوں موسیٰؑ اور ہارونؑ کی راہزنی کرے گا۔ (۳/۱۰۹)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب موسم گرم ہو جائے تو اژدہا زندہ ہو جاتا ہے اور لوگوں کو اپنی دہشت سے ڈراتا ہے، اسی طرح نفس عارضی طور پر اگر سرد ہو جائے تو موقع ملتے ہی اپنی اصلی خباثت پر آ جاتا ہے سوائے اللہ کے بندوں کے۔

اکیسواں باب

طریقت میں تہذیبِ نفس

علم کسی بھی نوعیت کا ہو، استاد اور مرشد کی ضرورت رہتی ہے۔ اصلاحِ نفس کے بغیر علم بھی ظاہری علم کہلاتا ہے۔ استاد کے بغیر علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ کبر و ناز کو ترک کرنے کے بعد ہی صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔ متکبر اور خود بین لوگ جہلِ مرکب میں مبتلا رہتے ہیں۔ انسان کا کمال اس کا بہترین لباس ہے، چنانچہ اگر کوئی لوہار یا چمڑا رنگنے والا پھٹے پرانے کپڑے پہن کر کام کرے تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ کمال حاصل کرنے کے لیے جامۂ افتخار اور استکبار کو اُتار دینا چاہیئے اور یہ بغیر اصلاحِ نفس ممکن نہیں۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ علم قولی، فعلی یا صناعی یعنی حرفت سے تعلق رکھتا ہے۔ علومِ قولی استاد سے اور کتابوں سے سیکھے جاتے ہیں، علومِ صناعی یا حرفت کسی ماہر کے ساتھ رہنے سے آتے ہیں، مثلاً فنِ زرگری کسی سنار کے پاس بیٹھ کر سیکھنے سے آئے گا، تیسرا علم درویشی یا علم فقر جو تزکیۂ نفس سے تعلق رکھتا ہے، یہ کسی مرشد کے فیضان یا کسی اہلِ دل کی صحبت سے ہی حاصل ہوتا ہے اگر کسی شخص کو علم بھی حاصل ہو اور اعمال بھی صالح ہوں مگر اسے صحبت حاصل نہ ہوئی ہو تو اسے فقر کا کوئی اعلیٰ درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

پس لباسِ کبر بیروں کُن زتن   مَلبَسِ ذُل پوش دَر آموختن

تو تکبر کا لباس جسم سے اُتار دے، سیکھنے میں ذلت کا لباس پہن لے۔ (۵/۱۱۲)

عِلم آموزی طریقش قولی است　　　　حرفت آموزی طریقش فِعلی است

تو علم سیکھتا ہے تو اس کا طریقہ زبانی ہے، دستکاری سیکھتا ہے تو اس کا طریقہ عمل ہے۔ (۱۱۲/۵)

فقر خواہی آں بصحبت قائم است　　　　نے زبانت کار می آید نہ دَست

فقر چاہتا ہے تو وہ صحبت سے متعلق ہے، نہ تیری زبان کام آتی ہے نہ ہاتھ۔ (۱۱۳/۵)

دانش انوار است در جانِ رجال　　　　نے زراہِ دفتر و نے قیل و قال

اَنوار کا علم (سلوکِ اولیاء) لوگوں کے دل میں ہے، (وہ حاصل نہیں ہوتا ہے) نہ کتاب کے راستہ سے نہ گفتگو سے۔ (۱۱۳/۵)

تا دلش را شرح آں سازد ضیا　　　　پس اَلَمْ نَشْرَحْ بفرماید خدا

جب تک کہ اس کے دل کے لیے نور اس کی تشریح نہ کر دے، پھر خدا فرماتا ہے کیا ہم نے تیرا سینہ نہ کھول دیا۔ (۱۱۳/۵)

در نگر در شرحِ دل دَر اندرون　　　　تا نیاید طعنہءِ لَایُبْصِرُوْنَ

دل کی شرح کو باطن میں دیکھ لے تاکہ ''وہ نہیں دیکھتے ہیں'' کا طعنہ نہ دیا جائے۔ (۱۱۳/۵)

عقل اور نفسِ امّارہ

عقلِ حقیقت شناس اور نفسِ امّارہ کی جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ مولاناؒ نے اس مضمون کو بہت سی مثالوں سے ظاہر فرمایا ہے مگر مجنوں اور اس کی اونٹنی کی مثال لاجواب ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجنوں لیلیٰ کے شہر کی طرف جانے کے لیے اپنی اونٹنی پر سوار ہوا مگر اونٹنی کی توجہ تمام تر اپنے بچے کی طرف لگی تھی، جس بچے کو وہ مجنوں کے گھر میں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ مجنوں کے ہاتھ سے اونٹنی کی لگام جب عشق کے نشے میں ذرا ڈھیلی ہوتی تو اونٹنی اپنے گھر کی طرف واپس چلنا شروع کر دیتی اور مجنوں کو جب معلوم ہوتا کہ اونٹنی گھر کی طرف جا رہی ہے تو وہ پھر سے اس کی لگام کھینچ کر لیلیٰ کے گھر کی طرف اس کا رُخ کر دیتا۔ یہ واقعہ تین چار بار ہوا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عقل انسان کو راہِ راست پر لانا چاہتی ہے تاکہ انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچے مگر ذرا سی غفلت ہو جائے تو طے کیا ہوا راستہ دوبارہ طے کرنا پڑتا ہے اور ساری عمر کولہو کے بیل کی طرح وہیں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ نفسِ امّارہ سے خدا تک کا راستہ دو قدم کی مسافت ہے مگر انسان موسیٰؑ کی قوم کی طرح برسوں بیابانوں میں گھومتا رہتا ہے۔ مجنوں نے تنگ آ کر یہ کیا کہ جب اس کی اونٹنی واپس آنے سے باز نہیں آئی تو اس نے اپنے آپ کو اونٹنی سے نیچے گرا دیا کہ اس سے بہتر ہے میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔ جب چھلانگ لگائی تو پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تو اس نے کہا کہ میں گیند کی طرح ہی لڑھکتا ہوا پہنچ جاؤں گا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عشقِ لیلیٰ عشقِ مولیٰ سے تو کم تر ہے۔ عشقِ مولیٰ میں بھی انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔

میلِ مجنوں پیشِ آں لیلیٰ رواں　　　میلِ ناقہ پس پئے کُرہ اش رواں

مجنوں کی خواہش لیلیٰ کی طرف رواں ہے، اونٹنی کی خواہش پیچھے کو بچہ کے لئے دوڑتی ہے۔ (۴/۱۵۳)

یک دم ار مجنوں زخود غافل بُدے　　　ناقہ گردیدے و واپس آمدے

اگر مجنوں تھوڑی دیر کے لئے اپنے سے غافل ہو جاتا تو اونٹنی لوٹ جاتی اور واپس آ جاتی۔ (۴/۱۵۳)

لیک ناقہ بَس مُراقِب بُود و چُست　　　چوں بدیدے اُو مہار خویش سست

لیکن اونٹنی بہت نگران اور چست تھی جب وہ اپنی مہار کو ڈھیلا دیکھتی۔ (۴/۱۵۳)

جاں زہجرِ عرش اندر فاقہء　　　تن زِعشق خار بُن چوں ناقہٗ

رُوح عرش کی جدائی میں فاقہ میں ہے، جسم جھاڑ کے عشق میں اونٹنی کی طرح ہے۔ (۴/۱۵۴)

جاں کشاید سُوی بالا بالہا　　　در زدہ تن در زمیں چنگالہا

جان اُوپر کی طرف بازو کھولتی ہے، جسم نے زمین میں پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ (۴/۱۵۴)

مولاناؒ کی مراد یہ ہے کہ انسان کی روح اس کو آسمان کی طرف لے جانا چاہتی ہے مگر اس کا جسم زمین میں اپنے پنجے گاڑ دیتا ہے۔

وقتِ خشم و وقتِ شہوت مرد کو
(غصے اور شہوت کے موقع پر کون مرد ہے)

مولاناؒ نے فرمایا کہ جب نہر میں پانی ہو تو وہ نہر کہلانے کی حقدار ہے اور اگر پانی نہ ہو تو یہ مٹی کا ایک گڑھا ہے۔ اسی طرح عام لوگ مرد کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ مرد کہاں ہیں، یہ لوگ تو روٹی پر مرنے والے اور شہوت سے مغلوب انسان ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ایک شخص چراغ لے کر گھوم رہا تھا اور کہتا تھا کہ میں انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں اور میں حیران ہوں کہ ایک انسان بھی مجھے نظر نہیں آ رہا۔ لوگوں نے کہا کہ آخر یہ بازار مردوں سے ہی تو بھرے پڑے ہیں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ لوگ انسان نہیں، میں تو غصہ، شہوت اور حرص کی راہوں پر نہ چلنے والے مرد چاہتا ہوں۔ ایسا مرد کون ہے جو غصے اور شہوت میں انسان ہو، ایسی دو حالتوں پر ثابت قدم رہنے والا کون ہے تاکہ میں اس پر اپنی جان قربان کر دوں۔ اس کے بعد مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ خدا کو ہی فاعل سمجھتے ہوئے خود کو بیچ میں سے نکال لیتے ہیں اور یہ لوگ جبریہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کو مجبور سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص جبر پر ہے وہ بھی دریا پر جھاگ کو دیکھتا ہے اور خود کو بے گناہ سمجھتا ہے اور جو خود کو مسلوب الاختیار سمجھتا ہے، اس نے اللہ پر نظر کی اور مشاہدہ حاصل کیا۔ یہ بحث بہت طویل ہے۔

جُو کہ آبش ہست جُو خود آں بود　　　آدمی آنست کو را جاں بود

جس نہر میں پانی ہے تو وہی نہر ہے، آدمی تو وہی ہے جس میں جان ہے۔ (۵/۲۹۳)

ایں نہ مردانند اینہا صُورت اند مُردۂ نانند و کُشتۂ شہوتند

یہ لوگ جن کے قلب نُور سے خالی ہیں، مرد نہیں ہیں (بلکہ مٹی کی بے جان) مورتیاں ہیں، یہ لوگ روٹی پر جان دینے والے اور شہوت کے مارے ہوئے ہیں۔ (۲۹۳/۵)

آگے ایک حکایت کے ضمن میں بتاتے ہیں کہ دُنیا میں ایسا آدمی نایاب ہے جو بمعنی حقیقی آدمی ہے۔

گفت من جُویائے انسان گشتہ ام می نیابم ہیچ و حیراں گشتہ ام

اس نے کہا کہ میں انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں اور حیران ہوں کہ مجھے کوئی انسان نہیں ملتا۔ (۲۹۴/۵)

گفت مردے ہست ایں بازار پُر مَردمانند آخر اے دانائے حُر

(بوالفضول نے کہا) اے دانائے آزاد! آخر یہ بازار مردوں ہی سے تو بھرے پڑے ہیں۔ (۲۹۴/۵)

گفت خواہم مَرد بر جادہ دورہ در رہِ خشم و بہنگامِ شَرہ

درویش نے کہا: نہیں مجھے ایسے ویسے لوگ درکار نہیں بلکہ میں دو راہوں کی سڑک پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے والا جوانمرد چاہتا ہوں، یعنی غصے کے راستے میں اور حرص کے وقت۔ (۲۹۴/۵)

وقتِ خشم و وقتِ شہوت مَرد گو طالبِ مردے دَوانم کُو بکُو

غصے کے وقت اور شہوت کے وقت مرد کون ہے، میں ایسے مرد کی تلاش میں گلی گلی دوڑا پھرتا ہوں۔ (۲۹۴/۵)

کو دریں دو حال مردے دَر جہاں تا فدائے اُو کنم امروز جَاں

دُنیا میں ان دو حالتوں کے اندر ثابت قدم رہنے والا مرد کہاں ہے تا کہ آج میں اس پر اپنی جان قربان کر دوں۔ (۲۹۴/۵)

نفس کی ارتعاشات یا لہریں

سائنس دانوں کے مطابق ہر جامد اور غیر جاندار چیز سے مخصوص لہریں یا ارتعاشات نکلتی ہیں۔ ہر شخص کے گرد بہت سی ارتعاشات کا ایک ہالہ ہوتا ہے، جس کو حساس انسان دیکھ بھی سکتے ہیں اور جو لوگ ان ارتعاشات کو نہیں پہچانتے جب وہ کسی کو دیکھتے ہیں تو ان کو اس شخص میں سے یا تو کچھ محبت کی کشش محسوس ہوتی ہے یا نفرت محسوس ہوتی ہے۔ ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' میں ایک باب ''سائنسدانوں کے نزدیک عبادات کے اثرات'' پر لکھا گیا ہے، جس میں اس موضوع پر کافی تفصیل دی گئی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ لہریں ہمارے جسم سے ٹکراتی ہیں تو خوشگوار یا ناخوشگوار محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تجربہ کار اور حسّاس شخص جب کسی کو دیکھتا ہے تو اس کی سیرت کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ اولیائے کرامؒ میں بھی یہ بات موجود ہوتی ہے بلکہ کئی سو برس کے بعد پیدا ہونے والوں کی شکل وصورت اور سیرت کو بیان کر دیتے ہیں (جیسے حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کے متعلق تمام احوال اور کوائف تین سو سال پہلے ہی بیان کر دیئے تھے۔ اس کا ذکر ہماری تصنیف ''جنیدؒ و بایزیدؒ'' میں موجود ہے) بزرگ

لوگ ہر شخص کی باتوں سے اس کی حرص و ہوس اور تکبر وغیرہ کی بو سونگھ لیتے ہیں، خواہ وہ انسان ان باتوں کی نفی کرتا رہے۔ اگر کوئی شخص پیاز کھاتا ہے تو اس کی بُو سب لوگ محسوس کر لیتے ہیں ۔

بوئے نیک و بَد برآید بر سَما　　　ہم بیابد لیک پوشاند زما

ہمارے عیب وہ محسوس کر لیتے ہیں لیکن ہم سے چھپاتے ہیں۔ اچھی اور بُری بُو ظاہر ہو جاتی ہے آسمان پر۔ (۲۹/۳)

تو ہمی خُسپی و بُوئے آں حرام　　　می زند بَر آسمانِ سبز فام

تُو سو جاتا ہے اور اس حرام کی بُو نیلگوں آسمان پر پہنچتی ہے۔ (۲۹/۳)

ہمرہِ انفاسِ زشتت می شَود　　　تا بہ بُو گیرانِ گردوں می رَود

وہ تیرے بُرے سانسوں کے ساتھ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آسمان کے خوشبو سونگھنے والوں (یعنی فرشتوں) تک پہنچ جاتی ہے۔ (۳۰/۳)

بُوئے کبر و بُوئے خشم و بُوئے آز　　　در سخن گفتن بیاید چوں پیاز

تکبر کی بُو حرص کی بُو اور لالچ کی بُو زبان سے نکلتے ہی معلوم ہو جاتی ہے، پیاز کی بُو کی طرح۔ (۳۰/۳)

پس دعاہا رد شود از بوئے آں　　　آں دلِ کژ می نماید در زباں

اس کی بُو کی وجہ سے دعائیں رَد کر دی جاتی ہیں، دل کی کجی زبان پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ (۳۰/۳)

گر جنیں را کس بگفتے در رحم　　　ہست بیروں عالمے بس منتظم

اگر پیٹ کے بچے سے کوئی رحم میں کہتا ہے کہ باہر ایک بڑی منتظم دُنیا ہے۔ (۲۰/۳)

یک زمینِ خُرّمی با عرض و طول　　　اندرو بس نعمت و بے حد اکول

ایک لمبی چوڑی دل کشا زمیں ہے، اس میں بے شمار نعمتیں اور بے حد غذائیں ہیں۔ (۲۰/۳)

آسمانے بس بُلند و پُر ضیا　　　آفتاب و ماہتاب و صد سُہا

بہت اُونچا آسمان ہے اور منور آفتاب اور چاند اور سینکڑوں سُہا (ستارے) ہیں۔ (۲۰/۳)

دَر صفتِ ناید عجائب ہائے آں　　　تو دریں ظلمت چہء در امتحاں

اس کے عجائب بیاں نہیں ہو سکتے، تو اس اندھیرے کی آزمائش میں کیوں ہے۔ (۲۰/۳)

اُو بحکمِ حالِ خود منکر بُدے　　　زیں رسالت مُعرض و کافر شدے

وہ اپنی حالت کے تقاضے سے منکر ہوتا، اس پیغام سے اعراض کرنے والا اور کافر ہوتا۔ (۲۰/۳)

جنس چیزے چوں ندید ادراکِ اُو　　　نشنود ادراکِ منکر ناکِ اُو

اس کے ادراک نے چونکہ اس چیز کی جنس نہیں دیکھی، اس کا انکار کرنے والا احساس (ان باتوں کو) نہیں سنتا ہے۔ (۲۰/۳)

ان تمام حلقوں کو مناسب غذا ملتی رہنی چاہیے۔ جس طرح غلط غذا سے جسم خراب ہو جاتا ہے، اسی طرح نفس اور عقل و دل بھی نامناسب غذاؤں سے بدہضمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنا وظیفۂ حیات ادا نہیں کر سکتے۔

حلق عقل و دل چو شد خالی زفکر   یافت اُو بے ہضم معدہ رزقِ بکر

عقل اور دل کا حلق جب فکر سے خالی ہو گیا تو اس نے معدہ کے ہضم کے بغیر تازہ رزق پا لیا۔ (۱۹/۳)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی عمر میں اُس کی غذا میں تبدیلی آتی رہتی ہے، بچہ ماں کے پیٹ میں خون سے پلتا ہے، پھر دودھ چھڑانے کے بعد دوسری غذاؤں کو شروع کرتا ہے، حتیٰ کہ گوشت ترکاری وغیرہ کھاتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کو عقل و حکمت کا چسکا پڑتا ہے تو بدلتے ہوئے لقموں سے وہ لقمان حکیم بن جاتا ہے ؎

پس حیاتِ ماست موقوفِ فطام   اندک اندک جہد کُن تمّ الکلام

تو زندگی ہماری دودھ چھڑانے پر موقوف ہے، بتدریج کوشش کر، بات ختم ہوئی۔ (۱۹/۳)

چوں جنیں بود آدمی خونخوار بود   بُود اُورا بُوُد از خوں تار و پود

جب انسان ماں کے پیٹ میں خون کھانے والا تھا، اس کے وجود کا تانا بانا خون سے تھا۔ (۱۹/۳)

از فِطامِ خوں غذایش شیر شُد   وز فطامِ شیر لقمہ گیر شد

خون چھڑانے سے اس کی غذا دودھ ہوئی اور دودھ چھڑانے سے وہ لقمہ کھانے والا ہو گیا۔ (۱۹/۳)

وز فِطامِ لقمہ لقمانے شود   طالبِ مطلوبِ پنہانے شود

لقمہ چھڑانے سے وہ لقمان ہو جاتا ہے، ایک پوشیدہ مطلوب کا طالب بن جاتا ہے۔ (۱۹/۳)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ آدمی عالمِ جسمانی اور شہوتِ حیوانی کو چھوڑ کر عالمِ رُوحانی میں داخل ہونے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کو معلوم نہیں ہے کہ رُوحانی عالم میں اس کو کیا کچھ ملتا ہے۔ اس کی مثال مولاناؒ یوں دیتے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں بچے کو پیٹ کے اندر کا جہاں ہی بھلا معلوم ہوتا ہے، اسی طرح انسان عالمِ دُنیا سے عالمِ رُوحانی میں پیدائش (دوسری پیدائش) سے گھبراتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے گرا تو مرا۔ اسی طرح بچہ دُنیا میں آنے پر بھی رضامند نہ ہوتا اور ضرور کافر اور منکر رہتا مگر فطرت اس کو جبراً کشادہ جہاں میں لے آتی ہے، جہاں آسماں، طرح طرح کے پھل، چاند و تارے اور پہاڑ و دریاؤں کی خوشنما دُنیا آباد ہے، جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔

جملہ عالم آکل و ماکول داں

(اس دُنیا کی ہر چیز کھانے والی یا کھائی جانے والی ہے)

اس دُنیا میں ہر چیز آکل (کھانے والی) اور ماکول (کھائی جانے والی) ہے۔ ایک چیز اگر کام دینے والی ہے تو وہ کام کرتی بھی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس دُنیا میں ہر ذرّے کو حصولِ غذا کے لیے منہ کھولے ہوئے

دیکھا ہے۔ ہر جاندار کا ہر عضو اپنی اپنی مخصوص غذا مانگتا ہے۔ جسم کا ہر حصہ اپنی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے، جو چیز کھائے جانے سے بچ جاتی ہے، خوش بخت ومقبل (با اقبال) ومقبول ہو کر اس عالم سے ماورا ہو جاتی ہے۔

ذرّہ ہا دیدم دہاں شاں جُملہ باز　　　گر بگویم خوردِ شاں گردد دراز

میں نے ذرّے دیکھے، جن کے منہ کھلے ہوئے تھے مگر میں ان کی خوراک بیان کروں تو بات بڑھ جائے گی۔ (۱۷/۳)

جُملہ عالم آکِل و ماکول داں　　　باقیاں را مُقبل و مَقبول داں

تمام عالم کو کھانے والا اور کھایا ہوا سمجھ، باقی رہنے والوں کو مقبول اور با اقبال سمجھ۔ (۱۷/۳)

لقمہ بخشی آید از ہر کَس بکَس　　　حلق بخشی کارِ یزدان ست و بس

لقمہ دینا ہر شخص سے ہر شخص کے لئے ہوسکتا ہے، حلق بخشنا صرف اللہ کا کام ہوسکتا ہے۔ (۱۶/۳)

حلق بخشد خاک را لُطفِ خدا　　　تا خورد خاک آب و روید صد گیا

اللہ تعالیٰ کی مہربانی مٹی کو حلق عنایت کرتی ہے، یہاں تک کہ مٹی پانی پیتی ہے اور سینکڑوں گھاس اُگاتی ہے۔ (۱۷/۳)

باز حیواں را بہ بخشد حَلق و لَب　　　تا گیاہش را خورد اندر طلب

پھر (اللہ تعالیٰ) حیوان کو حلق اور ہونٹ بخشتا ہے، یہاں تک کہ وہ تلاش کر کے اس (خاک) کی گھاس کھاتا ہے۔ (۱۷/۳)

چوں گیاہش خورد و حیواں گشت زفت　　　گشت حیواں لقمۂ انسان و رفت

جب اس (حیوان) نے اس (خاک) کی گھاس کھائی اور موٹا ہو گیا، پھر وہ حیوان انسان کا لقمہ بنا اور ختم ہو گیا۔ (۱۷/۳)

باز خاک آمد شد اَکّالِ بشر　　　چوں جدا شد از بشر روح و بصر

پھر مٹی آئی وہ انسان کو نگل جانے والی بنی، جب کہ انسان سے رُوح اور بینائی جُدا ہو گئی۔ (۱۷/۳)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہر عضو، جان، عقل و دل، بدن اور نفس کا بھی حلق ہے۔

فرعون و موسیٰ کا قصہ ہر نفس میں پایا جاتا ہے

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا تاریخی قصہ تو ایک الگ بات ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو فرعونیت کے آثار ہر شخص کے اندر پائے جاتے ہیں۔ فرعونیت نفسِ انسانی کا ایک مظہر ہے۔ فرعون کا قصہ سُن کر لوگ فرعون کو بُرا کہتے ہیں، حالانکہ لوگوں کے اندر فرعون کے اژدھا موجود ہیں اور انسان بے سامان ہے۔ جو کچھ فرعون کو میسر تھا اگر تجھے دیا جائے تو دیکھ کہ تو کس طرح کا فرعون ہوتا ہے۔ کچھ لوگ وزیراعظم اور بڑے افسر بنتے ہیں تو لوگ ان کی فرعونیت کو دیکھتے ہیں مگر وہ خود اپنے آپ کی فرعونیت پر غور نہیں کرتے۔ اگر کوئی ان وزیروں کی تعریف کرے تو یہ لوگ الا ماشاء اللہ گردن اکڑا لیتے ہیں، یہ بھی تو فرعونیت ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ صرف فرعونیت ہی انسان میں موجود نہیں بلکہ موسیٰ بھی تمہارے اندر ہی ہے۔ خدا نے ان دونوں میلانات کو تمہارے سامنے رکھا ہے اور تمہیں اختیار دیا ہے کہ جس کو چاہو اختیار کر لو۔ موسیٰ علیہ السلام کے یدِ بیضا یا قلبِ صافی میں نور تھا، وہی نور ہر انسان میں قابلِ افادہ و استفادہ ہے۔ انسان کو ان دونوں قسموں کو اپنے اندر معلوم کر لینا چاہیئے ۔

آنچہ در فرعون بُود اندر تو ہست   لیک اژدرہات محبوسِ چہ است

جو کچھ فرعون میں تھا وہ تیرے اندر ہے لیکن تیرے اژدہے کنویں میں قید ہیں۔ (۱۰۱/۳)

اے دَریغ ایں جملہ احوالِ تو ہست   تو برآں فرعون بر خواہش بَست

ہائے افسوس! یہ سب تیرے احوال ہیں، تُو ان کو فرعون سے وابستہ کرنا چاہتا ہے۔ (۱۰۱/۳)

موسیٰ و فرعون در ہستیِ تُست   باید ایں دو خصم را در خویش جُست

موسیٰ اور فرعون تیرے وجود میں ہیں، ان دو مقابل شخصیتوں کو اپنے اندر تلاش کرنا چاہیئے۔ (۱۲۷/۳)

تا قیامت ہست از موسیٰ نتاج   نُورِ دیگر نیست دیگر شد سراج

موسیٰ کا سلسلہ قیامت تک کے لئے ہے، روشنی دوسری نہیں ہے، چراغ دوسرا ہے۔ (۱۲۷/۳)

حیوانی نفس اور عقل کے تقاضے

انسان نے عورت کو بہت سی ذمہ داریاں سپرد کی ہیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے اسے کچھ اخراجات کی ضرورت رہتی ہے، بعض اوقات عورتوں کو فضول طریقے سے اخراجات کرنے کی عادت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے اور گھر میں میاں بیوی کا تصادم رہتا ہے۔ اس مالی تنگی کی وجہ سے گھریلو جھگڑے دیگر خانگی اُمور پر بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ اکثر علماء، بعض صوفیاء اور اکثر اہلِ کمال لوگوں کی بیویاں ان کی زندگیوں کو ناخوشگوار بنا دیتی ہیں۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورت کا تقاضا کچھ اور ہے اور مرد کا ذوق کچھ اور ہے۔ ان دونوں کی دلچسپیاں یکساں نہیں رہ سکتیں۔ اس لیے ہمیشہ 99.9 فیصد جوڑوں میں جھگڑا اور فساد رہتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے شیخ سعدیؒ کا ذکر کیا ہے کہ جب ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھر آئے اور کھانا مانگا تو آپ کی بیوی نے سالن کی ہنڈیا ان کے سر پر دے ماری اور ہنڈیا کا طوق ان کے گلے میں آ گیا۔ وہ اسی حالت میں دوستوں کے پاس آ گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہوا تو فرمایا کہ شادی کی سنت پوری کرنے کے لیے میرے گلے میں یہ طوق ڈال دیا گیا ہے۔

''در گلویم سنتِ پیغمبر یست''   میرے گلے میں سنتِ پیغمبری ہے۔

کہتے ہیں کہ سقراط کی زندگی فلسفی بحثوں میں گذرتی اور وہ کئی کئی دن تک گھر نہ آتے۔ ایک دن وہ گھر آئے تو بیوی برس پڑی اور پھر ایک بالٹی پانی کی ان کے سر پر دے ماری۔ حکیم ہنس دیئے اور کہا کہ گرجنے کے بعد برسنا

ضروری تھا۔ ایک اور ولی اللہ کو ملنے کے لیے کوئی شخص ان کے گھر پر آیا تو ان کی بیوی نے اپنے خاوند کو برا بھلا کہا اور اس ملاقات کرنے والے کو کہا کہ تم ایسے شخص کے پاس کیا لینے آئے ہو؟ جب اس شخص نے اپنے پیر و مرشد کے سامنے ماجرا بیان کیا تو فرمایا کہ اس عورت کی تلخ بیانی پر صبر کرنے سے تو ہم کو ولی اللہ بنایا گیا ہے۔ ایک اور بہت بڑے ولی اللہ (حضرت بایزید بسطامیؒ) کے مرید کو بھی اس کی بیوی نے یہی صلوٰتیں سنائیں تو جب اس کو معلوم ہوا کہ ان کے مرشد جنگل سے لکڑیاں لینے گئے ہیں تو مرید نے دیکھا کہ ان کے مرشد جنگل میں ایک شیر پر لکڑیاں لاد کر لا رہے ہیں۔ وہ مرید یہ دیکھ کر حیران ہوا تو آپ نے فرمایا کہ بھئی میں بیوی کی بات کو سن کر برداشت کرتا ہوں تو یہ شیر میری بات مانتا ہے۔

مولانا رومیؒ یہ مثالیں دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ عورتوں کے جھگڑے کی مثال ایسے ہے، جیسے نفس کا انسان کے ساتھ جھگڑا۔ یہ دونوں ایک ہی جسم میں رہتے ہیں اور ان کی سدا کشمکش رہتی ہے۔

ماجرائے مَرد و زن اُفتاد نقل　　　　ایں مثالِ نفسِ خود می دان و عقل

مرد اور عورت کا قصہ ایک مثال واقع ہوا ہے، اس کو اپنے نفس اور عقل کے جھگڑے کی مثال سمجھ۔　　(۱/۲۷۸)

بائیسواں باب

انسان پر جذبات کا غلبہ

غلبۂ حال میں عقل رخصت ہو جاتی ہے

قوی جذبات کے ہیجان کے وقت انسانوں کی عقل اور دُور اندیشی جاتی رہتی ہے۔ مولاناؒ نے ایک شخص کی بیٹی کی شادی کا قصہ بیان کیا ہے کہ اس کی بیٹی کی شادی کے لیے مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا تو آخر اس نے ایک غریب لڑکے سے شادی کر دی اور بیٹی کو سمجھایا کہ اس لڑکے سے اولاد پیدا نہ ہونے دینا، کیونکہ اگر اولاد ہو گئی تو یہ اس کا خرچہ کہاں سے پورا کرے گا۔ باپ نے بتایا کہ جب انزال کا وقت آئے تو خاوند سے الگ ہو جایا کرو۔ بیٹی نے وعدہ کر لیا مگر پوچھا کہ حمل سے بچنے کے لیے مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ وہ انزال کی حالت میں آ گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی نشانی یہ ہے کہ جب اس کی آنکھوں میں مستی کا رنگ آ جائے تو سمجھ لینا کہ انزال قریب ہے، مگر وہ لڑکا جوان اور نہایت خوبصوت تھا، لہٰذا جو فطرت کا تقاضا تھا وہی ہوا اور بچہ پیدا ہو گیا۔ پہلے تو انہوں نے بچے کو چھپائے رکھا مگر جب ظاہر ہو گیا تو باپ نے بیٹی کو بہت ڈانٹا۔ لڑکی نے کہا کہ میں اس کی آنکھوں کا رنگ کیا دیکھتی، کیونکہ اس کی آنکھوں کی حالت بدلنے سے پہلے ہی میری اپنی آنکھیں اندھی ہو جاتی تھیں۔ مولاناؒ نے یہ بتلایا کہ جب حرص، لالچ اور غصے کے وقت غلبۂ حال ہو جائے تو عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نفسِ امارہ عقل پر غالب آ جاتا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ نفسِ امارہ کی ناجائز خواہشات کا قلع قمع ایسا ہی ہے جیسے کہ درخت کی کچھ شاخیں کاٹ دی جائیں تو درخت کی قوت باقی ماندہ دوسری شاخوں کی طرف رجوع کرتی ہے۔ مولاناؒ لڑکی کی بات

کو اشعار میں یوں رقمطراز کرتے ہیں ؎

در زمانِ حال و انزال و خوشی　　خویشتن باید کہ ازوے در کشی

خوشی اور انزال کی کیفیت کے وقت اپنے آپ کو اس سے جُدا کر لینا چاہیئے تھا۔ (۳۷۴/۵)

گفت کے دانم کہ انزالش کیست　　ایں نہان ست و بغایت دُور دست

اس لڑکی نے کہا کہ انزال کے وقت کا مجھے کیسے علم ہوگا، کیونکہ یہ تو مخفی بات ہوتی ہے اور غایت سے دُور۔ (۳۷۴/۵)

گفت چوں چشمش کلاپیسہ شود　　فہم کن کاں وقتِ انزالش بود

کہا کہ جب اس کی آنکھوں میں مستی کا رنگ آ جائے تو جان لینا کہ انزال کا وقت آ گیا ہے۔ (۳۷۴/۵)

نیست ہر عقلِ حقیرے پائدار　　وقت حرص و وقتِ جنگ و کارزار

ہر حقیر عقل مضبوط نہیں ہے، حرص کے وقت اور جنگ و کارزار کے وقت۔ (۳۷۴/۵)

مطلب یہ ہے کہ اگر غیض وغضب اور شہوتِ نفس و لالچ میں انسان اپنے اُوپر قابو پا لے تو یہی بہادری کی علامت ہے، شیر نر کو مارنا بہادری نہیں ہے۔ یہ مشہور حقیقت ہے۔

مرد و زن میں غالب کون اور مغلوب کون ہوتا ہے

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی زینت کو مردوں کے لیے بنایا ہے (مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ جہاں بھی چاہیں اپنی زینت کو ظاہر کرتی رہیں، سوائے اپنے محرموں کے۔ سورۂ نور: ۳۱) قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے لیے باعثِ تسکین بنایا ہے، جیسے فرمایا "وَجَعَلَ مِنھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا" (اور اسی لیے اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔ الاعراف:۱۸۹)۔ مرد عورت پر ظاہری غلبہ دیئے جانے کے باوجود مرد اندر سے عورت کا مغلوب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے فاتح اور حکماء اپنے تحکم اور اقتدار کو عورت کے سامنے بالائے طاق رکھ دیتے ہیں ؎

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حق آراستہ است　　زانکہ حق آراست چوں تانند رست

زُیِّنَ لِلنَّاسِ کو خدا نے آراستہ کیا ہے، جس کو خدا نے آراستہ کیا اس سے چھٹکارا کیسے ہو سکتا ہے۔ (۲۶۰/۱)

چوں پئے یَسْکُنَ اِلَیْھَاش آفرید　　کے تواند آدمؑ از حوّا برید

جب اس کو لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا (یعنی مرد کے سکون) کے لئے پیدا فرمایا ہے تو آدمؑ حوّا سے کیسے جدا ہو سکتے ہیں۔ (۲۶۰/۱)

رُستم زال ار بود وَز حمزہ بیش　　ہَست در فرماں اسیرِ زالِ خویش

اگر رستم زال تھا (حضرت) حمزہؓ سے بھی بڑھا ہوا، وہ اپنی بوڑھی (بیوی) کے حکم کا قیدی تھا۔ (۲۶۰/۱)

آنکہ عالم مستِ گفتش آمدے　　کَلِّمِیْنِیْ یَا حُمَیْرَا می زدے

وہ ذات جس کی گفتگو سے عالم مست ہو جاتا ہے، فرماتی تھی کہ اے حمیرا! مجھ سے بات کرو۔ (۲۶۰/۱)

مولاناؒ فرماتے ہیں جہاں آگ سر اُٹھائے تو پانی اس کو بُجھا دیتا ہے لیکن اگر پانی دیگچی میں ڈال کر اُبالا جائے تو پانی آگ کو نہیں بجھا سکتا بلکہ پانی ہوا میں اُڑتا رہے گا اور ختم ہو جائے گا، یعنی یہاں پانی مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بظاہر مرد غالب ہے (جیسے پانی آگ کو بجھا دیتی ہے) اور عورت مغلوب ہے مگر باطن میں زن غالب اور مرد مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مولاناؒ نے ایک حدیث سے ثابت کیا ہے کہ عورتیں عقلمند مردوں پر غالب آ جاتی ہیں۔ ''اِنَّهُنَّ يَغْلِبْنَ الْعَاقِلَ وَ يَغْلِبُهُنَّ الْجَاهِلُ '' یعنی عورتیں عاقلوں پر غالب آ جاتی ہیں اور جاہل مرد عورتوں پر غالب آ جاتے ہیں ۔

گفت پیغمبر کہ زن بر عاقلاں غالِب آید سخت بر صاحب دلاں

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ عورت عقلمندوں اور صاحبِ دل لوگوں پر بہت غالب ہے۔ (۲۶۱/۱)

باز بر زن جاہلاں چیرہ شوند زانکہ ایشاں تُند و بس خیرہ روند

پھر جاہل لوگ عورت پر غالب ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ بدمزاجی اور اکھڑ پن سے ملتے ہیں۔ (۲۶۱/۱)

کم بود شاں رقّت و لُطف و وِداد زانکہ حیوانی ست غالِب بر نہاد

ان میں نرمی، مہربانی اور محبت کم ہوتی ہے کیونکہ ان کی طبیعت پر حیوانیت غالب ہے۔ (۲۶۱/۱)

مہر و رقت وصف انسانی بُود خشم و شہوت وصفِ حیوانی بود

محبت اور نرمی انسانی وصف ہوتا ہے، غصہ اور شہوت حیوانی وصف ہوتا ہے۔ (۲۶۱/۱)

عاقل پر عورت کیوں غالب آتی ہے اور مرد جاہل عورت پر کیوں غالب آ جاتا ہے؟ اس کی وجہ آپ بیان فرماتے ہیں کہ مردِ عاقل سے یہ توقع ہے کہ وہ لطیف جذبات، عقل، عدل اور رحم رکھتا ہے، وہ احسان فراموش بھی نہیں ہوتا۔ عقل مند مرد عورت کو اس لیے بھی اچھا سمجھتا ہے کہ عورت نے اسے جنا اور مصیبت سے پالا ہے۔ اچھی عورت سے آدمی اس لیے مرعوب ہوتا ہے کہ وہ بیوی کی محبت سے لذت اندوز ہوتا ہے اور وہ عورت اُس کے بچوں کو پالتی اور گھر کو سنبھالتی ہے۔ جاہل آدمی مردوں کی فوقیت کی وجہ سے سب کچھ بھول جاتا ہے اور معمولی باتوں پر مار دھاڑ شروع کر دیتا ہے (بزرگوں نے کہا کہ عورت کا منہ کھلتا ہے تو مرد کا ہاتھ کھل جاتا ہے)۔ یہاں عورت کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ اچھی عورت ایسے کام نہیں کرتی، جس پر اسے مارا پیٹا جائے۔ عاقل آدمی عورت کی معمولی غلطیوں کو نظرانداز کرتا ہے اور عورت بھی مرد کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے جھگڑا نہیں کرتی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو طول نہیں دیتی۔ جاہل مرد میں مہر و رقت اور لطف جو وصفِ انسانی ہیں، کی کمی ہوتی ہے اور اس پر حیوانیت غالب ہوتی ہے۔ مہذّب زندگی (مردِ عاقل کی زندگی) ایسی ہے، جیسے دیگچی میں پانی ہو اس لیے وہ غصے یا اشتعال کی آگ سے مغلوب ہو جاتا ہے اور عقل و تہذیب کا تقاضا بھی یہی ہے۔

مولانا ایک بہت گہری بات فرماتے ہیں کہ عورت اس لیے محبوب ہے کہ وہ ظِل اللہ یا پرتو حق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ

کی صفاتِ کاملہ مجازی طور پر عورت میں پائی جاتی ہیں۔ صفاتِ الٰہیہ میں سے خلاقی کی صفت عورت میں مرد سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہ ایک قطرہ منی سے شروع کر کے بچے کی پرورش تک تکلیف اُٹھاتی ہے۔ عورت کا رحم ربوبیت کا محل ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ وہ مخلوق بھی ہے اور خالق بھی۔ گو مردوں کے کارنامے بہت بڑی نوعیت کے ہیں مگر عورت کے اس کارنامے سے سب نیچے ہیں اور یہ کام کوئی مرد کسی حالت میں نہیں کرسکتا۔ ایک قطرے سے انسان بنانا، اولیاء وانبیاء پیدا کرنا عورت کا ہی کام ہے۔

پرِ تو حق است آں معشوق نیست خالق ست آں گوئیا مخلوق نیست

وہ اللہ کا عکس ہے معشوق نہیں ہے، گویا وہ خالق ہے مخلوق نہیں ہے۔ (۲۶۱/۱)

عورت کو یہ شرف حاصل ہے (بشرطیکہ وہ عورت ٹھیک ہو) کہ مرد کی جاذب قلب ہے، بچے کی مولد اور مصور ہے، بچے کی مربی، شوہر کے لیے سکونِ قلب ہے اور وہ مصلحِ اُمورِ معیشت ہے اور یہ صفات کسی نہ کسی صفتِ الٰہیہ کا پَر تو ہیں۔

نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تاخیر کرو

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کسی خطا کار کی تادیب اور سزا میں جلدی نہ کرو، اسی طرح غصے میں انتقام کا شائبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جو بُرا ہے اس کا بُرا حشر لازمی ہوگا مگر اس کو سزا دینے کے لیے اپنے نام کو دور رکھو اور اسے اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر کوئی اچھا ہو تو اس کے ساتھ اچھائی کرنا بہتر ہے تا کہ تمہیں اس کا اجر ملے۔ کھانے کے وقت سے پہلے کچھ بھوک لگے تو اس کو اشتہائے کاذب کہتے ہیں، ایسی حالت میں جھٹ پٹ پیٹ بھرنا بُرا ہوتا ہے۔ شہواتِ نفسانیہ کا فوراً تقاضا پورا کرنا درست نہیں۔ اگر شہوت غلط نوعیت کی ہو تو وہ وقفہ دینے سے خود بخود رفع ہو جاتی ہے۔

آں ادب کہ باشد از بہرِ خدا اندراں مستعجلی نبُود روا

جو سزا خدا کے لئے ہوتی ہے، اس میں جلد بازی مناسب نہیں ہوتی۔ (۲۵۲/۶)

وانچہ باشد طبع و خشمِ عارضی می نشاید تا نگردد مُرتضی

اور جو مزاج اور عارضی غصہ کی وجہ سے ہو، اس میں جلدی کر تا کہ رضامندی نہ آجائے۔ (۲۵۲/۶)

اِشتہا صادق بُود تاخیر بہ تا گوارندہ شود آں بے گرِہ

سچی بھوک ہو تو تاخیر بہتر ہے تا کہ بغیر کراہت کے خوب ہضم ہو جائے۔ (۲۵۳/۶)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کوئی چیز نہ اچھی ہے نہ بُری، نہ خیرِ مطلق نہ شرِ مطلق۔ کسی چیز کا خیر یا شر ہونا اس کے موقع کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی کو تھپڑ مارنا بُری بات ہے لیکن اگر کسی کو تھپڑ مارنے سے اس کی اصلاح ہو جائے کہ وہ قتل جیسے جرم سے باز رہے تو درست ہے۔ سزا کا صحیح مقصد اِصلاح ہے، انتقام نہیں۔ اگر نمدے سے گرد دُور کرنے کے لیے ڈنڈے سے مارنا پڑے تو یہ بُرا نہیں ۔

خیرِ مطلق نیست زینہا ہیچ چیز   شرِ مطلق نیست زینہا ہیچ نیز

ان میں سے کوئی چیز مطلق خیر نہیں ہے، نیز ان میں سے مطلقاً کوئی چیز شر نہیں ہے۔ (۲۵۴/۶)

نفع و ضرِ ہر یکے از موضع ست   علم زیں رُو واجب ست و نافع ست

ہر ایک کا نفع اور نقصان ایک مقام سے ہے، اس اعتبار سے علم ضروری اور مفید ہے۔ (۲۵۴/۶)

زخم در معنیٰ فتد بر خوی بد   چوب بَر گرد اُوفتد نے بر نَمد

چوٹ حقیقتاً بُری عادت پر پڑتی ہے، لکڑی گرد پر پڑتی ہے نہ کہ نمدے پر۔ (۲۵۴/۶)

دُنیادار احمقوں سے بھاگو

مولانا رومیؒ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ایک قصہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے دیکھا آپ کوہ و دشت کی طرف بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ آپ کو کسی موذی جانور یا ظالم شخص کا خطرہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں احمقوں سے بچنے کے لیے بھاگ رہا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ کیا آپ وہی مسیح نہیں کہ جو اندھوں کو بینا اور مُردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کی حماقت کی بیماری کو بھی ٹھیک کر سکتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ جسمانی عارضے تو عارضی ہوتے ہیں اور قابلِ علاج ہوتے ہیں لیکن جو شخص حماقت میں پختہ ہو گیا اور "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ" کا مصداق ہے یعنی اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ (البقرۃ:۷) فرمایا، یہ دل کے اندھے، گونگے اور بہرے میرے بس کے نہیں، ایسے احمقوں کی مجلس سے تو عقلمندوں کو بھی بچنا چاہیئے کیونکہ ان کی صحبت میں عقل اس طرح جاتی ہے، جس طرح نادیدہ طور پر ہوا پانی کو اُڑا کر لے جاتی ہے۔ یہ بات حضرت مسیح علیہ السلام نے اس شخص کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے بیان کی تھی ۔

گفت رنجِ احمقی قہرِ خداست   رنجِ کوری نیست قہر آں ابتلاست

فرمایا، بے وقوفی کی بیماری خدا کا عذاب ہے، اندھے پن کی بیماری عذاب نہیں وہ آزمائش ہے۔ (۲۵۰/۳)

ان احمقوں نے دل کو وہ داغ دیا ہے جیسے خدا کی طرف سے مہر لگا دی گئی ہو اور اب ٹوٹ نہیں سکتی۔

انچہ داغِ اُوست مُہر اُو کردہ است   چارۂ بروے نیارد بُرد دست

یہ ایسا داغ ہے گویا اللہ نے مُہر لگا دی ہے تو کوئی تدبیر اس پر قابو نہیں پا سکتی۔ (۲۵۱/۳)

زاحمقاں بگریز چوں عیسیٰؑ گریخت   صحبتِ احمق بَسے خوں ہا کہ ریخت

بے وقوفوں سے اس طرح بھاگو جس طرح حضرت عیسیٰؑ بھاگے، احمق کی صحبت نے بہت خون بہائے ہیں۔ (۲۵۱/۳)

اندک اندک آب را دُزدد ہوا   واِیں چنیں دُزددہم احمق از شما

ہوا پانی کو تھوڑا تھوڑا چراتی ہے، اسی طرح بے وقوف تم میں سے (تم کو) چراتا ہے۔ (۲۵۱/۳)

آں گریز عیسوی نزبیم بُود ایمن ست اُو از پئے تعلیم بود

(حضرت) عیسیٰؑ کا بھاگنا خوف سے نہ تھا، وہ محفوظ تھے تعلیم دینے کے لئے۔ (۳/۲۵۱)

مولاناؒ فرماتے ہیں اگرچہ لوگ اندھے بہرے اور گونگے ہیں۔ کوئی کم نقصان دہ اور کوئی زیادہ ہے لیکن ان کا لباس چست ہونے کی وجہ سے ان میں رُوحانی کمی کا احساس عام لوگوں کو نہیں ہوتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں سبا ایک بہت بارونق شہر تھا اور وہاں کے لوگ اچھے خاصے امیر تھے، مگر رُوحانی زندگی سے بالکل کورے تھے۔ ان کی مثال ایسے تھی کہ چیونٹی تو نظر آ جائے مگر سلیمان نظر نہ آئے۔ اپنی روح کی حقیقت سے قطعاً ناآشنا تھے، اسی لئے قہرِالٰہی کے موجب ٹھہرے۔ لباس تو طویل اور دراز ہوسکتا ہے لیکن لباسِ تقویٰ سے بالکل ننگے نہیں ہونا چاہیئے۔ لوگوں کا یہ حال ہے کہ جس دیگچے پر وہ پکانا چاہتے ہیں اس کا پیندا ہی نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ شہوات کے پیدا کردہ فریب ہیں۔

مردِ دنیا مفلس است و ترسناک ہیچ اورا نیست از دُزددانش باک

دُنیادار انسان مفلس ہے اور خوف زدہ ہے، اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اس کو چوروں کا کیا ڈر۔ (۳/۲۵۴)

اُو برہنہ آمد و عُریاں رود وزغمِ دزدش جگر خوں می شود

وہ ننگا آیا اور ننگا جائے گا اور چور کے غم سے اس کا جگر خون ہوتا ہے۔ (۳/۲۵۴)

فرماتے ہیں کہ دُنیادار دُنیا کو قیمتی سرمایہ سمجھ کر اس طرح دُنیا سے چمٹتے ہیں، جیسے کہ ایک بچہ جس کی جھولی ٹھیکریوں سے بھری ہو اور وہ ڈرتا ہے کہ کوئی اس سے چھین نہ لے۔ اگر اس سے یہ ٹھیکریاں چھین لے تو رونے لگتا ہے اور واپس دے دے تو ہنسنے لگتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ مال کی محبت رکھنے والوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

تیسواں باب

خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

عالمِ رُوحانی اور عالمِ مادی کے لوگ

انسان کی شکل و صورت جسمانی ہے مگر اس کی اصل ماہیت رُوحانی ہے۔ زمین و آسمان کی خبریں لینے والا، طرح طرح کے علوم کو جاننے والا اور حیرت انگیز ایجادات کرنے والا محض دوگز کا مادی جسم ذرّاتِ خاکی کا مرکب ہی نہیں ہوسکتا۔ جسم سے وابستگی انسان کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور مادہ پرست اسی دھوکے میں ہیں کہ کوئی چیز ہمیں تباہ و برباد نہیں کرسکتی ہے۔ ابلیس نے سب سے پہلے یہ دھوکا کھایا کہ آدم علیہ السلام محض خاک کا پتلا ہے۔ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو علم دیا تو انسان کو مسجودِ ملائک کر دیا۔

انسان دو عالموں میں بیک وقت زندگی بسر کرتا ہے ایک عالمِ مادی اور ایک عالمِ رُوحانی۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے اندر بھی رُوحانی خوبیاں خوابیدہ حالت میں نظر آتی ہیں۔ مولاناؒ نے ایک مثال دی ہے کہ بطخ کے انڈے کو اگر مرغی کے نیچے رکھ دیا جائے تو بطخ کے بچے ہی اس میں سے نکلیں گے۔ بطخ فطری طور پر پانی کی طرف اپنا میلان رکھتی ہے اور مرغی جس نے انڈوں کو جنم دلوایا، پانی سے دُور بھاگتی ہے کیونکہ یہ خشکی کا جانور ہے۔ انسان اگرچہ عالمِ خاکی میں جنم لیتا ہے لیکن اس کی اصل فطرت رُوحانیت کے دریا کی شناوری کرتی ہے۔ بطخ کا بچہ، بے شک کوئی اسے روکے مگر وہ پانی میں ضرور جاتا ہے۔ انسان خود کو عالمِ جسمانی یعنی خشکی کا جانور سمجھتا ہے اور

رُوحانیت کے دریا کی طرف جانے کے لیے جھجکتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ جسمانی اور رُوحانی عالم میں زندہ رہ سکتا ہے، جس طرح بطخ خشکی اور تری دونوں میں رہ سکتی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

تخم بطی گرچہ مرغِ خانہ ات	کرد زیر پر چو دایہ تربیت

تو بطخ کا انڈہ ہے، اگرچہ تجھے گھریلو مرغ نے پروں کے نیچے دایہ کی طرح پالا ہے۔ (۳۵۲/۲)

مادر تو بطِ آں دریا بدست	دایہ ات خاکی بُد و خشکی پرست

تیری ماں تو اس دریا کی بطخ تھی، تیری دایہ خاکی اور خشکی پرست تھی۔ (۳۵۲/۲)

میلِ دریا کہ دلِ تو اندرست	آں طبیعت جانت را از مادر ست

دریا کی طرف جھکاؤ جو تیرے دل میں ہے، تری جان کا وہ مزاج ماں کی جانب سے ہے۔ (۳۵۲/۲)

دایہ را بگذار در خشک و براں	اندر آ در بحرِ معنیٰ چوں بطاں

دایہ کو خشکی پر چھوڑ دے اور دوڑ کر بطخوں کی طرح حقیقت کے سمندر میں آ جا۔ (۳۵۲/۲)

گر ترا دایہ بترساند زآب	تو مترس و سوئے دریا راں شتاب

اگر تجھے دایہ پانی سے ڈرائے تو نہ ڈر اور دریا کی جانب جلد (سواری) ہانک دے۔ (۳۵۲/۲)

تو بطے بر خشک و بَرتر زندہٗ	نے چو مُرغِ خانہ خانہ کندہٗ

تو ایسی بطخ ہے کہ خشکی اور تری پر تُو زندہ ہے، نہ کہ گھر کے مرغ کی طرح تو نے گھر کو کریدا ہے۔ (۳۵۲/۲)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (ہم نے بنی آدم کو فضیلت عطا کی اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا۔ (بنی اسرائیل:۷۰) کی یہی تفسیر ہے۔ ملائکہ کو عام طور پر عالمِ جسمانی سے تعلق نہیں اور بہت سے حیوانات سمندری ہیں اور کچھ خشکی کے ہیں مگر انسان بحر و بر بلکہ ہوا کا بھی باشندہ اور عالمِ ارواح کے سمندر کی شناوری بھی کرتا ہے ؎

تو بہ تن حیواں، بہ جانے از ملک	تا روی ہم بر زمیں ہم بر فلک

تو جسم کے اعتبار سے حیوان ہے اور رُوح کے اعتبار سے فرشتہ، تاکہ تو زمیں پر بھی اور آسماں پر بھی جا سکے۔ (۳۵۳/۲)

تا بہ ظاہر مِثْلُکُم باشد بَشَر	بادلِ یُوْحیٰ اِلَیَّ دیدہ ور

اگرچہ ظاہری طور پر بشر ہے، یُوحیٰ اِلَیَّ کے دل کے اعتبار سے تو صاحبِ بصیرت ہے۔ (۳۵۳/۲)

قالبِ خاکی فتادہ بر زمیں	روحِ اُو گرداں براں چرخِ بریں

تو ایک خاکی جسم ہے جو زمین پر پھینکا گیا ہے، جس کی روح بلند و بالا آسماں پر چکر کاٹتی ہے۔ (۳۵۳/۲)

ما ہمہ مُرغابیانیم اے غلام	بحر می داند زبانِ ما تمام

اے لڑکے! ہم سب مرغابیاں (پانی کے پرندے) ہیں، سمندر ہماری زبان کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ (۳۵۳/۲)

انسان نے کیا معرکے مارے ہیں اور کیا کیا ہستیاں پیدا ہوئی ہیں، یہ تمام داستاں رُوحانی دُنیا جانتی ہے۔ ایک مشکل بات جونظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں بطخ کے بچے مرغی کے نیچے نکالے گئے ہیں اور ان کو تمام عمر سمندری شناوری سے بڑی کوششوں کے ساتھ بچایا جا رہا ہے کہ مسلمان کسی سمندر کی طرف رواں دواں نہ ہو جائیں۔ دشمن اپنی پالیسی میں مضبوط ہے مگر مسلمان (بطخوں کے بچے) ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور سمندر کی راہ نہیں پا رہے۔ اس مسئلے کا حل مطلوب ہے۔

علامہ اقبالؒ کی شاعری میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں، جن سے آپ کی مراد ہے کہ اگرچہ انسان خاکی ہے مگر اس کی پرواز بلند ہے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی ۔۔۔ ہے اس کا نشیمن نہ بخارا، نہ بدخشاں

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ۔۔۔ قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآں

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم ۔۔۔ لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی ۔۔۔ خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش ۔۔۔ خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں ۔۔۔ جبریلؑ و سرافیلؑ کا صیاد ہے مومن

رُوحانیت بُری چیز کو اعلیٰ بنا دیتی ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ رُوحانی بزرگوں کی پاکیزگی کی بدولت ہستیٔ اسفل کے (بُرے لوگ) بھی نورِ حق سے چمک جاتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے تمام رُوئے زمین کو میرے لیے اور میری اُمت کے لیے مسجد بنا دیا ہے، جہاں خشک زمین موجود ہے وہی مسلمان کے لیے نماز ادا کرنے کی جائے نماز ہے۔ مسلمان کو عبادت کے لیے کلیسا و کنشت کی ضرورت نہیں "جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا" میرے لیے تمام زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔ (مسند احمد، ج ۱، ص ۲۵۰) یہ محاورہ ہے "چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک" یعنی خاک کو عالمِ پاک سے کیا نسبت ہے لیکن خاک کو عالم پاک بنانا، دینِ محمدی ﷺ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اس دُنیا کو دین کی برکات کا حامل بنانے کا نام اسلام ہے۔ کوئی چیز اچھی ہے نہ بُری، اس کا مصرف (استعمال کرنا) اس کو اچھا یا بُرا بناتا ہے۔

درج ذیل اشعار میں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ جہاں بھی جاتے ہیں ہر جگہ پر نماز ادا کر لیتے ہیں، حتیٰ کہ اس گھر میں بھی جس میں بچوں کے بول و براز ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں مصلّٰی ہو یا نہ ہو، آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ برگزیدہ بندوں کے لیے نجس مقام کو پاک فرما دیتے ہیں۔" ؎

عائشہؓ روزے بہ پیغمبر بگفت یارسول اللہ ﷺ تو پیدا و نہفت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک روز پیغمبر ﷺ سے کہا، یارسول اللہ ﷺ آپ مجمع اور تنہائی میں۔ (۲/۳۲۱)

ہر کجا یابی نمازے می کنی می روی در خانہ ناپاک و دنی

آپ جہاں بھی ہوں نماز پڑھ لیتے ہیں، حالانکہ آپ ناپاک اور پلید گھروں میں بھی جاتے ہیں۔ (۲/۳۲۲)

گرچہ می دانی کہ ہر طفلِ پلید کرد مستعمل بہر جا کہ رسید

اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ ہر ناپاک بچہ جہاں بھی جائے اس زمین کو مستعمل کر دیتا ہے۔ (۲/۳۲۲)

بے مُصلیٰ می گذاری تو نماز ہر کجا روئے زمیں، بکشائے راز

آپ بغیر مصلّے کے بھی نماز پڑھ لیتے ہیں جہاں بھی روئے زمین ہو، یہ راز بتائیے! (۲/۳۲۲)

گفت پیغمبر کہ از بہرِ مہاں حق نجس را پاک کرد ایں را بداں

پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ پاک لوگوں کے لئے اللہ نے نجس جگہ کو بھی پاک قرار دیا ہے، اس کو سمجھ لو۔ (۲/۳۲۲)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ نے ہر ادنیٰ چیز اور عمل کو رُوحانیت کی وجہ سے بلند مرتبت بنانے کا حکم دیا ہے، چنانچہ مسجد کے فرش کو عرش بنا دیتا ہے بلکہ عرش اس زمین پر رشک کرتا ہے جہاں سجدہ کیا جائے۔ اس کتاب میں اس بات کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ نیک آدمی کسی بُری چیز کو پکڑتا ہے تو اسے اچھا بنا دیتا ہے۔

نفس حیلہ ساز ہے اور کسی حجت کو نہیں مانتا

مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ نفس سوفسطائی ہے (یعنی بہانہ بنانے والا ہے)۔ سوفسطائی یونان میں معلّمین کا کام کرتے تھے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو نے ان کے خلاف جہاد کیا۔ سوفسطائی کہتے تھے کہ صداقتِ مطلقہ کوئی چیز نہیں، جس شخص کو جس چیز سے فائدہ پہنچے، وہی اس کے لیے خیر ہے اور جس سے اس کو نقصان پہنچے تو وہ اس کے لیے شر ہے۔ کسی بات پر ان کا یقین اور ایمان نہ تھا۔ امراء کی اولاد کو مناظرے کا فن سکھاتے اور اس کا عظیم معاوضہ مانگتے اور غلط بحث کے ہتھکنڈے ان کو سکھاتے۔ وہ کہتے تھے سیاست میں سچ کہنے کی ضرورت نہیں اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے مقصد کو ثابت کرنا ان کا طریقۂ کار تھا۔ وہ ہر بیّن حقیقت کے خلاف دلیل گھڑ لیتے۔ مولاناؒ نے نفس کو سوفسطائی کہا ہے، جو عقل کو حیلہ ساز بنا لیتا ہے۔ نفس کے حیلے بہانے اس قدر تیز ہیں کہ اس نے اپنی خواہشات کے لئے ہر دلیل اور حجت کو نہ ماننے کا پہلے ہی سے فیصلہ کر رکھا ہے۔

متہم نفس است نے عقلِ شریف متہم حس است نے نورِ لطیف

متہم (یعنی جس پر تہمت لگائی جائے) نفس ہے، نہ کہ شریف عقل۔ متہم حِس ہے، نہ کہ پاکیزہ نور۔ (۲/۳۲۸)

نفس سوفسطائی آمد می زنش کش زدن سازد نہ حجت گفتنش

نفس سوفسطائی ہے، اس کی سرزنش کر کیونکہ مارنا ہی اس کے لائق ہے، نہ کہ اس سے دلیل بیان کرنا۔ (۲/۳۲۸)

یہ لوگ معجزے کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ محض خیال یا نظر کا فریب ہے "هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ" ان لوگوں کا ہی مقولہ ہے ؎

معجزہ بیند ، فروزد آں زماں — بعد ازاں گوید خیالے بود آں

سوفسطائی معجزہ دیکھتا ہے تو اس وقت منور ہوتا ہے، اس کے بعد کہہ دیتا ہے وہ خیال تھا۔ (۳۲۸/۲)

ور حقیقت بود آں دیدِ عجب — چوں مقیمِ چشم نامد روز و شب

اگر یہ معجزہ حقیقت ہوتا تو مادی مظاہر کی طرح قائم اور دائم رہتا، اگر وہ عجیب نظارہ حقیقت تھا تو دن رات آنکھ میں کیوں نہ ٹھہرا۔ (۳۲۸/۲)

نفس کا بھی یہی حال ہے کہ جہاں اپنا مقصد پورا ہوتا ہوا نظر آئے تو واقعات کو ثبوتِ قطعی سمجھ لیتا ہے اور جو چیز اس کی خواہشات کے خلاف ہو تو ثبوت کے پہاڑ (قرآن اور حدیث) کو بھی نظر میں نہیں لاتا۔

وہ دعوے جو اپنی دلیل آپ ہوتے ہیں

مولاناؒ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کئی دعوے ایسے ہیں جو محتاجِ دلیل نہیں، مثلاً یہ محاورہ ہے "آفتاب آمد دلیل آفتاب" (یعنی سورج اپنی دلیل آپ ہے) یہاں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی بچہ ماں باپ کے پاس سویا ہے اور رات کو اندھیرے میں گھبرا جائے تو باپ یہ کہدے کہ بیٹا! گھبراؤ نہیں، میں تمہارے پاس ہوں۔ بچہ چونکہ باپ کی آواز کو پہچانتا ہے، وہ اس بات کی کوئی دلیل طلب نہیں کرتا کہ آواز دینے والا باپ ہے یا کوئی اور، کیونکہ وہ آواز پہچانتا ہے۔ ایک عربی بولنے والا کہتا ہے کہ میں عربی جانتا ہوں تو اس کا دعویٰ اس کی دلیل ہے۔ ایک کاتب اگر کوئی خط کسی کو لکھتا ہے کہ میں کاتب ہوں اور کہتا ہے مجھے کوئی کام دیں تو اس کا خط ہی اس کے دعوے کی دلیل ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اسی طرح کوئی آدمی نبی یا ولی سے خوارقِ عادات یا معجزہ طلب نہیں کرے گا، بشرطیکہ اس کے دل میں کفر اور فسق و فجور نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی نے حضور ﷺ سے معجزات طلب نہیں کئے۔ نبی کی بات ہی خود دعویٰ بہ دلیل ہے اور جس کو خدا نے بصیرت اور عقلِ خالص عطا کی ہو، وہ اس کی آواز کو پر معنیٰ سمجھ کر یقین کر لیتا ہے کیونکہ وہ اس آواز کے نور کو پہچانتا ہے۔ مولاناؒ کافر اور جاہل کے لیے فرماتے ہیں ؎

پیشِ اُو دعویٰ بوُد گفتار اُو — جہلِ او شُد مایہء انکارِ اُو

اس کے سامنے اس کا دعویٰ محض گفتار ہوگا، اس کا جہل اس کے انکار کا سرمایہ ہوگا۔ (۳۳۵/۲)

پیشِ زیرک کاندرونش نور ہاست — عینِ ایں آواز معنی بود راست

عقل مند کے سامنے، جس کے اندر نور ہے بعینہٖ یہ آواز حقیقت کا معنی رکھتی ہے۔ (۳۳۵/۲)

در دلِ ہر اُمّتی کز حق مزہ است — روئے و آوازِ پیمبر مُعجزہ است

ہر اُمتی کے دل میں حق کا ذائقہ ہے، پیغمبر کا چہرہ اور آواز معجزہ ہے۔ (۳۳۷/۲)

چوں پیمبر از بروں بانگے زند جانِ اُمّت در دروں سجدہ کُند

جب پیغمبر باہر سے پکارتا ہے تو اُمت کی روح اندر سجدہ کرتی ہے۔ (۳۳۷/۲)

زانکہ جنسِ بانگِ اُو اندر جہاں از کسے نشنیدہ باشد گوشِ جاں

اس لیے کہ اس کی آواز کی مانند دُنیا میں رُوح کے کان نے کسی کی آواز نہیں سنی۔ (۳۳۷/۲)

مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ حکمت مردِ مومن کا گُم شدہ مال ہے۔ جہاں وہ حکمت کی بات سنتا ہے تو وہ اس کو مان لیتا ہے، جو لوگ حکمت کو نہیں مانتے وہ حجتیں کرتے ہیں اور کسی بات کو ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ایسے بندے کو اگر سخت پیاس لگی ہو تو اسے کوئی کہے کہ ادھر آؤ اس گھڑے میں پانی ہے اور اپنی پیاس بجھا لو۔ فرماتے ہیں کہ کوئی ایسا منطقی کبھی نہیں دیکھا گیا جو یہ کہے کہ پہلے اس بات کا ثبوت دو کہ اس مٹکے میں پانی ہے اور اگر ثبوت نہ دو گے تو میں یہیں بیٹھا رہوں گا اور پیاس سے مرنے کو ترجیح دوں گا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب ماں بچے کو دودھ دینے کے لیے بلائے تو بچہ کبھی بھی دلیل طلب نہیں کرتا کہ تو واقعی میری ماں ہے۔ حکمت طلب اور ایمان طلب انسان کی رُوح حق کو پہچانتی ہے۔ جہاں صداقت نظر آئے تو بے تابانہ لپک کر آتی ہے ؎

پس چو حکمت ضالۂ مومن بُوَد آں زہر کہ بشنود مُوقِن شود

پس چونکہ حکمت مومن کی گم شُدہ چیز ہوتی ہے اور جب وہ کسی سے سنتا ہے تو یقین کرنے والا ہو جاتا ہے، مومن بن جاتا ہے۔ (۳۳۶/۲)

تِشنہ را چوں بگوئی تو شتاب دَر قدح آب است و بستانِ زود آب

پیاسے کو اگر کوئی کہے کہ دوڑ، مٹکے میں پانی ہے، جلد پانی لے لے۔ (۳۳۶/۲)

ہیچ گوید تشنہ کیں دعویست رَو از بَرم اے مُدّعی، مہجور شو

کبھی کسی پیاسے نے نہیں کہا کہ یہ تو دعویٰ ہے، جا اے مدعی! مجھ سے دُور ہو جا۔ (۳۳۶/۲)

یا گواہ و حجتے بنما کہ ایں جنسِ آب است و ازاں مَائے معیں

یا یہ کہے کہ گواہ اور دلیل لا کہ یہ پانی کی جنس ہے اور شیریں پانی میں سے ہے۔ (۳۳۶/۲)

سلوک طے کرنے کا ایک طریقہ

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ صوفی کا علم کتابی نہیں ہوتا بلکہ وہ کتابوں کے علاوہ تزکیۂ نفس کرتا ہے۔ تزکیہ سے مضامینِ غیب کھلنا شروع ہو جاتے ہیں، وہ صرف حروف سے کام نہیں لیتا بلکہ دل سے بھی کام حاصل کرتا ہے ؎

دفترِ صُوفی سواد و حرف نیست جز دلِ اسپید ہمچوں برف نیست

صوفی کا دفتر سیاہی اور حرف نہیں ہے، برف کی طرح سفید دل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (۲۹/۲)

حضرت حبیب عجمیؒ، اپنے استاد شیخ حسن بصریؒ کو کہا کرتے تھے کہ تم تو کاغذ کالے کرتے ہو اور میں دل کو سفید

کرتا ہوں، یعنی تزکیۂ نفس کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ صوفی کا زادِراہ انوارِ قدسیہ ہیں، جن کی روشنی میں وہ راستہ طے کرتا ہے۔ مولاناؒ ایک مثال پیش کرتے ہیں کہ کچھ صیاّد ایسے ہیں کہ وہ چند قدم تو ہرن کے قدموں کے نشان پر چلتے ہیں اور پھر ہرن کے نافہ کی خوشبو ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

زادِ دانشمند آثارِ قلم　　　زادِ صوفی چیست؟ انوارِ قِدم

عقلمند کا توشہ قلم کے نشانات ہیں، صوفی کا توشہ کیا ہے؟ انوارِ قدم یعنی اللہ کے انوار۔ (۲۹/۲)

رفتنِ یک منزلِ بر بوئے ناف　　　بہتر از صد منزلِ گام و طواف

نافہ کی خوشبو پر ایک منزل چلنا چکر کی سو منزلوں سے بہتر ہے۔ (۳۰/۲)

فرماتے ہیں کہ عارف کی بصیرت ایسی ہوتی ہے کہ جہاں تمہیں دیوار حائل نظر آتی ہے، وہاں ان کو ایک دریچہ (جھروکا) نظر آتا ہے۔ پردۂ آہن بھی ان کے لیے حجاب نہیں۔

با تو دیوار است و با ایشاں در است　　　با تو سنگ و با عزیزاں گوہر است

(وہ دل) تیرے لیے دیوار اور ان کے لئے دروازہ ہے، تیرے لیے پتھر ہے اور پیاروں کے لئے موتی ہے۔ (۳۰/۲)

آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں　　　پیر اندر خشت بیند پیش ازاں

تُو جو کچھ آئینہ میں مشاہدہ کرتا ہے، پیر لوہے کے ٹکڑے میں اس سے پہلے دیکھ لیتا ہے۔ (۳۰/۲)

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِّ پیر
(نفس کو شیخ کے سائے کے سوا کوئی چیز نہیں مار سکتی)

مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کا نفس سانپ کی طرح انسان کو ڈس لیتا ہے۔ اگر سانپ کے دانت اُکھاڑ دیئے جائیں تو پھر اس کو پتھر مارنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس موضوع پر ایک مبسوط بیان ہماری تصنیف ''تہذیبِ نفس'' میں بطور ایک باب دیا گیا ہے، جس میں ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے کہ شیخ کا دامن کس طرح پکڑنا چاہیئے اور اس سے کیا فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ مرید اگر شیخ کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے تو اس کا نفس اس طرح ہو جائے گا، جیسے کہ سانپ کے دانت نکال دیئے ہوں لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ مرید ایسا نہ کرے کہ رسمی طور پر بیعت کرے اور بیعت کے لوازمات کا خیال نہ رکھے۔ پیر کا کامل ہونا بھی اس کی شرائط میں سے ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہیچ نہ کشد نفس را جز ظلِّ پیر　　　دامن آں نفس کُش را سخت گیر

مرشد کے سایہ کے بغیر کسی شخص کا نفس نہیں مرتا، اس نفس کش کا دامن مضبوطی سے پکڑو۔ (۲۴۲/۲)

اگر مرید کا رابطہ اپنے مرشد سے اُستوار ہو اور مرشد اس کو رُوحانیت کے تمام دروس دیتا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ

مرید کی روح کی اِصلاح نہ ہو اور اس کا نفس اپنی سرکشی سے باز نہ آ جائے۔ شیخ ایسا ہو کہ جو مرید پر محنت کرنے کے بعد اس کو ضروریاتِ نفس کشی سکھائے، شیخ و مرشد کے پاس ایسے طریقے اور اسباق موجود رہتے ہیں، جن کی مدد سے مرید کا نفس تزکیہ اور تصفیہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور نفس اپنی مزاحمت سے باز آ جاتا ہے۔

صحبتِ شیخ سے شیخ کے انوار کا عکس مرید پر اثرانداز ہوتا ہے اور جب اس کے جسم سے شعاعیں مرید پر پڑتی ہیں تو یہ شعاعیں کیمیا کا کام کرتی ہیں اور مرید پر اصلاحِ نفس کے اثرات نافذ ہو جاتے ہیں۔ یہ شعاعیں رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک سے آج بھی جاری ہوتی ہیں، جس کو شیخ کے قلب سے مرید حاصل کر سکتا ہے۔ انوار کا یہ عکس رُوحانی انعکاس کہلاتا ہے اور یہ مرید کے سینے میں انقلاب برپا کر دیتا ہے اور اس کے اثر سے مرید ایسا ہو جاتا ہے جیسے نفس کے سانپ کے دانت نکال دیئے گئے ہوں۔ سانپ کی نسبت سے کچھ نسخوں میں مذکور بالا شعر اس طرح بھی لکھا گیا ہے ؎

ہیچ نکشد مار را جز ظلِّ پیر   دامن آں نفس کش را سخت گیر

(نفس کے) سانپ کو سایۂ مرشد کے سوا کوئی چیز ہلاک نہیں کر سکتی، (لہٰذا) اس نفس کش کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو۔ (۲۴۲/۴)

نجاتِ ابدی کے لئے نفس کشی ضروری ہے، جب تم مرشد کے دامن کو مضبوط پکڑ لو تو وہ توفیقِ حق ہو گی اور یاد رکھو کہ تم میں جو قوتِ باطنی پیدا ہو گی وہ اس کی کشش سے ہو گی۔ جنگِ بدر کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشتِ خاک اُٹھا کر کفار کی طرف پھینکی تو اللہ کی طرف سے کفار کو شکست ہوئی۔ (سبل الھدیٰ و الرشاد، ج۴، ص۴۷) مقصد یہ ہے کہ پیر کا فعل دراصل اللہ کا فعل ہوتا ہے، اُسی کے حکم اور مشیّت سے وہ وقوع پاتا ہے۔ جاننا چاہئے کہ مرید اگر صحیح مرید ہو تو مرشد سے فوائد اسی وقت ہی مرتّب ہوتے ہیں۔

چوبیسواں باب

نفس کا فریب اور مطالعۂ رومیؒ

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا

(اے خدا ہمارے لیے ہزاروں جال اور دانے پھیلائے گئے ہیں)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہم دُنیاداروں کو بہت حرص و ہوس کے پھندوں میں پھنسایا گیا ہے اور ہمارے سامنے بہت سے دانے بکھیرے گئے ہیں تا کہ شیطان ہم کو اس جال میں پھانس کر اپنا شکار کرے اور ہم اس سے بچتے رہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم حریص پرندوں کی طرح اس میں گرفتار ہونے کو ہیں، چنانچہ اے خدا! تو ہی ہم کو اس فریب کار سے محفوظ فرما۔ درج ذیل شعر میں نفس کو شہوات میں اُلجھانے کا ذکر کیا جا رہا ہے، یعنی جدھر بھی جاتے ہیں ہمارے اردگرد خواہشات کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ ہم جتنا بھی ان جالوں سے بچنا چاہیں، نہیں بچ سکتے، یاالٰہی! صرف تیرا فضل ہی ہے جو ہمیں اس جال سے بچا لے۔ ہم بچنے کی کوشش تو کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی ایسے گناہ کر بیٹھتے ہیں کہ ہماری وہ نیکیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں اس کا حل یہ ہے کہ اپنے دل کو شیطانی خیالات سے پاک کرو، اخلاقی کدورتوں سے شیشۂ دل کو صاف کرو تو پھر اعمالِ صالحہ کی برکت دیکھو گے۔ نماز جس کے متعلق حدیثِ پاک ہے "لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ" یعنی حضورِ قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ تو جان لیں کہ آدمی جب خدا کے حضور نماز کے لئے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے تو خاص خدا کی طرف دل کو

لگائے اور ایسا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی دوسرا خیال نہ آئے۔

عارف رومیؒ ایک لمبی داستان کے بعد اللہ سے عرض کرتے ہیں کہ شیطان ہر وقت ہماری کھوج میں لگا رہتا ہے اور ہم ہر وقت ایک نئے جال میں پھنسے رہتے ہیں۔ ہم اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور یہ ظالم ہمارے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے، لہٰذا تو ہمیں اس لعین کے شر سے بچا ؎

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا　　ما چو مرغانِ حریص و بے نوا

الٰہی! لاکھوں جال اور دانے (ہمارے اردگرد پھیلائے گئے) ہیں، ہم حریص اور بھوکے پرندوں کی طرح ان میں گرفتار ہونے کو ہیں۔ (۶۹/۱)

می رہانی ہر دمے مارا و باز　　سوئے دامے می رویم اے بے نیاز

تو ہمیں ہر وقت چھڑاتا ہے اور پھر ہم کسی جال کی طرف چل دیتے ہیں، اے بے نیاز! (۶۹/۱)

گر ہزاراں دام باشد ہر قدم　　چوں تو با مائی نباشد ہیچ غم

اگر ہر قدم پر ہزاروں جال ہوں جب تُو ہمارے ساتھ ہے تو کچھ غم نہیں۔ (۷۰/۱)

چوں عنایاتت شود با ما مُقیم　　کے بود بیمے ازاں دُزدِ لئیم

جب تیری عنایتیں ہمارے ساتھ ہو جائیں گی تو اس کمینے چور (شیطان) کا ڈر کب ہو سکتا ہے۔ (۷۰/۱)

انبیائے کرامؑ نفسانی غصہ سے پاک ہوتے ہیں

انبیائے کرام علیہم السلام نفسانی غصہ سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کا غصہ لوجہ اللہ ہوتا ہے جو کمالِ ایمان کی دلیل ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا "اے ابوذرؓ! ایمان کا کون سا رشتہ زیادہ مضبوط ہے؟" انہوں نے عرض کیا، "اللہ اور اُس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کے لیے لوگوں کے ساتھ معاونت کا برتاؤ رکھنا اور اللہ ہی کے لئے محبت کرنا اور اللہ ہی کے لئے بغض رکھنا ہے۔" (مشکوٰۃ)

ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں میں سے ایک شخص کا کچھ قرض جناب رسولِ خدا ﷺ کے ذمہ آتا تھا۔ اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت میرے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔" وہ کہنے لگا کہ "میں تو آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا، جب تک آپ میرا قرض ادا نہیں کریں گے۔" فرمایا "تو پھر بیٹھ جاؤ۔" آپ ﷺ نے اسی جگہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں پڑھیں۔ اصحاب اس یہودی کو دھمکیاں دیتے رہے مگر وہ ٹلا نہیں۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو اصحاب کو اس سلوک سے منع فرمایا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! ایک یہودی آپ کو باندھے بیٹھا ہے۔" فرمایا: "اللہ نے مجھے غیر مسلم رعیت پر ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے۔" روایت کے اتنے حصے سے آنحضرت ﷺ کا "مغلوب خوٗ" ہونا معلوم ہو گیا کہ کس طرح تاجدارِ کونین و سرورِ دارین ﷺ نے

اپنی رعایا میں سے ایک عام آدمی جو کہ مسلمان نہیں بلکہ یہودی ہے، کے آگے اپنے آپ کو مجبور و مغلوب بنا لیا۔ اس مجبوری و مغلوبیت کی تہ میں کس قدر عظیم الشان غلبہ اور زبردست طاقت اپنا کام کر رہی تھی، جس سے مغلوب خو کا غالب ہونا ثابت ہو گیا یعنی جب دن چڑھا تو وہ یہودی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور اس نے کہا: ''میں اپنا نصف مال اللہ کی راہ میں دیتا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں نے جو کچھ کیا، اس لیے کیا کہ آپ کے ان حالات کی آزمائش کروں جو میں نے تورات میں پڑھے ہیں کہ آخری پیغمبر محمد ﷺ عبداللہ کے بیٹے مکہ میں پیدا ہوں گے، مدینہ میں ہجرت کر کے جائیں گے، ان کی حکومت شام تک ہوگی، وہ بدخُو اور سنگدل نہ ہوں گے، نہ بازاروں میں غُل مچانے والے، نہ بُرا کرنے اور نہ بُرا بولنے والے ہوں گے۔'' (سبل الھدیٰ والرشاد، ج ۷، ص ۱۹)۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ باشد طالعِ او زآں نجوم   نفسِ اُو کفار سوزد در رُجوم

جس کا طالع ان ستاروں سے ہو، اس کا نفس رجوم کے وقت کفار کو جلا دینے والا ہوگا۔ (۱۰۴/۱)

جو شخص ان نجوم سے فیض حاصل کرتا ہے وہ نفسِ امارہ کو مغلوب کرنے پر قادر ہوتا ہے، جس طرح شہابِ ثاقب شیطان کو مار بھگاتا ہے۔

خشمِ مریخی نباشد خشمِ اُو   مُنقلب رَو غالب و مغلوب خُو

اس کا غصہ نفسانی غصہ نہیں ہوتا (بلکہ بغض فی اللہ ہوتا ہے۔ وہ تواضعاً) سر جھکا کر چلنے والا (اور منصور من اللہ ہونے کی وجہ سے) غالب (ہے) اور (کمال حلم وعفو کے سبب) مغلوب خُو (نظر آتا) ہے) (مریخ ستارہ جنگ جوئی کے اثرات ہیں)۔ (۱۰۴/۱)

عرض کن برمن شہادت را کہ من   مر ترا دیدم سَر افرازِ زمن

پس حضور مجھ کو کلمہ شہادت پیش کیجئے کیونکہ میں آپ کو (اس وقت) تمام زمانہ میں افضل سمجھتا ہوں۔ (۴۰۳/۱)

قُرب پنجہ کس زخویش و قومِ اُو   عاشقانہ سوئے دیں کردند رُو

(الغرض) تقریباً پچاس اشخاص اس کے اقربا و قبیلہ (قوم) میں سے کامل یقین کے ساتھ دینِ اسلام پر گامزن ہو گئے۔ (۴۰۳/۱)

مضبوط ایمان والے ہی ضبطِ نفس کرتے ہیں

فرمانِ نبوی ﷺ ہے ''تم میں سے کوئی ایمان دار نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں۔ (بخاری رقم الحدیث ۱۵) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی آپ کے ساتھ ایسی ہی محبت تھی۔ محبت کے ترازو میں ایک طرف آپ کی ذات پاک ہو اور دوسری طرف انسان کے ماں باپ تو آپ کا درجہ اس قدر بلند تر ہوگا کہ انسان ماں باپ کو آپ پر قرباں کر دے۔ یہ ان حضرات کا کمالِ ایمانِ محبت و عشق تھا جو ہر مومن کے لئے مامور بہ ہے۔ مذکورہ یہودی نے کہا ہے۔

تو تبار و اصلِ خویشم بودہَ   تو فروغ شمعِ کیشم بُودہَ

(میں اپنے خاندان کو چھوڑتا ہوں) آپ ہی میرے خاندان اور حقیقی قرابت دار ہیں اور میرے اس طریقِ دینداری کی شمع کا نور آپ ہی ہیں۔ (۴۰۳/۱)

اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے تعلق ہو تو نفس سے نجات ہوتی ہے

نفسِ امارہ ہمیشہ بُرائی کی طرف راغب کرتا ہے، لہٰذا تم اس کے خلاف کرو کیونکہ دُنیا میں پیغمبروں سے اسی طرح وصیت آئی ہے۔ نفس سے نجات چاہتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق قائم کرلو، کیونکہ (اس نفس کے) ہر سانس میں ایک مکر ہوتا ہے اور اس کے ہر مکر میں سینکڑوں فرعون اپنے تابعین کے ساتھ غرق ہو رہے ہیں۔ اگر تم ان مکروں سے بچنا چاہتے ہو تو موسیٰؑ اور موسیٰؑ کے خدا کی پناہ میں آ جاوٴ۔ اس موقع پر مولانا رومؒ کا کلام پیش کیا جا رہا ہے ۔

ہر نفس مکرے و در ہر مکر زاں   غرق صد فرعون با فرعونیاں

(اس نفس کے) ہر سانس میں ایک مکر ہوتا ہے اور اس کے ہر مکر میں سینکڑوں فرعون (جیسے شقی) مع اپنے تابعین کے غرق ہو رہے ہیں۔ (۱۰۷/۱)

در خدائے موسیٰ و موسیٰ گریز   آبِ ایماں را زفرعونی مریز

(نفس کے مکر سے بچنا چاہو تو) تو موسیٰؑ اور موسیٰؑ کے خدا (کی پناہ) میں دوڑو، اپنے ایمان کی آبرو فرعونیت کے باعث نہ گراوٴ۔ (۱۰۷/۱)

دست را اندر اَحَد و احمد بزن   اے برادر وارہ از بوجہل تن

بھائی! خداوند تعالیٰ اور رسول خدا ﷺ کے ساتھ تعلق پیدا کرو، بدن کے ابوجہل (یعنی نفسِ امارہ) سے نجات حاصل کرو۔ (۱۰۷/۱)

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ضبطِ نفس کی وجہ سے کافر مسلمان ہو گئے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ دشمن کو زیر کرنے کے لئے حلم کی تلوار زیادہ طاقتور ہوتی ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر اس وقت تیغ آہن سے کام لیتے تو زیادہ سے زیادہ اس گبر اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیتے، جن سے آپ کا مقابلہ ہوا لیکن آگے ان لوگوں کی اولاد کی اولاد پر تو اس ضربِ شمشیر کا اثر نہ ہوتا اور وہ بدستور کفر کی زندگی بسر کرتے لیکن تیغِ حلم کی یہ غیر محدود فتوحات ہیں کہ نہ صرف وہ خود مسلمان ہو گئے بلکہ ان کی اولاد قیامت تک حلقہ بگوشِ اسلام رہے گی ۔

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تَر   بل زصد لشکر ظفر انگیز تر

(واقعی) تیغِ آہنی سے حلم کی تلوار زیادہ تیز ہے بلکہ سینکڑوں لشکروں سے زیادہ موجبِ فتح و نصرت ہے۔ (۴۰۳/۱)

گفت من تخمِ جفا می کاشتم   من تُرا نوعے دِگر پنداشتم

کہنے لگا کہ میں (آپ کے خلاف) تخمِ جفا بوتا تھا، میرا تو آپ کے متعلق کچھ اور ہی خیال تھا۔ (۴۰۳/۱)

اس کافر نے کہا کہ میں اس غلطی پر تھا کہ آپ لوگ محض حصولِ دولت اور فتحِ ممالک کی غرض سے جنگ و جہاد کر رہے ہیں مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہے، جس کے انکشاف سے میں حیران رہ گیا ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ضبطِ نفس

مبارز کے سوال کا جو جواب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرما رہے ہیں، نیچے دیئے گئے شعر سے اصل جواب شروع ہوتا ہے۔ یہاں عِلّت کے لفظ سے اجمالاً اسبابِ عزم کا تعین کیا ہے۔ چونکہ ابو تراب کے نام میں جو ''تراب'' یعنی مٹی کا لفظ داخل ہے یہ اس لحاظ سے پُر لطف واقع ہوا ہے کہ مٹی سے بیل بوٹے اگتے ہیں اور پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی چیز کو خدا ہی کے حکم سے توڑ پھوڑ سکتے ہیں، یعنی قتلِ انسان صرف قصاص اور جہاد وغیرہ ہی میں رَوا ہے، جہاں یہ فعل حکمِ الٰہی کے ماتحت وقوع پاتا ہے۔ اس کافر کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جہاد کیا تو اس کو چت کر لیا، چونکہ اب جہاد کرنا ذاتی مفاد کی خاطر ہو گیا تھا کہ اس نے میرے چہرہ پر تھوکا ہے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اپنی ذات کی توہین دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا اور جذبۂ انتقام جوشِ زن ہو گیا جو اخلاص فی العمل کے منافی تھا۔

فرمایا روحِ کائنات ﷺ نے ''اَلْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ'' مطلب یہ ہے کہ محبت اور بغض خالصتاً اللہ کے لئے ہونا چاہیئے۔ اللہ کے لئے باہم معاونت کرنا، اللہ کے لیے محبت کرنا اور اللہ کے لئے کسی سے بغض رکھنا منشاء اسلام ہے۔ ہم غصے کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور طاقت ور شخص بھی وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، نہ کہ وہ شخص جو ہزار من کا پتھر اُٹھا لے۔ حدیثِ نبوی ﷺ میں ہے کہ ''کشتی گیری میں کمال رکھنے والا بہادر نہیں ہے بلکہ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔'' (احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۱۴۸)۔

خشم بر شاہاں شہ و مارا غلام   خشم را من بستہ ام زین و لگام

غصہ بادشاہوں پر حکمران ہے مگر ہمارا وہ غلام ہے، ہم نے غصے پر زین و لگام لگا رکھا ہے۔ (۳۸۶/۱)

گفت امیر المومنینؓ با آں جواں   کہ بہنگامِ نبرد اے پہلواں

چوں تو خیو انداختی بر روئے من   نفس جنبید و تبہ شد خوئے من

امیر المومنینؓ نے اس جوان سے فرمایا کہ اے پہلوان! جنگ کے وقت تُو نے جب میرے چہرے پر تھوک دیا تو میرا دل حرکتِ (غضبی) میں آ گیا اور میرا خُلق (حسن) بگڑنے لگا۔ (۴۰۲/۱)

تا اَحَبَّ لِلّٰهِ آید نامِ من   تاکہ اَبْغَض لِلّٰهِ آید کامِ من

تاکہ میرا خالصاً لوجہ اللہ محبت کرنے والا نام قرار پائے، میرا مقصود خاص اللہ کی رضا کے لئے دُشمنی کرنا ہو۔ (۳۸۶/۱)

تاکہ اَعْطیٰ لِلّٰهِ آید جُودِ من   تاکہ اَمْسَکَ لِلّٰهِ آید بُودِ من

تاکہ میری سخاوت اللہ کے لیے ہو جائے اور میری ہستی اللہ کے لیے روکنا ہو جائے۔ (۳۸۶/۱)

غرقِ نُورم گرچہ سقفم شُد خراب   روضہ گشتم گرچہ ہستم بُوتراب

میں (مرتبہ روح میں) سراپا غرق ہوں، اگرچہ ریاضت سے میرا جسم زار و نزار ہو گیا ہے، میں گلہائے معارف سے باغ ہو گیا ہوں، اگرچہ (نام) کی وجہ سے ابوتراب (کہلاتا) ہوں۔ (۳۸۶/۱)

جُز بیادِ اُو نجنبد مَیلِ من   نیست جُز عشقِ اَحد سرخیلِ من

(یعنی) اس کی ہوا کے بغیر میرا جھکاؤ نہیں ہوتا اور بجز عشقِ الٰہی کے میرا کوئی پیشرو نہیں۔ (۳۸۶/۱)

تیغِ حِلمم گردنِ خشمم زدست   خشمِ حق بر مَن ہمہ رحمت شد ست

میری تیغِ حلم نے میرے غصے کی گردن کاٹ ڈالی ہے (اور) خشمِ خداوندی (بھی) میرے حق میں سراپا رحمت بن گیا۔ (۳۸۶/۱)

چوُں در آمد علتے اندر غزا   تیغ را دیدم میاں کردن سزا

(میرے) جہاد میں جب ایک (نفسانی) عِلّت شامل ہونے لگی تو اس وقت میں نے تلوار کو میان میں ڈال لینا مناسب سمجھا۔ (۳۸۶/۱)

گبر ایں بشنید و نورے شُد پدید   در دلِ اُو تاکہ زنّارش برید

(اس) کافر (حریف) نے جو یہ بات سنی تو اس کے قلب میں نور (ایمان) ظاہر ہوا، جس سے اس نے اپنا زنارِ کفر توڑ ڈالا۔ (۴۰۳/۱)

نیم بہرِ حق شد و نیمے ہوا   شرکت اندر کارِ حق نبود رَوا

(پس میرا جہاد) کچھ تو اللہ کے واسطے رہ گیا اور کچھ (مقتضائے) خواہشِ نفسانی ہو گیا اور اللہ کے کام میں شرکت جائز نہیں۔ (۴۰۲/۱)

نقشِ حق را ہم بامرِ حق شکن   بر زُجاجہ دوست سنگِ دوست زن

(تو حق کا بنایا ہوا ہے) اور حق کے بنائے ہوئے نقش کو (اگر توڑنا چاہو) تو حق تعالیٰ ہی کے حکم سے توڑ سکتے ہو۔ (نہ کہ اپنے نفس کے حکم سے) دوست کے شیشے پر دوست ہی کا پتھر مارنا چاہیئے۔ (۴۰۲/۱)

بادِ کبرِ و باد عُجب و بادِ خلم   برد اُورا کہ نہ بُود از اہلِ علم

تکبر کی ہوا اور خود پسندی کی ہوا اور سُبک سری کی ہوا ایسے شخص کو ہلا ڈالتی ہے جو صاحبِ علم نہیں ہوتا۔ (۳۸۶/۱)

کوہم و ہستیِ من بنیادِ اُوست   وَر شوم چُوں کاہ بادم بادِ اُوست

میں حِلم و وقار میں گویا کوہ (پہاڑ) ہوں اور میرا وجود (حلم و وقار) کی اصل ہے، (اس لیے جنبش نہیں کرتا) اور اگر میں کاہ (تنکا) بن جاتا ہوں تو (بھی نفس کی تحریک مجھ پر موثر نہیں ہوتی بلکہ) میری (محرک) ہوا اللہ کے حکم کی ہوا سے (محکم) ہے۔ (۳۸۶/۱)

نفس کا علاج مجاہدات اور ترکِ لذات ہے

جس طرح مرغِ بے ہنگام کو اس کی بانگِ بے وقت کے باعث ذِبح کر دیا جاتا ہے، اسی طرح فرعون کے دعویٰ بے ہنگام نے اس کو غرقِ دریا کرایا۔ غرقِ فرعون سے یہ درسِ عبرت ملتا ہے کہ دعویٰ خدائی ایک ناقابلِ عفو جُرم ہے اور پھر عبرتِ عام کے لئے اس کی لاش کو دریائے نیل سے نکلوا کر ایک اونچے ٹیلے پر ڈال دیا گیا۔ اسی طرح نفس کو ذبح کرنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ نفس کو ریاضات و مجاہدات سے فنا کر سکتے ہیں تا کہ خود ہلاکتِ اَبدی سے بچ جائیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی اس کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (الفرقان ۶۳)

نفس کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے ''اَعدٰی عَدُوِّکَ نَفسُکَ الَّتِی بَینَ جَنبَیکَ'' یعنی تیرا بدترین دشمن تیرا نفس ہے، جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔ (احیاءعلوم الدین، ج۳، ص۴)

ہیں سگِ ایں نفسِ را زندہ مخواہ   کُو عدو جانِ تُست از دیر گاہ

خبردار! اپنے کتے نفس کی زندگی نہ بن جا کیونکہ وہ مدّت سے تمہاری جان کا دشمن ہے۔ (۵۷/۲)

سر بُریدن چیست؟ کُشتن نفس را   در جہاد و ترک گفتن لُمس را

(اب سوال پیدا ہوتا ہے) کہ نفس کو ذبح کرنے کی کیا تدبیر ہے، اس کو مغلوب کرنا ہے مجاہدات سے اور تمام لذّاتِ نفسانیہ کو ترک کر دینے سے، جن سے وہ طاقت پاتا ہے۔ (۲۴۱/۲)

روایات میں ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایک بار اپنے نفس کو مخاطب کر کے پوچھا کہ اے نفس! میں تجھے اس قدر لتاڑتا ہوں مگر تو پھر بھی اپنی سرکشی سے باز نہیں آتا۔ نفس نے کہا کہ ہم کو آپ سے کچھ یاقوتی مل جاتی ہے، ہم اس کی وجہ سے طاقتور بن جاتے ہیں۔ پوچھا، کون سی یاقوتی؟ کہا کہ بس یہی کہ جب آپ بازار میں جاتے ہیں تو لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آپ کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں تو اس میں ہمارا کام بن جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا! اچھا اب میں تمہارا علاج کرتا ہوں، ایک دن رمضان کے مہینے میں آپ نے سرِ بازار ایک روٹی کا ٹکڑا منہ میں چبانا شروع کیا تو لوگ باتیں بناتے ہوئے آپ سے متنفر ہو کر چلے گئے، حالانکہ آپ نے ٹکڑے کو کھایا نہیں،

فقط چبایا ہی تھا، اس طرح ان کے نفس کا علاج ہوا۔

اِبتداء میں ہی نفس کی خواہشات کو مار دو

نفس ہمیشہ انسان کو بُرائی پر آمادہ کرتا ہے، جب آدمی نفس کی ہر بات ماننے پر آمادہ رہتا ہے تو نفس کو ان باتوں کی عادت ہو جاتی ہے، پھر خود بخود اس کے دل میں اس قسم کی بُری خواہشات پیدا ہونے لگتی ہیں، جن میں بَدنظری، شوقِ زنا، ظلم، ایذائے خلق، حرصِ طعام، خواہشِ ترفع و افتخار وغیرہ ہزاروں بُرائیاں ہیں۔ جب کوئی ناصح ان بُرائیوں سے اس کو منع کرتا ہے تو اس کو بُرا معلوم ہوتا ہے اور کسی کی اتباع اس کو پسند نہیں آتی۔ یہی تکبر ہے اور اسی سے ناصح و مانع سے بُغض پیدا ہوتا ہے۔ جب عادت کی وجہ سے کوئی بُری خصلت پختہ ہو جائے تو جو شخص تم کو اس سے منع کرے اس پر تم کو غصہ آتا ہے۔

اِبتدائے کبر و کیں از شہوت ست　　　　راسخیء شہوتت از عادت ست

تکبر اور بغض کی اِبتداء خواہشِ نفسانی سے ہے اور تیری خواہشِ نفسانی کی پختگی (اتباعِ نفس کی) عادت سے ہے۔ (۳۲۴/۲)

زانکہ خُوئے بد بگشتت استوار　　　　مورِ شہوت شُد زعادت ہمچو مار

کیونکہ بُری خصلت تم میں محکم ہو چکی ہے، خواہشاتِ نفسانیہ کی یہ چیونٹی عادت کی وجہ سے سانپ بن گئی ہے۔ (۳۲۵/۲)

مارِ شہوت را بکُش در ابتداء　　　　ورنہ اینک گشتہ مارت اژدہا

اب بھی ہمت کرو اور خواہشاتِ نفسانیہ کے (اس) سانپ کو شروع ہی میں مار ڈالو، ورنہ دیکھنا تمہارا یہ سانپ اژدہا بن جائے گا۔ (۳۲۶/۲)

مادرِ بُتہا بُتِ نفسِ شُما ست　　　　زانکہ آں بُت مار و ایں بت اژدہا ست

تمہارا بُتِ نفس (سارے) بتوں کی ماں ہے کیونکہ وہ بُت سانپ ہے اور یہ اژدہا ہے۔ (۱۰۶/۱)

نفس میخواہد کہ تا ویراں کند

(نفس دینی بنیاد کو ویران کرنا چاہتا ہے)

نفس ہمارا چھپا دُشمن ہے، پس دُشمن کے مشورے پر کیوں کر عمل کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے خلاف چلنا چاہیئے، ہرچند کہ نفس کا مشورہ قابلِ عمل نہیں مگر وہ بھی فائدے سے خالی نہیں کیونکہ جب اس کے مشورہ کا اُلٹ کرنا مفید ہے تو اس طریقہ سے فائدہ کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے، بخلاف اس کے اگر نفس کا مشورہ نہ ہوتا تو تذبذب رہتا کہ یہ کام کریں یا نہ کریں۔ جب نفس مشورہ دیتا ہے تو اس کی مخالف جہت عمل کے لئے متعین ہو جاتی ہے اور تذبذب رفع

ہو جاتا ہے۔

نفسِ امارہ ہمیشہ بُرائی کی طرف مائل رہتا ہے۔ طاعات و عبادات میں اگر چہ یہاں مشقت ہے لیکن آخرت میں اجر و ثواب متوقع ہوتا ہے، اس لیے نفس اس کو ہرگز گوارا نہیں کرے گا بلکہ ان کو چھوڑ دینے کا مشورہ ہی دے گا، لہٰذا اس کی بات مت سنو۔ (شیخ سعدیؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ نفسِ امارہ جو کہے تم اس کے خلاف کرو، کیونکہ دنیا میں پیغمبروں سے اسی طرح وصیت آئی ہے، دیکھو وصیت کے مطابق معاملات میں مشورہ کرنا واجب ہوتا ہے تاکہ بلامشورہ کام کرنے سے آخر میں پشیمانی نہ ہو۔ نفس جو کچھ کہتا ہے بطور مشورہ کہتا ہے اور مشورہ سننے اور ماننے کا تو بے شک حکم ہے اور مشورہ کرنا واجب ہے مگر نفس کا مشورہ قابلِ عمل نہیں بلکہ لائقِ مخالفت ہے) ؎

آنچہ گوید نفسِ تو کاینجا بدست　　　مشنوش چوں کارِ او ضد آمدست

جو کچھ تمہارا نفس کہے کہ یہاں (یہ کام) بُرا ہے تو اس کی مت سنو کیونکہ اس کا کام (مصلحت کے) خلاف ہے۔ (۲/۲۱۹)

نفس میخواہد کہ تا ویراں کند　　　خلق را گمراہ و سرگرداں کند

کم بخت نفس (باغوائے شیطان) چاہتا ہے کہ (اس دینی بنیاد کو) تباہ کر دے (اور) مخلوق کو گمراہ اور سرگرداں کر دے۔ (۲/۲۱۹)

مشورت با نفسِ خویش اندر فعال　　　ہر چہ گوید عکسِ آں باشد کمال

مشورہ نفس کے ساتھ (ہر قسم کے) کاموں میں (کر سکتے ہو مگر) جو کچھ وہ کہے اس کے خلاف (کرنا شرطِ) کمال ہے۔ (۲/۲۱۹)

رُوح در عین است و نفس اندر دلیل

(رُوح مشاہدہ میں ہے اور نفس دلیلوں میں ہے)

کافر بادشاہ (نمرود) آگ سے مخاطب ہوا اور بولا کہ اے تُندخُو! تیری وہ جہان کو جلا دینے والی خصلت کہاں گئی، تُو کیوں نہیں جلاتی؟ تُو اپنی پرستش کرنے والے پر بھی رحم نہیں کرتی، پھر وہ شخص تجھ سے کیونکر نجات پا گیا جو تجھ کو پوجتا بھی نہیں؟ کسی چیز کے جلانے پر تُو قادر ہے، تجھ پر کس نے جادو کر دیا ہے کہ تیرا اتنا بلند شعلہ جلاتا کیوں نہیں؟

آگ بولی: میں وہی آگ ہوں، تُو ذرا اندر تو آ تاکہ میری تپش کا مزہ چکھ لے۔ میں خدائی تلوار ہوں اور اس کی اجازت ہی سے کاٹتی ہوں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ خیمے پر تیر کمان والے لوگوں کے کتے مہمان کے آگے تو خوشامد کرتے اور دُم ہلاتے ہیں اور اگر خیمے کے پاس سے کوئی اجنبی صورت کا آدمی گزرتا ہے تو کتوں کو شیر کی طرح حملہ آور پاتا ہے۔ میں خدا کی غلامی میں کتے سے کم نہیں ہوں۔ مجھ پر زندگی میں ایک ترک سے کم خدا کا حق نہیں

جو وہ کتے پر رکھتا ہے۔ انسان کے جذباتِ طبع بھی جو باطنی آگ ہیں، اسی کے حکم کے تابع ہیں اور انسان کو کبھی مغموم اور کبھی مسرور اسی کے حکم سے بناتے ہیں۔

چوں سزائے آں بُتِ نفس او نداد　　　از بُتِ نفسش بتے دیگر بزاد

چونکہ اس (بادشاہ) نے (اپنے) اس بت یعنی نفس کو سزا دی تھی (اس لیے) اس کے نفس کے بت سے ایک اور بت پیدا ہو گیا۔ (۱/۱۰۶)

طبع من دیگر نگشت و عُنصُرم　　　تیغِ حقم ہم بدستوری بُرم

میری طبیعت اور میری اصل نہیں بدلی، میں خدائی تلوار ہوں، (لیکن) اجازت ہی سے کاٹتی ہوں۔ (۱/۱۱۲)

نفس نمرود ست و عقل و جاں خلیلؑ　　　روح در عین ست و نفس اندر دلیل

نفس نمرود ہے اور عقل اور روح (بمنزلہ) خلیل اللہ ہیں، (ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ) روح مشاہدہ (حق) میں (مستغرق) ہے اور نفس استدلال (کے چکر) میں (سرگرداں) ہے۔ (۲/۳۱۱)

نار پاکاں را ندارد خود زیاں　　　کے زخاشاکے شود دریا نہاں

پاک لوگوں کو آگ نقصان نہیں پہنچا سکتی، (دیکھو) دریا کوڑے کرکٹ میں کب چھپ سکتا ہے؟ (۱/۳۷۷)

تاز نارِ نفس چوں نمرودِ تو　　　وا رہد ایں جسم ہمچوں عُودِ تو

تاکہ تیرے اس نمرود (سرکش) نفس کی آگ سے تیرا یہ لکڑی کا جسم نجات پائے۔ (۱/۳۷۶)

چہ کشد ایں نار را نورِ خدا　　　نورِ ابراہیم را ساز اُوستا

اس آگ کو کیا چیز بجھا سکتی ہے، نورِ عشق الٰہی بجھا سکتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ (یعنی مرشدِ کامل) کے نور کو استاد بنا لو (پھر وہ نور حاصل ہو جائے گا)۔ (۱/۳۷۶)

نفس مکّار است مکرے زایدت

(نفس مکّار ہے، نماز کا حکم دے تو بھی مکّار ہے)

جس چیز کی سرشت بُری ہو اس سے اگر کوئی اچھی بات بھی سرزد ہو جائے تو احتمال ہے کہ اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی بُرائی ہوگی، جس طرح حضرت معاویہؓ کے متعلق منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کو صبح کی نماز میں دیر ہوگئی۔ شیطان آ کر ان کے پاؤں دبانے لگا تاکہ جاگ کر نماز پڑھ لیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کی آنکھ کھلی تو حیران ہوئے کہ ہائے شیطان! اور نماز کے لئے جگائے؟ شیطان بولا میرا مقصد آپ کو نماز کے لئے جگانا نہیں بلکہ آپ کو اس تضرع و ابتہال اور رجوع انابت سے باز رکھنا مقصود ہے، جو آپ سے نماز کے قضا ہو جانے کی صورت میں وقوع پاتی ہے اور اس سے آپ کے مدارجِ قرب میں اور ترقی ہوتی ہے، جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ مولاناؒ کے بہت

سے اشعار ہیں مگر یہاں دو پر اکتفا کیا گیا ہے ؎

نفس خود را زن شناس از زن بتر　　زانکہ زن جزو ست نفست کُلِّ شر

اپنے نفس کو (بھی) عورت سمجھو (بلکہ) عورت سے بھی بدتر ہے کیونکہ عورت (میں) تو (شر کا) ایک حصہ ہے اور نفس سراپا شر ہے۔ (۲/۲۱۹)

گر نماز و روزہ می فرمایدت　　نفس مکارست مکرے زایدت

اگر تجھ کو نماز و روزہ کی ترغیب دے تو بھی (یاد رکھو) نفس مکار ہے تم سے کوئی نہ کوئی مکر کھیل رہا ہے۔ (۲/۲۱۹)

نار شہوت را چہ چارہ نورِ دیں
(شہوت کی آگ دین کے نور سے بجھتی ہے)

یہ اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ "جُزْ یَا مُؤمِنُ فَقَدْ اَطْفَاءَ نُوْرُکَ لَھَبِیْ" یعنی اے مومن! جلدی آگے گزر جا کیونکہ تیرے نور سے میری آگ بجھ جائے گی۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تحقیق نہیں۔ نورِ دین سے نورِ معرفت مراد ہے جو ریاضتِ مجاہدات اور مراقبات سے باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

نار شہوت راچہ چارہَ نورِ دین　　نُوْرُکُمْ اِطْفَآءُ نَارِ الْکٰفِرِیْنَ

(اچھا تو) اس آتشِ شہوت کا علاج کیا ہے۔ (اس کا علاج) دین کا نُور ہے (جیسے کہ) تمہارا نورِ (ایمان) کافروں کی آگ (یعنی آتشِ دوزخ) کو تم پر ٹھنڈا کر دے گا۔ (۱/۳۷۶)

ہر کہ تریاقِ خُدائے را بخورد　　گر خورد زہرے مگویش کو بُمرد

جس نے خدائی تریاق کھا لیا اگر وہ زہر بھی کھائے گا تو اس کو یہ نہ کہو کہ مر گیا۔ (۱/۳۷۷)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مضر اشیاء کا استعمال اور مباحات میں توسیع کاملین کو مضر نہیں، ناقصین کے لئے موجبِ ضرر ہے۔

خود بینی کا انجام موت ہے

مولانا رومیؒ نے بڑے احسن انداز میں خود بینی نہ کرنے کی نصیحت فرماتے ہوئے ایک حکایت بیان کی ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن شیر، بھیڑیا اور لومڑی اکٹھے تھے کہ ان کو شکار میں تین جانور مل گئے۔ ایک وحشی گائے، ایک بکری اور ایک خرگوش۔ شیر نے کہا: اے بھیڑیے اب تُو تقسیم کر، جب بھیڑیا تقسیم کرنے لگا تو اس نے وحشی گائے کے متعلق شیر سے کہا کہ بادشاہ سلامت یہ آپ کی ہے کیونکہ آپ بڑے ہیں، بکری میری ہے کیونکہ میں آپ سے چھوٹا ہوں اور لومڑی سے بڑا ہوں اور خرگوش لومڑی کے لئے ہے کیونکہ وہ سب سے چھوٹی ہے۔ جب شیر

نے دیکھا کہ بھیڑیا اکڑنے لگا اور تُو تُو میں میں کر رہا ہے تو اس نے کہا: اے گستاخ! تُو میرے سامنے اپنی ہستی کا اظہار کر رہا ہے، تو کون ہے جو میرے آگے خود بینی کرتا ہے؟ آگے بڑھ تاکہ میں تجھے سبق سکھاؤں۔ بھیڑیا آگے بڑھا تو شیر نے اسے پنجہ مار کر پھاڑ ڈالا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ خود بینی کا نتیجہ کیا نکلا؟ موت! آپ فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنے نفس پر کنٹرول نہیں کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بھی اس بھیڑیے جیسا ہی ہوگا، لہٰذا اس انجام سے پہلے اپنے نفس پر کنٹرول کرو اور خود بینی سے بچو۔ مولانا رومؒ کے شیر اور بھیڑیے کے متعلق چند اشعار ہیں، جو نیچے دیئے جا رہے ہیں۔

گفت پیش آ اے خرے کو خود خرید

(کہا، اے گدھے تُو جو خود بینی کرتا ہے! ذرا سامنے آ)

مولاناؒ ایک شیر، بھیڑیے اور لومڑی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ شیر نے شکار مارا اور بھیڑیے کو کہا کہ تم اس شکار کے حصے کر دو۔ بھیڑیے نے وحشی گائے کو شیر کے حصے میں جانے کو کہا اور بکری خود اپنے لیے منتخب کر لی اور لومڑی کو خرگوش دے دیا۔ جب شیر نے اس کی نیتِ بد کو بھانپ لیا تو بھیڑیا شیر سے بحث کرنے لگا، جس پر شیر کو غصہ آ گیا۔ مطلب یہ کہ نفس بھی انسان سے بحث کرتا ہے اور اس کو غلط بات کی طرف لے آتا ہے۔ اس بحث کی وجہ سے شیر نے بھیڑیے کو پنجہ مار کر ختم کر دیا۔

گفت شیر اے گرگ ایں را بخش کن   معدلت را نو کن اے گرگِ کہن

شیر نے کہا: اے بھیڑیے! اسے تقسیم کر، اے خرانٹ بھیڑیے! انصاف (کی رسم) تازہ کر۔ (۳۱۸/۱)

نائبِ من باش در قسمت گری   تا پدید آید کہ توچہ گوہری

تقسیم کرنے میں میرا قائم مقام بن جا تاکہ معلوم ہو جائے کہ تو کیسی اصل و نسل سے ہے۔ (۳۱۸/۱)

گفت اے شہ گاوِ وحشی بخشِ تست   آں بزرگ و تو بزرگ و زفت و چُست

بھیڑیے نے عرض کیا، حضور! گاوِ وحشی تو آپ کا حصہ ہے کیونکہ یہ بڑا مال ہے اور آپ بھی (ماشاء اللہ) بزرگ، عظیم اور شہ زور ہیں۔ (۳۱۸/۱)

بُز مَرا کہ بز میانہ است و وسط   رُوبہا! خرگوش بستاں بے غلط

بکری میری ہے کیونکہ بکری درمیانہ اور اوسط درجے کی ہے۔ اری لومڑی! خرگوش تو لے لے، ان کی تقسیم میں کوئی غلطی (کا احتمال) نہیں۔ (۳۱۸/۱)

شیر گفت اے گرگ چوں گفتی بگو   چونکہ من باشم تو گوئی ما و تو

شیر نے (غضبناک ہو کر) کہا، ارے بھیڑیے! ہماری موجودگی میں تُو تُو میں میں کیا بک رہا ہے، ان کا جواب دے؟ (۳۱۸/۱)

گرگ خود چہ سگ بود کو خویش دید　　　پیش چوں من شیر بے مثل و ندید

بھیڑیا کون کتا ہے جو خود کو دیکھے اور مجھ جیسے بے مثل و بے نظیر شیر کے آگے خود بینی کرے۔ (۳۱۸/۱)

گفت پیش آ اے خرے گو خود خرید　　　پیشش آمد پنجہء زد اورا درید

پھر کہا! ارے بے وقوف گدھے تو جو خود بینی کرتا ہے ذرا آگے ہو (بھیڑیا) اس کے پاس جو ہوا تو شیر نے پنجہ مار کر اس کو چیر ڈالا۔ (۳۱۸/۱)

معجزہ بیند فروزد آں زماں

(نفس معجزہ دیکھ کر مان جاتا ہے اور پھر اسے وہم قرار دیتا ہے)

نفس کمینہ کہتا ہے کہ معجزہ تو ایک خیالی و وہمی امر ہے، حقیقی اور واقع فی الخارج نہیں ہے۔ اگر اس میں واقعیت ہوتی تو اس کو ضرور بقا ہوتی اور اس کا وجود اب بھی اسی طرح ہماری نظر میں ہوتا مگر احمق اتنا نہیں سمجھتا کہ معجزات تو وقتی ہوتے ہیں۔ جب طلب کئے گئے تو ان کا ظہور ہوا، پھر ختم ہو جاتے ہیں، جیسے شق القمر کا معجزہ کہ جب کفار نے شق القمر کی استدعا کی تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ جن کو انھوں نے بچشم خود دیکھا، پس مدعا پورا ہوا اور دونوں ٹکڑے باہم ہو گئے۔ سوفسطائی کی طرح نفس بھی کہتا ہے کہ اگر فی الواقع دو ٹکڑے ہوئے تھے تو وہ اسی طرح دو ہی قائم رہتے، پھر ان کے باہم مل جانے اور اصلی حالت پر آ جانے سے معلوم ہوا کہ وہ جدا ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ ایک محض خیال ہے۔ نہیں، یہ خیال نہ تھا بلکہ وہ ایک امرِ واقعی ہے اور ہر وقت دکھائی دیتا ہے مگر پاک لوگوں کی نگاہ میں بسا ہوا ہے، انھی کو دکھائی دیتا ہے۔ حیوان لا یعقل مثل سوفسطائی کی آنکھ میں بسا ہوا نہیں۔

وَر حقیقت بُود آں دید عجب　　　چُوں مقیمِ چشم نامد روز و شب

اور اگر وہ عجیب نظارہ (واقعی اور) حقیقی ہوتا تو پھر رات دن اسی طرح برابر آنکھ میں سمایا رہتا، یعنی آنکھ اس کو دیکھتی رہتی اور وہ غائب نہ ہوتا۔ (۳۲۸/۲)

معجزہ بیند فروزد آں زماں　　　بعد ازاں گوید خیالے بُود آں

(نفس) معجزہ کو دیکھتا ہے تو اس وقت تو (نورِ اعتراف سے) منور ہو جاتا ہے (مگر) اس کے بعد (جب اپنی جبلت پر آ جاتا ہے تو) کہنے لگتا ہے وہ تو (محض) ایک خیال تھا۔ (۳۲۸/۲)

نفس سوفسطائیوں کا چیلہ ہے، زَد و کوب کے بغیر صحیح نہیں ہوگا

یہ حضرات جو عقل شریف کے مالک ہیں وہ سراپا عقل ہیں اور نفس سے منزہ ہیں۔ حواسِ ظاہری کے مقتضیات سے بے نیاز اور انوارِ رُوحانیہ سے نُورٌ علیٰ نُور ہیں پھر ان پر تہمت کیسی؟ کیونکہ تہمت تو بندۂ نفس اور پابندِ حواس پر ہی لگائی جا سکتی ہے۔ جس طرح علمائے کرام کے نزدیک سوفسطائیہ کا علاج زدو کوب اور خرق و غرق کے سوا اور کچھ

نہیں۔ ڈنڈا پیر اور اگنی دیوی اپنی حقیقتیں بآسانی منوا سکتے ہیں۔ اسی طرح نفس بھی سوفسطائیوں کا چیلہ ہے۔ یہ لاتوں کا بھوت باتوں سے ماننے والا نہیں، لہٰذا یہ بھی سزا کا مستوجب ہے اور جس کی صورت ریاضت و مجاہدات ہے۔ سوفسطائی فرقہ سوفسطائیہ سے منسوب فلاسفہ کا ایک توہم پرست فرقہ ہے، وہ حقائقِ اشیاء کا منکر ہے ؎

مُتَّہم نفس ست نے عقلِ شریف　　　مُتَّہم حِس ست نے نُورِ لطیف

تُہمت نفس پر ہے، نہ کہ عقل شریف پر (اور) تہمت حِس (ظاہری) پر ہے، نہ کہ (روح کے) پاکیزہ نُور پر۔ (۳۲۸/۲)

نفسِ سو فسطائی آمد میزنش　　　کِش زدن سازد نہ حجت گفتنش

نفس (بھی) سوفسطائی (فرقہ والوں کی طرح حقائق کا منکر اور اپنے شک کا مقلد) ہے، لہٰذا اس کو (خوب) پیٹو کیونکہ اس کے لیے مار پیٹ سازگار ہے، نہ کہ اس کے آگے دلیل پیش کرنا۔ (۳۲۸/۲)

اگر نفس کی تصویر دیکھنا چاہو تو دوزخ کا حال پڑھ لو

دوزخ کے سات دروازے اس کے شرور و آفات کی کثرت پر دال ہیں۔ اسی طرح نفس بھی مجمعٔ شرور و مفاسد ہے بلکہ دوزخ کے شرور نفس کے شرور کے نتائج ہیں۔ پتھر اور لوہا اپنی ذات کے اندر آگ رکھتے ہیں۔ ان کی آگ پر پانی کا گزر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح نفس کے رذائل مخفی ہیں اور وہ سرسری تدابیر سے زائل نہیں ہو سکتے۔ باہر کی آگ تو نہر کے پانی سے بجھ سکتی ہے مگر وہ پانی پتھر اور لوہے کے اندر کیونکر جائے۔ جس طرح شرارے کی حرارت ظاہری ہے، اس لیے وہ پانی سے ساکن ہوسکتی ہے اور سنگ و آہن کا مادہ ناریہ ہے، جو اس کی ذات میں ہے لیکن اسے پانی سے ساکن نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح بت کا شر اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں بلکہ بت پرست کے فعل پر موقوف ہے اور نفس کا شر اس کی ذات میں ہے ؎

صُورتِ نفس ار بجوئی اے پسر　　　قصہء دوزخ بخواں با ہفت دَر

بیٹا! اگر نفس کی تصویر (دیکھنی) چاہو تو دوزخ کا حال پڑھ لو جس کے سات دروازے ہیں۔ (۱۰۷/۱)

آہن وسنگ ست نفس و بت شرار　　　آں شرار از آب می گیرد قرار

سنگ و آہن زآب کے ساکن شود　　　آدمی با ایں دو کے ایمن شود

نفس (تو گویا) لوہا اور پتھر ہے (جن کے باہم ٹکرانے سے آگ جھڑتی ہے) اور بت (ان سے جھڑنے والی) چنگاری ہے۔ وہ چنگاری تو پانی سے بجھ سکتی ہے (مگر) پتھر اور لوہا پانی سے کب سکون پاتے ہیں اور (اگر ان کو پانی سے تر بھی کیا جائے تو) آدمی ان دونوں کے ہوتے ہوئے کب مطمئن ہوسکتا ہے (کہ یہ ٹکرائیں اور آگ نہ نکلے) (۱۰۶/۱)

پیشِ حق آتش ہمیشہ در قیام
(اللہ کے حضور آگ بھی عاشق کی طرح حاضر رہتی ہے)

لوہے اور پتھر کو ایک دوسرے سے نہ ٹکراؤ کیونکہ یہ دونوں مرد و زن کی طرح باہم مقرون ہو کر نتائج بد کا بچہ جنتے ہیں۔ سنگ و آہن کے ذکر میں ضمناً مولاناؒ یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ کسی پر ظلم نہ کرو، اس سے بہت بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ظلم سے نتائج بَد پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک گناہ کی وجہ سے ظالم کے سر پر اور بہت سے گناہوں کا بوجھ آن پڑتا ہے۔ بے شک لوہا اور پتھر آگ کا سبب ہیں کیونکہ اس سبب کو بھی اسی مسبب نے مہیا کیا ہے۔ کوئی مسبب بھلا آپ سے آپ سبب کب بن سکتا ہے؟ تمام موجوداتِ حادثہ کا وجود اسباب و علل کے سلسلہ سے وابستہ ہے کیونکہ ہر حادث کے لئے کسی محدث کا ہونا لازم ہے جو اس کا سبب ہے۔ کبھی اس سبب کا بھی کوئی اور سبب ہوتا ہے، اسی طرح دور تک سلسلہ چلا جاتا ہے اور اس سلسلۂ اسباب کی انتہا کسی مسبب الاسباب قدیم تک ہونی ضروری ہے تاکہ تسلسل لازم نہ آئے جو باطل ہے اور وہ سببِ قدیم اسماء و صفات الٰہیہ ہیں، جن سے عالم میں حوادث پیدا ہوتے ہیں ؎

پیش حق آتِش ہمیشہ در قیام　　ہمچو عاشق روز و شب بے جاں مُدام

حق تعالیٰ کے حضور میں آگ ہمیشہ رات دن ایک عاشقِ ہیجان کی طرح (خدمت و اطاعت کے لیے حاضر) کھڑی رہتی ہے۔ (۱۱۲/۱)

سنگ بر آہن زنی آتِش جہد　　ہم بأمرِ حق قدم بیروں نہد

تم لوہے پر پتھر مارتے ہو تو (اس سے) آگ نکلتی ہے، (یہ) بھی خدا کے حکم سے نکلتی ہے۔ (۱۱۲/۱)

کسی صاحبِ دل سے اپنے نفس کی اِصلاح کراؤ

انسان کو اپنا آپ محبوب ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے اخلاقی مصائب کو جان نہیں سکتا۔ آنکھ خود اپنے عیب کو نہیں دیکھ سکتی، لہٰذا یہ مشکل یوں رفع ہو سکتی ہے کہ اپنی تفتیشِ عیوب کا کام کسی صاحبِ دل کے سپرد کر دو، وہی ان کی اِصلاح بھی کر دے گا ؎

لیک ہر کس مُور بیند مارِ خویش　　تو زصاحِبدل کُن استفسار خویش

لیکن (مشکل یہ ہے کہ) ہر شخص اپنے (خصائل کے) سانپ کو چیونٹی جیسا دیکھتا ہے (پس اس مشکل کا حل یہ ہے کہ) تم (کسی) صاحبِ دل سے اپنے (باطنی حال کے) متعلق سوال کرو۔ (۳۲۶/۲)

تا نہ شُد زر مس نداند مَن مسِم　　تا نہ شُد شہ دل نداند مُفلِسم

تانبا جب تک سونا نہ بن جائے وہ نہیں جانتا کہ میں تانبا ہوں، (اسی طرح) دل جب تک بادشاہ نہ بن جائے وہ

نہیں سمجھتا کہ میں مفلس ہوں۔ (۳۲۶/۲)

نفس چوں با شیخ بیند گامِ تو　　از بُنِ دنداں شود اُو رامِ تو

نفس جب تیرا قدم شیخ کے ساتھ دیکھے گا تو مجبوراً تیرا فرمانبردار ہو جائے گا۔ (۲۴۶/۳)

نفس عقلِ ناقص کو مغلوب کر دیتا ہے

خواہشاتِ نفسانی کے غلبہ میں عقل سے کام ہی نہیں لیا جاتا۔ خود عقل ناقص میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ نفس کے معاملات میں دخل دے کر اس کے مفاسد کے تار و پور کو بکھیر دے۔ اگر اس کمزور عقل کی کوئی دھیمی آواز مبتلائے نفس انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور راہِ ثواب کی طرف مائل کرتی ہے تو مصاحبِ بد کی صحبت کا بد اثر پھر اس کو ہوائے نفسانی کے اتّباع پر مائل اور عقل کی آواز کو مغلوب کر دیتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

نفس چوں با نفس دیگر یار شد　　عقل جزوی عاطل و بیکار شُد

ایک نفس (بَد) جب دوسرے نفس (بَد) کے ساتھ مل جاتا ہے۔ تو (جس شخص کی) عقل ناقص ہوتی ہے، بے کار اور نکمّی ہو جاتی ہے (اس کو بُرے نتائج پر تنبیہ نہیں کر سکتی)۔

اپنی نگاہوں کو شہوات سے بچانے کے لیے بند رکھو

نیچے دیئے گئے شعر کے دوسرے مصرعے میں سورۂ نور کی اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اے پیغمبر ﷺ مسلمانوں سے کہو کہ اپنی آنکھوں کو (نامحرم عورتوں کو دیکھنے سے) بند رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کو بَدکاری سے محفوظ رکھیں۔ یہ ان کے لیے بہت پاکیزہ بات ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ خوب جانتا ہے۔" (دیکھیں سورۂ النور آیت ۳۰) مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اپنے قوائے مدرکہ کو حفظ و ضبط میں رکھو اور ان کو ادراکاتِ فاحشہ کی طرف ملتفت نہ ہونے دو۔ آنکھ جو جسم کے سوراخوں میں سے ایک سوراخ ہے اس کو بند رکھو کہ دل کی خرابی اس راستے سے آتی ہے۔

لو لہا بر بند و پُر دارش زخُم　　گفت غُضُوا عَنْ هَوَىٰ اَبْصَارَکُمْ

(اس کی) ٹونٹیاں (شہوات سے روک کر) بند کر دو اور ان کو خم (مٹکے کے پانی) سے پُر رکھو (قرآن مجید) میں اللہ نے فرمایا "یَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِکُمْ"، جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی نگاہوں کو شہوات سے بند رکھو۔ (النور:۳۰)

آگ، مٹی، پانی اور ہوا سب اللہ کے غلام ہیں
(ہمارے لیے وہ مُردہ ہیں لیکن اللہ کے لیے زندہ ہیں)

ہوا، مٹی، پانی اور آگ اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلتے ہیں۔ ان میں بھی ادراک اور حس ہے، اگرچہ ہم کو ان کا

مدرک ہونا معلوم نہیں ہوتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے محدود و ناقص علم کی بناء پر چند خاص اوصاف کو آثارِ حیات سمجھ رکھا ہے۔ جن اشیاء میں وہ آثار ہم کو نظر آتے ہیں، ان کو زندہ سمجھتے ہیں اور جن میں نہیں، ان کو بے جان تصور کرتے ہیں، حالانکہ اللہ کا علم اور قدرت ہماری معلومات سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جن چیزوں کو ہم بے جان سمجھتے ہیں اللہ کے علم و قدرت میں وہ زندہ ہیں۔ اللہ فرماتا ہے ''بے شک پتھروں میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف کے مارے گر پڑتے ہیں۔'' (البقرة:۷۴) سورہ الحشر کی آیت نمبر ۲۱ میں وارد ہے ''اگر ہم قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو اللہ کے خوف سے ڈرتا اور پاش پاش ہوتا دیکھتے۔'' حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے سامنے کوہِ اُحد نمودار ہوا تو فرمایا ''یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔'' (مشکوٰۃ رقم الحدیث ۲۷۴۵) قرآن و حدیث کے علاوہ اہلِ کشف کے نزدیک بھی جمادات کا زندہ ہونا مسلمہ ہے۔ صرف اہلِ فلسفہ اس کے منکر ہیں۔

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند بامن و تو مُردہ با حق زِندہ اند

ہوا، مٹی، پانی اور آگ (خدا کے) غلام ہیں، (گو) یہ ہمارے تمہارے آگے بے جان ہیں مگر اللہ کے آگے زندہ ہیں۔ (۱/۱۱۲)

کسبِ فانی خواہدت ایں نفسِ خس
(نفس فانی چیزوں کی تاک میں رہتا ہے)

نفس ہمیشہ ذلیل و ناشائستہ مشاغل کی ترغیب دیتا ہے، پس ایسے مشاغل کو ترک کرتے رہو۔ نفس اگر کسی اچھے شغل کی ترغیب دے تو اس سے دھوکا نہ کھانا، اس میں بھی اس کا کوئی نہ کوئی فریب ہوتا ہے۔ نفس دُنیا کمانے پر مر مٹ رہا ہے جو کہ فانی ہے، حقیر ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دُنیا کی قدر اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس سے ایک گھونٹ بھی نہ پینے دیتا (رقم الحدیث ۵۱۷۷، احیاء علوم الدین، ج۳، ص۱۸۱)۔ فرمایا کہ ''جس نے اپنی دُنیا کو محبوب رکھا اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا اور جس نے اپنی آخرت کو محبوب رکھا اس نے اپنی دُنیا کو نقصان پہنچایا۔ پس تم باقی کو فانی پر ترجیح دو۔'' (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۱۸۱)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شیطان کی ایک حکایت بیان فرماتے ہیں کہ شیطان نے آکر ان کو جگایا کہ اُٹھ کر نماز پڑھ لیجیے۔ انہوں نے کہا، سچ بتا تو نے طاعت کی ترغیب کیوں دی تیرا شیوہ یہ نہیں ہے۔ پہلے تو اس نے بہت کچھ ٹال مٹول کی مگر چونکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کامل تھے اس کے پھندے میں نہ آئے۔ آخر اس نے اپنے مکر کا اقرار کیا۔ نفس کا ایک مکر ہوتا ہے۔ نفس اگر روزہ نماز کی ترغیب دے تو اس کا اصل مقصد نماز و روزہ کی تعلیم نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ نفسِ مطمئنہ نہ بن جائے۔ اس عبادت سے سالک کے اندر غفلت اور غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو

ریاضات و مجاہدات کی وجہ سے خود بے نیاز سمجھنے لگتا ہے جب یہ چیزیں پیدا ہو جائیں تو گرفتارِ معاصی کر دینا نفس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ یاد رکھو کہ نفس مکار ہوتا ہے، جو فیصلہ کرو اس ذلیل کمینے کے خلاف کرو۔ اَرے نفس! تُو نے ہزاروں سوئے ہوئے فتنے جگائے ہیں، نمرود کا بھیجا بھی تیرے ہی سبب نکلا، تیری وجہ سے فرعون سا ہوشیار حکیم بھی عقل کا اندھا ہو گیا اور خدا کی شناخت سے بہرہ مند نہ ہوا۔

کسبِ فانی خواہدات ایں نفسِ خس — چند کسبِ خس کُنی بگذار و بس

تیرا یہ کمینہ نفس فنا ہو جانے والی کمائی کرنا چاہتا ہے، اس کو چھوڑ دو، کب تک یہ ذلیل کمائی کرتے رہو گے۔ (۲/۲۴۸)

خلق اطفالند جز مستِ خدا

(مخلوق سب سوائے مستِ الٰہی کے گویا بچے ہیں)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ تمام مخلوق بچے ہیں، یعنی بالغ نہیں ہیں۔ آپ نے تمام مخلوق میں سے مجذوب لوگوں اور محبوبانِ الٰہی (بندگانِ الٰہی) کو اس بات سے نکال دیا ہے، یعنی ان لوگوں کے علاوہ سب لوگ بچے ہیں۔ بالغ لوگ وہی ہیں جو نفسانی خواہشات سے جان چھڑا چکے ہیں۔ جو آدمی بالغ بننا چاہے یا اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے، اس لئے اس کو چاہیے کہ نفسانی خواہشات پر کنٹرول کرے، اگر اس نے خواہشاتِ نفس پر کنٹرول کر لیا تو وہ بھی بالغ لوگوں میں شامل ہو گیا۔

خلق اَطفال اند جُز مستِ خُدا — نیست بالغ جُز رہیدہ از ہَوا

مخلوق سب سوائے مستِ الٰہی کے گویا بچے ہیں، پس بالغ وہی ہے جو خواہشاتِ نفسانیہ سے چُھوٹ گیا۔ (۱/۳۵۳)

پچیسواں باب

ادب سے نفس کی تادیب

از خدا جوئیم توفیقِ ادب
(ہم خدا سے ادب کی توفیق مانگتے ہیں)

مولانا رومیؒ نے طریقت میں ادب پر بہت کلام کیا ہے۔ آپ کا کچھ کلام نیچے دیا جا رہا ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ ''باأدب بانصیب اور بے اَدب بے نصیب'' فرماتے ہیں کہ بے اَدب خدا کے لطف و کرم سے محروم رہتا ہے، اس لیے خدا سے ہمیشہ ادب کی توفیق کے لیے دعا کرنا چاہیئے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ بے ادب اپنی بے ادبی سے خود ہی بُرا نہیں ہوتا بلکہ اس کی بے ادبی کی آگ پورے عالم میں پھیل جاتی ہے۔ ایک بُرے آدمی کے اردگرد تمام ماحول میں بُرائی پھیل جاتی ہے اور اس کی صحبت میں بیٹھنے والا بھی بے ادب ہو جاتا ہے۔ سورج گرہن پر سائنس والوں نے جو وضاحت کی ہے، وہ ایک طرف لیکن مولاناؒ کا خیال ہے کہ یہ بھی لوگوں کی بے ادبی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ عزازیل (ابلیس) بھی بے ادبی کے باعث آدمؑ کو سجدہ نہ کر سکا اور خدائی قہر کا نشانہ بنا، غرضیکہ بے ادب کا سایہ جہاں بھی پڑتا ہے وہاں کوئی نہ کوئی خرابی یا نحوست رُو پذیر ہوتی ہے۔ جہاں بے ادبی کی جگہ ادب لے لے، وہاں بلندی کے تاثرات پائے جاتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یہ آسمان ادب کی وجہ سے نورٌ علیٰ نور ہو گیا اور چاند سورج اور ستارے اس کی چمک سے چمکدار ہو گئے۔ اللہ کے ساتھ ادب کا برتاؤ کرنے کی وجہ سے ہی فرشتے معصوم

اور پاک بن گئے۔

مذکورہ خوبیوں کے باعث یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کو بھی کچھ ملا ہے، وہ ادب کی پاسبانی میں ہی ملا ہے۔ روزِ الست جن رُوحوں نے وعدہَ الست کو خوشی خوشی قبول کیا، وہ نیک رُوحیں بن گئیں اور جنھوں نے "بلیٰ" تو کہا مگر بہت ناراضگی سے کہا، ان رُوحوں کو کفر کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔ ادب کے ان فوائد کو دیکھتے ہوئے اولیائے کرامؒ نے خود کو مؤدب کر لیا۔ اللہ کے نیک بندے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے انسان کو سب سے اعلیٰ مخلوق بنایا ہے اور بہت سی نعمتوں کا ان پر نزول فرمایا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہم پر اپنے انعامات نازل فرمائے ہیں تو پھر ہم خدا کی تمام نعمتوں کا شکر کیوں نہ کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ خدا نے ان کو اپنی محبت کے لائق سمجھا ہے اور اٹھارہ ہزار مخلوق میں سے ان پر ہی اپنا کلام بھیجا ہے۔ یہ دیکھ کر اولیائے کرامؒ خود کو خدا کی عبادت پر باندھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ تو نے ہمیں اپنے حکم کے قابل سمجھا۔ اللہ کے بندے اس بندے کا سا سلوک نہیں کرتے کہ جو لاٹھی کے بغیر نہ چلے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ کی طرف سے کوئی وعدہ وعید (جزا و سزا) نہ ہوتا، تب بھی مالک کے ساتھ وفا کے سوا چارہ نہ تھا۔ اگر خدا سب کو دوزخ میں ڈالتا اور کہتا کہ میری عبادت کرو تو پھر بھی اس کی عبادت کے بغیر چارہ نہ تھا۔ (آج کل ۲۰۰۳ء میں عراق پر امریکہ حاوی ہو گیا ہے تو اکثر اوقات ایک امریکی سپاہی دس بیس عراقیوں کو الٹا کر کے زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیتا ہے تو انہیں ان کے حکم کی اطاعت کیے بغیر چارہ نہیں ہے) جب بزرگوں نے یہ سوچا تو طمع کو نکال کر خدا کی اطاعت کرنے لگے۔

قرآن مجید میں سورہَ بنی اسرائیل آیت نمبر۱۴ میں ہے کہ "جب ہم کسی بستی کو اس کے گناہوں کے باعث ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش کرنے والوں کو اپنا فطری حکم بھیج دیتے ہیں (تعداد اور سامان بھی بڑھا دیتے ہیں) اور پھر جب وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو ان کے ذمہ حجت پوری ہو جاتی ہے اور پھر انہیں ہم پوری تباہی کے ساتھ اُکھاڑ پھینکتے ہیں۔" علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

جب مسلمان خداوند تعالیٰ کے احکام کو بھلا دیتے ہیں تو ان پر کوئی نہ کوئی ظالم اور جابر بادشاہ مسلط کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی اصلاح کرنا ہر مسلمان پر لازمی ہے کیونکہ اگر کوئی بُرائی سے منع نہیں کرتا اور خاموش رہتا ہے تو اس کا یہ سکوت بھی گناہ ہے۔ بُری بات کو بُرا نہ سمجھنے میں عدم ایمان کا اندیشہ ہے۔ جب بے ادب کی معصیت کا وبال پڑے گا تو دوسرے لوگ اور وحوش و طیور بھی اس میں مبتلا ہوں گے۔ یہ بات ایک حدیث سے بھی واضح ہے کہ "بُرائی سے منع نہ کرنے والوں کو بھی زندگی میں ہی عذاب دیا جاتا ہے۔" فحوائے الدین مکّی میں ہے کہ بے ادب سے مراد ہر عاصی و گنہگار ہے، جس میں نہ صرف تعظیمِ اکابر سے پہلوتہی کرنے والے شامل ہیں بلکہ مرتکبِ فواحش

اور واہیات کام کرنے والے بھی داخل ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیقِ ادب بے اَدب محروم ماند از فضلِ ربّ

ہم خدا سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں، بے ادب اللہ کی مہربانی سے محروم رہا۔ (۳۹/۱)

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

بے ادب نے نہ صرف اپنے آپ کو خراب کیا بلکہ اطرافِ عالم میں (فتنہ و فساد کی) آگ لگا دی۔ (۴۰/۱)

از ادب پُرنُور گشت است ایں فلک
(یہ آسمان ادب کے طفیل نورٌ علیٰ نور ہو گیا ہے)

آسمان کے ادب پر قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ''اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو حکم دیا کہ خوشی سے اطاعت گزار بنو گے یا جبر سے؟ عرض کی، ہم خوشی سے حاضر ہیں۔'' (حٰمٓ السجدۃ:۱۱) وہ طریقِ ادب میں اس قدر پابند ہیں کہ ان کی گردش اور ستاروں کی سیر میں ذرّہ برابر فرق نہیں آتا اور فرشتوں کا ادب یہ ہے کہ جب اللہ نے ان سے اسماء کے متعلق امتحان لیا تو سب نے کہا کہ اے مولیٰ! ہم تو صرف اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو بہت علم والا اور حکمت والا ہے (البقرہ:۳۲) فرشتوں نے ادب ملحوظ رکھا تو اسی لیے فرشتے معصوم اور پاک رہے اور ابلیس بے ادبی کی وجہ سے لعین بنا۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی برتری کا دعویٰ کیا، اس بے ادبی کی وجہ سے مردودِ ابدی بنا دیا گیا۔ جب لوگوں میں فسق و فجور اور احکامِ دین سے لاپرواہی بڑھ جاتی ہے تو اللہ کے حکم سے افلاک میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں تاکہ اس بات سے لوگ عبرت حاصل کریں اور اپنی سرکشی سے باز رہیں، اسی طرح جو شخص طریقِ سلوک میں گستاخی کرتا ہے تو وہ حیرت کی ندی میں ڈوب جاتا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

از ادب پُرنُور گشت ست ایں فلک وز اَدَب معصوم و پاک آمد ملک

یہ آسمان ادب کے طفیل (شمس و قمر اور کواکب سے) نورٌ علیٰ نور ہو گیا اور فرشتے ادب کی بدولت معصوم اور پاک ہیں۔ (۴۱/۱)

بُد زگستاخی کسوفِ آفتاب شد عزازیلے زِجُرأت ردِّ باب

سورج گرہن (جب ہوا تو لوگوں کی) گستاخی کے سبب ہوا، شیطان گستاخی کے سبب ہی راندۂ درگاہ ہوا۔ (۴۱/۱)

اگرچہ سائنس نے سورج گرہن کی تشریح سورج، زمین اور چاند کی منازل کی وجہ سے کی ہے مگر کسوف کی اصل وجہ لوگوں کی گستاخی کے سوا کچھ اور نہیں۔

اپنی تعریف پر خوش ہونا بھی ادب کے منافی ہے

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے بلکہ یہ اس کی فطرت میں شامل ہے۔ چونکہ انسان

کی تخلیق اللہ کی صورت پر ہوئی ہے، یعنی اللہ نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا ہے (الحدیث)۔ اسی لیے اس کی بعض صفات خدائی صفات سے ملتی جلتی ہیں اور منجملہ صفات میں سے ایک صفت مدح پسندی ہے۔ چونکہ خالقِ اکبر محمود و متکبر ہے، اسی لیے آدمی کو بھی مدح جوئی کی عادت ہے، جو اس کے لئے روا نہیں۔ حدیثِ نبوی ﷺ میں ہے کہ ''جب تم لوگوں کو دیکھو کہ تمہاری مدح کرتے ہیں تو ان کے منہ میں خاک ڈالو'' (مشکوٰۃ رقم الحدیث ۴۸۲۶) مدح سے تکبر اور غرور پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ جن کا باطن غیر مصفّٰی ہے تو نفس امارہ ان پر غالب ہوتا ہے ؎

پیشِ شاں شعرے بہ از صد تنگِ شَعر　　　خاصہء شاعر کو گہر آرد زقعر

(وہ اپنی مدح کے اس قدر شائق ہوتے ہیں کہ) ان کے نزدیک ایک قصیدہ پشمینے کی سو گٹھریوں سے اچھا ہے (جو قصیدے کے عوض شاعر کو دی جائیں)، خصوصاً وہ شاعر جو دریائے تخیل کی گہرائی سے (نازک) موتی نکالے۔ (۱۲۲/۴)

بزرگوں سے عاجزی ادب کا حصہ ہے

عجز و نیاز اچھی خصلت ہے۔ ناز و نخرے چھوڑ دو اور اپنی خوبروئی نہ جتلاؤ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح عاجزی اختیار کرو۔ دیکھو پتھر بہار کے موسم میں بھی سرسبز نہیں ہوتا، لہٰذا بہتر ہے کہ خاک بن جاؤ تاکہ رنگا رنگ پھول پیدا ہوں۔ اگر تم سنگدل رہو گے اور کسی کی متابعت نہ کرو گے تو فیضانِ کاملین سے محروم رہو گے ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　　آزموں را یک زمانے خاک باش

تم برسوں دلخراش پتھر رہ چکے ہو (اور دیکھ لیا کہ کچھ حاصل نہ ہوا اب) بطور آزمائش تھوڑی دیر کے لئے خاک بن جاؤ (اور پھر نتیجہ دیکھو)۔ (۲۱۱/۱)

طریقت سراسر ادب ہے

تمام صوفیائے کرام اس بات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ جب تک مرید کے دل میں اپنے شیخ کے لیے مناسب ادب کے جذبات موجود نہ ہوں، اس وقت تک عبادات اور مجاہدات اپنا پورا اثر نہیں دکھاتے۔ ان اولیاء کرامؒ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تصوف سارے کا سارا ادب ہی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تصوف کا مدار عشق پر ہے اور عشق میں اوّل تا آخر ادب کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ عشق جو ادب نہ سکھائے تو وہ عشق ہی نہیں۔ صاحبِ ہوش کے لیے ادب کے بغیر چارہ نہیں۔ سورۃ الحجرات میں ادب کی تعلیم دی گئی ہے۔ انسان کے لیے تصوف ایک زینت اور جمال ہے اور ادب تصوف کی روحِ رواں ہے۔ مولانا رومؒ نے مثنوی میں ادب پر بہت طویل کلام لکھا ہے اور فرماتے ہیں ''بے ادب محروم ماند از فضل رب'' یعنی بے ادب اللہ کے فضل سے محروم رہتا ہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بے ادب نہ صرف اپنی رُوحانی دُنیا کو خراب کرتا ہے بلکہ پورے عالم میں فساد کی آگ لگا دیتا ہے۔ ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ عبادت سے آدمی جنت تک پہنچ جاتا ہے مگر اطاعتِ الٰہی میں ادب بجا لانے سے اللہ تک پہنچ جاتا

ہے۔ ابوعلی دقاقؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص بادشاہ کی محفل میں بے ادب بیٹھے گا تو اس کی جہالت اسے قتل کروا دے گی۔ ابنِ معاذؒ فرماتے ہیں کہ سمجھ لو بے ادب عنقریب ہلاک ہو جائے گا۔ جو لوگ ہلاکت میں گرفتار ہیں، ادب کے مارے ہوئے ہیں۔ زیادہ علم حاصل کرنے کے مقابلہ میں تھوڑا سا ادب حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ خدمت کے دائرے میں رہ کر ادب کا لحاظ رکھنا خدمت سے بھی بالاتر ہے بلکہ صوفیاء کے نزدیک عبادت سے بھی بالاتر ہے، کیونکہ عبادت خواہ کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو رَد ہو سکتی ہے مگر خدمت اور ادب خواہ کتنے ہی معمولی نوعیت کے ہوں ضائع نہیں ہو سکتے۔

ادب پر مشائخِ کبار کی چند مثالیں

حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے وصیت فرمائی کہ ان کی قبر حضرت بایزید بسطامیؒ کی قبر سے تیس فٹ گہری کھودی جائے تا کہ بایزیدؒ کی قبر سے اونچی نہ رہے۔ مولانا حسام الدینؒ، مولانا رومؒ کے خاص مرید تھے اور مولاناؒ ان سے مثنوی کے اشعار لکھواتے تھے۔ تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ حسام الدینؒ اپنے پیر کا اس قدر ادب کرتے تھے کہ ان کے گھر میں بول و براز تو کیا وضو کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ اگر کبھی آدھی رات کے وقت بھی حسام الدینؒ کو وضو کی حاجت ہو جاتی تو اپنے گھر جا کر وضو کرتے، حالانکہ آپ کا گھر مولانا رومؒ کے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا اور کبھی برف باری کی وجہ سے راستہ نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا۔ اس بات سے ان کے ادب کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالباً اس ادب کی وجہ سے مولاناؒ بھی حسام الدینؒ کا اس قدر ادب کرتے کہ جس طرح کوئی اپنے پیر کا ادب کرتا ہے۔

ابوعلی دقاقؒ جب اپنے شیخ نصر آبادیؒ کے پاس جاتے تو پہلے غسل کرتے مگر آپ کے مرید ابوالقاسم قشیریؒ جب ابوعلی دقاقؒ کے پاس جاتے تو پہلے روزہ رکھتے پھر غسل کرتے، عطر لگاتے اور پھر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ اپنے پیر کے دروازے پر پہنچ کر شرم و حیا کی وجہ سے دروازے سے ہی لوٹ آتے اور اگر مدرسے کے اندر داخل ہو بھی جاتے تو بدن پر سنسنی سی طاری ہو جاتی۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر میں ان کی مجلس میں بیٹھ بھی جاتا تو سوال کرنے کی جرأت نہ ہوتی، پھر فرماتے ہیں اگر اللہ کوئی نبی بھیج بھی دیتا تو میں اس کا اپنے شیخ سے بڑھ کر ادب نہ کر سکتا۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ میرا ان کے ساتھ بہت زیادہ قرب تھا مگر یہ مجال نہ تھی کہ کبھی ان پر کسی قسم کا اعتراض کرنے کا خیال تک بھی میرے دل میں آیا ہو۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، اس قدر قرابتِ مصطفیٰ ﷺ رکھنے کے باوجود اپنے شیخ و استاد حضرت زید بن ثابتؓ کی رکاب تھامتے تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں امام مالکؒ کے سامنے بڑی نرمی سے کتاب کے صفحات پلٹتا تھا تا کہ انہیں آواز نہ پہنچے۔ حضرت ربیعؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ میں پانی پیوں اور امام شافعیؒ دیکھ رہے ہوں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے

اپنے استاد کے گھر کی جانب کبھی پاؤں نہ پھیلائے، حالانکہ آپ اور آپ کے استاد کے گھر کے درمیان سات گلیوں کا فاصلہ تھا۔ (رسالۃ المسترشدین مع تعلیقاتِ ابوغدۃ ص۲۰۲،۲۰۳)

ابنِ عطارؒ فرماتے ہیں کہ جو اپنے نفس کو بے ادبی پر قائم رہنے دیتا ہے اور اس کی مخالفت نہیں کرتا تو اس کا نفس مطلق العنان اور سرکش بن جاتا ہے۔ جس کے ظاہر میں ادب نہیں، وہ باطنی حسنِ ادب سے محروم ہوتا ہے۔ ادب ایک ایسی چیز ہے جو انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مریدین جن میں ادب نہیں پایا جاتا، ان کا طریقت کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہونا ہرگز ممکن نہیں۔ ادب کے سلسلے میں ہماری تصنیف ''بیعت کی تشکیل اور تربیت'' میں ایک باب لکھ دیا گیا ہے جس کا مطالعہ اچھے نتائج برآمد کرتا ہے، بشرطیکہ مرید واقعی مرید ہو نہ کہ صرف نام کا مرید ہو۔

مرید کی اپنی کوئی خواہش نہیں ہوتی

کہا جاتا ہے کہ ''اَلْمُرِیْدُ لَا یُرِیْدُ'' یعنی مرید وہ ہے جو خود کچھ نہیں چاہتا۔ ایسا مرید خدا کی رضا کو اپنی رضا سمجھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرتا ہے۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ استاد وہ ہے جس سے کسی نے کتاب اللہ کی خواہ ایک ہی آیت کیوں نہ سیکھی ہو۔ فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیئے کہ اپنے استاد کو رُسوا نہ کرے اور غلطی سے بھی اپنے آپ کو اس پر ترجیح نہ دے، جو ایسا کرتے ہیں وہ اسلام سے ایک رشتے کو توڑ لیتے ہیں۔ حضرت ابوعلی فارمدیؒ کو حضرت ابو القاسم گرگانیؒ نے فرمایا کہ مرید کو چاہیئے کہ اپنے شیخ کے سامنے ''کیوں'' کا لفظ بھی استعمال نہ کرے کیونکہ اس لفظ میں اعتراض کی گنجائش ہوتی ہے۔

ادب سے دین ملتا ہے اور مُراد بھی

حضرت بایزید بسطامیؒ ابتدائی ایام میں حضرت جعفر صادقؒ کی صحبت میں رہے (یعنی ان کے اویسی تھے)۔ ایک روز حضرت جعفر صادقؒ نے فرمایا کہ طاق سے فلاں کتاب اُٹھا لاؤ۔ آپ نے عرض کیا کون سے طاق سے، فرمایا! اتنا عرصہ تمہیں یہاں آتے ہو گیا ہے اور ابھی تک تمہیں طاق کا پتہ بھی نہیں چلا۔ عرض کیا کہ مجھے اس سے کیا غرض کہ میں اِدھر اُدھر سر کو اُٹھا کر دیکھوں، میں تو صرف آپ کی صحبت کے لیے آتا ہوں اور آپ کی طرف ہی متوجہ رہتا ہوں۔ حضرت جعفر صادقؒ نے فرمایا کہ اچھا اگر ایسا معاملہ ہے تو واپس بسطام چلے جاؤ، تمہارا کام ختم ہو گیا ہے، یعنی تم نے ادب حاصل کر کے تمام رُوحانی منزلوں کو طے کر لیا ہے اور اب مزید تربیت کی ضرورت نہیں۔ (غالباً یہ بات آپ کے اویسی احوال کے دوران ہوئی ہو گی کیونکہ دونوں کا زمانہ ایک نہ تھا)۔

صوفیائے کرام کا قول ہے کہ طریقت میں جو گستاخی کرے وہ ہمیشہ کے لیے راندۂ طریقت اور نامُراد رہتا ہے۔ حضرت مجددؒ الف ثانیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے غضب اور اولیائے کرامؒ کے غضب سے بچائے، کیونکہ

اولیائے کرامؒ جس طرح نسبت کے عطا کرنے پر کامل قدرت رکھتے ہیں، اس طرح نسبت سلب کرنے پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں اور ایک ہی بے التفاتی میں صاحبِ نسبت کو مفلس کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ بات سچ ہے کہ جو دے سکتے ہیں وہ لے بھی سکتے ہیں۔ مشائخ سے بے ادبی کرنے والوں کو کسی جگہ سے بھی فیض نہیں مل سکتا، خواہ وہ کسی بہت بڑے بزرگ کے پاس بھی چلا جائے، اگر کوئی اپنے شیخ سے کسی چیز کے متعلق دل میں شبہ رکھتا ہو تو اسے خود اپنی کوتاہی کی طرف منسوب کرے اور اگر اپنے شیخ کو قصور وار سمجھے تو وہ ان بزرگوں کی برکات سے محروم رہتا ہے۔ حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ اپنے شیخ کے متعلق دل میں بُرا خیال پیدا کرنا زہر قاتل کی طرح ہے جو اس کی رُوحانی دُنیا کو برباد کر سکتا ہے۔ آپ کا ایک مرید آپ کو چھوڑ کر چلا گیا تو آپ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ ہمیں چھوڑ کر وہ کس سے جا ملے گا۔ آج کل یہ بات عام ہو گئی ہے کہ اگر کسی کو چند ٹکوں کا فائدہ نظر آئے تو پیر کو چھوڑ جاتے ہیں۔ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کا ایک مرید کسی اور پیر سے بیعت ہونے کے لئے سامنے بیٹھا تو اس کے منہ پر زوردار طمانچہ پڑا۔ یہ دیکھ کر اس پیر نے اس مرید کو بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہارا پیر بہت کامل ہے، کیا تم مجھے بھی مرواؤ گے۔

پیر کی مجلس کے آداب

صوفیائے کرام نے مریدین کو آداب کے لیے سخت تاکید فرمائی ہے اور اس بات کی تلقین کی ہے کہ مرید شیخ کی مجلس میں جائے تو بالکل خاموش بیٹھے، جب تک شیخ نہ کہے گفتگو نہ کرے، شیخ کے کلام کو غور سے سنے، مرید نہ تو بلند آواز سے گفتگو کرے اور نہ زیادہ طویل گفتگو کرے، ہنسنے سے پرہیز کرے۔ دل میں اپنے شیخ کے متعلق کوئی بُرا خیال نہ لائے، شیخ کے سامنے اپنا مصلیٰ نہ بچھائے کیونکہ اس میں سجادہ نشینی کی بُو آتی ہے، مرید اپنے شیخ کے علاوہ کسی دوسرے سے اصلاح کی توقع نہ رکھے اور صرف ایک شیخ سے ہی وابستہ رہے۔ جس قدر اپنے شیخ سے محبت ہوگی اسی قدر رُوحانی درجات بلند ہوں گے اور دُنیا کی نعمتوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ مرید کو چاہیئے کہ اپنے شیخ سے کسی کو بزرگ تر نہ تصوّر کرے۔ مرید ایسی جگہ پر نہ کھڑا ہو جہاں اس کا سایہ پیر کے پیرہن یا پیر کے سائے پر پڑے۔ اس کے مصلےٰ پر پاؤں نہ رکھے۔ اس کے وضو کی جگہ طہارت نہ کرے، یہاں تک کہ اس کے کپڑے یا برتن بھی استعمال نہ کرے۔ پیر کی موجودگی میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کی طرف متوجہ نہ ہو یعنی کسی سے گفتگو نہ کرے۔ شیخ کی طرف اپنی پشت نہ کرے اور اس کی قیام گاہ کی طرف پاؤں نہ کرے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ شیخ کی مجلس میں گھٹنے کھڑے کرکے بیٹھتے ہیں اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتے ہیں، بلند آواز سے کلام کرتے ہیں اور کسی دوسرے سے مزاح شروع کر دیتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ ایسا مرید فائز المراد کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا بے اَدب شخص جس مجلس میں بھی چلا جائے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ اس کے پیر نے اس کو مجلس کے آداب نہیں سکھائے۔

شیخ کے پاس بیٹھ کر تسبیح یا وظیفہ پڑھنا، حتیٰ کہ درود شریف بھی پڑھنا نہیں چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی کتاب یا اخبار پڑھنا انتہائی بے ادبی کی دلیل ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ''سایہء پیر بہ است از ذکرِ حق'' یعنی پیر کے سایہ میں بیٹھنا ذکرِ حق سے بہتر ہے۔ پیر کی مجلس میں بیٹھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنا ہی سب سے بڑی نفلی عبادت ہے۔ شیخ کے سامنے نوافل کا پڑھنا بھی سوئے ادب میں شامل ہے۔ اپنے شیخ کے مقابلے میں کسی بڑے سے بڑے پیر یا عالم کو بڑا خیال نہ کرے۔ ''مکتوباتِ لطیف'' اور ہماری تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں ادب کے موضوع پر لکھی گئی تحریروں کا مطالعہ فرمائیں، جس میں ادب پر زیادہ مفصل بیان شامل کر دیا گیا ہے۔

جو زخم کی درد برداشت نہیں کر سکتا، وہ نفس کے زخم کیسے برداشت کرے گا

پہلے زمانے میں اور آج کل (انگلینڈ اور امریکہ میں بھی) بہت سے لوگ اپنے جسموں پر کچھ نہ کچھ تصویریں یا اپنے مطلب کے تحصیل کی کوشش میں کچھ حروف یا نقوش گدواتے ہیں۔ مولانا رومیؒ نے ایک قزوینی کا قصہ بیان کیا ہے کہ ایک پہلوان صورت آدمی تھا مگر ہمت اور بہادری میں حقیقتِ حال یہ تھی کہ وہ بالکل صفر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے کندھے پر ایک خونخوار شیر کی شکل بنائی جائے تاکہ اس کے حریف اس شیر کی صورت سے ہیبت زدہ ہو جائیں، حقیقتاً وہ پہلوان بہت ڈرپوک تھا۔ وہ قزوینی ایک نائی کے پاس گیا اور اپنا ارادہ اسے بتایا۔ نائی نے گودنے والی مشین پکڑی اور اس سے پوچھا کہ یہ تصویر اس کے جسم پر کہاں بنائی جائے۔ اس نے کہا کہ میرے کندھے پر شیر کی تصویر بنا دو۔ نائی جب شیر کی تصویر بنانے لگا تو ایک جگہ پر اپنی مشین کی سوئی رکھی۔ تصویر گدوانے کے لیے معمولی سا درد ہوا مگر وہ پہلوان صاحب اتنے کمزور دل تھے کہ اس سوئی کی چبھن برداشت نہ کر سکے اور نائی سے کہنے لگے کہ ذرا رُک جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ ابھی اس سوئی سے شیر کا کون سا حصہ بنانے لگے ہو۔ میں تو سوئی کے درد سے مرا جا رہا ہوں۔ نائی نے کہا، شیر کا کان بنانے لگا ہوں۔ پہلوان نے پوچھا کہ کیا کان کے بغیر شیر نہیں ہوتا تو نائی نے کہا کہ ہاں کان کے بغیر بھی شیر ہو سکتا ہے۔ پہلوان نے کہا کہ یار پھر رہنے دو تم تصویر میں کان نہ بناؤ۔ نائی نے دوسری جگہ سوئی رکھی تو پہلوان پھر تڑپنے لگا اور آہ و زاری کرنے لگا اور پوچھا کہ اب کیا بنا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ شیر کی دُم بنا رہا ہوں۔ اس پہلوان نے پھر پوچھا کہ کیا دُم کے بغیر شیر نہیں ہوتے۔ نائی نے کہا کہ ہاں ہوتے تو ہیں۔ پہلوان نے کہا کہ یار! پھر شیر کی دُم بھی نہ بناؤ، حتیٰ کہ نوبت ٹانگ، دھڑ، سر، آنکھیں، پیٹ پر پہنچی تو پہلوان نے ایک ایک کر کے شیر کے ہر حصے کے لئے کہا کہ یہ بھی رہنے دو۔ آخر نائی نے مشین زمین پر رکھ دی اور کہا کہ میں نے آج تک ایسا شیر نہیں دیکھا کہ جس کا نہ کان ہو، نہ سر، نہ پیر، نہ ٹانگیں، نہ دھڑ، نہ پیٹ اور نہ دُم ہو اور جیسا شیر تم بنانا چاہتے ہو ایسا شیر اللہ نے آج تک نہیں بنایا۔ نائی نے کہا کہ جب تمہارے اندر سوئی کا زخم برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے تو پھر ایسے بانکے شیر بنانے کا دَم نہ مارو۔

اس کے بعد مولاناؒ نصیحت فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسی ڈینگیں مارتے ہیں اور ایسی صفات کا اظہار کرتے ہیں جو ان میں موجود نہیں ہوتیں، اگر ان کی ان غلط خواہشات کی تعریف نہ کی جائے تو وہ اپنے نفس کے زخموں کو محسوس کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ تم اپنے زخموں کے درد پر صبر کرو تاکہ تم اپنے نفس کے زخم سے محفوظ رہو، جو لوگ اس درد کو برداشت کر لیتے ہیں تو آسمان، چاند اور سورج ان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ مولانا رومیؒ کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

میزنند از صورتِ شیر و پلنگ   بر تن و دست و کتفہا بے دِرنگ

یہ لوگ جسم، ہاتھ اور کندھوں پر شیر اور چیتے کی تصویریں بلا تردّد گدواتے ہیں۔ (۱/۳۱۳)

از سرِ سوزن کبودیہا زنند   بر چناں صورت پیا پے بے گزند

اس قسم کی تصویریں (بنانے کی جگہ) پر تکلیف ظاہر کئے بغیر سوئی کی نوک سے پے در پے گودتے ہیں۔ (۱/۳۱۳)

کہ کبودم زن ستاں شیرینئے   سُوئے دِلاّکے بشد قزوینئے

(اسی طرح) ایک قزوینی کسی نائی کے پاس گیا کہ میرے جسم پر تصویر بنا دے (اور اپنے معاوضے کی) شرینی لے لے۔ (۱/۳۱۳)

گفت برزن صورتِ شیرِ ژیاں   گفت چہ صورت زنم اے پہلواں

اس نے پوچھا، اے پہلوان! کون سی تصویر بناؤں، اس نے کہا، (ایک) غضبناک شیر کی تصویر بناؤ۔ (۱/۳۱۳)

جہد کُن رنگِ کبودی شیرِ زن   طالعم شیرست و نقشِ شیر زن

میرا ستارہ اسد ہے اور تم شیر ہی کی تصویر بنا دو، کوشش کرو دل کھول کر گودو۔ (۱/۳۱۳)

گفت بر شانہ گہم زن آں رقم   گفت بر چہ موضعت صورت زنم

(پوچھا آپ کے جسم) پر کس جگہ تصویر بناؤں، وہ بولا، میرے کندھے پر وہ نقش منقش کر دو۔ (۱/۳۱۳)

با چنیں شیرِ ژیاں در عزم و حزم   تا شود پشتم قوی در رزم و بزم

تاکہ میں اس بہادر شیر کی بدولت ہمت اور ارادہ کی رُو سے رزم و بزم میں قوی پُشت رہوں۔ (۱/۳۱۳)

دردِ آں در شانہ گہ مسکن گرفت   چونکہ اُو سوزن فرو بُردن گرفت

جب اس نائی نے سوئی چبھونی شروع کی تو اس کا درد شانے میں ہونے لگا۔ (۱/۳۱۳)

مَر مَرا کُشتی چہ صورت می زنی   پہلواں دَر نالہ آمد کائے سَنی

پہلوان چلا اُٹھا کہ اے بھلے مانس! تُو تصویر کیا بناتا ہے تُو نے تو مجھے مار ہی ڈالا۔ (۱/۳۱۳)

گفت از چہ عُضو کردی ابتدا   گُفت آخر شیر فرمودی مرا

(نائی نے کہا) تم نے آخر مجھ کو شیر بنانے کا حکم دیا ہے، قزوینی نے پوچھا، کس عضو سے بنانا شروع کیا ہے۔ (۱/۳۱۳)

گفت از دُمگاہ آغازیدہ ام گفت دُم بگزار اے دو دیدہٗ ام
اس نے جواب دیا، دُم سے شروع کیا ہے، اس نے کہا، اے نورِ چشم! دُم کو چھوڑ دے۔ (۳۱۳/۱)

از دُم و دُمگاہِ شیرم دم گرفت دُم گہ اُو دَم گہم محکم گرفت
اس شیر کی دُم اور دُم گاہ سے میرا ناک میں دَم آ گیا، اس کی دُم گاہ نے میری سانس لینے کی جگہ کو ختم کر ڈالا۔ (۳۱۳/۱)

شیرے بے دُم باش گو اے شیر ساز کہ دلم سستی گرفت از زخمِ گاز
اے شیر بنانے والے یہ شیر بے دُم سہی کیونکہ اوزار کے زخم سے میرا دل نڈھال ہو گیا ہے۔ (۳۱۴/۱)

جانبِ دیگر گرفت آں شخص زخم بے محابا و مُواساتے و رحم
پھر وہ شخص دوسری طرف سے بے دھڑک اور بے رحمی و بے پرواہی کے ساتھ چرکے لگانے لگا۔ (۳۱۴/۱)

بانگ زد اُو کایں چہ اندام ست ازو گفت اُو گوش ست ایں اے مردِ نکو
(ادھر آ) اس نے آواز دی کہ یہ کون سا حصہ بن رہا ہے؟ اس نے جواب دیا، اے مہربان! یہ کان ہے۔ (۳۱۴/۱)

گفت تا گوشش نباشد اے ہُمام گوش را بگذار و کوتہ کن کلام
(قزوینی نے) کہا، حضرت خیر کان نہ سہی اس کان کو چھوڑو اور قصہ مختصر کرو۔ (۳۱۴/۱)

جانبِ دیگر خلش آغاز کرد باز قزوینی فغاں را ساز کرد
(پھر نائی نے) دوسری طرف سوئی چبھونی شروع کی، قزوینی پھر چلانے لگا۔ (۳۱۴/۱)

کایں سُوم جانب چہ اندام ست نیز گفت اینست اشکمِ شیر اے عزیز
کہ یہ تیسری جانب کون سا عضو بن رہا ہے، اس نے کہا اے عزیز! یہ شیر کا پیٹ ہے۔ (۳۱۴/۱)

گفت تا اِشکم نباشد شیر را خود چہ اشکم می بباید شیر را
بولا، شیر کا پیٹ بھی نہ سہی، اس بدبخت (تصویر) کو پیٹ کی کیا ضرورت ہے۔ (۳۱۴/۱)

گشت افزوں درد کم زن زخمہا اشکمے چہ شیر را بہرِ خدا
تکلیف بڑھ گئی ہے زخم کم لگاؤ، خدا کے لئے شیر کا پیٹ کیا ہوا (میرے لیے تو عذاب بن گیا) (۳۱۴/۱)

خیرہ شُد دَلّاک بس حیراں بماند تا بدیر انگشت در دنداں بماند
(اب تو بے چارہ) نائی متعجب ہوا اور نہایت حیران رہ گیا اور دیر تک دانتوں میں انگلی دبائے کھڑا رہا۔ (۳۱۴/۱)

بر زمین زد سوزن آندم اوستاد گفت در عالم کسے را ایں فتاد!
اس وقت استاد نائی نے سوئی زمین پر دے ماری اور کہنے لگا، بھلا دُنیا میں کسی کو ایسا معاملہ بھی پیش آیا ہوگا۔ (۳۱۴/۱)

شیر بے دُم و سَر و اشکم کہ دید از چُنیں شیرے خدا خود نافرید
بے دُم، بے سر اور بے شکم شیر کس نے دیکھا؟ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا۔ (۳۱۴/۱)

چوں نداری طاقتِ سوزن زدن   از چنیں شیرِ ژیاں بس دم مزن

(پھر قزوینی سے مخاطب ہو کر بولا) جب تم میں سوئی کا زخم برداشت کرنے کی طاقت نہیں تو پھر ایسے بانکے شیر کی تصویر بنوانے کا بھی دَم نہ مارو۔ (۳۱۴/۱)

مطلب:۔ یعنی جو شخص تیغ و سنان چھوڑ سوئی کا زخم برداشت کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا اس کو کیا حق ہے کہ شیر جیسی خون خوار اور ہیبت ناک ہستی کی تصویر اپنے جسم پر بنوا کر اپنی شجاعت و بہادری کا اظہار کرے۔

اے برادر صبر کن بردَردِ نیش   تا رہی از نیشِ نفسِ گبر خویش

اے بھائی! زخم کے درد پر صبر کرو تا کہ تم اپنے نفسِ بے دین کے زخم سے محفوظ رہو۔ (۳۱۴/۱)

کاں گروہیکہ رہیدند از وجوُد   چرخ و مہر و ماہ شاں آرد سجود

کیونکہ جو لوگ اپنے وجود سے آزاد ہو گئے، آسمان اور سورج اور چاند ان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ (۳۱۵/۱)

مطلب:۔ یعنی جو لوگ اپنی ہستی کو فنا کر لیتے ہیں (جو ریاضت و مجاہدات کا ثمرہ ہے) تو تمام اجرامِ فلکیہ ان کے مسخر و مطیع ہو جاتے ہیں۔

چھبیسواں باب

بھوک سے نفس کی اِصلاح

اسلام میں بھوک کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور بھوک کو اس قدر برداشت کرنا صرف اسی لیے ہے کہ اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ پیدا کرنے میں بھوک کا بہت بڑا کردار ہے اور نفس کشی اسی سے متعلق ہے اور اسی لیے اسلام نے سال میں ایک ماہ کے روزے رکھنے کا حکم فرض کی حیثیت سے جاری کیا ہے۔ ہماری تصنیف ''تہذیبِ نفس'' میں بھوک پر ایک پورا باب لکھا گیا ہے لیکن قارئین کی سہولت کے لیے اس باب کا ایک خلاصہ بھی تیار کیا گیا ہے، جو اس کتاب میں عوام کی معلومات کی غرض سے نیچے دیا جا رہا ہے۔

ماڈرن زمانہ میں بھوک کا مسئلہ

بھوک برداشت کرنے پر جو فوائد مرتّب ہوتے ہیں، ان مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ آج کے مسلمان ان باتوں پر عمل کرنا تو کیا انہیں تو ان حقیقتوں سے قطعاً کوئی آشنائی بھی نہیں۔ عام مسلمان کی بات تو ایک طرف ہمارے زمانے میں مسلکِ تصوف پر چلنے والے صوفیوں کے لیے بھی بھوک کو برداشت کرنے کی باتیں بعید از قیاس اور ان کے عمل کی سطح سے کہیں بلند نظر آتی ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے راقم الحروف نے اس بات کو مناسب سمجھا ہے کہ جو کچھ مذکورہ کتاب ''تہذیبِ نفس'' میں بیان کیا گیا ہے، اس کے خلاصے کو یہاں مختصر اور آسان حروف میں پیش کر دیا جائے تا کہ بھوک میں بیان کردہ تمام خوبیوں کا جامع نقشہ ذہن نشین ہو جائے اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے کے آسان نکات چن لئے جائیں۔

بھوک کا عمل اختیار کرنے پر جو فوائد مرتّب ہوئے اور جس طرح ہمارے اسلاف نے بھوک کی سختیاں برداشت کیں، اس کے ایک سرسری مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی سختیاں برداشت کرنا تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، جنیدؒ بغدادی، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم جیسے بزرگوں کا ہی کام ہے۔ احادیثِ نبوی ﷺ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے پیٹ کو بھوکا رکھے، جگر کو پیاسا رکھے، جسم کو زائد از ضرورت کپڑوں سے ننگا رکھے اور اپنی اُمیدوں کو کوتاہ رکھے تاکہ وہ اس قابل ہو جائے کہ اللہ کے نور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ (کشف المحجوب، احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۷۴) یہی وجہ تھی کہ ایک طبیب جو مدینہ شریف میں مسلمانوں کا علاج کرنے کے لیے حضور ﷺ کی اجازت کے ساتھ آیا تو اس نے اس بات کی شکایت کی کہ یہ مسلمان تو بہت کم بیمار ہوتے ہیں اور وہ مدینے کے لوگوں کا علاج کرنے کی بجائے فارغ بیٹھا ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے اس طبیب سے فرمایا ''ہم ایسی قوم ہیں جو کھانا اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک بھوک نہ ہو اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے۔ (الحدیث)'' فرمایا یہ ہی راز ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اچھی صحت کا۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ ''ابلیس انسان کو پیٹ کے ذریعے گمراہ کرتا ہے اور غلط راستوں پر لے جاتا ہے۔'' (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۷۵) شریعت کی اتباع بھی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کیونکہ نفس کو اس کی بغاوت سے روکنے کے لیے اتباعِ شریعت سے بہتر کوئی کام نہیں۔ ماہِ رمضان کے روزے اسی لیے سودمند ہیں کہ روزہ انسان کے نفس کو مہذب بنا دیتا ہے اور مسلمان کو اس کا انعام تقویٰ کی شکل میں دیا جاتا ہے۔

طریقت میں بھوک ضروری ہے

طریقت میں نفس کی تادیب کرنا سب سے اہم مرحلہ ہے۔ اس میں شکم سیری سے منع کیا جاتا ہے تاکہ نفس کی سرزنش ہو سکے اور مشائخ کا اصول ہے کہ جو سالک بھوک برداشت نہیں کرتا اس کو طریقت کے زُمرے سے نکال دیا جاتا ہے اور اسے کہہ دیتے ہیں کہ تجھے طریقت قبول نہیں کرتی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ مجھے ۳۰ سال کی سخت ریاضت اور مجاہدات سے صرف یقین کی دولت میسر ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ بھوک کو مجاہدات میں امتیازی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس میں نفس کی تادیب ہے۔ احادیث میں ہے کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کی رگوں میں گردش کرتا ہے اور حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اس کی گردش کو بھوک کے ذریعے بند کر دو۔ (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۷۵) بھوک دشمنِ خدا کے لیے قہر ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا شہوات کا منبع اور مرکز ہے۔ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دلوں کو بھوک کے ذریعے منور کرو اور اس کے توسط سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو۔ (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۸۰) بھوکا رہنے والا مجاہد کا درجہ رکھتا ہے اور خدا کے نزدیک بھوک سے بہتر کوئی عمل نہیں۔ حضور ﷺ کا ایک اور بھی فرمان ہے کہ ''آسمان کے فرشتے اس انسان کے پاس بالکل نہیں آتے جس نے اپنا پیٹ بھر کر عبادت کا مزہ کھو دیا۔'' پیٹ کو بھوکا رکھنا تمام بزرگانِ دین کا شعار ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب سے ایمان لایا ہوں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تا کہ میں اپنے رب کی عبادت کا مزہ حاصل کر سکوں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے رب تعالیٰ کے دیدار کے شوق کی وجہ سے کبھی سیر ہو کر پانی نہیں پیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کا معمول تھا کہ آپ چھ دن فاقہ سے رہتے تھے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ ''دلوں کو زیادہ کھانے پینے سے ہلاک نہ کرو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس طرح زیادہ پانی سے کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں، اسی طرح زیادہ کھانے سے دل کا سوز اور گداز ختم ہو جاتا ہے۔'' (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۷۴) کہتے ہیں اگر فرعون بھوکا رہتا تو ہرگز خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔

بھوک سے جہاد

سورۂ البقرہ کی آیت نمبر ۱۵۵ میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ لوگوں کو خوف، بھوک اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے آزماتا ہے اور جو لوگ ان باتوں میں صبر سے کام لیتے ہیں، وہی فلاح پاتے ہیں۔''

بھوک کی اہمیت اسی سے معلوم ہو جاتی ہے کہ بھوک نفس میں خضوع پیدا کرتی اور دل میں عجز و نیاز بڑھاتی ہے۔ قوتِ نفسانی بھوک سے گھٹتی ہے۔ بھوک سے جسم میں کمزوری ہوتی ہے مگر دل میں روشنی، جان میں صفائی اور سر میں حق کا مواد حاصل ہوتا ہے۔ صوفیاء کا قول ہے کہ سالکینِ راہِ طریقت کے لیے تین حکم ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ غلبۂ نیند ہو تو سوئے، ضرورت سے زیادہ کلام نہ کرے اور کھانا فاقے کے بعد کھائے۔ اس کے ساتھ اگر درویش میں کھانا کم کھانے کی طاقت ہو تو وہ قربِ الٰہی کے مرتبے کے لائق ہوتا ہے۔ کم کھانا شہوات کی موت ہے۔ زیادہ کھانے سے دل سخت ہو جاتا ہے اور اس کا نور چلا جاتا ہے۔ حکمت کا نور بھوک کی وجہ سے ہوتا ہے اور سیرابی انسان کو اللہ تعالیٰ سے دُور کر دیتی ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اپنے نفسوں سے بھوک اور پیاس کے ساتھ جہاد کرو۔ اس کا بھی وہی ثواب ہے جو کفار سے جہاد کرنے میں ہے۔'' (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۷۳) جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اس کو ملکوتِ آسمانی کی طرف راہ نہیں سوجھتی۔ (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۷۳)

حضرت عبدالواحد بن زیدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو دوست نہیں بنایا، سوائے اس کے کہ جو بھوکا رہا ہو اور ہوا میں کوئی نہیں اُڑا مگر جو بھوکا رہا اور زمین کو طے کرنے کا شرف بھی بھوکے کو ہی ملتا رہا ہے۔ حضرت معروف کرخیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم روزہ افطار کرو تو پھر دیکھو کہ کس کے پاس افطار کر رہے ہو کیونکہ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک خراب لقمہ سے دل کی کیفیت خراب ہو جاتی ہے اور پھر ساری عمر وہ اپنی اصلی حالت پر نہیں آ سکتا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خراب لقمہ کھانے سے انسان ایک سال کے لیے نمازِ تہجد سے محروم ہو جاتا ہے اور کبھی ایک دفعہ کی بدنظری سے بندہ ایک عرصہ تک تلاوتِ قرآن سے محروم ہو جاتا ہے۔ پیٹ بھرنے سے دل اندھا ہو جاتا ہے، بخارات دل کو چڑھتے ہیں اور اس سے آدمی کند ذہن ہو جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ ''پیٹ بھر کر کھانے سے دل سے نورِ معرفت ختم ہو جاتا ہے۔'' جو شخص اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان پیٹ بھر کر ذکر و مناجات کی لذت

چاہتا ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

مشائخ کرام کا قول ہے کہ سرکش جانور (نفس بھی) اس وقت تک سیدھا نہیں رہتا جب تک اسے بھوکا نہ رکھیں۔ شہوت شکم سیری سے جنم لیتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے کہ اسلام میں حضور ﷺ کے بعد سب سے پہلی بدعت جو ظہور میں آئی وہ یہ تھی کہ قوم نے سیر ہو کر کھانا شروع کر دیا اور ان کا نفس بغاوت پر آمادہ ہونے لگا۔ (احیاء العلوم الدین، ج ۳، ص ۷۸) شہوتِ فرج کم خوری سے سرد پڑ جاتی ہے۔ ایک سال تک سوکھی اور کم روٹی کھانے سے عورت کا خیال دل میں نہیں آتا، اسی لیے جس کی شادی نہ ہو تو اسے روزے رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ زیادہ کھانے سے احتلام کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اولیائے کرامؒ کم خوری کو اس لیے بھی پسند فرماتے تھے کہ اس میں خرچ کم ہوتا ہے اور عبادت کے لیے وقت بھی زیادہ مل جاتا ہے۔ کم خوری سے انسان غسل خانے میں بار بار جانے سے بچ جاتا ہے اور بار بار وضو کرنے سے بھی بچ جاتا ہے۔ بھوک سے صحت بہتر رہتی ہے اور دواؤں کا خرچ اور ہسپتالوں کے چکروں سے بھی انسان بچ جاتا ہے۔ بھوک سے حرام پر نظر نہیں جاتی اور ایسے حلال رزق والا انسان یقیناً مرد فقیہ ہوتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ ''مجھے اگر قرض کی ضرورت ہو تو میں لوگوں سے نہیں کہتا بلکہ اپنے پیٹ سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی خواہش کو ترک کر دے۔''

بھوک میں ملنے والے درجات

صدّیقین کا درجہ یہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کرتے۔ بھوکا آدمی کمزوری کے باعث اگر بیٹھ کر بھی نماز پڑھے تو یہ شکم سیر کی کھڑے ہو کر پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔ بھوک رکھنے کی علامت یہ ہے کہ اتنی بھوک رہے کہ اس کا روکھی روٹی کھانے کے لیے بھی دل تڑپ رہا ہو۔ اگر سالن کی طلب ہو تو یہ سچی بھوک نہیں بلکہ عیاشی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہ حال تھا کہ کئی کئی دن تک بھوکے رہتے اور جنگِ بدر میں تو دو صحابہ کی دن بھر کی خوراک ایک کھجور ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کا پیٹ کمر کے ساتھ ملا رہتا تھا اور آپ ﷺ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ترس آ جاتا تھا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''بھوک تمام نیک اعمال کی سردار ہے، پرانا کپڑا پہننا اور آدھا پیٹ خالی رکھنا جزوِ پیغمبری ہے۔'' (احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۷۴) حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''تفکّر نصف عبادت ہے، جب کہ بھوک مکمل عبادت ہے۔'' (احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۷۴)

حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ صوفیائے کرام کی جماعت پر رحمتِ الٰہی کا نزول تین وقتوں میں ہوتا ہے۔ ایک کھانے کے وقت کیونکہ وہ نہیں کھاتے مگر فاقے کے وقت، دوسرے ہمنشینی اور مکالمہ کے وقت کیونکہ اس وقت یہ انبیاء اور صدیقین کے مقامات میں ان کے قائم مقام ہو کر کلام کرتے ہیں اور تیسرے سماع کے وقت کیونکہ اس وقت وہ خدا کے شہود اور وجد میں ہوتے ہیں۔ مشائخ کا یہ قول ہے کہ جب غذاؤں سے پرہیز ہو تو خواہشات ضعیف

ہو جاتی ہیں، عقل بڑھ جاتی ہے، نفس کا زور ٹوٹ جاتا ہے، خواہشات فنا ہونے لگتی ہیں اور مرید کی تمام مرادیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت کا دروزاہ مسلسل کھٹکھٹاتے رہو یہاں تک کہ وہ تمہارے لیے کھل جائے۔'' جب پوچھا گیا کہ دروزاہ کھٹکھٹانا کیسے ممکن ہے تو فرمایا ''بھوک اور پیاس سے ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے۔'' (احیاء علوم الدین، ج۳، ص۷۵) حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے کو اعتدال کا راستہ بتایا کہ وہ ایک دن گوشت، ایک دن دودھ، ایک دن روغن کے ساتھ، ایک دن روکھی روٹی اور ایک دن سرکہ سے کھانا کھائے تاکہ نفس سرکشی نہ کرے۔

بھوک کے مسئلہ کا حل

مذکورہ تمام گفتگو کا مطالعہ کرنے کے بعد پہلا مسئلہ تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آج کا آزاد نوجوان بلکہ آج کا مبتدی اور متوسط صوفی بھی ان تمام منزلوں سے کیسے گذر سکے گا، جس طرح ہمارے بڑے بڑے بزرگوں نے اپنی زندگیوں میں اللہ کے لئے مجاہدات کی سختیاں برداشت کیں اور ہمارے لیے ایسی قابلِ تقلید مثالیں چھوڑی ہیں، جس پر عمل کرنا موجودہ نسل کے لئے ممکن نہیں اب تو اس نازک زمانے کے مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ حل کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ اس لیے بھی مشکل ہو گیا ہے کہ ہمارے زمانے میں لوگوں کے لیے ایسی تربیت گاہیں بہت کم نظر آتی ہیں، جہاں ان باتوں کا سبق دیا جاتا ہو۔ آج کی پود کے (بقول علامہ اقبالؒ) ماں باپ بذاتِ خود رُوحانی طرز کی زندگی سے بالکل کورے نظر آتے ہیں اور علمی درسگاہوں میں دینی اُمور میں کامل استاد بھی نہیں ملتے تو کہاں سے آئے گی صدا ''لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ''۔

اس کے بعد دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ماحول کچھ اس طرز میں ڈھل چکا ہے کہ اب اتنی گہری رُوحانی باتیں تو کہاں دیکھنے میں آئیں گی، یہاں تو سیدھی سادی رُوحانی باتیں نہ تو سنانے والے ہیں اور نہ سننے والے اور اگر ہیں تو لوگوں کو ان کی باتوں کو سننے کی توفیق ہی کہاں ملتی ہے جو اپنی رنگین محفلوں کو چھوڑ کر دینی باتوں کو سنیں۔ دینی باتیں سنانے والے بھی شعلہ فشاں بزرگ نہیں رہے، جن کی بات کو سن کر لوگوں کے سینوں میں دین کی طرف آنے کی آگ بھڑک اُٹھے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو زمانۂ حال کی مغربیت یا نشۂ چرس کا ذوق اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ اب اس مغربیت کو چھوڑ نہیں سکتے، تاوقتیکہ کوئی علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ عشق کی آگ ان کے سینوں میں پھونک دے۔ یہی دُنیا کے عشق کی آگ اگر رُوحانی یا حقیقی عشق کی طرف موڑ دی جائے تو پھر یہ لوگ رُوحانی دُنیا میں بھی کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ؎

اقبال تیرے عشق نے سب بَل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

راقم الحروف اس بات کا قائل ہے اور اس بات کا تجربہ کیا ہے کہ اگر شیخِ کامل میسّر ہو جائے تو دُنیا بدل جاتی ہے۔

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

مذکورہ تین باتوں کا علاج اُوپر بیان کردہ حروف میں ہی چھپا ہوا ہے کہ کوئی اس پر عمل پیرا ہو تو منزل ضرور مل جاتی ہے۔ یاد رہے کہ مذکورہ منزل ایک دو دن میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی سچی طلب اگر دل میں پیدا ہو جائے تو یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں، بس کسی مردِ کامل کی تلاش ضروری ہے تا کہ سچی طلب دل میں پیدا ہو، پھر اللہ منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری خود لے لیتا ہے۔ اس میں بس استقامت کی ضرورت ہے۔

بڑے بڑے مشائخ نے جو مجاہدات کیے ہیں وہ ہمارا نوجوان نہیں کر سکتا، البتہ کوئی رفتہ رفتہ اس میدان میں آنے کی کوشش جاری رکھے تو کام بن جاتا ہے۔ یہ یاد رکھیں کہ اس خطرناک زمانے میں جہاں ہر طرف بے دینی کا رنگ پھیل چکا ہے، وہاں اللہ نے اپنے گنہگار بندوں کے لیے نرمی کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ایسے زمانے میں تھوڑا سا عمل بھی کرو گے تو اللہ پچھلے زمانے کے بڑے بڑے بزرگوں کے اعمال سے زیادہ مہربانی فرمائے گا یعنی تھوڑی محنت پر زیادہ اجر دے گا، لہٰذا نفس کی سرزنش کے لیے جو اُوپر بیان ہوا ہے، اس کے مطابق درجہ بدرجہ عمل کرنا شروع کر دیں اور بزرگوں کی کتابوں اور علامہ اقبالؒ کے کلام سے ہمت اور حوصلہ حاصل کرتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ پر بھی اللہ کا وہی فضل و کرم ہو جائے جو مشائخ پر ہو چکا ہے، اگر کسی کو اس طرف آنے کی لگن ہی نہ ہو تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔

اند کے صرفہ بکن از خواب و خور
(کھانے اور نیند میں کسی قدر کمی گوارا کرو)

مولانا رومیؒ درگاہِ حق میں ہدیہ لے جانے کا طریقہ بیان فرماتے ہیں کہ تھوڑا سونا اور تھوڑا کھانا چاہیے تا کہ طاعات و عبادات بہ احسنِ وجوہ انجام پذیر ہوں۔ فرماتے ہیں یہ چیز محبوب حقیقی کی درگاہ میں پیش کرنے کے لئے بہترین ہدیہ اور اس کے مقامِ قرب میں باریاب ہونے کا سب سے اچھا وسیلہ ہے۔ خواب و خور (سونا اور کھانا) اس ہدیہ کی رسائی اور وسیلہ بننے کے حصول سے مانع ہیں۔

زیادہ کھانے سے جسم میں ثقل و کسل پیدا ہو جاتا ہے، دل سے نشاط و تازگی زائل ہو جاتی ہے اور وہ ذوقِ عبادت و لطفِ مناجات سے محظوظ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے انسان عبادت کو ترک کرنے یا ناقص صورت میں بجا لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب ضرورت سے زیادہ نیند غلبہ کرتی ہے تو اوقاتِ عبادت کم بلکہ فوت ہوتے رہتے ہیں، کبھی کثرتِ طعام سے معدہ اور جگر کے فعل میں خلل آ جاتا ہے تو عروضِ امراض کے سبب سے ہفتوں یا مہینوں

کے لئے بالکل ہی طاعات و عبادت سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اگر تقلیلِ غذا اختیار کی جائے تو اس سے تقلیلِ نوم کی مصلحت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے، یعنی قلتِ طعام سے نیند خود بخود معتدل ہو جاتی ہے۔ پھر فرائض وسنن میں کسی قسم کی غفلت وکوتاہی وقوع میں نہیں آتی، چنانچہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تقلیلِ غذا آثارِ ایمان میں سے ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی بہت سا کھانا کھا جایا کرتا تھا، پھر جب وہ مسلمان ہوگیا تو تھوڑا کھانے لگا۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''مومن ایک آنت سے کھانا کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں سے کھانا کھاتا ہے۔'' یہ روایت بخاری شریف کی ہے اور مسلم شریف کی روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یوں ہے کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص کے لئے بکری دوہنے کا حکم دیا۔ وہ بکری دوہی گئی تو وہ شخص اس کا سارا دودھ پی گیا، حتیٰ کہ سات بکریوں کا دودھ نوش کر گیا۔ پھر وہ صبح کے وقت مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے بکری دوہنے کا حکم فرمایا، چنانچہ بکری دوہی گئی تو اس نے اس کا دودھ پی لیا۔ پھر دوسری بکری کو دوہنے کا حکم دیا تو یہ دودھ وہ سارا نہ پی سکا، پس رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں پی جاتا ہے۔'' (مشکوٰۃ شریف رقم الحدیث ۴۱۷۶)

حضرت شاہ ولی اللہؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ کافر کا مقصود پیٹ ہی پیٹ ہے اور مومن کا نصب العین آخرت ہے اور مومن کے لئے مناسب یہ ہے کہ کھانا کم کھائے اور اس کا کم کھانا ایمان کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے اور طعام کی حرص کفر کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے۔ (حجتہ اللہ البالغہ)

شو قَلِيْلُ النُّوْمِ مِمَّا يَهْجَعُوْن ۔۔۔ باش در اسحار از يَسْتَغْفِرُوْنَ

سوتے وقت تھوڑی نیند لو (اور) آخر شب میں (خداوند غفور و رحیم سے) بخشش مانگو۔ (۳۳۱/۱)

تقلیلِ خواب کی فضیلت بیان کرنے کے لئے ان آیات سے اقتباس کیا ہے ''كَانُوا قَلِيْلاً مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ○'' یعنی یہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور صبح کو استغفار کرتے تھے۔ (الذاریات: ۱۷۔۱۸) غرض یہ کہ تھوڑا سونا نزولِ برکات اور حصولِ سعادت کا ذریعہ ہے اور دعا و مناجات اور توبہ استغفار کے لئے نیم شب اور صبح دونوں اوقات زیادہ موزوں ہیں۔

چاشنے داں تو حالِ خواب را ۔۔۔ پیش محموئ حالِ اولیاء

خواب کی حالت کو تُو اولیاء کی حالتِ محمولیت کے آگے ادنیٰ نمونہ سمجھ۔ (۳۳۲/۱)

اولیاء کرامؒ کی محمولی یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کو بالکلیہ ترک کرکے مرضئ حق کے تابع محض اور منقاد خالص ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے نزدیک تکلفِ فعل اور تجسمِ عمل کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا اور یہ اَمر ان کے لیے بمنزلہ امرِ طبعی بن جاتا ہے اور یہ محمولی خواب کی محمولی سے اکمل ہے۔ محمولی اولیاء کی کیفیت اصحابِ کہف کی سی ہے، جو غار میں بے خود لیٹے پڑے ہیں۔ انہیں دُنیا جہان کی کچھ خبر نہیں۔ اصحابِ کہف کی طرح ان کی کروٹ بھی اللہ بدلتا ہے۔

اسی طرح اولیاء کرامؒ بھی بیٹھتے اُٹھتے چلتے پھرتے ہر حالت میں عشقِ اِلٰہی کے استغراق میں مست و بے خود ہیں ؎

گر شود پُرنُور روزن یا سَرا تو مَداں روشن مگر خورشید را

اگر کوئی روشندان یا گھر روشن ہو تو تم صرف سورج کو (بالذات) روشن سمجھو (نہ کہ اس گھر یا روشندان کو)۔ (۱/۳۳۸)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ کوئی گھر اگرچہ اپنے اندر نور پاتا ہے مگر وہ آس پاس والے روشن گھر سے جگمگا رہا ہے۔ یہ علم و حکمت جو تمہارے قلب کے اندر نزول کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے یہ اولیاء اللہ کی برکت سے ہے۔ تم شکر کرو اور اس کو اپنا کمال سمجھ کر مغرور مت ہو اور صحبتِ پیر سے مستفید ہوتے رہنے سے انکار نہ کرو اور ہرگز خود بینی نہ کرو۔ اس علم و کمال نے مغرور لوگوں کو امتِ مرحومہ سے خارج کر دیا ہے۔ اگر دروازہ یا دیوار دعویٰ کرے کہ میں خود روشن ہوں اور کسی کا پرتو مجھ پر نہیں، دیکھ لو میں خود روشن ہوں تو سورج کہہ سکتا ہے کہ اے خطا کار! جب میں چھپ جاؤں گا تو اصلی راز کھل جائے گا۔

بدن اپنی خوبصورتی اور جمال پر نازاں ہے اور روح نے اپنی شان وشکوہ اور ساز و سامان چھپا رکھے ہیں۔ روح بدن کو کہتی ہے اے گندگی کے ڈھیر! تو ہے کیا؟ خیر میرے پرتِو حیات سے تو نے ایک دو روز زندگی حاصل کر لی۔ میں ذرا تجھ سے علیحدہ ہو جاؤں پھر دیکھنا تیرے دوست تیرے لیے ایک قبر کھودیں گے۔ جب تیرے ہمدرد تجھ کو قبر میں دفن کر کے چل دیں گے پھر جب تو گل سڑ جائے گا تو سب تیری بدبو سے ناک بند کریں گے، پس جس طرح جان کا پرتو جسم پر ہوتا ہے اسی طرح علم و کمالات میں اولیاء کا پرتو میری اور تمہاری روح پر ہے۔ اگر وہ روح یعنی مرشدِ کامل اپنا قدم ہماری روح سے پیچھے ہٹا لے تو ہماری روح ایسی بے کمال رہ جائے جیسے جسمِ بے جان۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ؎

اند کے صرفہ بکُن از خواب و خُور ارمُغاں بہر ملاقاتش بَبر

اپنی نیند اور خوراک میں کسی قدر کمی گوارا کرو اور اس محبوب حقیقی کی ملاقات کے لیے (ایمان اور اعمالِ نیک کی) سوغات لے جاؤ۔ (۱/۳۳۱)

جوع رِزقِ جانِ خاصانِ خدا ست

(بھوک خاصانِ خدا کی رُوح کی غذا ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ بھوک تمام بیماریوں کی دوا ہے اور سب دواؤں سے بڑھ کر دوا ہے۔ اس کو ایسی ویسی چیز نہ سمجھو، یہ تو اللہ کے خاص بندوں کو دی جاتی ہے۔ بھوک میں سینکڑوں فضل و ہنر ہیں۔ زندگی کو موت کی لذت چکھا دینے والی بھوک زندگی سے بہتر ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

جوع خود سُلطانِ داروہاست ہیں جُوع دَر جاں نہ چنیں خوارش مبیں

جان لو کہ بھوک تو تمام دواؤں کی سردار ہے، بھوک کو جان کے ساتھ رکھو اس کو ایسی ناچیز نہ سمجھو۔ (۵/۲۸۷)

رنجِ جُوع از رنجہا پاکیزہ تَر　　　خاصہ دَر جُوع ست صد نفع و ہُنَر

بھوک کی تکلیف بیماریوں سے بہت اچھی ہے، خصوصاً (اس لحاظ سے کہ) بھوک میں سینکڑوں فضل و ہنر ہیں۔ (۵/۲۸۷)

جُوع مر خاصانِ حق را دادہ اند　　　تاشوند از جُوع شیر و زور مند

بھوک کی فضیلت صرف اللہ کے خاص بندوں کو عطا کی گئی ہے تا کہ وہ بھوک کی بدولت شیر کی طرح طاقت ور اور رُوحانی قوم بن جائیں۔ (۵/۲۸۸)

جوع ہر جلفِ گدا را کے دہند　　　چوں علَف کم نیست پیش او مہند

(بھوک کی فضیلت) ہر کمینے بھکاری کو کب دی جاتی ہے، جب کہ دُنیا میں لذائذ کی گھاس کی کمی نہیں اس لیے یہ گھاس اس کے آگے رکھ دی جاتی ہے۔ (۵/۲۸۸)

نبود اندر دل تُرا جُز فکرِ ناں　　　ناید اندر خاطرت جُز ذکرِ ناں

تیرے دماغ میں سوائے روٹی کی فکر کے اور کچھ (متصور) نہیں ہوتا، تیرے دل میں سوائے روٹی کے ذکر کے اور کچھ نہیں آتا۔ (۵/۲۸۸)

بعد چندیں سال حاصل چیستت　　　جوع مردن بہ بود زیں زیستت

اتنے برسوں کے بعد (شکم پُری) سے تجھے کیا ملا (سوائے اس کے کہ کھا لیا اور ہگ دیا)، تیری اس (حرص طعام کی) زندگی سے موت کی لذت چکھا دینے والی) بھوک اچھی۔ (۵/۲۸۸)

دانہ کمتر خور مکُن چندیں رفو　　　چوں کُلُوْا خواندی بخواں لاتُسْرِفُوْا

خوراک تھوڑی کھاؤ اس قدر رفو نہ کرو، جب تم نے قرآن مجید میں یہ حکم پڑھا ہے کہ کھاؤ تو اس کے ساتھ یہ بھی پڑھو کہ اسراف نہ کرو۔ (۵/۱۴۷)

تاخوری دانہ نیفتی تو بدام　　　ایں کُند علم و قناعت و السلام

تا کہ تم دانہ کھاؤ اور جال میں نہ پڑو، قناعت کا علم یہی تلقین کرتا ہے، والسلام۔ (۵/۱۴۷)

نعمت از دنیا خورد عاقل نہ غم　　　جاہلاں محروم ماندہ دَر نَدم

عقل مند آدمی دُنیا کے رزقِ قلیل سے بقائے حیات و ادائے طاعات کا فائدہ اُٹھاتا ہے (جمع مال و حصولِ جاہ کا) غم نہیں (مول لیتا مگر) جاہل لوگ ندامت کے ساتھ (اس فائدہ عظیم سے محروم رہ گئے)۔ (۵/۱۴۸)

بھوک اور کم خوری پر مولانا رومؒ کے اور بھی بہت سے اشعار مثنوی میں درج ہیں لیکن اختصار کی خاطر اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

ستائیسواں باب

تشبیہات کا استعمال مثنوی کا خاصہ ہے

ہر شاعر اپنے کلام میں تشبیہات کا استعمال کرتا ہے۔ شاعر جتنا بلند ہو اس کی تشبیہات بھی اسی اندازے سے بلند پایہ ہوتی ہیں، جس کی وضاحت اس باب میں کی جا رہی ہے تاکہ قارئین مثنوی میں استعمال کردہ تشبیہات سے لطف اندوز ہو سکیں۔

تشبیہات و تمثیلات کیوں استعمال کی جاتی ہیں؟

اس دُنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہیں اور حادثات (واقعات) بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کثرت میں بھی وحدت پائی جاتی ہے، مثلاً اگر ہم کہیں کہ دُنیا میں ان گنت اشیاء موجود ہیں تو اس سے یہ مراد ہے کہ خداتعالیٰ کی وحدت کا ظہور مختلف اشیاء میں کثرت کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ فطرت کے قوانین میں انفرادیت ہے اور اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

فطرت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو یا ناری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

اس مثال سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ اشیاء کی لامحدود کثرت پائی جاتی ہے یعنی لاتعداد انسانوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن ہر انسان کے اندر رائج نظام یا سسٹم ایک جیسا ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت کثرتِ آفرین ہونے کے باوجود اس کی ہر چیز میں چھپی ہوئی ایک حقیقت وحدانی ہے، لہٰذا تمام قسموں (انواع) میں وحدت بھی جلوہ گر ہے۔

جب کوئی شخص اشیاء کی کثرت میں وحدت کو تلاش کر لیتا ہے تو ان میں موجود مشابہت کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دیتا ہے۔ اشعار میں جو جادو پیدا ہوتا ہے وہ اسی تشبیہ کا مرہونِ منت ہے، جیسا کہ علامہ اقبالؒ کے مذکور بالا شعر میں نظامِ شمسی کو ایک ذرّے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نظامِ شمسی میں ایک سورج اور کچھ سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں تو یہی وحدتِ افکار کے مطابق ایک ایٹم (Atom) کے گرداگرد بھی الیکٹرونز (Electrons) گھوم رہے ہیں۔ ہر ایٹم کے الیکٹرون اگرچہ مختلف ہوں لیکن فطرت کا قانون ان سب میں ایک ہی نوعیت کا رائج ہے، جس کو الیکڑونز کی تھیوری (Electronic theory) ثابت کرتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ جس کی حق بات میں اگر سوز نہ ہو تو وہ اندازِ حکمت ہے کہ جس کے دل میں گرمی پیدا نہیں ہوتی اور جب حکمت میں دل کا سوز شامل ہو جائے تو یہ شعر بن جاتی ہے اور یہ شعر دل و روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ اچھا شعر وہی ہو سکتا ہے، جس میں حکمت اور سوزِ قلب کے باوجود تشبیہ موجود ہو۔ علامہ اقبالؒ کے درج ذیل شعر میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں ؎

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است   شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

حق اگر سوز نہ رکھے تو یہ اندازِ حکمت ہے، جب یہ سوز دل حاصل کر لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم   دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت

بوعلی سینا اونٹنی کے غبار میں کھو گیا اور رومیؒ کے ہاتھ نے بڑھ کر محمل کا پردہ پکڑ لیا۔

مذکور بالا اشعار میں لیلیٰ کے محمل سے مراد حقیقتِ مطلقہ سے تشبیہ رکھنا ہے، غبارِ ناقہ سے ہستی کے بیابانِ بے پایاں کو تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک حکیم یعنی (بوعلی) اور ایک صوفی (مولانا رومیؒ) اس اونٹنی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ گرد و غبار کے معقولات میں حقیقت رُوپوش ہو جاتی ہے اور محمل تک پہنچنا محال نظر آتا ہے۔ استدلال اور فلسفہ کا حامی اس کے گرد و غبار میں کھو جاتا ہے اور صوفی دوسری راہ اختیار کرتا ہے اور جرأت مندانہ انداز میں محمل کا پردہ تھام لیتا ہے اور محمل نشین یعنی حقیقت مطلقہ (خدائے تعالیٰ) کے دیدار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اگر یہ تشبیہ نہ لاتے تو حکمت اور پُرسوز شعر کا فرق ظاہر نہ ہوتا۔

نفسی کیفیات کو بیان کرنا ہو تو اس میں بھی ایک اور طرز کی تشبیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کا تعلق عالمِ اَنفُس سے بھی ہے اور عالمِ آفاق سے بھی۔ انسان کا نفس عالمِ انفسی کہلاتا ہے، جو اس کائنات کے اندر موجود ہے اور وہ اس کے اندر اجمالی نقشے کی صورت رکھتا ہے (یعنی Universe in Miniature) جو آفاق میں بالتفصیل موجود ہے وہ انفس میں اجمالی (مختصر) طور پر موجود ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ نفس کی کیفیات (Qualtities) تو ہیں مگر کمیتیں (Quantities) نہیں ہوتی۔ انسان جب نفسی کیفیت کو بیان کرتا ہے تو اس میں مکانیت استعمال نہیں ہوتی لیکن اس کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے مکانیت کی اصطلاحیں تلاش کرنا پڑتی ہیں جو تشبیہات کہلاتی ہیں، مثلاً

محبت ایک کیفیت ہے، جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ مجھے اس سے گہری محبت ہے تو اس کے لیے مادی تشبیہہ استعمال نہیں ہو سکتی لیکن تشبیہہ دینے کے لیے مادی تشبیہہ ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ کبھی انسان اس کے اظہار کے لیے کہتا ہے کہ وہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یا کبھی محبت کو آگ سے تشبیہہ دیتا ہے۔ انگریزی کی ایک نظم میں ہے : Love is the fire in the heart ever burning یعنی محبت دل میں وہ آگ ہے جو ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ شیفتہؔ نے اسی چیز کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ایک صوفی اس عشق کی آگ کے لیے کہتا ہے "اَلْعِشْقُ نَارٌ یُّحْرِقُ مَا سِوَی الْمَحْبُوْبِ" (یعنی عشق وہ آگ ہے جو محبوب کے سوا ہر چیز کو جلا دیتی ہے) اسی طرح مرزا غالب نے ذوقِ وصال اور دردِ فراق کو درجِ ذیل شعر میں بیان کیا ہے ؎

کاوْ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شِیر کا

مرزا غالب نے اپنی تنہائی کی سختی کو اس طرح بیان کیا ہے، جیسے پہاڑوں سے دودھ کی نہر نکالنا ہو اور یہ تشبیہہ ہے۔ نفسِ انسان اپنے لیے کوئی ایسی زبان وضع نہ کر سکا جس سے نفسی کیفیات کا اظہار ہو سکتا ہے، اس لیے جسمانی عالم میں مادی چیزوں کی اصطلاح کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس کو تشبیہہ کہا جاتا ہے۔ ایک شاعر نے اپنی اسی بے بسی یعنی زبانِ حال یا اپنی کیفیت کا اظہار درج ذیل اشعار میں کیا ہے۔

ہم اور زبانِ حال کسی دم بہم نہیں
ہم ہیں تو بے سخن ہیں، سخن ہے تو ہم نہیں

عنقا کے پر لگے ہیں ہمارے خیال کو
گذرے ہیں مثلِ سایہ کہ نقشِ قدم نہیں

اسی بے زبانی کی کیفیت کو عارف رومیؒ نے بڑی حسرت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ حقیقی ہستی کی زبان نہیں ہوتی۔ کاش! اس کی بھی کوئی زبان ہوتی تو مستِ شرابِ عشق بھی اپنا حال بیان کر سکتے، کیونکہ ہستی لامکانیت سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں مکانیت کا دخل نہیں، ہماری زبان اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتی۔ وہ خدا سے یہ التجا کرتے ہیں کہ الٰہی! ہماری ایسے مقام کی طرف رہنمائی کر، جہاں الفاظ کی بے چارگی یا کوتاہی کے بغیر کلام ممکن ہو سکے ؎

کاشکے ہستی زبانے داشتے تا ز مستاں پردہ ہا برداشتے

کاش! عشق کوئی زبان رکھتا تاکہ عاشقوں کے پردے اُٹھا دیتا۔ (۴۴/۳)

اے خدا جاں را تو بنما آں مقام کاندرو بے حرف می روید کلام

اے خدا! تو ہماری رُوح کو وہ مقام عطا کر کہ جس میں بغیر حروف کے کلام کیا جا سکے۔ (۳۲۳/۱)

کیفیات کی زبان نہ ہونے کی وجہ سے عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی اس کو ایک میخانہ قرار دیا گیا ہے۔ حسن نے عشق پر جو حملے کیے ہیں اس نے عاشقوں کو غزلخوانی پر مجبور کر دیا ہے، جہاں معشوق کے ناز و ادا کی بات ہوتی ہے تو وہاں تیر و شمشیر اور دشنہ و خنجر سے معشوقوں پر حملہ ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے کہا ہے کہ اگر معرفتِ الٰہی کی بات کرنا ہو تو بات کا بغیر ساغر و مینا کے ہونا ممکن نہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

صائب نے کہا ہے کہ حق سے آشنائی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب دل و دماغ سے ہر قسم کے خیالات کو نکال دیا جائے لیکن وہ کہتے ہیں کہ صہبائے معرفت شراب بے شیشہ ہے یعنی یہاں بھی وہ صہبا، شیشہ و شراب کی مدد لیتے ہیں ؎

حق را ز دل خالی از اندیشہ طلب کن از شیشہ ء بے مے مئے شیشہ طلب کن

خدا کو فارغ دل سے اور بے اندیشہ طلب کرو، معرفت کے لیے مے شیشہ سے شیشے والی شراب طلب کرو۔ (صائب)

انگریز شاعر ٹینی سن نے کہا ہے کہ حقیقتِ مطلق (خدا) کا وجدان تو ہو سکتا ہے لیکن اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ دُنیا کی چیزیں مظاہر حقیقت کے سائے ہیں اور الفاظ ان اشیائے مظاہر کے سائے ہیں، یعنی الفاظ مذکورہ سائے کے سائے ہیں۔ اگر معاملہ ایسا ہو تو حقیقت کا بیان کرنا کب ممکن ہو سکتا ہے؟ اصل بات تو یہ ہے کہ ایسی حالت میں تشبیہہ سے کام لئے بغیر چارہ نہیں، جہاں جذبات کی بات کی جائے تو سمجھ لیں کہ جذبات کی زبان تشبیہہ ہوتی ہے۔ شاعری میں تمام تر جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس لیے موثر شعر وہی ہوتا ہے جس میں کوئی خوبصورت تشبیہہ دی جائے۔ دل کا پیمانہ کسی تشبیہہ میں ہی چھلکتا ہے۔ خوشی ہو یا غم شاعرانہ زبان اس کا اظہار کرتی ہے۔

مولانا رومیؒ کی تشبیہات

عارف رومیؒ کا پورا کلام حکمت اور عرفان کا ایک گہرا سمندر ہے۔ ان کے لیے کہا گیا ہے کہ مولوی رومی کی مثنوی، معنوی طرز میں قرآن حکیم کو فارسی زبان میں بیان کرتی ہے۔ اپنے کلام میں وہ منطقی استدلال (فلسفی دلائل) کو کسی تشبیہہ یا مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ آپ کے استدلال میں آپ کا ذاتی وجدان شامل ہے۔ وہ حقیقی

صوفی ہیں، نہ کہ بنے ہوئے صوفی۔ وہ حقیقی شاعر ہیں، نہ کہ بنے ہوئے جعلی شاعر۔ جو بات ان کے دل میں آتی ہے وہ اس کو اپنے جذبات کے ساتھ کہہ جاتے ہیں، خواہ کوئی اس کو بے فن شاعر کہے لیکن اللہ نے ان کو یہ خوبی دی ہے کہ ہر باریک بات کے لیے ان کے دماغ میں کوئی دلنشیں تشبیہہ موجود ہے، جس سے سننے والے کو یقین بھی آ جاتا ہے اور وجد بھی طاری ہو جاتا ہے۔ دُنیا بھر کے ادیبوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن اور حدیث کے بعد علمِ رُوحانیت اور معرفت کا کوئی دفتر مثنوی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ زیرِ نظر کتاب کو تحریر کرنے کا واحد مقصد بھی یہی ہے کہ مثنوی تصوف کی بہترین کتاب ہے، اس لیے اس کو عام لوگوں کے لیے عام فہم لفظوں میں لکھ دینا ضروری ہے۔ جو لوگ عملی لحاظ سے مستحکم نہیں ہیں یا جو لوگ رُوحانیت کی طرف آنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور جن کا علم معمولی سطح تک محدود ہے، ایسے مسلمان اس کو سمجھ کر رُوحانیت کے سمندر میں غوطہ لگائیں اور اس میں موجود معانی کو معلوم کرنے کے بعد وجدانی اور رُوحانی کیفیت محسوس کریں۔

ضروری ہے کہ "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" (یعنی لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو) اس اصول کے مطابق یہ ضروری ہے کہ بات ایسی کی جائے جسے حکمت پسندوں کے علاوہ عام انسان بھی سمجھ سکیں۔ راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ وہ علماء مشکل الفاظ اور مشکل ترکیبیں صرف اس لیے لکھتے ہیں کہ لوگ ان کی تحریری قابلیت کی داد دیں مگر ان کی ایسی زبان استعمال کرنے سے کیا فائدہ کہ جس سے ۹۹ فیصد لوگ کتاب سے فائدہ حاصل نہ کر سکیں، چونکہ ہماری آبادی میں علمائے عالی فہم کی تعداد ایک فیصد سے بھی کہیں کم ہے اور ۹۹ فیصد لوگ تو کم علم اور کم فہم ہیں اور اگر لوگوں کی بھاری اکثریت کسی تحریر کو نہ سمجھ سکیں تو کتاب لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ راقم الحروف عام مسلمانوں کی علمی سطح بہت کم ہونے کی وجہ یہی سمجھتا ہے کہ عام علمائے اسلام کی کتابیں عوام کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتیں۔ علماء سے استدعا ہے کہ خدا کے لیے اپنی قابلیت کے گوہر بکھیرنے کی بجائے عام فہم کتابیں لکھیں اور مشکل لفظ اگر لکھنا ناگزیر ہو تو بریکٹ میں یا حاشیہ میں اس کی تشریح کر دی جائے۔ مولانا رومیؒ کے کلام میں یہ بات موجود ہے کہ وہ ایسی سلیس زبان استعمال کرتے ہیں کہ عام فارسی جاننے والا ان کی بات کو سمجھ سکتا ہے اور ایک مشکل بات کو سمجھانے کے لیے وہ ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ جس سے بات ہر کوئی ذہن نشین کر لیتا ہے۔ نیچے کچھ مثالیں دی جا رہی ہیں۔

عارف رومیؒ نے مثنوی کا آغاز ہی ایک تشبیہہ سے کیا ہے۔ وہ اپنی بانسری کی مثال میں یہ بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، یہ زندگی کیا ہے، کدھر سے آئی ہے اور کدھر کو جاتی ہے، خالق اور مخلوق کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے؟ ان سوالات کا جواب فلسفی، اہلِ دانش اور اہلِ دین ڈھونڈتے ہیں لیکن کوئی کہاں تک پہنچا ہے، اس بات کو اہلِ علم جانتے ہیں اور ہر گروہ ان حقائق کا مکمل جواب نہیں دے سکتا۔ عارف رومیؒ ان سوالات کا جواب اپنی بانسری کی مثال سے دیتے ہیں۔ ہر کتاب کا لبِّ لُباب اس کا دیباچہ ہوتا ہے۔ مثنوی کے دیباچے میں بانسری کے

اشعار ہیں، جن میں وہ رُوح کی ماہیت اور اس کے مقصود و میلان کو دلچسپ اور دِلسوز طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ مضمون تمام مثنوی اور تصوف کا لُبّ لُباب ہے، جس طرح سورۂ فاتحہ کو تمام قرآن کا نچوڑ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح مثنوی کے اوّلین اشعار کو مثنوی کی تمہید کہا جا سکتا ہے۔

مثنوی میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس کی طرز اور اس میں موجود ترنم اسی طرح ہے جس طرح کہ اصل موسیقی دردانگیز اور سوز و گداز سے لبریز ہوتی ہے۔ حکماء، صوفیاء و ماہرینِ نفسیات کا یہ خیال ہے کہ موسیقی میں وہ خاصیت موجود ہے کہ جس کے ذریعے انسانی روح اپنی ماہیت (اصل) بلکہ اصلِ حیات و کائنات میں غوطہ زن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولاناؒ نے شروع سے ہی بانسری کی موسیقی سے مدد لی ہے۔ موسیقی میں جو عرفان ہے وہ نہ تو عقلی استدلال سے حاصل ہوتا ہے اور نہ محسوسات سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ تمام چیزیں ہستی کے حجاب و نقاب ہیں اور مولانا رومیؒ کے مطابق یہ پردے بھی ساز کے پردے بن جاتے ہیں۔ غالب نے فرمایا ؎

محرم نہیں ہے تُو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

انسان کی ظاہری صورت عالمِ جسمانی اور مادی سے متعلق ہے لیکن پاکیزہ موسیقی انسان کو جسمانی واسطے سے رُوحانی عالم میں پہنچا دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قوالی یعنی سماع کے ذریعے نوے (۹۰) لاکھ کافروں کو مسلمان کیا۔

اس کتاب کی تصنیف ہم نے امریکہ میں شروع کی مگر آج سے چار سال پہلے جب ہم اپنے ایک مرید ڈاکٹر شہزاد کے پاس نیوپال (نیو یارک کے نزدیک) تبلیغی سرگرمیوں کے سلسلے میں گئے تو وہاں سلسلہ وار تقریروں کے بعد مسجد کے تہہ خانے میں ہی دی گئی ایک پارٹی میں بہت سے سامعین حاضر تھے۔ وہاں ایک ایسے مسلمان امریکن سے ملاقات ہوئی جو صرف قرآن کے ترنم سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا تھا۔ ڈاکٹر شہزاد فرماتے ہیں کہ ہم دونوں پروفیسر ہیں اور ایک دن ہم دونوں اپنے کالج سے پچیس (۲۵) میل دور گھر کی طرف جا رہے تھے تو میں نے اپنے امریکن ساتھی سے کہا کہ میں تو راستے کی ایک مسجد میں نماز پڑھوں گا اور اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں، ورنہ کچھ دیر مسجد میں ٹھہر جائیں تاکہ ہم اکٹھے گھر کی طرف روانہ ہو سکیں۔ وہ پروفیسر مسجد کے اندر ہی ایک برآمدے میں ٹھہر گیا اور نماز میں پڑھی جانے والی آیاتِ قرآنی کے ترنم کی وجہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ جب ڈاکٹر صاحب باہر آئے تو اسے زار و قطار روتا ہوا پایا اور بنابریں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ امریکن پروفیسر صاحب کھانے کے موقع پر راقم الحروف سے بحث میں اُلجھ پڑے کہ آپ مسلمان موسیقی کو حرام کیوں قرار دیتے ہیں، حالانکہ میں قرآن کی موسیقی کو سن کر متاثر ہوا ہوں اور اس موسیقی نے مجھے مسلمان کر دیا۔ لہٰذا بات اس پر ختم ہوئی کہ موسیقی کی دو

قسمیں ہیں، ایک تو لچر پچر موسیقی ہے جس میں واہیات ساز ہوتے ہیں اور ایسی موسیقی والوں کا کلام بھی واہیات ہوتا ہے بلکہ پوری محفل ہی واہیات ہوتی ہے۔ اس قسم کی موسیقی سننے کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ دوسری موسیقی جس کو بعض علماء بھی صحیح مانتے ہیں اور اس موسیقی کی مثالیں قرآن کی قرأت، پاکیزہ مجلس سماع (جو بعض شرائط کے تحت جائز ہے) فطرت کی پیش کردہ موسیقی اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی ثناخوانی یا مثنوی کا ترنم سے پڑھا جانا یہ سب حلال اور جائز ہیں۔

مذکورہ حقیقت کو عارف رومیؒ نے اس انداز میں پیش کیا ہے بلکہ خود بھی حیرت کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں رباب کو دیکھو اس کے تار بھی مادی، اس کی لکڑی بھی مادی، اس پر منڈھا ہوا پوست (چمڑہ) بھی مادی ہے لیکن جہاں مضراب نے اس میں ارتعاش پیدا کیا تو فوراً رُوحِ انسانی کے ازلی دوست (یعنی خدا) کی دلنواز آواز کیسے آنے لگی ؎

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست   از کجا می آید ایں آوازِ دوست

رباب کا خشک تار، خشک لکڑی اور خشک چمڑہ ہے لیکن اس کے ساز میں دوست کی آواز کیسے آنے لگی۔ (مثنوی)

سَرِ پنہاں است اندر زِیر و بَم   فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

اس کی آواز کے اُتار چڑھاؤ میں جو راز مخفی ہے اگر اسے ظاہر کر دوں تو جہان برہم ہو جائے۔ (۱/۳۴)

عامیانہ ساز جو ہمارے برِّاعظم کے علاقوں میں مروّج ہے، ان کو ہندو مذہب بھی مانتا ہے لیکن بانسری کی موسیقی میں وہ بات نہیں، جو لغو موسیقی میں ہوتی ہے اور جس سے جذباتِ اسفل مشتعل ہوتے ہیں۔ بانسری کے ترنم سے مولانا یہ معنی اخذ کرتے ہیں کہ تمام رُوحوں کا تعلق رُوح الارواح یعنی اللہ سے ہے۔ اگر رُوح کو ''نَے'' سے تشبیہ دی جائے تو عالمِ ارواح ایک نیستان (بانسوں کا جنگل) بن جاتا ہے۔ روحیں اللہ کے قُرب سے جدا ہوئی ہیں، جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں لیکن صوفیاء کے نزدیک یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے (کہ روحیں عالم بالا سے نیچے آئی ہیں) روح اپنے وطن سے یعنی عالمِ ارواح سے آئی ہے۔ وہ اپنی ''نَے'' سے اپنے وطن سے جدائی یا فراق کا نالہ گا رہی ہے۔ روحِ انسانی اپنے اصلی وطن یعنی اپنے ماخذ کی طرف عود (رجوع) کرنا چاہتی ہے، جب تک اس کو دوبارہ وصال حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی شکایت (نالہ) دردانگیز طریقے سے بیان ہوتی رہے گی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند

بانسری سے سُن کیا بیان کرتی ہے اور جدائیوں کی کیا شکایت کرتی ہے؟ (۱/۳۱)

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند   از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

کہ جب سے مجھے بانس کے جنگل سے کاٹا ہے، میرے نالے سے مرد و عورت (سب) روتے ہیں۔ (۱/۳۱)

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش　　باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

جو کوئی اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے، وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے۔ (۳۱/۱)

مذکور بالا قصہء حیات بیان کرنے کے لیے بانسری جو نالہ کرتی ہے وہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے جو آنکھ اور زبان کا نُور بیان نہیں کر سکتا (کیونکہ انسان کی جان تو تن میں ہے اور وہ محسوسات کو بیان نہیں کر سکتی) لیکن سرِّ ازلی کو ظاہر کرنے کی کوشش میں رُوح انسانی ''نَئے'' کی تہہ میں غوطہ زَن ہوتی ہے اور اپنے رازِ جدائی بیان کرنا چاہتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ بانسری میں اگرچہ ہوا گردش کرتی ہے مگر یہ ہوا نہیں، آتشِ عشق کے شعلے ہیں ؎

آتش عشق است کاندرِ نَے فتاد

(نَے میں عشق کی آگ لگی ہوئی ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں جس میں یہ آگ نہیں اس کی ہستی تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ فرماتے ہیں کہ (بانسری) کے دو منہ ہوتے ہیں۔ ایک منہ تو بانسری نواز کے منہ میں ہوتا ہے اور دوسرے منہ سے آواز نکلتی ہے۔ رُوحِ انسانی کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اس کا ایک مُنہ ''مُنہ ازلی نَے نواز'' (اللہ) کی جانب ہے اور دوسرا منہ وہ ہے جس سے تمام مظاہر میں آواز پیدا ہوتی ہے۔ رُوح کی بانسری جو خُدا کا وِصال چاہتی ہے، حقیقتاً فراق دینے والی بھی وہی ہستی ہے اور نالہء فراق کی وجہ بھی وہی ہے۔ کسی نے مولاناؒ کے اشعار کا حسبِ ذیل ترجمہ کیا ہے ؎

بانسری سے سُن کیا بیان کرتی ہے　　اور جدائیوں کی کیا شکایت کرتی ہے
کہ جب سے مجھے جنگل سے کاٹا ہے　　میرے نالہ سے مرد و عورت سب روتے ہیں
میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو　　تا کہ میں عشق کے درد کی تفصیل سناؤں
جو کوئی اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے　　وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے
میں ہر مجمع میں روئی　　خوش اوقات اور بد احوال لوگوں کے ساتھ رہی
ہر شخص اپنے خیال کے مطابق میرا یار بنا　　مگر میرے اندر سے میرے رازوں کی جستجو نہ کی

بانسری کی خوبی یہ ہے کہ اس کا سینہ چاک چاک ہوتا ہے، جو بات منہ سے نہیں نکل سکتی وہ سینے کے سوراخوں سے پھوٹنے لگتی ہے اور شرح درد میں سینہ بھی پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو تا کہ میں عشق کے درد کی تفصیل سناؤں۔ (۳۱/۱)

رُوحانیت میں تشبیہہ و تمثیل ہے مگر یہ جہلا کے لیے گمراہ کُن ہے

کوئی بات اگر آسانی سے سمجھ نہ آئے تو وہاں تمثیل سے کام لیا جاتا ہے تا کہ بات سننے والے کی سمجھ میں آ جائے۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی بات سمجھ نہ آئے تو اسے ٹیڑھی طرح سے کہا جاتا ہے تا کہ ٹیڑھا

بندہ بات سمجھ لے۔ اگر کوئی سیدھی مثال کو نہیں سمجھتا تو اس کو کچھ ٹیڑھی قسم کی بات بتاتے ہیں تاکہ اس کے فہم میں آ جائے۔

''پائے کج را کفش می بالیست کج'' (ٹیڑھے پاؤں کے لیے ٹیڑھا جوتا بنانا پڑتا ہے) عوام بھی بچوں کی طرح ہیں، ان کے لیے کئی قصے گھڑنے پڑتے ہیں تاکہ انہیں بات سمجھ آ جائے ؎

بر دروغاں جمع می آید دروغ ــــ لِلْخَبِیْثَاتِ اَلْخَبِیْثُوْنَ زد فروغ

جھوٹوں کے لیے جھوٹ جمع ہو جاتا ہے، اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ خبیث عورتوں کے لیے خبیث مرد ہوتے ہیں۔ (۳۴۰/۲)

ہر کہ اُو جنسِ دروغ است اے پسر ــــ راست پیشِ اُو نباشد مُعتبر

اے بیٹے! جو جھوٹ کا ہم جنس ہے اور اس کے لیے سچ معتبر نہیں ہوتا۔ (۳۴۱/۲)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کی چشمِ بصیرت کھل جائے اور عقل کے دانت آ جائیں تو وہ خالص رُوحانی غذا کو ہضم کر لیتا ہے ؎

ہر کرا دندانِ صدقے رُستہ شد ــــ از دروغ و از خباثت رُستہ شد

جس کے سچائی کے دانت نکل آئے ہیں وہ جھوٹ اور خباثت سے آزاد ہو گیا۔ (۳۴۱/۲)

مولانا رومیؒ نے تمثیل کی بات سمجھانے کے لیے کسی زمانے کا ایک قصہ لکھا ہے اور جس کا ذِکر فردوسی نے شاہنامہ میں بھی کیا ہے۔ وہ یہ کہ حکیم برزد نے نوشیروان سے کہا کہ اس نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ ہندوستان میں ایک درخت ہے، جسے کھانے سے مردہ بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ نوشیروان نے کہا کہ جاؤ اور ہندوستان سے اسے تلاش کر کے لاؤ۔ حکیم برزد قنوج کے مہاراجہ کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ ایسی بوٹی یہاں کوئی نہیں، چلو کسی بڑے رشی یا سنیاسی کے پاس جاتے ہیں۔ اس رشی نے کہا کہ یہ راز کی بات ہے اور فلاں راجہ کے پاس ایک کتاب ہے، جس میں یہ بات لکھی گئی ہے۔ برزد ادھر بھی گیا۔ اس راجہ نے اسے پڑھنے کی اجازت دی اور نقل کرنے سے منع کر دیا۔ برزد نے وہ کتاب زبانی پڑھی اور حفظ کر لی پھر نوشیروان نے اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ کروایا۔ بعد میں عربی میں اور پھر ابنِ احمد سامانی نے اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولاناؒ نے یہ قصہ ان اشعار سے شروع کیا ہے۔

گفت دانائے برائے داستاں ــــ کہ درختے ہست در ہندوستاں

ایک عقلمند نے داستان کے طور پر کہا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا درخت موجود ہے۔ (۳۴۱/۲)

ہر کسے کز میوہٴ اُو خورد و بُرد ــــ نے شود اُو پیرو نے ہرگز بمرد

جس کسی نے اس کا میوہ کھا لیا اور پالیا تو وہ نہ بوڑھا ہوا اور نہ کبھی مرا۔ (۳۴۱/۲)

آخر وہ حکیم ایک جوگی کے پاس گیا اور درخت کا پتا کیا تو وہ سن کر ہنس پڑا اور کہا کہ ارے بھولے! یہ زمین پر

اُگنے والا بوٹا نہیں بلکہ معرفت کا درخت ہے اور حیات بخش چیز کو کوئی درخت کہتا ہے تو کوئی آفتاب اور کوئی اسے سمندر کہتا ہے تو کوئی ابرِ رحمت لیکن تم زیادہ تشبیہات اور مثالوں میں نہ جاؤ، بس اتنی بات سمجھ لو کہ بقائے حیات اس کے کم ترین آثار میں سے ہے۔

شیخ خندید و بگفتش اے سلیم — ایں درختِ علم باشد در علیم

شیخ ہنسا اور اس سے کہا، اے عقل مند! یہ درخت علم کا ہے عالم کے اندر۔ (۳۴۴۳/۲)

پس بلند و بس شگرف و بس بسیط — آبِ حیوانے زدریائے محیط

جو بہت بلند اور بہت عجیب اور بہت پھیلا ہوا ہے، محیط سمندر کا آبِ حیات ہے۔ (۳۴۴۳/۲)

گرچہ فردست اُو اثر دارد ہزار — آں یکے را نام شاید بے شمار

اگرچہ وہ ایک ہے، ہزاروں نتیجے رکھتا ہے، اس ایک کے لئے بے شمار نام مناسب ہیں۔ (۳۴۴۳/۲)

مذکورہ گفتگو تشبیہات کی مثالیں ہیں، جن سے تشبیہات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اس مطالعہ کے بعد مولاناؒ نے ان تشبیہات کو اپنے کلام میں کیوں استعمال کیا، واضح ہو جاتا ہے۔

آخر میں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ مولانا رومیؒ نے مثالوں کے طورِ پر مثنوی میں کچھ ایسے واقعات بیان کئے کہ جسے بعض لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایسے واقعات محض لوگوں کے مذاق کے مطابق لکھے گئے ہیں تا کہ وہ بات فوراً سمجھ میں آ جائے۔ افسوس ہے کہ معترض حضرات کے بیٹے اور بیٹیاں اپنی کتابوں اور ٹی وی میں عجیب پراگندہ باتیں پڑھتے اور دیکھتے ہیں مگر ان پر وہ اعتراض نہیں کرتے اور نہ ہی اجتناب کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ کی ایسی مثالوں سے بہت سے جُہلا گمراہ ہو جاتے ہیں۔

اٹھائیسواں باب

کردار کے معاون اور مہالک

اَخلاقِ حمیدہ اور اَخلاقِ رذیلہ پر مولانا رومیؒ نے بہت کلام کیا ہے اور مثنوی میں صِدق و صَفا، زُہد وتقویٰ، ہوس و ہویٰ، حسد اور حرص وغیرہ کے متعلق کافی سیر حاصل کلام موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہماری تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' جو اِن شاء اللہ کچھ عرصے بعد شائع ہو جائے گی، قابلِ مطالعہ ہے۔ یہاں پر مولاناؒ کے چند اشعار پر کفایت کی جائے گی۔

زُہد وتقویٰ فضلِ الٰہی کا محراب ہے

اسلام کے قوانین کے مطابق دُنیاوی نسبتیں آخرت میں کام آنے والی نہیں ہیں اور اگر کوئی نسبت کام آئے گی تو وہ صرف حضورﷺ کی نسبت ہے۔ ابلیس نے کچھ کام ایسے کیے جس کی وجہ سے اسے معلم الملکوت بنا دیا گیا مگر اپنے اس مقام سے اس میں تکبر پیدا ہوگیا اور اپنے متعلق اس کی سوچ غلط ثابت ہوئی۔

ایک قول مشہور ہے کہ ''اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ''،جس نے سب سے پہلے قیاس کیا، وہ شیطان ہے (الاوائل للسیوطی ص۲۰) شیطان نے کہا: میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور آدمؑ مٹی سے اور چونکہ آگ مٹی سے افضل ہے اس لیے میں انسان سے افضل ہوں مگر اللہ نے ارشاد فرمایا ''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ'' یعنی تم میں اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے بڑھ کر پرہیزگار ہے (الحجرات:۱۳)۔ یہ فضیلت کوئی دُنیوی میراث نہیں، یہ انبیاء کی میراث ہے اور اس کی وارث پرہیزگار لوگوں کی رُوحیں ہیں ؎

گفت حق نے بلکہ لا اَنْساب شد　　　زُہد و تقویٰ فضل را محراب شد

اللہ نے فرمایا (یہ بات) نہیں (بلکہ ہمارے نزدیک) نَسب کا اعتبار ہی نہیں، ہمارے فضل کا محراب (صرف) زُہد و تقویٰ کا مقام ہے۔ (۳۵۱/۱)

مولانا رومیؒ مثنوی شریف میں بیان فرماتے ہیں کہ اعمال کا مرتکب قیامت کو اپنے اعمال اپنے پاس موجود پائے گا۔ حضرت عدی ابنِ حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اس کا پروردگار کلام کرے گا۔ اس کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان یا پردہ نہ ہوگا جو اس کے آگے آڑ ہو، پھر وہ اپنے دائیں طرف نظر کرے گا تو اس کو اپنے عمل ہی نظر آئیں گے جو وہ پہلے کر چکا ہے اور اپنے بائیں نظر کرے گا تو ادھر بھی اس کو اپنے عمل ہی نظر آئیں گے جو وہ کر چکا ہے اور اپنے سامنے دیکھے گا تو اس کو دوزخ دکھائی دے گی، پس بچو دوزخ سے اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ۔'' اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ (مشکوٰۃ)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص کی زندگی جن اخلاق و اطوار اور جن حالات و مشاغل میں گزرتی ہے، انہی کی مناسب صورت میں وہ اُٹھے گا۔ اسی طرح مولانا شاہ ولی اللہؒ کا قول ہے کہ عالمِ مثال میں بعض ایسی مناسبات ہیں جن پر احکام مبنی ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت جبرئیلؑ کا خاص حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں متشکل ہونا کسی خاص معنی پر مبنی تھا اور ان مناسبات کو عارف جان لیتا ہے کہ فلاں عمل کی جزا کس صورت میں ہوئی، اس طرح تعبیرِ خواب کو عارف جانتا ہے کہ خواب میں دیکھی ہوئی صورت کے کیا معنی ہیں۔ غرض اس طریقے سے نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص علم کو چھپائے اور تعلیم کی ضرورت کے وقت اس سے جی چرائے، اس کو آگ کی لگام سے عذاب دیا جائے گا، جو شخص مال کو نہایت عزیز رکھے اور ہمیشہ اس کی محبت میں مگن رہے اس کے گلے میں گنجا سانپ ہار بنا کر ڈالا جائے گا، جو شخص درہم و دینار کی حفاظت جان کے برابر کرے اور خدا کی راہ میں ان کو خرچ نہ کرے تو اس کو انہی چیزوں سے داغ دے دے کر عذاب دیا جائے گا، جو شخص اپنے آپ کو دُنیا میں تیز چیز یا زہر وغیرہ سے عذاب دے تو قیامت کے دن اسی سے اس کو عذاب دیا جائے گا، جو شخص کسی محتاج کو کپڑا پہنائے تو قیامت میں اس کو جنت کی اعلیٰ پوشاک دی جائے گی اور جو کسی غلام کو آزاد کر دے تو قیامت میں اس کا ایک ایک عضو آگ سے آزاد کر دیا جائے گا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

پیشہا و خُلقہا ہمچوں جہیز　　　سوئے خصم آیند روزِ رستخیز

تمام پیشے اور اخلاق سامانِ سفر کی طرح قیامت کے روز اپنے مالک کی طرف آئیں گے۔ (۱۹۱/۱)

صورتے کاں بر نہادت غالب ست　　　ہم براں تصویر حشرت واجب ست

دُنیا میں جو صورت تمہارے وجود پر غالب ہے، اس صورت میں (قیامت کو) تمہارا حشر ہونا واجب ہے۔ (۱۹۱/۱)

پیشہا و خلقہا از بعدِ خواب واپس آید ہم بخصمِ خود شتاب

سو چکنے کے بعد پیشے اور خصلتیں فوراً اپنے مالک کے پاس واپس آ جاتی ہیں (چنانچہ سُنار، لوہار وغیرہ سویرے اُٹھتے ہی اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ (۱/۱۹۱)

پیشہا و اندیشہا در وقتِ صبح ہم بلانجا شد کہ بود آں حسن وقبح

پیشے اور اندیشے سویرا ہوتے ہی اسی جگہ جاتے ہیں جہاں پہلے وہ خوبی یا بُرائی کے سبب تھے۔ (۱/۱۹۱)

چوں کبوتر ہائے پیک از شہرہا سوئے شہر خویش آرد بہرہا

جیسے کہ نامہ بر کے کبوتر دوسرے شہروں سے اپنے شہر کی طرف (اپنے اپنے مکتوب الیہم کے لئے) نامہ و پیام کے حصے لاتے ہیں۔ (۱/۱۹۱)

ہرچہ بینی سوئے اصلِ خود رود جزو سوئے کُلِّ خود راجع شود

جو چیز تم دیکھتے ہو اپنے اپنے اصل کی طرف جاتی ہے، جزو اپنے کُل کی طرف لوٹتا ہے۔ (۱/۱۹۱)

در پناہِ لطفِ حق باید گریخت

(دُنیا کو چھوڑ کر اللہ کی پناہ میں آنا چاہیئے)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کامیابی کی راہ پر گامزن ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ مخلوق کی دوستی چھوڑ کر خالق سے دوستی کرے، جس کی وجہ سے یہ آب و آتش وغیرہ سب اس کے مددگار اور غلام بن سکتے ہیں۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ ٹھنڈی ہو گئی اور جس طرح ہارونؑ، موسیٰؑ اور نوحؑ کو دریا نے راستہ دیا، لہٰذا اس ہستی کی محبت دل میں بسا لو، جس کی وجہ سے دُنیا کی تمام مخلوق کے دل میں تمہاری محبت ڈال دی جائے گی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

در پناہ لُطفِ حق باید گریخت کو ہزاراں لطف بر اَرواح ریخت

(مخلوق کی دوستی کو چھوڑ کر) خداوند تعالیٰ کی مہربانی کی پناہ میں آ جانا چاہیئے جس نے (اپنے بندوں کی جانوں پر) ہزاروں مہربانیاں مبذول فرمائی ہیں۔ (۱/۲۰۴)

آنکہ غافل بود از کشت بہار

(جو بہار میں فصل سے غافل ہوا وہ وقت کی قدر کیا جانے)

مولانا رومؒ وقت کی قدر و قیمت بیان فرماتے ہوئے ایک مثال دیتے ہیں کہ کاشت کار لوگ ہی جانتے ہیں کہ بیج بونے کے ایّام کتنے اہم ہوتے ہیں، جب کہ چند دنوں کی محنت سال بھر کے رزق کے لئے اطمینان دلا دیتی ہے، اگر ان دنوں میں غفلت کی جائے تو سال بھر فقر و فاقہ برداشت کرنا پڑتا ہے "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" (دُنیا

آخرت کی کھیتی ہے) گویا دُنیوی زندگی اعمال کے بیج بونے کا موسم ہے جس کی پیداوار آخرت میں کام آئے گی، لہٰذا فضول مصروفیات کو ترک کر کے اس قیمتی وقت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

آنکہ غافل بود از کشتِ بہار　　اُوچہ داند قیمتِ ایں روزگار

جو شخص (عین) موسم پر (بیج) بونے سے غافل ہے، وہ اس وقت کی قدر کیا جانے۔ (۲۰۴/۱)

گر نبودے نوح را از حق یدے

(اگر نوحؑ کو طوفان میں اللہ کی تائید حاصل نہ ہوتی)

حضرت نوح علیہ السلام کی ظاہری حالت ایسی تھی کہ لوگ آپؑ کے وعظ و نصیحت کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی کشتی کا تمسخر اُڑاتے تھے، لیکن جب ان کی دُعا سے طوفان آیا تو بڑے بڑے پہاڑوں کو بہا کر لے گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی میں لاکھوں شہروں کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ بندگانِ خدا کو تائید الٰہی حاصل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے یہ لوگ مخالفین کی قوت و شان و شوکت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور کوئی غیبی طاقت ہے جو ان کی زبان سے اظہارِ حق کرواتی ہے۔

گر نبودے نوح را از حق یَدے　　پس جہانے را چساں برہم زدے

(چنانچہ) اگر حضرت نوحؑ کو تائیدِ الٰہی کا سہارا نہ ہوتا تو وہ سارے جہان کو (طوفان کے ساتھ) کیونکر تہ و بالا کر سکتے۔ (۳۲۶/۱)

چوں بمردم از حواساتِ بشر

(جو بشری حواس سے فانی ہو جائے تو خدا اس کا مددگار ہوتا ہے)

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ارشاد فرمایا کہ "اے سرکشو! میں اپنی ہستی کو فنا کر کے محبوبِ حقیقی کے ساتھ جی رہا ہوں، میں اپنی رائے سے کچھ نہیں کہہ رہا۔" چنانچہ حدیثِ قدسی ہے "جو بندہ نوافل کے ساتھ میرا قُرب چاہتا ہے تو میں اس کی قوتِ سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، حتیٰ کہ میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے" یعنی اس کے ہر کام میں اللہ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے۔ چونکہ پیغمبر ذاتِ حق میں فنا ہوتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے بایمائے حق کہتا ہے، نہ کہ بتقاضائے نفس "وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی" (یعنی آنحضور ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتے مگر جو کچھ وحی کیا جاتا ہے، بیان کرتے ہیں۔ النجم:۴۳)

چُوں بمردم از حواساتِ بَشَر　　حق مَرا شد سمع و ادراک و بَصَر

جب میں حواسِ بشریہ سے فنا ہو گیا تو پس حق تعالیٰ میری سمع و بصر اور ادراک بن گیا۔ (۳۲۶/۱)

شیر و صیدِ شیر خود آنِ شماست

(سیدھی راہ والے کے لیے شیر بھی ہے اور اس کا شکار بھی)

اس شعر میں یہ بیان ہو رہا ہے کہ صراطِ مستقیم کو اپنانے اور نفس کی خواہشات کو ترک کرنے سے آدمی کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ ایک درندہ یعنی شیر جس کا کام چیر پھاڑ کرنا ہے وہ بھی غلام بن جاتا ہے اور دُنیا اور آخرت کی ہر ظاہری اور باطنی نعمت اس کو مل جاتی ہے، پھر یہ تمام نعمتیں اللہ نے اپنے بندوں ہی کے لئے پیدا فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو تمام نعمتوں سے بے نیاز ہے، لہٰذا بندے کو چاہیئے کہ وہ تمام تر نفسانی خیالات کو ترک کر کے اس خالق حقیقی کی غلامی میں آ جائے ؎

چُوں فقیر آئید اندر راہِ راست　　شیر و صیدِ شیر خود آنِ شماست

جب فقیر صراط مستقیم پر آ کر (خیالاتِ نفسانیہ سے) خالی ہو جاتا ہے (تو اس کو معیتِ حق حاصل ہو جاتی ہے) اس طرح شیر اور شیر کا شکار بھی تمہارا مال ہو جاتا ہے۔ (۳۲۷/۱)

ہر کہ باشد شیرِ اسرار و امیر

(جو اسرارِ حق جانتا ہے، وہ دل کی بات تاڑ لیتا ہے)

اہلِ حق اپنے صفائے باطن سے دوسرے کے مافی الضمیر کو معلوم کر لیتے ہیں، لہٰذا ان کے حضور اپنے دل میں شکوک و شبہات لانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ میدانِ اسرار کے شیر اور سردار ہوتے ہیں۔ خبردار! ان کے حضور سوءظن سے بچو اور اگر ان سے فیض نہ حاصل کر سکو تو اپنا نقصان بھی نہ کرو ؎

ہر کہ باشد شیرِ اسرار و امیر　　او بداند ہر چہ اندیشد ضمیر

جو شخص (میدانِ اسرار کا شیر اور سردار ہوتا ہے، (یعنی مرشدِ کامل) وہ دل کی بات تاڑ لیتا ہے۔ (۳۱۷/۱)

مولانا رومؒ یہاں یہ بیان فرما رہے ہیں کہ جب تُو خود بینی کرے گا تو بادشاہ پر تیری گردن مارنا فرض ہو جائے گا۔ اگرچہ بتقاضائے رحم و کرم اکثر مجرموں کی خطائیں بخش دی جاتی ہیں لیکن کبھی مصلحت اس کی بھی متقاضی ہوتی ہے کہ مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ ایک شیر، بھیڑیا اور لومڑی کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان تینوں نے مل کر تین جانور شکار کیے تو بھیڑیئے نے کہا ہر ایک کے حصہ میں ایک ایک جانور آتا ہے لیکن لومڑی نے کہا، حضور! یہ تینوں تمہارے ہیں مگر بھیڑیئے نے گائے شیر کے لئے، بکری اپنے لئے اور خرگوش کو لومڑی کے لئے تقسیم کرنے کی رائے دی۔ شیر نے بھیڑیئے کی خود بینی پر اس کو سزا دی اور اس کو پنجہ مار کر ختم کر دیا مگر لومڑی کی خودی پر اس کو تینوں جانور دے دیئے گئے۔ بادشاہی شیر کا حق ہے، اس کو بادشاہِ حق تسلیم کرو، لہٰذا بڑائی اس خالقِ حقیقی کی ہے، اپنے آپ کو اسی کے سامنے فنا کر دو پھر مقامِ اولیٰ سے نوازے جاؤ گے۔ شیر نے بھیڑیئے کو کہا ؎

چوں نگشتی فانی اندر پیشِ من فرض آمد مر ترا گردن زدن

جب تو میرے حضور میں محو (و بے خود) نہ ہوا تو تیری گردن مارنا میرا فرض تھا۔ (۳۱۸/۱)

با ھویٰ و آرزو کم باش دوست

(آرزو اور ھویٰ کی غلامی نہ کرو)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ حسد ایک ایسی رذیل چیز ہے جو بہت سے رذائل کا سرچشمہ ہے۔ حسد کا مطلب ہے کسی کی بہتری پر جلنا، جس طرح شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کی قدر و منزلت دیکھ کر ان سے حسد کیا اور کہا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا اور انسان کو مٹی سے پیدا کیا (الاعراف۔۱۲) "خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ" کہہ کر حسد کا اظہار کیا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ حسد خود انسان کے باطن کا مرض ہے۔ جب حسد کا مرض دل پر اثر کرتا ہے تو حواس، فکر اور عقل وغیرہ یعنی تمام دماغی و قلبی خاندان اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، یعنی یہ تمام طاقتیں بجائے کوئی اچھا عمل کرنے کے حسد کے ماتحت کام کرنے لگتی ہیں۔ راہِ سلوک پر چلنے والے کے لئے بھی یہ دُشوار گزار گھاٹی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں وہ شخص خوش نصیب ہے جو حسد سے بچا ہوا ہے۔ حسد کے بارے میں حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ ''حسد سے بچو! حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔'' اگر حسد سے بچنا چاہو تو کسی کامل مرد کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ، اسی طرح نفسانی خواہشات سے بھی بچو۔ کیونکہ جو ھویٰ کا بندہ ہو (اپنی ذاتی خواہش کی پیروی کرتا ہو) تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے یعنی خدا کی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ اس ہوائے نفسانی کو دُنیا کی کوئی طاقت زائل نہیں کر سکتی لیکن مرشدِ کامل کے وسیلے سے اس ہوائے نفسانی کو زائل کیا جا سکتا ہے، پس جس شخص کو حسد و ہویٰ سے بچنا ہے وہ کسی شیخِ کامل کا دامن پکڑ لے تو وہ حسد و ہویٰ سے بچ جائے گا۔

نیچے دیئے گئے شعروں میں مولاناؒ بیان فرماتے ہیں کہ انسان کو نفسانی خواہش کے تابع نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ تمہیں اللہ کی راہ سے گمراہ کرتی ہے اور جس نے نفسانی خواہشات پر قابو پا لیا تو وہ شخص کامیاب ہوا۔ ہوائے نفسانی پر قابو پانے کے لئے کسی کامل کے سائے میں پناہ لو (شیطانی وسواس سے امن میں رہو گے) مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

با ھویٰ و آرزو کم باش دوست چوں یُضِلُّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُوست

(غرض) نفسانی خواہش اور قضائے فضول کے تابع نہ ہو، جو کہ تم کو اللہ کے راستہ سے گمراہ کرتی ہے۔ (۳۰۹/۱)

آپ کی مراد اس شعر سے یہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے: یعنی اے داؤدؑ ہم نے تم کو دُنیا میں خلیفہ بنایا ہے، پس لوگوں کو راہِ حق کی تبلیغ کرو اور اپنی ذاتی خواہش کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تم کو راہِ خدا سے گمراہ کر دے گی، بے شک جو لوگ راہِ خدا سے گمراہ ہو جاتے ہیں، ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ (صٓ: ۲۶)

ایں ہوا را نشکند اندر جہاں ہیچ چیزے ہمچو سایہ ہمرہاں

آرزو (اور) اس ہوائے نفسانی کو دُنیا میں کوئی چیز رفقائے طریق یعنی مرشدانِ کامل کے بغیر زائل نہیں کر سکتی۔ (۳۰۹/۱)

گفت پیغمبر علیؓ را کاے علیؓ شیرِ حقی پہلوانی پُر دلی

جنابِ رُوحِ دو عالم، رُوحِ کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اے علیؓ! تم اللہ کے شیر ہو، بہادر ہو، دلیر ہو۔ (۳۱۰/۱)

(اہلِ ہند کُشتی لڑنے والوں کو پہلوان کہتے ہیں)۔

آفتابِ رُوح نے آنِ فلک کہ زنورش زندہ اند اِنس و مَلک

وہ رُوحانی سورج ہے، آسمان سے منسوب (ہونے والا سورج) نہیں، اس کے نور سے انسان اور فرشتے زندہ ہیں۔ (۳۱۱/۱)

در بشر روپوش گشت است آفتاب فَھِمُ کُن وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

وہ رُوحانیت کا آفتاب (ایک) بشر کے جسم میں پنہاں ہو رہا ہے، اس نکتے کو سمجھ لو اور اللہ بہتر جانتا ہے۔ (۳۱۱/۱)

(مراد یہ کہ کسی کامل، اکمل، مکمل و اطہر مرشد سے توسّل پیدا کرو)

یا علیؓ از جملہء طاعاتِ راہ بر گزیں تو سایہء خاصِ اِلٰہ

اے علیؓ راہِ (حق) کی تمام طاعتوں میں سے خاصانِ خدا کے سایہء (صحبت میں رہنے) کو ترجیح دو۔ (۳۱۱/۱)

ہر کسے در طاعتے بگریختند خویشتن را مخلصے انگیختند

ہر شخص ایک (نہ ایک) طاعت میں پناہ لے رہا ہے (اور) اپنے لیے نجات کی صورت نکال رہا ہے۔ (۳۱۱/۱)

تو برو در سایہء عاقل گریز تا رہی زاں دُشمنِ پنہاں ستیز

تم مَردِ کامل کے سایہ میں پناہ لو تاکہ اس میں چھپے وار کرنے والے دُشمن (یعنی نفس و شیطان) سے امن میں رہو۔ (۳۱۱/۱)

تحت الشعور میں خوابیدہ شہوات اور سفلی معاملات

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب انسان یہ معلوم کر لے کہ ابھی مجھ میں کچھ کمی ہے تو یہ اس کی ترقی کا پہلا قدم ہے اور جہاں کوئی خود کو کامل بزرگ سمجھ لے تو سمجھ لو کہ اس کی ترقی رُک گئی۔ زندگی یا آگے بڑھتی ہے یا پیچھے کی طرف۔

ابلیس نے کہا: "اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ" میں انسان سے بہتر ہوں (سورۃ الاعراف: آیت ۱۲) تو وہ شیطان قرار دیا گیا۔

مولاناؒ ایک اور مثال دیتے ہیں کہ ندی یا تالاب کا پانی ساکن ہو تو صاف معلوم ہوتا ہے اور اگر کسی جنبش سے اس کی تہہ کی مٹی ہل گئی تو یہ مٹی پانی کو گدلا کر دیتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے کہ آزمائش اور نفس کے ارتعاش سے اگر یہ خوابیدہ خباثتیں بیدار ہو جائیں تو انسان لوگوں کے لیے تماشہ بن جاتا ہے ؎

علتے بدتر زپندارِ کمال نیست اندر جانت اے مغرورِ ضال

کمال کے گھمنڈ سے زیادہ بدتر بیماری تیری روح میں اور کچھ نہیں ہے، اے گمراہ مغرور! (۳۳۴/۱)

علتِ ابلیس "اَنَا خَیْرٌ" بُدست   ویں مرض در نفسِ ہر مخلوق ہست

ابلیس کی بیماری کہ "میں اچھا ہوں" بُری تھی، یہ مرض ہر مخلوق کے نفس میں موجود ہے۔ (۱/۳۳۴)

گرچہ خود را بس شکستہ بیند او   آب صافی داں و سرگیں زیرِ جُو

اگرچہ وہ خود کو کتنا ہی متواضع خیال کرے یہ بُرائی تو نہر کے صاف پانی کے نیچے گندگی کی طرح ہے۔ (۱/۳۳۴)

چوں بشورانی وُرا در امتحاں   آبِ سرگیں رنگ گردد در زماں

جب تو اس کو بطور امتحان ہلائے گا فوراً پانی گوبر کے رنگ کا ہو جائے گا۔ (۱/۳۳۴)

نفس کے ان میلانات کا خود اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ نہر خود اپنی صفائی نہیں کر سکتی۔ تلوار خود اپنا دستہ نہیں بنا سکتی، اس رُوحانی مرض کے لیے کسی مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔

حسد

ریزہ ریزہ صدق ہر روزہ چرا

(ہر روز کا ذرا ذرا سا صِدق ہمارے اعمالنامے میں کیوں جمع نہیں ہوتا)

احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان نیکیوں کی گٹھری جمع کرتا ہے اور مرنے کے بعد جب اس کے اعمال نامہ کی گٹھڑی کھولی جاتی ہے تو اس میں بہت کم اعمال کا وزن موجود ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ نیک اعمال تو بہت کرتے ہیں مگر غیبت، چغلی، بدخوئی اور اعمالِ بد کی وجہ سے وہ نیکیاں کاٹ لی جاتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت کم نیک اعمال اس کے نیکی کے پلڑے میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اس حدیث سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنی نیکیوں کی بقاء کے لیے نیکیوں کو ضائع کرنے والے اعمال سے گریز کرنا چاہیئے۔

مولانا رومیؒ کے درج ذیل شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے نفس کے اندر ضرور رُوحانی چور یعنی شیطان موجود ہے، چنانچہ احادیث میں وارد ہے "اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِ نْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ" (بلوغ المرام) بے شک شیطان انسان کی رگ رگ میں خون کی طرح پھرتا ہے، یہی چور ہے جو ذخیرۂ اعمال کو تباہ کر دیتا ہے، ورنہ حشر کے دن تک اس ذخیرہ میں کچھ تو جمع ہوتا۔ چور خزانہ پر گھات لگایا ہی کرتا ہے لیکن چوکیدار کا کام ہے کہ اس کو دفع کرتا رہے۔ شیطانی خطرات و وساوس سے دل کو بالکل منزّہ رکھنا مستحب ہے اور یہ کاملین کا کام ہے جو محبوبِ حقیقی کے لئے منزلِ دل کو ہر شے سے خالی کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ جان سے بھی موذی اعمال کو دُور رکھے ہوئے ہیں۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ آہنِ دل جب عبادتِ الٰہی سے لالو لال ہو جاتا ہے اور اس سے انوارِ غیب کے شرارے جھڑنے لگتے ہیں، جن سے عرفان و اِیقان کی روشنی متصور ہے تو دزدِ شیطان جو انسان کے پہلو میں چھپا ہوتا ہے، چپکے سے ان انوار کو بجھاتا ہے اور اس عبادت گزار کے حالات و واقعات کو منور نہیں ہونے دیتا۔ اللہ اس دزدِ لئیم

سے پناہ دے۔ فرماتے ہیں ؎

ریزہ ریزہ صِدق ہر روزہ چرا　　جمع می ناید دریں انبارِ ما

(زیادہ انبار نہ سہی) ریزہ ریزہ صدق و اخلاص کا ہر روز ہمارے اس ذخیرے میں جمع کیوں نہیں ہوتا؟ (۱/۶۹)

کز حسد آلود گردد خاندان

(حسد میں گھرانے کا گھرانہ مبتلا ہو جاتا ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ حسد انسان کے باطن کا مرض ہے، حسد سے بچو۔ حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے، جیسے آگ ایندھن کو۔ حسد کے تباہ کن نقصانات سے بچنے کے لئے کسی مرشدِ کامل کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ تاکہ حسد جیسے موذی مرض سے چھٹکارا حاصل کر سکو۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں خاص طور پر اللہ والوں یعنی بزرگوں سے حسد کرنے سے گریز کرو کیونکہ یہ عمل شیطان کا ہے، اس نے ہی سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام سے مرتبے کی وجہ سے حسد کیا۔ اگر تم بزرگوں سے حسد کرو گے تو اس سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن اس حسد کی وجہ سے تمہارا اپنا دل ہی تاریک ہو گا، لہٰذا اولیائے کرامؒ کے قدموں کی خاک بن جاؤ اور حسد پر مٹی ڈال دو۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

ایں جسد خانہ حسد آمد بداں　　کز حسد آلودہ گردد خانداں

یہ جسم حسد کا گھر ہے، یہ بھی یاد رہے کہ حسد میں گھرانے کا گھرانہ مبتلا ہو جاتا ہے۔ (۱/۷۴)

چوں کُنی با بے حسد مکر و حسد　　زاں حسد دل را سیاہیہا رسد

جب تو (کسی) بے حسد (بزرگ) کے ساتھ مکر و حسد کرے گا (تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا)، اس حسد سے تیرے ہی دل پر تاریکیاں چھا جائیں گی۔ (۱/۷۴)

حشرِ پُر حرصِ سگِ مردار خوار

(حریص اور مردار خور کُتے کا حشر قیامت کو سور جیسا ہو گا)

مولاناؒ فرماتے ہیں جس طرح دوسرے مجرموں کا حشر ان کے اعمالِ بد کے مناسب ہو گا، اسی طرح حرام کاری کرنے والوں کی شرمگاہیں اس قدر بدبودار ہوں گی کہ اہلِ محشر تنگ آ جائیں گے اور شراب پینے والوں کے منہ سے بھی سخت بدبو آئے گی، اسی طرح حرص کرنے والے آدمی کا حشر قیامت کے دن سور کی شکل میں ہو گا۔ اَخلاقِ بد اور عاداتِ قبیحہ دُنیا میں محض کیفیاتِ نفسانیہ ہیں جو محسوس بحواسِ ظاہر نہیں ہو سکتیں مگر قیامت میں وہ خاص خاص شکلوں میں نمودار ہو کر اپنے مرتکبین کے لیے باعثِ عذاب ہوں گی، جو خصلت تمہارے وجود میں تمام خصائل پر غالب ہے اسی کے مطابق حشر میں تمہاری صورت کا ہونا واجب ہے، مثلاً سود خور کی شکل سور جیسی ہو گی۔ حدیث شریف میں آیا ہے "یُبْعَثُ النَّاسُ عَلٰی نِیَّاتِھِمْ" یعنی قیامت میں لوگ اپنی اپنی نیت کے موافق اُٹھائے جائیں گے

اور دوسری حدیث شریف میں ہے "يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَامَاتَ عَلَيْهِ" یعنی ہر بندہ قیامت کو ان اعمال کی شکل میں اُٹھایا جائے گا، جن میں اس نے وفات پائی تھی ۔

حشرِ پُر حرصِ سگِ مُردار خوار صورتِ خُوکے بود روزِ شمار

(جس طرح ایک) حریص مُردار کھانے والے کتے کا حشر قیامت کے دن سور کی شکل میں ہوگا۔ (۱۴۲/۲)

آں حسد از عشق خیزد نہ از جحُود

(یہ سجدہ نہ کرنے کا حسد بھی عشق سے پیدا ہوا نہ کہ انکار سے)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ شیطان نے جب سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ شیطان کو بزعم خویش خداوندتعالیٰ سے عشق تھا، اس لیے اس نے گوارا نہ کیا کہ آدمؑ کو خدا کی بارگاہ میں اس سے زیادہ تقرب حاصل ہو۔ اب اس کو خواہ حسد کہو یا رقابت، بہرکیف عاشقوں کے نزدیک ہم چشمی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں بلکہ غیرتِ عشق تو قتل ہونے میں بھی کسی کی شرکت گوارا نہیں کر سکتی اور اس قسم کا حسد تو یقیناً انتہا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے، جہاں کوئی غیر شخص دوست کے ساتھ ہم نشین ہو۔ شیطان کا خیال کہ اسے خدا سے محبت یا عشق تھا تو یہ ایک غلط بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ عاشق کا کام سرِتسلیم خم کرنا ہے نہ کہ محبوب کے ساتھ گستاخی کا مرتکب ہونا۔ روایات میں ہے کہ حضرت جنیدؒ کو ابلیس سے ملنے کی خواہش تھی تو ایک دن جب ابلیس ان کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ اے لعین! تمہیں خدا کے حکم سے رُوگردانی کی جرأت کیسے ہوئی۔ ابلیس نے کہا کہ جنیدؒ! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرتا؟ اس کے اِس جواب سے آپ کو حیرت ہوئی کہ بات تو یہ ٹھیک کہتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اُسی وقت اللہ نے میرے دل میں یہ بات القا فرمائی کہ اسے کہہ دو کہ اگر تم نے خدا کو خدا سمجھ لیا تھا تو اس کے حکم سے انکار کیوں کیا؟ جونہی میرے دل میں یہ القا ہوا تو ابلیس دُم دبا کر بھاگ گیا اور کہنے لگا اے جنید! تم نے تو مجھ کو جلا دیا ہے ۔

ترک سجدہ از حسد گیرم کہ بود آں حسد از عشق خیزد نہ از جحود

میں مانتا ہوں کہ (میں نے) آدمؑ کے آگے سجدہ نہیں کیا تھا، یہ حسد عشق کی وجہ سے تھا نہ کہ انکار سے۔ (۲۵۱/۲)

اس کے بعد مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ جو سورج کا حاسد ہو وہ سورج کے وجود سے ہی اندھا ہو جاتا ہے۔ آفتاب کا وجود ایسا ہے کہ جو چیز تاریکیٔ شب میں دکھائی نہیں دیتی وہ نظر آنے لگتی ہے لیکن جس شخص کو آفتاب نہیں بھاتا، اس شخص کے لئے اس کا اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ وہ اس سے روشنی حاصل کرنے کی بجائے اُلٹا اندھا ہو جاتا ہے، جس طرح کوئی شخص کسی باکمال بزرگ سے حسد کرتا ہے تو اس سے فیض حاصل کرنے کی بجائے اُلٹا نقصان اُٹھاتا ہے۔ حاسد کو حسد عموماً دوسرے کی خوشحالی اور فارغ البالی سے ہوتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ خوشحالی کے ساتھ

منکسر المزاج بھی ہے تو وہ جل اُٹھتا ہے۔ اسی طرح نہ لوگوں کے لئے اللہ کی نعمتوں کا خاتمہ ہوگا اور نہ ہی وہ زندگی بھر حسد سے نجات پائے گا۔ حسد ایک ایسی بلائے بد ہے کہ جو انسان اس آفت میں ملوث ہو وہ تمام برکات سے محروم رہتا ہے، اگرچہ وہ خود تمہارا مرشد ہی کیوں نہ ہو۔ اس حسد کا نجس ترین دھبہ اس کے تقدس و بزرگی میں بھی چھپ نہیں سکتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

آنکہ اُو باشد حسودِ آفتاب — کور می گردد زبودِ آفتاب

جو کہ سورج کا حاسد ہوتا ہے وہ سورج کے وجود سے اندھا ہو جاتا ہے۔ (۲/۱۱۶)

ایں حسد در فعل از گرگاں گذشت

(یہ حسد اپنے فعل میں بھیڑیوں سے بڑھا ہوا ہے)

درج ذیل شعر میں بھیڑیے سے مُراد باطنی حسد ہے جو اصلی بھیڑیوں سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ یوسفؑ کے بھائیوں نے یہ بہانہ کیا کہ ان کے بھائی کو بھیڑیئے نے کھا لیا، درحقیقت وہ کنوئیں میں ڈالے گئے تھے اور یہ فعل باطنی حسد کو ظاہر کرتا ہے۔ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالا اور یہ کام کوئی بھیڑیا نہ کر سکتا تھا۔ روزِ قیامت حاسدوں کی شکل بھیڑیوں کی صورت میں ہو گی۔

گرگِ ظاہر گردِ یوسفؑ خود نگشت — ایں حسد در فعل از گرگاں گذشت

سچ مچ کا بھیڑیا تو یوسفؑ کے پاس بھی نہیں پھٹکا (جو کچھ ہوا وہ حسد کے باطنی بھیڑیے کا فعل تھا) حسد (باطنی بھیڑیا) اپنے فعل میں سچ مُچ کے بھیڑیوں سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ (۲/۱۴۲)

حصہ پنجم

انتیسواں باب

مثنوی اور قرآن

(مثنوی میں اشاراتِ قرآن)

مثنوی مولانا رومؒ ایک ایسی کتاب ہے، جس میں مولاناؒ نے تمام رُوحانی موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور اس کو رُوحانی کُتب پر سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بعض مشائخ مثنوی کو رُوحانیت پر سب سے بڑی تحریر خیال کرتے ہیں۔ مولانا جامیؒ نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ مولانا رومیؒ کی مثنوی فارسی زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتی ہے۔

مثنویٔ معنویٔ مولوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

(مولانا رومیؒ کی مثنویٔ معنوی حقیقتاً فارسی زبان میں قرآن ہے)

مولانا رومیؒ نے قرآن کی بہت سی آیات کی کچھ روایتوں کی مدد سے تفسیر کرنے کے بعد ان آیات کی وضاحت میں مطابقت پیش کی ہے، جس سے آیاتِ قرآنی آسانی سے عوام کے ذہنوں پر اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے مجنوں کے متعلق ایک حکایت یوں بیان کی ہے کہ کسی نے مجنوں کو صحرا میں انتہائی استغراق کی حالت میں اس طرح دیکھا کہ وہ زمین پر کچھ حروف لکھ رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجنوں کسی کو خط لکھ رہا ہے۔ جب مجنوں سے اُس کے متعلق استفسار کیا گیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ وہ خط نہیں لکھ رہا تھا بلکہ لیلیٰ کے نام کو بار بار زمین پر لکھنے سے اپنے دل کو تسلی دے رہا تھا ؎

گفت مشقِ نام لیلیٰ میکنم خاطرِ دل را تسلی میدہم

مجنوں نے کہا کہ میں لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اس طرح میرے دل کو تسلی ہوتی ہے۔

اس مثال سے آپ نے قرآن کی آیت "اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (یعنی یاد رکھو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے) (الرعد: ۲۸) کی دلچسپ تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ جن کو اللہ سے محبت ہو ان کے دل اس کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح آپ جو بھی مثال بیان کرتے ہیں اس میں قرآن اور حدیث کا حوالہ ملتا ہے۔ قرآن کے مضامین کی وضاحت آپ نے مختلف مقامات پر کی ہے، جن میں سے چند ایک بطور نمونہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

قرآن کے معانی کا سمجھنا محض قرأت سے افضل ہے

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ الفاظِ قرآن کا یاد کرنا بھی عبادت ہے مگر اس کے معانی پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا زیادہ افضل ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم قرآن مجید کے اسرار و حکم سمجھنے اور ان پر غور کرنے میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ قرآن مجید کے الفاظ حفظ کرنے کی ان کو فرصت نہ تھی، حالانکہ الفاظِ قرآن کا یاد کرنا بھی عبادت ہے مگر چونکہ معنی پر غور کرنا الفاظ کے یاد کرنے سے افضل ہے اس لیے وہ افضلیت کی طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے، پس افضل کے مقابلے میں غیر افضل کو چھوڑ دیا جاتا ہے، خواہ وہ فی نفسہٖ امرِ حسن ہی کیوں نہ ہو۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ پھر امرِ حسن کے مقابلے میں امرِ قبیح کو کیوں نہیں چھوڑنا چاہیئے جو بے ہودہ کام اور فضول خیالات ہیں، غرض جس صحابی کو قرآن مجید کا چوتھا حصہ بھی حفظ ہو جاتا وہ اپنے حق میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ کلمات سنتا کہ یہ تو ہم سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ خدانخواستہ صحابہ کی قوتِ حافظہ ضعیف تھی بلکہ جیسے کہ صاحبِ شرعۃ الاسلام نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم دس آیات پڑھتے تھے اور جب تک ان کے پورے پورے اسرار و نکات اور احکام و مسائل نہ سیکھ لیتے، آگے نہ بڑھتے تھے۔ ابنِ عطا کہتے ہیں کہ میں پہلے دن رات میں دو مرتبہ قرآن ختم کر لیتا تھا لیکن اب یہ حال ہے کہ چودہ سال سے میں نے قرآن کا پڑھنا شروع کر رکھا ہے اور بمشکل سورۂ الانفال تک پہنچا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ یہ اس لئے کہ پہلے میں غفلت میں اور غرور سے پڑھتا تھا اور اب بصیرت و انتباہ سے پڑھتا ہوں (منہج)۔ آگے ارشاد ہے کہ اصحابِ رسول ﷺ کا اتنا قرآن حفظ کر لینا بھی بڑی بات تھی۔ قرآن عالیشان بادشاہ کے سوا اور کسی کے لئے ممکن نہیں اور یہ صحابہ ہی کی شان ہے اس لیے کہ محبتِ حق کی ایسی مستی میں حفظِ قرآن کے ادب کی رعایت رکھنا ممکن نہیں ہوتا اور اگر ہو تو موجب تعجب ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح قرآن کے آثار و معانی میں کامل انہماک کے ساتھ حفظِ الفاظ کا اہتمام مشکل امر تھا مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جلالتِ شان کے آگے وہ آسان ہو گیا۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ لوگ سارا قرآن حفظ کرنے کو تو کر لیتے ہیں مگر ان کا حفظِ قرآن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حفظِ قرآن سے کیا مناسبت رکھتا ہے؟ فرماتے ہیں جس طرح لاٹھی اندھوں کو محبوب ہوتی ہے، اسی طرح دل کے

اندھے الفاظ یاد کرنے کے دلدادہ ہوتے ہیں، یعنی اندھا قرآن کے الفاظ اپنے اندر بھر لینے کے لئے قرآن کا صندوق بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اندھوں کے لئے لاٹھی سہارا ہوتی ہے تو دل کے اندھوں کے لئے قرآن کے الفاظ سہارا ہیں، انہی کی بدولت وہ کماتے کھاتے ہیں، نماز میں بھی اس کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ میں غلطی ہو جائے تو نماز ٹوٹ جائے، بخلاف اس کے جو لوگ اس کے معانی میں مست ہیں، وہ نہ دنیا کمانے کی پرواہ رکھتے ہیں اور نہ ان کی نماز باطل ہوتی ہے کیونکہ مست و مجنوں مکلّف ہی نہیں ہوتے اور جس طرح صندوق میں سیم و زر اور مال و متاع محفوظ رکھا جاتا ہے اسی طرح ان دل کے اندھوں کا سینہ قرآن کے الفاظ کا صندوق ہے، جس سے وہ مال و زر کما کر کھاتے ہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ خالی الفاظ کو رٹنے والے حافظِ قرآن بہرحال ان لوگوں سے بہتر ہیں جو حفظِ قرآن سے محروم ہیں۔ اسی طرح مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایسا صندوق جو خالی ہے وہ اس صندوق سے بہتر ہے جو چوہوں اور سانپوں سے بھرا ہوا ہے۔ مذکورہ بالا گفتگو سے مولاناؒ نے یہ واضح فرمایا کہ قرآن مجید کو خالی الفاظ سے ہی نہ یاد کرو بلکہ اس کے معانی و اسرار کو بھی سمجھو اور پھر یہ فرمایا کہ قرآن مجید کے الفاظ کو یاد کرنا بھی عبادت ہے مگر معانی کو سمجھنا اس سے افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کو کچھ بھی نہ یاد ہو اس سے الفاظ یاد کرنے والا افضل ہے اور جس کا سینہ خالی ہے وہ اس شخص سے بہتر ہے جس کا سینہ شرور و مفاسد سے بھرا ہوا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

در صحابہ کم بُدے حافظ کسے — گرچہ شوقے بود جاں شاں را بسے

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں حافظِ قرآن کم ہوتے تھے، اگرچہ اُن کی جان کو اس کا شوق بہت تھا۔ (۱۳۹/۳)

رُبعِ قرآں ہر کرا محفوظ بود — جَلَّ فِینَا از صَحابہ میشُود

جس صحابی کو قرآن مجید کا چوتھا حصہ بھی حفظ ہو جاتا، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ سنتا کہ یہ تو ہم میں بڑھ گیا۔ (۱۴۰/۳)

جمع صورت با چنیں معنیِ ژرف — نیست ممکن جُز زِسُلطانے شگرف

(قرآن کے) ایسے گہرے معنی کے ساتھ الفاظ کا جمع ہونا ایک عالی شان بادشاہ کے سوا اور کسی کے لئے ممکن نہیں۔ (۱۴۰/۳)

در چنیں مستی مراعاتِ اَدَب — خود نباشد وَر بود باشد عُجب

محبِّ حق کی ایسی مستی میں (حفظِ قرآن کے) ادب کی رعایت رکھنا ہو نہیں سکتا اور اگر ہو تو (موجب) تعجب ہے۔ (۱۴۰/۳)

جمع ضِدّین از نیاز اُفتاد و ناز — باز در وقتِ تحیُّر امتیاز

(اور جیسے) نیاز و ناز (کے اکٹھا ہونے) سے جمع ضدین واقع ہوتا ہے اور پھر (جیسے) حیرت کی حالت میں تمیز (کا

باقی رہنا جمع ضدین ہے)۔ (۱۴۰/۳)

چوں عَصا معشوقِ عُمیاں میشود کور خود صندوقِ قرآں میشود

جس طرح لاٹھی اندھوں کو محبوب ہوتی ہے (اسی طرح دل کے اندھے الفاظ یاد کرنے کے دل دادہ ہوتے ہیں) اندھا (قرآن کے الفاظ اپنے اندر بھرلینے کے لئے) قرآن کا صندوق بن جاتا ہے۔ (۱۴۰/۳)

عجائباتِ قرآن پر بہت سے اور مضامین بھی ہیں جو ہم اپنی دیگر کتب میں بیان کرچکے ہیں۔

گفت کوراں خود صنادیق اند پُر از حُروف و مصحف و ذکر و نذُر

(کسی بزرگ نے ٹھیک) کہا ہے کہ (دل کے) اندھے کیا ہیں؟ حدیث، قرآن، ذکرِ حق اور خوف (دلانے والی نصیحتوں) سے بھرے ہوئے صندوق ہیں۔ (۱۴۱/۳)

باز صندوقے پُر از قرآں بہ است زانکہ صندوقے بود خالی بدست

پھر ایک صندوق قرآن سے بھرا ہوا، اس صندوق سے بہتر ہے جو ہاتھ میں خالی ہو۔ (۱۴۱/۳)

باز صندوقے کہ خالی شد زِبار بہ زصندوقے کہ پُر موش ست و مار

پھر وہ صندوق جو اسباب سے خالی ہے، ایسے صندوق سے بہتر ہے جو صندوق چوہوں اور سانپوں سے پُر ہے۔
(۱۴۱/۳)

برھویٔ تاویلِ قرآں میکنی
(قرآن کی تاویل اپنی خواہش کے مطابق کرتے ہو؟)

مولانا رومیؒ نے مثنوی شریف میں قرآن مجید کی تفسیر بالرائے کرنے کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے معنی میں اپنی رائے و عقل کو دخل کا موقع دینا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے "مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِـرَاْيِهٖ فَقَدْ كَفَرَ" یعنی جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی، وہ کافر ہوگیا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّیْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ وَمَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَاْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ" یعنی میرے نام سے (ہر ایسی ویسی) حدیث روایت کرنے سے بچو، مگر وہ جو تم جانتے ہو (کہ صحیح ہے)، پس جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ لگائے تو اس کو چاہیے کہ وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا سمجھے اور جو شخص قرآن مجید کے معانی میں اپنی رائے سے کچھ کہے تو اس کو بھی چاہیے کہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا سمجھے (ترمذی)، لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ کوئی کتاب و سنت کا عالم، قواعدِ کلام کا ماہر، اسلوبِ عربیت کا واقف، مصالحِ شرح و اصولِ دین کو سمجھنے والا نیک نیتی سے بلا کسی غرضِ نفسانی کے کوئی معنی بطور احتمال کے بیان کرے تو اس کی مشروعیت پر تمام اُمت متفق ہے۔

حضرت حارث الاعور رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں سے گزرا تو دیکھا کہ لوگ احادیث میں بحث و تکرار کر رہے ہیں۔ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا تو ان کو اس کی اطلاع دی۔ انہوں نے فرمایا: کیا وہ ایسا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ یاد رکھو عنقریب فتنہ برپا ہوگا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! اس سے نجات دلانے والی کیا چیز ہے؟ فرمایا: قرآن مجید، اس میں تم سے پہلے گزرنے والی امتوں کے حالات ہیں اور تم سے پیچھے آنے والے واقعات کی خبر ہے اور تمہاری موجودہ ضروریات کے احکام ہیں۔ وہ کتابی فیصلہ ہے، ہزل (مذاق) نہیں، جو کسی ظالم کے ڈر سے اسے چھوڑے گا اللہ اس کو توڑ ڈالے گا اور جو شخص اس کے سوا کسی اور کتاب سے ہدایت طلب کرے گا اللہ اس کو گمراہ کرے گا اور وہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔ وہ حکمت والا ذکر ہے، وہ سیدھا راستہ ہے۔ یہ وہ ہے جس سے خواہشات میں کجی نہیں آ سکتی اور نہ اس سے زبانیں تھک سکتی ہیں اور نہ علماء اس سے سیر ہو سکتے ہیں اور نہ وہ بار بار دُہرانے سے پرانا ہوتا ہے اور نہ اس کے عجائبات ختم ہوتے ہیں۔ یہ وہ ہے کہ جب اس کو جنّات نے سنا تو وہ یہ بات کہنے سے باز نہ رہ سکے کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو راست روی کی طرف ہدایت کرتا ہے، پس ہم اس پر ایمان لائے، جو اس کا قائل ہوا وہ سچا ہے، جس نے اس پر عمل کیا اس نے اجر پایا اور جس نے اس کے ساتھ حکم دیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت پائی۔ (ترمذی)

سوال:- مولاناؒ کے قول میں مطلق تاٗویل کی تردید پائی جاتی ہے، حالانکہ علماء متاٗخرین نے قرآن مجید کی بہت سی آیات میں تاٗویل کی ہے، خصوصاً ان آیاتِ صفات کی جن میں ایسے کلمات آ گئے ہیں جو جسمانیت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" (طٰہٰ)۔ وہ رحمٰن ہے جو عرش کے اُوپر قائم ہے۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (فتح) اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اُوپر ہے۔ "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" (البقرہ) تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔ "یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ" (سورۂ قلم) جس روز کھولی جائے پنڈلی وغیرہ وغیرہ، چونکہ اللہ جسم اور جسمانیت سے منزہ ہے اس لیے علماء نے ان آیات میں استویٰ، ید، وجہ اور ساق کے کلمات کی تاٗویل کی ہے۔ کیا مولاناؒ کے قول میں ایسی تاٗویل کی بھی تردید ہے؟

جواب:- یہ تاٗویلات علمائے حقانیین نے اصولِ شرعیہ اور قواعدِ عربیّہ کو ملحوظ رکھ کر استحالہ نقلی و عقلی کے دفع کرنے اور تعارض کے رفع کرنے کے لئے کی ہیں، جو محض ایک شرعی و دینی مقصد ہے اور ان کا یہ کام غرضِ نفسانی سے پاک ہے اور اہلِ حق نے خلفاً عن سلفٍ اس کو اختیار کیا ہے، لہٰذا اس قسم کی تاٗویلات کا رد مولاناؒ کا مقصود نہیں بلکہ یہاں اس تاٗویلِ باطل کا رد کرنا مدِّنظر ہے، جو اہلِ ہوا اور مبتدعین کا شیوہ ہے اور جس کو وہ کسی دینی مصلحت سے نہیں بلکہ محض نفسانی و شیطانی اغراض کے لئے اختیار کرتے ہیں اور وہ ان کو کسی شرعی اصول کے تحت نہیں لاتے بلکہ محض اپنے عقلی قیاس سے کام لیتے ہیں، جیسا کہ بعض گمراہ فرقے معجزاتِ انبیاء اور رفع عیسیٰؑ کی تاٗویل کرتے ہیں

اور اکثر فلاسفہ حشر و نشر، صراط و میزان اور بہشت و دوزخ کی مختلف تأویلات کرتے ہیں، کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جنت اور دوزخ محض اچھے اور بُرے احوال سے عبارت ہے، اس میں حقیقت نہیں۔ معاذاللہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

کردۂ تأویلِ حرفِ بکر را   خویش را تأویل کن نے ذکر را

تم نے (قرآن مجید کے) محفوظ حرف کی تأویل کی ہے، اگر کرتے ہو تو خود اپنے آپ کا تغیر و تبدل کرو، نہ کہ قرآن کی تأویل۔ (۱/۱۳۵)

قرآن مجید کو بکر اس لیے کہا کہ بکر، محفوظ دستِ نارسیدہ کو کہتے ہیں اور قرآن پر بھی باطل کی دسترس نہیں۔ اللہ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے "اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُونَ" یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ (الحجر:۹) "خویش را تأویل کن" کے یہ معنی ہیں کہ تم جہل و نادانی میں مبتلا ہو، اپنے دل کے قفلِ ہوا کو توڑ کر علوم و معارف حاصل کرو تاکہ تمہاری حالتِ جہل بدل جائے۔ مولانا رومؒ نے تأویلِ قرآن کے بارے میں فرمایا ہے کہ ؎

فکرِ تو تأویل کردہ ذکر را   ذکر را مان و بگرداں فکر را

تمہاری قوتِ فکر نے قرآنی آیت کی تأویل کی ہے، قرآن کو (اس کی حالت پر) رہنے دو اور اپنی قوتِ فکر کو بدلو۔ (۱/۱۳۵)

بر ہوا تأویلِ قرآں میکُنی   پست و کژ شد از تو معنیٔ سنی

تم محض اپنی ہوائے نفسانی کے مطابق قرآن مجید کی تاویل کرتے ہو (اور) تمہاری (غلط تأویل کی) وجہ سے (قرآن مجید کے ظاہر اور) روشن معنی پست اور کج ہو جاتے ہیں۔ (۱/۱۳۵)

علامہ اقبالؒ نے بھی قرآن کی تأویل کرنے والوں کی تادیب کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں   ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب   کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

مسلمانوں کی جرأت و بے باکی کے متعلق علامہؒ فرماتے ہیں ؎

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر   چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا   اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ کچھ کم ظرف انسانوں نے قرآن کی تاویلات کرنا شروع کر دی ہیں، اس لیے ہمارے لیے دین پر چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ بعض کم علم لوگ ایسی تاویلیں کرنے والوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں ؎

تنگ برما راہگذار دیں شد است　　　　ہر لیمئے رازدارِ دیں شد است

ہم پر دین کی راہ دُشوار ہوگئی، ہر کمینہ انسان دین کا راز دار بن بیٹھا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے قرآن کے متعلق بہت سے اشعار لکھے ہیں، جن کا پیش کرنا اس تحریر میں ممکن نہیں۔ البتہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان نے ایک کتاب ''اقبال اور قرآن'' کے نام سے لکھی ہے اور اس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کے بیشتر اشعار قرآن اور حدیث کی تشریح کرتے ہیں۔

اہلِ بصیرت قرآن کے نُور کو سمجھ لیتے ہیں

نُورِ گوہر نُورِ چشمے ما شدے　　　　ہم سوال و ہم جوابِ ما بُدے

اگر ہم کو بصیرت حاصل ہوتی تو مضامینِ قرآن کے گوہر کا نور ہماری چشم (حق) کا نور بن جاتا (پھر) جو سوال ہمارے دل سے پیدا ہوتا اس کا جواب بھی ہمارے اپنے دل سے ہی مل جاتا۔ (۹۰/۲)

مطلب:۔ اپنے نورِ بصیرت کی بدولت قرآنی ہدایات سے اس قدر ایقان و اذعان حاصل ہو جاتا ہے کہ پھر دل میں کوئی شُبہ ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر پیدا ہوتا ہے تو اپنے آپ دفع ہو جاتا ہے، پس جب لوگ قرآن مجید کے باوجود حق و باطل میں تمیز کرنے کی توفیق نہیں رکھتے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ انہی کی بصیرت کا نقص ہے۔ قرآن مجید میں حق و باطل میں تمیز کر دینے میں کوئی کمی نہیں۔ مولاناؒ نے دیگر اشعار میں اس بات پر زور دیا ہے کہ چونکہ قرآن کو فرقان بھی کہا جاتا ہے، اس لئے یہ ہر اچھی اور بُری بات میں فرق کو واضح کر دیتا ہے۔ (دیکھئے ۹۰/۲)

قرآن کریم کی تحقیر کرنے کا انجام

قرآن مجید کو افسانہ کہنے والے خود عذابِ الٰہی سے تباہ و برباد ہو کر افسانہ بن گئے بلکہ قرآن مجید کے علاوہ تمام شعائرِ اللہ کی بے ادبی کرنے والوں کا بہ تعجیل یا بہ تاخیر یہی حشر ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اسی طرح مشہور واقعہ قرآن مجید کی سورۃَ الفیل میں ہے، جس میں کعبہ کی بے ادبی کرنے والے کے انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ ابرہہ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں نے کعبہ شریف کو گرانے کی جرأت کی تو نیست و نابود ہو گئے، الغرض قرآن کو غلط سمجھنا اور طعنہ دینا بہت بُرا عمل ہے، جس کی وجہ سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ مولانا رومیؒ مثنوی میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

اے سگِ طاعِن تو عو عو میکنی　　　　طعنِ قرآں را بروں شو میکنی

اے طعنہ زَنی کرنے والے کتے! تُو فضول بھونک رہا ہے، کیا طعنِ قرآن کے (الزام) سے رَستگاری پانے کی توقع کرتا ہے۔ (۴۰۸/۳)

ایں نہ آں شیر ست کزوے جاں بری　　　　یا ز پنجہ قہرِ اُو ایمان بَری

یہ وہ شیر نہیں جس سے تو جان سلامت لے جائے یا اس کے پنجہء قہر سے اپنا ایمان بچا کر لے جائے۔ (۴۰۸/۳)

تا قیامت میزند قرآں نِدا اے گروہِ جہل را گشتہ فِدا

قیامت تک کے لئے قرآن یہ ندا کر رہا ہے کہ اے نادانی پر فدا ہونے والے گروہ۔ (۴۰۸/۳)

مر مرا افسانہ مے پنداشتید تخمِ طعن و کافری مے کاشتید

تم لوگوں نے مجھے افسانہ اور داستاں کا مجموعہ سمجھا ہے، تم طعن اور کفر کا بیج بوتے رہے ہو۔ (۴۰۸/۳)

خود بدیدید ائے خسیسانِ زمن کہ شما بودید افسانہ زمن

اے زمانہ بھر کے کمینے لوگو! تم نے دیکھ لیا کہ میری بے ادبی کرنے کی وجہ سے تم ہلاک ہوکر خود عبرتناک افسانہ بن گئے۔ (۴۰۸/۳)

خود بدیدید آنکہ طَعنہ می زدید کہ شما فانی و اَفسانہ بُدید

حتیٰ کہ اے طعنہ مارنے والو! تم نے دیکھ لیا کہ تم خود فانی اور افسانہ ہو گئے۔ (۴۰۸/۳)

من کلامِ حَقّم و قائم بذات قوتِ جانِ جان و یاقوتِ زکات

میں حق تعالیٰ کا کلام ہوں اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہوں، روح کے لئے بمنزلہ غذا ہوں اور مصفیٰ اور پاکیزہ یاقوت ہوں۔ (۴۰۸/۳)

نور خورشیدم فتادہ برشما لیک از خورشید ناگشتہ جدا

میں آفتابِ حق کا نور ہوں جو تم پر برس رہا ہے لیکن آفتاب سے جدا نہیں ہوا۔ (۴۰۸/۳)

نِک منم یَنبوعِ آں آبِ حیات تا رہانم عاشقاں را زیں ممات

دیکھو! آبِ حیات کا سرچشمہ ہوں میں تاکہ عاشقوں کو موت سے بچاؤں۔ (۴۰۸/۳)

جہاد کی فضیلت

جہاد کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، قرآن پاک میں بھی کئی مقامات پر جہاد پر زور دیا گیا ہے۔ سورۂ الحج آیت نمبر ۷۸ میں فرمایا گیا ہے "وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط" یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے۔ لفظ جہاد کی تشریح کرتے ہوئے علامہ راغب لکھتے ہیں۔ اَلْجِهَادُ وَ الْمُجَاهَدَةُ اِسْتِفْرَاغُ الْوُسْعِ فِيْ مُدَافَعَةِ الْعَدُوِّ۔ دشمن کا مقابلہ کرنے میں اپنی ہر امکانی قوت صَرف کر دینے کو جہاد اور مجاہدہ کہتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں جہاد کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مُجَاهَدَةُ الْعَدُوِّ الظَّاهِرِ ظاہری دشمن سے جہاد

۲۔ وَمُجَاهَدَةُ الشَّيْطَانِ اور شیطان سے جہاد

۳۔ وَمُجَاهَدَةُ النَّفْسِ اور اپنے نفس کے خلاف جہاد

مذکورہ آیت میں ان تینوں قسم کے جہاد شامل ہیں۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے، "جَاهِدُوْا اَهْوَائَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْا اَعْدَائَكُمْ" (یعنی جس طرح تم اپنے ظاہری دشمنوں سے جہاد کرتے ہو، اسی طرح تم اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرو)۔ ایک اور روایت ہے کہ حضور ﷺ ایک جہاد سے واپس آئے تو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف آ گئے ہیں یعنی آپ ﷺ نے جہاد بالنفس کو جہادِ اکبر کا نام دیا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا ہے ؎

اے شہاں کشتیم ما خصمِ بروں　　ماند خصمے زاں بتر در اندروں

اے بزرگو! ہم نے ظاہری دشمن کو تو مار لیا مگر ایک اس سے زیادہ بڑا دشمن باطن میں رہ گیا ہے۔ (۱۶۳/۱)

قَدْ رَجَعْنَا مِنْ جِهَادِ الْاَصْغَرِیم　　با نبی اندر جہادِ اکبریم

بے شک جہادِ اصغر سے ہم لوٹ آئے، اب نبی کے ساتھ جہادِ اکبر میں مشغول ہیں۔ (۱۶۴/۱)

(اس قول کا حوالہ کنوز الحقائق، ص ۹ اور احیاء العلوم، ج ۳، ص ۶ میں درج ذیل حدیث میں موجود ہے)۔

"قَدِمْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ مُجَاهَدَةُ الْعَبْدِهَوَاهُ"

(تمہیں خوش آمدید ہو کہ تم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے ہو، وہ جہادِ اکبر یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرے)۔

آخر میں مولانا رومیؒ لکھتے ہیں کہ جہاد ہاتھ سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی، جس طرح حضور اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے "جَاهِدُوْا الْكُفَّارَ بِاَيْدِيْكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ" کفار کا مقابلہ زورِ بازو کے ساتھ بھی کرو اور زبان سے بھی (مفردات)۔

گویا دشمن کے مقابل میں سر دھڑ کی بازی لگا دینا لفظِ جہاد کے مفہوم میں داخل ہے، امکانی وسائل مہیا کرنے میں جنگی تدابیر میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے میں اگر کسی قسم کی غفلت برتی جائے تو ایسی ادھوری کوشش کو قرآنی اِصطلاح میں جہاد کا نام دینا زیادتی ہو گی۔ جَاهِدُوْا کے یہ معنی ذہن نشین کرنے کے بعد آگے بڑھیے، ارشاد ہے "فِی اللّٰہِ" یعنی تمہاری یہ ساری تگ و دو عدیم النظیر جانثاری اور فدائیت اور یہ بے مثال صبر و استقامت کسی ذاتی یا دنیوی مقصد کی تکمیل کے لئے نہ ہو بلکہ محض اللہ کے نام کو بلند کرنے کے لئے ہونی چاہیے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث امتِ مسلمہ کی جنگ دوسری قوموں کی جنگوں سے غایت و مقصد کے لحاظ سے بالکل ممتاز ہو جاتی ہے۔ خود مسلمان بھی اگر اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے آمادۂ پیکار ہوں گے تو اسے قرآنی اِصطلاح میں جہاد نہیں کہا جائے گا۔

پھر فرمایا "حَقَّ جِهَادِهٖ" کہ جہاد کرو تو پھر اس کا حق ادا کرو۔ اللہ کے نام کو بلند کرنے کی خاطر خون کے دریا بہتے ہیں تو انہیں بہنے دو، اگر کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں تو ذرا پرواہ نہ کرو، رنگ رنگیلی جوانیاں قربان ہو رہی ہیں تو انہیں بلا تأمل قربان ہونے دو، جب تک تمہاری جان میں جان ہے اسلام کا پرچم سرنگوں نہ ہونے پائے۔ حضرت

جعفرؓ کی طرح ایک ہاتھ کٹ گیا ہے تو جھٹ دوسرے ہاتھ میں جھنڈا تھام لو اور اگر دوسرا بازو بھی کٹ گیا تو اپنے دانتوں سے پکڑ لو۔ تمہارا جسم اگر تیروسنان کے چرکوں سے چھلنی ہو گیا ہے تو کیا ہوا اسلام کی عظمت و ناموس کو اگر تم نے اپنی جان دے کر بچا لیا تو تم سے زیادہ سُرخرو اور کون ہوگا؟

جس طرح قوتِ ارادی، عزم اور قربانی کی ضرورت ایمان کے ظاہری دشمنوں کے مقابلے کے لئے ہے، اسی طرح شیطان اور نفس کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی ان صفات کا مظاہرہ ضروری ہے بلکہ یہاں پہلے سے بھی زیادہ ہوشیار اور چوکس ہونے کی ضرورت ہے۔ ظاہری دشمن تو دشمن کا لباس پہن کر آیا تھا، یہ ایسے دشمن ہیں جو اپنے کو مخلص ترین دوست ظاہر کرتے ہیں مگر ان کی چالیں بڑی باریک ہوتی ہیں اور ان کا دامِ فریب تب نظر آتا ہے، جب انسان اس میں پھنس کر پھڑپھڑانے لگتا ہے۔

من نمیکردم غزا از بہرِ آں
(میں ملک و مال کی خاطر جہاد نہیں کرتا)

مولانا رومیؒ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں کہ پیغمبروں اور پیغمبروں کے جانشینوں کا جنگ اور جہاد سکندر کی طرح ملک گیری اور چنگیز خان کی طرح خونریزی کی غرض سے نہیں ہوتا کیونکہ ملکِ فقر و غنا کے تاجدار کو دُنیوی ملک و دولت کی کیا ضرورت؟ اور دُنیا میں پیامِ امن لانے والے کو خونریزی سے کیا تعلق؟ بلکہ ان کا جہاد صرف اس غرض پر مبنی ہوتا ہے کہ ملک و قوم سے اس مفسد مادہ کو نابود کر دیا جائے، جس کا ضررِ متعدی خلق کی خرابیٔ اخلاق اور فسادِ عقائد کا باعث ہے۔ جس طرح ایک جراح کا کسی مہلک پھوڑے کو نشتر کے ساتھ چیر ڈالنا بیمار کے ساتھ بدسلوکی نہیں بلکہ اس کی زندگی کو خطرے سے بچانے کے لحاظ سے عین شفقت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نشتر اس وقت استعمال کرتا ہے جب مسلمان عیاشی میں سرگرداں ہو جائیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

کرتی ہے ملوکیت اندازِ جنوں پیدا — اللہ کے نشتر ہیں، تیمور ہو یا چنگیز

اسی طرح نبی کا جنگ و جہاد، قید و حبس اور قتل و قصاص کے ذریعہ سے مفسدانِ ملک کا خاتمہ کر دینا تمام خلق کے لئے تمہیدِ امن ہے ؎

من نمیکردم غزا از بہرِ آں — تا ظفر یابم فرو گیرم جہاں

میں اس غرض سے جنگ نہیں کرتا تھا کہ فتحیاب ہو کر جہاں کو مسخر کر لوں۔ (۴۳۱/۳)

کایں جہاں جیفہ است و مُردارِ رخیص — بر چنیں مُردار چوں باشم حریص

یہ جہاں تو سڑی ہوئی لاش، مردار اور ارزاں چیز ہے، ایسے مردار کے لئے میں لالچ کیوں کروں؟ (۴۳۱/۳)

زاں ہمی کردم صفوفِ جنگ چاک — تا رہانم مر شمارا از ہلاک

میں نے جنگ کی صفوں کو اس لیے چیرا ہے کہ تم کو ہلاک ہونے سے بچاؤں۔ (۴۳۲/۳)

زاں نمی بُرّم گلوہائے بشر تامرا باشد کرو فرّ و حشر

میں لوگوں کے گلے اس غرض سے نہیں کاٹتا کہ میں شان وشوکت اور رجوع عام حاصل کروں۔ (۴۳۲/۳)

از در افتادن در آتش با دو دست

(میں تمہیں آگ میں گرنے سے دونوں ہاتھوں سے بچاتا ہوں)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ چند مفسدوں کے گلے اس لیے نہیں کاٹے جاتے کہ ان کو قتل کرنا مقصود ہے بلکہ اس لیے کاٹے جاتے ہیں تاکہ ان کے فساد سے سارا جہان نجات پائے۔ جنگ و جہاد کا یہ مقصد نہیں کہ لوگوں کو اپنی گرفت میں لیا جائے بلکہ جہاد کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مست لوگوں کی طرح آگ (دوزخ) کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ان لوگوں کو اسی آگ سے بچانے کی خاطر جہاد کیا جاتا ہے۔

زاں ہمی بُرّم گلوے چندتا زاں گلوہا عالَمے یابد رہا

میں چند (مفسدوں کے) گلے اس لیے کاٹتا ہوں تاکہ ان (کٹے ہوئے) گلوں (کی عبرت) سے سارا جہاں (مفسدوں کے ہاتھ سے) نجات پا جائے۔ (۴۳۲/۳)

من ہمی رانم شمارا ہمچو مَست از در افتادن در آتش با دو دست

میں ایک مست کی طرح تم کو آگ میں دونوں ہاتھوں کے ساتھ پڑنے سے بچاتا ہوں۔ (۴۳۲/۳)

سعی اَبرار و جہادِ مومناں

(نیک لوگوں کی کوشش اور مومنوں کا جہاد شروع سے چلا آ رہا ہے)

جہاد کرنا قضا کا مقابلہ نہیں کیونکہ جہاد کو بھی ہم پر قضا ہی نے مقرر کیا ہے۔ اسی طرح انبیاء اور اولیاء نے بھی جہاد کیا ہے۔ یہ کوئی قضا کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ قضا کی اتباع ہے، جو سعی و کوشش کی جاتی ہے بلکہ تقدیر میں لکھی ہوتی ہے۔ اطاعت وعبادت میں سعی یا کوشش کرنا کسی صورت میں باعث نقصان نہیں، پھر کیوں نہ کوشش کی جائے مگر جس نے سعی و کوشش سے دُنیا کی تلاش کی اس نے باطل و بے حقیقت چیز کی تلاش کی اور جس نے آخرت کی تلاش کی اس نے حق اور حقیقت کی تلاش کی۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لائے، سب نے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور یہی لوگ ہیں، جن کے لئے خوبیاں ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (توبہ ع ۱۰)۔ اسی طرح جن مومنوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تو اللہ نے ان کی ایسی فوجوں سے مدد فرمائی کہ جن کو عام لوگ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی تمام تدبیریں پُرلطف ثابت ہوئیں۔ یہ صرف اور صرف کوشش اور جہاد کا نتیجہ تھا۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

سعی اَبرار و جہادِ مُومناں تابدیں ساعت زآغازِ جہاں

نیک لوگوں کی کوشش، مومنوں کا جہاد اِبتدائے عالم سے اب تک (وقوع میں آیا ہے)۔ (۱/۱۲۵)

جَہد میکن تاتوانی اے کیا در طریقِ انبیاء و اولیاء

اے دانا آدمی! انبیاء اور اولیاء کے طریقے پر مقدور بھر کوشش کرو۔ (۱/۱۲۵)

مسلمان کافروں پر بھاری ہوتے ہیں

مولانا رومیؒ قرآن کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ نے مومنوں کے ساتھ فرشتوں کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے اور مومن ویسے بھی کفار پر شدید (یعنی بھاری) ہوتے ہیں اور آپس میں رحم دل ہوتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مومن ہمیشہ کافروں پر غالب رہے، یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں نورِ ایمان اور جہاد کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

زو اَشِـدَّآءُ عَلَـى الْكُفَّارِ باش خاک بر دلداری اغیار باش

جاؤ! کافروں پر سخت (اور بھاری) ہوکر رہو، ان کے (حق سے) بیگانہ رہنے والوں کی دلداری پر خاک ڈالو۔

تیسواں باب

مثنوی کے چند رُوحانی متفرقات

عارف رومیؒ کو جن موضوعات سے خصوصی شغف تھا، ان پر تو آپ نے مثنوی میں جی کھول کر کلام کیا ہے لیکن آپ نے انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو فروگذاشت نہیں کیا، جس پر اپنے خیالات کا قرآن اور حدیث کی روشنی میں اظہار نہ کیا ہو۔ قرآن کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ہر اچھی اور بُری بات میں فرق ظاہر فرما دیا ہے۔ اس لیے مولانا رومیؒ نے بھی اپنی مثنوی میں ان متفرقات کے متعلق کافی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ مثنوی میں ایسے متفرقات کی تعداد کافی وسیع ہے، جن کا اس کتاب میں بیان کرنا ضروری تھا لیکن اختصار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس حصے میں ان متفرقات میں سے چند ایک کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

جن موضوعات کے متعلق اس حصہ میں کچھ تفصیل بیان کی جا رہی ہے اُن کا تعلق انسانی روح، صحبت کا مقام، فلسفہء بقا اور ارتقاء، دانش اور بینش، تحقیق و تقلید اور جبر و قدر وغیرہ سے ہے، اس کے علاوہ عبادات، ذکرِ الٰہی، نماز و روزہ، عقل کے نظریات، اصحابِ کہف اور علم کی افادیت سے تعلق رکھنے والے مولاناؒ کے کچھ کلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مولانا رومؒ کا فلسفہء آہ و زاری، توکل، دعا اور وعدہ پر لکھے گئے چند اشعار پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ قارئین کو عارف رومیؒ کے عمیق اَفکار کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

زیرِغور موضوعات پر اگرچہ مثنوی میں مختلف مقامات پر طویل اور عریض گفتگو کی گئی ہے جس کا اس مختصر اور تعارفی تحریر میں سمونا ممکن نہ تھا، چنانچہ ہر موضوع پر چند اشعار پیش کرنے پر کفایت کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین

اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے اور جو احباب اب تک مثنوی کا مطالعہ نہیں کر سکے ان کے علم کے لیے یہ تحریر ایک خوشنما اور دلچسپ اضافے کا باعث بنے گی۔

انسان کی روح

انسان کی رُوح کے متعلق کفارِ مکہ نے حضورﷺ سے دریافت کیا کہ رُوح کیا چیز ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں اس کا جواب یہ فرمایا کہ ''آپ فرما دیجئے کہ یہ رُوح میرے رب کی طرف سے ایک امر ہے اور تم کو اس کا علم نہیں دیا گیا مگر قلیل'' (بنی اسرائیل : ۸۵)۔ سورۃ یٰسٓ آیت نمبر ۸۲ میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کا امر تو یہی ہے کہ جب وہ کسی چیز کو چاہتا ہے تو اس سے فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔'' دونوں قسم کی صورتوں میں ''اَمْرُاللّٰه'' کا لفظ آیا ہے یعنی روح کو فرمایا کہ یہ '' اَمْرُاللّٰه'' ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے بھی یہی فرمایا ''اِنَّمَآ اَمْرُهٗ'' یعنی اللہ کا جب امر (حکم) ہو جائے تو وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب اللہ کا حکم (اَمْرُاللّٰه) ہو جائے تو تخلیق ہو جاتی ہے اور انسان کی روح بھی (جو کہ اَمْرُاللّٰه ہے) جب حرکت میں آ جائے تو بھی تخلیق ہو سکتی ہے، چنانچہ جب اللہ کے بندوں کی روح حرکت میں آ جائے تو اس سے بھی تخلیق ہو جاتی ہے یعنی اگر کسی نیک بندے کی روح کچھ کرنا چاہے تو وہ اس کے سامنے حاضر ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح بھی ''کُن'' کی کنجی ہے۔ بنابریں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوت دی ہے کہ انسان کی روح جو چاہتی ہے، وہ ہو سکتا ہے۔ مشائخ کا کہنا ہے کہ روح میں وہ طاقت ہے کہ وہ جو کچھ چاہے ہو جاتا ہے اور روح اگر چاہے تو زمین اور آسمان کو ایک لقمہ میں ہڑپ کر جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ روح سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز اللہ تعالیٰ نے نہیں بنائی۔ اس پر اقوال اور احادیث وارد ہیں۔

روح کی بہت سی قسمیں ہیں۔ روحِ حیوانی جو ہر جاندار میں ہوتی ہے اور روحِ سیرانی یا روحِ انسانی صرف انسان ہی میں ہوتی ہے اور سونے کے وقت یہ انسان سے جدا ہو کر مختلف مقامات کی سیر کرتی ہے، اسی لئے اسے روحِ سیرانی کہا جاتا ہے۔ روح کے متعلق یہ بات قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی روح کو اللہ تعالیٰ اپنے قبضے میں لے لیتا ہے تو اس پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور جب روح کو واپس نہ کیا جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ (الزمر:۴۲) اس حقیقت کو مولانا رومیؒ نے نیچے دیئے گئے اشعار میں بھی بیان کیا ہے۔

روح کا ایک بہت بڑا مضمون ہماری تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبال'' میں (جس کی اشاعت ابھی تک نہیں ہوئی) بیان کیا گیا ہے اور کچھ مختصر سا بیان ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' میں (صفحہ نمبر ۱۱۰، ۱۱۱) پر بھی دیا گیا ہے۔ عارف رومیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ عشق میں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، اگرچہ دو شخصوں کے جسم الگ الگ ہوں، دونوں میں مکانی بعد نہیں ہوتا۔ وہ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ اگر ایک کمرے میں دو شمعیں روشن ہوں تو ان کی روشنیاں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں اور وہ ناقابلِ تقسیم ہوتی ہیں۔ اگر عشق نفسانی نہ ہو تو جس طرح

عاشق معشوق کا طالب ہوتا ہے، اسی طرح معشوق بھی عاشق کا جویا ہوتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

کہ زدل تا دل یقیں روزن بُود　　　نے جُدا و دُور چوں دو تن بُود

اس لئے کہ یقیناً ایک دل دوسرے کے لئے جھروکہ بنتا ہے، وہ دو جسموں کی طرح الگ اور دُور نہیں ہوتے۔ (۳/۴۱۷)

متصِل نہ بُود سِفالِ دو چراغ　　　نورِ شاں ممزوج باشد دَر مَساغ

دو چراغوں کی بتیاں ملی جُلی نہیں ہوتیں، ان کی روشنی پھیلاؤ میں ملی جُلی ہوتی ہے۔ (۳/۴۱۷)

ہیچ عاشق خُود نباشد وَصل جُو　　　کہ نہ معشوقش بُود جویائے اُو

کوئی عاشق کسی کے وصل کا خود بخود (طالب) نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کا معشوق اس کا طالب نہ ہو۔ (۳/۴۱۷)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ یقیناً خدا کے ہاں بھی تمہاری محبت موجود ہے ؎

در دلِ تو مہرِ حق چوں شُد دو تو　　　ہَست حق را بے گماں مہرے بتو

اگر تیرے دل میں خدا کی محبت دوگنی ہوگئی تو بے شک خدا کو بھی تم سے محبت ہو جائے گی۔ (۳/۴۱۸)

مولانا رومؒ کے مطابق روح کے خصائص

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ بھیڑیوں اور کتوں کی روحیں اور ہیں مگر شیرانِ خدا یعنی اولیائے کرامؒ کی رُوحیں ان سب سے اور دیگر انسانوں سے بھی اولیٰ ہیں۔ رُوح کے لئے لازم ہے کہ وہ خیر اور شر کو پہچانے اور اللہ کی ناراضگی سے ڈرے اور گریہ و زاری کرے۔ انسان سوتا ہے مگر اس کی روح آفتاب کی طرح آسمان اور زمین کے گرد چکر لگاتی ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عام انسان تو کھانے پینے اور سونے میں مشغول رہتا ہے مگر جب وہ ایمان، اسلام اور اخلاص سے مشرف ہو جائے تو وہ ایک چیز دگر بن جاتا ہے اور ملائک سے بھی بہتر ہو جاتا ہے۔ روح کے کمالات کو اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا ہے، اس لئے اس کے لئے جو بھی مثال بیان کی جائے وہ بے معنی ہوگی۔ آپ نے فرمایا ؎

جانِ گرگاں و سگاں ہر یک جداست　　　متحد جانہائے شیرانِ خداست

کتے اور بھیڑیوں کی روحوں میں اختلاف ہے، مگر شیرانِ خدا کی ارواح سب متحد ہیں۔ (۴/۵۲)

جاں چہ باشد باخبر از خیر و شَر　　　شاد با احسان و گریاں از ضَرر

روح کی تعریف یہ ہے کہ وہ خیر و شر سے باخبر ہو، نیکی سے خوش ہو اور بُرائی سے غمگین اور خدا کے حضور رونے والی ہو۔ (۶/۲۸)

مرد خُفتہ رُوح اُو چوں آفتاب　　　در فلک تاباں و تن در جامہ خواب

مرد سویا ہوتا ہے مگر اس کی روح مثلِ آفتاب آسمان پر تاباں ہوتی ہے اور جسم لباس خواب میں ہوتا ہے۔ (۶/۳۱۸)

مرد اول بستۂ خواب و خور ست　　آخرالامر از ملائک بہتر ست

انسان پہلے صرف کھانا اور سونا چاہتا ہے لیکن ایمان، اسلام اور اخلاص سے مشرف ہو کر ملائک سے بازی لے جاتا ہے۔ (۳۱۸/۴)

روح چوں مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ مختفی ست　　ہر مثالیکہ بگویم منتفی است

ہماری روح ''امرِ ربی'' کے لفظ سے مخفی ہے، اس کے لئے جو بھی مثال ہوگی وہ بے معنی اور غیر حقیقی ہوگی۔ (۳۱۸/۶)

روح بے قالب نتاند کار کرد

(بغیر جسم کے روح کام نہیں کر سکتی)

اللہ تعالیٰ نے رُوح اور جسم کو اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ شریعت میں رُوح ایک خاص ہستیٔ انسان کے ظاہری وجود کے اندر ہے، گویا انسان کے اندر ایک اور جسم ہے جو اس کے جسم کے برابر (ہر حال اور کیفیت میں) ہوبہو وہی ہے۔ اگر کوئی انسان روح کو دیکھ سکتا ہے تو اس کے لئے روح اور جسم کو الگ الگ امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔

صوفیہ کے خیال میں یہ جسم ایک مثالی جسم ہے اور روح اس سے برتر ایک اور ہستی ہے۔ قصائی لوگ گردن، پٹھ، شانہ، سینہ اور ران کی شناخت کرتے ہیں۔ چنانچہ گاہک جو چیز مانگتا ہے اسے وہی چیز دیتے ہیں مگر روح اور جسم کے درمیان ایک ایسا ارتباط ہے کہ ان میں اب یہ تقسیم ناممکن ہے ؎

روح بے قالب نتاند کار کرد　　قالبِ بے جان فسُردہ بُود و سرد

روح قالب کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی، قالب بے جان، بے کار اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔ (مگر اولیائے کرام کی روحیں لطیف جسم کے ساتھ اس دنیا میں اور اگلے جہان میں حاضر ہو سکتیں ہیں) (۳۴۴/۵)

رُوح کے متعلق چار سوال

رُوح کے متعلق عام طور پر چار سوال کئے جاتے ہیں:

نمبر۱ روحِ نورانی کا خاکِ جسمانی سے اجتماع کیونکر ہوا؟ نمبر۲ اس اجتماع کے بعد وہ ایک مدتِ معین تک کیسے رہتے ہیں؟ نمبر۳ جسم کو کمتر ہونے کے باوجود ظہور میں نظر آنے کی فضیلت کیوں بخشی گئی اور روح کو افضل ہونے کے باوجود مخفی حالت میں کیوں رکھا گیا؟ نمبر۴ انسان صرف روح کا نام ہے یا جسم اور روح کا مجموعہ۔ مولانا رومؒ ان چاروں کا جواب دیتے ہیں ؎

ہر دو اُو باشد و لیک از ریع و زرع　　دانہ باشد اصل واں کہ ہست فرع ،

انسان روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے لیکن پیداوارِ کھیتی میں سے دانہ اصل ہوتا ہے اور بھوسہ اس کی فرع ہے۔ (۳۴۴/۵)

حکماء کہتے ہیں انسان کا مصداق صرف روح ہے، جسم اس کا ایک آلۂ کار ہے۔ جس طرح سوار صرف گھوڑے پر بیٹھنے والے کو کہتے ہیں، گھوڑا اس کا مرکب ہے۔ سوار کے مفہوم میں گھوڑا داخل نہیں، چنانچہ انسان روح ہے۔ یہ دلیل چوتھے سوال کا جواب ہے یعنی انسان جسم اور روح کا نام ہے۔

حکمت ایں اضداد را باہم بہ بست اے قصاب ایں گرِ دراں باگردن ست

حکمت نے ان دونوں چیزوں کو باہم کر دیا ہے، اے قصائی یہ ران کا حصہ گردن کے ساتھ پیوستہ ہے۔ (۳۴۴/۵)

روح چوں مغزست و قالب ہمچو پوست قالبِ بے جاں کم از خاک ست دوست

اے دوست! جسم بے روح خاک سے بھی کم رُتبہ ہے، روح گویا مغز ہے اور جسم مثلِ پوست (اور پوست مغز کے بغیر نکما ہے)۔ (۳۴۴/۵)

تیسرے سوال کا جواب اس شعر میں ہے، یعنی روح اپنی نفاست کی وجہ سے مغز کی مانند ہے اور جسم اپنی کثافت کی وجہ سے مثلِ پوست ہے اور مغز ہمیشہ پوست میں مخفی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسم ظاہر ہے (پوست) اور روح مغز ہونے کی وجہ سے مخفی ہے۔ جسم کا تعلق عالمِ ناسوت یا عالمِ شہادت سے ہے (جو اس دُنیا کی چیز ہے) اور روح کا تعلق عالمِ اَرواح سے ہے۔ اس دُنیا کے آلات اس دُنیا کی چیزیں ہیں یعنی جسم کو جسمانی حواس ہی محسوس کر سکتے ہیں اور روح چونکہ عالمِ ارواح سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے جسمانی آلاتِ حواس اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ انسان کے کسبِ اعمال کا مقام دُنیا ہے، اس لئے انسان کا اس دُنیا میں مباشر و معالج ہونا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے جسم کا ظاہر ہونا لازمی تھا کیونکہ اس کے بغیر کسبِ اعمال کا ہونا ممکن نہیں۔ روح چونکہ مباشر بالذات نہیں، اس لئے اس کا ظہور یا بروز لازمی نہیں۔ اس کے بعد مولانا رومیؒ ان سوالوں کی تصدیق میں بہت سے ثبوت دیتے ہیں۔

جسم اور روح کے متعلق دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (یعنی روح اور جسم کو) اس لئے اکٹھا رکھا کہ یہ ایک مدت معین تک مل کر کام کریں، ورنہ تو نہ ہی روح کوئی کام کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی جسم بلا روح کے کسی حِس و حرکت کے قابل ہے۔

مذکور بالا شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسم اگرچہ ظاہر ہے اور روح مخفی، لیکن دونوں کے اجتماع سے دُنیا کے کاروبار چلتے ہیں۔ یہ پہلے سوال کا جواب ہے کہ روح اور جسم کا اجتماع کیوں ہوا۔ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے روح اور جسم کے اجتماع میں یہ حکمت رکھی ہے کہ انسان کو مرغوب اشیاء کی طلب ہو اور غیر مرغوب اشیاء کو دفع کرنے میں مدد حاصل ہو۔

حِکمتے کہ بود حق را زازدواج گشت حاصل از نیاز و از لجاج

حق تعالیٰ نے اس اجتماع (روح اور جسم) سے جو حکمت ظاہر فرمائی وہ انسان کے طلب (مرغوبات) اور دفع (غیر مرغوبات) سے حاصل ہوگئی۔ (۳۴۵/۵)

موت اور نیند کی حالت میں رُوح کا قبض ہونا

قرآن کی "سورۃ اَلـزُمَرَ" کی آیت نمبر ۴۲ میں درج ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی روحوں کو جسم سے نکال لیتا ہے اور پھر داخل کر دیتا ہے اور جن کو موت آئے تو ان کی روح کو دوبارہ داخل نہیں کیا جاتا۔ مولانا رومیؒ نے مثنوی شریف میں ایک عنوان قائم کیا ہے ؎

تمثیلِ مردِ عارف و تفسیرِ آیت "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا"

مردِ عارف کی مثال اور آیت کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانوں کو اُن کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے۔ (۷۰/۱)

شمہء زِیں حالِ عارف وانمود خلق را ہم خوابِ حِسّی در رَبُود

عارف کے حال کا کچھ نمونہ (خدا نے حِسیّات کے ذریعہ سے) ظاہر کر دیا ہے، چنانچہ مخلوق کو بھی یہ نیند عارض ہوئی جو ظاہری ہے (سکرو بے خودی مراد نہیں)۔ (۷۰/۱)

عنوان بالا میں "سورۃ الزمر" کی آیت نمبر ۴۲ کا اقتباس درج ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ ہی موت کے وقت روحوں کو قبض کرتا ہے اور جو مرتے نہیں اُن کی روحوں کو خواب میں قبضے میں کر لیتا ہے، پھر جن پر موت کا حکم ہو چکتا ہے تو اُن کو روک رکھتا ہے اور دوسروں کو چھوڑ دیتا ہے ایک مقررہ وقت تک، بے شک اس میں غور کرنے والوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ نیند بھی موت کی بہن ہے یعنی موت اور نیند کی دونوں صورتوں میں ذی روح کے جسم سے اس کی جان نکل جاتی ہے، پھر جس پر موت کا حکم صادر ہو جاتا ہے اس کی روح تو واپس جسم میں آتی نہیں اور جس پر نیند طاری کی جاتی ہے اس کی جان واپس بدن میں ڈال دی جاتی ہے۔ تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ ہر شخص کے دو نفس ہیں، ایک نفسِ حیات جو موت کے وقت جسم سے نکل جاتا ہے اور دوسرا نفسِ تمیز جو خواب کے وقت جسم سے نکلتا ہے۔

جس طرح اَرواح کو ایک وقتِ خاص میں قیدِ جسم سے آزادی بخش کر بارِ تکالیف سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ہم کو بھی اگر باطنی خطرات کے پھندے سے آزادی دلائی جائے تو کیا بات ہے۔ خواب میں ارواح جسم سے نکلتی نہیں، صرف اتنا ہوتا ہے کہ روح حواس وقویٰ کے واسطہ سے جو تصرّف جسم میں کرتی ہے وہ تصرف موقوف ہو جاتا ہے، اس کو روح کی آزادی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ روحیں ہر شب اس (عنصری) پنجرے سے چھوٹ جاتی ہیں اور فارغُ البال بغیر کسی افسری و ماتحتی کے پھرتی ہیں۔

ہر شبے از دامِ تن اَرواح را می رَہانی می کُنی اَلواح را

(الٰہی) تو ہر شب روحوں کو بدن (کے مضبوط) جال سے آزاد کر دیتا ہے (اور نفسِ بدن کی) تختیاں (اور کواڑ) کھول دیتا ہے (تاکہ روحیں آزاد ہو جائیں)۔ (۷۰/۱)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابنِ آدم میں ایک نفس ہوتا ہے اور ایک روح، ان دونوں

کے درمیان شعاعِ شمس کی طرح ایک شعاع ہوتی ہے۔ نفس میں عقل و تمیز ہوتی ہے اور روح میں تنفس اور تحرّک ہوتا ہے پھر جب بندہ سوتا ہے تو اللہ اس کے نفس کو قبض کر لیتا ہے، روح کو قبض نہیں کرتا۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ خواب میں زندوں اور مُردوں کی اَرواح باہم ملتی ہیں، پس جب تک اللہ کو منظور ہوتا ہے، باہم ملاقات و تعارف کرتی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ اس روح کو روک رکھتا ہے جس پر موت صادر ہو چکی ہے اور دوسری کو اس کے جسم میں واپس بھیج دیتا ہے۔

کلیدِ مثنوی میں لکھا ہے کہ اہلِ کشف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو جسم عطا فرمائے ہیں۔ ایک جسمِ عنصری کہ دُنیا میں رہتا ہے اور آخرت میں محشور ہوگا اور اسی پر ثواب و عذاب ہوگا۔ دوسرا جسمِ مثالی کہ عالمِ مثال میں موجود ہے اور خواب میں نظر آتا ہے اور روحِ حقیقی جو ایک امرِ ربیؔ ہے، دونوں جسموں سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے روحِ طبعی مراد نہیں، اس کا تعلق صرف جسمِ عنصری سے ہے، پس روح کے بدن سے نکلنے اور عالمِ مثال میں جانے سے مراد یہ ہے کہ جسمِ عنصری سے اس کا تعلق ضعیف ہو کر جسمِ مثالی سے تعلق بڑھ جاتا ہے اور عالمِ مثالی سے بدن میں آنے سے مراد یہ ہے کہ جسمِ مثالی سے تعلق کم ہو کر جسمِ عنصری کے ساتھ زیادہ ہو جاتا ہے، الغرض خواب کے اندر جسم سے روح نکلتی ہو یا نفس اور اس کی سیر و حرکت مجرداً ہو یا بہ تعلقِ جسمِ مثالی، بہرکیف یہ حالت موت کے ساتھ ملتی جلتی ہے، اسی لئے فرمایا گیا ہے: "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ" یعنی کیفیتِ خواب میں غور کرنے والوں کے لئے عبرت و استبصار کا سامان ہے تاکہ وہ اس پر قیاس کر کے موت کو یاد رکھیں اور فکرِ عاقبت کریں۔ مولاناؒ یہاں خواب کی کیفیت بیان فرماتے ہیں اور چونکہ یہ بیان آیت کے مضمون کے مطابق ہے، اس لئے اس بیان کو آیت کی تفسیر کہہ دیا گیا ہے اور یہ بیان عارف کے حال کی تمثیل ہے یعنی جو حالت خواب والوں کی ہوتی ہے وہی عارف کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔

کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ نقشِ اولیاست   کو دلیلِ نورِ خورشیدِ خداست

کیف مدالظّل (میں جو سایہ کا اشارہ ہے اس سے مراد) اولیاء کرام کا وجود مبارک ہے، جو خورشید حق کی طرف رہنما ہے۔ (۷۴/۱)

مطلب:- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا۔"

ترجمہ: اے پیغمبر ﷺ کیا تم اپنے رب کی طرف نہیں دیکھتے کہ اس نے کس طرح سایہ کو دراز کیا اور اگر چاہے تو اس کو ساکن کر دے، پھر ہم نے آفتاب کو اس پر دلیل بنایا (الفرقان: ۴۵) مولاناؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو سایۂ ظاہری کا حکم آیا ہے، یہی مثال اولیاء اللہ کی ہے کہ جس طرح سایہ ظاہری سے سورج اور اس کی رفتار کا پتہ چلتا ہے اسی طرح اولیاء اللہ کی ذاتِ بابرکات سے ظِلُّ اللّٰہ میں آفتابِ حق یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی

ہے۔ کچھ لوگوں نے اس آیت سے مراد یہ لی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارواح کو دنیا میں کیسے بھیجتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جیسے سایہ دراز ہوتا ہے اسی طرح ایک روح عالمِ ارواح سے آتی ہے اور وہ کسی مرد کی صلب میں کسی پھل یا سبزی کے ذریعے آتی ہے اور پھر رحمِ مادر میں منتقل ہو جاتی ہے۔

رُوح انسان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے اور نفس زمین کی طرف

روح اگرچہ جسم میں مقید اور علائقِ جسمانیہ میں محصور نظر آتی ہے مگر اُس کا اصلی مقام اعلیٰ و ارفع ہے اس لئے وہ اِن علائق سے آزاد ہونے اور اپنی اصل کی طرف واصل ہونے کی متقاضی ہے۔ انسان روح کو بارِ علائق کے نیچے دبائے رکھتا ہے جو اُس کے لئے مانع ترقی ہیں اور پرواز سے روکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انسان میں دو قوتیں ودیعت کی ہیں۔ ایک قوتِ مَلکیہ یعنی فرشتوں کے ساتھ مناسبت رکھنے والی طاقت اور اس کے پیدا ہونے کی صورت یہ ہے کہ روحِ حیوانی جو بدن انسان میں سرایت کئے ہوئے ہے روحِ انسانی سے فیض یاب ہو اور وہ اس کے فیض کو قبول کر لے اور اس سے مغلوب ہو جائے۔ دوسری قوتِ بہیمیہ یعنی چوپایوں سے مناسبت رکھنے والی قوت اور یہ نفسِ حیوانی سے پیدا ہوتی ہے، جو تمام حیوانات میں مشترک ہے اور یہ قوت روحِ طبعی کے قویٰ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ ان دونوں قوتوں میں کھینچا تانی اور مزاحمت ہوتی رہتی ہے۔ قوتِ ملکی عروج چاہتی ہے اور بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر قوتِ بہیمی غالب آ جائے تو قوتِ ملکی دب جاتی ہے اور اگر قوتِ ملکی کا غلبہ ہو جائے تو قوتِ بہیمی ہار کر رہ جاتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

روح می بُردت سُوئے عرشِ بریں　　　سُوئے آب و گلِ شدی در اسفلین

روح تو تجھے عرشِ بریں کی طرف لے جاتی (لیکن) تو پانی اور مٹی کی طرف نچلے درجوں میں آ گیا۔ (۸۴/۱)

انسان کی رُوح حیوانوں اور دیگر مخلوق سے برتر ہے

مولانا رومیؒ نے علم کی مثال دے کر یہ بات ثابت کی ہے کہ انسان کا علم چونکہ زیادہ ہے، اس لئے وہ حیوانات کی روح سے افضل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حیوانات کو صرف جزئیات کا علم ہے اور انسان کو کلیات کا بھی علم ہے، جس طرح ایک انسان اپنے قوی دشمن سے کوئی چوٹ کھا کر فرار ہوتا ہے، اسی طرح ایک جانور بھی لاٹھی کی ضرب کھا کر بھاگ جاتا ہے۔ یہاں ایک امر محسوس موثر ہے جس سے متاثر ہونے میں انسان اور جانور دونوں برابر ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح دُور سے لاٹھی اُٹھانا انسان کے لئے موجب خوف و حذر ہے، اسی طرح حیوان کے لئے بھی باعثِ فرار ہے کیونکہ یہاں ایک امر متوہم یعنی توقع اذیت موثر ہے اور اس میں بھی دونوں مساوی ہیں، اگر فرض کریں کہ کسی مکان میں ایک انسان اور ایک چوپایہ موجود ہوں اور چھت کا شہتیر ٹوٹنے کی آواز آئے تو انسان فوراً بھاگ جائے گا مگر چوپایہ کی طبیعت میں کوئی امر بھاگ جانے کا محرّک نہ ہوگا کیونکہ اس مقام پر خوف و حذر کا باعث ایک امرِ کلی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب چھت کا شہتیر ٹوٹتا ہے تو ضرور ساری چھت زمین پر آ گرتی ہے اور اس

کے نیچے دب کر ہلاک ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ انسان مُدرکِ کلیات ہے، اس نے اس امرِ کل کو ادراک کر لیا اور بھاگ کھڑا ہوا، چوپایہ مُدرکِ کلیات نہیں، صرف محسوسات کا ادراک کرسکتا ہے اس لئے اسے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا اور کھڑا رہا۔ اس سے انسان کے علم کا حیوان کے علم سے بہ مدارج زیادہ ہونا ثابت ہوا۔ جب ہمارا علم ان کے علم سے بڑھ کر ہے تو ہماری زندگی بھی ان کی زندگی سے افضل و برتر ہوگی۔

بعض خاص اعتبارات سے انسان ملائکہ سے افضل ہے مگر علم اور احاطۂ معلومات کے لحاظ سے عامہ بشر سے ملائکہ بڑھ کر ہیں کیونکہ انسان میں حسِ حیوانی ہے، حسِ ملکی نہیں جب کہ فرشتوں میں حسِ ملکی ہے، حیوانی نہیں اور حسِ ملکی ادراکِ مغیبات میں حسِ حیوانی سے بڑھ کر ہے۔ واضح رہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ ملائکہ انسان سے افضل ہیں یا انسان ملائکہ سے افضل ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو پیدا فرمایا تو ملائکہ نے عرض کیا: اے پروردگار! تو نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو کھاتے ہیں، پیتے ہیں، نکاح کرتے ہیں اور سوار ہوتے ہیں، پس ان کے لئے دُنیا مخصوص کر دے اور ہمارے لئے آخرت۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے جس کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے اسے میں اس مخلوق کے برابر نہیں بناؤں گا جو صرف لفظ کن کے کہنے سے موجود ہوگئی۔'' (مشکوٰۃ) ابنِ العربی کہتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ انسان اور ملائکہ کرامات اور قربت میں برابر نہیں ہیں بلکہ انسان کی بندگی بڑھ کر ہے (حاشیہ مشکوٰۃ)

جانِ ما از جانِ حیواں بیشتر ازچہ! زاں رُوکہ فزوں دارد خبر

دیکھو! ہماری جان چوپایہ کی جان سے بڑھ کر ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ہماری جان زیادہ علم رکھتی ہے۔ (۲/۳۱۳)

جاں نباشد جز خبر در آزمُوں ہر کہ را افزوں خبر جانش فُزوں

آزمائش میں علم حاصل نہ ہونے کے سوا اور کسی چیز سے جان ثابت نہیں ہوتی، جس کا علم بڑھا ہوا ہے اس کی جان بڑھی ہوئی ہے۔ (۲/۳۱۳)

انسانوں اور حیوانوں کی رُوح میں فرق

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ حیوانات اور انسان کی روح میں بہت فرق ہے اور اسی طرح انبیاء اور اولیاء کی روحوں میں بھی فرق ہے۔ مولانا رومیؒ روحِ انسانی کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ تمام حیوانات جن میں انسان، درندے، پرندے، طیّور اور وحوش وغیرہ شامل ہیں، شعور اور روحِ حیوانی میں مشترک ہیں۔ شعور کے معنی ہیں اپنے فائدے اور نقصان اور راحت و زحمت کا احساس کرنا اور روحِ حیوانی وہ ہے جس سے جسم زندہ ہے اور اس کے تصّرف سے وظائفِ جسم پورے ہو رہے ہیں، پس یہ دونوں چیزیں انسان اور غیر انسان میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ عقل اور روحِ انسانی خاص انسان میں پائی جاتی ہے، باقی حیوان اس سے بہرہ مند نہیں۔ عقل کے خواص میں

سے ایک ادراکِ کلیات اور حصولِ معارف بھی ہے جس سے باقی حیوانات کو مطلق تعلق نہیں، پھر انبیاء اور اولیاء کی روح و عقل اور بھی اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے، جو انوارِ الٰہیہ ہونے کے لحاظ سے باقی تمام انسانوں کی روح و عقل سے ممتاز ہوتی ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں شعور اور روحِ حیوانی اگرچہ انسان یا غیر انسان یعنی باقی تمام حیوانات میں موجود ہو تو وہ ذریعۂ اتحاد نہیں بلکہ روحِ انسانی اور عقل ذریعۂ اتحاد ہے اور انبیاء و اولیاء کی روح و عقل واثق ترین ذریعۂ اتحاد ہے۔ اس سے باہر عام انسان کی ارواح بھی متحد نہیں۔ روحِ حیوانی ایک جسمِ لطیف بخاری ہے جو غذاؤں سے متولّد ہوتا ہے اور اسی کو مولاناؒ نے یہاں روحِ باد کہا ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کی بقاء سانس اور ہوا پر موقوف ہے۔ روحِ انسانی اس سے الگ اور برتر چیز ہے جو خاص انسان میں پائی جاتی ہے، اس لئے روحِ حیوانی اتحاد نہیں رکھتی، اتحاد اگر ہے تو روحِ انسانی میں ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

جانِ حیوانی ندارد اتحاد   تو مجو ایں اتحاد از روحِ باد

حیوانی جان اتحاد نہیں رکھتی ہے، تُو یہ اتحاد ہوائی روح میں نہ تلاش کر۔ (۵۲/۴)

باز غیرِ عقل و جانِ آدمی   ہَست جانے در ولی و در نبی

پھر انسان کی عقل اور جان کے علاوہ ولی اور نبی میں اور جان ہے۔ (۵۲/۴)

خاصانِ الٰہی کو تنگ کرنے والے تباہ ہو جاتے ہیں

مولانا رومؒ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے واقعہ سے ثابت کرتے ہیں کہ قوم کی اذیتوں کا اثر خود کفار پر ہی نازل ہوتا ہے اور انبیائے کرامؑ ان کی شرارتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ حضرت صالح علیہ السلام اور قومِ ثمودؑ کے قصّے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اشقیاء کا خدائی معاملات کو سرسری سمجھ لینا اور آخر خود اپنی اس غلطی کے سبب عذابِ الٰہی کا شکار ہو جانا اصولِ خدائی ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح موذیاں ناقہ قہرِ الٰہی سے نیست و نابود ہوئے، اسی طرح خاصانِ حق کو ایذا دینے والے لوگ بھی تباہ ہو جاتے ہیں، پس مقبولانِ الٰہی کی روح مثلِ صالحؑ کے ہوئی اور تن مثلِ ناقہ کے ہے۔ روح تو ہمیشہ وصل میں ہوتی ہے کہ اس کو کوئی ہلاک نہیں کر سکتا مگر تن فاقہ وغم میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

روح آفتوں کا اثر قبول کرنے والی نہیں اگر کوئی آفت آئے تو اس کا اثر جسم پر ہوگا، روح پر نہیں اور نہ ہی یہ آزار کا اثر قبول کرنے والی ہے کیونکہ وہ نورِ الٰہی ہے اور اللہ کا نور کفار سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ کچھ مشائخ کا قول ہے کہ کسی بیماری یا بلا کا اثر اگرچہ پہلے روح پر ہوتا ہے مگر فوراً یہ جسم پر منتقل ہو جاتا ہے۔

رُوحِ صالح بر مثالِ اُشتریست   نفسِ گمرہ مرد را چوں پَے بَریست

روح (جو مثل) صالح (کے ہے وہ) شتر کی مثل (ایک چیز یعنی بدن پر سوار) ہے اور گمراہ (آدمی) کا نفس اس کے پٹھے کاٹنے والا ہے۔ (۲۶۸/۱)

اکتیسواں باب

صحبت کا مقام

(فقر خواہی آں بہ صحبت قائم است)

سالکینِ راہِ طریقت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت صحبتِ شیخ کی محسوس کی جاتی ہے کیونکہ صحبت کا طریقہ رسول اکرم ﷺ سے اب تک اہلِ طریقت کا شعار چلا آ رہا ہے۔ مولاناؒ نے نہایت وضاحت سے اس بات کو سالکینِ راہِ طریقت کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ علم تو کتابوں اور دیگر ذرائع سے بھی حاصل ہوسکتا ہے مگر طریقت یا فقر کے معاملات مرشدِ کامل کی صحبت کے بغیر ذہن نشین نہیں ہوتے کیونکہ علم تو کتابی شے ہے اور طریقت یا فقر کا تعلق محض صحبت سے ہوتا ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگرچہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نمازی، حاجی، غازی، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور تمام عبادات کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے تھے لیکن صرف صحبت کے اعتبار سے ان کو صحابی کہا گیا ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام عبادات میں سے صحبت کے اثرات زیادہ موثر اور مقدم سمجھے جاتے ہیں۔ مولاناؒ کے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سالکینِ راہِ طریقت کے لئے صحبت کا لزوم کس قدر ضروری ہے۔

مولاناؒ نے ایک مثال دی ہے کہ کسی اہلِ دل کی صحبت میں اپنے آپ کو جذب کرنے سے اُسی طرح صفات میں تبدیلی آتی ہے، جس طرح تلخی کا ذائقہ رکھنے والا ہلیلہ (ہریڑ) قند کے مرتبان میں ڈال دیا جائے تو اس کے ذائقے کی تلخی بہت کم ہو جاتی ہے کیونکہ ایک مدت تک دونوں کو باہم رکھنے سے ہلیلہ کے رگ و پے میں شکر سما جاتی ہے۔ یہ ہلیلہ دیکھنے کو تو بعد میں بھی ویسا ہی لگتا ہے مگر اس کی صفات بدل چکی ہوتی ہیں۔ اس نظریے کے تحت کہا جاتا ہے

کہ جس چیز کا چاہو مربہ بنا لو۔ یہ کہاوت اب بھی مشہور ہے کہ "مربی بیار و مربہ بخور" یعنی کسی مربہ بنانے والے کو لاؤ اور مربہ کھاؤ۔ اگر کسی شخص کو روحانی مُربی مل جائے تو وہ بھی مرید کی سیرت میں اخلاقی شیرینی پیدا کر دیتا ہے۔

چوں اویس از خویش فانی گشتہ بود　　آں زمینی آسمانی گشتہ بود

جب اویسؒ اپنے آپ سے فانی ہو گئے تھے تو وہ زمین کے رہنے والا آسمانی بن گیا۔ (۴/۱۷۹)

آں ہلیلہ پروریدہ در شکر　　چاشنیٔ تلخیش نبود دگر

وہ ہڑیڑ جو شکر میں مربہ بنی ہو، اس میں پھر تلخی کا مزا نہیں ہوتا۔ (۴/۱۷۹)

آں کسے کز خود بکلّی دَر گذشت　　ایں منی و مائی خود در نوشت

وہ شخص جو خودی سے پوری طرح گذر گیا، اس نے خودی اور انانیت کو لپیٹ دیا ہے یعنی اپنی انانیت کو تہہ کر کے اس سے بَری ہو گیا۔ (۴/۱۷۹)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دُنیاوی علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اقوال اور کتابوں کی ضرورت رہتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص طریقت یا فقر کا طالب ہو تو اس کے لئے پیر و مرشد اور کامل شیخ کی صحبت اَز بس ضروری ہے۔ دانش ایک رُوحانی چیز ہے جو مرشد کی روح سے مرید کی روح کو ملتی ہے۔ فقر اور سلوک کا علم نور ہے جو مردانِ حق کی صحبت سے ہی مل سکتا ہے، باتوں اور تقریروں سے حاصل نہیں ہوتا۔

یک زمانے صحبتے با اولیاء

(کچھ دیر اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا)

مولاناؒ کا یہ شعر بہت مشہور ہے کہ اولیاء کے حضور میں گذرا ہوا مختصر وقت سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔

یک زمانے صُحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

تھوڑی سی دیر اولیاء کی ہم نشینی سو سالہ بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔ (۱/۱۰۱)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ بے جان روٹی انسان کی صحبت میں رہ کر انسان کا جزو بن جاتی ہے اور بے جان چیزوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ ایندھن کی ظلمت (تیرگی) آگ میں جانے سے انوار میں تبدیل ہو جاتی ہے اور مثل مشہور ہے کہ "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" یعنی جو نمک کی کان میں گیا تو وہ بھی نمک بن گیا۔

ہیزمِ تیرہ حریفِ نار شد　　تیرگی رفت و ہمہ انوار شُد

تاریک ایندھن آگ کا حریف بن جاتا ہے، اس کی تاریکی چلی جاتی ہے اور مجسم نور بن جاتا ہے۔ (۲/۱۳۶)

در نمکسار اَرْ خرِ مُردہ فتاد　　آں خری و مردگی یکسو نہاد

نمک کی کان میں اگر مردہ گدھا گِرا، اس نے گدھا پن اور مُردار پن کو علیحدہ کر دیا۔ (۲/۱۳۶)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان اپنے پالتو جانوروں کو بہت سے کرتب سکھاتا ہے، مثلاً گھوڑوں کا سدھانا، ریچھ کا ناچنا، کتوں کا گلے کی پاسبانی کرنا، بکروں کا مجمعے کو سلام کرنا وغیرہ تو کیا انسان مشائخ سے کچھ بھی نہیں سیکھ سکتا۔ کیا وہ

کتوں سے بھی گیا گذرا ہے؟

بلکہ خود از آدمی در گاو و خر — می رود دانائی و علم و ہنر

لیکن انسان سے خود ہی گائے اور گدھے میں دانائی اور علم و ہنر پہنچ جاتے ہیں۔ (۱۴۳/۲)

اسپ سُکسک می شود رہوار و رام — خرس بازی می کند بُز ہم سلام

کم رفتار گھوڑا تیز رفتار اور فرمانبردار ہو جاتا ہے، ریچھ ناچتا ہے اور بکری بھی سلام کرتی ہے۔ (۱۴۳/۲)

رفت در سگ زآدمی حرص و ہوس — یا شباں شد یا شکاری یا حرس

انسان سے حرص و ہوس کتے میں پہنچی اور وہ چرواہا، شکاری یا محافظ بنتا ہے۔ (۱۴۳/۲)

آئینہ کز زنگ و آلائش جُداست

(وہ آئینۂ دل جو زنگ اور آلائش سے جُدا ہو)

تمام کائنات انسان کے دل میں منعکس ہے لیکن یہ انعکاس اس وقت ہی محسوس ہوسکتا ہے کہ جب آئینہ دل حرص و ہوس اور دُنیاداری کے تردّد سے صاف ہو۔ جب "حُبُّ الشَّهَوٰتِ" یعنی شہوات کی خواہش انسان کے دل کے آئینے کو مکدّر اور آلودہ کر دیتی ہیں اس لیے عرفانِ حقائق حاصل نہیں ہوسکتا۔ عام انسانوں کے دل زنگ آلود ہونے کی وجہ سے حقیقت کو پہچاننے والے نہیں ہوتے۔

آئینہ ات دانی چرا غمّاز نیست — زانکہ زنگار از رخش ممتاز نیست

تم جانتے ہو کہ تمہارا آئینہ حقیقت کا غماز کیوں نہیں ہے، کیونکہ اس کے چہرے سے زنگار الگ نہیں ہوا ہے۔ (۳۵/۱)

آئینہ کز زنگ و آلائش جداست — پُر شعاعِ نورِ خورشیدِ خداست

وہ آئینہ جو آلائش اور زنگ سے جدا ہے، وہ خدا کے نور کے آفتاب کی شعاعوں سے بھرا ہے۔ (۳۵/۱)

رَو تو زنگار از رخِ او پاک کُن — بعد ازاں آں نور را ادراک کُن

جاؤ تم دل کے چہرے سے زنگ پاک کرو، اس کے بعد خدا کے نور کا ادراک کرو۔ (۳۵/۱)

اہلِ عقل کہتے ہیں کہ علم کا ذریعہ یا تو محسوسات ہیں یا معقولات ہیں (یعنی فلسفہ اور حکمت کے علوم سے) انسان تجربے اور مشاہدے سے خارج کی چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے مگر رُوحانی لوگوں کا خیال ہے کہ حقیقی علم خارج کی معلومات سے نہیں، باطن سے بذریعہ تصفیہ قلب پیدا ہوتا ہے۔ ان کا اصول ہے کہ اس آئینے کو چمکاؤ یعنی جیسے کہا گیا ہے "صیقلی کن، صیقلی کن صیقلی" (یعنی چمکاؤ، چمکاؤ اور خوب چمکاؤ)۔ انسان عِلّت اور معلول کی کڑیاں جوڑتا ہے اور زندگی کی اضداد خیال میں شک پیدا کر دیتی ہیں، اس لئے استدلالی حکمت (دلائل پر قائم حکمت) شک و شبہ کے دائرے سے باہر نہیں جاتی، خارجی معلومات کا انبار لگانے کی بجائے اگر انسان دل کو چمکائے تو علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین پیدا ہو جاتے ہیں۔

مولاناؒ نے رومی اور چینیوں کے فن کی مثال پیش کی ہے کہ جب رومیوں اور چینیوں کے ہُنر کے فن کا مقابلہ ہوا

تو روم کے فنکار ایک دیوار پر نقش و نگار بناتے رہے اور چینیوں نے اپنی دیوار کو شیشے کی طرح صاف اور چمکدار کر دیا جب بوقتِ مقابلہ دونوں دیواروں کے درمیان سے پردہ ہٹایا گیا تو رومیوں کا فن چینیوں کی شیشہ کی طرح صاف اور چمکتی دیوار میں منعکس ہوا اور رومیوں کے فن سے زیادہ خوشنما نظر آیا۔ کائنات کی ہر چیز خدا کا پتا دیتی ہے، جس طرح کسی چیز کا سایہ نظر آئے تو آفتاب کا پتا چلتا ہے۔ آفتاب خود دلیلِ آفتاب ہے ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب　　　گر دلیلت باید از وے رو متاب

آفتاب کی دلیل خود آفتاب ہے، اگر تجھے دلیل درکار ہے تو اس حقیقت سے منہ نہ موڑ۔ (۱/۴۳)

لوگوں کو سائے سے اتنا فائدہ نہیں جتنا سورج سے ہوتا ہے، اس لئے دنیا شمسِ ازلی (یعنی اللہ تعالیٰ) کی محتاج ہے۔ موجودات میں گھرا رہنے سے فائدہ نہیں ہوتا، اگر کوئی سایہ میں بیٹھا رہے تو نیند غالب آ جاتی ہے اور مقصدِ حیات تو بیداری ہے۔

سایۂ خواب آرد ترا ہمچوں سمر　　　چوں بر آید شمس اِنشَقَّ القَمَرُ

سایہ قصہ گوئی کی طرح تجھے سُلاتا ہے، سورج نکلتا ہے، چاند شق ہو جاتا ہے۔ (۱/۴۳)

ہر چیز سورج کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے، حتیٰ کہ چاند بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ آفتابِ ازلی یعنی خدا کی تو کوئی مثل نہیں۔

آں خیالاتے کہ دامِ اولیاء ست　　　عکسِ مہ رویانِ بستانِ خُداست

وہ خیالات جو اولیاء کے لئے جال ہیں، خدا کے باغ کے حسینوں کا عکس ہیں۔ (۱/۳۹)

وحی اور الہام

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ وحی اور الہام میں کون خطاب کرتا ہے اور مخاطب کون ہے؟ تمام اَرواح، روح الارواح یعنی ذاتِ باری تعالیٰ سے صادر ہوئی ہیں۔ انسان کے اُوپر کئی پردے چڑھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ پردے دور ہو جائیں تو پھر روح اپنے مصدر (اللہ) سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ انسان پر جو کچھ القا ہوتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا کچھ کہہ رہا ہے، لیکن مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یہاں دوسرا کوئی نہیں، انسان کی اپنی روح کی گہرائیوں سے وہ آواز نکلتی ہے کیونکہ خدا تو ہماری شہ رگ سے نزدیک ہے، جو ہماری روح کی گہرائی ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ روحِ انسانی کی گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ شیطان بھی اندر سے بولتا ہے، خدا بھی انسان کے اندر سے ہی خطاب فرماتا ہے۔ لوگ بحثوں سے بچنے کے لئے اس کو وحیٔ دل کہتے ہیں۔

طوطئی کاید زوحی آوازِ اُو　　　پیش زآغازِ وجود آغازِ اُو

وہ طوطی (روح) جس کی آواز وحی سے ہے، وجود کی ابتداء سے پہلے اس کی ابتداء ہے۔ (۱/۱۹۳)

از پئے روپوش عامہ در بیاں　　　وحیٔ دل گویند آں را صوفیاں

عوام سے روپوشی کے لئے بیان میں، اس کو صوفی دل کی وحی کہہ دیتے ہیں۔ (۴/۱۸۱)

بتیسواں باب

فلسفۂ بقا و ارتقاء

مولانا رومیؒ کا فلسفۂ بقا اور ارتقاء بیان کرنے سے پہلے بقا اور ارتقاء کے لغوی معنوں کا علم ہونا ضروری ہے، لہٰذا سِرِ دلبراں اور کتاب اللّمع میں دیئے گئے معنی ملاحظہ فرمائیں۔

ارتقاء

تصوّف میں ارتقاء سے مراد ارتقائے نفسِ ناطقہ (یعنی انسانی مراتبِ عالیہ) کے ہیں۔ دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ طفلِ شیرخوار شیرِ مادر سے پرورش پاتا ہے اور اپنی ماں کے پاس گہوارہ میں محبوس (مقید) رہتا ہے۔ جب بڑا ہوتا ہے تو پھر ماں سے جدا ہو کر باپ کی تربیت میں آتا ہے اور سفر اختیار کر کے تحصیل علوم میں منہمک ہو جاتا ہے اور مراتبِ عالیہ پر فائز ہوتا ہے پھر کسبِ امور صوری اور معنوی میں مشغول ہوتا ہے۔ تحصیلِ حقائق کے بعد مادرِ طبیعت سے اس کا بُعد ہو جاتا ہے اور پدرِ علوی سے اسے قُرب حاصل ہوتا ہے پھر وہ مراتبِ عالیہ پر فائز ہوتا ہے۔

عناصر اربعہ مرتبۂ سفلی رکھتے ہیں اور مثلِ ماں کے ہیں اور افلاک علوی باپ سے مشابہت رکھتے ہیں، ان دونوں کے ازدواج سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس ارتقاء میں نسبِ مجازی کوئی چیز نہیں ؎

بندۂ عشق شوی ترکِ نسب کن جامی   کہ در ایں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اے جامی! تُو عشق کا بندہ بن اور نسب کو ترک کر دے کیونکہ اس راہ میں فلاں کا بیٹا فلاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

وہ نسبت جو شہوت سے ہو بجز کبر و نخوت (تکبر اور غرور) کے اور کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔ ایسے انسانوں میں مقید

رہنا کمالِ انسانی پر پہنچنے سے مانع ہوتا ہے کیونکہ کمالِ انسانی تجرد اور مقامِ اطلاق سے متعلق ہے، انسان کا مقصدِ اصلی معرفتِ الٰہی ہے، جس کا حصول حجابِ خودی دور ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ سورۃ المومنون میں ہے کہ ''جب صور پھونکا جائے گا اس دن انسانوں میں کوئی نسب قائم نہیں رہے گا اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی پوچھ گچھ ہوگی۔'' (یعنی دین کا نسب ہی قائم رہے گا)۔

مولاناؒ کا فرمان ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک دوسرے میں تحلیل ہوتی رہتی ہے اور بالآخر انسان میں تحلیل ہو کر معرفت کی قابلیت پیدا کرتی ہے۔ بخارات اُٹھتے ہیں، بادل بنتے ہیں اور اُوپر جا کر قطرے بن کر بارش برساتے ہیں۔ بارش زمین پر آتی ہے تو سبزہ زار اُگتا ہے اور نبات کا نام اختیار کرتے ہیں۔ یہ نبات جانوروں کی غذا بنتی ہے اور حیوان کا حصہ بن جاتی ہے اور بالآخر انسان جانوروں کو کھاتا ہے اور اس کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے جو عمرِ صوری کے بعد مبداء سے جا ملتی ہے، یہی ارتقاء ہے۔

اسی طرح رُوحانی طفلِ شیرخوار (مرید) جس نے نفسِ ناسوتی سے خلاصی نہیں پائی، شیرِ مالوفاتِ طبع (روحانی طبع کا دودھ) اور مادر اسفل السافلین یعنی عناصر کی گود میں اور بدن کے گہوارے میں محبوس رہتا ہے۔ جب بالغ ہوتا ہے یعنی جب آثارِ رُشد (ارشاد و ہدایت) اس میں نمودار ہوتے ہیں اور نیک و بد کی تمیز اس میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ سفرِ معنوی اختیار کرتا ہے۔

فنا اور بقا

فنائیت عدم شعور کو کہتے ہیں، ذات احد میں اس درجہ استغراق کہ اپنا بھی ہوش نہ رہے، فنا کہلاتا ہے۔ بے خودی بھی یہی ہے کہ اپنی خودی کا ہوش نہ رہے۔ کتاب اللمع میں ہے کہ فنا بندے کا اللہ کے ساتھ قائم ہونا ہے اور بندے کے افعال کی جگہ اللہ کی صفات اور افعال کا قائم ہو جانا بقا ہے۔ اس کی تشریح ہماری عنقریب شائع ہونے والی تصنیف ''اسلام و رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں دے دی گئی ہے، یہاں اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

بقا

وہ بقا جو فنا کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس بقا کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر ایک چیز دوسری چیز کے ساتھ اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے ہے اور ان میں سے ہر ایک کا مقصد یہ ہے کہ اس کو بقا حاصل ہو سکے، جس کو انگریزی میں (Survival of the Fittest) کہتے ہیں۔

مولاناؒ کے فلسفۂ ارتقاء کا مفہوم

انسانی زندگی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے بقاء اور ارتقاء کے اصولوں کو اس دنیا میں اُجاگر کیا ہے۔ ہر شخص اور ہر شے اپنی بقا کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے اور اسی وجہ سے جو سب سے زیادہ قوی ہوتے

ہیں وہ اس بقا کی جنگ میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شے میں اپنی ذات کا ارتقاء بھی اس لئے ضروری ہے کہ وہ زمانے کی گردش میں کامیاب رہنے کے قابل ہو سکے اور اپنے مقاصدِ زندگی کو بخوبی حاصل کر سکے۔ یہ مضمون بہت طوالت طلب ہے، اس لئے یہاں مولانا رومیؒ کے چند اشعار ہی پیش کئے جائیں گے۔

آنکہ از پستی ببالا بر رود

(انسان جو پستی سے رِفعتِ افلاک پر پہنچتا ہے)

مولانا رومیؒ جہاں یہ فرماتے ہیں کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے "فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ" (بے شک ہم نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے) (الحج:۵) وہاں آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان کی روح عالمِ مادی کی پیداوار نہیں، وہ عالمِ بالا سے مادی دُنیا کی پستی کی طرف اس لئے بھیجی گئی ہے کہ رَجْعَة اِلَی اللّٰہ کی سعیٔ دراز سے اپنے ممکناتِ حیات کو مستحکم بنا سکے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرنے کی سعیٔ کو حقیقت بنائے اور جب یہ کہا کہ ہم نے تم کو مٹی سے بنایا تو اس سے تم اپنی ہستی کو پستی کا مادہ نہ سمجھو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ درخت کے بیج کو جب مٹی میں بویا جاتا ہے تو ذوقِ نمو اور شوقِ ارتقاء اس کو سربلند درخت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عام انسان تو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان خاک سے نکلا اور پھر خاک میں چلا جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو خاک سے اُبھر کر کائنات کی کار فرما قوتوں کا سردار بننا ہے۔

بیں کہ اندر خاک تخمے کاشتم — گرد خاکی و مَنَش اَفراشتم

دیکھ لے میں نے مٹی میں بیج بویا، وہ خاکی بنا اور میں نے اس کو بلند کیا۔ (۵۵/۳)

حملۂ دیگر تو خاکی پیشہ گیر — تا کُنم بر جُملہ میرانت امیر

دوسری بار تُو خاکی ہونا اختیار کر، تاکہ میں تجھے تمام سرداروں کا سردار بنا دوں۔ (۵۵/۳)

آب از بالا بہ پستی دَر رَود — آنکہ از پستی ببالا بَر رَود

پانی بلندی سے پستی کی طرف جاتا ہے، لیکن وہ پستی سے بلندی کی طرف جاتا ہے۔ (۵۵/۳)

دانۂ ہر میوہ چوں گردد دَفیں — بعد ازاں سَرہا بر آرد از زمیں

ہر میوے کا بیج زمین میں آتا ہے، اس کے بعد زمین سے بہت سے سر نکلتے ہیں۔ (۵۵/۳)

اصل نعمت ہا زگردوں تابخاک — زیر آمد شُد غذائے جانِ پاک

تمام نعمتوں کی اصل آسمان سے مٹی تک نیچے آئی تو پاک جان کی غذا بنی۔ (۵۵/۳)

پس صفاتِ آدمی شد آں جماد — بر فرازِ عرش پرّاں گشت شاد

تو وہ بے جان آدمی کی صفات سے (موصوف) ہوگیا اور خوش ہو کر آسمان کی بلندی پر اُڑ گیا۔ (۵۵/۳)

جُملہ اجزا در تحرّک دَر سُکون ناطقاں کہ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
تمام اجزا حرکت اور سکون میں کہتے ہیں کہ ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (۵۵/۳)

اشعار بالا کے ترجمے سے مولاناؒ کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور علامہ اقبالؒ نے ان کے خیالات کے مطابق بہت سے اشعار لکھے ہیں، جن کا بیان یہاں ممکن نہیں، البتہ چند اشعار شائقین کے ذوق کے لئے دیئے جا رہے ہیں۔ علامہؒ ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریلؑ و سرافیلؑ کا صیّاد ہے مومن
(ض۔ک۔۵۰۷)

ہمسایۂ جبریلؑ امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اِس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان
(ض۔ک۔۵۲۲)

ایں بقاہا از فناہا یافتی
(تو نے یہ بقائیں فناؤں سے ہی حاصل کی ہیں)

مولانا رومیؒ اِرتقائی صوفی اور حکیم ہوئے ہیں۔ آپ تمام مسلمان حکماء و صوفیا میں امتیازی مقام رکھتے ہیں، فلسفۂ ارتقاء کو آپ نے کئی مقامات پر مثنوی میں بیان فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انسان چار عناصر (آتش و باد آب اور خاک کی منزل میں تھا اور اگر زندگی میں میلانِ ارتقاء (ترقی کرنے کا میلان) نہ ہوتا تو وہ اس سے آگے قدم نہ اُٹھا سکتا۔ غور سے دیکھا جائے تو انسان کئی مراحل طے کرتا ہے اور ایک وقت ایسا تھا کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ "هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا" (بے شک آدمی پر ایک وقت وہ بھی گزرا کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا) (الدھر:۱) اللہ تعالیٰ محض ایک "خلاق" نہیں بلکہ مبدلِ ہستی ہے۔ اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی بہتر سے بہتر صورتوں میں بدلتی رہتی ہے۔ اِبتدائے آفرینش سے اس حالت تک

انسان نے ہزارہا صورتیں بدلی ہیں، اس حال میں کہ پہلی صورت سے بعد میں آنے والی صورت بہتر تھی۔ تمام کائنات میں فنا و بقا کا قانون جاری و ساری ہے۔ ایک صورت کے فنا ہونے کے بعد ہی دوسری صورت ظہور میں آسکتی ہے۔ زندگی کا مقصد افزونیءِ حیات ہے اور کسی ایک حالت پر اس کا قیام اس کا مقصد نہیں ؎

تو ازاں روزے کہ در ہَست آمدی　　آتشی یا خاک یا بادے بُدی

تُو جس دن سے وجود میں آیا ہے، آگ یا خاک یا ہوا تھا۔ (۸۸/۵)

گر بداں حالت ترا بُودے بقا　　کہ رسیدے مر ترا ایں ارتقا

اگر اسی حالت پر تیرا بقا ہوتا تو تجھے یہ ترقی کب حاصل ہوتی؟ (۸۸/۵)

از مُبدّل ہستیءِ اوّل نہ ماند　　ہستیء دیگر بجائے اُو نشاند

تبدیل کرنے والے کی وجہ سے پہلا وجود نہ رہا، اس نے دوسرا وجود اس کی بجائے قائم کر دیا۔ (۸۸/۵)

ہمچنیں تا صد ہزاراں ہستہا　　بعدِ یک دیگر دوم بہ زابتدا

اسی طرح لاکھوں وجود تک، ایک کے بعد دوسرا پہلے سے بہتر رہا ہے۔ (۸۸/۵)

ایں بقاہا از فناہا یافتی　　از فنایش رُو چُرا بر تافتی

تو نے یہ بقائیں فناؤں سے حاصل کی ہیں، اس کی فنا سے تو نے کیوں منہ موڑا ہے۔ (۸۸/۵)

صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود　　تاکنوں ہر لحظہ از بدوِ وجود

اے سرکش! تو نے لاکھوں حشر دیکھے ہیں، ہر لمحہ وجود کی ابتداء سے اب تک۔ (۸۹/۵)

از جمادی بے خبر سوی نُما　　وزنما سوئے حَیات و اِبتلا

بے خبری میں جمادیت سے نشوونما کی جانب اور نشوونما سے زندگی اور آزمائش کی جانب رواں دواں ہوں۔ (۸۹/۵)

زانکہ او از اصلِ بے پرواز بود　　واں دگر پرندہ و پرباز بود

کیونکہ وہ اصل سے بغیر اُڑان کے تھا، وہ دوسرا اُڑنے والا اور کھلے پروں کا تھا۔ (۹۰/۵)

اگر زندگی کا اصل میلان ارتقائی ہے تو پھر ایک حالت پر قائم ہو جانا اور تبدیلیٔ ہیئت کی تمنّا نہ کرنا موت کے برابر ہے۔ علامہ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا　　زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

حدیث شریف میں آیا ہے:

قَالَ النَّبِیُّ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِرْحَمُوْا ثَـلَاثًا عَـزِیْـزَ قَوْمٍ ذُلَّ، وَ غَنِیَّ قَوْمٍ اِفْتَقَرَ وَ عَالِماً لِماَ یَلْعَبُ بِہِ الْجُھَّالُ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تین قسم کے اشخاص پر رحم کرو۔ ایک وہ جو اپنی قوم میں سرداری و اقتدار رکھتا تھا (لیکن انقلابِ روزگار سے) وہ ذلیل ہو گیا۔ دوسرا وہ جو کبھی امیر تھا لیکن اب افلاس میں گرفتار ہے۔ تیسرا وہ عالم جو جاہلوں کے بیچ میں گھر گیا اور علم سے تہی دامن اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا بھی یہی حال ہے، ابنِ آدم اَحْسَنِ تَقْوِیْم سے اَسْفَلُ السَّافِلِیْنَ میں گر رہا ہے مگر بعض اہلِ بصیرت نے اپنے پہلے ازلی مقام کو فراموش نہیں کیا۔ وہ اپنے مسجودِ ملائک ہونے کی حالت کو نہیں بھولے۔ آدم علیہ السلام اپنی اصلی حالت میں نیابتِ الٰہی اور سردارِ عالم بھی تھے، غنی بھی تھے اور وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علم الاسماء عطا فرمایا (البقرہ:۳۱)، اس کی بدولت وہ عالم بھی تھے۔ عام انسان اب ان تینوں حیثیتوں کو بھول گیا ہے۔

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش — باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

جو کوئی اپنی اصل سے دُور ہو جاتا ہے، وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے۔ (۳۱/۱)

ویسے بھی کہا جاتا ہے "کُلُّ شَیْءٍ یَّرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ" (ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے) اپنی ماہیت میں انسان اللہ تعالیٰ سے اس طرح وابستہ تھا کہ جس طرح شاخ درخت کے تنے اور اس کی جڑ سے وابستہ ہوتی ہے یا ایک زندہ عضو ایک زندہ جسم سے رابطہ رکھتا ہے۔ عضو کٹ جائے تو وہ مر جاتا ہے، جو لوگ درجۂ اسفل تک خدا سے کٹ کر دنیا سے وابستہ ہو گئے تو اُن کی حالت ان کتّوں کی طرح ہوتی ہے، جن کو مردہ گوشت لذیذ محسوس ہوتا ہے "اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّطَالِبُھَا کِلَابٌ" یعنی دُنیا مُردار ہے اور اس کا طالب کتّا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ

آنکہ اُو بعد از عزیزی خوار شد — واں توانگر ہم کہ بے دینار شد

وہ جو عزت کے بعد ذلیل ہو گیا ہو، وہ مالدار بھی جو بے زر ہو گیا ہو۔ (۹۱/۵)

واں سوم آں عالمے کاندر جہاں — مُبتلا گردد میانِ اَبلہاں

تیسرے وہ عالم جو دُنیا میں، بے وقوفوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ (۹۱/۵)

زانکہ از عزت بخواری آمدن — ہمچو قطع عضو باشد از بدن

کیونکہ عزت سے ذلت میں آ جانا، جسم سے عضو کٹ جانے کی طرح ہے۔ (۹۱/۵)

عضو گردد مردہ کزتن وا بُرید — نو بُریدہ جُنبد امّا نے مُدید

جو عضو بدن سے کٹ گیا وہ مردہ ہو جاتا ہے، نیا کٹا ہوا تڑپتا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں۔ (۹۱/۵)

ہر کہ از جامِ اَلست اُو خورد پار　　　ہستش اِمسال آفتِ رنج و خمار

جس نے گذشتہ سال جام اَلست سے پیا ہو، اس کو اس سال رنج اور اعضاء شکنی کی مصیبت ہوگی۔ (۹۱/۵)

وانکہ چُوں سگ ز اصل گہدانی بُود　　　کے مرا اُورا حرصِ سلطانی بود

وہ جو کتے کی طرح اصل سنڈاس کا ہو، اس کو بادشاہت کا لالچ کب ہوتا ہے۔ (۹۱/۵)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مومن اس دنیا میں ایسے ہی ہے جیسے کوئی شکاری کسی غزال رعنا (مشک والا ہرن) کو گائے اور بھینسوں کے طویلے میں بند کر دے تو وہ وہاں کے ماحول سے سخت پریشان ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اسلام دنیا میں آیا تو اجنبی تھا اور آخرت میں بھی اجنبی ہو جائے گا۔ مبارک ہو ایسے کسمپرس اجنبیوں کے لئے جو غرباء تھے (بَدَاءَ اْلاِسْلَامُ غَرِیْباً وَسَیَعُوْدُ کَمَابَدَأَ غَرِیْباً فَطُوْبیٰ اللْغُربَاءُ) (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۹۰)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہرن میں مشکِ نافہ ہوتا ہے اور اس کی غذا سنبل و لالہ جیسے پودے، اسی لیے بے چارہ گاؤخر کے طویلے میں پریشاں حال رہتا اور اکثر ہی بیمار رہتا تھا۔ ایک دن ایک گدھا بھی بیمار ہوگیا تو اس نے اپنا کھانا ہرن کو پیش کیا مگر اس نے نہ کھایا۔ گدھا کہنے لگا کہ تم خود کو بڑا معزز اور ہمیں ذلیل سمجھتے ہو کہ ہماری ضیافت قبول نہیں کرتے، ہرن نے کہا کہ تم اسے ضیافت سمجھتے ہو مگر میرے لئے تو یہ آفت ہے۔ گدھے نے کہا کہ آپ گپیں ہانکئے کیونکہ دوسرے ملک میں جا کر مسافر گپ لگا سکتا ہے۔ دنیادار بھی مومن کو اسی طرح نشانۂ ہدف بناتے ہیں۔

موجوداتِ عالم کو چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان لیکن ان کے مسئلہ آفرینش کے متعلق حکماء میں اختلاف رائے ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ یہ چاروں اپنے وجود میں مستقل ہیں، یعنی فطرت نے ان کو ابتدا ہی سے اس صورت میں پیدا کیا ہے۔ دوسرے فریق یعنی ڈارون کا خیال ہے کہ اصل میں صرف ایک چیز تھی، وہی ترقی کرتے کرتے اخیر درجہ یعنی انسان تک پہنچی۔ اس کا خیال تھا کہ انسان پہلے جماد تھا، پھر نبات، پھر حیوان اور پھر انسان بنا۔ یہ سلسلۂ ارتقاء خود ان انواع میں بھی جاری ہے، مثلاً فاختہ، قمری، کبوتر جداگانہ نوعیں نہیں ہیں بلکہ اصل میں ایک ہی پرندہ تھا جو خارجی اسباب سے مختلف صورتیں بنتا گیا اور صورت کے انقلاب کے مطابق سیرت بھی بدلتی گئی۔ اس مسئلے کا موجد ڈارون خیال کیا جاتا ہے اور درحقیقت ڈارون نے جس تفصیل اور تدقیق سے مسئلہ کو ثابت کیا ہے اس کے لحاظ سے وہی اس مسئلہ کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ مولانا رومؒ نے اس مسئلہ کو اِن اشعار میں بصراحت لکھا ہے ؎

آمدہ اوّل باقلیم جَماد　　　وز جَمادی در نَباتی اُو فتاد

پہلے وہ (روح) جماد کی اقلیم میں آئی اور پھر جمادی (اقلیم) سے نباتی (اقلیم) میں آئی۔ (۳۴۴/۴)

سالہا اندر نَباتی عمر کرد　　　وز جَمادی یاد ناورد از نبرد

سالوں نباتی (اقلیم) میں عمر بسر کی اور سرکشی کی وجہ سے اپنی جمادی (زندگی) کو بھلا دیا۔ (۳۴۴/۴)

وز نَباتی چوں بہ حیوانی فتاد نامدش حالِ نَباتی ہیچ یاد

اور نباتی (اقلیم) جب حیوانی (اقلیم) میں آئی، اس کو نباتی (اقلیم) کا حال کبھی یاد نہ آیا۔ (۳۴۴/۴)

جُز ہماں میلے کہ دارد سُوئے آں خاصہ دَر وقتِ بہار و ضیمراں

سوائے اُس میلان کے جو اُس کی جانب ہے، خصوصاً بہار اور ضیمراں کے موسم میں۔ (۳۴۴/۴)

ہمچو میلِ کودکاں با مادراں سِرّ میلِ خود نداند دَر لباں

جیسا کہ بچوں کا ماؤں کی طرف میلان ہے کہ وہ دودھ پینے میں اپنے میلان کا خود راز نہیں جانتے۔ (۳۴۴/۴)

ہمچنیں اِقلیم تا اِقلیم رَفت تاشد اکنوں عاقل و دانا و زَفت

وہ اسی طرح (ایک) اقلیم سے (دوسری) اقلیم تک چلتی رہی، یہاں تک کہ وہ اب عقلمند، دانا اور قوی ہوگئی۔ (۳۴۵/۴)

اس دُنیا میں ہر زندہ ہستی صید بھی ہے اور صیاد بھی

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اس دُنیا میں حشرات الارض سے لے کر انسان تک ہر زندہ ہستی صید بھی ہے اور صیاد بھی۔ ہر مخلوق کچھ نہ کچھ کھاتی ہے اور خود کسی دوسرے کی خوراک بنتی ہے۔ پرندہ کیڑے کھاتا ہے اور بلی پرندے کو کھاتی ہے، چور مال کی تاک میں ہے اور کوتوال چور کی تاک میں، گھاس پانی پی کر سرسبز ہوتا ہے تو جانور اس کو کھا جاتے ہیں اور اس جانور کو بھی انسان کھا جاتا ہے۔

عالمِ جسمانی کے علاوہ عالمِ نفسی کا بھی یہی حال ہے کہ ایک خیال دوسرے خیال کو کھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں جو کسی کی غذا نہیں اور اللہ کی بھی کوئی غذا نہیں۔ اگر انسان آکل و ماکول کی نفسا نفسی سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو جائے تو پھر اس کو بقا حاصل ہو جائے گی اور وہاں تنازع للبقاء نہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ؎

مرغکے اَندر شکارِ کِرم بُود گربہ فرصت یافت اُورا دَر رَبُود

ایک چھوٹا سا پرندہ کیڑے کے شکار میں (مصروف) تھا، بلی کو موقع ملا وہ اُس کو اُچک لے گئی۔ (۸۱/۵)

آکل و ماکول بود اُو بے خبر در شِکار خود، زصیّادِ دِگر

وہ کھانے والا اور لُقمہ تھا اور بے خبر تھا، اپنے شکار میں، دوسرے شکاری سے۔ (۸۱/۵)

دُزد گرچہ در شکارِ کالہ است شحنہ باخصمانش در دُنبالہ است

چور اگرچہ سامان کے شکار میں (مصروف) ہے، کوتوال مع اس کے دُشمنوں کے (اس کے) درپے ہے۔ (۸۱/۵)

اُو چناں غرق ست در سَودائے خود غافل ست از طالب و جویائے خود

وہ اپنی دُھن میں ایسا غرق ہے کہ اپنے طالب اور جویا سے غافل ہے۔ (۸۱/۵)

گر حشیش آبِ زلالے میخورد   معدہٗ حیوانش دَرپے میچَرد

اگر گھاس شیریں پانی پیتی ہے تو بعد میں اُس کو حیوان کا معدہ چر لیتا ہے۔ (۸۲/۵)

آکل و ماکول آمد آں گیاہ   ہمچنیں ہر ہستیِ غیرِ اِلٰہ

وہ گھاس کھانے والی اور غذا بن گئی، خدا کے سوا ہر موجود ایسا ہی ہے۔ (۸۲/۵)

وھُوَ یُطْعِمُکُمْ وَلَا یُطْعَمُ چو اُوست   نیست حق ماکول و آکِل لحم و پوست

چونکہ وہ تمہیں کھلاتا ہے اور کھلایا نہیں جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ غذا اور گوشت و پوست کا کھانے والا نہیں ہے۔ (۸۲/۵)

ہر خَیالے را خَیالے میخورد   فکرِ آں فِکر دگر را می چَرد

ہر خیال کو ایک خیال کھا جاتا ہے، اس کا فکر دوسرے فکر کو چر جاتا ہے۔ (۸۲/۵)

ہیں گریز از جوقِ اکّالِ غلیظ   سُوئے اُو کہ گفت ہستیمت حفیظ

خبردار! بھاری یعنی زیادہ کھانے والوں کی جماعت سے بھاگ اُس کی جانب، جس نے فرما دیا ہے ہم تیری حفاظت کرنے والے ہیں۔ (۸۲/۵)

جب انسان اس منزل پر پہنچ جائے کہ علمِ ازلی کا حامل ہو جائے تو اسے مظاہرِ فطرت (ارضی یا فلکی) کا علم ہو جاتا ہے۔ یہ ظاہری محسوسات جو حقیقت کے مغز پر چھلکوں کی مانند ہیں، صاحبِ مغز (یعنی مشاہدہ والا) لازماً ان کا بھی مالک ہو جاتا ہے، یعنی پھل خریدنے والا چھلکے کا بھی مالک ہو جاتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ ارض و سما کے مظاہر چھلکے ہیں اور مغز حقیقت ہے، یعنی مجازی عارف حقیقت کے احاطۂ قدرت میں ہوتا ہے۔

پس فلک قشر ست و نورِ روح مغز   ایں پدید است آں خفی زیں رو ملغز

بس آسماں چھلکا ہے اور روح کا نور مغز ہے، یہ کھلا ہے وہ چھپا ہوا ہے، اس سے لغزش نہ کھا۔ (۳۰۶/۲)

تنسیخِ آیات سے قانونِ تغیّر کی تعلیم ہے

تنسیخِ آیات "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْنُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْمِثْلِهَاؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"

ترجمہ:- جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اُس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے، کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔ (البقرہ:۱۰۶) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم آیات کو اس وقت تک منسوخ نہیں کرتے، جب تک اس جیسی یا اس سے بہتر کوئی آیت نہ لے آئیں۔ فطرت ہر وقت تجدید میں مصروف ہے۔ شریعتیں قوموں میں نظم و نسق پیدا کرنے کے لئے نافذ کی جاتی ہیں مگر جب اقوام کی حالت بدل جائے تو اللہ تعالیٰ شرائع کو بدل دیتا ہے۔ غور سے دیکھیں کہ تورات، زبور اور انجیل جو خدا کی نافذ کردہ شرائع تھیں

لیکن یہ اُس زمانے کے ماحول کے مطابق تھیں۔ انسان کا ذہن ہر زمانے میں بدلتا گیا، چنانچہ وہ شرائع بھی بدلتی گئیں لیکن جب انسان کا ذہن پختہ (Mature) ہو گیا تو شرائع کو بھی بدل کر پختہ کر دیا گیا۔ اب اس کے بعد آخری شرع میں اجماع، قیاس اور استصلاح وغیرہ کے مطابق معمولی ردّ و بدل تو ہوئی مگر دین وہی رہا۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دیکھو رات دن کو منسوخ کر دیتی ہے۔ موسم بدلتے ہیں اور حالاتِ زمانہ بھی بدلتے ہیں۔ جنگوں میں بھی جانیں ضائع ہوتی ہیں مگر اس کے بعد اصلاح و فلاح سے انسان کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ بقا اور ارتقاء کے لئے تنسیخ کا قانون لازم و ملزوم ہے مگر خدا کے غیر متغیر قوانین یا آئین منسوخ نہیں ہوتے۔ "فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً" تو تم اللہ کی سنت کو ہرگز بدلتا نہ پاؤ گے۔ (فاطر:۴۳) مظاہرِ حیات میں ایک مظہر دوسرے کی تنسیخ کرتا رہتا ہے، جس کے بغیر نہ بقائے حیات ممکن ہے اور نہ افزائشِ حیات، کیونکہ اس سے انسان فروغ حاصل کرتا ہے۔

مولانا رومیؒ باغبان کی مثالیں دیتے ہیں کہ وہ باغ کی بہتری کے لئے باغ میں تغیر و تبدّل کرتا رہتا ہے۔ شاخوں کو کاٹنا درختوں کی بہتری کا ذریعہ بنتا ہے۔ فالتو جڑی بوٹیوں کو کاٹ دیتا ہے تاکہ زمین کی طاقت ضائع نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ اپنے ادنیٰ میلانات کو منسوخ کرتے جاؤ، یہاں تک کہ تمہیں حیاتِ جاودانی حاصل ہو جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "جس کے دو دن برابر ہیں تو وہ گھاٹے میں ہے۔" ایک حالت میں قائم رہنا جمود پیدا کرتا ہے۔ درزی کپڑے کی قطع و برید کرتا ہے تو عمدہ لباس بناتا ہے۔ سوداگر کچھ سامان بیچتا ہے تو زیادہ منفعت کے بعد بہتر مال خریدتا ہے۔

ہر شریعت را کہ حق منسوخ کرد   اُو گیا بُرد و عوض آورد ورد

جس شریعت کو خدا نے منسوخ کیا ہے تو اس نے گھاس کو ختم کیا اور بدلے میں گلاب لایا ہے۔ (۳۹۱/۱)

شب کند منسوخ نورِ روز را   چوں جمادے داں خرد افروز را

رات دن کی روشنی کو منسوخ کر دیتی ہے، عقل بڑھانے والے کو پتھر کی طرح سمجھ۔ (۳۹۱/۱)

باز شب منسوخ شد از نور روز   تا جمادی سوخت زاں آتش فروز

پھر دن کی روشنی سے رات منسوخ ہوتی ہے، یہاں تک کہ اس حرارت پیدا کرنے والے کی وجہ سے پتھریلا پن ختم ہو گیا۔ (۳۹۱/۱)

جنگِ پیغمبرؐ مدارِ صُلح شُد   صُلح ایں آخر زماں زاں جنگ بُد

پیغمبر ﷺ کی جنگ صلح کا دار و مدار ہوئی، اس اخیر زمانہ کی صلح اسی جنگ کی وجہ سے تھی۔ (۳۹۲/۱)

صَد ہزاراں سر بُرید آں دلستاں   تا اماں یابد سَرِ اہل جہاں

اس محبوب نے لاکھوں سر قلم کر دیئے، تاکہ دنیا والوں کے سروں کو امن حاصل ہو۔ (۳۹۲/۱)

حلقِ حیواں چوں بُریدہ شد بعدل — حلقِ انساں رُست و افزائید فضل

جانور کا گلا جب انصاف سے کاٹا گیا تو انسان کے حلق نے نشو ونما پائی اور اس کی فضیلت بڑھ گئی۔ (۳۹۲/۱)

خانہ را ویراں کند زیر و زبر — پس بیک ساعت کند معمور تر

گھر کو ویران اور زیر و زبر کرتا ہے، پھر ایک گھڑی میں اور زیادہ آباد کر دیتا ہے۔ (۳۹۳/۱)

مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آیات منسوخ کیں، ان کو صحابہ کے ذہن سے بھی محو کر دیا اور نئی آیات کو حافظہ میں ڈال دیا۔ (قارئین کی معلومات کے لئے یہ ہے کہ کچھ آیات کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوئے اور کچھ کا صرف حکم منسوخ ہو مگر تلاوت ابھی تک ہے)۔

جزا اور سزا کے قوانین بعض اوقات سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ ہر عمل پر جزا یا سزا دیتا ہے۔ کسی کام کی جزا یا سزا اس کام کی جنس کے مطابق نہیں ہوتی، مثلاً نیک زندگی کا اجر جنت ہے، عمل اور اجر ہم جنس نہیں۔ مزدور کی محنت کے بدلے اس کو چند چاندی کے سکے ملتے ہیں جس کا تعلق محنت کی جنس کے ساتھ نہیں، اسی طرح اعمالِ سیۂ کی سزا جہنم، سانپ اور بچھو ہیں۔

مولاناؒ نے ایک بہت دلچسپ بات کا ذکر کیا ہے کہ ایک شخص رشوت کے جرم میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اسے سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ عدالت نے بھی غلط فیصلہ دیا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اندھیر نگری ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ نہ تو دنیا میں اندھیر نگری ہے اور نہ آخرت میں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ کیا ہو تو اس کو سزا اس گناہ کے جرم کی وجہ سے نہ ملے تو کسی اور کام میں خواہ اس میں اس کا قصور ہو یا نہ ہو سزا مل جاتی ہے۔ اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ میں فلاں فلاں گناہ کا مُرتکب ہوا تھا مگر اب مجھے اس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ایک شخص پر ظلم کیا تھا اور اس کی سزا ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جزا اور سزا کی تحقیق کی جائے تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اس لئے اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے ؎

گر تُرا آید زجائے تُہمتے — کرد مظلومت دُعا در محنتے

اگر تجھ پر کسی جگہ تُہمت لگے تو یہ جانو کہ کسی مظلوم نے مصیبت میں تیرے لئے بددعا کی ہے۔ (۳۳۱/۳)

تو ہمی گوئی کہ من آزادہ ام — برکسے من تہمتے ننہادہ ام

تو بھی کہتا ہے کہ میں بے قصور ہوں، میں نے کسی پر تُہمت نہیں رکھی ہے۔ (۳۳۱/۳)

او زِنا کرد و جَزا صَد چوب بود — گوید او من کے زدم کس را بعُود

اس نے زنا کیا اور سزا سو درّے ہوئے، وہ کہتا ہے کہ میں نے کسی کو سو درّے کب مارے ہیں؟ (۳۳۱/۳)

نے جَزائے آں زنا بُود ایں بَلا — چوب کے ماند زنا را در جَزا

کیا اس زنا کی سزا یہ بلا نہیں ہے؟ دُرّے زنا سے سزا میں کب مشابہ ہیں۔ (۳۳۱/۳)

آبِ صبرت آب جوئے خُلد شُد　　جوئے شیرِ خُلد مِہرِ تُست ووُدّ

تیرے صبر کا پانی جنت کی نہر کا پانی ہے، جنت کی دودھ کی نہر تیری محبت اور دوستی ہے۔ (۳۳۲/۳)

راقم الحروف نے ریڈیو تہران سے ایک دلچسپ واقعہ سنا (جو مثنوی میں بھی نقل کیا گیا ہے) اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص غریب الحال تھا اور اس کو گوشت کھائے ہوئے کئی دن گذر گئے تھے، اس نے دعا کی کہ الٰہی! مجھے گوشت عطا فرما۔ رات کو اس کو خواب میں کہا گیا کہ کل تمہارے گھر میں ایک گائے داخل ہوگی، وہ تمہارے لئے بھیجی جا رہی ہے، تم اس کو ذبح کرکے کھا لینا یہ تمہارا ہی مال ہوگا۔ دوسرے دن واقعی ایک گائے اس کے گھر میں داخل ہوئی اور اس نے دروازے بند کرکے ذبح کر ڈالی اور خوب مزے سے اُڑائی۔ گائے والے کو بھی علم ہوگیا کہ اس کی گائے فلاں شخص نے ذبح کرکے کھا لی ہے۔ اس نے حضرت داوٗد علیہ السلام کے پاس جا کر دعویٰ داخل کر دیا اور آپؑ نے دونوں کے بیانات سننے کے بعد فیصلہ کیا کہ اس شخص نے گائے ٹھیک کھائی ہے، اس کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

مذکور بالا فیصلہ سُن کر مدعی نے شور و واویلا کیا اور حضرت داوٗد علیہ السلام سے کہنے لگا کہ آپ پیغمبر ہیں لیکن (معاذاللہ) آپ نے یہ فیصلہ غلط کیا ہے، آپ انصاف کریں۔ حضرت داوٗد علیہ السلام نے فرمایا کہ انصاف کا فیصلہ تمہیں مہنگا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے انصاف کا فیصلہ قبول ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام اسے جنگل میں لے گئے اور ایک درخت کے نیچے زمین کھودنے کا حکم دیا تو اس میں سے ایک مُردے کی ہڈیاں برآمد ہوئیں اور اس کو بتایا کہ تم نے گائے کھانے والے کے باپ کو مار کر یہاں دفن کیا تھا اور اب تم نے اس کے تمام مال پر قبضہ جما لیا ہے۔ یہ گائے اس کے باپ کی ملکیت تھی اس لئے اس کو اس گائے کے کھانے کا حق تھا۔ اب تم مجھ سے انصاف چاہتے ہو تو انصاف یہ ہے کہ اس جرم کی سزا میں تمہیں قتل کیا جائے گا۔

مذکورہ حکایت سے معلوم ہوا کہ کئی مرتبہ کسی کو کسی نہ کسی گناہ کی پاداش میں سزا مل جاتی ہے، حالانکہ بظاہر یہ اس کا قصور معلوم نہیں ہوتا۔ سزا ضرور ملتی ہے خواہ کسی اور شکل میں ملے۔ ایک بزرگ نے کسی کو کہا کہ تمہیں اس گناہ کی سزا ضرور ملے گی خواہ دیر سے ہی ملے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ مجھے اس بات کی سزا تیس (۳۰) سال کے بعد ملی۔ (واقعہ طویل ہے)۔

اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ

(حکمت مومن کی گم شُدہ چیز ہے)

یہ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”حکمت مومن کا گم شُدہ مال ہے۔“ مولاناؒ فرماتے ہیں جو حکمت کا طالب ہو وہ دین کا ہی طالب ہوتا ہے۔ انسان کی روح آفرینش سے پہلے ہی خدا سے آشنا ہو چکی ہے، اگر انسان کو مصائب، لالچ، حرص اور خواہشاتِ طلب حقیقت میں گمراہ نہ کریں اور حق اس کو نظر آئے تو ضرور اس کو پہچان لیتا ہے۔

اُشترے گُم کردی و جُستیش چُست چوں بیابی، چوں ندانی کانِ تست

تُو نے اونٹ گم کر دیا اور اس کو جُستی سے ڈھونڈا، جب تو اُسے پا لے گا پھر کیسے نہ سمجھے گا کہ وہ تیری ملکیت ہے۔

(۲/۲۷۶)

ضالہ چہ بود ناقۂ گم کردۂ از کفت بگریختہ در پردۂ

گم شُدہ چیز کیا تھی؟ گم شُدہ اونٹنی، جو تیرے ہاتھ سے نکل بھاگی، چھپ گئی۔

(۲/۲۷۶)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ چند شر پسند انسانوں، غرض کے بندوں اور احمقوں نے انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ ؎

ہمچنانکہ ہر کسے در معرفت می کند موصوف غیبی را صفت

جس طرح کہ ہر شخص خدا شناسی میں، غیبی موصوف کی صفتیں بیان کرتا ہے۔ (۲/۲۷۷)

حافظؔ صاحب کا شعر ہے ؎

آنانکہ حسنِ روئے تو تفسیر می کنند خوابے نہ دیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

جو لوگ ترے چہرے کے حسن کی تفسیر کرتے ہیں، وہ جو چیز خواب میں بھی نہ دیکھی گئی ہو اس کی تعبیر کرتے ہیں۔

(حافظ)

کسی شاعر نے کہا ہے ؎

حرم جویاں درے را می پرستند فقیہاں دفترے را می پرستند

حرم کو تلاش کرنے والے ایک دروازے کی پوجا کرتے ہیں، فقہا کتابوں کی پوجا کرتے ہیں۔ (غیر مثنوی)

بر افگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے را می پرستند

اے خدا! پردہ اُٹھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ یار لوگ کسی اور کی ہی پوجا کرتے ہیں۔ (غیر مثنوی)

گویا ہر شخص اپنے خیال اور مسلک کے اعتبار سے بات کرتا ہے، اس لئے ان سب کی باتیں اور شرحیں مختلف ہوتی ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہر فرقے میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے، اس لئے ہر فرقے کے پیچھے اچھے خاصے لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں۔ مولاناؒ کو کسی مُلّا نے پوچھا کہ آپ ہر فرقے کو درست کہتے ہیں تو آپ کافر اور ملحد ہو گئے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ بہتر (۷۲) فرقوں میں سے کس پر اتفاق کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں تو ہر فرقے سے متفق ہوں۔ مُلّا نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ ملحد ہیں۔ مولاناؒ نے متبسّم ہو کر کہا کہ میں اس سے بھی متفق ہوں، چنانچہ مناظرہ شروع ہونے سے پہلے ختم ہو گیا۔

کہ مرا از شر بخیر انداختند

دُنیا میں مطلق شر کا وجود نہیں

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خیرِ مطلق ہے، وہ شرِ مطلق پیدا نہیں کرتا، یعنی کوئی چیز ایسی نہیں کہ جو قطعاً شر ہو اور اس میں خیر کا پہلو موجود نہ ہو۔ مثال کے طور پر زہر ایک انسان کے لئے باعثِ موت بن جاتا ہے مگر سانپ کی زندگی زہر کے بغیر ممکن نہیں، بلکہ زہر اس کے لئے آبِ حیات ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ زید کو ایک شخص شیطان کہتا ہے مگر دوسرے کے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ زید تو بہت اچھا آدمی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جس نے کسی انسان کے اچھے پہلو پر نظر ڈالی اور بُرے پہلو سے چشم پوشی کی تو وہ اس کو دوست بنا لے گا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ ایک خطیب اپنے مواعظ میں بدمعاشوں اور کافروں کے لیے دعائے خیر کیا کرتا تھا تو لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ خطیبِ مسجد نے فرمایا کہ میں نے نیکی انہی بُرے لوگوں کی وجہ سے سیکھی ہے، اس لئے میں اُن کے لئے بددعا کیسے کروں۔

گفت نیکوئی ازینہا دیدہ ام — من دعا شاں زیں سبب بگزیدہ ام

اس نے کہا کہ میں نے اُن سے بھلائی دیکھی ہے، اس لئے میں نے ان کو دُعا دینا اختیار کیا ہے۔ (۲۰/۴)

خبث و ظلم و جور چنداں ساختند — کہ مرا از شر بخیر انداختند

انہوں نے ایسا خبث، ظلم اور جفا کی کہ مجھے بُرائی سے بھلائی میں لا ڈالا۔ (۲۱/۴)

ہر گہے کہ رُو بدنیا کردمے — من زایشاں زخم و ضربت خوردمے

جب بھی میں نے دُنیا کی طرف اپنا رُخ کیا، میں ان سے تکلیف اُٹھاتا اور مار کھاتا رہا۔ (۲۱/۴)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ لوگ دوستوں کے اچھے سلوک سے خوش ہیں اور دشمنوں کی دشمنی کو شر سمجھتے ہیں اور خُدا سے ان کے لئے شکایت کرتے ہیں، حالانکہ دشمنوں کی عداوت اور رنج و غم تمام اخلاقی اِمراض کے لئے اکسیر ہیں۔ یہ شر نُما مصائب زندگی کو کیمیا بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء اور اولیاء کو رنج و شکست کی آماجگاہ بنا دیتا ہے اور یہ احادیث سے ثابت ہے کہ "اَشَدُّ النَّاسِ بَلاَءً اَلْاَنْبِیَاءُ" (لوگوں میں سے سب سے زیادہ بلائیں انبیاء پر نازل ہوتی ہیں)۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جتنے مصائب اور تکالیف مجھ کو دیئے گئے ہیں، کسی کو بھی نہیں دیئے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مقربین یا تو اپنے اختیار سے اس قسم کی محنت و امتحان سے گذرتے ہیں یا پھر خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انہیں اِبتلا (آزمائش) کی آگ میں ڈال کر خالص اور مخلص بنا دے۔"

تلخ و تیز و مالشِ بسیار دہ — تاشود پاک و لطیف و بامزہ

اس کو تلخ اور تیز (دوا) دے اور بہت مَل، تا کہ پاک، پاکیزہ اور شاندار بن جائے۔ (۲۲/۴)

ورنمی تانی رضاده اے عیار　　که خدا رنجت دہد بے اختیار

اے کھرے! اگر تو نہیں کر سکتا تو راضی ہو جا کہ اللہ تعالیٰ تجھے مجبوراً تکلیف میں مبتلا کر دے۔ (۲۲/۴)

علمِ او بالائے تدبیرِ شماست　　که بلائے دوست تطہیرِ شماست

کیونکہ دوست کی مصیبت تمہاری پاکیزگی ہے، اس کا علم تمہاری تدبیر سے بڑھا ہوا ہے۔ (۲۲/۴)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خیر کے ساتھ شر کو کیوں پیدا کیا؟ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ خیرِ محض مخلوق تو مجبورِ محض ہوتی ہے۔ اگر خدا نے ایک حد تک انسان کو اختیار کے ساتھ آزادی دی ہے تو اس کا غلط استعمال بھی ہوسکتا ہے۔ سو فیصد خیر والے مومن خدا کے لئے پیدا کرنا کیا دُشوار تھا لیکن قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ خدا بالجبر مسلمان پیدا کرنا نہیں چاہتا، اُسے ایسے مومنوں کی ضرورت ہے کہ جو خیر و شر میں تمیز کریں اور حق و باطل کی لڑائی میں حق کا ساتھ دیں۔ ایک جیسے ہی لوگ ہوتے تو اچھے بُرے میں کیا تمیز ہو سکتی تھی۔ اگر دنیا میں خیر و خوبی نہ ہوتی تو پھر امتحان کیا ہوتا، جس طرح بندہ آزادی میں رہ کر خیر و خوبی کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ مجبوری کی عصمت بھی بھلا کوئی عصمت ہے؟ (یعنی ایک عورت کو بند کر کے رکھ دو تو اس کی عصمت مجبوری کی ہوگی) خدا چاہتا ہے کہ انسان خود اپنے اندر حق و باطل کی جانچ کا ملکہ پیدا کرے۔

بہر ایں نیک و بدے کامیخت ست　　ایں وعید و وعدہا انگیخت ست

یہ دھمکی اور وعدے پیدا کئے ہیں، اس لئے نیک اور بد کو ملا رکھا ہے۔ (۲۸۰/۲)

نقد و قلب اندر چرمداں ریختند　　چونکہ حق و باطلے امیختند

چونکہ حق اور باطل کی آمیزش کر دی ہے، کھرے اور کھوٹے کو ایک تھیلے میں بھر دیا ہے۔ (۲۸۰/۲)

دَر حقائق امتحان ہا دیدۂ　　پس محک می بایدش بگزیدۂ

تجھے ایک منتخب کسوٹی کی ضرورت ہے، جو حقیقتوں میں آزمائی ہوئی ہو۔ (۲۸۰/۲)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ خیر و شر، رحمت و زحمت، راحت و تکالیف زندگی کے دو پَر ہیں، زندگی دو پَروں سے ہی پرواز کر سکتی ہے۔ ایک پَر کے ساتھ کوئی پرندہ نہیں اُڑ سکتا اور یہ کہنا کہ خُدا نے خیر کے ساتھ شر کیوں پیدا کیا ہے، نہایت نامعقول ہے۔ شر بھی بالواسطہ خیر ہے اور خیر کے لئے ضروری ہے۔

عاجز آید از پریدن یکسَرہ　　تا دو پر باشی کہ مرغِ یک پرہ

تاکہ تُو دو پروں والا ہو جائے کیونکہ ایک بازو کا پرندہ اُڑنے سے بالکل عاجز رہتا ہے۔ (۱۵۵/۲)

حکیم المانیہ کانٹ نے لکھا ہے کہ بادِ مخالف شر کی حیثیت رکھتی ہے اور پرندے کے اُڑنے میں مزاحمت پیدا کرتی ہے اور اُسی مزاحمت سے پرندہ اڑتا ہے اگر ہوا نہ ہوتی اور خلائے مطلق ہوتی تو پرندہ ایک گز بھی نہ اُڑ سکتا۔ کسی شاعر نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لئے

جو شخص کہتا ہے کہ شر کیوں ہے؟ وہ حقیقت میں یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ زندگی کیوں ہے اور زندگی اِضداد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر و شر کے پیدا کرنے کی حکمت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے الفاظ میں ہماری تصنیف ''حسنِ نماز'' کے صفحہ نمبر ۵۹۱ پر ملاحظہ فرمائیں، جس میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کا بیان ''نظریۂ عبدیت'' کو واضح کرتا ہے۔

لطفِ بیان اور وعظ سننے والوں کے مزاج پر ہے

یہ حقیقت ہے کہ اگر وعظ کے سامعین باذوق، عقلمند، باہوش اور علمی نکات کو سمجھنے والے ہوں تو وعظ کرنے والے کی روح بیدار اور مائل بہ گفتار ہو جاتی ہے۔ راقم الحروف کا طریقہ عام طور پر یہی رہا ہے کہ وعظ کا موضوع سامعین کی نوعیت پر ہی متعیّن کرتا ہے، بسااوقات ایسا ہوا کہ موضوعِ وعظ جو اپنے دل میں متعیّن کیا جاتا ہے، وہ سامعین کے رُوحانی اور علمی ذوق کو دیکھ کر بدل دیا جاتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ وعظ کی روح کو اگر پستان سمجھ لیا جائے تو سخن اُس پستان کے اندر دودھ ہے۔ یہ دودھ اس وقت رواں ہوتا ہے جب کوئی اُسے کھینچنے والا اور چوسنے والا ہو۔ اگر سننے والے وعظ سننے کے تِشنہ اور طالبِ معرفت ہوں تو ایک مُردہ وعظ کے بیان میں بھی جان پڑ جاتی ہے اور غیر شعوری طور پر وعظ کرنے والا سامعین کے مزاج کے مطابق وعظ کرنے لگتا ہے۔ اگر سننے والوں کی فکر بلند ہو تو خود کہنے والے کو بھی اس سطح پر آنا پڑتا ہے۔ ایک مجمع جس میں باذوق پڑھے لکھے ڈاکٹر، انجینئر اور اعلیٰ درجہ کی سوجھ بوجھ رکھنے والے موجود ہوں تو وعظ کرنے والا انٹ شنٹ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس سے معیاری گفتگو کرنے کے لئے مجمع کا ماحول زبردستی تقاضا کرے گا کہ سلجھی ہوئی اور عقل سے آراستہ پیراستہ باتیں کی جائیں۔

اے دریغا مَر تُرا گُنجا بُدے تا زجانم شرحِ دل پیدا شدے

ہائے افسوس! تجھ میں اگر گنجائش ہوتی تو میری جان سے دل کی کچھ شرح ظاہر ہوتی۔ (۲۵۶/۱)

ایں سخن شِیر ست در پستانِ جاں بے کشندہ خوش نمی گردد رَواں

یہ باتیں کہ جان کے پستان میں دودھ ہے اور یہ دودھ چوسنے والے کے بغیر اچھی طرح جاری نہیں ہوتا۔ (۲۵۶/۱)

مستمع چوں تِشنہ و جُوینده شد واعِظ ار مُردہ بُود گوینده شد

سننے والا جب پیاسا اور طلبگار ہو تو وعظ کہنے والا اگر مُردہ (بھی) ہو تو بولنے لگتا ہے۔ (۲۵۶/۱)

تقسیمِ ہند سے پہلے بمبئی میں کچھ پڑھے لکھے آدمی خطابت کے لئے آتے اور خطابت کا عنوان ہال میں ہی تجویز کیا جاتا تھا۔ ایک صاحب خطاب کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک عورت نے اُٹھ کر اُسے کہا "Speak on nothing" (یعنی لاشئی) پر تقریر کرو اور وہ شخص تین گھنٹے تک اسی موضوع پر تقریر کرتا رہا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ واقعی اس موضوع پر نہایت عمدہ اور طویل خطاب ہو سکتا ہے۔ اس کا مواد سورۃ الدھر اور کائنات کی تخلیق میں موجود ہے۔

کیلی فورنیا (امریکہ) میں راقم الحروف کو ایک کلب میں محفلِ ذکر میں وعظ کرنے کے لئے بلایا گیا جس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، جو مجلس کے عقب میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ عورتوں کی وجہ سے پورے ہال میں مکمل اندھیرا تھا اور سامعین کے چہرے قطعاً نظر نہیں آ رہے تھے۔ اب ایسے ماحول میں جب کہ مجمع میں موجود لوگوں کے ذوق اور فکری مزاج کا علم ہی نہ ہو تو وعظ کرنا نہایت مشکل تھا۔ امیرِ مجلس کو جب کہا گیا تو انہوں نے روشنی کچھ زیادہ کر دی مگر لوگوں کے چہرے اور وضع قطع نظر نہ آ رہی تھیں۔ وعظ تو سامعین کے ذوق پر انحصار کرتا ہے، جس کا مظاہرہ نہ ہو سکا۔ وعظ تو جو ہو سکا وہ کر دیا مگر ایسے وعظ میں ذوق کا پیدا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ مجلس کے بعد پوری روشنی کر دی گئی جو پہلے وعظ کے اوقات میں بھی کی جا سکتی تھی۔ کھانے کے وقت عورتیں اِدھر اُدھر بھی گھوم رہی تھیں۔ ذکر کی مجلسوں میں تو اندھیرے کا ہونا سننے میں آتا ہے مگر وعظ میں اندھیرا ہونا تو راقم الحروف کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھے معیار کے وعظ میں ایک ایسا شخص آ جائے جو ذوق سے بیگانہ ہو تو تمام مجلس میں بدمزگی چھا جاتی ہے اور زبانِ عرفان بند ہو جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ ''سوروں کے آگے موتی مت بکھیرا کرو۔'' مولاناؒ نے فرمایا کہ دنیا میں جمال دیدۂ بینا کے لئے ہے، اندھوں کے سامنے اظہارِ حسن بے معنی ہے۔ اندھے خاوند کے لئے کون عورت بناؤ سنگھار کرے گی ؎

اے ستیرہ ہیچ تو برخاستی خویشتن را بہرِ کور آراستی

اے پردہ نشیں! کبھی تُو تیار ہوئی ہے، اپنے آپ کو اندھے کے لئے تُو نے کبھی آراستہ کیا ہے؟ (۱/۲۵۷)

ہر چہ را خوب و خوش و زیبا کنند از برائے دیدۂ بینا کنند

کسی چیز کو اچھا، عمدہ اور حسین بناتے ہیں تو دیکھنے والی آنکھ کے لئے بناتے ہیں۔ (۱/۲۵۶)

جھوٹے شوقِ جہاد والے صوفی و مُلّا

مولاناؒ نے جھوٹے صوفیوں اور مُلّاؤں کے متعلق بہت سے واقعات نقل کئے ہیں۔ ایک جگہ وہ ایک بُزدِل صوفی کا ذکر کرتے ہیں، جس نے خود کو صوفی مشہور کیا ہوا تھا اور اپنے آپ کو مجاہدِ نفس کا نام دیا ہوا تھا۔ ایک اسلامی جہاد میں اس نے بہت سی تقریریں کیں۔ وہ اپنے آپ کو عاشقِ جہاد کہتا تھا۔ جب لشکرِ اسلام روانہ ہوا تو اُس نے لشکر والوں کو کہا کہ آپ لوگ جائیں، میں بعد میں آ جاؤں گا۔ کافی دنوں بعد وہ چلا اور لشکر کے عقب میں پہنچا تو اُس وقت جہاد ختم ہو چکا تھا، جب لشکر فتح حاصل کر کے مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ لے کر واپس آیا تو صوفی صاحب بھی باہر نکلے اور مالِ غنیمت کا کچھ حصہ اُن کو پیش کیا گیا تو اُس نے کہا کہ میں اس مال کا حقدار نہیں ہوں کیونکہ میں قِتال میں حصّہ نہ لے سکا اور شکایت کرنے لگا کہ میرے جیسے جانباز کو وہ لوگ پیچھے چھوڑ گئے جو زبردست مجاہد تھا۔ ایک لشکری نے کہا کہ ہم آپ کو ایک قیدی دیئے دیتے ہیں، آپ اپنا کافرکشی کا شوق پورا کر لیں اور اس کو مار کر

آپ بھی غازیوں میں شامل ہو جائیں۔ وہ لوگ ایک قیدی کو جو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس کے پاس چھوڑ کر خود اپنے خیموں میں چلے گئے۔

کچھ وقت کے بعد وہ لوگ صوفی کے پاس واپس آئے تاکہ وہ اس قیدی کو دیکھیں اور صوفی صاحب کو مالِ غنیمت بھی پیش کریں۔ انہوں نے وہاں ایک عجیب منظر دیکھا کہ صوفی صاحب کو اس زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدی نے چت کر کے زمین پر لٹایا ہوا ہے اور خود وہ قیدی اُس کے اُوپر سوار ہے اور اپنے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر صوفی صاحب کو لہولہان کیا ہوا ہے۔ لشکریوں نے پوچھا کہ صوفی صاحب آپ ایک دست و پا بندھے ہوئے قیدی سے اس طرح لہولہان کیوں ہو گئے۔ صوفی صاحب نے کہا کہ کیا پوچھتے ہو کہ جب تم اس قیدی کو میرے پاس چھوڑ کر چلے تو اس ظالم نے ایسی زہر آلود اور خوفناک آنکھوں سے مجھے گھورا کہ میں حواس باختہ ہو گیا اور پھر یکدم مجھے زمین پر گرا کر میرے سینے پر بیٹھ گیا اور میرا یہ حشر کر دیا جو تم دیکھ رہے ہو۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ مذہبی پیشوا اور رہنما بنے بیٹھے ہیں، جو کافروں سے اس طرح پٹ جاتے ہیں۔

خستہ کردہ حلقِ اُو بے حربۂ　　دَست بَستہ گبر ہمچوں گربۂ

ہاتھ باندھے ہوئے کافر نے بلّی کی طرح بغیر نیزے کے اُس کے گلے کو زخمی کر دیا۔ (۳۷۶/۵)

نیم کُشتش کرد باِنداں اسیر　　ریش اُو پُر خوں ز حلقِ آں فقیر

قیدی نے دانتوں سے اُس کو اَدھ موا کر دیا، اُس فقیر کے حلق کے خون سے اُس کی داڑھی بھری ہوئی تھی۔ (۳۷۷/۵)

بَر رُخِ صُوفی زدند آب و گلاب　　تا بہوش آید ز بیہوشی و خواب

صوفی کے چہرے پر پانی اور گلاب چھڑکاؤ، تاکہ وہ بے ہوشی اور غفلت سے ہوش میں آ جائے۔ (۳۷۷/۵)

اللہ اللہ اینچہ حال ست اے عزیز　　اینچنیں بیہوش گشتی از چہ چیز

اللہ اللہ اے پیارے! یہ کیا حال ہے؟ تُو کس چیز سے ایسا بے ہوش ہو گیا؟ (۳۷۷/۵)

گفت چوں قصدِ سرش کردم بخشم　　طُرفہ دَر من بنگرید آں شوخ چشم

اس نے کہا، جب میں نے غصہ سے اس کا سر (قلم کرنے کا) ارادہ کیا، اس بے حیا نے مجھے عجیب طرح سے گھورا۔ (۳۷۷/۵)

چشم را وا کرد پہن اُو سوی من　　چشم گردانید و شد ہوشم زتن

اس نے میری جانب آنکھیں پھاڑیں، آنکھوں کو گھمایا اور میرے ہوش بدن سے اُڑ گئے۔ (۳۷۷/۵)

گردشِ چشمش مرا لشکر نمود　　می ندانم گفت چوں پُر ہول بُود

اس کی آنکھوں کا گھومنا مجھے لشکر کی طرح نظر آیا، میں بتا نہیں سکتا کہ وہ کس قدر خوفناک تھیں۔ (۳۷۷/۵)

قوم کو مخاطب کر کے مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ خود اس قوم کا بھی اُس صوفی جیسا حال ہے۔ جہادِ اصغر اور

جہادِ اکبر کے دعوے تو بہت کرتے ہیں مگر جب وقت آتا ہے تو ایک معمولی دشمن سے بھی مار کھا جاتے ہیں۔ جہاں نفس نے آنکھیں دکھائیں تو ٹھنڈے ہو کر چت ہو جاتے ہیں۔

ہمچوں تو کز دستِ نفسِ بستہ دست ہمچو آں صوفی فتادستی بہ پست

تیری طرح کہ ہاتھ بندھے نفس سے، اُس صوفی کی طرح نیچے گرا پڑا ہے۔ (۵/۳۷۷)

اللہ والوں کو تنگ کرنے والے دُنیا طلب مرید

مولاناؒ نے اس بات کو کافی طول دیا ہے کہ لوگ پیروں کے پاس اپنی دُنیاوی حاجات لے کر آتے ہیں اور ایسا شخص شاذ و نادر ہی ہوتا ہے جو تزکیۂ باطن یا خدا رسی میں کوشاں ہو۔ کچھ لوگ تو اپنے خاندان کے وقار کے رُعب میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی عزت کریں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عزت تو موجودہ حالت پر ہی صادق ہوتی ہے۔ انہوں نے ایک مثال پیش کی کہ ایک سفر میں اونٹ، گائے، بیل اور دُنبہ جا رہے تھے کہ راستے میں ایک سبزے کا پولہ ملا۔ دُنبہ کہنے لگا کہ میرا تعلق تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ہے۔ بیل نے کہا کہ میں تو حضرت آدم علیہ اسلام کے ساتھ ہل میں جوتا جاتا تھا اور اونٹ نے وہ پولہ اُوپر اُٹھا لیا جو باقی دونوں کی دسترس سے باہر تھا اور کہنے لگا کہ تم تو شیخی مارتے رہو اور ہم تو اس عقیدے کے قائل ہیں کہ جو موجودہ وقت میں سب سے بہتر جسم والا ہے وہ اس پولے کا مالک ہے، لہٰذا پولہ پر میرا قبضہ ہے۔ اس نے کہا۔

کہ مرا خود حاجتِ تاریخ نیست کایں چنیں جسمے و عالی گرد نیست

کہ مجھے خود تاریخ (بتانے) کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ میرا ایسا جسم اور اونچی گردن ہے۔ (۶/۲۴۳)

داند ایں را ہر کہ زاصحاب نُہاست کہ نہادِ من فزوں تر از شماست

اس کو ہر وہ شخص جانتا ہے جو عقل مندوں میں سے ہے کہ میرا وجود تم سے بڑھا ہوا ہے۔ (۶/۲۴۳)

تینتیسواں باب

دانش اور بینش

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسانی عمل کے لئے دانش اور بینش کا اگر لحاظ کیا جائے تو عمل کی بنیاد بہتر انداز سے ہوسکتی ہے۔ ریاکار اور احمق لوگ اس بات کا احساس نہیں کرتے اور بداعمالی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی فرمایا ہے کہ ''جن کا عمل ہو بے غرض، اس کی جزا کچھ اور ہے'' ذاتی خواہشات کی بنیاد پر کئے گئے اعمال کی جزا خلوصِ اعمال کے برابر ہرگز نہیں ہوسکتی۔

آدمی دید است باقی پوست است
(آدمی تو دانش اور بینش والا ہے، باقی کھال ہے)

مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ عقلِ استدلالی رُوحانی وجدان پیدا کرنے سے قاصر ہے، خواہ کوئی تفسیرِ کبیر ہی کیوں نہ لکھ دے۔

گر بہ استدلال کار دیں بدے　　فخر رازی رازدارِ دیں بدے

اگر اِستدلال سے دین کا کام چل سکتا تو فخر الدین رازی دین کے رازدار ہوتے۔ (اقبالؒ)

پائے استدلالیاں چوبیں بود　　پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اِستدلال والوں کے قدم لکڑی کے ہوتے ہیں، لکڑی کے پاؤں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ (۲۳۲/۱)

شرح او کے کار بوسینا بود　　　وانکہ ایں نور را بینا بود

جو اس نور کو دیکھنے والا ہو تو اس کی شرح سے بوعلی سینا کا کام نہیں ہو سکتا۔

مولاناؒ فلسفہ کے قائل نہ تھے کیونکہ یہ حقیقت سے پردے کو ہٹا نہیں سکتا بلکہ حقیقت کے قریب سے بھی گذر نہیں سکتا۔

کو بجنباند بکف پردہ عیاں　　　گر شود صد تو کہ باشد ایں زباں

اس زبان کے ساتھ اگر تم جیسے کئی بندے ہوں، اپنے ہاتھ سے پردے کو حرکت کون دے سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ بوعلی سینا تو قافلے سے اُڑنے والی خاک میں ہی پریشان ہے لیکن رومیؒ کے عشق نے لیلیٰ کے محمل کا پردہ بھی تھام لیا۔

دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت　　　بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم

بوعلی اونٹنی کے غبار میں کھو گیا، رومیؒ کے ہاتھ نے محمل کے پردہ کو تھام لیا۔ (اقبالؒ)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دانش سے بینش تک ہزارہا سال کے فاصلے کی مسافت ہے لیکن اس بات سے نا اُمید نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہو تو جس طرح اربوں فرسنگ کی مسافت سے ستاروں اور شمس و قمر کا نور دُنیا تک چند منٹوں میں پہنچ سکتا ہے اسی طرح بینش اور دانش کے فاصلے بھی ختم ہو سکتے ہیں، کیونکہ روحانی دنیا میں مشہور ہے کہ کبھی کبھار سینکڑوں سالوں کی راہیں ایک آہ کے وقفے میں طے ہو سکتی ہیں ؎

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ حواسِ ظاہری اگرچہ حوادث اور ظواہر کے متعلق معلومات بخشتے ہیں لیکن نورِ باطن یا حسِ باطنی کے بغیر یہ علم حقیقت رس نہیں ہوتا۔ حواسِ ظاہری کا علم افادی اور مادی ہوتا ہے۔ یہ علم خورد و نوش اور دنیاوی کاموں میں تو مدد دیتا ہے لیکن کنہِ حیات معلوم کرنے میں بے بس ہو جاتا ہے۔ اگر حسِ باطنی نورِ حق سے مستفید ہو جائے تو تمام حواسِ ظاہری بھی حقیقت کی جنت تک پہنچ جاتے ہیں اور معرفت کی غمازی کرنے والے بن جاتے ہیں، پھر وہاں زبان و بیان اور حقیقت و مجاز کا امتیاز باقی نہیں رہتا ؎

تا یکایک سوئے آں جنت رَوَد　　　ہر حست پیغمبرِ حِس ہا شود

تیری ہر حس (باقی) حواس کے لئے پیغامبر بن جائے، تاکہ فوراً اُس جنت کی طرف چلی جائے۔ (۳۰۶/۲)

بے حقیقت بے زباں و بے مجاز　　　حسِ ہا باحسِ تو گویند راز

حواس تیری حس سے راز کہہ دیں گے، بغیر زباں اور بغیر حقیقت و مجاز کے۔ (۳۰۶/۲)

سقراط بھی کہا کرتا تھا کہ میں علم کو لوگوں میں نہیں ڈالتا۔ ہر انسان از خود روحِ معرفت سے حاملہ ہے، میں تو صرف جنانے والی دائی کا کام کرتا ہوں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ مجاز کے مقابلے میں حقیقت ایک دائی ہے لیکن

یہ علم الیقین کی منزل ہے۔ اس سے کم درجے پر تو ہم تخیلات کو جنم دیتے ہیں لیکن جہاں مشاہدہ ہو جائے وہاں ابہام اور تاویل کی گنجائش نہیں رہتی۔

آں حقیقت را کہ باشد از عیاں   ہیچ تأویلے نگنجد درمیاں

وہ حقیقت جو مشاہدہ سے حاصل ہوئی، اس میں کسی تأویل کی گنجائش نہیں ہے۔ (۳۰۶/۲)

حقائق کا ہم دو طرح ادراک کر سکتے ہیں، ایک عقل اور حکمت سے، دوسرا براہِ راست دید سے، جسے کشفِ حقیقت یا رُوحانی وجدان کہتے ہیں۔ استدلالی حکمت گھر کے آستانے تک تو جاتی ہے لیکن اندرون در اِسے کوئی خبر نہیں۔ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

عقل گو آستان سے دُور نہیں   اس کی قسمت میں حضور نہیں

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا مقصود شنید یا تقلید نہیں، اصل عنایت تو دید ہے ؎

آدمی دید است باقی پوست است   دید آنست آنکہ دید دوست است

آدمی تو بینائی ہے، باقی سب کھال ہے، دید تو دراصل محبوب کی دید ہے۔ (۱۶۶/۱)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایک لمحہ کی براہِ راست دید کو سالہا سال کی قیل و قال سے بیان نہیں کر سکتے۔ عقل بھی اس کے مقابلے میں کوتاہ ہے اور بیان بھی عاجز ہے۔ ایمان بالغیب بھی حضور ﷺ کے مقابلے میں کم حیثیت رکھتا ہے ؎

آنکہ یک دیدن کند ادراکِ آں   سالہا نتواں نمودن از زباں

ایک نظر جو کچھ محسوس کر لیتی ہے، وہ سالہا سال زبان سے نہیں کہا جا سکتا۔ (۱۹۷/۳)

آنکہ یکدم بیندش اِدراک و ہوش   سالہا نتواں شنیدن آں بگوش

جس کو علم و ہوش ایک دم دیکھ لیتا ہے، اس کو کانوں کے ذریعہ سالوں میں نہیں سنا جا سکتا۔ (۱۹۷/۳)

حکیم بو علی سینا اور ابو سعید ابوالخیرؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ رُوحانی حقائق کے ثبوت میں بو علی سینا نے ان کے سامنے بہت سے دلائل پیش کئے اور کہا کہ میں ان دلائل کی وجہ سے ان حقائق کا قائل ہوں۔ جب وہ طویل فلسفیانہ گفتگو ختم کر چکے تو ابو سعید ابوالخیرؒ نے فقط ایک فقرہ کہا: ''ہر چہ تو می دانی من می بینم''، یعنی جو کچھ تم جانتے ہو، میں اسے دیکھتا ہوں۔ حکمت اور ولایتِ مشاہدہ میں دانش اور بینش کا فرق ہے۔

حسِّ تو از حسِّ خر کم تر بدست
(انسان کی حسّ گدھے کی حس سے بھی کمتر ہے)

عقل اور اخلاق کے معاملے میں انسان کبھی کبھار حیوانوں سے بھی گر جاتا ہے اور قرآن نے اس کے لئے ''اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ'' کا نام دیا ہے (التین: ۵)۔ حیوان اپنی فطری خواہشات کو معینہ فطرت کے مطابق پورا کرتا ہے۔ کوئی حیوان غلط غذا یا غلط جگہ پر اپنی خواہشات پوری نہیں کرتا مگر انسان ہر غیر فطری طریقوں کی طرف شدت سے

مائل ہو جاتا ہے۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں کہ کچھ انسان گدھے سے بھی زیادہ بے عقل ہو جاتے ہیں۔ گدھا اگر کسی دلدل میں پھنس جائے تو اس قدر ہاتھ پیر مارتا ہے کہ جب تک اس سے باہر نکل نہیں آتا اس وقت تک اپنی کوشش نہیں چھوڑتا مگر انسان جب کبھی کسی اخلاقی دلدل میں پھنس جائے تو اسی جگہ پر ڈیرے لگا لیتا ہے، اگر اس کو منع کیا جائے اور کہا جائے کہ اس دلدل سے نکل جاؤ تو اس حرکت کو اپنی اضطراری، مجبوری اور معذوری کی حالت سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہماری اس مجبوری کو گناہ نہ سمجھو، اپنی کمزوری کو تقدیر کے سر پر تھوپ دیتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

در کوئے نیک نامی ما را گذر نہ دادند　　گر نمی پسندی تغیر کن قضا را

اللہ تعالیٰ نے ہمیں نیک نامی کے کوچے سے گذرنے نہ دیا، اگر تمہیں پسند نہیں تو ہماری تقدیر کو بدل دو۔

مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

چوں خرے در گلِ فتد از گامِ تیز　　دَمبدم جُنبد بَرائے عزمِ خیز

جب گدھا تیزی سے کیچڑ میں پھنس جائے تو وہ ہر لمحہ اُٹھنے کا عزم کر کے حرکت کرتا ہے۔ (۳۱۵/۲)

جائے را ہموار نکند بہرِ باش　　داند اُو کہ نیست آں جائے معاش

وہ اپنے رہنے کے لئے جگہ ہموار نہیں کرتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہاں رہنے کو کوئی جگہ نہیں۔ (۳۱۵/۲)

حسِ تو از حسِ خَر کم تر بدست　　کہ دلِ تو زیں وَ حَل ہا برنَجست

تیری حس گدھے کی حس سے بھی کمتر ہے کہ تیرا دل اُن کیچڑوں سے باہر نہ نکلا۔ (۳۱۶/۲)

در وَحل تاویلِ رخصت می کُنی　　چوں نمی خواہی کزاں دل برکُنی

تُو کیچڑ میں پڑے رہنے کی دلیل تلاش کرتا ہے، کیونکہ تُو نہیں چاہتا کہ اس سے دل ہٹائے۔ (۳۱۶/۲)

کایں روا باشد مرا من مضطرم　　حَق نگیرد عاجزے را از کرم

کہ میرے لئے یہ جائز ہے کہ میں مجبور ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے مجبور کی گرفت نہیں کرتا۔ (۳۱۶/۲)

ایسے لوگ جو عضلاتی دلدل میں پھنس جاتے ہیں، بہت سے بہانے تراشتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ خدا کریم اور رحیم ہے معاف کر دے گا، کبھی کہتے ہیں کہ قسمت ہم کو یہاں گھیر کے لے آئی ہے اور کبھی خود کو اضطراری حالت میں محفوظ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ درج ذیل اشعار اکثر گنگناتے ہیں ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا　　پر تُو نے بھی دل آزُردہ ہمارا نہ کیا

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر　　لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص نے یہ کہا کہ ہم تو بہت گناہ کرتے ہیں لیکن خدا نے ہم پر کبھی گرفت نہیں کی، یہ اس کی شانِ کریمی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس کو کہو کہ اللہ تعالیٰ کے مکافاتِ عمل سے کوئی نہیں بچ سکتا اور تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تمہارے ان گناہوں کی وجہ سے ہم نے تمہارے

دل کو پتھر کا بنا دیا ہے اور یہ شقاوتِ قلبی ہماری طرف سے سخت سزا ہے، اگر تو سمجھ سکے۔ یہ بات ایک حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔

آں یکے می گفت در عہدِ شعیبؑ — کہ خدا از من بسے دید است عیب

حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص کہتا تھا کہ خدا نے میرے بہت سے عیب دیکھے ہیں۔ (۳۱۶/۲)

چند دید از من گناہ و جُرمَہا — وز کرم یزداں نمی گیرد مَرا

اس نے میرے گناہ اور جرم بہت دیکھے ہیں اور اللہ اپنے کرم کی وجہ سے مجھے نہیں پکڑتا۔ (۳۱۶/۲)

عکس می گوئی و مقلوب اے سفیہ — اے رہا کردہ رَہ و بگرفتہ تیہ

اے بے وقوف! تو اُلٹی اور بالعکس بات کہتا ہے، اے گم کردہ راہ تو میدان تیہ (کا راستہ) اختیار کئے ہوئے ہے۔ (۳۱۷/۲)

چند چندت گیرم و تو بے خبر — در سَلاسِل ماندہٗ پا تا بہ سَر

میں تیری بار بار گرفت کرتا ہوں اور تو بے خبر ہے، پیر سے سر تک تو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ (۳۱۷/۲)

زنگِ تو بر توت اے دیگِ سیاہ — کرد سیمائے درونت را تباہ

اے کالی دیگ! تیرے تہ بہ تہ زنگ نے تیرے باطن کی خصوصیتوں کو تباہ کر دیا ہے۔ (۳۱۷/۲)

بر دلت زنگار بر زنگار ہا — جمع شد تا کُور شد ز اَسرار ہا

تیرے دل پر تہ بہ تہ زنگ جمع ہو گیا، یہاں تک کہ وہ اسرار سے اندھا ہو گیا۔ (۳۱۷/۲)

قرآن مجید نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ — نہیں نہیں! درحقیقت زنگ چڑھ گیا ہے اُن کے دلوں پر، اُن کے کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔ (المطففین: ۱۴)

نیک اعمال میں چاشنی پیدا کرنے کے طریقے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور توبہ و استغفار سے وہ صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر گناہ کرتا چلا جائے تو یہ نقطہ پھیلتے پھیلتے اس کے تمام قلب پر زنگ لگا دیتا ہے۔“ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر نئی چمکدار دیگ ہو تو یہ نقطہ بڑھتے بڑھتے دیگ کا تلہ مکمل طور پر سیاہ کر دیتا ہے اور کئی کالی تہیں اس پر چڑھ جاتی ہیں اور یہاں تک کہ تہیں چڑھنے سے سیاہی میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان بھی گناہوں کو محسوس نہیں کرتا۔

گر زند آں دود بر دیگِ نَوے — آں اثر بنماید ار باشد جَوے

اگر وہ دھواں نئی دیگ پر لگے تو اثر دکھاتا ہے، خواہ جو کے برابر ہو۔ (۳۱۷/۲)

زانکہ ہر چیزے بضد پیدا شود　　بر سفیدی آں سیہ رُسوا شود

کیونکہ ہر چیز بالمقابل سے ظاہر ہوتی ہے، سفیدی پر سیاہ بدنام ہوتا ہے۔ (۳۱۷/۲)

چوں سیہ شد دیگ پس تاثیر دود　　بعد ازاں بروے کہ بیند اے عنود

جب دیگ کالی ہوگئی تو (مزید) دھویں کی تاثیر، اے سرکش! اس کے بعد اُس پر کون دیکھتا ہے کیونکہ زیادہ ہونے کا اثر نہیں دکھائی دیتا۔ (۳۱۷/۲)

جب کوئی گناہ کرے تو اس کی سیاہی اس کو محسوس ہوتی ہے اور وہ توبہ کر لیتا ہے مگر جب وہ گناہ کرتا ہی جائے تو رفتہ رفتہ اس کو گناہ گناہ محسوس نہیں ہوتا۔ دل کی سیاہی سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ قیامت تک کھلا رکھا ہے، چنانچہ جب بھی لغزش ہو جائے تو فوراً توبہ کر لو بلکہ ہر صبح و شام استغفار کرنا منشاء الٰہی ہے ؎

چوں کُند اصرار و بد پیشہ کُند　　خاک اندر چشمِ اندیشہ کُند

جب اصرار کرتا ہے اور بُرائی کو پیشہ بنا لیتا ہے، تو فکر کی آنکھ میں دھول جھونکتا ہے۔ (۳۱۷/۲)

توبہ نندیشد، دِگر شیریں شود　　بر دلش آں جُرم، تا بے دیں شود

توبہ کی فکر نہیں کرتا پھر میٹھا بن جاتا ہے، اس کے دل پر وہ گناہ یہاں تک کہ وہ بے دین بن جاتا ہے۔ (۳۱۸/۲)

مولانا فرماتے ہیں کہ جب سفید کاغذ پر لکھا جائے تو وہ پڑھا جا سکتا ہے اور اگر دوسری تیسری اور کئی بار اسی تحریر کے اُوپر لکھا جائے تو کچھ بھی سمجھ نہ آئے گا، لہٰذا گنہگار بھی گناہ کرتا جاتا ہے پھر اس کو زیادہ گناہوں پر ندامت محسوس نہیں ہوتی۔

چوں نویسی کاغذِ اسپید بر　　آں نبشتہ خواندہ آید در نظر

جب تم سفید کاغذ پر لکھتے ہو، وہ لکھا ہوا نظر میں آ کر پڑھا جاتا ہے۔ (۳۱۸/۲)

چوں نویسی بر سَرِ بنوشتہ خط　　فہم ناید خواندنش گردد غلط

اگر لکھے ہوئے پر لکھو گے تو یہ لکھا سمجھ نہیں آئے گا، پڑھنا غلط ہو جائے گا۔ (۳۱۸/۲)

کاں سیاہی بر سیاہی او فتاد　　ہر دو خط شد کور، و معنی رُو نداد

یہ اس لئے کہ اس نے سیاہی پر سیاہی ڈال دی، دونوں لکھائیاں اندھی ہو جاتی ہیں اور معنی نظر نہیں آتے۔ (۳۱۸/۲)

ور سوم بارہ نویسی بر سَرش　　پس سیہ کردی چو جان کافرش

اور اگر تُو اس پر تیسری بار لکھے، تو تُو نے کافر کی جان کی طرح اس کو کالا کر دیا۔ (۳۱۸/۲)

ذوق باید تا دہد طاعات بر

وہ باتیں جس سے روحانی واردات کم ہو جاتے ہیں

حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے کے مذکورہ بالا شخص کا قصہ آپ دوبارہ بیان کرتے ہیں کہ اس شخص نے

پوچھا کہ یہ گناہ نظر کیوں نہیں آتے؟ فرمایا! چونکہ اللہ تعالیٰ کریم اور ستار ہے، اس لئے گناہوں کو لوگوں پر ظاہر نہیں فرماتا لیکن اس گنہگار کے لئے ایک نشانی اللہ تعالیٰ نے بتلائی ہے کہ ایسے شخص کو ذرہ بھر بھی نیک کام کا اثر یا لذت محسوس نہیں ہوتی۔ رُوحانی دُنیا والے کی زندگی ذوقِ قلب کے ساتھ وابستہ ہے، اگر رُوحانی لوگ گناہوں پر اصرار کریں تو ان کو بھی ذکر وفکر اور عبادت میں چاشنی نہیں آتی کیونکہ اعمال کی محض صورت موجود ہوتی ہے، گناہوں کی وجہ سے عبادت کے معنی ناپید ہو جاتے ہیں اور رُوحانی لوگوں کا ذوقِ قلب چھین لیا جاتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جن کے کرنے سے تہجد کی نماز چھوٹ جاتی ہے اور دیگر کمالات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ کبھی غلط نظری کے باعث اس کی تلاوتِ قرآن ختم کر دی جاتی ہے، ذکر کم ہو جاتا ہے اور ذکر کم ہونے سے فکر منجمد ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اعمال کے مغز کو ختم کر کے چھلکے اکھٹے کر رہا ہے، اس سے پھل پیدا نہیں ہوسکتا، بھلا چھلکے بونے سے بھی کوئی درخت اُگتا ہے۔

یک نشانِ آنکہ می گیرم وُرا — آنکہ طاعت دارد از صوم و دُعا

اس کی علامت کہ میں اس کو پکڑتا ہوں ایک یہ ہے کہ وہ روزے اور نماز کی عبادت کرتا ہے۔ (۳۱۹/۲)

وز نماز و از زکوٰۃ و غیر آں — لیک یک ذرّہ ندارد ذوقِ جاں

اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی عبادت کا ہونا تو ہوتا ہے لیکن وہ روح کے ذوق کا ایک ذرہ نہیں رکھتا ہے۔ (۳۱۹/۲)

می کُند طاعات و افعالِ سَنی — لیک یک ذرّہ ندارد چاشنی

وہ عبادت اور اعلیٰ اعمال کرتا ہے لیکن ایک ذرہ لطف کی چاشنی کا نہیں پاتا۔ (۳۱۹/۲)

طاعتش نُغز است و معنیٰ نُغز نے — جوزہا بسیار و در وے مغز نے

اس کی ظاہری عبادت اچھی ہے اور روح کی عبادت اچھی نہیں ہے، اخروٹ بہت ہیں (مگر) ان میں گری نہیں ہے۔ (۳۱۹/۲)

ذوق باید تا دہد طاعات بر — مغز باید تا دہد دانہ شجر

ذوق چاہیے تاکہ عبادات پھل دیں، گری چاہیے تاکہ دانہ درخت اُگائے۔ (۳۱۹/۲)

دانۂ بے مغز کے گردد نہال — صورت بے جاں نہ باشد جز خیال

بے گری کا دانہ کب پودا بنتا ہے؟ بے جان تصویر سوائے خیال کے کچھ نہیں۔ (۳۱۹/۱)

ریاکار اور احمق کا عمل

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ احمق اور نقّال لوگ قرآن کی چند آیات یا چند احادیث کو رٹ لیتے ہیں اور سادہ لوگوں کو اپنی باتوں سے بہکاتے ہیں۔ لوگوں پر اس شخص کے علم کا اثر ہوسکتا ہے جو صدقِ دل، خلوص اور جذبۂ تبلیغ سے لوگوں پر اپنا علم پیش کرے۔ اگر واعظ کے دل میں کسی قسم کا لالچ ہو تو وعظ میں خلوص کا ہونا ممکن نہیں، ویسے بھی کچھ مطالعہ کرنے کے بعد آدمی اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ علم کو آگے بڑھا سکے، اسی طرح کسی مشین کے پرزے کو دیکھ کر

انسان اس کا ماہر نہیں ہو جاتا۔ پرندے کی آواز کو نقل کرنے سے اس کے مافی الضمیر کو سمجھا تو نہیں جا سکتا، جیسے بلبل باغ میں بولتی ہے اور کسی معمولی آدمی کو یہ سمجھ نہیں آ سکتا کہ بلبل پھول سے کیا باتیں کرتی ہے۔

گر بیاموزی صفیرے بُلبلے — تو چہ دانی کُو چہ گوید باگلے

اگر تم بلبل کی بولی کو سیکھ لیتے ہو تو کیا تم جانتے ہو کہ وہ پھول سے کیا کہتی ہے۔ (۱/۳۴۷)

لحنِ مُرغاں را اگر واصِف شوی — بر ضمیرِ مُرغ کے واقف شوی

اگر تُو پرندوں کی بولی بولے، پرندے کے دل سے تُو کب واقف ہو سکتا ہے؟ (۱/۳۴۷)

حقائق کو نہ جاننے والا تک بازی (تُکا) لگاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کا عموماً بُرا حشر ہوتا ہے۔ مولانؒا فرماتے ہیں کہ ایک بہرہ شخص کسی کی عیادت کے لئے گیا اور بیمار کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے ایک سوال و جواب کا تخمینہ بنا لیا، لیکن جب وہ گیا تو اس کے پہلے ہی سوال سے بیمار چڑ گیا اور اس سے سخت ناراض ہو گیا۔

مولانؒا فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ عبادت میں بھی بے اصل قیاس آرائی کرتے ہیں۔ بیمار پرسی کرنے والے بہرے نے بیمار سے پوچھا، کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا، مر رہا ہوں۔ بہرے نے کہا، اللہ کا شکر ہے اور تمام باتیں بیمار کے مزاج یا حقیقت سے اُلٹ کہیں تو وہ ناراض ہو گیا۔ مولانؒا نے فرمایا کہ کچھ لوگوں کی عبادت بھی اسی رنگ میں ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا ان سے راضی ہو رہا ہے، حالانکہ خدا ان سے اور ناراض ہو جاتا ہے۔ کئی لوگ اپنی عبادت سے لوگوں کی دل آزاری کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری تصنیف **''شاہین کا جہان اور''** کا آخری باب مطالعہ کریں۔

بَس کساں کایشاں عبادتہا کنند — دل برضوان و ثوابِ آں نہند

بہت انسان ہیں جو عبادت کرتے ہیں اور (اللہ تعالیٰ کی) خوشنودی اور اس کے ثواب کی اُمید کرتے ہیں۔ (۱/۳۴۹)

خود حقیقت معصیّت باشد خفی — بس کَدِر کانرا تو پنداری صَفی

(لیکن) وہ چھپی ہوئی گناہ گاری ہوتی ہے، بہت سے مکدّر پانی ہوتے ہیں، جن کو تُو صاف پانی سمجھتا ہے۔ (۱/۳۴۹)

ہمچوں آں کر کُو ہمی پنداشت ست — کو نکوئی کرد و آں خود بدّ بُدست

اس بہرے کی طرح جس نے یقین کیا کہ اُس نے بھلائی کی، حالانکہ وہ بُرائی تھی۔ (۱/۳۴۹)

ہیں مشو نومید نور از آسماں — حق چو خواہد می رسد دریک زماں

خبردار! مایوس نہ ہو، آسماں سے نور جب خدا چاہتا ہے فوراً پہنچ جاتا ہے۔ (۴/۶۰)

چرخِ پانصد سالہ راہ اے مستعیں — دَر اثر نزدیک آمد با زمیں

اے مدد کے طالب! آسمان پانچ سو سال کی مسافت پر ہے مگر اثر کرنے میں زمین کے نزدیک ہے۔ (۴/۶۱)

وز نُفوسِ پاک اخترؤش مَدد — سُوئے اختر ہائے گردوں می رَسد

پاک نفوس کی جانب سے مدد، ستاروں کی طرح آسمان کے ستاروں کی جانب پہنچتی ہے۔ (۴/۶۱)

چونتیسواں باب

تحقیق و تقلید

تحقیق اور تقلید کا مطلب

تحقیق و تقلید مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کا محبوب مضمون ہے، ان دونوں حضرات نے اس عنوان پر کافی کلام کیا ہے لیکن اس کتاب میں مضمون کی وُسعت کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہاں مولاناؒ کے صرف چند اشعار پر اکتفا کیا جائے گا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ تقلید تو یہ ہے کہ کسی سے کوئی علم سیکھ کر اسے لوگوں پر بیان کر دیا جائے، اس میں رُوحانی حقائق کا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ تصدیق بالقلب اس وقت ہوتی ہے جب ذاتی تجربے سے حقائق قلب پر وارد ہونے لگیں۔ وہ فقیہ جو سنی ہوئی یا پڑھی ہوئی باتوں کو دُہراتے ہیں ان میں عقل کی بھی ضرورت نہیں رہتی، فقط حافظے سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسے فقیہ کے وعظ کا لوگوں کے دلوں پر اثر نہیں ہوتا، ان کو نہ عین الیقین حاصل ہوتا ہے اور نہ حق الیقین۔ تحقیق میں رُوحانی حقائق نفس ذاتی تجربے کی بناء پر بیان کئے جاتے ہیں۔ ''ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد''۔ جیسے کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے

مولاناؒ نے ایک لومڑی اور گدھے کا مکالمہ مثنوی میں لکھا ہے کہ جنگل میں شیر بیمار ہو گیا اور اس نے ایک گدھے سے کہا کہ جاؤ کسی گدھے کو پکڑ لاؤ، اس کا آدھا حصہ تمہیں بھی کھانے کے لیے دوں گا۔ گدھے نے کہا کہ کسی مرغزار میں چلیں کیونکہ گدھے کو شک تھا کہ شیر کے کہنے میں ضرور کوئی مکر ہے، پھر کہنے لگا کہ ہمیں توکل کرنا

چاہیئے اور ہمیں بیٹھے رہنا چاہیئے کیونکہ خدا کے پاس ہمارا رزق ہے۔ گدھا یہ تقریر سنی سنائی باتوں کے مطابق کر رہا تھا۔ اس کے دل میں یقین کی کوئی اُستواری نہ تھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کا ایمان تقلیدی ہے، وہ محض قیاس آرائی کرتے ہیں اور اُن سے ان کا ایمان جدا ہو جاتا ہے۔ ان کی حرص و ہوس کا ایک تھپڑ ان کی تمام تقریروں کو مکڑی کے جالے کی طرح توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

صَد دلیل آرد مقلّد در بیاں ‏ ‏ ‏ از قیاسے گوید آں را نز عیاں

مقلّد سو دلیلیں بیان کرتا ہے۔ وہ قیاس سے بتاتا ہے نہ کہ مشاہدہ سے۔ (۲۵۲/۵)

آں مقلد صد دلیل و صَد بیاں ‏ ‏ ‏ دَر زباں آرد ندارد ہیچ جاں

وہ مقلّد سو دلیلیں اور سو بیان زبان پر لاتا ہے لیکن اس میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ (۲۵۳/۵)

چونکہ گوینده ندارد جان و فَر ‏ ‏ ‏ گفتِ اورا کے بُوَد برگ و ثمر

چونکہ کہنے والا جان اور شان وشوکت نہیں رکھتا، لہٰذا اس کی گفتگو میں پھل اور پتے کب ہوں گے۔ (۲۵۳/۵)

پس حدیثش گرچہ بَس با فر بُوَد ‏ ‏ ‏ دَر حدیثش لرزه ہم مُضمر بُوَد

اس کی بات اگرچہ بہت شان وشوکت والی ہو، (لیکن) اس کی بات میں کپکپاہٹ پوشیدہ ہوتی ہے۔ (۲۵۳/۵)

ایسے خطیب اپنے الفاظ پر کچھ مُشک چھڑک لیتے ہیں لیکن کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ تری جان گل و یاسمین چیرتی رہے تا کہ کثافت لطافت میں بدل جائے۔ جانور جو کہ گھاس پھوس کھاتے ہیں، لوگوں کی خوراک بن جاتے ہیں اور جن کی خوراک اللہ کا نور ہے، وہ قرآن بن جاتے ہیں ؎

ہر کہ کاہ و جَو خورد قُرباں شود ‏ ‏ ‏ ہر کہ نورِ حق خورد قرآں شود

جو گھاس اور جَو کھاتا ہے ذبح ہو جاتا ہے اور جو اللہ کا نور کھاتا ہے قرآن بن جاتا ہے۔ (۲۵۳/۵)

تحقیق وتقلید کا مضمون ہماری تصنیف "سنتِ مبارکہ" میں صفحہ ۲۰۰ سے ۲۰۷ تک کافی تفصیل سے دیا گیا ہے، وہاں اس کا مطالعہ کیا جائے۔

مولانا رومیؒ نے چند مضامین کو اپنی مثنوی کا محور بنایا ہے، جن میں سے ایک تحقیق وتقلید بھی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اس بارے میں بہت کچھ کلام فرمایا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ دین کی حقیقت سے وہی آگاہ ہو سکتا ہے جس نے اس کا ازروئے تحقیق و تجربہ و مشاہدہ حاصل کیا ہو، باقی تمام لوگوں کا دین روایتی ہے۔ چھوٹی عمر سے بچوں نے کچھ علم ماں باپ سے ہی سن سنا کر حاصل کیا ہوتا ہے اور وہ اس پر پختہ ہو جاتے ہیں، خواہ وہ غلط عقائد ہی کیوں نہ ہوں لیکن مولانا فرماتے ہیں ایسے لوگ ہدایت سے مطلقاً محروم نہیں ہوتے۔ اگر مقلد بھی اپنی جماعت میں پھنس کر اچھے راستے پر چل رہا ہے تو اس کو بھی نجات حاصل ہو جائے گی۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ محقق کو منزلِ مقصود کی خوبیوں کا علم ہے اس لیے وہ خوشی خوشی اس پر چل رہا ہے، جب کہ مقلد بیرونی جبر سے منزل کی

طرف گھسیٹا جارہا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مقلدین کی چشم باطن تقلید کی وجہ سے بند ہو چکی ہے، ان کو دارالخلود نظر نہیں آرہا اور جو لوگ عارف یا ولی کی رہبری میں نہیں چلتے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو بھی ادھر ہی گھسیٹے لے جارہی ہے۔ مقلدین کا ایک بڑا گروہ بھی اللہ کی رحمت سے خالی نہیں ہے، وہ طوعاً یا کرہاً خدا کی طرف ہی لے جائے جارہے ہیں لیکن محققین اور مقلدین میں بہت فرق ہے۔

ہر مُقلّد را دریں رَہ نیک و بد　　ہم چُناں بَستہ بحضرت می کشد

ہر مقلد کو اس راستہ میں اچھائی یا بُرائی سے اسی طرح باندھ کر دربار میں کھینچتا ہے۔ (۴۳۴/۳)

جُملہ در زنجیرِ بیم و اِبتلا　　می رَوند ایں رہ بغیرِ اَولیاء

سب خوف اور آزمائش کی زنجیر میں اولیاء کے بغیر اس راستے پر چلتے ہیں۔ (۴۳۴/۳)

تحقیق کی حقیقت پیش کرتے ہوئے مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ابتداء میں بچہ مدرسے کی طرف نہیں جاتا۔ (طفل مکتب نمی رود و لے برندش) یعنی مدرسے کا بچہ مدرسے جاتا نہیں بلکہ لے جایا جاتا ہے۔ بچپن کی حالت میں وہ دینی علم کی افادیت سے آگاہ نہیں ہوتا اور جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس بات کو پہچان لیتا ہے کہ اس میں بے شمار فوائد ہیں اور پھر جب اسے علم کا معاوضہ ملنے لگتا ہے تو اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ دنیا سو رہی ہے اور وہ رات بھر مطالعہ میں غرق رہتا ہے۔ وہ چوروں کی طرح تمام رات مطالعہ میں گذار دیتا ہے اور خواب وخوری سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔

کودکاں را می بَری مکتب بزور　　زانکہ ہستند از فوائد چشم کور

تُو بچوں کو مکتب میں جبراً لے جاتا ہے، اس لیے کہ وہ فائدوں سے اندھے ہیں۔ (۴۳۵/۳)

چُوں شُود واقف بمکتب می دَوَد　　جانش از رفتن شگفتہ می شَوَد

جب وہ جان جاتا ہے تو مکتب میں دوڑا جاتا ہے، اس کی روح جانے سے کھلتی ہے۔ (۴۳۵/۳)

می رُود کودک بمکتب پیچ پیچ　　چوں ندید از مُزد کارِ خویش ہیچ

بچہ مکتب میں پیچ و تاب سے جاتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے کام کا کوئی معاوضہ نہیں دیکھا ہے۔ (۴۳۵/۳)

چوں کند در کیسہ دانگے دست مزد　　انگہے بے خواب گردد شب چو دُزد

جب ایک دانگ مزدوری تھیلی میں ڈال لیتا ہے، تب چور کی طرح رات کو جاگتا ہے۔ (۴۳۵/۳)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عابدین کی کثیر تعداد جنت کے شوق میں یا دوزخ کے خوف سے عبادت کرتی ہے۔ یہ لوگ بھی طفل مکتب کی طرح ہیں، جن سے سبق یاد کرنے پر مٹھائی کا وعدہ کیا جاتا ہے یا اگر سبق نہ یاد کریں تو ان کو پیٹے جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اللہ کے نیک بندے یا عارفین ہی بغیر کسی غرض کے عبادت کرتے ہیں۔ مقلد کا عمل وعدہ کی اُمید پر ہوتا ہے یا وعید پر، یعنی سزا کے خوف میں ہے۔

ایں مُحِبّ حق زبہر علتے　　　　واں دگر را بے غرض خود خُلّتے

یہ خدا کا دوست کسی غرض سے ہے، اس دوسرے کی خود بے غرض دوستی ہے۔ (۴۳۵/۳)

مولاناؒ ایک مثال دیتے ہیں کہ شیر خوار بچہ دایہ کو دودھ کی خاطر چمٹتا ہے لیکن اگر دایہ حسین ہے اور اس کا کوئی عاشقِ صادق موجود ہو تو اس دایہ کا حسن ہی اس شخص کے لیے جاذب ہے ؎

ایں مُحِبّ دایہ لیک از بہر شیر　　　　واں دگر دل دادہ بہرِ ایں ستیر

یہ انا کا عاشق ہے لیکن دودھ کی خاطر اور وہ دوسرا اس پردہ نشیں کا دلدادہ ہے۔ (۴۳۵/۳)

طفل را از حُسن اُو آگاہ نے　　　　غیر شِیر اُو را ازو دل خواہ نے

بچے کو اس کے حسن سے واقفیت نہیں ہے، اس کے دودھ کے علاوہ اس کو کچھ مرغوب نہیں ہے۔ (۴۳۵/۳)

واں دگر خود عاشق دایہ بُوَد　　　　بے غرض در عشق یک رایہ بُوَد

دوسرا خود انا کا عاشق ہوتا ہے، بلا کسی غرض کے عشق میں ایک رائے والا ہوتا ہے۔ (۵۳۵/۳)

اُمیدِ جنت اور خوفِ دوزخ سے عبادت کرنے والا حسنِ مقصود اور جمالِ معبود سے آگاہ نہیں، وہ تو صرف جنت کی جوئے شیر کی طرف کھچا جا رہا ہے یا دوزخ کی طوق و زنجیر سے یا اس کی آتش سے خائف ہے۔ (حضرت مجدد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ایسا شخص بھی جنت کا حقدار بن جاتا ہے بے شک نفس کا ادغان ہی شامل کیوں نہ ہو)۔

پس محبِّ حق بامید و بترس　　　　دفترِ تقلیدِ می خواند بدرس

لالچ اور ڈر سے اللہ کا دوست تقلید کی کتاب کو درس کے ساتھ پڑھ رہا ہے۔ (۴۳۵/۳)

واں محبّ حق زبہرِ حق کجاست　　　　کہ زاغراض و زعلت ہا جداست

وہ اللہ کے لیے اللہ کا دوست کہاں ہے؟ جو غرضوں اور علتوں سے جدا ہے۔ (۴۳۵/۳)

فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص اس معرفت تک نہ پہنچے کہ نیکی آپ ہی اپنا اجر ہے اور بدی آپ ہی اپنی سزا ہے، اس کی روح شہوات وخطرات میں تڑپتی رہے گی۔ مرزا غالب کا شعر ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رابعہ بصری کی ایک روایت مشہور ہے کہ ایک دن وہ بازار سے گزر رہی تھیں، آپ کے ایک ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں کسی برتن میں دہکتے ہوئے کوئلے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو فرمانے لگیں اس پانی سے جہنم کو بجھانے اور اس آگ سے جنت کو جلانے جا رہی ہوں تاکہ لوگ خدا کی عبادت خدا ہی کی محبت سے کریں اور اجر وزجر کے محرکات عمل میں نہ لائیں۔ (یہ تو اعلیٰ مومن کی نوعیت ہے)۔

اگر کوئی محقق نہیں تو تقلید بہتر ہے

مولاناؒ کا فرمان ہے کہ اکثر لوگ مقلد ہوتے ہیں اور محقق کوئی کوئی ہوتا ہے۔ محقق کا درجہ بلند ہے لیکن محقق ہر شخص نہیں ہوسکتا، اس لیے تقلید کے بغیر اس کو چارہ نہیں۔ مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کا قول ہے کہ علمِ تصوف کے بغیر علمِ شریعت کو حاصل کرنے والا زندیق ہے، اسی طرح علمِ تصوف کو علمِ شریعت کے بغیر حاصل کرنے والا فاسق ہے اور ان دونوں کو جمع کرنے والا، یعنی جس کے پاس شریعت کا علم ہو اور تصوف کا علم بھی ہو تو وہ محقق ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اچھوں کی تقلید سے عوام کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ آپ نے اس کو ذہن نشین کرانے کے لئے ایک مثال پیش کی ہے کہ ایک شخص اندھا تھا اور پیاسا بھی تھا، اس کے ساتھ ایک شخص بینا تھا اور وہ بھی پیاسا تھا۔ آنکھوں والے کو دور سے ندی نظر آ گئی اور اندھے کو ندی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ آنکھوں والے نے کہا کہ تُو میرے ساتھ چل اور اس بحث میں نہ پڑ کہ ندی نظر نہیں آ رہی۔ آخر اندھا تسلی بخش ثبوت کے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا اور جب گھڑا پانی میں ڈبویا اور بھرا ہوا گھڑا اُٹھایا تو پھر اسے یقین آیا کہ واقعی ندی ہے۔ مقلد بھی کسی محقق کے پیچھے چل کر آخر میں فیض اور یقین حاصل کرسکتا ہے لیکن انسان کا نصب العین مقلد رہنا نہیں بلکہ محقق بننا ہے۔

گر نہ بینی آب کورانہ بفن   سوئے جو آور سبو در جوئے زن

اگر تو اندھے پن سے پانی کو نہیں دیکھتا، تدبیر کے ساتھ ٹھلیا نہر کی جانب لا (اور) نہر میں ڈبو دے۔ (۳/۴۱۰)

چوں شنیدی کاندریں جو آب ہست   کور را تقلید باید کار بست

جب تو نے سن لیا کہ اس نہر میں پانی ہے، اندھے تقلید کو کام میں لا۔ (۳/۴۱۰)

گرنہ بیند کور آب جو عیاں   لیک داند چوں سبو بیند گراں

اگرچہ اندھا نہر کے پانی کا مشاہدہ نہیں کرتا ہے لیکن سمجھ لیتا ہے، جب ٹھلیا کو بھاری دیکھ لیتا ہے۔ (۳/۴۱۰)

کہ زجُو اندر سبو آبے برفت   کایں سبک بود و گراں شد زآب زفت

کیونکہ نہر سے ٹھلیا میں پانی پہنچ گیا اس لیے کہ یہ ہلکی تھی، بھاری پانی سے بھاری ہوگئی۔ (۳/۴۱۰)

فلسفی کی بے کار دوڑ دھوپ

مولانا رومیؒ فلسفی کو بارہا بھٹکا ہوا انسان کہہ چکے ہیں، پہلے باب میں علامہ اقبالؒ کا بیان کہ انہیں فلسفہ میں بوئے خامی آتی ہے، گزر چکا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مادیت کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکے اور حقیقت رسی کے قائل نہیں ہیں۔ صوفی اپنے خدا کو اپنے نفس کی گہرائیوں میں تلاش کرتا ہے اور طبعی فلسفی اس کو آفاق میں ڈھونڈتا ہے مگر مظاہر کا علم اس کو کنہء وجود سے آگاہ نہیں کرسکتا، جب کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ خدا تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ایسا فلسفی ایک شکاری کی طرح ہے جو دُور دُور تیر مارتا ہے لیکن اس کا شکار اس کے بالکل

قریب ہے ؎

آنچہ حق است اقرب از حَبْلِ الْوَرِیْدُ　　تو فگندہ تیرِ فکرت را بعید

جو حق ہے وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے، تو نے فکر کے تیر کو دور پھینکا۔ (۲۳۲/۶)

اے کمان و تیرہا بر ساختہ　　صید نزدیک و تو دور انداختہ

اے وہ! جو تیر اور کمان تیار کئے ہوئے ہے، شکار نزدیک ہے اور تُو نے دُور چلایا۔ (۲۳۲/۶)

خزینۂ معرفت انسان کے اندر ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ ایسے لوگ جو حقیقت کو نہیں سمجھتے، خدا سے دور تر چلے جاتے ہیں ؎

ہر کہ دور انداز تر او دور تر　　وز چنیں گنج است اُو مہجور تر

جو شخص دور پھینکنے والا ہے، وہ زیادہ دور ہے اور وہ ایسے خزانہ سے زیادہ محروم ہے۔ (۲۳۲/۶)

فلسفی خود را زاندیشہ بکشت　　گو بدو کُورا سوئے گنج است پُشت

فلسفی نے خود کو (فکر) سے مار ڈالا، اس سے کہدے کہ اس کی خزانہ کی جانب پشت ہے۔ (۲۳۳/۶)

گو بدو چندانکہ افزوں می رود　　از مرادِ دل جدا تر می شود

اس سے کہدے کہ وہ جتنا دوڑتا ہے، دل کی مراد سے زیادہ جدا ہو رہا ہے۔ (۲۳۳/۶)

تلاشِ حق اپنے اندر رہ کر ہونی چاہیے جیسا کہ "جَاهَدُوْا فِیْنَا" سے ظاہر ہے، نہ کہ اس سے دور ہٹ کر۔

جَاهَدُوْا فِیْنَا بگفت آں شہر یار　　جَاهَدُوْا عَنَّا نہ گفت اے بے قرار

اس شاہ نے جَاهَدُوْا فِیْنَا کہا ہے، اے بے قرار! اس نے "جَاهَدُوْا عَنَّا" نہیں کہا ہے۔ (۲۳۳/۶)

کامیاب وہی ہوسکتا ہے جس نے حَبْلِ الْوَرِیْدُ کے قرب سے اس ہستی کو اپنے اندر تلاش کیا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے اگر میرا یقین حبل الورید پر پہلے ہی ہوتا تو ۳۰ سالہ عبادت اور ریاضت کی مدت نہ کاٹنا پڑتی جَاهَدُوْا عَنَّا کا مطلب ہے ہماری جانب سے دور جانے کی کوشش کرنا ہے۔

مدارجِ عقل

جس طرح ہستی کے بہت سے مدارج ہیں، اسی طرح عقل کے بھی بہت سے مدارج ہیں۔ اس میں جمادات، نباتات اور حیوانات بھی شامل ہیں۔ ان تینوں کی عقل کے بعد وہ عقل ہوتی ہے، جسے لوگ عقلِ انسانی کہتے ہیں، عقلِ انسانی میں بھی عقلِ حیوانی کی آمیزش ہوتی ہے، جس سے انسان حیوانی خواہشات اور مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس سے ذرا اُوپر حکماء یا فلاسفہ کی عقل ہے جو علّت و معلول اور منطق کے محدود قوانین سے تمام حقائق کا احاطہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مولاناؒ اس عقل کو جُزوی عقل کہتے ہیں اور حکماء اس کو کُلی عقل سمجھ لیتے ہیں۔ اس سے

اُوپر عقلِ نبوی ہے، جس میں اندازِ بصیرت اور استدلال ہوتا ہے، یہ حکماء و متکلمین کے استدلال سے الگ ہوتا ہے۔ فلسفی اور نبی کی عقل میں پوست اور مغز کا فرق ہوتا ہے۔ فلسفی کی عقل کا میلان بھی حیوانی عقل کی طرح عالمِ مادی کی طرف ہی ہوتا ہے کیونکہ حیوانات سبزیوں، پھلوں اور چھلکوں ہی کے طالب ہوتے ہیں۔ وہ ان چھلکوں کے مغز کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مادی عقل عام انسانوں کے علاوہ فلاسفہ کے دست و پا بھی جکڑ لیتی ہے۔ مادی عقل سے اُوپر والی عقل کو مولانا عقلِ عقل کہتے ہیں اور اہل دل اس عقلِ عقل پر سوار ہوتے ہیں، گرفتار نہیں ہوتے۔

بند معقولات آمد فلسفی — شہسوار عقلِ عقل آمد صفی

فلسفی معقولات کا پابند ہے، منتخب انسان عقلِ کُل کا شہسوار ہے۔ (۲۴۵/۳)

عقل عقلت مغز و عقل تست پوست — معدۂ حیوان ہمیشہ پوست جوست

تیری عقل کی عقل مغز ہے اور تیری عقل چھلکا ہے، حیوان کا معدہ ہمیشہ چھلکے تلاش کرنے والا ہے۔ (۲۴۵/۳)

فرماتے ہیں کہ عقلِ استدلالی ورق کالے کرتی ہے، پھر بھی لاکھوں دلائل کے بعد یقین پیدا نہیں کرتی لیکن جس میں عقلِ عقل ہے، اس کے لیے انفس اور آفاق روشن ہو جاتے ہیں۔

پینتیسواں باب

ذکرِ الٰہی کے چند اسرار

تصوّف میں سب سے اُونچی ریاضت ذکرِ الٰہی ہے

ذکرِ الٰہی ہی خدا کی محبت کا بہترین ذریعہ ہے۔ سالکانِ راہِ طریقت ذکر ہی سے خدا کا قُرب حاصل کرتے ہیں کیونکہ یہ اللہ کی محبت کی علامت ہے اور محبت جس سے ہو، اس کا اکثر ہی ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ اَحَبَّ شَيْئاً فَاَكْثَرَ ذِكْرَهٗ. یعنی جس کو کسی سے محبت ہوتو وہ اکثر ہی اس کا ذکر کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ قلبِ انسانی میں لاتعداد اسرارِ الٰہی چھپے ہوتے ہیں اور ان کو افشا کرنے کا طریقہ قلزمِ دل کو ضربِ ذکرِ الٰہی سے چیرنا ہے ؎

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اَسرار جب تک تو اِسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

اولیاء کرامؒ کا کشف، رُوحانی تصرف، مراقبہ اور مشاہدہ ذکرِ الٰہی کے باعث ہوتا ہے۔ اس میں کونین کا مشاہدہ اور لوحِ محفوظ تک رسائی حاصل ہوتی ہے لیکن ذکرِ الٰہی سے مراد صرف وہی ذکر ہے جو کسی شیخ سے اخذ کیا گیا ہو۔ یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت، ہر حالت میں اور ہر لحہ ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کوئی پابندی یا رکاوٹ راستے میں حائل نہیں ہوتی اور اگر دل ذکرِ الٰہی سے صیقل ہو جائے تو دل کے آئینے میں ہر چیز کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ تحصیلِ مقصود کے لیے ذکر پر دوام اور استمرار (ہمیشہ کرتے رہنا) ضروری ہے۔ حضرت بہاؤالدین نقشبندؒ نے فرمایا ہے کہ ہم چالیس سال سے آئینہ داری کر رہے ہیں اور ہمارے آئینہ نے کبھی غلطی نہیں کی۔ علامہ اقبالؒ سے ایک

انگریز نے دریافت کیا کہ مسلمانوں کا قرآن محمد ﷺ پر نازل ہوا یا انہوں نے اسے خود ہی تحریر فرما لیا ہے۔ اس پر علامہؒ نے اسے بتایا کہ حضور ﷺ تو ایک بڑی ہستی ہیں اور یہ کلام ان پر اللہ کی طرف سے نازل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، جب کہ خود جو اشعار میں نے لکھے ہیں وہ ان کو دیوار پر کندہ الفاظ کی صورت میں نظر آتے رہے ہیں اور وہ ان کو قلمبند کر دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ؎

مجھے رازِ دوعالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

اولیاء کرامؒ فرماتے ہیں کہ انسان کا دل سمندر سے بھی گہرا ہے اور اس میں بے شمار راز چھپے ہوئے ہیں اور یہ راز صرف ان پر ظاہر ہوتے ہیں، جن کا آئینہ ذکرِ الٰہی سے صاف اور شفاف ہو چکا ہو۔

فِکر میں اگر جمود ہو تو ذِکر سے کُھل جاتا ہے

(فکر وہ ہے جو راہ کو کھول دے اور راہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملا دے)

مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ ایک صوفی درویش کو شیطان نے بہکایا کہ تیرے اس رات دِن کے ذکر کا کیا فائدہ، کیونکہ تیرے اللہ اللہ کہنے پر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی جواب ہی نہیں دیتا، چنانچہ اس صوفی نے ذکر کرنا بند کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعے اس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ میرے اس بندے سے کہہ دو کہ ایک دفعہ اللہ کہنے کے بعد میں ہی تجھے دوسری بار اللہ کہنے کی توفیق دیتا ہوں تو پھر دوسری بار لفظ اللہ تمہاری زبان سے نکلتا ہے۔ دوسری بار تجھے ذکر کی توفیق دینا ہی میرا لبیک (یعنی میرا جواب) ہے کیونکہ پہلی بار تیرا کہا ہوا "اللہ" اگر قبول نہ ہوتا تو دوبارہ تیری زبان سے اللہ کا لفظ نہ نکلتا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

گفت آں اللہ تو لبیکِ ماست آں نیاز و دردو سوزت پیکِ ماست

اللہ نے کہا کہ تیرا اللہ کہنا ہی ہمارا جواب ہے، یہ تیرا درد وسوز و نیاز گویا ہمارا ہی پیغام ہے۔ (۳۲/۳)

نے ترا در کارِ من آوردہ اَم نے کہ مَن مشغول ذکرت کردہ ام

نہیں! بلکہ اپنے اس کام میں تجھے لگانے والا ہی میں ہوں، نہیں! بلکہ تجھے ذکر میں مشغول کرنے والا بھی میں ہوں۔ (۳۳/۳)

ترس و عشقِ تو کمندِ لُطفِ ماست زیرِ ہر "یاربّ" تو لبیک ہاست

تیرا خوف اور عشق ہی میرے لُطف کی ڈوری ہے، تیرے ہر بار یارَبّ کہنے میں میرے بہت سے لبیک ہیں۔ (۳۳/۳)

اللہ تعالیٰ سے ملنے کا طریقہ

مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنا چاہتے ہیں وہ سب سے پہلے صوم وصلوٰۃ کی پابندی کریں یعنی

شریعت کا اتباع تو ہر حال میں لازم ہے، اس کے بعد اوقاتِ مقررہ پر ذکر جاری کریں اور فکر کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ فکر ایک ایسی عبادت ہے، جس کی ایک ساعت ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے (فکر میں ہر بات کی کنہ پر تفکر کیا جا سکتا ہے اور اس میں ہر معاملے میں تحقیق کے مرتبے پر پہنچنا ہوتا ہے۔) مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر فکر جامد (جامد یعنی بند) ہو جائے تو جاؤ ذکر کرو۔ ذکر کرتے رہنے سے جامد شدہ فکر کھل جائے گا کیونکہ ذکر اور ریاضت کرتے رہنے سے فکر حرکت میں آ جاتا ہے۔ اس افسردہ جمود کے لئے ذکر خورشید کی طرح ہے جو قلبِ انسانی کو حرارت پہنچاتا ہے۔ سائنسدانوں کا قول ہے کہ اس دنیا کی آگ کی زیادہ سے زیادہ حرارت ۱۸۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ ہے اور صوفیاء کا قول ہے کہ جہنم کی حرارت اس سے ستر گنا تیز ہے اور ذکرِ الٰہی سے جو آگ دل میں پیدا ہوتی ہے، وہ جہنم کی آگ سے بھی ستر گنا تیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مومن پل صراط سے گذرے گا تو ایک حدیث کے مطابق جہنم اس کی خوشامد کرے گی کہ اے مومن! جلدی سے گذر جا کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری آگ (نور) میری آگ کو ختم کر دے۔ چنانچہ جب فکر کھل جائے تو سالک کی خدا تک پہنچنے کی راہ کھل جاتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ راہ وہ ہوتی ہے، جو خدا تک پہنچا دے ؎

این قدر گفتیم، باقی فکر کن فِکر اگر جامد بود رو ذِکر کن

جو میں نے کہہ دیا ہے اس پر سوچ بچار کرو، اگر فکر منجمد ہو گئی ہے تو ذکر کرو (کھل جائے گی)۔ (۱۵۳/۶)

ذکر آرد فکر را در اِہتزاز ذِکر را خورشید این افسردہ ساز

ذکر کی گرمی فکر کو حرکت میں لاتی ہے، اس افسردہ جمود کے لئے ذِکر کو آفتاب خیال کرو۔ (۱۵۴/۶)

فکر آں باشدِ کہ بکشاید رہے راہ آں باشد کہ پیش آید شہے

فکر تو وہ ہے کہ جو راستہ کھول دے اور راستہ وہ (مفید) ہے، جو شاہِ حقیقی سے ملا دے۔ (۳۰۲/۲)

صیقل جاں آمد از تَقْوَی الْقُلُوْبِ

(روح کا صیقل ہونا دلوں کے تقویٰ پر منحصر ہے)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ روح کا چمکانا تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں، یہ وہ کام ہے جس کی طرف عام انسان توجہ نہیں دیتا۔ جو لوگ حصولِ فیض کی قابلیت وصلاحیت سے خالی ہیں ان کو اس سے کیا غرض کہ ان کے دلوں کو آئینے کے مقابل لا کر آئینے کی طرح صیقل کر دیا جائے۔ یہ آئینۂ دل صیقل و مجلّٰی کیوں کر ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت "وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ" (الحج:۳۲) سے ہوتی ہے یعنی جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، پس یہ دلوں کے تقویٰ سے ہی ہوتی ہے۔ حضرت صاحبِ بحر العلومؒ فرماتے ہیں کہ مفسرین اس آیت میں شعائر اللہ کو مناسکِ حج مثلاً ہدی، صفا و مروہ وغیرہ پر محمول کرتے ہیں مگر یہ معنی مناسبتِ مقام نہیں بلکہ شعائر کے معنی بحسبِ لغت

نشانیوں کے ہیں، پس شعائر اللہ، اللہ کی نشانیاں ہوئیں۔ اس تقدیر پر عام موجودات شعائرِ اللہ ہیں کیونکہ وہ مظاہرِ حق ہیں اور شعائرِ اللہ کی تعظیم سے مقصد یہ ہے کہ ان شعائر یعنی نشانیوں میں حق کا مشاہدہ کرے اور اگر حق کا مشاہدہ نہ ہوگا تو شعائر شعائر نہ ہوں گے، غرض جس چیز کا تصور کیا جائے اور اس میں حق ملحوظ ہو تو وہ من جملہ شعائر ہے اور اس کی تعظیم حق کی تعظیم ہے، جو تقویٰ قلب سے ہوتی ہے یعنی چونکہ شعائر میں سوائے حق کے اور کچھ ملحوظ و مشاہدہ نہیں ہوتا، لہٰذا ان کی تعظیم غیرِ حق کے نشان کو صفحۂ قلب سے محو کر دیتی ہے اور یہ روح کے لئے صیقل ہونا ہے۔

عاشقِ آئینہ باشد رُوئے خوب　　صیقلِ جاں آمد از تقوَی القُلُوب

ایک خوبصورت شخص ہی آئینے کا دلدادہ ہوسکتا ہے (نہ کہ بدصورت اور) روح کا صیقل ہونا (جس سے وہ آئینہ بن جاتی ہے) دلوں کے تقویٰ سے میّسر ہوسکتا ہے۔ (۳۲۹/۱)

مولاناؒ کی مراد اس شعر سے یہ ہے کہ جس کا دل اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ محض دلوں کے تقویٰ سے ہی ممکن ہے۔

خوبصورت شخص کے سامنے آئینہ رکھنا چاہیے

آئینہ ایک پری جمال و ماہ پیکر صورت کے لئے ہی کارآمد ہوسکتا ہے، جو اس سے اپنے حسن کی آراستگی میں مدد لے۔ ایک بدصورت و کریہہ شکل کے لئے یہ آئینہ مفید نہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہؒ کی صحبت و نسبت سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں، جو صالح الاستعداد اور پاک فطرت ہوں کیونکہ اولیاء اللہؒ مریدوں کی روح کے لئے آئینہ ہیں اور اس ظاہری آئینے سے بہتر ہیں۔ جس طرح آئینے کو چہرہ اور خدوخال دیکھنے کے لئے اپنے سامنے رکھا جاتا ہے، اسی طرح سلاطین صوفیہ کو بھی اپنے سامنے جگہ دیتے تھے۔ سلاطین کا ان حضرات کو اپنے سامنے جگہ دینا ان کی عظمت و تقدس کے لحاظ سے اور ان سے فیض و برکت حاصل کرنے کی غرض سے تھا تاکہ ان کے ضمیر سے اپنے باطنی اسرار کا تماشا دیکھا جا سکے۔

ہر کہ او از اصلِ فطرت خوب زاد　　آئینہ در پیشِ او باید نہاد

جو شخص اصل فطرت سے خوبصورت پیدا ہوا ہو، اس کے روبرو آئینہ رکھنا چاہیے۔ (۳۲۹/۱)

جو خدا کی ذات میں فنا ہو جائے، وہ ہلاکت میں نہیں رہے گا

جو شخص ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا ہو کر بقا باللہ حاصل کر لے وہ "کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ" (یعنی ہر شے ہلاک ہونے والی ہے) کے حکم سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ ھالک نہ رہا بلکہ باقی با اللہ بن گیا۔ خداوند تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ جب تک تم فنا ہو کر اس کی ذاتِ پاک میں شامل نہیں ہوئے، ہستی کی اُمید نہ رکھو۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ تمام موجودات اس کی ذاتِ پاک میں فنا و محو ہیں اور ہستیٔ حقیقی سے بہرہ ور وہی

ہے، جو اس میں فنا ہو جائے، اُسے بقابِـاللّٰـه کہتے ہیں لیکن جو اس میں فنا نہ ہو اس کا دعویٰ ہستی فضول ولغو ہے۔ مولانا احمد حسنؒ، شیخ ولی محمدؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ مولاناؒ نے یہ کلمات جو بصیغۂ متکلم فرمائے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر آپ کی جہتِ عبودیت جہتِ ربوبیت میں فنا ہو چکی ہے۔ چونکہ محو و فنا اور ترکِ خودی کا ذکر چلا آ رہا ہے، اس لئے یہاں اندازِ تکلّم سے یہ ظاہر کرنا اور بھی مناسب تھا کہ ایک بندہ جو مقامِ فنا میں ذاتِ حق کے کلام کو بطریق تکلّم ادا کر سکتا ہے تو اس وقت وہ معبود ہی کا کلام ہوتا ہے، نہ کہ غیر کا کیونکہ عبد کو موہوم و باطلِ خودی جو اس کی ذاتِ حق سے بیگانگی اور اس کے کلام کو بصیغہ غائب ادا کرنے کی مقتضی تھی، فنا ہو چکی اور ہستیٔ حقیقی جو تمام ہستیوں میں بصیغۂ ماومن متکلم ہے، باقی رہ گئی۔

هر که اندر وجه ما باشد فنا كُلِّ شَیْءٍ هَالِكٌ نبود جزا

جو کوئی ہماری ذات میں فنا ہو جائے (اس کو) کُـلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ (کی کلیت کے ماتحت) ہلاکت کی سزا بھگتنی نہیں پڑتی۔ (۳۱۹/۱)

فنا اور بقا "لَا وَ اِلَّا" کی مناسبت سے ہے

لَا اور اِلَّا کے ذکر سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہاں نفی و اثبات مراد ہے، جو کلمہ طیبہ میں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ذکر و شغل کے مرتبہ میں نفی اشیاء کے ملاحظہ سے گذر کر خاص اثبات یعنی مشاہدۂ حق میں مشغول ہے۔ جیسے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے۔

تا بجاروبِ لَا نروبی راه نرسی در سرائے اِلَّا اللّٰـه

بلکہ یہاں لَا سے ہستیٔ موہوم مراد ہے جو حقیقت میں منفی و معدوم ہے اور اِلَّا سے ہستیٔ حقیقی مقصود ہے، پس معنی یہ ہوئے کہ وہ ہستیٔ موہوم سے گذر کر ہستیٔ حقیقی سے مشرف ہو گیا۔

جو لوگ لَا اور اِلَّا میں مخفی اسرار کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ ہماری تصنیف "حسنِ نماز" کا مطالعہ فرمائیں۔ علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتب میں بھی اس موضوع پر بہت کلام کیا گیا ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

زانکه در اِلَّا ست او از لَا گذشت هرکه درِ اِلَّا ست او فانی نگشت

کیونکہ وہ اِلَّا وَجْهَهٗ کے ساتھ مستثنیٰ ہے، وہ لا (یعنی هَالِكٌ) سے گذر گیا، جو کوئی اِلَّا میں ہے وہ فانی نہیں ہوا۔ (۳۱۹/۱)

هرکه بر درِ او من و ما می زند ردِّ باب ست او و بر "لَا" می تند

جو کوئی اس کے دروازے پر من و ما کا دعویٰ کرتا ہے، وہ دروازے سے مردود ہے اور ابھی لا (یعنی ہلاکت) پر قائم ہے۔ (۳۱۹/۱)

رسول اللہ ﷺ کے نور سے آدم علیہ السلام کا ظہور ہوا

رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ ''آدم علیہ السلام اور باقی تمام انبیاء علیہم السلام میرے جھنڈے کے نیچے میرے پیچھے ہوں گے۔'' (سنن ترمذی، دارمی) نبی ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہم پیدائش میں پیچھے آنے والے ہیں اور درجے میں سب سے مقدّم رہنے والے ہیں۔'' (دلائل النبوۃ لابی نُعَیم) بعض علماء نے اس کے معنی یوں بیان کئے ہیں کہ میں اور میری اُمت تمام پہلے انبیاء اور ان کی امتوں پر درجہ میں مقدم ہیں مگر صوفیاء کے نزدیک یہ معنی ہیں کہ میری حقیقت تمام حقائق پر سابق ہے اور ہر حقیقت میری حقیقت سے وابستہ ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے لئے ہی آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا اور ان کے لئے ہی وہ ساتویں آسمان پر گئے۔ وہ مسجود اس لئے ہوئے کہ نورِ محمدی ﷺ ان کی صلب (پشت) میں تھا۔ ساتویں آسمان پر معراج اس لئے کیا کہ نورِ محمدی ﷺ سے فیض حاصل کرنا مطلوب تھا، پس حقیقت میں باپ مجھ بیٹے سے پیدا ہوا۔ عادتِ الٰہیہ یوں جاری ہے کہ وجود میں آنے والی ہر چیز کا فکر اور تصور مقدم ہوتا ہے، حقیقت میں درخت میوے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

گر بصورت من ز آدم زادہ اَم   من بمعنی جدِّ جد افتادہ اَم

اگرچہ بظاہر میں آدم علیہ السلام سے پیدا ہوا ہوں، لیکن درحقیقت میں دادے کا دادا واقع ہوا ہوں (اس بناء پر کہ حقیقتِ آدمؑ کا ظہور حقیقتِ محمدیہ ﷺ سے ہوا ہے)۔ (۴/۶۲)

آبِ ذکرِ حق و زنبور ایں زماں   ہست یادِ ایں فلان و آں فلاں

اللہ تعالیٰ کی یاد پانی ہے اور مکھی (یہ ہے کہ) اس ذکر کے وقت اِس فلاں اور اُس فلاں کی یاد آئے۔ (۴/۵۴)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یادِ حق میں وسواس کا حال شہد کی مکھیوں کی طرح ہے اور اس سے بچاؤ ذکر اللہ کے پانی سے ہوسکتا ہے۔

ذکر کا مزید بیان دوسری جلد میں آئے گا

ضخامت کے بوجھ سے بچنے کے لیے اس جلد میں ذکر کا مختصر بیان کر دیا گیا ہے لیکن ہماری زیرِنظر تصنیف کی دوسری جلد میں انشاء اللہ کافی اور وافی تفصیل دی جائے گی۔ زندگی نے وفا کی تو یہ خواہش بھی انشاء اللہ پوری ہوگی۔

چھتیسواں باب

عقل سے نظریات پیدا ہوتے ہیں

عقل خود را می نماید رنگہا

(عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے)

عارف رومیؒ نے عقل اور روح پر بہت بسیط کلام کیا ہے، جس کا احاطہ کرنا طوالت کے سبب اس تحریر کی حدود سے تجاوز کر جائے گا۔ اس جگہ آپ کے چند اشعار کی تشریح کی جا رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ کا کلام ہم ایک الگ کتاب ''عقل و عشق اور فلسفہ خودی'' میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی عنقریب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عقل اپنے آپ کو کئی رنگوں میں پیش کرتی ہے۔ عقل کبھی تو عیاری و مکاری کرتی ہے اور جب عقلِ سلیم کے ساتھ رونمائی کرتی ہے تو عشق کے اثرات اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کی غمازی بالِ جبریل میں حسبِ ذیل اشعار میں کی ہے۔

عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے ؟ چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے

بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے　　خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
خرد بیزار دل سے دل خرد سے　　خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے

مولانا رومیؒ کے لکھے ہوئے چند اشعار نیچے دیئے جا رہے ہیں۔

ذرۂ عقلت بہ از صوم و صلوٰۃ
(ذرہ بھر عقل، روزہ و نماز سے بہتر ہے)

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! لوگ آپس میں کس بات سے فضیلت حاصل کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عقل کے ساتھ۔ میں نے عرض کی اور آخرت میں کس بات سے فضیلت حاصل کریں گے؟ فرمایا: عقل کے ساتھ۔ میں نے عرض کیا: کیا وہ اپنے اپنے عملوں کا بدلہ نہیں پائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! وہ اللہ کی دی ہوئی عقل کے حصہ کے موافق ہی تو عمل کریں گے اور عطا شدہ عقل کے اندازے پر اُن کے اعمال ہوں گے اور عملوں کے مطابق وہ بدلہ پائیں گے۔ فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ ''آدمی اپنی خوش خلقی کی بدولت روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کرتا ہے اور آدمی کی خوش خلقی کی تکمیل اس کی عقل کی تکمیل کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس وقت اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے اور وہ اپنے پروردگار کی اطاعت کرتا ہے۔ (منہج القوی)

اسی طرح عبادات عقل کو صیقل کرتی ہیں لیکن عقلوں کا جلد یا بدیر صیقل پذیر ہونا اُن کے کمالِ استعداد یا نقصِ استعداد پر موقوف ہے۔ عقل کی کئی اقسام ہیں: ایک عقل روشنی کے لحاظ سے آفتاب کی مثل ہے اور ایک عقل زہرہ اور ٹوٹنے والے ستارے سے بھی کم تر ہے، کوئی عقل مست چراغ جیسی ہے اور کوئی آگ کی چنگاری جیسی ہے اور جو عقلیں آفتاب کی مانند ہوتی ہیں اگر اُن کے سامنے سے (ماسوا اللہ کا) بادل اُٹھ جائے تو وہ عقلیں خدا کو دیکھنے والا نور برساتی ہیں۔ (یہ انبیاء و اولیاء کی عقول ہیں، جن سے عقولِ عوام فیض پاتی ہیں) مخلوق کی عقلیں ان کی عقول کا عکس ہیں۔ ان کی عقول مُشک ہیں اور مخلوق کی عقلیں خوشبو ہیں۔

عقلِ کُل ایک ایسی حقیقت ہے، جس میں تمام کائنات چھپی ہوئی ہے اور نفس ایک ایسی حقیقت ہے جو کچھ عقل میں ہے اس کی تفصیل نفسِ کل ہے اور اِن دونوں کا مظہر انسانِ کامل ہے یعنی مردِ خدا جو انسانِ کامل ہے، مظہرِ حق ہے اس لئے کہ ذاتِ حق تمام اسماء و صفات سمیت انسانِ کامل میں ظاہر ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عقلِ کل اور نفسِ کل مظہرِ حق ہوں۔ عقل کی مزید دو قسمیں ہیں: عقلِ جزوی اور عقلِ کلی۔ عقلِ جزوی شخصی عقل ہے جو دنیادار کی عقل ہے۔ اس جزوی عقل نے عقلِ کلی کو بھی بدنام کر دیا ہے۔ اگر یہ عقلِ جزوی راہِ حق میں مصروف ہو تو مہذب بن سکتی ہے۔ عقلِ جزوی کیونکہ اُمورِ دُنیا میں مصروف ہو کر حق سے بعید ہو چکی ہے، اس لئے عقلِ کلی کی بدنامی کا

باعث بنتی ہے۔ عقلِ کلی ایک مردِ خدا یا انسانِ کامل کی عقل ہے۔ مردِ خدا یا عقلِ کلی نے جب حق تعالیٰ کا شکار بن کر اور اس کے دامِ عشق میں مقیّد ہو کر صیاّد کا حُسن دیکھا تو خود اس کا صید بن گیا، یعنی وہ مُتَخَلّقُ بِاَخلاقِ اللّٰہِ اور خلیفۂ حق بن گیا، پس اُس کا حکم تمام کائنات میں نافذ ہو گیا۔ بخلاف اس کے کہ دُنیادار یا عقلِ جزوی والا مخلوقِ خدا کو اپنی کمندِ تسخیر اور دامِ تزویر میں مقیّد کرنے کی وجہ سے خود اس شغلِ بے ثمر کا شکار ہو جائے (یعنی بیکار کاموں میں لگ جائے) لیکن معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عقلیں برابر ہیں اور اگر کچھ فرق محسوس کرتے ہو تو اس سے مراد یہ نہیں کہ عقلوں میں فرق ہے بلکہ یہ زیادتی اور فرق تعلیم و ریاضت اور تجربے کی وجہ سے ہے۔ اُوپر جو گفتگو ہوئی اس کا نقشہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اپنے کلام میں اس طرح کھینچتے ہیں ؎

پس نکو گفت آں رسولِؐ خوش جواز ذرۂ عقلت بہ از صوم و نماز

پس خوب کہا ہے اس پاک رسول اللہ ﷺ نے کہ تیرے لئے ذرہ بھر عقل روزہ و نماز سے بہتر ہے۔ (۵۶/۵)

زانکہ عقلت جوہرست ایں دو عَرَض ایں دو در تکمیلِ آں شد مُفترض

کہ تمہاری عقل جوہر ہے اور یہ دونوں (نماز و روزہ) عرض ہیں، یہ دونوں اس کی تکمیل میں فرض ہیں۔ (۵۶/۵)

تا جلا باشد مر آں آئینہ را کہ صفا زاآید زطاعت سینہ را

تاکہ اس عقل کے آئینے کے لیے نماز و روزہ جلا بن جائیں کیونکہ سینے کو نماز و روزہ کی اطاعت سے صفائی حاصل ہوتی ہے۔ (۵۶/۵)

لیک گر آئینہ از بُن فاسدست صیقل آں را دیر باز آرد بَدست

لیکن آئینہ اگر اصل سے خراب ہے تو اس پر جلا مدت کے بعد آتی ہے۔ (۵۶/۵)

ہَست عقلے ہمچو قرصِ آفتاب ہَست عقلے کمتر از زہرہ و شہاب

ایک عقل روشنی کے لحاظ سے آفتاب کی مثل ہے اور ایک عقل زہرہ اور ٹوٹنے والے ستارے سے بھی کم ہے۔ (۵۶/۵)

وا گزیں آئینہ کُو اکیس است اندکے صیقل گری اُورا بس است

وہ آئینہ اختیار کرو جو زیادہ زیرک ہے، اس کو تھوڑا سا صیقل کرنا ہی کافی ہے۔ (۵۶/۵)

ایں تفاوت عقلہا را نیک داں در مراتب از زمیں تا آسماں

عقلوں کے اس تفاوت کو جو ان کے مراتب میں ہے، خوب سمجھ لو کہ مراتب کا فرق زمین سے آسمان تک ہے۔ (۵۷/۵)

ہَست عقلے چوں چراغِ سرخوشے ہَست عقلے چوں ستارہ آتشے

ایک عقل مست چراغ کی سی ہے، ایک عقل آگ کی چنگاری کی سی ہے۔ (۵۶/۵)

زانکہ ابر از پیش اُو چوں وا جہد　　نُور یزداں بیں خردہا بر دہد

کیونکہ جب (ماسوا اللہ کا) بادل سامنے سے اُٹھ جاتا ہے تو (وہ آفتاب کی سیف) عقلیں خدا کو دیکھنے والا نور برساتی ہیں۔ (۵۶/۵)

عقلہائے خلق عکسِ عقلِ اُو　　عقلِ اُو مشک ست و عقلِ خلق بُو

مخلوق کی عقلیں اس کی عقل کی عکس ہیں، اس کی عقل مُشک ہے اور مخلوق کی عقل خوشبو۔ (۵۶/۵)

عقلِ کُل و نفسِ کُل مرد خداست　　عرش و کُرسی را مداں کزوے جُداست

عقلِ کل و نفسِ کل مردِ خدا ہے۔ عرش اور کرسی کو اس سے جدا نہ سمجھو۔ (۵۶/۵)

مظہرِ حق است ذاتِ پاکِ اُو　　زُو بجو حق را و از دیگر مجُو

اس کی ذاتِ پاک حق کی مظہر ہے، حق کو اسی سے طلب کرو اور کسی سے طلب نہ کرو۔ (۵۶/۵)

عقل جُزوی عقل را بدنام کرد　　کامِ دنیا مَرد را بے کام کرد

شخصی عقل نے عقل (کلی) کو بدنام کر دیا ہے، دنیا کی کامیابی نے اس کو (عقبیٰ میں) ناکام کر دیا ہے۔ (۵۷/۵)

آں زصیدی حُسن صیادے بدید　　ویں زصیادی غمِ صیدی کشید

اس (عقلِ کل والے) نے شکار بن کر شکاری کی خوبی دیکھی اور اس (عقل جزوی والے) نے شکاری بن کر (خود) شکار ہونے کا غم اُٹھایا۔ (۵۷/۵)

آں زخدمت نازِ مخدومی بیافت　　ویں ز مخدومی ز راہ عِزّ بتافت

اس مردِ خدا نے خدمت کے ذریعہ شانِ مخدومی حاصل کی اور یہ (دنیادار) مخدومی (کے غرور) کے باعث عزت کی راہ سے پھر گیا۔ (۵۷/۵)

عقل بادشاہ ہے اور نفسانی خواہش وزیر ہے

مملکتِ وجود کے اندر ایک بادشاہ ہے اور ایک وزیر ہے، یعنی بادشاہ عقل ہے اور نفسانی خواہش وزیر ہے۔ عموی طور پر وزیر بادشاہ پر غالب رہتا ہے، یعنی انسان کی عقل خواہشِ نفسانی کے وزیر سے مغلوب ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اس وزیر نے شاہِ عقل کو مغلوب و مسخر کر رکھا ہے، جس طرح ہامان نے فرعون کو مغلوب کر رکھا تھا، اسی طرح روح کو بھی بادشاہ کہا جاتا ہے اور عقل کو وزیر۔ خام عقل روح کو بھی متغیر کر دیتی ہے، جس طرح بُرا وزیر بادشاہ کو گمراہ بلکہ تباہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح عقل بمنزلہ فرشتہ بھی ہے، فرشتہ ہر چند کہ گناہ و معصیت سے پاک ہوتا ہے مگر مشہور قصہ کی بناء پر جب ہاروت و ماروت دو فرشتے امتحان میں پڑ گئے تو نہ صرف خود بُرائی کے مرتکب ہوئے بلکہ بُرے لوگوں کے استاد بن گئے۔ اسی طرح عقل اگرچہ ایک نور ہے مگر جب وہ ہوا و ہوس سے متاثر ہو جائے تو روح کو بھی ناپاک کر دیتی ہے۔ ناقص عقل کو اپنا وزیر نہ بناؤ جو ہوا و ہوس سے متاثر اور ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہے۔

اے بادشاہ! عقل کو اپنا وزیر بناؤ جو قیدِ نفس سے آزاد اور ضلالت سے محفوظ ہے، اسی طرح تم میں بھی عقل ہے اور تم کسی دوسرے بزرگ کی عقل کے رفیق بن جاؤ اور اس سے مشورہ کرو تو ان شاء اللہ ہدایت پانے اور شرورِ نفس سے محفوظ رہنے کی زیادہ اُمید ہے۔ مولانا رومؒ نے اس کے متعلق فرمایا ہے ؎

عقلِ تو مَغلوب دستور ہَواست　　　　دَر وجودت رہزنِ راہِ خداست

(اسی طرح) تمہاری (مملکتِ وجود کے اندر بھی) عقل (معاشِ روح کی وزیر) ہے اور (وہ) خواہشِ نفسانی سے مغلوب ہے وہ (عقل) راہِ خدا کی راہزن ہے۔ (۴/۱۲۷)

ہمچو جاں باشد شہ و صاحب چو عقل　　　　عقل فاسد روح را آرد بہ نقل

بادشاہ گویا روح ہوتا ہے اور وزیر مثل عقل، خراب عقل روح کو متغیر کر دیتی ہے اور اسی طرح بُرا وزیر بادشاہ کو گمراہ بلکہ تباہ کر دیتا ہے۔ (۴/۱۲۸)

آں فرشتۂ عقل چوں ہاروت شُد　　　　سحر آموزِ دو صد طاغوت شُد

وہ عقل جو بمنزلہ فرشتہ ہے جب ہاروت بن جائے تو دوسو شیطانوں کو جادو سکھانے لگتی ہے۔ (۴/۱۲۸)

عقل جُزوی را وزیر خود مگیر　　　　عقلِ کُل را ساز اے سُلطاں وزیر

ناقص عقل کو اپنا وزیر نہ بناؤ (جو ہوا و ہوس سے متاثر اور ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہے)۔ اے بادشاہ! عقلِ کلی کو اپنا وزیر بناؤ (جو قیدِ نفس سے آزاد اور ضلالت سے محفوظ ہے)۔ (۴/۱۲۸)

با دو عقل از بس بلاہا وارہی　　　　پائے خود بر اُوجِ گردونہا نہی

دو عقلوں کے اجتماع سے تم بہت سی آفتوں سے بچ جاؤ گے اور یہاں تک ترقی کرو گے کہ اپنا پاؤں آسمان کی بلندی پر جا رکھو گے۔ (۴/۱۲۸)

مر ہَوا را تو وزیرِ خود مَساز　　　　کہ بَرآید جانِ پاکت از نماز

ہوا اور ہوس کو بھی تم اپنا وزیر نہ بناؤ کیونکہ اس کے اثر سے تمہاری پاک روح طاعت و عبادت سے خارج ہو جائے گی۔ (۴/۱۲۸)

کایں ہوا پُر حرص و حالی بیں بُوَد　　　　عقل را اندیشہ یُوم الدین بُوَد

کیونکہ یہ خواہش (نفسانی) حرص سے پُر اور موجودہ (عالم) کو نصب العین بنانے والی ہے (بخلاف اس کے) عقل (کامل) کو آخرت کے دن کا خیال ہوتا ہے۔ (۴/۱۲۸)

عقل را دو دیدہ دَر پایانِ کار　　　　بہر آں گُل میکشد اُو رنجِ خار

عقل کو انجام کار کے دیکھنے کے لئے دو آنکھیں (حاصل ہیں) اس پھول کے لئے وہ کانٹے کی تکلیف برداشت کرتی ہے، راحتِ عقبیٰ کے لئے دنیا میں تکالیفِ طاعات سہتی ہے۔ (۴/۱۲۸)

ور چہ عقلت ہست با عقلِ دگر ۔۔۔ یار باش و مشورت کُن اے پدر

اور اگر چہ تم میں بھی عقل ہے (تاہم) اے باوا! (کسی) دوسرے کی عقل کے رفیق بن جاؤ اور اس سے مشورہ کرو (تو اِن شاء اللہ ہدایت پانے اور شرِ نفس سے محفوظ رہنے کی زیادہ اُمید ہے۔ (۱۲۸/۴)

انسان کو آمادۂ فعل کرنے والی دو طاقتیں ہیں

انسان کو آمادۂ فعل کرنے والی دو طاقتیں ہیں، ایک عقل، دوسری نفس۔ عقل مشورہ دیتی ہے جب کہ نفس ناپاک جذبات کے زیرِ اثر کسی کام پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ نفس کا ہی کام ہے کہ وہ حرص کے جذبہ سے متاثر ہو کر انجام پر نظر کئے بغیر کوئی کام کرانے لگتا ہے۔ ہاں جو عقل نفس کے آگے بے بس ہو جائے وہ نفس کی ہمنوا ہو جاتی ہے اور غیراندیشانہ کام کرانے لگتی ہے ؎

عقل کو مغلوبِ نَفس اُو نَفس شد ۔۔۔ مُشتری ماتِ زحل شد نحس شد

جو عقل نفس سے مغلوب (ہو جائے) وہ بھی (بمنزلہ) نفس بن جاتی ہے، جب ستارہ مشتری (جو سعد اکبر ہے۔ نحس اکبر یعنی) زحل کے زیرِ اثر آ جائے تو منحوس ہو جاتا ہے۔ (۱۵۵/۲)

عقل بُری چیز کو بھی اپنا ہم رنگ بنا لیتی ہے۔ عقل کی مغلوبیت کی حالت میں بھی تعلق باللہ سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔

عاقبت بین ست عقل از خاصیت ۔۔۔ نَفس باشد کو نہ بیند عاقبت

عقل تو طبعاً عاقبت میں ہے اور جو عاقبت میں نہ ہو تو وہ نفس ہے (عقل نہیں)۔ (۱۵۵/۲)

حضور ﷺ کی ذات کی خوبیاں کسی سے بھی مخفی نہ رہیں

جنابِ رسول ﷺ کی عقل و دانش اور عقلِ سلیم کی تمام تفصیلات، مثلاً صدق، امانت، تقویٰ وغیرہ کے حالات تمام لوگوں پر ظاہر تھے، حتیٰ کہ دشمن بھی آپ ﷺ کو صادق و امین کے لقب سے پکارتے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سرمایہ سے آپ ﷺ کا کاروبارِ تجارت کرنا آپ ﷺ کی امانتداری کا منہ بولتا ثبوت ہے، حجرِ اسود کا معاملہ جو ہولناک خونریزی کا باعث ہونے لگا تھا، آپ ﷺ نے خوش اسلوبی سے سلجھایا کیونکہ آپ ﷺ صادق و امین مانے جاتے تھے۔ تمام لوگوں نے آپ ﷺ کی پختگیٔ رائے کی اور کمالِ عقل کی داد دی، حتیٰ کہ آپ ﷺ کے منکروں، مخالفوں اور حاسدوں کو بھی آپ ﷺ کے خصائل سے انکار نہ تھا مگر آپ ﷺ کی روحِ وحی بہت سے لوگوں پر مخفی رہی، اسی وجہ سے آج دنیا میں کروڑوں بدنصیب لوگ ایسے موجود ہیں جو آپ ﷺ کو رسول اور صاحبِ وحی نہیں سمجھتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عقل اگر ایک پوشیدہ چیز ہے تو وحی اس سے بھی زیادہ مخفی و مستور اور بادُشواری ادراک میں آنے والی ہے۔ یہاں کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر وحی بمقابلہ عقل کے بمشکل ادراک میں آنے والی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ زیادہ خفا کی وجہ سے مدرک نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہو گی کہ وحی کے آثار ہی نہیں ہیں اور

عقل کے آثار ہوتے ہیں، جن سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

عقلِ احمدؐ از کسے پنہاں نشد　　روحِ وحیش مدرک ہر جاں نشد

(دیکھو) حضرت محمد ﷺ کی عقل کسی سے (حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی) مخفی نہیں رہی مگر آپ کی وحی ہر شخص کو معلوم نہ ہوسکی (اس لیے تو بہت سے لوگ آپ کے منکر رہے)۔ (۳۰۷/۲)

عقلِ مُوسیٰؑ چوں بُوَد در غیب بند　　عقل موشی خود کیَست اے ارجمند

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام (ایسے اولوالعزم پیغمبر) کی عقل (اسرار) غیب میں عاجز ہے تو اے ارجمند (ذرا سوچو کہ) ایک چوہے (کے سے حقیر و ناچیز آدمی) کی عقل (کی) کیا (بساط) ہوگی جو ان اسرار کو سمجھے۔ (۳۰۷/۲)

باز عقل ازروح مخفی تر بُود　　حِس بسوئے روح زو تر رَہ بَرد

پھر عقل روح سے بھی زیادہ مخفی ہوتی ہے، اس لیے حس (ظاہر) روح (کے ادراک) کی طرف فوراً پہنچ جاتی ہے (اور عقل کو ادراک نہیں کرتی)۔ (۳۰۶/۲)

جُنبشے بینی بدانی زندہ است　　ایں ندانی تو زعقل آگندہ است

(اس کی دلیل یہ ہے کہ) تم (کسی جسم میں) حرکت دیکھتے ہو تو سمجھ جاتے ہو کہ وہ زندہ (یعنی روح رکھتا) ہے لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ وہ عقل سے بھی پُر ہے یا نہیں (یا کوئی دیوانہ اور مجنوں ہے)۔ (۳۰۶/۲)

روح وحی از عقل پنہاں تر بود　　زانکہ اُو غیب ست و اُو زاں سر بود

روحِ وحی کی استعداد عقل سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے، اس لیے کہ وہ عالمِ غیب سے ہے اور وہاں سے ہی ظہور میں آئی ہے۔ (۳۰۷/۲)

میں نے عقل کو آزمایا اور پھر خود کو دیوانہ بنا لیا

مولاناؒ فرماتے ہیں بے شک تم میں عقل ہے مگر تم عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ مکھی کے پروں کی طرح پستی کی طرف اُڑ رہے ہو۔ تمہارا میلان شہوات و لذات کی طرف ہے، اگرچہ عقل کا تقاضا ہے کہ تم بلندی کی طرف پرواز کرو مگر تم اس کے مقتضا پر عمل نہیں کرتے بلکہ اندھی تقلید کے متبع بن رہے ہو اور اپنے مرغِ طبع کے پیچھے اُڑے اُڑے پھرتے ہو، جس کا میلان لذاتِ نفسانیہ کی طرف ہے۔

گرچہ عقلت سوئے بالا مے پرَدْ　　مرغِ تقلیدت بہ پستی مے چرَدْ

اگرچہ تمہاری عقل بلندی کی طرف اُڑتی ہے مگر تمہاری تقلید کا مرغ پستی کی طرف چگنے لگتا ہے۔ (۲۲۴/۲)

آزمودم عقلِ دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

میں نے اس عقل کو جو دور اندیش (ہونے کی مدعی) ہے، آزمایا ہے (معلوم ہوا کہ اس عقلِ ناقص سے بے عقل ہو جانا اچھا ہے، لہٰذا اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا۔ (۲۲۴/۲)

عقل را ہم آزمودم من بسے　　　　زیں سپس جویم جنوں را مغرسے

(اسی طرح) میں نے عقل کو بہت آزمایا (مگر تشفی نہ ہوئی اب) اس کے بعد میں دیوانگی کا کھیت تلاش کروں گا (جہاں وہ پھلتی پھولتی ہے)۔ (۲/۲۲۵)

فلسفی کی عقل

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ فلسفی لوگ چونکہ عالمِ محسوسات کے مقید اور امورِ باطن کے منکر ہوتے ہیں، اس لیے وہ انبیاءؑ اور اولیاءؒ کے مشاہدات اور مکشوفات کو سودا و تخیلاتِ باطلہ بلکہ جنون سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے کہ کفارِ عرب رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) مجنوں (دیوانہ) کہتے تھے۔ فلاسفہ سے کوئی خاص فرقہ مراد نہیں بلکہ جس شخص میں کج فہمی اور غلط بینی کا مادہ ہو وہ اس زمرہ میں شامل ہے، خواہ وہ بظاہر فرقہ ناجیہ کا ہی ایک فرد ہو۔

فلسفی صرف قوتِ فکریہ اور مقدماتِ ظنیہ کی بناء پر حقائقِ عالیہ کا انکار کرتا ہے۔ اس کی عقل ابھی سفلیات کی دہلیز سے باہر نہیں نکلی، جو فلسفی استنِ حنانہ کے آہ و فغان کا منکر ہے وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قوائے مدرکہ کا اندازہ لگانے سے محض محروم ہے۔ پانی و مٹی اور گارے کا بولنا اہلِ دل یعنی انبیاءؑ و اولیاؒء کے حواس کو محسوس ہو رہا ہے۔ کسی کو اپنے مومنِ کامل ہونے پر مغرور نہ ہونا چاہیئے۔ شاید کوئی شعبہ فلسفیت دل میں پنہاں ہو اور کسی وقت ظہور پذیر ہو کر کشتیِ ایمان کو گردابِ تشویش میں ڈال دے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم پر قائم رہنے اور دنیا سے بسلامتی ایمان لے جانے کی دُعا کرنی چاہیئے۔ چنانچہ وہ کبھی کبھی اپنا اعتقادِ فلسفہ ظاہر کر ڈالتا ہے اور اس کی رگِ فلسفیت اہلِ ایمان کے زمرے میں اس کا منہ کالا کرتی رہتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

فلسفی گوید زمعقولاتِ دُوں　　　　عقل از دہلیز می ماند بروں

فلسفی (جو کلامِ جماد کا منکر ہے) عقلیاتِ سافلہ کی گفتگو کر رہا ہے اور اس کی عقل ابھی سفلیات کی دہلیز سے باہر نہیں نکلی (علوم عالیہ تک تو کیا پہنچتی)۔ (۱/۳۴۰)

ایک عقل دوسری عقل سے قوت پاتی ہے

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مرید اگرچہ خود عاقل و صاحبِ بصیرت ہو مگر ایک عقل تنہا مشکلات کو طے کرنے سے عاجز ہے، مثلاً مرشدِ کامل کی عقل اس کی یاور ہے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک پیشہ ور دوسرے پیشہ ور کی رفاقت میں اپنے کام کو بخوبی چلاتا ہے اور اس میں خوب ترقی کرتا ہے۔ جس طرح گنا گنے کی بدولت کمال حاصل کرتا ہے۔ بعض شارحین فرماتے ہیں کہ جو گنا دوسرے گنوں کے وسط میں ہو تو وہ اردگرد کے گنوں سے زیادہ شیریں ہوتا ہے کیونکہ وہ ان سے شرینی حاصل کرتا ہے، بخلاف اس کے کنارہ کا گنا ایسا پُر مزہ نہیں ہوتا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

عقل خود را می نماید رنگہا　　　　چوں پری دورست زاں فرسنگہا

عقل اپنے آپ کو مختلف رنگوں میں ظاہر کرتی ہے، پری کی طرح پری سے بھی کوسوں دور ہے۔ (۲/۲۲۳)

عقل قُوت گیرد از عقلِ دگر　　　نیشکر کامِل شود از نیشکر

ایک عقل دوسری عقل سے قوت پاتی ہے، ایک گنا دوسرے گنّے سے کمال حاصل کرتا ہے۔ (۲/۲۲۰)

عقلمند کی عداوت جاہل کی دوستی سے بہتر ہے

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر عقل مند سے ظلم بھی ہو جائے تو وہ جاہلوں کی وفا سے بہتر ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ عقلمند تو تجربہ و شناخت کو عمل میں لے آتا ہے اور جاہل شناخت کی باتوں کو صرف زبان پر رکھتا ہے، عقل میں نہیں لاتا۔ جاہل علم و تجربہ کو نقصان میں ڈالتا ہے یعنی جاہل کو نفع اور نقصان کی تمیز نہیں، اس لیے وہ تجربہ ہونے کے باوجود ایسے کام کر بیٹھتا ہے جو مضر ہوں، اس لیے اس کا تجربہ بے سود رہتا ہے۔ عقل کی کمزوری میں نفس کو موقع مل جاتا ہے۔ تم پر لازم ہے کہ نفس کو قوی ہونے کا موقع نہ دو، ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔ مجاہدہ سے نفس کو مغلوب اور عقل کو غالب کرنے کی ترغیب تھی لیکن یہ بات شیخ کی تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اس لیے وہی رہبر ہے۔ شیخ بعض مرتبہ ایسا حکم دیتا ہے جو مرید کو ناگوار ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ طبعاً رنجیدہ ہوتا ہے، اس لیے شیخ یہ تعلیم دیتے ہیں کہ جب تم کو شیخ سے فائدہ پہنچ رہا ہے اور آئندہ فائدہ پہنچنے کی اُمید ہے تو پھر اس کو کیوں چھوڑتے ہو، ہرگز اس کی صحبت سے کنارہ کشی نہ کرو۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبرؐ عداوت از خِرد　　　بہتر از مہرے کہ از جاہل رسد

پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ عداوت جو عقل کے ساتھ ہو، اس محبت سے اچھی ہے جو جاہل سے وقوع میں آئے۔ (۲/۱۸۴)

دوستی با مردمِ دانا نکوست　　　دشمنِ دانا بہ از نادان دوست

دوستی دانا آدمی کے ساتھ اچھی ہے، دانا دشمن نادان دوست سے اچھا۔ (۲/۱۸۴)

خود زضُعفِ عقلِ تو اے خَر بہا　　　ایں خَر پژ مُردہ گشت ست اژدہا

اے وہ شخص جو گدھے کے برابر ہے تیری عقل کی کمزوری میں یہ مریل خر (نفس) ایک (مہیب وخونخوار) اژدہا بن گیا ہے۔ (۲/۱۸۲)

سینتیسواں باب

دُنیا اور اس کی آفات

دُنیا کیا ہے؟

دُنیا کو دُنیا اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ ''دَنَایَۃ'' سے مشتق ہے اور ''دَنَایَۃ'' کے معنی کمینی شئے کے ہیں، لہٰذا دُنیا کو دُنیائے دَنِی (کمینی دُنیا) کہا جاتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دُنیا کے کمینہ پن کو درج ذیل الفاظ میں ظاہر کیا ہے جو اس کی حقیقت کی صحیح غمازی کرتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے کہ دُنیا آرائش و ابتلاء اور آزمائش کا مقام ہے۔ اس کے ظاہر کو مختلف ملمع سازیوں اور زینتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کی صورت کو موہوم خال و خط اور زلف و رخسار سے خوبصورت کیا گیا ہے۔ اسے دیکھنے سے شیرینی، تراوت اور تازگی کا خیال آتا ہے لیکن حقیقت میں عطر لگا ہوا مُردار، مکھیوں اور کیڑوں سے بھرا ہوا نجس خانہ اور زہر سے لبریز شکر ہے۔ اس کا باطن سراسر خراب اور اَبتر ہے۔ اس دُنیا پر فریفتہ ہونے والا دیوانہ اور مسحور ہے۔ اس کا گرفتار مجنوں اور فریب خوردہ ہے، جو اس کے ظاہر پر فریفتہ ہو گیا وہ نقصانِ ابدی کے ساتھ داغدار ہو گیا اور جس نے اس کی حلاوت پر نظر کی، دائمی ندامت اور شرمندگی اس کے حصے میں آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''دُنیا اور آخرت دو سوکنوں کی طرح ہیں، اگر ایک راضی ہو جائے تو دوسری ناراض ہے۔'' (دیکھیں ہماری تصنیف ''نشانِ منزل'' صفحہ ۱۱۲)

راقم الحروف کی کتاب ''نشانِ منزل'' اور ''حضورِ قلب'' کے علاوہ عنقریب شائع ہونے والی کتاب ''اسلام و

رُوحانیت اور فکرِ اقبالؒ'' میں دُنیا کے متعلق اچھی خاصی تفصیل دی گئی ہے۔ ضرورت مند احباب اس کا مطالعہ کریں۔
احادیث کی رُو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا کا بمقدارِ ضرورت موجود ہونا اسلام نے پسند فرمایا ہے۔ دین کو بھلا کر ضرورت سے زائد کی تمنا کرنا اور اس کے لئے سرگرداں رہنا، خدا اور اس کے رسول ﷺ سے دوری کا باعث بنتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ انسان اپنی عمر کے تمام حصوں میں کثرتِ مال کے لئے کوشاں رہتا ہے، حتیٰ کہ اِن خواہشات کو پورا کرتے کرتے ہی قبر تک پہنچ جاتا ہے اور مرنے کے وقت تک دنیا کا مال و دولت جمع کرنا اس کا مطمعِ نظر رہتا ہے (دیکھئے سورۃ التکاثر)۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''انسان کو عمر بھر خواہشات کی فکر رہتی ہے اور اُس کے مُنہ کو فقط قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس کی ساری ہمت دنیا کی طلب کے لئے ہو اس کی خدا کے نزدیک کچھ قدر و منزلت نہیں رہتی۔'' فرمایا: ''قیامت کے دن بہت سے نیک اعمال والے لوگ صرف اس لئے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے کہ جب وہ دُنیا کو دیکھتے تھے تو کود پڑتے تھے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے بعد دنیا آئے گی اور تمہارے ایمان کو اس طرح چاٹ کر کھا جائے گی جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ''یہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں، یہ اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں، اس کو وہ جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں، اس کے لئے وہ ظلم کرتا ہے جس کو علم نہیں، اس پر وہ حسد کرتا ہے جس کو کوئی سمجھ نہیں اور اس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے جس کو یقین نہیں۔''

دُنیا کی مذمت پر صوفیاء کے اقوال

حضرت بشر حافیؒ نے فرمایا کہ ''جو زندگی میں مال جمع کرتا رہا اُس کو اُس کے نیک اعمال فائدہ نہ دیں گے اور اگر مال کا جمع کرنا اچھا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ دنیا کو کیوں قبول نہ کر لیتے اور پیٹ پر پتھر کیوں باندھتے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میں اپنے انبیاء اور اولیاء کو زینتِ دنیا اور نعمتوں سے ایسے بچاتا ہوں جیسے گڈریا اپنی بکریوں کو بھیڑیوں سے بچاتا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ''حلال میں حساب ہے اور حرام میں عذاب۔''

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ''دنیا کے ناپسندیدہ ہونے کی علامت یہی کافی ہے کہ وہ نااہل لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔'' حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ ''دنیا کے ذلیل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آدمی اس کی محبت سے گنہگار ہوتا ہے۔'' ابوحازمؒ فرماتے ہیں کہ ''تھوڑی سی دنیا آخرت کے بہت سے کاموں سے باز رکھتی ہے۔'' ایک صوفی کا قول ہے کہ ''جو تھوڑی روزی پر راضی ہوا، اللہ تعالیٰ اُس کے تھوڑے اعمال سے راضی ہو جاتا ہے۔'' وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں کہ ''جس کا دل دنیا کی چیزوں سے خوش ہوتا ہے وہ عقلمندی سے دور ہے اور جس نے اپنی شہوات کو پاؤں تلے روندا تو شیطان اس کے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔'' حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ

نیکوکاروں کو دُنیا سے دور رکھتا ہے تاکہ اُن کی آزمائش کرے اور دشمنوں کو وسعت دیتا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ''کسی کے سامنے تیری محتاجی اس کی غلامی قبول کرنے کے برابر ہے اور جس سے تو بے نیاز ہے، تو اُسی کا ہم نظیر اور ہم مثل ہے اور مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ بے نیاز رہے۔'' ایک دفعہ حضرت محمد بن واسعؒ سوکھی روٹی کھاتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے کہ پرہیزگاری اختیار کرو کہ آج تک کسی بزرگ یعنی پرہیزگار کو بھوکا مرتے نہیں دیکھا گیا۔ ایک شخص نے دیکھا کہ حضرت ابوالدرداءؓ کھجوروں کی گٹھلیاں چن رہے تھے (جب ایک شخص نے تعجب کا اظہار کیا تو) آپ نے فرمایا ''معیشت پر نگاہ رکھنے والا یقیناً مردِ فقیہ ہوتا ہے'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''میانہ روی رکھو کیونکہ یہ اقدام بذاتِ خود آدھی روزی کی حیثیت رکھتا ہے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''جاہ و مال کی بدولت دل میں منافقت اس طرح پیدا ہو جاتی ہے جیسے پانی سے سبزہ اُگ آتا ہے۔'' مولانا رومؒ نے ایک حدیث کا ترجمہ کیا ہے کہ مال و نعمت کی کثرت سے دل سے سوز و گداز نکل جاتا ہے یعنی دینار کی محبت سے ناز پیدا ہو جاتا ہے۔ صوفیہ فرماتے ہیں کہ تمام عبادات کا نچوڑ یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی قلبِ انسانی پر غالب ہو جائے اور ماسویٰ اللہ سے بے نیاز ہو جائے اور یہ بات (الاماشاء اللہ) ایک مالدار کے لئے ناممکن ہے۔ صوفیہ کا قول ہے کہ مال کی کفایت تریاق ہے، زیادتی زہر ہے، ضرورت سے زیادہ کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے میں ہلاکت ہے۔ مال سے ایک دم خالی ہو جانا بھی ٹھیک نہیں کیونکہ ایسا شخص اگر صاحبِ فقر نہ ہو تو کفر تک پہنچ جاتا ہے۔

آثار میں ہے کہ جب سب سے پہلے درہم اور دینار آیا تو ابلیس نے انہیں ہاتھ میں لیا، آنکھوں سے ملا، بوسہ دیا اور کہا کہ جو کوئی تجھے دوست رکھے گا میرا غلام رہے گا۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے فرمایا کہ درہم اور دینار تو بچھو ہیں اور جب تک اس کے کاٹے کا منتر معلوم نہ ہو تو اُس وقت تک اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ فرمایا اس کا منتر یہ ہے کہ مال کو حلال طریقے سے کمانا اور شریعت کے احکام کے مطابق خرچ کرنا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار چاندی کے ایک سکے کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کہا کہ تو وہ چیز ہے کہ جب تک میرے ہاتھ سے باہر نہ ہو جائے، مجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن   نے قماش و نقرہ و فرزندان و زن

دنیا کیا ہے؟ خدا کی یاد سے غافل ہونا، نہ کہ دنیا کا ساز و سامان اور نہ ہی پیسہ و چاندی اور نہ ہی بچے اور بیوی۔

(۱/۱۲۵)

جس نے دُنیا سے دل لگایا، وہ خدا سے غافل ہو گیا

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دنیا ایک ایسی چیز ہے کہ جس نے اس سے دل لگایا، وہ خدا کی یاد سے غافل ہوا۔ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا کا ساز و سامان یعنی سونا، چاندی، بیوی، بچے وغیرہ دنیا نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت دنیا کے زمرے میں آ جاتے ہیں جس وقت آدمی ان کی وجہ سے خدا کی یاد سے غافل ہو جائے۔ ایسی حالت میں یہ تمام چیزیں دنیا میں

شمار ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی واضح طور پر ایسی دنیا کی زندگی سے گریز کرنے کے لئے بارہا فرمایا ہے، جس طرح درج ذیل آیتِ مبارکہ میں فرمایا ہے۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْکَانُوْ یَعْلَمُوْنَ. (العنکبوت:۶۴)
اور دارِ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے (جسے موت نہیں) کاش! وہ جانتے۔

اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ اُس عالم کے در و دیوار اور صحن، پانی اور پیالہ، پھل اور درخت سب زندہ ہیں اور یہ سب بات کرنے والے اور بات سننے والے ہیں۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ "اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّطَالِبُھَا کِلَابٌ"، یعنی دنیا مُردار ہے اور اس کے طلبگار کُتّے ہیں۔ اگر آخرت کے لئے ابدی زندگی نہ ہوتی تو آخرت بھی مُردار ہوتی۔ مُردار کو اس کے مُردہ ہونے کی وجہ سے مُردار کہتے ہیں، نہ کہ بدبو کی وجہ سے۔ قرآن مجید میں بارہا مرتبہ اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے، اس میں دل نہ لگاؤ اور جو ابدی زندگی ہے اس کی طرف توجہ دو جسے آخرت کہتے ہیں اور آخرت ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے بلکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ" یعنی دنیا کی زندگی سوائے دھوکے اور فریب کے کچھ بھی نہیں (آل عمران:۱۸۵)، لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس زندگی کی طرف توجہ دے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے قائم رکھنا ہے، لیکن انسان ہے کہ اس دنیا کی رنگینیوں میں دل لگا بیٹھا ہے اور اس دنیا کو ایسا گھر سمجھ بیٹھا ہے، گویا وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔ اس موضوع پر آپ نے بھی اپنا کلام پیش کیا ہے جس میں مولانا رومؒ نے دنیا اور آخرت کا تقابل کرکے آخرت کی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

آں جہاں چوں ذرّہ ذرّہ زندہ اند نکتہ دانند و سُخن گویندہ اند

جب کہ اُس جہاں کا ذرّہ ذرّہ زندہ ہے، وہ نکتہ کو سمجھنے والے اور بات کرنے والے ہیں۔ (۳۶۱/۵)

اس مردہ جہاں میں مومن کو راحت نہیں

در جہاں مُردہ شاں آرام نیست کایں علَف جز لائقِ انعام نیست

مردہ جہاں میں اُن کو راحت نہیں ہے، کیونکہ یہ چارہ چوپایوں ہی کے لائق ہے۔ (۳۶۱/۵)

مولاناؒ کے درج بالا شعر سے مراد یہ ہے کہ یہ دنیا مُردہ ہے، یہاں انسان کو راحت نہیں ہے کیونکہ یہ اس کا اصلی مقام نہیں ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس دنیا میں دل لگا لیتے ہیں وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بے مقصد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں فرمانِ رسول اللہ ﷺ ہے کہ "یہ دنیا مومن کے لئے قیدخانہ ہے" یعنی مومن کا اصل ٹھکانہ آخرت ہے، اسی لئے مومن کو اس دنیا کی زندگی میں طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مومن کی مجلس اور وطن چمن ہے

ہر کرا گلشن بُوَد بزم و وطن   کے خورد اُو بادہ اندر گولخن

جس شخص کی مجلس اور وطن چمن ہو، وہ بھٹی میں شراب کب پئے گا؟ (۳۶۱/۵)

اس شعر میں مولانا رومیؒ نے یہ واضح کیا ہے کہ کوئی ناکارہ چیز کو کارآمد چیز پر کب ترجیح دے گا اور کوئی عقلمند ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا کیونکہ ہر شخص اپنے فائدے کی چیز کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی لئے مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کی مجلس اور وطن چمن ہو وہ کبھی بھٹی کی شراب پینا گوارا نہیں کرے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کا ٹھکانہ جنت ہو وہ کب جہنم کے گڑھے کو پسند کرے گا کیونکہ مومن کا ٹھکانہ جنت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے آخرت میں تیار کر رکھی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی مومن جہنم کی راہ اختیار کرے تو افسوس ایسے مومن پر جو اپنا ٹھکانہ زبردستی جہنم بنا رہا ہے، لہٰذا مومن کو چاہیئے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں اپنی آخرت کی فکر کرتے ہوئے اپنے اعمال درست کرے اور اس دنیا کے رنگین نظاروں میں اٹکے ہوئے اپنے دل کو آخرت کی طرف توجہ دلائے۔

ترکِ دنیا ہر کہ کرد از زہدِ خویش

(دُنیا اس کی ہے جو اسے اپنے زُہد سے تَرک کر دے)

حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔'' (مشکوٰۃ شریف) اس لئے مومن کے لئے اس جہاں کے گمراہ کُن تعلقات سے علیحدگی اچھی ہے۔

دنیا کو تَرک کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ دنیا کے قید خانہ میں سرنگ لگا دے اور نکل جائے۔ دنیا میں سرنگ لگانے سے مراد یہ ہے کہ قیودِ دنیا سے دُور ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کے متعلقات سے علیحدہ کر لے، جس شخص نے دنیا ترک کر دی گویا اس نے اپنے آپ کو نجات دی۔ ایسی دنیا اختیار کرو جو آخرت اور حق تعالیٰ سے دور نہ کرے، وہ شخص علائقِ دنیا کے باوجود دنیادار نہیں بلکہ دین دار ہے۔ یہ دنیا تو تیرے لئے بلائے جان ہے اور اس دنیا کے محل اور باغات تیرے لئے قید خانہ ہیں، لہٰذا تو اس مصیبت سے جان آزاد کر لے۔ اس موقع پر مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

ایں ترا و باغِ تو زندانِ تُست   ملک و مالِ تو بلائے جانِ تُست

یہ تیرے محل اور باغ تیرا قید خانہ ہیں، تیرا ملک و مال تیرے لئے بلائے جان ہیں۔ (۸۴/۱)

قرآن پاک میں ہے ''اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ وَّاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ۔'' بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جس کے پاس اجرِ عظیم ہے۔ (التغابن:۱۵)

ترکِ دُنیا ہر کہ کرد از زہدِ خویش   بیش آمد پیشِ اُو دنیا زپیش

جس شخص نے اپنے زُہد سے دُنیا ترک کر دی، دنیا (خود) اس کے آگے حاضر ہوتی ہے اور (پہلے سے زیادہ) (۷۹/۱)

مالِ دُنیا نے انسان کو غافل اور مغرور بنا دیا ہے

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دُنیا کی زندگی میں کفار و مشرکین کو جاہ و جلال اور عروج و اقبال کے سامان دیتا ہے۔ مثنوی میں مولاناؒ نے ایک شیر کا ذکر کیا ہے کہ وہ بھیڑیے اور لومڑی کے ساتھ شکار کو نکلا اور پھر اس نے بھیڑیے سے پوچھا کہ شکار کردہ جانور گائے، بکری اور خرگوش کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔ بھیڑیے نے کہا کہ حضور گائے آپ لے لیں اور بکری مجھے دے دیں اور لومڑی کو خرگوش دے دیں۔ شیر یہ بات سن کر کہ وہ بکری اپنے لیے رکھ کر مجھے گائے کھانے کو کہہ رہا ہے، ایک دم غصے میں آ گیا مگر اپنے چہرے پر اس نے مسکراہٹ ظاہر کی پھر یکایک اس کو پنجہ مار کر ہلاک کر دیا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ کافروں کو جب مال و دولت ملتی ہے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہے، حالانکہ اس نے کافروں کو سخت عذاب دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۳۱ میں فرمایا ہے ''اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھیے، ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے کافروں کے چند گروہوں کو، یہ محض زیب و زینت ہیں دُنیاوی زندگی کی اور انہیں اس لیے دی ہیں تاکہ ہم آزمائیں انہیں ان سے اور آپ کے ربّ کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔''

اگر ایک شخص ہر دم صغیرہ و کبیرہ گناہوں میں مصروف رہتا ہے اور ہر بُرائی ہونے کے باوجود وہ دولت مند اور خوش حال ہے تو یہ اس کے لیے استدراج ہے ؎

مالِ دُنیا شد تبسّم ہائے حق کرد مارا مست و مغرور و خَلَق

اس طرح دنیا کا مال (بلاتشبیہ) اللہ تعالیٰ کی مسکراہٹیں ہیں، جنہوں نے ہم کو مست غافل و مغرور اور ناکارہ بنا دیا ہے۔ (۱/۳۱۸)

فقر و رنجوری بہشت است اے سند
(فقیری اور بیماری انسان کے لئے بمنزلہ بہشت ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کی بھول بھلیوں میں پڑ کر دین سے غافل وہی شخص ہوتا ہے جو دنیا کا طالب ہو، لیکن جو شخص دنیا سے متنفر ہو اور فقر و درویشی پر کامل ہو اس کے لئے صبر و قناعت کی مشکلات نعمتہائے جنت بن جاتی ہیں اور پھر وہ دنیوی عجائبات کے دام سے، جس کو قدرت بطورِ استدراج اہلِ عصیاں کے اِبتلا کے لئے نصب کرتی ہے اور جسے تبسم سے تعبیر کیا جاتا ہے، صاف بچ جاتا ہے اور یہی مطلب پہلے ان کلمات کا ہے کہ ان کے فقر و درویشی کے سبب سے وہ تبسم کے جال کو اُٹھا لیتا ہے اور تم دنیا کے دھوکے میں نہیں آتے ؎

فقر و رنجوری بہشت ست اے سَنَد کاں تبسم دامِ خود را بر کَنَد

(اے معزّز آدمی) فقیری اور بیماری تمہارے لیے بمنزلہ بہشت ہے کیونکہ وہ تبسم اپنا جال اکھیڑ لیتا ہے۔ (اور تم دنیا

کے دھوکے میں نہیں آتے)۔ (۳۱۸/۱)

جس دل میں خدا کی محبت گھر کر جائے اس پر دُنیا کی محبت کا تسلّط نہیں ہوتا

جب دل میں درویشی کی ہوا سمائی ہو تو آدمی دریائے جہاں کی سطح پر ساکن رہتا ہے اور جس شخص کے دل میں اللہ کی محبت و معرفت نے گھر کر لیا اور وہ اس مسرتِ حقیقی سے مسرور ہے، اس پر حبِّ دنیا کا کبھی تسلط نہیں ہو سکتا۔ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

کش دل ازنفخِ الٰہی گشت شاد   آب نتواند مرورا غوطہ داد

جس کا دل خدائی پھونک سے خوشحال ہو گیا، اس کو (یہ) پانی کبھی غوطہ نہیں دے سکتا۔ (۱۲۶/۱)

زاں سلیماں خویش جز مسکین نخواند

(ملک و مال نیکوں کے لئے فخر کا باعث نہیں ہوتا)

حضرت سلیمان علیہ السلام جن و اِنس کے بادشاہ اور بحر و بر کے فرمانروا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مسکین و خاکسار کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں غرورِ مال و جاہ اور حبِّ شوکت و حشمت کی جگہ نہ تھی، جیسے دوسرے بادشاہوں کے دل پر تکبّر کے جذبات قابض ہوتے ہیں اور جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو مسکین فرمایا کرتے تھے اور یہ بات تو قرآن مجید کے ان کلمات سے ثابت ہے کہ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ یعنی از جانب سلیمان اور یہ اس مکتوب کا عنوان ہے، جو آپ نے بلقیس ملکہ سبا کے نام بھیجا تھا۔ اس میں کوئی شاہانہ لقب استعمال نہیں کیا بلکہ ایک منکسر المزاج اور نفس کش درویش کی طرح اپنا نام لکھنے پر کفایت کی اور یہ امر ایک پُرعظمت بادشاہ سے ظہور پانا اس کے اپنے لئے لقب مسکین و خاکسار استعمال کرنے سے کم نہیں۔ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

زاں سلیمانؑ خویش جز مسکیں نخواند   چوں کہ مال و ملک را از دِل براند

چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملک و مال کی محبت کو دل سے نکال دیا تھا، اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو (باوجود اس قدر دولت و حشمت کے) بجز مسکین کے (کسی لقب سے) ملقب نہیں کیا۔ (۱۲۶/۱)

نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے

مال و دولت اور لذاتِ دنیا مذموم نہیں ہیں بلکہ جب تک وہ دین سے مانع نہ ہوں تو اچھے ہیں، اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ"، یعنی اللہ تعالیٰ پرہیزگار مال دار بندے کو دوست رکھتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

مال کو دل میں جگہ نہیں بنانے دینی چاہیئے کیونکہ جس طرح کشتی کے اندر پانی چلا جائے تو کشتی ڈوب جاتی ہے

اور اگر پانی باہر رہے تو اس پر کشتی تیرتی رہتی ہے، اسی طرح جب یہ مال دل میں چلا جائے یعنی مال کی محبت دل میں بس جائے تو دل خدا کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے، اگر مال کی محبت دل میں نہ بسائی جائے تو دل نیکی کی طرف راغب بھی ہوگا اور خدا کی یاد سے غافل بھی نہیں ہوگا۔ بُری دُنیا سے مراد یہ ہے کہ ہر ایسی دنیا جس کو حاصل کرنے سے آدمی اللہ کی یاد سے غافل ہو، وہ دنیا آدمی کے لئے آخرت میں ذلّت کا باعث ہے اور ایسی دنیا جس کو حاصل کرنے سے آدمی خدا کی یاد سے غافل نہ ہو تو وہ دنیا آدمی کے لئے ذریعہ نجات بن جائے گی، الغرض دنیا کو دل میں جگہ نہ دو، ورنہ دل خدا کی یاد سے غافل ہو جائے گا۔

مال را کز بہرِ دیں باشی حمول　　　　نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ خواندش رسول

جس مال کو تم دین کے لئے اپنے پاس رکھو تو اس کے حق میں جناب رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ "نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ" یعنی نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے۔ (۱۲۶/۱)

قرآن پڑھو رزقِ حلال آئے گا

قرآن میں رزقِ حلال کا بار بار ذکر آیا ہے۔ ایک حدیث شریف کا یہ مفہوم ہے کہ عبادت کو اگر دس حصوں میں تقسیم کیا جائے تو ایک حصہ نماز و روزہ اور دیگر عبادات کے ادا کرنے میں ہے اور باقی نو حصے اکلِ حلال یعنی حلال رزق کمانے کے ہیں۔ مولانا رومیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص آتا اور دستِ سوال دراز کرتا تو آپ اس کو کچھ نہ کچھ ضرور دے دیتے۔ ایک بار حضرت نے فرمایا کہ اے شخص! یہ بتاؤ کہ خدا کا دروازہ اچھا ہے یا عمر کا؟ اس نے کہا کہ دروازہ تو خدا کا ہی بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور قرآن پڑھو شاید تمہیں کوئی راستہ نظر آئے۔ اس کے بعد وہ شخص حضرت کے پاس آنا بند ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن اس کا پتہ چلانے کے لئے اس کے گھر گئے اور پوچھا کہ وہ اب مانگنے کے لئے کیوں نہیں آتا۔ اس نے کہا کہ آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ جاؤ اور قرآن پڑھو، شاید تمہیں کوئی راستہ ملے، چنانچہ میں نے قرآن پڑھا، اب مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں، گھر بیٹھے ہی سب کچھ ملتا ہے۔ پوچھا، تم نے قرآن میں کیا پڑھا تو اس نے کہا کہ میں نے قرآن کھولا تو اس میں یہ آیت نظر آئی "وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ" اور آسمان میں ہے تمہارا رزق اور وہ ہر چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (الذاریات:۲۲) چنانچہ اس دن سے میں نے آسمان والے سے رشتہ جوڑ لیا اور اب مجھے ہر چیز مل جاتی ہے۔ اس کی یہ بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت روئے۔ مولاناؒ نے اس واقعہ کو مثنوی میں محفوظ کیا ہے۔

رزقِ حلال دل کی نورانیت میں اضافہ کرتا ہے

حدیث شریف میں آیا ہے "طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ" یعنی حلال روزی کی تلاش دیگر

فریضوں کے بعد فرض ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

جو تیل میں آتے ہی ہمارا دیا گل کر دے، اس کو پانی کہو کیونکہ وہ دیئے کو گل کر دیتا ہے۔ حرام لقمہ انوارِ قلب پر وہی اثر رکھتا ہے جو چراغ کے لئے پانی، پس جو روزی موتِ قلب کا باعث ہو وہ روزی نہیں، زہر ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ جسم بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا، جس نے حرام غذا سے نشوونما پائی ہو اور جس جسم نے حرام غذا سے نشوونما پائی ہو، اس کے لئے دوزخ بہتر ہے۔'' (مشکوٰۃ شریف)

علم وحکمت اور عشق و رقّت حلال لقمے سے پیدا ہوتے ہیں، جس لقمے سے تم حسد، فریب، جہل اور غفلت پیدا ہوتی دیکھو تو اس کو حرام سمجھو، حرام لقمہ کھانا انسان کو دیگر معاصی پر آمادہ کرتا ہے۔ حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں جو شخص حرام کھاتا ہے اس کے اعضاء آمادۂ عصیاں ہو جاتے ہیں، خواہ وہ خود چاہے یا نہ چاہے، خواہ اس کو معلوم ہو یا نہ ہو اور جس شخص کی غذا حلال ہے، اس کے اعضاء اطاعت کرتے ہیں اور ان کو نیکی کی توفیق دی جاتی ہے۔ (احیاء العلوم) یعنی جس کی غذا حرام ہے، وہ چاہنے کے باوجود بھی نیک کام نہیں کر سکتا اور جو حلال روزی کھاتا ہے تو وہ نیکی نہ کرنے کا ارادہ کرے تب بھی اس کا دل نیکی کی طرف راغب ہونے لگے گا۔

مولانا رومیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

لقمۂ کاں نور افزود و کمال ۔۔۔ آں بود آوردہ از کسبِ حلال

جس لقمے نے (دل میں) نور اور کمال کو ترقی دی ہے، وہ کسبِ حلال سے پیدا کیا ہوا لقمہ ہوتا ہے۔ (۱/۱۸۷)

اچھے نتیجے کا انحصار اچھے عمل پر ہے

حلال یا حرام جیسا کھاؤ گے، ویسا ہی اثر پاؤ گے۔ پاک وطیّب خوراک کا ثمرہ اچھا ملے گا اور حرام و ناپاک غذا کا نتیجہ خراب ہوگا، نہ عبادت کام آئے گی نہ دُعا قبول ہوگی۔ اس کتاب کا صفحہ ۴۴۹ بھی مطالعہ کریں کئی مرتبہ قرآن کی تلاوت اور تہجد کی نماز ختم ہو جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''جو شخص ایک کپڑا دس درہم میں خریدے اور اس میں ایک درہم حرام شامل ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی کوئی نماز قبول نہیں کرے گا جب تک وہ اس کپڑے کو پہنے گا۔'' (مشکوٰۃ شریف) صحیح مسلم شریف کی روایات میں ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ ''ایک آدمی لمبا سفر کرتا ہے جو پراگندہ اور غبار آلودہ ہوتا ہے، اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر کہتا ہے، اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار! حالانکہ اس کا کھانا حرام پوشاک حرام اور حرام مال سے پرورش پائی تو اس کی دُعا کہاں قبول ہوگی۔'' (مشکوٰۃ شریف)

کھانے کا لقمہ تخم ہے اور اس کا پھل خیالات ہیں۔ لقمہ دریا ہے اور اس کے موتی خیالات ہیں، جیسا لقمہ ویسے خیالات۔ حلال لقمے سے تمہارے پاک دل میں حضوری اور تمہاری باطنی آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔

حلال روزی کے کھانے سے قوائے مدرکہ باطنی میں ادراکِ صحیح اور نورِ معرفت پیدا ہوتا ہے۔ مولانا رومؒ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ؎

ہیچ گندم کاری و جو بر دہد ‌ ‌ ‌ ‌ دیدۂ اسپے کہ کرّہ خر دہد؟

کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ تم گیہوں بوؤ اور جو پیدا ہو، بھلا تم نے کبھی ایسی گھوڑی دیکھی، جو گدھے کا بچہ دے۔ (۱/۱۸۷)

رزقِ حلال سے اخلاقِ رذیلہ دُور ہوتے ہیں اور اوصافِ حمیدہ پیدا ہوتے ہیں

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جس لقمے کے کھانے کے بعد انسان میں علم و حکمت، معرفت و کمال، صحت مند فکر اور عشقِ الٰہی پیدا ہو تو سمجھ لو کہ یہ رزقِ حلال کی برکت سے ہے۔ معرفت کا سمندر، نایاب موتی اور جذبۂ خدمت سب حلال روزی کی وجہ سے ہاتھ آتے ہیں، جب کہ غیر حلال یعنی حرام رزق سے بے حیائی، جہل و غفلت کے آثار نمودار ہوتے ہیں ؎

لقمۂ کاں نور افزود و کمال ‌ ‌ ‌ ‌ آں بود آورد از کسب حلال

جس نوالے سے ضمیر روشن اور کمال حاصل ہو، ایسا لقمہ یقیناً حلال کمائی سے ہوتا ہے۔ (۱/۱۸۷)

چوں ز لقمۂ تو حسد بینی دوام ‌ ‌ ‌ ‌ جہل و غفلت زاید آنرا داں حرام

جس لقمے سے حسد، حرص، جہالت اور غفلت بڑھتی دیکھو تو ایسی غذا کو حرام جاننا چاہیے۔ (۱/۱۸۷)

علم و حکمت زاید از لقمہء حلال ‌ ‌ ‌ ‌ عشق و رقت زاید از لقمہ حلال

دانشمندی، علم، عشق اور دلی لطافت حلال روزی سے حاصل ہوتی ہے۔ (۱/۱۸۷)

لقمہ تخم ست و برش اندیشہ ہا ‌ ‌ ‌ ‌ لقمہ بحر و گوہرش اندیشہ ہا

لقمہ بیج ہے اور صحت مند فکر اس کا پھل ہے، غذائیت کا سمندر اور نایاب موتی فکرِ صالح ہے۔ (۱/۱۸۷)

زاید از لقمۂ حلال اندر دہاں ‌ ‌ ‌ ‌ میل خدمت عزم رفتن آں جہاں

حلال روزی سے دل جذبۂ خدمت سے سرشار ہوتا ہے اور دنیا جہاں سے جلد فارغ ہونے کو پسند کرنے لگتا ہے۔ (۱/۱۸۸)

رزق آسمان سے آتا ہے اس لئے آسمان کے مالک سے ہی رزق طلب کرو

اللہ تعالیٰ نے اپنی عطا اور قدرتِ محض سے تمام مخلوقات کے رزق کا ذمہ لیا ہے، اس لیے اسی سے رزق کو طلب

کرو۔ مستی اور حیرت اللہ تعالیٰ سے ہی طلب کرو، نہ کہ بھنگ اور شراب سے۔ اصل دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، جو لوگ آسمان والے سے رشتہ قائم کر لیتے ہیں وہ کسی بھی مشکل سے دوچار نہیں ہوتے۔

تا بدانی اصل اصلِ رزقِ اوست　　تاہم اُورا جوید آنکو رزق جوست

تا کہ تمہیں معلوم ہو کہ رزق کا اصل مبدأ وہی تعالیٰ شانہٗ ہے تا کہ رزق کو طلب کرنے والا اسی سے طلب کرے۔ (۱۵۷/۵)

رزق از وَے جو مجو از زید و عمر　　مستی از وے جو مجو از بنگ و خمر

رزق اسی (اللہ) سے طلب کرو، زید و عمر سے طلب نہ کرو، حیرت اور مستی اسی سے تلاش کرو، بھنگ اور شراب سے تلاش نہ کرو۔ (۱۵۷/۵)

منعمی زو خواہ نے از گنج و مال　　نصرت از وَے خواہ نے از عم و خال

خوشحالی اس سے چاہو، نہ کہ خزانے اور مال سے، مدد اس سے چاہو، نہ کہ چچا اور ماموں سے۔ (۱۵۷/۵)

بلکہ شکر حق کن و ناں بخش کن　　کہ نگشتی در جوالِ او کہن

بلکہ حق تعالیٰ کا شکر کرو اور (شکرانے میں مساکین کو) روٹیاں بانٹو کہ تم اس کی بے فیض دوستی کے تھیلے میں پڑے بوڑھے نہیں ہو گئے۔ (۱۵۹/۵)

تا مسبّب بیند اندر لامکان　　ہرزہ بیند جہد و اسباب و دکان

تا کہ مسبّب کو لامکان کے اندر دیکھ لو اور اس کی قدرت کے آگے اپنی کوشش اور کمائی اور دُکان کو ہیچ سمجھو۔ (۱۶۲/۵)

اَڑتیسواں باب

جبر و قدر

ہیچ عاقل مر کلوخے را زند
(کوئی عاقل پتھر کو نہیں مارتا)

قدر اور جبر پر راقم الحروف نے ایک مکمل کتاب "مسئلہ تقدیر" کے نام سے لکھی ہے، جو جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔ یہاں مولانا رومیؒ کے چند اشعار اس روشنی میں دیئے جا رہے ہیں کہ انسان کو خدا کی طرف سے بااختیار بنایا گیا ہے۔ آپ نے اس موضوع پر بہت سے اشعار لکھے ہیں مگر ان کے کلام کی ترجمانی بغیر اشعار کے کی جا رہی ہے اور محض چند اشعار بغایتِ نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو مکلّف بنایا گیا ہے، اسی لیے اس کو احکام دیئے گئے ہیں۔ آدمی کو کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ تو اُڑ! یا یہ کون کہتا ہے کہ اے اندھے آ مجھے دیکھ! پتھر کو ہرگز کوئی یہ نہیں کہتا کہ تو ادھر کیوں نہیں آتا، مٹی کے ڈھیلے کو کب کوئی کسی کام کرنے کا حکم دیتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ معذور اور اندھے پہ کوئی تنگی نہیں، پتھر کو کوئی یہ نہیں کہتا کہ تو دیر سے کیوں آیا ہے اور لکڑی سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ تو نے مجھے ضرب کیوں لگائی (البتہ بچوں کے سامنے لکڑی یا کسی ضرب لگانے والی چیز کو ایسا کہہ دیتے ہیں)، غرضیکہ حکم، ممانعت، ناراضگی، انعام اور عتاب اہلِ اختیار کے سوا کسی کو نہیں دیئے جاتے۔ فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی حسن کا اعلیٰ نمونہ سامنے نہیں آ جاتا انسان اس کو چاہنے

کی کوشش نہیں کرتا۔ ہر جذبہ کسی محرک تحریک سے ظہور میں آتا ہے اگرچہ اس جذبہ کا وجود انسان کے دل میں ہر وقت رہتا ہے، مثال کے طور پر مولاناؒ نے فرمایا کہ عورتوں نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو اُنگلیاں کاٹ لیں، حالانکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا وجود اس سے پہلے بھی موجود تھا۔ کسی عورت کو کوئی مرد دیکھتا ہے تو اس سے محبت وجود میں آتی ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ نیکی کے لیے انسان کے دل میں فرشتہ رہتا ہے، جو اس کو نیکی کا مشورہ دیتا ہے اور بدی کے لیے شیطان اس کو بہکاتا ہے۔ شیطان انسان کو مرغوباتِ نفسانیہ کی دعوت دیتا ہے تو انسان کے اختیار کی طاقت کام کرنے لگتی ہے۔ فرشتہ دل میں بلند غلغلے پیدا کرتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں نیکی اور بُرائی کی خصلتیں سو رہی ہوتی ہیں، جو فرشتے اور شیطان کی طاقت سے جاگ اُٹھتی ہیں۔ بندہ اُس کے مطابق کام کرتا ہے، جس کا غلبہ زیادہ ہو۔ بعض احادیث سے ظاہر ہے کہ بندے کے ساتھ فرشتے مامور ہیں جو انسان سے اس کی آفات کو دور کرتے ہیں، چنانچہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی بندے کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو اس کو شیاطین لے جائیں (الجوھرۃ النیرۃ)۔ یہ دونوں طاقتیں غیب کے پردے میں پیش کی جاتی ہیں اور اگر یہ پردہ اُٹھا دیا جائے تو تم ان کی صورتوں کو دیکھ لو (جس طرح آنکھ والے نظرِ بصیرت سے دیکھ لیتے ہیں) جو نہیں دیکھ سکتے وہ اس کے منکر ہیں اور واضح دلائل کے باوجود نہیں مانتے۔

ہیچ گوئی سنگ را فردا بیا ور نیائی من دھم بد را سزا

بھلا کبھی تم پتھر کو حکم دیتے ہو کہ کل کو حاضر ہو اور اگر نہیں آئے گا تو میں بُرے کو سزا دوں گا۔ (۳۰۵/۵)

ہیچ عاقل مر کلوخے را زند ہیچ باسنگے عتابے کس کند

کیا کوئی عقلمند کسی ڈھیلے کو مارتا ہے، کیا کوئی آدمی کسی پتھر کو ملامت کرتا ہے؟ (ہرگز نہیں)۔ (۳۰۵/۵)

پس فرشتہ و دیو گشتہ عرضہ دار بہرِ تحریکِ عُروقِ اِختیار

غرضیکہ فرشتہ اور شیطان اختیار کو رگوں کی حرکت میں لانے کے لیے نیکی اور بدی کو پیش کر دیتے ہیں۔ (۳۰۳/۵)

می شود زالہامہا وَ وَسوسہ اختیارِ خَیر و شرّت دہ کسہ

ملائکہ کے الہامات اور شیاطین کے وسوسے سے تیرا نیکی اور بدی کا اختیار دس بندوں کے اختیار کے برابر قوی ہو جاتا ہے۔ (۳۰۳/۵)

وقتِ تحلیلِ نماز اے بانمک زاں سَلام آورد باید بَر ملک

اے جوان ملیح! نماز کو ختم کرتے وقت تمھیں فرشتوں کو سلام کرنا چاہیے۔ (۳۰۳/۵)

کہ زالہام و دعائے خوبِ تاں اختیارِ ایں نمازم شُد رَواں

یعنی اے فرشتو! تمہارے الہام اور نیک دُعا سے اس نماز کو مکمل کرنے پر میرا اختیار ختم ہو گیا۔ (۳۰۳/۵)

انبیاء در کارِ دُنیا جبری اند
(انبیاء دُنیا کے کاموں میں مجبور ہوتے ہیں)

تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جس میں انسان کسی کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسری وہ جس میں انسان مجبورِ محض ہے اور کسی کام کرنے کی قدرت رکھنے کے بعد بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا کہ قدر اور جبر میں کیا فرق ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ! وہ کھڑا ہو گیا۔ فرمایا: ایک ٹانگ اُٹھا لو تو اس نے اُٹھا لی، پھر فرمایا: دوسری ٹانگ بھی اُٹھا لو۔ اس نے کہا کہ یہ تو نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ فرمایا: ایک ٹانگ کا اُٹھانا قدر ہے (کیونکہ اس پہ تمہیں قدرت دی گئی ہے) اور دوسری ٹانگ تم نہیں اُٹھا سکتے تو یہ جبر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ انسان کرسکتا ہے وہ تو کرے اور اللہ تعالیٰ انسان سے یہی حساب لے گا کہ تم نے وہ کام کئے، جو کرسکتے تھے اور جو کام کسی انسان کی سکت سے باہر ہے اس کے متعلق اس سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ (حقیقت تو یہ ہے کہ انسان جو ٹانگ اُٹھا سکتا ہے وہ بھی اللہ کی توفیق سے ہی اُٹھاتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ بھی نہ اُٹھا سکتا)۔

ابن بطوطہ نے ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ایک بزرگ کے مکان کے باہر کچھ لوگ دریوں پر بیٹھے تھے (غالباً کسی کی دعوت کے بعد) باہر بیٹھے ہوئے لوگ قسمت کے بارے میں گفتگو کرنے لگے تو وہ بزرگ آئے اور کہنے لگے کہ تم جبر و قدر پر کیا بات کر رہے ہو۔ تم لوگ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے، تم تو زمین سے اُٹھنے کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور اگر رکھتے ہو تو اُٹھ کے دکھاؤ!۔ کہتے ہیں کہ وہ لوگ تین دن تک وہیں بیٹھے رہے اور اُٹھنے کی قدرت ان سے سلب کر لی گئی۔ اس بات کو ملاحظہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے معافی مانگی تو پھر کہیں اُٹھنے کے قابل ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اُٹھنے بیٹھنے کی قوت بھی خدا کی ہی طرف سے ہے۔

قسمت کے متعلق مفسرین کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "میں جب کوئی کام کرنا چاہتا ہوں تو اس کے متعلق کہتا ہوں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔" "اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ" یعنی اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی کام کے لیے تو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ (یٰس:۸۲) مفسرین نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور پھر اس کام کے ہونے یا نہ ہونے کا ارادہ بھی کرتا ہے، اگر ارادہ کرے تو وہ کام ہو جاتا ہے، ورنہ نہیں ہوتا۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ اگر اللہ کا ارادہ نہ ہو تو قدر بھی جبر کے ہی معنی رکھتی ہے۔ مولانا کا کلام "جبر کا مفہوم" اسی بیان کے بعد دے دیا گیا ہے۔ انبیاء دنیا کے کاموں میں جبری ہیں کہ ان سے بُرے کام صادر نہیں ہو سکتے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

انبیاء در کارِ دنیا جبری اند   کافراں در کارِ عقبیٰ جبری اند

(پس) انبیاء علیہم السلام تو دنیا کے معاملات میں جبری (تارکِ اسباب) ہیں اور کفار آخرت کے کاموں میں جبری

(تارکِ اسباب) ہیں۔ (۹۳/۱)

مسئلہ جبر و قدر

عقائد کے مسائل اکثر ایسے ہیں کہ ان میں کچھ دقت اور اشکال پیش آتی ہیں اور ان کو حل کرنا آسان نہیں، مثلاً روح، معاد، جزا و سزا قطعاً واضح نہیں لیکن جبر و قدر کا مسئلہ ایسا پُر پیچ ہے کہ مذہبی حیثیت اس سے الگ بھی کر لی جائے تب بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا، اسی طرح ایک ملحد اس مسئلہ کا آزادانہ طریقہ سے فیصلہ کرنا چاہے تب بھی نہیں کرسکتا۔ جبر و قدر میں اگر یہ پہلو اختیار کیا جائے کہ انسان بالکل مجبور ہے تو انسان کے افعال کا اچھا بُرا ہونا بالکل بے معنی ہوگا، کیونکہ جو افعال کسی سے محض مجبوراً صادر ہوتے ہیں ان کو نہ ممدُوح کہا جا سکتا ہے، نہ مذمُوم۔ دوسرا پہلو یعنی انسان بااختیار ہے تو وہ بھی خلافِ واقعہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ کچھ کام انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ دیکھیں کہ انسان کسی کام کو کیوں کرتا ہے اور کیوں ایک کام سے باز رہتا ہے؟ انسان میں خدا تعالیٰ نے خواہش کا مادہ پیدا کیا ہے جس کو ہم ارادہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ خواہش خاص اسباب اور مواقع سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے اندر ایک اور قوت ہے، جس کو ہم قوتِ اجتناب سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ایک کام سے باز رہنا۔ جب کوئی بُرا کام ہم کرنا چاہتے ہیں تو ان دونوں قوتوں میں تعارض ہوتا ہے اگر قوتِ ارادی فطرتاً قوتِ اجتنابی سے قوی تر ہو تو انسان اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے، ورنہ باز رہتا ہے۔

مولانا رومؒ نے اس مسئلہ پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے، سب سے پہلے مولاناؒ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ گو جبریہ و قدریہ دونوں غلطی پر ہیں لیکن دونوں کو نسبتاً دیکھا جائے تو قدریہ کو جبریہ پر ترجیح ہے کیونکہ اختیارِ مطلق بداہت کے خلاف نہیں اور جبرِ مطلق بداہت کے خلاف ہے۔ اس طرح ہر شخص کو بداہتہً نظر آتا ہے کہ وہ صاحبِ اختیار ہے، باقی یہ امر کہ یہ اختیار خدا نے دیا ہے، ایک نظری مسئلہ ہے یعنی استدلال کا محتاج ہے، بدیہی نہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

منکرِ حس نیست آں مَردِ قدَرْ فعلِ حق حسی نباشد اے پسر

قدری انسان حس کا منکر نہیں ہے، اے بیٹا! اللہ تعالیٰ کا کام حس میں نہیں آتا۔ (۳۰۵/۵)

منکرِ فعلِ خداوندِ جَلیل ہَست دَر انکار مدلولِ دَلیل

خداوندِ جلیل کے فعل کا منکر دلیل کے نتیجہ کے انکار میں (مبتلا) ہے۔ (۳۰۵/۵)

اس لیے مولاناؒ نے اختیار کو متعدد قوی دلائل سے ثابت کیا ہے، جس کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

انسان فاعلِ مختار ہے، پتھر نہیں

مولانا رومیؒ نے انسان کے فاعل مختار ہونے کے لئے درج ذیل چار دلائل پیش کئے ہیں :-

۱۔ ہر شخص کے دل میں اختیار کا یقین ہے اور گو سخن پروری کے موقع پر کوئی شخص اس سے انکار کرے لیکن اس کے

تمام افعال اور اقوال سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اختیار کا معترف ہے۔ اگر کسی شخص کے سر پر چھت ٹوٹ پڑے تو اس کو چھت پر مطلق غصہ نہیں آتا، لیکن اگر کوئی شخص اس کو پتھر دے مارے تو اس شخص کو پتھر مارنے والے پر غصہ آئے گا۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ چھت کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور آدمی جس نے پتھر کھینچ مارا وہ فاعل مختار یعنی اختیار رکھتا ہے۔

۲۔ ایک نہایت لطیف استدلال مولاناؒ نے یہ پیش کیا ہے کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے آگاہ ہیں۔ کوئی شخص اگر ایک کتے کو دور سے پتھر کھینچ مارے تو چوٹ پتھر کے ذریعہ سے لگے گی، لیکن کتا پتھر سے متعرض نہ ہوگا بلکہ اس پر حملہ کرے گا جس نے پتھر مارا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ کتا بھی سمجھتا ہے کہ پتھر مجبور تھا اس لیے وہ قابلِ الزام نہیں مگر جس بااختیار شخص نے اذیت دی، وہ مواخذہ کے قابل ہے۔

۳۔ انسان کے تمام افعال و اقوال سے اختیار کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، ہم جو کسی کو کسی بات کا حکم دیتے ہیں، کسی کام سے روکتے ہیں، کسی پر غصہ ظاہر کرتے ہیں، کسی فعل پر نادم ہوتے ہیں، یہ تمام امور اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم انسان کو فاعلِ مختار خیال کرتے ہیں اسی لیے اس کو ڈانٹتے ہیں۔

۴۔ جبر کے ثبوت میں سب سے قوی جو استدلال پیش کیا جاتا ہے اور کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ خدا اگر ہمارے افعال کا فاعل نہیں تو مجبور ہے اور اگر قادر ہے تو ایک فعل کے دو فاعل نہیں ہو سکتے۔ مولاناؒ نے اس شبہ کا ایسا جواب دیا جو جواب بھی ہے اور بجائے خود ثبوتِ اختیار پر مستقل استدلال بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو چیز جس چیز کی ذاتیات میں ہے، وہ اس سے کسی حالت میں منفک نہیں ہوسکتی۔ صانع جب کسی آلہ سے کام لیتا ہے تو صانع کی قوت فاعلہ آلہ کو بااِختیار نہیں بنا سکتی جس کی وجہ یہ ہے کہ جمادیت جماد کی ذاتیات میں ہے، اس لیے کسی فاعل کا عمل اس کی جمادیت کو سلب نہیں کرسکتا۔ یعنی پتھر ہونے سے منع نہیں کیا جا سکتا۔

مولاناؒ نے انسان کو قدرت ہونے کا ثبوت بہت پیارے انداز میں دیا ہے ؎

این کہ فردا این کُنم یا آں کُنم　　　این دلیلِ اختیار ست اے صَنم

یہ کہ کل یہ کروں گا یا وہ کروں گا، اے پیارے! یہ اختیار کی دلیل ہے۔ (۳۰۷/۵)

واں پشیمانی کہ خوردی زاں بَدی　　　زاختیارِ خویش گشتی مُہتدی

اور وہ شرمندگی جو تُو نے بدی سے اُٹھائی، اپنے اختیار سے تُو ہدایت یاب بنا۔ (۳۰۷/۵)

غیرِ حق گر نباشد اختیار　　　خشم چوں می آیدت بر جُرمِ دار

اگر خدا کے علاوہ کسی کو اختیار نہ ہو تو تجھے مجرم پر غصہ کیوں آتا ہے؟ (۳۰۸/۵)

چوں ہمی خائی تو دنداں بَر عَدُو　　　چوں ہمی بینی گناہ و جُرمِ اُزو

تُو دشمن پر دانت کیوں پیستا ہے، تُو اس کی خطا کو جرم کیوں سمجھتا ہے؟

گر زسقفِ خانہ چوبے بشکند　　بَر تو اُفتد سخت مجروحت کُند

اگر گھر کی چھت کی کوئی کڑی ٹوٹ جائے، تجھ پر گرے اور تجھے بہت زخمی کردے۔ (۵/۳۰۸)

ہیچ خشمے آیدت بَر چوبِ سقف　　ہیچ اندر کینِ اُو باشی تو وقف

تجھے چھت کی کڑی پر کوئی غصہ آتا ہے، تو کبھی اس سے کینہ کرنے میں مبتلا ہوگا؟ (۵/۳۰۸)

کہ چرا بَرمن زد و دستم شکست　　یا چرا برمن فتاد و کرد پَست

کہ وہ مجھے کیوں لگی اور میرا ہاتھ توڑ دیا یا، وہ مجھ پر کیوں گری اور مجھے نیچے لے لیا؟ (۵/۳۰۹)

آنکہ دُزدد مالِ تو گوئی بگیر　　دَست و پائش را ببر سَازش اسیر

جوشخص تیرا مال چراتا ہے، کیا تُو (مال کو) کہتا ہے پکڑ لے، اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈال، اس کو قید کرلے۔ (۵/۳۰۹)

گر بیاید سیل و رَختِ تو بُرد　　ہیچ با سیل آورد کینے خرد

اگر سیلاب آئے اور تیرا سامان (بہا) لے جائے، کوئی عقل مند سیلاب سے کینہ وری کرتا ہے؟ (۵/۳۰۹)

ہم چنیں سگ گربرو سنگے زَنی　　بر تو آرد حَملہ گردد منثنی

اسی طرح کتا اگر تُو اس کو پتھر مارے تو تیرے اُوپر حملہ کرتا ہے، پلٹ کر آتا ہے۔ (۵/۳۰۹)

عقل حیوانی چو دانست اختیار　　ایں مگو اے عقل انساں شرمدار

حیوانی عقل نے جب اختیار کو سمجھ لیا تو اے انسانی عقل! شرم کر کہ تُو اس جبر کی قائل کیوں نہیں ہوئی۔ (۵/۳۰۹)

''مسئلہ جبر و قدر'' کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور جس تقدیر کو وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان کی اپنی حرکتوں یا خیالات کی کج رَوی کی وجہ سے بطور سزا یا جزا ملتی ہے۔

جبر کا مفہوم

کسی ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنا، کسی کو زبردستی کسی کام پر لگانا جبر ہے۔ انسان جس چیز پر قدرت نہیں رکھتا وہ جبر ہے۔ ٹوٹی ہوئی لکڑی کب ستون بن سکتی ہے؟ جبر کا مطلب سب نیکی و بدی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا ہے، جو شخص سستی کی وجہ سے ناشکرا اور بے صبر رہا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جبر پر قائم ہوں۔ مست آدمی اپنی مستی کی وجہ سے طلبِ کمال میں کوتاہی کرتا ہے اور وہ اُلٹا خوش ہوتا ہے کہ میں نے جبرِ محمود پر عمل کیا یعنی اپنے اختیار کو اختیار خداوند میں محو کر دیا، حالانکہ غلط فہمی میں اس نے ناشکری اور بے صبری کے گناہوں کا اِرتکاب کیا۔ جوشخص جبر کے زعمِ باطل میں مبتلا رہا، اس نے اپنے آپ کو بیمار بنا لیا یہاں تک کہ اسی بیماری نے اس کو جہالت و بطالت کی قبر میں دفن کر دیا۔ بعض منافقین احکامِ دین کی بجاآوری سے دُور رہنے کے لئے جھوٹ موٹ اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرتے تو ان

کے حق میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اگر تم ہمارے سامنے بیمار بنو گے تو فی الواقع بیمار ہو جاؤ گے۔ (کذا فی بحرالعلوم وغیرہ) اگر تم کو جبری بننا ہی منظور ہے تو جبرِ محمود اختیار کرو۔

بستن شکستہ کے دعویدار کا فرض تھا کہ پہلے پائے شکستن پر عمل کرتا اور پھر بستن کو عمل میں لاتا لیکن جب اس نے نہ سعی کی، نہ شدتِ سعی سے اپنے پائے طلب کو شکستہ کیا تو پھر اس کا پاؤں کو باندھنا محض لہو مَل کر شہیدوں میں شامل ہونا ہے جو جبر کا مصداق نہیں۔ مولانا رومؒ کا فرمان ہے ؎

جبر چہ بُوَد؟ بستنِ اِشکستہ را　　　یا بہ پیوستن رگِ بگسستہ را

جبر (کے لغوی معنی) کیا ہیں؟ ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا یا کٹی ہوئی رگ کو پیوستہ کرنا۔ (۱/۱۳۴)

جبر کی اقسام

جبر بمعنی عام یعنی مطلق سبب اختیار کرنے کے ہیں۔ جبر کی دو قسمیں ہیں، ایک جبرِ مذموم دوسرا جبرِ محمود ہے۔ جبرِ مذموم وہ ہے، جس کا قائل واصل الی الحق نہیں ہے اور جبرِ محمود کا قائل واصل الی الحق اور عارف باللہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم یہ گمان بھی نہ کرنا کہ تمہارا جبرِ محمود ہے کیونکہ تم ابھی تک واصل الی الحق نہیں ہوئے اور تمہارا جبر تو منزلِ وصل تک پہنچنے سے پہلے ہی سو رہنے کا مصداق ہے جو جبرِ مذموم ہے۔ جبرِ محمود خداوند کے مشاہدہ میں مقلوب ومحو ہونے سے پیدا ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے اختیاراتِ کاملہ اور تصرفاتِ عامہ کو دیکھ کر انسان اپنے آپ کو بے بس پائے۔ اگرچہ اس کے ساتھ اپنے اختیارات کا بھی اس کو علم ہے، جو قدرت نے اس کو دیئے ہیں مگر اس مختارِ مطلق کے آگے اپنے اختیارات کو بالکل معدوم نہیں تو کالعدم سمجھے۔

جبری کا بے اختیار ہونا بھی دو معنی رکھتا ہے، ایک تو یہ کہ اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں، وہ عبادت اور پابندیٔ احکام میں اپنے آپ کو جبری بنا لیتا ہے لیکن حصولِ لذت اور زیادہ منافع کے لیے بھاگا بھاگا پھرتا ہے اور اپنے آپ کو عملاً مختار ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ مقتضائے قدرت اور منشائے حکمت کو بنظرِ عبرت و بصیرت نہیں دیکھتا اور اعتبار و استبصار کی آنکھ بند کر کے تعطیل جوارح کا مرتکب ہو کر منزل سے دور راستے ہی میں محوِ خواب ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

جبر تو خُفتن بُوَد در رہ مَخُسپ　　　تا نہ بینی آں در و در گہ مَخُسپ

تیرا جبر کا قائل ہونا گویا دنیا کے راستے میں بے دست و پا ہو کر سو رہنا ہے، پس راہ میں نہ سو یعنی جب تک کہ اس (محبوبِ حقیقی) کے در اور درگاہ کو نہ دیکھ لے، نہ سو۔ (۱/۱۲۱)

ور بُوَد ایں جبر جبرِ عامہ نیست　　　جبرِ آں امّارۂ خود کامہ نیست

اور اگر (بالفرض) یہ جبر ہی ہے تو بھی یہ عوام کا جبر نہیں، اس نفس امّارہ خود غرض کا جبر نہیں۔ (۱/۱۷۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے کامل و مطلق اختیار کے آگے اپنے ناقص اختیار کو جبر کے لفظ سے تعبیر کیا جائے تو اس میں

کوئی مضائقہ نہیں مگر یہ جبرِ محمود ہے، جو فی الواقع جبر نہیں بلکہ مجازاً اس پر جبر کا اطلاق کیا جاتا ہے اور یہ جبرِ مذموم سے جداگانہ ہے، جس کو جاہل عوام نے ترکِ طاعت اور اختیارِ معصیت کے لیے ایک حیلہ بنا رکھا ہے۔ جبرِ محمود کو وہی لوگ پہچانتے ہیں جن کے دل کی آنکھ خدا نے کھول دی ہو۔

تمام افعال کے آثار اور نتائج کا خالق اللہ تعالیٰ ہے

تمام افعالِ عباد کے آثار اور نتائج کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، نہ کہ بندہ۔ افعالِ عباد کے نتائج اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے، باقی رہے وہ افعال جو بندوں سے سرزد ہوتے ہیں کہ ان کا خالق بھی خدا ہے یا انہیں بندے پیدا کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ معتزلہ کے نزدیک افعال کا خالق خود بندہ ہے مگر اہلِ حق کا عقیدہ یہ ہے کہ بندوں کے تمام نیک و بد افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، ہاں بندہ ان افعال کا کاسِب ہے۔

ولی جب کسی سبب کے سَرزد ہونے سے پشیمان ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اس سبب پر نتائج و آثار کا دروازہ بند کر دیتا ہے یعنی اس فعل پر اس کا اثر مرتّب نہیں ہونے دیتا۔ افعال پر آثار کا مرتّب ہونا بندے کے اختیار کی بات نہیں۔ اس سے یہ بھی لازم آیا کہ جب ایک فعل پر اس کا اثر و نتیجہ مرتب ہونے لگتا ہے تو اس کو روکنا بھی بندے کے قبضہ اور قدرت میں نہیں ہوتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ حالت عوام کی ہے کہ جو خوارقِ عادات کے اہل نہیں ہیں لیکن اہل اللہ جن کو خوارقِ عادت کا رُتبہ حاصل ہے اس سے مستثنیٰ ہیں کہ اسباب پر آثار کو مرتّب نہ ہونے دیں، چنانچہ بعض اولیاء کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ قدرت حاصل ہے کہ چھوٹے موٹے تیر کو راہ سے واپس لے آئیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

خَلقِ حق افعالِ مارا مُوجدست   فعلِ ما آثارِ خَلقِ ایزدست

(ہاں) خدا کی آفرینش ہمارے افعال کی موجد ہے (اور) ہمارے فعل خدا کی آفرینش کے نتائج ہیں۔ (۱/۱۷۲)

ہمچنیں کسب و دم و دام و جماع   آں موالید ست حقِ را مُستطاع

اسی طرح کمانا، حیلہ و تدبیر کرنا، جال بچھانا اور جماع کرنا۔ یہ (سب کے سب کام) اللہ تعالیٰ کے مخلوق اور مقدور ہیں۔ (۱/۱۸۹)

مخلوق کا عجز اور خالق کا اختیار

اجرامِ عرض اور اجرامِ فلک کی تمام حرکات و افعال اسی ذاتِ حق کے امر و الہام کی تابع ہیں، جس سے مخلوقات کا بے اختیار ہونا ثابت ہے۔ اسی بے اختیاری کو یہاں لفظ جبر سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس بے اختیاری کے مضمون سے مخلوق کا عجز اور خالق کا اختیار مطلق ثابت ہوتا ہے اور اس نے میری کیفیت عشقیہ کو جوش زَن کر دیا اور جو شخص صاحبِ عشق نہیں وہ بجائے اس کے کہ حق تعالیٰ کے اختیار علی الاطلاق سے ہدایت پا کر آمادۂ طاعت وعبادت

ہو، وہ اپنے آپ کو جہال کی طرح مجبورِ محض قرار دے کر طاعت و بندگی سے گریز کرتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے مختارِ مطلق ہونے سے بندہ کے اختیار کی مطلقاً نفی لازم نہیں آتی بلکہ اختیارِ تام اور قدرتِ مستقلہ کی نفی لازم آتی ہے اور توبہ کے احکام کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ اختیار بھی کافی ہے۔

لفظِ جبرم عشق را بے صبر کرد وانکہ عاشق نیست حَبسِ جبر کرد

جبر کے لفظ نے (یہ ثابت کر کے کہ خدا کے سوا کوئی فاعل نہیں) میرے عشق کو بے قرار کر دیا اور (بخلاف اس کے) جو عاشق نہیں اس کو (اس لفظ نے بجائے لذت ایمانی کے) جبر (متعارف کے غلط مسئلے) کا قیدی بنا دیا۔ (۱۷۱/۱)

انسان کا خود کو مجبورِ محض ظاہر کرنا

انسان اپنے آپ کو مجبورِ محض قرار دیتا ہے، حالانکہ کبھی کبھی اپنے اختیار کا اظہار کرتا ہے لیکن اختیار وہاں ظاہر کرتا ہے جہاں اسے حالات خوشگوار دکھائی دیتے ہیں، اس وقت تو ذرا بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ کام میرے اختیار میں نہیں اور وہ کام کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کر ڈالتا ہے۔ لیکن جب کوئی کام نہ کر سکے تو پھر ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے مجبورِ محض بن بیٹھتا ہے، چاہے اس کام کے بگڑ جانے کا سبب اس کی اپنی سوء تدبیر ہی کیوں نہ ہو، وہ ایسی حالت میں جبری بن جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ ہمارا کیا بس ہے جو کچھ ہوا ہمارے اختیار سے باہر تھا۔ اگر انسان اپنے آپ کو مجبورِ محض خیال کرتا ہے تو اس میں مجبوری کے آثار بھی نظر آنے چاہئیں یعنی عاجزی، بے اختیاری اور تذلل یہ سب اس انسان میں موجود ہونے چاہئیں۔ یہ سب خصوصیات کہاں ہیں اگر تم اپنے آپ کو جباری کی خدائی زنجیر میں جکڑا ہوا سمجھتے ہو تو اس زنجیر کی جھنکار یعنی تمہاری اس مجبوری کی علامت ہونی چاہیئے۔ مطلب یہ کہ تم ایک بے حس وحرکت تصویر ہوتے۔ پھر یہ ہزاروں خودمختارانہ شوخیاں کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جیل خانہ کا قیدی کب آزاد ہو سکتا ہے؟ ٹوٹی ہوئی لکڑی کب ستون بن سکتی ہے۔ اس حوالے سے مولانا رومیؒ کا کلام ہے کہ ؎

بستہ در زنجیر رادی چوں کند چوبِ اشکستہ عمادی چوں کند

(بھلا) زنجیر سے جکڑا ہوا سخاوت کیسے کر سکتا ہے، ٹوٹی ہوئی لکڑی ستون کیونکر بن سکتی ہے؟ (۹۳/۱)

اندراں کاریکہ میلت نیست و خواست اندراں جبری شوی کیں از خدا است

جس کام سے تجھے لگاؤ اور خواہش نہیں ہے اس میں تو مجبور بن بیٹھتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ (۹۳/۱)

اختیار کے سبب ہی جزا وسزا مقرر ہے

لیک ہست ایں فعلِ ما مختار ما زو جزا گہ مارِ ما گہ یار ما

لیکن ہمارا فعل ہمارے اختیار میں ہے، (اس لیے) کبھی اس کی جزا ہمارے مخالف کبھی جزا ہمارے موافق ہے۔ (۱۷۲/۱)

انسان کو اپنے فعل کا اختیار حاصل ہونا ایک دعویٰ ہے، جس کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس کو جبھی تو اپنے اچھے بُرے کام کی جزا وسزا ملتی ہے۔

جبر و اختیار میں فرق کرنے کے لئے ایک مثال

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

یک مثال اے دل پئے فرقے بیار تا بدانی جبر را از اِختیار

اے دل! ایک مثال فرق ظاہر کرنے کے لیے پیش کر، تاکہ تو جبر کو اختیار سے (الگ) شناخت کر سکے۔ (۱/۱۷۴)

ایک ہاتھ جو مرضِ رعشہ سے کانپ رہا ہے اور ایک وہ ہاتھ جسے تم خود اس کی جگہ سے حرکت دیتے ہو۔ دونوں ہاتھوں کی حرکت کو خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہونے میں مشترک سمجھو، لیکن اس حرکت کو جو تم اَزخود کر رہے ہو اس حرکت پر جو رعشہ سے ہے، قیاس نہیں کر سکتے بلکہ ان میں یہ بین فرق ہے کہ ایک حرکت ارادۂ اختیاری ہے اور دوسری حرکت ارتعاشیہ اضطراری ہے، جس کو جبر محض کہتے ہیں۔

درست عقیدہ فرقہ جبریہ اور فرقہ قدریہ کے بین بین ہے

گر نباشد فعلِ خَلق اندر میاں پس مگو کس را چرا کردی چناں

اگر (وقوعِ افعال میں) مخلوق کے فعل کا کوئی دخل نہ ہو تو تمہیں کسی (مرتکب گناہ) کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ تم نے ایسا کام کیوں کیا، کیونکہ تمہارے عقیدے کے موافق خود اس نے یہ کام نہیں کیا۔ (۱/۱۷۲)

اگر بندۂ خاص اپنے آپ کو خالقِ افعال سمجھے تو اس سے فرقہ قدریہ کا اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے اور اگر وقوعِ فعل محض خدا کی طرف سے سمجھے تو یہ فرقہ جبریہ کا عقیدہ ہے۔

جب قضا آتی ہے تو فہم و عقل نہیں رہتی

امام المتقین (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ) نے فرمایا ہے کہ جب قضا آتی ہے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، جب قضا گزر جاتی ہے تو آدمی تأسف سے اپنے آپ کو کاٹ کھاتا ہے۔ غفلت کا پردہ اُٹھتے ہی وہ اپنا گریبان پھاڑنے لگتا ہے۔ مرد اپنی گفتگو سے ایسے پچھتاتا ہے، جیسے ایک ظالم پولیس افسر مرتے وقت اپنے ظالمانہ اعمال سے پچھتاتا ہے۔ بڈھا کافر دل سے پشیمان ہو کر توبہ کرتا ہے، جب عذر لاتا ہے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔

عقل و ادراک جو مہر و ماہ کی طرح روشن ہیں، قضاء الٰہی کے آگے تاریک و بے نور ہو جاتے ہیں۔ قضاء کے آگے باریک بینی و بعید نظری کچھ کام نہیں دیتی۔ انکارِ قضا کا کفرِ صریح تو بہت بڑا گناہ ہے، اگر تم میں کافروں کا ذرا سا شبہ بھی ہو تو تم شرمگاہ کی طرح گندگی اور شہوت کی جگہ ہو۔

چوں قضا آید شود دانش بخواب مہ سیہ گردد بگیرد آفتاب

جب قضا آتی ہے تو عقل سو جاتی ہے، چاند سیاہ پڑ جاتا ہے اور سورج کو گرہن لگ جاتا ہے۔ (۱/۱۴۹)

چوں قضا آید فرو پوشد بَصَر تانداند عقلِ ما پا را زسر

جب قضا آتی ہے آنکھیں بند کر دیتی ہے تا کہ ہماری عقل سر پیر کو نہ سمجھ سکے۔ (۱/۲۶۲)

قصہء آدم علیہ السلام میں قضا کا دخل

ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام جو عِلمُ الْاَسْمَاءِ کے تاجدار ہیں، ان کی رگ رگ میں لاکھوں علم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو سارے نام بتا دیئے (البقرۃ:۳۱) حضرت آدم علیہ السلام کو صرف اشیاء کے نام یاد کرا دینا مراد نہیں بلکہ یہاں اسماء کے لفظ میں حقائقِ اوصاف کو بھی شامل کیا گیا ہے، پس تعلیم اسماء سے مراد کہ ان کو تمام اشیاء کے نام، ماہیات اور خواص بتا دیئے۔ قدرت نے جس چیز کی ماہیت اور جو حالت بنا دی ہے وہ غیر متبدل ہے، وہ سنت اللہ کے مطابق ہے اور سنت کے متعلق فرمایا "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا" اور اللہ کی سنت کو آپ ہرگز تبدیل کرتا ہوا نہ پائیں گے (فاطر:۴۳) حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام سکھانا اسی سنت اللہ کے ماتحت ہے، اس لیے وہ نام بھی غیر متغیر تھے، لہٰذا انہوں نے جس چیز کا جو لقب ٹھہرایا وہ تبدیل نہیں ہوا، جس چیز کو انھوں نے چالاک قرار دے دیا وہ سُست نہیں ہوئی۔ جو شخص خاتمہ کے وقت مومن ہونے والا ہے، اس کو انہوں نے پہلے ہی دیکھ لیا اور وہ بھی ان پر ظاہر ہو گیا۔

جب آخری حالت قابلِ اعتبار ہے جس کے علم کی بدولت حضرت آدم علیہ السلام نے ملائکہ پر شرف پایا تو ہر مومن و صالح آدمی کو لازم ہے کہ آخرت کا خیال رکھے، لہٰذا تم پر لازم ہے کہ جس چیز کا علم حاصل کرنا چاہو کسی دانائے کامل سے حاصل کرو۔ علمی و عملی استفادے کے لئے ایسے علماء کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے جو عامل، کامل، صالح و متقی اور متادِب بآدابِ شریعت ہوں۔

حضرت آدم علیہ السلام باوجود اس فضل و کمال کے کہ خداوند تعالیٰ نے ان کو علم اسماء سے نوازا اور فرشتوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے ان کی فضیلت ثابت کی بلکہ فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا مگر جب قضا آتی ہے تو وہ بھی لغزش میں پڑ جاتے ہیں۔ ہد ہد سلیمان علیہ السلام کو کہتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام باوجود اس فضل و کمال کے لغزش کر گئے تو ہم کس شمار و قطار میں ہیں۔

تفصیلِ قصہ قرآن مجید میں یوں ہے "اور ہم نے کہا: اے آدمؑ! تم اور تمہاری بی بی بہشت میں رہو اور اس میں جہاں کہیں سے تمہارا جی چاہے بافراغت کھاؤ، مگر اس درخت (گندم) کے پاس مت جانا، ورنہ تم اپنا نقصان کر لو گے، پس شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس حالت میں تھے اس نے ان کو نکلوا کر چھوڑا۔ پھر

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم سب اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور زمین میں تمہارے لیے ایک وقت تک ٹھکانا اور ساز و سامان ہے۔'' (البقرۃ:۳۵:۳۶)

حضرت آدم علیہ السلام حیران تھے کہ یہ دانۂ گندم کی ممانعت حُرمت کی وجہ کیا تھی یا کسی تاویل سے تھی۔ شجرِ ممنوعہ کے متعلق حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال آتا تھا کہ اس تحریم سے اس درخت کے پھل کا حرام ہونا بصریحِ معنی مراد ہے یا اس حکم کا کچھ اور سبب ہے اور درخت فی الواقع حرام نہیں۔ شیطان نے یہ تاویل ان کے ذہن نشین کر دی کہ یہ درخت فی نفسہٖ حرام نہیں بلکہ اس وجہ سے تم پر ممنوع کر دیا گیا کہ تم کو یہ کمالات حاصل نہ ہو جائیں کہ ہمیشہ جنت میں رہو یا اس درخت (گندم) کے کھانے سے فرشتے نہ بن جاؤ یا حیاتِ دوام حاصل نہ کرلو۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں شجرہ کی صریح نہی یا تاویل کے متعلق جو حیرت پیدا ہو رہی تھی، وہ شیطان کے بہکانے میں مدد و معاون بن گئی۔ یہاں تک کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسے ڈال کر ان کو اس درخت کا پھل کھلا دیا، جس کی پاداش میں ان کو جنت سے نکل جانے پر مجبور ہونا پڑا، پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کو شجرِ ممنوعہ کے تناول کے سبب حکم ہوا کہ جنت سے نکل جائیں تو ان کو علم ہوا کہ یہ سب شیطان کا فریب تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کو نعیمِ جنت سے محروم کر دے مگر اب کیا ہونا تھا۔ چار و ناچار بہشت سے نکلنا اور زمین پر اُترنا پڑا۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ بات معمولی تھی کہ آپ سے صرف اجتہادی خطا ہوئی، تاہم اتنے بڑے آدمی سے معمولی سی لغزش بھی باعث گرفت ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بود آدم دیدۂ نورِ قدیم مُوئے در دیدہ بُوَد کوہِ عظیم

حضرت آدم علیہ السلام کی مثال خدا کی آنکھ کی سی ہے، آنکھ میں ذرا سا بال گر جانا ایسے ہے جیسے کوہِ عظیم گر گیا ہو۔

(۱۶/۲)

تب حضرت آدم علیہ السلام ''رَبَّنَا ظَلَمْنَا'' کہہ کر مناجات کرنے اور درد و سوز سے آہیں بھرنے لگے کہ الٰہی! اندھیرا چھا گیا اور ہم سے راستہ گم ہوگیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ تاویل کے تحت کیا اور تاویل کے ساتھ کوئی کام کرنا گناہِ کبیرہ نہیں ہوسکتا بلکہ یہ لفظ ظلمت سے مشتق ہے۔

امام غزالیؒ ''احیاء العلوم'' میں فرماتے ہیں کہ نیکی کا نور صفحۂ دل سے گناہ کی تاریکی کو مٹا دیتا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ مرتکب گناہ پر واجب ہے کہ توبہ کرے، نادم ہو اور کسی ایسی نیکی کو گناہ کا کفارہ بنائے جو اس کی متضاد ہو، جیسے جاہل لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم جو گناہ کرتے ہیں وہ تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں اور قضائے الٰہی کے مطابق ہم سے صادر ہوتے ہیں، پس ہم سے ان پر کیوں مواخذہ ہوگا نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ بلکہ لازم ہے توبہ و استغفار کرے تاکہ اگر ارتکابِ خطا بقضائے الٰہی ہوا ہے تو توبہ و استغفار بھی بقضائے الٰہی ہو جائے اور یہ قضا اس قضا کے زخم کے لئے مرہم بن جائے۔ جب قضا بلا بن کر آتی ہے تو دُعا بھی قضا بن کر اس کا مقابلہ کرتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بلا کو کسی طرح پیدائش کے ساتھ پیدا کرتا ہے، پھر اس کو کسی مبتلا پر نازل کرتا ہے اور ادھر سے دُعا اُوپر جاتی ہے تو وہ دُعا اس بلا کو دفع کر دیتی ہے۔

دانشِ یک نہی شد بروے خطا　　　　این ہمہ دانست و چوں آمد قضا

الغرض آدم علیہ السلام کو یہ سارا علم تھا اور جب قضا آئی تو وہ ایک امتناعی حکم کے سمجھنے میں خطا کھا گئے۔ (۱/۱۵۰)

جبر و اختیار جب عارفین میں آ جاتا ہے تو جلال کا نُور بن جاتا ہے (عارفین کا جبر و اختیار)

مقربینِ الٰہی کا اختیار و جبر عوام کی طرح نہیں ہوتا کیونکہ عوام کا اختیار انکارِ تقدیر کا باعث بن جاتا ہے اور ان کا جبر تعطیلِ شرائع و ابطالِ تکالیف کا موجب بن جاتا ہے۔ جبر و اختیار کے ایک ہی عقیدہ کا مستحسن صورت اختیار کر لینا اور عوام سے متعلق ہو کر مذموم بن جانا قابلِ توجہ امر ہے، اس لیے اس امر کی تائید میں ایک ہی شے، ایک محل میں، ایک صفت پر ہو سکتی ہے، مثلاً پانی کا قطرہ سیپ سے باہر ہو تو پانی کا قطرہ ہے پھر سیپ کے اندر جا کر وہ قطرہ موتی بن جاتا ہے۔

اختیار و جبر تم میں تو محض ایک خیال تھا اور جب ان عارفین میں گیا تو جلال کا نور بن گیا۔ عوام کے نزدیک اختیارِ جبر ایک خیال ہے یا خیالِ صحیح ہے جو عام خوش اعتقاد لوگوں کا مسلک ہے اور وہ محض مرتبۂ علم میں ہے، اس کے ساتھ حال و وجدان شامل نہیں لیکن جب وہ عقیدہ حضرات عارفین کے دل میں سماتا ہے تو ان کے علم و اعتقاد کے ساتھ ذوق و وجدان کے مقرون ہونے سے اپنے عجز اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ان کے دل پر اس قدر استحضار ہوتا ہے کہ ان کے لئے سراسر نور جلال بن جاتا ہے۔

قطرہا اندر صدفہا گوہر ست　　　　اختیار و جبرِ ایشاں دیگر ست

ان حضرات کا اختیار و جبر کچھ اور ہی ہے (ان کے اختیار و جبر کی پہلی مثال یہ ہے کہ) سیپ کے اندر (پانی کے) قطرے موتی (کی صورت میں) ہیں۔ (۱/۱۷۱)

ہُد ہُد اور کوّے کا قضا و اختیار کے متعلق نظریہ

کوا قضائے الٰہی کا منکر ہے۔ اگر اس کی ہزاروں عقلیں ہوں تو بھی اس سوء اعتقاد کی وجہ سے وہ کافر ہے۔ ہُد ہُد کہتا ہے، اگرچہ کوّے کا مجھ کو دروغ گوئی سے متہم کرنا ایک سخت جملہ ہے، جو دوسرے لحاظ سے قضا کا انکار بھی ہے لیکن اس کا یہ انکار کرنا اور مجھ پر الزام لگانا بھی بتقضائے الٰہی ہے، یعنی قضائے الٰہی نے اس کو مبتلائے مصیبت کیا ہے، جس کے آگے زورِ عقل اور قوتِ تدبیر بیکار ہو جاتی ہے، اس لیے مجھے اس سے انتقام لینے کا ارادہ نہ رکھنا چاہیئے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

از قضا داں کو قضا را منکرست　　　　از قضا ایں تعبیہ کے نادر ست

قضا سے یہ چھپانا کب نئی بات ہے؟ یہ بھی قضا سے سمجھ کہ وہ قضا کا منکر ہے۔ (۱/۱۴۹)

اُنتالیسواں باب

عِلم کی افادیت

کون نہیں جانتا کہ علم ہی ایسی چیز ہے جس سے انسان کا حیوان اور دیگر مخلوق میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ علم سے ہی انسان اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان پر سب سے بڑی عطا یہ فرمائی کہ ''علم الاشیاء'' کو ان کے دل میں ڈال دیا اور اس بَرتری کے باعث ان کو مسجودِ ملائک بنایا اور خلافتِ الٰہیہ کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ آج بھی یہی دستور ہے کہ انسان علمِ رُوحانی اور دُنیاوی کی وجہ سے اپنے سینے کو آباد رکھتا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرتا ہے۔

آدمِ خاکی زحق آموخت علم

(آدمِ خاکی نے اللہ تعالیٰ سے عِلم سیکھا)

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ انسان خاکی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنے کے بعد رشکِ ملائک ہوگیا۔ یہ علم اس طریقے سے آدم علیہ السلام کے سینے میں ڈال دیا گیا جس طرح مرغی کا بچہ پیدا ہوتے ہی کھانے کے لئے ٹھونگے مارنے لگتا ہے اور انسان کا بچہ ماں کے دودھ کو پینے کا متلاشی ہو جاتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس علم کے سبب انسان ہوائی جہاز، گاڑیاں، بھاپ کے انجن اور دوسری مشینری بنانے کی اہلیت رکھتا ہے اور یہ سب اسی عطا کردہ علم کے باعث ہے۔ اس زمانے میں اور آنے والے زمانے میں جتنی بھی سائنس کی ایجادات ہوئیں اور

ہوں گی، وہ سب اسی عطا کردہ علم کی مرہونِ منت ہیں۔ انسان کے علاوہ باقی تمام مخلوق کو "علم الاشیاء" نہیں دیا گیا، چنانچہ اس کائنات میں انہیں وہ مقام حاصل نہیں، جو علم کی وجہ سے ابنِ آدم کو ورثے میں ملا۔ یہاں پر مولاناؒ کے چند اشعار کو ہی پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ کتاب اس سے زائد معلومات کی مقتضی نہیں۔

عِلم کی اقسام

نمبرا۔ علم من اللّٰہ یعنی اللہ کی طرف سے اور اسی کو علم ظاہری بھی کہتے ہیں۔ **نمبر۲۔** علم مع اللّٰہ۔ یہ وابستگیِ الٰہی ہے، اسی کو علمِ باطنی کہتے ہیں۔ **نمبر۳۔** علم بِاللّٰہ یعنی وہ عِلم جو اللہ کے لئے ہو، علمِ حکمت اسی کو کہا جاتا ہے پہلے دو علم یعنی علم من اللہ اور علم مع اللہ یہ دونوں بولنے سے بڑھتے ہیں۔ لیکن علم باللہ خاموشی سے بڑھتا ہے، اسی لئے بڑی عبادت خاموشی ہے کہ اس سے علم اور حکمتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ (فائدہ) خاموشی عقل کی جلا ہے، نفس کی فنا ہے، علم و عقل پردۂ خواہشات ہیں۔ مولانا رومؒ اس موقع پر ارشاد فرماتے ہیں ؎

ہیں بکش بہر ہوا ایں بارِ علم   تاشوی راکب تو بر رہوارِ علم

خبردار! اپنی خواہشات کی خاطر علم حاصل نہ کرنا تاکہ تو علم کے گھوڑے پر سوار ہو سکے۔ (۱/۳۵۵)

چُونکہ بر رہوار عِلم آئی سوار   بعدازاں اُفتد تُرا از دوش بار

جب تو علم کے گھوڑے پر سوار ہو گیا، تب تیرے کندھوں سے بوجھ بھی اُتر جائے گا۔ (۱/۳۵۵)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ علم کی بدولت دنیا کی تمام مخلوق انسان کی فرمانبردار بنائی گئی ہے، علم و ہنر کی وجہ سے انسان پوری دنیا کی مخلوق کو فرمانبردار بنا سکتا ہے۔ انسان ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ ہو تو سمندر کی کائنات اور کوہ و دشت کا عالم سب انسان کے لیے مسخر ہو جاتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

آدمی را زیں ہنر بیچارہ گشت   خَلقِ دریاہا و خَلقِ کوہ و دشت

اس ہُنر کی وجہ سے آدمی کے لئے فرمانبردار ہو گئی ہے، پہاڑ، جنگل اور دریائی مخلوق۔ (۱/۱۳۰)

علم چوں بر دل زند یارے بود

(علم جب دِل میں اُتر جائے تو مددگار ثابت ہوتا ہے)

مولانا رومؒ نے مثنوی شریف میں علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے جو ارشاد فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہاں بیان کیا جا رہا ہے، اس کے بعد اُن کے اشعار بھی دیئے جا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اہل دل کو علم کے اُٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ علم اُن کو اُٹھائے پھرتا ہے، برخلاف اُن لوگوں کے جو جسم والے ہیں یعنی جو اہل دل نہیں، اُن کا علم اُن کے لئے بار ہوتا ہے۔ اگر علم دل پر اثر کرے تو مددگار ثابت ہوتا ہے، اگر تن پر اثر کرے تو وزن (بار) بن جاتا ہے۔ جو علم اللہ کی طرف سے نہ ہو وہ بار ہوتا ہے، جو علم بلاواسطہ اللہ سے حاصل کیا ہو وہ ماشطہ کے

ظاہری بناؤ سنگھار کی طرح پائیدار نہیں ہوتا، لیکن اگر انسان علم کو اچھی طرح اُٹھائے تو اُسے اُس وزن کے عوض خوشی عطا کی جائے گی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ خبردار! خواہشات کی خاطر علم حاصل نہ کرنا بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر علم حاصل کرو تا کہ تمہارے اندر علم کے انبار دکھائی دیں۔ علم ہی کی وجہ سے انسان کی فضیلت ہے اگر محض صورت کی وجہ سے آدمی انسان کہلاتا تو ابوجہل اور احمد مصطفیٰ ﷺ یکساں ہوتے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں احمد مصطفیٰ ﷺ اور ابوجہل دونوں بُت خانے میں جاتے ہیں لیکن غور کرو دونوں کے جانے کا فرق ہے۔ احمد مصطفیٰ ﷺ جاتے ہیں تو بُت سرنگوں ہو جاتے ہیں اور ابوجہل جاتا ہے تو اُمتیوں کی طرح اُن کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے۔ اسی طرح دیوار پر تصویر بنائی گئی ہے، دیکھو ذرا! ہو بہو آدمی ہے لیکن غور کرو اس میں کس چیز کی کمی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اس تصویر میں روح کی کمی ہے، لہٰذا تم کمیاب گوہر کی تلاش کرو۔ یعنی ایسا علم حاصل کرو جو تمہیں اُٹھائے یعنی وہ علم تمہارا بار اُٹھائے، نہ کہ تم اس کا بار اُٹھاؤ، لیکن آج کل علم بار بنا ہوا ہے، یہ اختلافاتِ فروعی اس علم کا بار بننے کی مثال ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

علم ہائے اہلِ دل حَمالِ شاں | عِلم ہائے اہلِ تن اَحمالِ شاں

اہلِ دل کو اپنا علم اُٹھانے کی ضرورت نہیں بلکہ اُن کا علم انہیں اُٹھائے ہوتا ہے، برخلاف اس کے اہلِ تن کا علم اُن کے لئے بار ہوتا ہے۔ (۳۵۵/۱)

عِلم چوں بر دل زند یارے شود | عِلم چوں برتن زند بارے شود

علم اگر دل پر اثر کرے تو وہ مددگار ہوتا ہے اور اگر تن پر اثر کرے تو بار ہو جاتا ہے۔ (۳۵۵/۱)

گفت ایزد یَحْمِلُ اَسْفارَہٗ | بار باشد علم کاں نبود زہُو!

جو علم اللہ کی طرف سے نہ ہو وہ بار ہوتا ہے اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یَحْمِلُ اَسْفارَہٗ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (۳۵۵/۱)

عِلم کآں نبود زہُو بے واسِطہ | آں نپاید ہمچو رنگِ ماشِطہ

جو علم بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے حاصل نہ ہو، وہ ماشطہ کے ظاہری بناؤ سنگھار کی طرح پائیدار نہیں ہوتا۔ (۳۵۵/۱)

لیک چوں ایں بار را نیکو کشی | بار بَرگیرند و بخشندت خوشی

لیکن اگر تم اس علم کو اچھی طرح سے اُٹھاتے ہو تو تمہیں اس بار کے عوض خوشی عطا کی جائے گی۔

عِلم تقلیدی وبالِ جانِ ماست | عاریہ است و ماں نشستہ کآنِ ماست

تقلیدی علم ہمارا وبالِ جان ہے، وہ مانگی ہوئی چیز ہے اور ہم مطمئن بیٹھے ہیں کہ یہ ہماری ملکیت ہے۔ (۲۲۴/۲)

زیں خِرد جاہل ہمی باید شدن | دست در دیوانگی باید زدن

اس عقل سے بیگانہ ہو جانا چاہیئے، دیوانگی اختیار کر لینی چاہیئے۔ (۲۲۴/۲)

علم تقلیدی بُود بہرِ فروخت　　　　چوں بیابد مُشتری خوش بر فروخت

تقلیدی علم فروخت کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ جب کوئی خریدار پاتا ہے چمک اُٹھتا ہے۔ (۳۰۷/۲)

مُشتریِ علمِ تحقیقی حق است　　　　دائماً بازارِ اُو بارونق است

تحقیقی علم کا خریدار خدا ہے، اس کا بازار ہمیشہ بارونق ہے۔ (۳۰۷/۲)

عِلم کی بدولت انسان پر سات طبق روشن ہو جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ ایک ضعیف کو ایسے علم سے مشرف فرماتا ہے جو کبھی کسی قوی کو بھی نصیب نہیں ہوتا، جس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام مٹی کے کثیف و تاریک مادّے سے بنے ہوئے تھے، بخلاف فرشتوں کے جن کی تخلیق نور سے تھی اور اسی طرح شیطان آگ سے تخلیق کیا گیا تھا۔ یہ دونوں نورانی اور اعلیٰ مادّے ہیں مگر جب حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نام سکھائے۔ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" ۔الخ (یعنی آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کا علم دیا گیا) (سورۃ البقرۃ:۳۱) تو حضرت آدم علیہ السلام فضیلت میں فرشتوں سے بھی سبقت لے گئے۔ چنانچہ فرشتوں نے عرض کیا! پاک ہے تُو، ہم کو کوئی علم نہیں سوائے اُس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بے شک تو بڑا علم والا حکمت والا ہے۔ پھر جب حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا گیا تو آپ نے سب کے سب اشیاء کے نام فوراً بتا دیئے، اس پر فرشتوں کا فخر و جاہ ماند پڑ گیا جس کی وجہ سے اپنے آپ کو آدم علیہ السلام سے افضل سمجھتے تھے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

آدمِ خاکی زحق آموخت عِلم　　　　تا بہفتم آسماں افروخت عِلم

حضرت آدم علیہ السلام نے جو خاک سے بنے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ سے علم (اشیاء) سیکھ لیا تو (اس) علم نے زمین سے لے کر ساتویں آسمان تک (سب کچھ ان پر) روشن کر دیا۔ (۱۲۹/۱)

دل کو جو جوہر ملا وہ دریاؤں اور آسمانوں کو بھی نہیں ملا

علم کا دارومدار ظاہری قوت و ضعف پر نہیں بلکہ یہ ایک عطیۂ الٰہی ہے اور خداوند تعالیٰ جسے چاہے دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "بے شک ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو ان سب نے اس کے اُٹھانے سے عذر کیا اور اس سے ڈرنے لگے اور اس کو انسان نے اُٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ناداں اور ظالم تھا۔ (ظَلُوْماً جَهُوْلاً کی تفسیر ہماری تصنیف "حُسنِ نماز" میں مطالعہ فرمائیں) امانت سے بعض نے عشق و محبت اور بعض نے خلافتِ الٰہی اور بعض نے علم و عقل مراد لی ہے۔ غرض امانت سے مراد خواہ کچھ بھی ہو، بہرحال یہ ایک ایسا عطیہ ہے کہ انسان ضعیف الجسم کا دل تو اس کا حامل ہو گیا جو ایک قطرہ خون سے زیادہ وجود نہیں رکھتا مگر کوہ و دریا وغیرہ بڑی بڑی چیزیں اس کو اُٹھانے کے قابل نہ سمجھی گئیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

قطرۂ دِل را یکے گوہر فتاد　　　　کاں بدریاہا و گردوں ہا نداد

دِل کو جو ایک قطرہ (خون) ہے، ایک ایسا جوہر (علم و عقل) ملا ہے جو (خداوند تعالیٰ نے) دریاؤں کو اور آسمانوں کو

(بھی) نہیں دیا۔ (۱۲۹/۱)

علم کی بدولت انسان شیطان کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے

نفس جو انسان کے اندر ایک دشمن ہے، انسان کی بربادی کے لئے طرح طرح کے دام وفریب بچھاتا ہے۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آنحضرت ﷺ سے بغرضِ احتیاط نفس کی مکاریوں کی کیفیت پوچھتے رہتے تھے، چنانچہ احادیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول منقول ہے کہ لوگ تو رسول اللہ ﷺ سے بھلائی کے بارے میں سوال کیا کرتے مگر میں برائی کے متعلق پوچھتا رہتا، اس خوف سے کہ مبادا وہ مجھے پیش آ جائے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث ۴۸۴۔۷) صحابہ سے مراد حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے امثال ہیں۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آنحضرت ﷺ سے اعمال کی ظاہری فضیلت کے متعلق زیادہ سوال نہیں کرتے، بلکہ باطنی عیب کی تلاش کرتے ہوئے کہتے یا حضرت فرمایئے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

مُو بمُو و ذرّہ ذرّہ مکرِ نفس　　　　می شناسیدند چُوں گُل از کرفس

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آنحضرت ﷺ کے فیضِ تعلیمات سے نفس کے باریک سے باریک اور ذرّہ ذرّہ فریب کو اس طرح پہچان لیتے جس طرح پھول (کی خوشبو) کو کرفس کی (بدبو) سے (پہچان لیتے ہیں)۔ (۶۸/۱)

بہرِ ایں معنی صحابہ از رسُول ﷺ　　　　مُلتمس بودند مکرِ نفسِ غُول

اسی (قسم کے شیطانی مکر کا سراغ لگانے کے لئے) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ ﷺ سے نفسانی چھلاوے کے فریب پوچھتے رہتے تھے۔ (۶۸/۱)

عالم و عادل سب محض معانی ہیں

کسی مکان میں متحیز ہونا یا پیش و پس کی سمتوں سے منسوب ہونا، جسم کی صفات ہیں جو محسوس بحواس ظاہر ہوتا ہے مگر عادل و عالم وغیرہ صفات کا متحیز اور منسوب نہ ہونا اس کے امرِ معنوی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ معانی لامکان سے بدن پر وارد ہوتے ہیں اور وہ اس آفتابِ روح کی صفات ہیں جو آسمان میں نہیں سما سکتا اور روح لامکانی ہے یعنی عالمِ امر سے تعلق رکھتی ہے اور مجردات سے ہے، اس لئے یہ صفات بھی لامکانی ہیں، جسمانیات سے نہیں ہیں، جبکہ روح کا کوئی خاتمہ نہیں ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

عالمِ و عادل ہمہ معنیٰ ست و بس　　　　کِش نیابی در مکانِ پیش و پَس

(اور) عالم و عادل (وغیرہ اوصاف ہیں جن کو قلم لکھتا ہے) سب محض معانی ہیں، جن کو کسی مکان میں (متحیز) اور آگے یا پیچھے (کسی سمت سے منسوب) نہ پاؤ گے۔ (۱۳۰/۱)

چالیسواں باب

فلسفہ و سائنس

مثنوی میں فلسفہ و سائنس

اگرچہ علمِ کلام، تصوف اور اخلاق سب فلسفہ میں داخل ہیں اور اس لحاظ سے مثنوی تمام تر فلسفہ سے تعلق رکھتی ہے، لیکن چونکہ علمِ اخلاق نے ایک مستقل حیثیت قائم کر لی ہے اور علمِ کلام و تصوف مذہب کے دائرہ میں آ گئے ہیں اس لئے فلسفہ کے عام اطلاق سے یہ علوم متبادر نہیں رہ سکتے، اس بناء پر فلسفہ سے فلسفہ کی دو شاخیں مراد ہیں، جو علومِ مذکورہ سے خارج ہیں۔

مولاناؒ کو اگرچہ مثنوی میں فلسفہ کے مسائل کا بیان کرنا پیشِ نظر نہ تھا لیکن ان کا دماغ اس قدر فلسفیانہ واقع ہوا تھا کہ بلا قصد فلسفیانہ مسائل ان کی زبان سے ادا ہو جاتے تھے۔ وہ معمولی بات بھی کہنا چاہتے تو فلسفیانہ نکتوں کے بغیر نہیں کہہ سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ کوئی مختصر سی حکایت شروع کرتے ہیں تو جزوں میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہم اس موقع پر فلسفہ اور سائنس کے چند مسائل درج کرتے ہیں، جو ضمناً اور تبعاً مثنوی میں بیان کئے گئے ہیں۔

تجاذبِ اجسام

تجاذبِ اجسام کا مطلب ہے کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں اور اسی کشش کے مقابلۂ باہمی سے تمام سیارات اور اجسام اپنی جگہ پر قائم ہیں، اس مسئلہ کی نسبت تمام یورپ بلکہ تمام دنیا کا خیال

ہے کہ یہ نظریہ نیوٹن کی ایجاد ہے، لیکن لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوئی ہو گی کہ سینکڑوں برس پہلے یہ خیال مولانا رومؒ نے ظاہر کیا تھا۔

چونکہ اجرامِ فلکی ہر طرف سے کشش کر رہے ہیں اس لئے زمین بیچ میں معلّق ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے اگر مقناطیس کا ایک گنبد بنایا جائے اور لوہے کا کوئی ٹکڑا اس طرح سے ٹھیک وسط میں رکھا جائے کہ ہر طرف سے مقناطیس کی کشش برابر پڑے تو لوہا درمیان میں لٹکا رہ جائے گا، یہی حالت زمین کی ہے۔

تجاذبِ ذرّات

تحقیقاتِ جدیدہ کی رُو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جسم کی ترکیب نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات سے ہے، جن کو اجزائے مقناطیسی کہتے ہیں۔ ان ذرّات میں بھی باہم کشش ہے لیکن کشش کے مدارج یکساں نہیں۔ بعض ذرّات نہایت شدّت سے کشش کرتے ہیں، اس لئے ان میں نہایت اتصال ہوتا ہے اور اسی قسم کے اتصالِ ذرّات کو عام محاورہ میں ٹھوس کہتے ہیں، مثلاً لوہا بہ نسبت لکڑی کے زیادہ ٹھوس ہے کیونکہ یہ ایسے ذرّات سے مرکّب ہے، جن میں باہمی کشش نہایت قوی ہے، لکڑی کے ذرّات میں یہ کشش کم ہے۔ بعض چیزوں میں یہ کشش اور بھی کم ہوتی ہے اور اس بناء پر وہ بہت جلد ٹوٹ یا پھٹ سکتی ہیں، تخلخل اور تکاثف کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی اجزاء کے اتصال کا کم اور زیادہ ہونا۔

مولاناؒ نے اپنے شعروں میں جذب کو عشق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور یہ صوفیانہ اصطلاح ہے۔ مولاناؒ نے بیان کیا ہے کہ نباتات جن اجزاء سے پرورش پاتے ہیں، وہ جمادی اجزاء ہیں لیکن چونکہ ان میں اور نباتی اجزاء میں باہمی کشش اور تجاذب ہے اس لئے وہ اجزا نبات بن جاتے ہیں، اسی طرح نباتی اجزاء حیوانی اجزاء بن جاتے ہیں اور اگر یہ کشش اور تجاذب نہ ہوتا تو ہر جزو اپنی جگہ جم کر رہ جاتا اور یہ مرکبات ظہور میں نہ آتے۔

تجدیدِ امثال

تحقیقاتِ جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ جسم کے اجزاء نہایت جلد فنا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اجزاء آتے ہیں، یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد انسان کے جسم میں سابقہ ایک ذرّہ بھی باقی نہیں رہتا بلکہ بالکل ایک نیا جسم پیدا ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ فوراً پرانے اجزاء کی جگہ نئے اجزاء قائم ہو جاتے ہیں، اس لئے کسی وقت جسم کا فنا ہونا محسوس نہیں ہوتا۔ یہ تمام باتیں مولانا رومیؒ نے موجودہ سائنسی تحقیقات سے پہلے ہی اپنے کلام میں لکھ دی تھیں۔

اکتالیسواں باب

آہ و زاری

آہ و زاری پیشِ تو بس قدر داشت

(آہ و زاری خدا کے حضور بڑی قدر رکھتی ہے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کوئی مصیبت کسی سبب سے نہیں آتی بلکہ مسبب الاسباب یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر کسی کے اعمال خراب ہیں تو اس کی سزا ضرور ملے گی (دنیا میں اور آخرت میں بھی)۔ قرآن میں ہے "تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔" (سورہ روم)۔ مشہور قول ہے کہ لوگ بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اگر بادشاہ کا دین پر عمل ٹھیک نہ ہو تو قوم کو (ضرور ہی) اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اس میں البتہ عوام کا بھی قصور ہے اس لئے عوام کو اللہ کی طرف سے بادشاہ کی بے دینی کی وجہ سے لازمی عتاب ہوتا ہے۔

آہ و زاری اللہ کی بارگاہ میں بہت قدر رکھتی ہے کیونکہ یہ گناہوں کو معاف کروا دیتی ہے اور بہت سے مصائب دُور کر دیتی ہے۔ سورہَ ھود اور نوح میں ہے کہ توبہ استغفار کرو تمہاری سب مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ اس لیے حضرت حسن بصریؒ نے لوگوں سے کہا کہ استغفار ہر بیماری اور مشکل کا علاج ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ زاری اور استغفار کرو تا کہ تمہاری مشکلیں حل ہوں اور منہ پر رونق آئے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے رونے والے کے آنسوؤں کو شہید کے خون کے برابر درجہ عطا کیا گیا ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ ''خشیتِ الٰہی میں رونے والے کا دوزخ میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ گائے کے تھنوں میں دودھ کا واپس چلے جانا ناممکن ہے۔'' مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؂

از مُسبِّب می رسد ہر خیر و شر — نیست اَسباب و وسائط اے پدر

ہر بھلائی اور برائی سب پیدا کرنے والے (مسبب) کی طرف سے آتی ہے، اے باوا! اسباب اور واسطہ کچھ نہیں ہے۔ (۱۶۲/۵)

جز خیالِ منعقد بر شاہراہ — تا بماند دَورِ غفلت چند گاہ

سوائے خیال کے جو راستے پر جما ہوا ہے تاکہ تھوڑی دیر غفلت کا زمانہ رہے۔ (۱۶۲/۵)

مطلب یہ ہے کہ اے بزرگوار! ہر نیکی و بدی مسبب سے پہنچتی ہے۔ (اسباب سے نہیں پہنچتی) اسباب و وسائل تو سوائے ایک خیال کے اور کچھ نہیں ہیں، جو اس عالم کی شاہراہ پر انسان کے دل میں قائم ہے، یعنی انسان خیال رکھتا ہے کہ یہاں ہر کام سبب سے واقع ہوتا ہے اور اس خیال کا قائم رہنا داخلِ حکمت ہے تاکہ اس عالم میں کچھ وقت تک بے خبری کا دَور رہے۔ اسی بے خبری کی بناء پر انسان کی فطری سعادت و شقاوت کا امتحان ہوتا ہے، ورنہ اگر حقائق سب کی نظر میں عیاں ہو جاتے تو تمام اہلِ عالم سعید بن جاتے ؂

آں رسولِ حق قلاوزِ سلوک — گفت اَلنَّاسُ عَلٰی دِیۡنِ الۡمُلُوۡک

آپ رسولِ حق ﷺ نے جو سلوک (وطریقت) کے پیشوائے عظیم ہیں، فرمایا ہے کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر چلا کرتے ہیں۔ (۱۶۶/۵)

آبِ دیدہ پیشِ تو با قدر بود — من ندانستم کہ آرم ناشنود

آنسو تیری بارگاہ میں قابلِ قدر ہیں، اس لیے میں رونا سننے کی تاب نہ لا سکا یعنی اس کو ان سُنی نہ بنا سکا۔ (۱۶۶/۵)

آہ و زاری پیش تو بس قدر داشت — من ندانستم حقوقِ آں گذاشت

آہ و زاری تیری بارگاہ میں بڑی قدر رکھتی ہے، اس لیے میں اس کے حقوق کو نظر انداز نہ کر سکا۔ (۱۶۶/۵)

پیشِ تو بس قدر دارد چشمِ تر — من چگونہ گشتمے اِستیزہ گر

آنسوؤں بھری آنکھ تیرے حضور میں بڑی قدر رکھتی ہے، میں کس طرح (اس کی پرواہ نہ کر کے) جھگڑتا۔ (۱۶۶/۵)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گریہ و زاری کی جو قدر و منزلت ہے وہ کسی کے ہاں نہیں، فرماتے ہیں کہ اگر گریہ و زاری کی عادت کر لو گے تو تمہاری روح اور چہرے پر ہر وقت خوشی کے آثار نظر آنے لگیں گے۔ ؂

چوں تضرّع را بَرِ حق قدر ہاست — آں بہا کانجاست زاری را کجاست

چونکہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں زاری کی بڑی قدر و قیمت ہے اور زاری کی جو قیمت وہاں ہے اور کہاں ہوگی۔ (۱۶۸/۵)

با تضرّع باش تا شاداں شوی　　گریہ کن تا بے دہاں خنداں شوی

زاری میں مشغول رہو تا کہ تم کو خوشی حاصل ہو، گریہ کرو تا کہ تم منہ کے بغیر ہنسو۔ (یعنی جسمانی نہیں بلکہ رُوحانی تبسم حاصل ہوگا۔ (۵/۱۶۸)

کہ برابر می نہد شاہِ مَجید　　اشک را در فضل با خونِ شہید

کیونکہ خداوندِ بزرگ نے آنسو کو فضیلت میں شہید کے خون کے برابر رکھا ہے۔ (۵/۱۶۸)

ہر تضرع کہ بود با سوز و درد　　آں تَضرُّع را اثر باشد بمرد

جو زاری سوز و درد کے ساتھ ہو، اس زاری کا اثر مرد پر ہوتا ہے (یا تو یہ مطلب ہے کہ خود رونے والے پر اس کا خاص اثر نمایاں ہوتا ہے یا یہ کہ وہ رونا دوسرے آدمی پر اثر کرتا ہے۔ (ج ۵۔۳۱۴)

ہیں ترحم کن بمن رحمت نما　　زانکہ مرغے را نیاز آرد ہما

ہاں رحم کرو، مجھ پر ترس کھاؤ کیونکہ تم اوجِ تقرب کے ہما ہو اور ہما کسی پرندے کو دکھ نہیں دیتا۔ (ج ۵ حصہ ۲ ص۔۳۱۴)

آں منجم چوں نباشد چشمِ تیز　　شرط باشد مردِ اُصطرلاب ریز

منجم جب صاحبِ بصیرت نہ ہو (جو خود بخود احوالِ نجوم معلوم نہ کر لے) تو کسی اصطرلاب بنانے والے آدمی کی ضرورت پڑتی ہے۔ (۵/۱۹۵)

زاں زُمرد مار را دیدہ جہد　　کور گردد مارو رَہرو وا رَہد

اس (صحبتِ شیخ کے) زمرد سے (مال و جاہ کے) سانپ کی آنکھیں نکل پڑتی ہیں، سانپ اندھا ہو جاتا ہے اور راہرو (اس کی اذیّت سے) بچ نکلتا ہے۔ (۵/۱۹۹)

اے خنک چشمے کہ اُو گریانِ اوست

(بڑی مبارک ہے وہ آنکھ جو خدا کے لئے روتی ہے)

مولانا رومیؒ نے عاشقوں کی زاری پر بہت کلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ بہت مبارک ہے وہ آنکھ جو اللہ کے لیے روتی ہے اور وہ دل بہت مبارک ہے جو اس کے لیے جل بھن رہا ہو۔ اس زاری کا انجام بہت بہتر ہے۔ جہاں پانی بہتا ہے وہاں سبزہ ہوتا ہے، آنسوؤں سے جو سبزہ اگتا ہے وہ رُوحانی سبزہ کے زُمرے میں آتا ہے۔ جنگِ تبوک میں کچھ صحابہ جو جنگ میں شامل نہ ہوئے تھے، ان کو توبہ کرنے پر معاف کر دیا گیا۔ قرآن کی رُو سے حضرت حسن بصریؒ (اور دیگر مشائخ) کا قول ہے کہ ''سورۂ نوح'' اور ''سورۂ ھود'' میں توبہ و استغفار پر جو آیات نازل ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مصیبت اور پریشانی کا علاج توبہ و استغفار میں ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ زیادہ بڑی مشکلات میں ایک ہزار سے تین ہزار تک یا اس سے بھی زیادہ بار اگر روزانہ استغفار کیا جائے تو بڑی سے بڑی مشکل بھی حل ہو جاتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے پاس جو شخص کسی مصیبت یا مشکل کی دعا کے لیے

آتا تو آپ اس کو استغفار کے لیے کہتے۔ ایک شخص نے جو آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، عرض کی کہ کیا آپ ہر مشکل کے لیے استغفار کی تلقین فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے سورۂ ھود اور نوح میں پڑھا نہیں کہ استغفار کرو، اس کے باعث تم کو ہر مصیبت سے نجات ملے گی۔

ایک حدیث میں رونے والے کے آنسوؤں کو شہید کے خون کے برابر کہا گیا ہے۔ (احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۱۴۳)۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ جو رحم کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اے خنک چشمیکہ اُو گریانِ اُوست   وے ہُمایوں دل کہ اُو بریانِ اُوست

بڑی مبارک ہے وہ آنکھ جو اس کے لیے روتی ہے اور وہ دل بہت مبارک ہے جو اس کے لئے جل بھن رہا ہے۔
(۱/۱۱۱)

از پئے ہر گریہ آخر خندہ ایست   مَرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

ہر رونے کے بعد بالآخر ہنسی ہے، انجام پر نظر رکھنے والا مبارک انسان ہے۔ (۱/۱۱۱)

ہر کجا آبِ رواں سبزہ بُوَد   ہر کجا اشکِ رواں رحمت شود

جہاں کہیں آبِ رواں ہو، سبزہ ہوتا ہے، جہاں کہیں اشک رواں ہوں تو وہاں رحمت ہوتی ہے۔ (۱/۱۱۱)

باش چوں دولاب نالاں چشم تر   تا زصحنِ جانت بَر روید خضر

رہٹ کی طرح نالاں اور گریاں رہ، تاکہ تیری روح کے صحن سے سبزہ اُگے۔ (۱/۱۱۱)

مرحمت فرمود سید عفو کرد   چوں زجرأت توبہ کرد آں روئے زرد

سیدالکونین ﷺ نے رحم فرمایا، معاف کر دیا، جب اس شرمندہ نے ہمت کر کے توبہ کی۔ (۱/۱۱۱)

رحم خواہی رحم کن بر اشکبار   رحم خواہی بر ضعیفاں رحم آر

تُو رحم چاہتا ہے تو آنسو بہانے والے پر رحم کر، تُو رحم چاہتا ہے تو کمزوروں پر رحم کر۔ (۱/۱۱۱)

چوں خدا خواہد کہ ماں یاری کند
(جب خدا ہماری مدد کرنا چاہتا ہے)

مولانا رومیؒ کا یہ خیال بالکل قرآن اور سنت کے مطابق ہے کہ جو زاری کرتا ہے تو خدا کی مدد اس کے حال میں شامل ہو جاتی ہے۔ جب وہ کسی کو زاری کی توفیق دے دیتا ہے تو اس کے قلبی میلان اور کوششوں کو دیکھ کر ہی یہ توفیق عطا کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کی پردہ دری کرنا چاہتا ہے تو اس کو (اس کے قلبی خیالات اور اعمال کی نوعیت کے مطابق) پاک لوگوں پر طعنہ زنی کرنے کا میلان پیدا کر دیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے کسی کی عیب پوشی کرنا چاہتا ہے تو وہ شخص عیب داروں کے عیب بھی نہیں بیان کرتا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس دَرَد   میلش اندر طعنۂ پاکاں بَرَد

جب خدا چاہتا ہے کہ کسی کی پردہ دری کرے تو اس کا میلان پاک لوگوں پر طعنہ زنی میں کر دیتا ہے۔ (۱/۱۱۰)

وَر خدا خواہد کہ پوشد عیبِ کس   کم زند در عیبِ معیوباں نَفَس

اگر خدا چاہتا ہے کہ کسی کی عیب پوشی کرے تو عیب داروں کے عیب بھی نہیں بیان کرتا۔ (۱/۱۱۰)

چوں خدا خواہد کہ ماں یاری کند   میلِ مارا جانبِ زاری کند

جب خدا ہماری مدد کرنا چاہتا ہے تو ہمیں انکساری کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ (۱/۱۱۰)

نالہء مومن ہمیں داریم دوست

(ہم مومن کے رونے کو دوست رکھتے ہیں)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندۂ مومن زاری کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ اے ہر دُعا کو قبول کرنے والے اور پناہ دینے والے! فلاں بندہ گڑگڑا رہا ہے اس پر رحم فرما۔ سورۂ المؤمن آیت نمبر ے میں فرشتوں کا مومنوں کے لیے دُعا کرنے کا ذکر ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ فرشتے جو عرش کے ارد گرد (حلقہ زن) ہیں وہ اہلِ ایمان کے لئے استغفار کرتے ہیں اور ان کے لئے بھی مغفرت کی دُعا کرتے ہیں، جنھوں نے کفر سے توبہ کی ہے۔ فرشتے یہ بھی کہتے ہیں، اے خدا! تو بیگانوں کو عطا کرتا ہے تو ان مومنوں پر بھی اپنی عطا کے دروازے کھول دے۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ عطا میں تاخیر ان کی ذلت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ یہ زیادہ گڑگڑائیں تاکہ ان کو میں زیادہ عزت بخشوں۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

پس ملائک با خدا نالند زار   کائے مُجیبِ ہر دُعا و مُستجار

پھر فرشتے خدا کے سامنے عاجزی سے روتے ہیں کہ اے ہر دُعا کو قبول کرنے والے اور پناہ گاہ! (۶/۴۰۵)

بندۂ مُومن تضرّع می کُند   اُو نمی داند بجز تو مُستند

ایک مومن بندہ گڑگڑا رہا ہے، وہ تیرے سوا کسی کو سہارا نہیں سمجھتا ہے۔ (۶/۴۰۵)

تو عطا بیگانگاں را می دہی   از تو دارد آرزو ہر مشتہی

تو غیروں کو عطا کر دیتا ہے، ہر خواہشمند تجھ سے ہی اُمید رکھتا ہے۔ (۶/۴۰۵)

حق بفرماید نہ از خواری اُوست   عینِ تاخیرِ عطا یاریِ اُوست

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ اس کی ذلت کی وجہ سے نہیں ہے، عطا میں تاخیر بعینہٖ اس کی مدد ہے۔ (۶/۴۰۵)

نالہء مُومن ہمیداریم دُوست   گو تضرع کُن کہ ایں اعزازِ اُوست

ہم مومن کے رونے کو دوست رکھتے ہیں، کہہ دو کہ گڑگڑائے کیونکہ یہ اس کا اعزاز ہے۔ (۶/۴۰۵)

زور را بگزار و زاری را بگیر
(زور کو چھوڑ دو اور زاری اختیار کرو)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ پروانے کی طرح محنت اور خطرات کی آگ میں کُود پڑو اور سونے کی تھیلی (پیر بن کر لوگوں سے نذرانے لینے) کی نہ سوچو، مال و دولت کو اکٹھا کرنے کے ایسے زور کو چھوڑو اور اللہ کی بارگاہ میں زاری کرو۔ اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم اور فضل زاری کے راستے سے ہی آتا ہے، جو زاری کرتا ہے اس پر رحم زیادہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کے رحم کو زاری میں تلاش کرو۔ مجبور اور مضطرب کی زاری جلد سنی جاتی ہے اور جھوٹی زاری کسی مطلب کو پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے، جس طرح یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یوسفؑ کی موت کی خبر اپنے والد کو سنا کر جھوٹا رونا رویا تھا۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

لیک چوں پروانہ در آتش بتاز ‌ ‌ ‌ کیسہء زَر برمدوز و پاک باز

لیکن پروانہ کی طرح آگ میں کود پڑو، سونے کی تھیلی نہ سیو اور پاکباز رہو۔ (۵۸/۵)

اخلاص کے ساتھ ریاضات، مجاہدات کی تکالیف برداشت کرو، ان ریاضات سے یہ مقصد نہ رکھو کہ ایک دن پیرو مرشد بن کر مریدوں سے سیم و زر کمائیں گے اور تھیلیاں بھریں گے۔

زور را بگذار و زاری را بگیر ‌ ‌ ‌ رحم سوئے زاری آید اے فقیر

زور کو چھوڑو اور زاری کو اختیار کرو، اے فقیر! خداوند تعالیٰ کا رحم زاری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ (۵۸/۵)

گر کُنی زاری بیابی رحمِ او ‌ ‌ ‌ رحمِ اُو دَر زاریِ خود باز جُو

اگر تم زاری کرو گے تو اس کا رحم اپنے اُوپر مبذول پاؤ گے، اس کے رحم کو اپنی زاری میں طلب کرو۔ (۵۸/۵)

زاریٔ مُضطر کہ تشنہ معنوی ست ‌ ‌ ‌ زاریٔ سرد و دروغ آنِ غوی ست

مجبور پیاسے کی زاری سچی (زاری) ہے، بخلاف اس کے ٹھنڈی اور جھوٹی زاری اس گمراہ کی ہے جو کسی غرض سے رونے والی صورت بناتا ہے۔ (۵۸/۵)

گریہء اِخوانِ یوسف حیلتست ‌ ‌ ‌ کاندروں شاں پُر زرشک و علتست

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا رونا ایک بناوٹ ہے کیونکہ ان کا دل تو حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف رشک اور خرابی سے پُر ہے پھر ان کی ہمدردی میں رونا دھونا کیا ہے۔ (یہ جھوٹا رونا ہے) (۵۸/۵)

گریہء با صدق بَر جانہا زَنَدْ ‌ ‌ ‌ تا کہ چرخ و عرش را گریاں کُند

سچا رونا جانوں یا روحوں پر اثر کرتا ہے، حتیٰ کہ آسمان اور عرش کو بھی رُلا دیتا ہے۔ (۷۲/۵)

گریہء بے صدق بے سوزش بوَد   دیو دوں بر گریہ اش خنداں شود

(بخلاف) اس کے صدق سے خالی رونا جوش نہیں رکھتا، اس لیے شیطان بھی اس (رونے والے) کے رونے کا مذاق اُڑاتا ہے۔ (۷۲/۵)

عقل و دلہا بے گمانے عرشی اند   در حجاب از نور عرشی میزیند

(انسان کی) عقل اور قلوب بلاشبہ عرش سے منسوب ہیں اور در پردہ عرشی نور سے زندہ ہیں۔ (۷۲/۵)

گرہمی خواہی کہ مشکل حل شود
(اگر مشکل کو حل کرنا چاہتے ہوتو)

اگر آدمی چاہے کہ محرومی کا کانٹا پھول میں بدل جائے تو اس آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنے طفلِ چشم کو رُلائے کیونکہ مراد مندی رونے پر موقوف ہے۔ رو کر، گڑگڑا کر دُعا مانگے بغیر اپنے مُدعا میں کامیابی ناممکن ہے۔ اسی طرح ایک زاہد کو اس کے ایک دوست نے کہا کہ اتنا نہ رویا کرو کہ آنکھ میں کوئی خرابی آ جائے تو زاہد نے کہا، اگر رونے سے یہ آنکھیں حق تعالیٰ کے نور کا مشاہدہ کریں گی تو پھر ان کے جانے کا کیا غم، وصالِ حق میں مشاہدہٴ جمال کے وقت جو دو آنکھیں ملیں گی وہ کیا کم ہیں، اگر وہ مشاہدہٴ جمال نہ کریں گی تو بے شک جاتی رہیں، ایسی بدبخت آنکھ کو اندھی ہو جانے دو۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جب اپنے بندے کو اس کی دو پیاری چیزوں میں مبتلا کرتا ہوں تو اگر وہ صبر کرے تو میں ان دونوں کے عوض اس کو جنت دوں گا۔'' (ان دو چیزوں سے) آپ کی مراد اس کی دو آنکھیں ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف الاحادیث القدسیہ ص ۱۵۱)

مولانا رومؒ ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں ؎

گرہمی خواہی کہ مُشکل حل شود   خارِ محرومی بگُل مُبدل شود

اگر تم چاہتے ہو کہ مشکل حل ہو جائے اور محرومی کا کانٹا پھول میں بدل جائے۔ (۵۵/۲)

گر ہمی خواہی کہ آں خلعت رسد   پس بگریاں طفلِ دیدہ بَر جسد

اگر تم چاہو کہ خلعتِ قبولِ حق تم کو مل جائے تو اپنے طفلِ چشم کو جسم پر رلاؤ۔ (۵۵/۲)

کامِ خود موقوفِ زاریٔ دلست   بے تضرع کامیابی مُشکل است

مراد مندی دل کے رونے پر موقوف ہے، گڑگڑا کر دُعا کیے بغیر کامیابی مشکل ہے۔ (۵۵/۲)

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال   چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

زاہد نے کہا، میرا حال دو صورتوں سے خالی نہیں، آنکھ اس کے جمال کو دیکھے گی یا نہ دیکھے گی۔ (۵۵/۲)

نالم ایں را نالہا خوش آیدش
(میں اس لیے روتا ہوں کہ خدا کو رونا پسند ہے)

جو بندہ گزرے ہوئے اعمال کے غم میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہو کر اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتا ہے تو فی الحقیقت وہ آنسو نہیں بلکہ موتی ہیں، ان کو آنسو سمجھنا غلطی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو گریہ و زاری بہت پسند ہے۔ میں اس کے ناز سے کیوں کڑوے آنسو نہ بہاؤں، میں اس کے عاشقوں کے حلقے میں کیوں داخل نہ ہو جاؤں، میں اس کے دن کے سے روشن جلوے کے بغیر اور اس کے دن کو روشنی بخشنے والے چہرے کو دیکھے بغیر کیوں نہ رات کی طرح سیاہ بخت ہو جاؤں؟ میں اس لیے روتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو رونا اچھا لگتا ہے۔

محبوبِ حقیقی اپنے عشاق کے درد سے اس لیے خوش ہے کہ وہ اس کے عشق و محبت کے مقتضیات سے ہے اور درد ہر چند عشاق کے لیے تکلیف دہ ہے مگر چونکہ وہ رضائے محبوب کا باعث ہے اور محبوب کا مرغوب بھی محبوب ہوتا ہے اس لیے درد اُن کو محبوب ہے۔

مولانا رومؒ کا کلام اس کی عکاسی کرتا ہے ؎

عاشقم بر رنجِ خویش و دردِ خویش — بہرِ خوشنودیٔ شاہِ فردِ خویش

میں اپنے رنج و درد کا عاشق ہوں اور اپنے آقائے واحد کی خوشی کی خاطر اپنے رنج اور اپنے درد کو چاہتا ہوں۔ (۱/۱۹۹)

نالم ایرا نالہا خوش آیدش — از دو عالم نالہ و غم بایدش

میں اسی لیے روتا ہوں کہ اس کو رونا اچھا لگتا ہے، اس کو دو جہاں سے نالہ و غم بھاتا ہے۔ (۱/۱۹۸)

خاکِ غم را سُرمہ سازم بہرِ چشم — تا زگوہر پُر شود دو بحرِ چشم

میں غم کی مٹی کو آنکھوں کا سُرمہ بناتا ہوں تا کہ دونوں آنکھوں کے دریا اشک کے موتیوں سے بھر جائیں۔ (۱/۱۹۹)

گر بنالیدے و مستغفر شدے
(اگر روئے اور استغفار کرے تو خدا کا نورِ رفتہ مل جاتا ہے)

دُعا و مناجات اور توبہ و استغفار کرنے کو تو بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر توبہ کے لئے گریہ و زاری بہت ضروری ہے۔ جب تک سوزشِ دل کی بجلی اور دونوں آنکھوں کے آنسوؤں کا پانی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی آگ کب تسکین پا سکتی ہے؟ جس طرح میوہ کی پختگی کے لئے حرارت اور پانی چاہیئے اسی طرح میوۂ اعمال کی پختگی کے لئے سوزشِ قلب اور اشکباریٔ چشم کی ضرورت ہے، اس طرح کرنے سے سب کی دعائیں مقبول ہوں گی اور سب اپنی محنت کا پھل پائیں گے۔

می بباید تاب و آبے توبہ را　　　شرط شد برق و سحابے توبہ را

(کیونکہ) توبہ کے لئے سوزش (قلب) اور اشکباری (چشم) کی ضرورت ہے۔ توبہ کے لئے (بے قراری) اور بادل (کی سی اشکباری بھی چاہیئے)۔ (۱۶۴/۲)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہارے پانی کو زمین کے اندر چھپا دوں اور چشموں کو خشکی کا خطہ بنا دوں، تو کون ہے جو اس پانی کو دوبارہ چشموں میں لائے؟ سوائے میرے جو کہ بے مثل ہوں، بزرگی اور اہمیت والا ہوں۔ ایک قاری قرآن مجید میں سے "مَاءُ کُمْ غَوْرًا" (الملک: ۳۰) (جس کے معنے ہیں کہ اگر میں بند کر دوں پانی کو) پڑھ رہا تھا تو ایک ذلیل فلسفی اس وقت مدرسے کے پاس سے گزر رہا تھا، اس نے اس آیت کے جواب میں یہ کلمات کہہ ڈالے "ہم پھاوڑے کی ضرب اور تیشے کی تیزی سے زمین کھود کر پانی کو پستی سے بلندی پر لے آئیں گے۔" فلسفی رات کو سویا اور خواب میں ایک شیر مرد کو دیکھا، جس نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور اس کی دونوں آنکھیں اندھی کر دیں اور جھڑک کر کہا، اگر تُو سچا ہے تو پہلے ذرا اپنے ان دونوں چشمہءِ چشم میں سے اپنی طاقت وعلم کے ساتھ نور تو نکال لا؟ جب دن کو فلسفی بستر سے اُٹھا تو سچ مچ اپنی آنکھوں کو اندھا پایا اور نورِ بصارت دونوں آنکھوں سے نابود تھا۔ اگر وہ اپنی گستاخی سے شرمندہ ہو کر توبہ و گریہ زاری کر لیتا تو یہ بعید نہ تھا کہ اس کا گُم شُدہ نُورِ خدا کے فضل و کرم سے پھر ظاہر ہو جاتا لیکن توبہ و استغفار پر مائل ہونا بھی ہر شخص کے اختیار میں نہیں، توبہ کے مزے کی چاہ ہر غافل کو نہیں ہوتی۔ اعمالِ بد کی خرابی اور انکارِ حق کی نحوست نے اس فلسفی کے دل پر توبہ کا راستہ بند کر رکھا تھا۔ فلسفی لوگوں کے قلوب اس قسم کے ایمان و یقین کے نور سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

گر بنالیدے و مُستغفر شُدے　　　نورِ رفتہ از کرم ظاہر شُدے

اگر وہ (اپنی اس گستاخی سے نادم ہو کر) رو دیتا اور استغفار کرتا تو (بعید نہ تھا کہ اس کا) گم شدہ نورِ (رحمتِ خدا کے کرم سے (پھر) ظاہر ہو جاتا۔ (۱۶۴/۲)

یہاں ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے کہ امام بخاری جوانی کی حالت میں اندھے ہو گئے۔ آپ کی والدہ نے زاری کی اور خدا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ الٰہی میرے بیٹے کو ایسے بینا کر دے جیسے وہ ماں کے پیٹ میں بینا تھا۔ امام بخاری کی بینائی درست ہوگئی اور بخاری شریف آپ نے اس بینائی کے ملنے کے بعد لکھی۔

رحمتے بے علتے بروے بتافت

(رونے والے پر بلا تاخیر رحمتِ الٰہی نازل ہوتی ہے)

انسان کے دل میں بنی نوع انسان کی تکلیف و مصیبت کو دیکھ کر جو ایک قدرتی درد پیدا ہوتا ہے، اس کو علمائے اخلاق نے شفقت و رقّت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ نوعِ انسان کے فضائلِ خاصہ میں سے ایک فضیلت ہے اور پھر اس وقت دردِ دل اور رقّت و شفقت کی شان و عظمت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب کہ اس کا کوئی خاص باعث

اور سبب نہ ہو یعنی کسی خاص قرابت یا صحبت اور رفاقت کا تعلق اس کا محرک نہ ہو اور اس کی تہہ میں کوئی احسانِ ماضی یا توقعِ مستقبل اثر انداز نہ ہو تو ایسے دردِ دل کو مولانا نے رحمتِ بے علّت کہا ہے۔

شریعت پاک نے کسی عزیز کے فراق یا موت پر جہاں نوحہ خوانی و سینہ کوبی اور بے صبری کے افعال سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، وہاں اشکباری کو جو دردِ دل کی اضطراری مقتضیات انسانی سے ہے، جائز رکھا ہے بلکہ اس کو رحمت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس لیے مولانا نے بھی اس کو رحمت قرار دیا ہے ؎

باز اندر چشم خود او گریہ یافت — رحمتِ بے علتے بروے بتافت

پھر انھوں نے اپنی آنکھ میں رونے کا اثر پایا (اور اللہ تعالیٰ کی صفت) رحمت نے جو محض بے علّت ہے ان پر تجلی کی۔ (۱/۲۷۲)

ہیں بہ پشتِ آں مکن جرمِ گناہ
(توبہ کے پیچھے جرمِ گناہ نہ کرو)

قلب کثرتِ گناہ سے تاریک اور مسخ ہو جائے تو پھر نیکی اور بدی کی تمیز نہیں رہتی اور انسان بُرا کام کرنا اپنا پیشہ بنا لیتا ہے اور احساس اور فکر کی آنکھ میں خاک ڈال لیتا ہے، حتیٰ کہ پھر نہ گناہ کی بُرائی سوجھتی ہے اور نہ اس کا بُرا انجام خیال میں آتا ہے۔ اس صورت میں اگر وہ توبہ و استغفار کا ارادہ نہیں کرتا تو وہ گناہ اس کے دل کو اور بھی اچھا لگتا ہے اور ایک بے دین انسان کی طرح کفر کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ کثرتِ گناہ کی وجہ سے اس کے دل پر زنگارِ غفلت کی ساٹھ تہیں چڑھ جاتی ہیں، وہ زنگ اس کے دل کے لوہے کو کھانے لگتا ہے، پھر اس کا قلب بالکل سیاہ اور مسخ ہو جاتا ہے، جیسے کافر کی روح۔

توبہ و استغفار کے ساتھ عجز و انکساری اور احکامِ شرع پر گامزن رہنا چاہیے۔ اس بھروسہ پر گناہِ کبیرہ اور گناہِ صغیرہ پر ساری زندگی گزار لینا کہ توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے اور آخری عمر میں گریہ زاری و توبہ کر لوں گا، غلط ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ سب کی توبہ قبول ہوگی اور سب کو استغفار کا صلہ ملے گا، لہٰذا یہ خیال چھوڑ دو کہ گناہ کر کے توبہ کر لوں گا اور بخشش ہو جائے گی، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت فضل و کرم مانگتے رہنا چاہیے ؎

ہیں بہ پشتِ آں مکن جرم و گناہ — کہ کنم توبہ درآیم در پناہ

خبردار! اس بھروسہ پر جرم و گناہ کے مرتکب نہ ہونا کہ میں (پھر کبھی) توبہ کر لوں گا (اور حق تعالیٰ کی) پناہ میں آ جاؤں گا۔ (۲/۳۱۸)

توبہ نندیشد دگر شیریں شود — بردلش آں جرم تابیدیں شود

توبہ کی فکر نہیں کرتا اور پھر میٹھا بن جاتا ہے، اس کے دل پر وہ گناہ یہاں تک چھا جاتا ہے کہ وہ بے دین ہو جاتا ہے۔ (۲/۳۱۸)

بیالیسواں باب

توکّل

کسی کام میں اسباب اختیار کرنے کے باوجود اسباب پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے فقط اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا نام توکّل ہے اور یہی توکّل کے لغوی معنی ہیں۔ اصطلاح میں بھی توکّل کے معنی خدا پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔ ترکِ اسباب کو توکّل سمجھنا، بے سمجھی اور اسلامی تصور کے منافی ہے۔ توکل کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ''وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ'' (ابراہیم: ۱۱) یعنی خدا ہی پر مؤمنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے ''فَلْيَتَوَكَّلْ'' صیغۂ امر ہے، جہاں امر ہو اُس کی اطاعت لازم ہے۔ وکیل کو کام سونپ دینے کے بعد موکل سو نہیں جاتا بلکہ پوری جدوجہد کرتا ہے تاکہ کام میں سُستی نہ ہو۔ یہی منشاء الٰہی ہے کہ توکل تو اللہ تعالیٰ پر کرو مگر اپنے کام کے لئے احکام وقوانین کے مطابق جدوجہد بھی جاری رکھو۔

توکّل کے غلط معنی

مغربی تہذیب اور مادہ پرست لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اسباب ہی سے ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات صرف علّت ومعلول کے غیر منتہی سلسلے کا نام ہے اور اسباب کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان خیالات کا ہمارے رُوحانی نظریات پر یہ اثر ہوا ہے کہ لوگوں کی ایک اکثریّت نے اسباب پر ہی آنکھیں جما لی ہیں۔ اسباب کے ساتھ رُوحانی پہلو کو بھی مدِّنظر رکھنا مسلمانوں کا امتیاز ہے، جب کہ فرنگی دنیا والے فقط مادی پہلو اختیار کرتے ہیں اور رُوحانی پہلو کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

توکّل کی فضیلت میں احادیث

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرو، جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دے گا، جس طرح پرندوں کو دیتا ہے، وہ صبح کو بالکل بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر لوٹتے ہیں۔" (مشکوٰۃ، ج ۲، ص۵۱۹،۵۲۰)

۲۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث کا خلاصہ یوں ہے کہ "آدمی کا دل وادیوں میں بھٹکتا رہتا ہے اور جس کا توکل اللہ پر ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو وادیوں اور راستوں میں بھٹکنے سے بچا لے گا۔"

۳۔ ایک حدیث میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خوب محنت کرو اور اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کرو۔"

۴۔ بخاری شریف میں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار اشخاص کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل کرے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو داغ نہیں لگواتے، شگون نہیں لیتے، منتر نہیں پڑھتے، بلکہ خدا پر ہی توکل کرتے ہیں۔" (مشکوٰۃ، ج۲، ص۵۱۸)

۵۔ ایک روایت میں ہے: کہ "حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک ناقہ سوار صحابی نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ اس اونٹنی کو چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کئے رہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی ٹانگوں میں رسی باندھو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔" (الدرر المنتشرۃ، ص۹۱، احیاء علوم الدین، ج۴، ص۲۴۴)

علاماتِ متوکل

یحییٰ بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ انسان کب متوکل کہلاتا ہے؟ فرمایا! جب وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا وکیل بنانے پر راضی ہو جائے۔ سہل بن عبداللہ نے فرمایا ہے کہ متوکل کی تین علامات ہیں:

۱۔ وہ نہ کسی سے مانگے ۲۔ نہ کسی چیز کو رد کرے ۳۔ نہ اپنے پاس کچھ روکے۔

آپ کا یہ بھی قول ہے کہ توکل کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہو، جس طرح مردہ غسال کے سامنے ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے اسے پلٹتا ہے اور مردہ نہ کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ کوئی تدبیر۔

توکّل کے ساتھ جدوجہد کرنا

حضرت علامہ اقبالؒ نے بھی اسباب کو اختیار کرنے پر اور محنت کرنے پر زور دیا ہے۔ اسلام کی تعلیم بھی یہ ہے کہ جتنی طاقت ہے اتنی محنت اور کوشش کی جائے اور پھر نتیجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا جمود کے سِوا کچھ نہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

خبر نہیں کیا نام ہے اُس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلّد ابھی ناخوش ابھی خورسند

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے ترا مرضِ کور نگاہی

حضرت علامہ اقبالؒ کا سارا کلام اس بات پر شہادت دیتا ہے کہ اے مسلمان! کام کر اور پھر دیکھ اللہ تعالیٰ تجھے کیا انعامات دیتا ہے؟

تیرے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تُو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

یعنی قضا کے منتظر نہ رہو بلکہ قضا مومن کی منتظر ہوتی ہے۔ توکل اور جدوجہد پر مولانا رومؒ نے بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے، جو شعروں کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے۔

گفت پیغمبر با آوازِ بلند
بر توکّل زانوئے اُشتر بہ بند

پیغمبر ﷺ نے بلند آواز سے کہا ہے، توکّل کے ساتھ اُونٹ کے گھٹنے باندھ دو۔ (۱/۱۱۹)

توکّل اختیار کرنا نبی پاک ﷺ کی سنت ہے۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے ''اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ'' یعنی اُونٹ کو رسی سے باندھ اور خُدا پر بھروسہ کر یعنی حفاظت کے لئے جو اسباب ہیں وہ بھی اختیار کر۔

نیست کسبے از توکّل خوب تر
چیست از تسلیم خود محبوب تر

کوئی کوشش توکل سے بہتر نہیں، تسلیم و رضا سے زیادہ محبوب کیا چیز ہے؟ (۱/۱۱۹)

اس شعر میں مولاناؒ فرماتے ہیں کہ توکل سے کوئی چیز بہتر نہیں یعنی کوئی کوشش بہتر نہیں، جو انسان خدا کی رضا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کے وہ خدا پر توکل کرے لیکن توکل اس طرح کرے کہ پہلے راہِ کسب اختیار کرے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے، قرآن مجید میں ہے ''وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ'' اور جو اللہ پر توکل کرے تو وہ اسے کافی ہے (الطلاق:۳)۔ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ اگر یقین کے ساتھ توکل شامل ہو تو جس بات پر توکل کیا جائے، اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیتا ہے۔ اس پر طویل گفتگو کسی اور کتاب میں کی جائے گی۔

تقدیرِ الٰہی کا مقابلہ فضول ہے

ملک مصر میں ایک ظالم بادشاہ کا نام ولید بن مصعب اور لقب فرعون تھا۔ وہ خدائی کا مدّعی تھا اور لوگوں کو اپنی پرستش پر مجبور کرتا تھا۔ قیاس سے کاہنوں نے یہ تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا جو تم کو اور تمہارے

مذہب کو تباہ کر دے گا تو اُس ستم گر نے دشمن سے بچنے کے لئے بارہ ہزار معصوم و بے گناہ بچے قتل کرا دیئے۔ اس کو کوئی خبر نہ تھی کہ وہ دُشمن میرے گھر میں پرورش پا رہا ہے اور میری ہی گود میں کھیل رہا ہے۔ غرض یہ کہ تقدیرِ الٰہی کا مقابلہ فضول ہے، دراصل مقابلہ کرنے والا خود اپنے ہاتھوں مقتضائے تقدیر کو پورا کرتا ہے۔

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی یوں قتل سے بچوں کے کبھی ہوتا نہ بدنام

مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود

قضا سے گریز کرنے والے نے دشمن سے بچنے کے لئے دروازہ بند کرلیا اور (تماشہ یہ کہ) دشمن گھر ہی میں (موجود) تھا، فرعون کا حیلہ (بھی) اس بات (کے قبیل سے تھا) (۱/۱۲۰)

صد ہزاراں طِفل کُشت آں کینہ کش وانکہ اُو می جُست اندر خانہ اش

اُس کینہ والے نے (بنی اسرائیل کے) لاکھوں بچے مروا ڈالے اور جس کو (قتل کرنے کے لئے وہ تلاش کرتا تھا وہ (خود اس کے گھر میں موجود تھا)۔ (۱/۱۲۰)

در توکّل تکیہ بر غیرے خطاست
(توکّل میں غیر پر بھروسہ غلط ہے)

در توکّل تکیہ بر غیرے خطاست پس بدانکہ کَسب ہا از ضُعف خاست

پس جان لے کہ کوشش ضعفِ اعتقاد سے پیدا ہوتی ہیں، توکل میں غیر پر بھروسہ غلط ہے۔ (۱/۱۱۹)

اس شعر میں بیان کیا جا رہا ہے کہ توکل تمام ذرائع رزق سے افضل ہے۔ توکّل سے بہتر رزق کا کوئی ذریعہ نہیں بلکہ یہاں تک بیان کر رہے ہیں کہ کسب کوئی فطری و ضروری امر نہیں ہے بلکہ اس کا رواج یوں پڑا ہے کہ لوگ رُوحانی کمزوری کے سبب توکل کے معتقد نہیں ہوئے تھے تو قدرت نے اُن کے لئے روزی کے اکتساب کا حیلہ نکالا جو اُن کی استعداد کے مطابق ہو، ورنہ کافی عرصہ تک بلا اسباب روزی دی جاتی رہی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مریض کو اگر کڑوی دوائی اچھی نہ لگے تو اس کو پلانے کے لئے اُس میں قند ملا دی جاتی ہے تاکہ وہ اُس کو پی لے، اس طرح کسب بھی تدبیر ہے۔

تقدیر کے سامنے تدبیر بھی کوئی کام نہیں کرتی

بس جہند از مار سوئے اژدہا بس گریزند از بلا سوئے بلا

بہت سے غیر متوکّل لوگ (ایک) بلا سے بھاگتے ہیں تو دوسری (اس سے بڑی) بلا کی طرف جا نکلتے ہیں، (اسی طرح) بہت سے لوگ سانپ سے بھاگتے ہیں (تو) اژدہے کی طرف جا پہنچتے ہیں۔ (۱/۱۱۹)

تقدیر کے آگے تدبیر نہیں چلتی اور اسی طرح قضا سے بچنے کے لئے کوئی تدبیر کرنا خود قضا کی طرف چلنا ہے۔ انسان معنی و تدبیر کرتا ہے لیکن تقدیر اُس کے کام پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان تمام اسباب و ذرائع سے دستبردار ہو جائے اور توکّل وتسلیم کے زُعم میں اُس بلا کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ جان دیدے، حالانکہ مہالک سے پرہیز، خطرات سے بچاؤ، دشمن کی مدافعت یہ سب تقاضائے عقل ہیں۔ یہ کوئی قضا سے گریز نہیں اور نہ توکّل کے خلاف ہے۔ محتاط آدمی جو قضا پر ایمان رکھتا ہے جب وہ کسی بلا سے بچنے کے لئے کوشش کرتا ہے تو لوگ اُسے طعنہ دیتے ہیں کہ وہ قضا سے بھاگتا ہے، حالانکہ وہ قضا سے بھاگتا ہے، نہ بھاگ سکتا ہے بلکہ اچھے اچھے بزرگانِ دین نے دُشمن سے بچنے کے لئے دوستِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہنا اختیار کیا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ جس طرح بلا و مصیبت خدا کی بنائی ہوئی ہے، اسی طرح اس سے بچنے کے اسباب بھی خدا نے بنائے ہیں۔

در توکّل کسب و جہد اولیٰ ترست

(توکّل میں سعی وکسب کرنا بہتر ہے)

یہاں توکل میں کسب اور کوشش کو اختیار کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے دوست بن جاؤ۔ سعی وکسب کے بارے میں قرآن و حدیث میں بھی زور دیا گیا ہے۔ قرآن (سورۃ النجم آیت ۳۹) میں ہے "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی." نہیں ہے انسان کے لئے مگر جو کوشش کرے۔ حدیث پاک ہے "اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ" حلال روزی کمانے والا اللہ تعالیٰ کا دوست ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوشش اور کسب انسان کے لئے کتنا اہم ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ایک عرابی کو دیکھا کہ اُس نے اپنا اونٹ مسجد کے دروازے پر بٹھا دیا اور کہا "تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ" یعنی اس کی حفاظت کے لئے اللہ پر توکل کرتا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "توکل کے ساتھ اس کا زانو بھی باندھ دو۔" جس کا مقصد یہ ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے اسبابِ ظاہری کو بھی کام میں لاؤ اور توکل بھی کرو۔ اسبابِ ظاہری توکل کے خلاف نہیں ہیں، لہٰذا کسب کے ساتھ توکل کرو، کوشش کے ساتھ توکّل کرو۔ صحیح توکّل یہ ہے کہ استعمالِ اسباب کے ساتھ حافظِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو سمجھو۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

در توکل کسب و جہد اولیٰ ترست　　　تا حبیبِ حق شوی ایں بہتر ست

توکّل میں کسب اور کوشش بہتر ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے پیارے بن جاؤ، یہ بہت اچھی بات ہے۔ (۱/۱۱۹)

جہد کن جدّے نما تا وا رہی

(جب تک خلاصی نہ ملے جہد کرتے رہو)

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت وقدرت سے اسبابِ معیشت اور وجوہِ اسباب کو مقرر فرمایا ہے، اُن کو اختیار کرنا آدمی

کی ذمہ داری ہے اور اُن سے بے خبر رہنا آدمی کی حماقت ہے۔ اسی طرح امام غزالیؒ نے ایک واقعہ احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ ایک زاہد نے تمام اسباب ترک کر کے اللہ تعالیٰ پر توکّل کرتے ہوئے ایک غار میں ڈیرہ لگایا، جہاں ایک ہفتہ بھوک کاٹنے کے بعد جب وہ تنگ ہوگیا تو اُس نے دعا کی کہ الٰہی! تُو نے جو رزق میرے لئے مقرر کیا ہے یا وہ مجھے دے دے یا موت دے دے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ترکِ دنیا سے ہماری حکمت کو توڑ دو اور کیا تم جانتے نہیں کہ ہمیں اپنے دستِ قدرت سے اپنے بندے کو رزق دینے سے، اپنے بندوں کے ہاتھوں دلانا زیادہ محبوب ہے۔ امام ممدوحؒ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ تمام اسباب کو ترک کر دینا حکمتِ الٰہیہ سے مقابلہ کرنا ہے اور سنت اللہ کو کچھ نہ سمجھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ خود کسب کر کے کھاؤ کیونکہ کسب اللہ تعالیٰ کو ایسے غیب کی روزی دینے سے زیادہ عزیز ہے۔ جدوجہد کے متعلق مولانا رومؒ کا قول ہے کہ ؎

جہد کن جدّے نما تا وا رہی   گر تو از جَہدش بمانی اَبلہی

کوشش کر، تندہی کر، تاکہ (تو) (مشکلاتِ معیشت سے) نجات پائے اور اگر اس (حکیمِ مطلق اور قادرِ برحق) کے مقدر کیے ہوئے) جدوجہد سے تو (قاصر) رہ گیا تو احمق ہے۔ (۱/۱۱۹)

تینتالیسواں باب

عبادتِ نماز و روزہ

نماز و روزہ کو اسلام کے اہم ارکان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ماہِ رمضان تو سال میں ایک بار ہی آتا ہے مگر نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں ہر مسلمان کو روزانہ پانچ مرتبہ اللہ کے دربار میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ایک دن میں پانچ بار اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا حکم صرف نماز کی بابت ہی دیا گیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام ارکان سے زیادہ نماز کے رکن کو ہی اہمیت حاصل ہے۔

نماز کی اہمیت کا اندازہ مطلوب ہو تو ہماری تصانیف ''حُسنِ نماز''، ''نشانِ منزل'' اور ''اقامتِ صلوۃ'' کا مطالعہ بہت سُودمند ہوگا کیونکہ ان کتب میں یہ خوبی ہے کہ ان کے مضامین پوری تفاصیل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اور قارئین کو ان کا طرزِ تحریر نہایت دل چسپ اور موثر انداز میں مل سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو عوام کے لئے شائع کیا گیا ہے، لہٰذا معمولی تعلیم والے حضرات بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور ان کی قیمت اتنی کم رکھی گئی ہے کہ غریب سے غریب شخص بھی اس کو خرید سکتا ہے اور اگر مصنف کے گھر سے ان کو خریدا جائے تو تمام کتب پر چالیس فیصد رعایت مل سکتی ہے۔ مذکورہ بالا کتب کے مطالعہ سے نماز کے متعلق اور روزہ کے متعلق بھی مکمل تفصیل حاصل کی جا سکتی ہے۔

زیرِ نظر تحریر میں نماز پر مولاناؒ کے چند اشعار کے ساتھ ساتھ مختصر مگر جامع معلومات دی جا رہی ہیں اور روزے پر بھی کچھ بیانات شامل کر دیئے گئے ہیں۔

نماز کی اہمیت کے متعلق کچھ نکات

اپنی افادیت کی بناء پر اسلام کے تمام ارکان بہت اہمیت رکھتے ہیں مگر نماز کو ان سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ اہمیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے، نماز کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ تمام فرائض اسلام، مثلاً حج، زکوٰۃ، صیام وغیرہ کے احکام جب نازل ہوئے تو ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف آیات نازل فرمائیں اور ان آیات کے ذریعے اُن کو فرض قرار دیا مگر نماز کے لئے رسول اللہ ﷺ کو معراج میں بُلا کر حکم دیا گیا ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا کہ نمازی کے لئے تین خصوصی عزتیں ہیں: (جو احادیث میں بھی وارد ہیں) ایک یہ کہ جب انسان نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو سر سے لے کر آسمان تک اس پر رحمت کی گھٹا چھا جاتی ہے اور نیکیاں بارش کی طرح برستی ہیں۔ دوسرے یہ کہ فرشتے نمازی کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں اور اُس کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اس کی زیارت کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ جب مسلمان نماز کی نیّت باندھتا ہے تو ربّ العالمین کی تجلیات سامنے آ جاتی ہیں اور ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی! اگر تُو دیکھ لے کہ تیرے سامنے کون ہے اور تُو کس سے یہ تمام باتیں کر رہا ہے (اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ) تو خدا کی قسم! تُو قیامت تک نماز سے سلام نہ پھیرے اور نماز کی حالت میں ہی مر جائے اور کبھی بھی بس نہ کرے۔

ایک حدیث شریف میں وارد ہے کہ قیامت کے دن جب نمازیوں کو جنت میں جانے کا حکم ہوگا تو سب سے پہلے ایک جماعت جنت میں جائے گی، جن کے چہروں کی چمک سورج کی طرح ہوگی۔ فرشتے اُن سے پوچھیں گے کہ تم کون لوگ ہو اور دنیا میں کیا عمل کرتے رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم مسلمان ہیں اور نماز کی حفاظت کرنا ہمارا عمل تھا۔ فرشتے پوچھیں گے کہ کس طرح حفاظت کرتے تھے؟ جواب دیں گے کہ ہم نماز سے پہلے ہی مسجد میں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس جماعت کے بعد ایک اور جماعت جنت میں داخل ہو گی جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے، ان سے پوچھا جائے گا تو جواب دیں گے کہ ہم اذان سے پہلے باوضو ہو کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور اذان سنتے ہی مسجد میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ تیسری جماعت کے چہرے ستاروں کی طرح چمکدار ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اذان سُن کر وضو کرتے اور مسجد میں پہنچ جاتے اور تکبیر اُولیٰ کا خیال رکھتے تھے۔

اسی طرح اہلِ ایمان جب قبروں سے نکل کر میدانِ حشر میں آئیں گے تو اُن کی عجیب شان ہوگی، اُن کے آگے بھی نور ہوگا اور اُن کے دائیں جانب بھی نور ہوگا۔ (اس کی روشنی چاروں طرف ہوگی) یہ نور قوتِ ایمان اور اعمالِ حسنہ کے مطابق ہوگا۔ احادیث میں ہے کہ بعض مومن ایسے ہوں گے، جن کے نور سے مدینہ اور عدن کی لمبی مسافت جگمگا رہی ہو گی، بعض کے نور سے مدینہ اور صنعاء یمن کا درمیانی علاقہ روشن ہو رہا ہوگا اور بعض کے نور سے اُن کے قدم رکھنے کی جگہ روشن ہوگی۔ کچھ احادیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا ذکر کرنے والوں کا نور اس قدر زیادہ ہوگا کہ اس کے سامنے چاند سورج اور ستاروں کی روشنی ماند پڑ جائے گی۔

نماز ہی اصل عبادت ہے

عبادت کا معنی تذلّل ہے، یعنی اللہ کے لئے حد درجہ اور انتہائی عاجزی اختیار کرنا کہ اس سے بڑھ کر عاجزی اور نہ ہو سکے۔ عبادت کا اصل مفہوم نماز ہی میں ہے، چونکہ اللہ کے لئے عزت کی انتہا کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں، چنانچہ (عزیزِ مطلق کے سامنے) انتہائے عبادت سے مراد ذلیل مطلق ہو جانا ہے۔ اگر اس مفہوم کو پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یوں تو تمام عبادتوں میں اصل بات اللہ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے مگر نماز میں جس انتہائی درجے کی عاجزی و انکساری کا اظہار ہوتا ہے وہ کسی اور عبادت میں موجود نہیں کیونکہ اس میں وہ اپنی ہستی کو مٹا کر اپنے سر کو خدا کے سامنے خاک پر رکھ دیتا ہے اور یہی انتہائے عبادت ہے، چنانچہ عاجزی کا اصل مفہوم نماز ہی میں پایا جاتا ہے۔ تمام عبادتوں کا نماز کے ساتھ تقابل کریں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ تمام عبادات نماز میں شامل ہیں اور نماز تمام عبادات کی جامع ہے۔ مولانا رومؒ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ؎

چونکہ با تکبیر ہا مقروں شُدند   ہمچو قُرباں از جہاں بیروں شُدند

وہ اس طرح تکبیر کے ساتھ جہاں سے نکل جاتے ہیں، جس طرح کوئی قربانی کا جانور دنیا سے باہر نکل جاتا ہے۔ (۳/۲۱۰)

اقتداء کردند آں شاہاں قطار   دَرپئے آں مُقتدائے نامدار

ان شاہوں نے قطار بنا کر اقتداء کی، اُس نامدار مقتداء کے پیچھے۔ (۳/۲۱۰)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ذکر کے پانی میں سانس کھینچ کر غوطہ لگا لو اور صبر کرو، اس کے بعد تم ذکر کے اس صاف پانی کی پوری کیفیت سر تا پا اختیار کر لو گے۔ جس طرح پانی کے اندر غوطہ مارنے والا مکھیوں کے حملے سے محفوظ رہتا ہے، اسی طرح یادِ الٰہی میں مستغرق ہو جانے والا حواس کے بے ہودہ اِدراک سے نجات پا جاتا ہے۔

معنئِ تکبیر ایں ست اَے امیم   کاے خدا پیشِ تو ما قُرباں شُدیم

اے امام! تکبیر کے معنی یہ ہیں کہ الٰہی ہم تیرے آگے قربان ہو گئے۔ (۳/۲۱۰)

وقت ذبح اَللّٰہُ اَکْبَر میکنی   ہمچنیں در ذبحِ نفسِ کُشتنی

گوئی اللّٰہُ اَکْبَر و آں شُوم را   سر بُبر تا وا رہد جاں از فنا

تم جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کہتے ہو، اسی طرح اس کی گردن زنی کے لئے یعنی نفس کے ذبح کرنے میں (نماز کے وقت) اَللّٰہُ اَکْبَر کہو اور اس منحوس کا سر کاٹ ڈالو تا کہ جان تکلیف سے چھوٹ جائے) نفسِ سرکش کو کچلنا ہو تو سربسجود ہونا یعنی اس سگ کو مصلے پر حلال کرنا اچھا ہے۔ (۳/۲۱۰)

تن چوں اسمٰعیلؑ و جاں ہمچوں خلیلؑ   کرد جاں تکبیر بَر جسمِ نَبیل

بدن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی مثل ہے اور روح حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کی مثل ہے (جس طرح

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری رکھ دی تھی) اسی طرح رُوح نے شاندار جسم (کی لذّات) پر تکبیر پڑھ دی۔ (۲۱۰/۳)

نماز و روزہ کی عبادت سے نہ صرف آخرت بلکہ دُنیا کے حالات بھی سنور جاتے ہیں

دین سے دُوری کی وجہ سے ہمارے مسلمان اُن باتوں سے قطعاً بے بہرہ ہیں، جن کا اعلان اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے کھلے الفاظ میں کیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا وعدہ جو قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ کی تابعداری میں لگ جاؤ تو یہ تمام دُنیا تمہاری تابعدار ہو جائے گی (اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو جب پیدا کیا تو دُنیا کو اس بات کا حکم دیا کہ اے دنیا! جس کو تو میرا تابعدار دیکھے، تو اس کی تابعدار ہو جانا۔) اس وعدے کو ہم نے اور دیگر لوگوں نے بالکل صحیح پایا۔ وہ روایت حسبِ ذیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی مشکلات کو رفع کرنے کے لیے بہت سے قوانین وضع کیے ہیں، جن کا ذکر اس کتاب کے آخری باب میں کر دیا ہے مگر انسان ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ حضرت امام شعرانیؒ نے ''طبقات الکبریٰ'' میں حضرت امام جعفر صادقؓ کا حسبِ ذیل قول نقل کیا، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر انسان خدا کی تابعداری کرے تو یہ کائنات اس کی تابعدار ہو جائے گی۔

اَوْحَی اللّٰهُ اِلَی الدُّنْیَا اَنْ اَخْدِمِیْ مَنْ خَدَمَنِیْ وَاَتْعِبِیْ مَنْ خَدَمَکِ۔ (طبقات الکبریٰ، ص ۵۰)

اللہ تعالیٰ نے دُنیا پر وحی فرمائی کہ تو اس کی خدمت کر جو میری تابعداری کرے اور اس کو تھکا دے جو تیری تابعداری کرے۔

اس کے علاوہ چند قوانینِ الٰہی نیچے درج کیے جا رہے ہیں، جن کو اکثر مسلمان قطعاً نہیں جانتے، اگر ان قوانین کو سمجھ لیا جائے تو انسان کے تمام غم دور ہو جائیں اور مسلمان کا قومی تشخص بھی بڑھ جائے۔ وہ قوانین حسبِ ذیل ہیں:-

۱۔ جو اللہ کا ہو گیا، اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ (کشف الاسرار)

۲۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے تو دُنیا کی ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔ (احیاء علوم الدین، ج ۴، ص ۱۴۱)

۳۔ اگر تم نے توبہ کر لی اور عملِ صالح کئے تو تم کو دُنیا کی بادشاہی (بالادستی) دے دی جائے گی۔ (ھود: ۳)

۴۔ اگر تم خدا کا شکر کرو گے تو خدا تمہیں اور زیادہ دے گا۔ (ابراہیم: ۷)

۵۔ اگر تم نے مجھے دھوکہ دیا تو میں بھی تمہارے دھوکے سے بڑا دھوکہ دوں گا یعنی اگر تم عہد سے پھر گئے تو میں بھی پھر جاؤں گا۔

۶۔ اگر تم علمِ دین حاصل کرو گے (جس میں تمام علوم شامل ہیں، جو دین کے لئے حاصل کیے جائیں) تو اس کے بدلے تمہیں دولت، عزت اور حکومت بھی عطا کی جائے گی۔ (جامع بیان العلم وفضلہ، ج ۱، ص ۲۰۴ موضحاً)

۷۔ تم ہی سب پر غالب آ جاؤ گے اگر تم مومن ہو۔ (آل عمران: ۱۳۹)

۸۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے (یعنی بذریعہ تبلیغ تم لوگوں کو بُرائی سے ہٹا کر نیکی اور نجات کی طرف لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ

تمہارے ذاتی کاموں میں تمہاری مدد کرے گا) یعنی جو لوگ یہ کام کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دُنیاوی کاموں میں اُن کی مدد کرے گا۔ (محمد:۷ توضیحاً)

۹۔ جو اللہ کے دین کی خدمت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کہتا ہے کہ تم ہماری خدمت کرو، تمہارا رزق ہمارے ذمے ہے اور اللہ تعالیٰ نیکوں کو دوست رکھتا ہے اور خود اُن کے دُنیاوی اخراجات کی کفالت کرتا ہے۔ (قوت القلوب)

۱۰۔ جو اللہ سے دوستی کرے گا اللہ اس سے دوستی کرے گا۔ (المائدہ:۹۴۔مفہوماً)

۱۱۔ جو اللہ کا ذکر کرے گا، اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اس کا ذکر اپنی تنہائی میں یا فرشتوں کی مجلس میں کرے گا۔ (بخاری رقم الحدیث ۷۴۰۵)

۱۲۔ جو اپنی مرضی یا خواہشات کو اللہ کے لئے ترک کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی مرضی کو اس بندے پر چھوڑ دے گا۔ (روایت رابعہ بصری)

۱۳۔ اللہ اللہ کرنے والوں کی زبان اللہ تعالیٰ کی زبان بن جاتی ہے اور اُن کا ہر کام اللہ تعالیٰ اپنے ذِمے لے لیتا ہے۔ (بخاری رقم الحدیث ۶۵۰۲)

اگر قرآن اور حدیث کا مطالعہ کریں تو اللہ تعالیٰ کی بندوں کے لئے اور بھی بہت سی عنایتوں، مہربانیوں اور عطاؤں کا ذکر ملتا ہے، جب اللہ نے مذکورہ بالا قوانین انسان کی بہتری کے لئے وضع کئے ہیں تو انسان ان وعدوں پر اعتبار کیوں نہیں کرتا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ میری تابعداری کرو تو دنیا تمہاری تابعدار ہو جائے گی تو پھر تابعداری میں کیا مشکل ہے؟ تابعداری میں صرف اتنی بات ہے کہ کبیرہ گناہ نہ کرو اور نماز و روزہ جیسی چیدہ چیدہ عبادات ادا کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے حج اور زکوٰۃ کو لوگوں کی استطاعت پر چھوڑا ہے، بس اتنی سی بات پر خدا راضی ہو جاتا ہے، مگر انسان خدا کی بات کو چھوڑ کر دنیا کو راضی کرنا چاہتا ہے جس میں اس کو کوئی فائدہ نہیں اور محنت بھی زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ دنیا کو راضی کرنے کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا بہت آسان ہے، آزما کے دیکھ لو، پھر کیوں خدا کی طرف دھیان نہیں کرتے؟

رمضان المبارک کے متعلق اہم نکات

ماہِ رمضان کا نام اللہ تعالیٰ نے اپنے نام پر رکھا ہے کیونکہ رمضان اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اس وجہ سے ماہِ رمضان کے معنی ہوئے ''اللہ کا مہینہ'' صوم کے معنی چپ رہنے یا خاموشی کے ہیں کیونکہ اس مہینے میں ہر انسانی خواہش کو ساکت یا خاموش کر دیا جاتا ہے، اس مہینے میں جائز اور حلال چیزوں پر بھی پابندی لگا دی جاتی ہے۔ رمضان کا نام رمض سے لیا گیا ہے، جس کے معنی گرمی یا جلنے کے ہیں۔

حضور ﷺ نے خطبہ فرمایا کہ تم پر ایک عظیم المرتبت اور برکتوں والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، جس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار راتوں سے افضل ہے، اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کے لیے ایک فرض ادا کیا تو اس کا ثواب ستر (۷۰)

گنا ہوگا اور ایک نفل کا ثواب فرض کے برابر ہوگا۔ اس مہینے میں دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ (الترغیب والترھیب، ج۲، ص۵۷)

روزے کی غایت تقویٰ ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۸۳ میں ہے کہ ''روزے اس لئے فرض کئے تاکہ تم متقی بن جاؤ'' چنانچہ روزے کے بغیر تقویٰ ممکن نہیں۔ تقویٰ تو ہر گناہ کو ترک کرنے سے مل جاتا ہے مگر رمضان میں مباح چیزوں کا ترک بھی تقویٰ ہے۔

وہ رحمتیں جو صرف رمضان کا خاصہ ہیں

رمضان کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے کیونکہ اس میں مغفرت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ رمضان کا آخری حصہ جہنم سے آزادی ہے۔ اس ماہ میں نزولِ قرآن ہوا۔ اس کی ایک رات لیلۃ القدر ایسی ہے کہ اس میں کی جانے والی عبادت پر ہزار مہینوں کی عبادت کا ثواب ملتا ہے۔ اس ماہ میں صلوٰۃ التراویح پڑھی جاتی ہیں۔ آخری ہفتہ میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ (علی الکفایہ) ہے، جس سے معتکف کو بے شمار فوائد ملتے ہیں (تفصیل کے لئے ہماری مذکورہ کتب کا مطالعہ فرمائیں)۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ قرآن اور رمضان اللہ تعالیٰ سے بندے کے لئے بخشش اور شفاعت طلب کریں گے اور اُن کی شفاعت قبول ہوگی۔ (اَلصِّیَامُ وَالْقُراٰنُ یَشْفَعَانِ) (مشکوٰۃ رقم الحدیث ۱۹۶۳)

مولانا رومؒ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں کہ نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ اسلامی عقیدہ اور باطن کی اصلاح پر گواہی دیتے ہیں، یعنی تمام عبادات مسلمان کے اعتقاد اور عقیدہ کی شہادت دیتی ہیں۔

ایں نماز و روزہ و حج و جہاد   ہم گواہی دادنست از اعتقاد

یہ نماز، روزہ، حج اور جہاد بھی عقیدہ پر گواہی دینا ہے۔ (۳۱/۵)

ایں زکوٰۃ و ہدیہ و ترکِ حسد   ہم گواہی دادنست از سِرِّ خود

یہ زکوٰۃ، ہدیہ اور حسد نہ کرنا بھی اپنے باطن پر گواہی دینا ہے۔ (۳۱/۵)

گوہرے دارم ز تقویٰ یا سخا   ایں زکوٰۃ و روزہ بر ہر دو گوا

میں جوہر رکھتا ہوں تقویٰ کا یا سخاوت کا، یہ زکوٰۃ اور روزہ دونوں کے گواہ ہیں۔ (۳۱/۵)

روزہ گوید کرد تقویٰ از حلال   با حرامش داں کہ نبود اتّصال

روزہ کہتا ہے کہ اُس نے حلال سے پرہیز کیا، سمجھ لے کہ حرام سے اس کا اتصال نہ ہوگا۔ (۳۱/۵)

چنانچہ رمضان کے مہینے میں مغفرتِ الٰہی جوش میں آتی ہے اور بے شمار لوگوں کے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے اور جو اس ماہ میں مغفرت طلب نہ کرے تو وہ حضور ﷺ کی رحمت سے دُور ہوگا۔

رمضان کے روزوں میں انسان کے نفس اور رُوح کی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔ بھوک میں بے بہا کمالات

ہیں۔ اس ماہ میں ابلیس کو قید کر دیا جاتا ہے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی عبادات کے اَجر میں بے پناہ اضافہ کر دیا جاتا ہے اور قبولیتِ دُعا کے امکانات بہت زیادہ ہو جاتے ہیں اور لوگوں کے درجات بلند کر دیئے جاتے ہیں۔

روزے اور نماز کے باعث خطائیں معاف ہوتی ہیں

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ اگر شکاری دانہ پھینکتا ہے تو شکار پر شفقت اور رحمت کرنے کے لئے نہیں بلکہ شکار کو پکڑنے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ بلی اگر کسی جانور پر داؤ لگا کر بالکل خاموش ہو کر روزے دار کی طرح بیٹھی ہے اور ناتجربہ کار کو یہ تاثر دے رہی ہوتی ہے کہ وہ سوئی ہوئی ہے لیکن شکاریوں کے دانا پھینکنے کی سخاوت اور بلی کا روزہ داروں کی طرح شکار کے لئے چپ رہنا سخیوں کی سخاوت کو اور روزے داروں کے روزوں کو بدنام کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دھوکے بازوں کی حرکتوں کو معاف کر دیتا ہے تاکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی غفاری ظاہر ہو جائے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روزے دار اور عبادت گزار کبھی اپنے نفس کی اتباع میں غلط حرکات کر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پھر بھی ان کے نیک اعمال کے صدقے ان کو معاف کر دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ (اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ) روزے اور قرآن شفاعت کریں گے۔ (الترغیب والترھیب، ج۲، ص۵۰)

ہَست صیّاد اَر کند دانہ نثار ‌ ‌ ‌ نے زرحم وجود بل بہرِ شکار

شکاری اگر دانہ بکھیرتا ہے، رحم اور سخاوت کی وجہ سے نہیں بلکہ شکار کرنے کے لئے۔ (۵/۳۲)

ہست گُربہ روزہ دار اندر صیام ‌ ‌ ‌ خفتہ کردہ خویش بہر صَید خام

بلی روزہ دار ہے روزوں میں، ناتجربہ کار شکار کے لئے اپنے آپ کو سلائے ہوئے ہے۔ (۵/۳۲)

کردہ بدظن زیں کژی صَد قوم را ‌ ‌ ‌ کردہ بدنام اہلِ جود و صوم را

اس کجی سے اس نے سینکڑوں قوموں کو بدظن کر دیا، اس نے سخیوں اور روزہ داروں کو بدنام کیا۔ (۵/۳۲)

سبق بُردہ رحمتش داں غدر را ‌ ‌ ‌ دادہ نورے کہ نباشد بدر را

اس کی رحمت سبقت لے گئی اور اُس غدار کو وہ نور عطا کیا جو چودھویں کے چاند میں نہیں ہوتا ہے۔ (۵/۳۲)

کوششش را شُستہ حق زیں اِختلاط ‌ ‌ ‌ غسل دادہ رحمت او را زیں خُباط

اس خلط ملط سے (اللہ تعالیٰ) نے اس کی کوشش کو دھو دیا، رحمت نے اس کو اس خبطی پن سے غسل دیدیا۔ (۵/۳۲)

تاکہ غفاریٔ اُو ظاہر شود ‌ ‌ ‌ سیئات جُملہ را غافر شود

تاکہ اس کی غفاری ظاہر ہو جائے، تمام گناہوں کو بخشنے والی بن جائے۔ (۵/۳۲)

فضلِ حق با ایں کہ اُو کژ می تند ‌ ‌ ‌ عاقبت زیں جُملہ پاکش می کند

باوجودیکہ وہ کجی کر رہا ہے، اللہ کا کرم انجام کار ان سب سے اس کو پاک کر دیتا ہے۔ (۵/۳۲)

چوالیسواں باب

دُعا

اے خدا درمانِ کارِ من رساں
(اے خدا میرے کام کا علاج کر دے)

دُعا کے فلسفے کو سمجھنا بہت مشکل اور محنت طلب امر ہے۔ سب سے پہلے دُعا کے متعلق قرآن اور حدیث کے فرمودات کا علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان تمام تفصیلات کو اس جگہ مہیا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ پہلے ہی ہمارا وہ طویل بیان، جو ہم تقریباً ۱۲۰ صفحات پر مشتمل اپنی تصنیف ''حسنِ نماز'' میں تحریر کر چکے ہیں اگر اس کا مطالعہ کیا جائے تو دُعا کے موضوع پر بذاتِ خود ایک مکمل سبق ہے۔

مولانا رومیؒ کے فلسفۂ دُعا کا مطالعہ کرنے سے پہلے دُعا کے متعلق چیدہ چیدہ معاملات کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبتوں کو رفع کرنے کے لیے ایک زریں نسخے کے طور پر انسانوں کو کہا ہے کہ مجھ سے مانگو، میں دُعا سنتا ہوں مگر اس کی قبولیت کے لئے چند شرائط ہیں کہ بندہ مسلمان ہو اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو مانتا ہو، خدا کی ناراضگی کے افعال کا مُرتکب نہ ہو۔ دُعا کی قبولیت میں دُعا مانگنے کا طریقہ، درست عقائد، نیک اعمال اور خدا کو منانے کے ڈھنگ کا علم ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد چھ ایسے عناصر بیان کرنے میں آتے ہیں کہ جن کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو دُعا جلدی قبول ہونے کا امکان ہے۔ وہ عناصر حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ نیک اعمال کے وسیلہ سے دُعا کرنا ۲۔ کسی بزرگ ہستی سے دُعا کرانا
۳۔ اسمِ اعظم کے ذریعے دُعا کرنا ۴۔ قبولیت کے اوقات میں دُعا کرنا
۵۔ کسی متبرک مقام پر دُعا کرنا ۶۔ توبہ و استغفار کی کثرت کرنا

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے کسی نے پوچھا، کیا بات ہے کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ آپ نے جواب میں یہ نو (۹) نکات بیان کیے، جن کا لبِ لباب یہ ہے کہ تم لوگ خدا، رسول ﷺ، قرآن، موت، قیامت اور جنت و دوزخ کو مانتے ہو مگر تمہیں ان پر یقین نہیں اور تمہارے اعمال ان سب کو نہ ماننے کے برابر ہیں۔ اس کے علاوہ تم اللہ کی نعمتوں کا شکر نہیں کرتے، شیطان کا مقابلہ نہیں کرتے، مردوں کے دفن کے بعد عبرت حاصل نہیں کرتے، اپنے عیبوں کی بجائے دوسروں کے عیبوں پر نظر کرتے ہو۔ قرآن اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو اللہ کا ہو گیا اللہ اس کا ہو جاتا ہے، چنانچہ جس نے اپنے عمل سے اللہ کو اپنا بنا لیا تو پھر اس کی ہر دُعا قبول ہوتی ہے یا کم از کم بیشتر دعائیں دنیا میں ہی منظور ہو جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جو اللہ کے ساتھ ٹھیک ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ٹھیک سلوک کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

مردِ مومن با خدا دارد نیاز با تو ما سازیم تو با ما بساز

مردِ مومن خدا سے یہ رغبت یا راز و نیاز رکھتا ہے کہ ہم تمہارے (یعنی خدا کے) ساتھ بنا کر رکھیں گے اور تُو ہمارے ساتھ بنا کر رکھ۔ (اقبالؒ)

مولانا رومیؒ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کیا جا رہا ہے، گو آپ کا کلام طویل ہے لیکن چند ایک اشعار پر قناعت کی جائے گی۔

ہر دُعا کا ہر حالت میں قبول ہونا ضروری نہیں

ہر دُعا ہر زبان سے اور ہر حالت میں قبول ہو جانی ضروری نہیں، اس کے متعلق حدیثِ پاک میں بیان ہے "وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ" اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ غافل دلوں کی دُعا قبول نہیں کرتا (سنن ترمذی رقم الحدیث ۳۴۷۹) مثنوی میں بزرگوں سے دُعا کروانے کے متعلق بہت اشعار قابلِ مطالعہ ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

گرچہ درماں جوئی و گوئی بجاں کائے خدا درمانِ کارِ من رساں

اگر چہ تو علاج تلاش کرے اور دل سے کہے کہ اے خدا! میرے کام کا علاج کر دے۔ (۲/۷۵)

لیک زاں درماں نہ بینی رنگ و بو بہرِ دردِ خویش بے فرمانِ اُو

لیکن تو اس علاج کا رنگ و بو نہیں دیکھے گا، اس کے حکم کے بغیر اپنے درد کے لئے۔ (۲/۷۵)

فائدہ مند دُعا ہی مقبول ہوتی ہے

عام طور پر آدمی دُعا کرتا ہے لیکن قبولیت کے آثار اس کو دکھائی نہیں دیتے، بعض اوقات وہ دُعا اس کے لیے بہتر نہیں ہوتی اور وہ شخص نہیں جانتا کہ وہ خود اپنے لیے ایک بَلا چاہتا ہے اور حق تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے اس دُعا کو اس کے حق میں مقبول نہیں کیا۔ مال و جاہ کی محبت سے دَست بردار ہو کر خاص خدا سے محبت رکھنی چاہیے اور اسی پر پورا بھروسہ رکھنا لازم ہے۔ وہ کوئی کام تمہاری مرضی کے خلاف بھی کرے تو اس پر ناخوش ہونا مناسب نہیں کیونکہ وہ خداوند تعالیٰ ہے اور ہمارے تمہارے فوائد و مصالح کو خوب جانتا ہے، اگر ہماری دُعا قبول نہ بھی کرے تو بھی سبحان اللہ اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی، بہرحال دُعا کے اجر سے دُعا کرنے والا پھر بھی محروم نہیں رہتا کیونکہ نامقبول دُعا کا اجر آخرت میں ملتا ہے ؎

بس دعاہا کاں زیانست و ہلاک　　　از کرم مے نشنود یزدانِ پاک

بہت سی دعائیں جو نقصان اور ہلاکت کا باعث ہیں، اللہ پاک ان کو کرم کی وجہ سے قبول نہیں کرتا ہے۔ (۲۷/۲)

مُصلح ست اُو مصلحت را داند او　　　کاں دعا را باز می گرداند او

(تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) وہ (یعنی خداوند تعالیٰ) بہتری کرنے والا ہے اور مصلحت کو جانتا ہے (جو کسی نہ کسی مصلحت کی بناء پر) اس دُعا کو (غیر مقبول) لوٹا دیتا ہے۔ (۲۷/۲)

واں دعا گوینده شاکی می شود!　　　می بَرد ظنِّ بد و آں بد بود!

دُعا کرنے والا شاکی ہوتا ہے، بُرا گمان کرتا ہے اور یہ بدگمانی بُری چیز ہے۔ (۲۷/۲)

شُکر حق را کاں دعا مردود شد　　　من زیاں پنداشتم آں سود شد

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ دُعا مردود ہوگئی، میں نے نقصان سمجھا تھا وہ نفع ہوگئی۔ (۲۷/۲)

تضرّع والی دُعا فوراً قبول ہوتی ہے

دردِ دل اور رقتِ قلبی کا کرشمہ دیکھو کہ ایک ریچھ حیوان لایعقل کے نالہ و فغاں میں یہ جوہر موجود ہے کہ وہ بھی رحم و کرم سے مستفید ہوتا ہے۔ وہ بھی انسان کے رحم و کرم سے جس کو ریچھ سے کوئی انس اور ہمدردی ہونی لازم نہیں اور جب انسان اشرف المخلوقات کی گریہ و زاری اس جوہر سے خالی ہو تو اس پر بھی رحمت متوجہ نہیں ہوتی وہ بھی حق تعالیٰ کی جو ارحم الراحمین ہے، اگر انسان کی آوازِ دعا میں ذرا بھی تضرع و عجز ہو تو کیوں حق تعالیٰ کی رحمت نازل نہ ہو۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

چونکہ نالۂ خِرس رحمت کش بود　　　نالہء ات نبود چنیں ناخوش بود

جب ریچھ کی گریہ و زاری جاذبِ رحم ہے (اور) تیری گریہ و زاری (ایسی) نہیں (تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) یہ (تیری

گریہ وزاری) قابلِ نفرت ہے۔ (۲/۱۹۵)

مظلوم کی دُعا

بیہقی نے پانچ دعاؤں کا ذکر کیا ہے کہ جنہیں اللہ فی الفور قبول فرماتا ہے۔ ایک مظلوم، دوسرا حاجی جب تک گھر نہ آ جائے، تیسرا جہاد کرنے والا جب تک فارغ نہ ہو، چوتھا بیمار جب تک اچھا نہ ہو جائے اور پانچواں مسلمان بھائی کے لیے غائبانہ دُعا۔ (مشکوٰۃ رقم الحدیث ۲۲۶۰)

ابوالعالیہؒ نے ایک دن ہارون رشیدؒ سے کہا کہ مظلوم کی بددُعا سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے رد نہیں کرتا، اگرچہ وہ فاجر ہی ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ اگرچہ وہ کافر ہی ہو۔

ترمذی کی حدیث میں ہے کہ تین آدمیوں کی دعا رَد نہیں ہوتی۔ ایک روزہ دار کی جب وہ روزہ افطار کرے، دوسری عادل حاکم کی، تیسری مظلوم کی کہ اللہ تعالیٰ اس کو اَبر کے اُوپر اُٹھاتا ہے۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث ۳۴۴۸)

ابوداؤد ابنِ ماجہ اور ترمذی میں اس طرح بھی ہے کہ تین دعائیں قبول کی جاتی ہیں، اُن کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ایک باپ کی، دوسری مسافر کی، تیسری مظلوم کی۔ اِختصار کی خاطر مولاناؒ کے اشعار شامل نہیں کیے جا رہے ہیں۔

دِل بَرداشتہ درویش کی دُعا

حضرت داتا گنج بخشؒ نے ''کشف المحجوب'' میں کراماتِ اولیاء کے باب میں لکھا ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ نے مصر سے جدہ کے سمندری سفر میں کشتی پر ایک درویش کو دیکھا، جس کی ایک ساعت بھی یادِالٰہی سے غافل نہ تھی اور اس کے چہرے پر کثرتِ عبادت سے ایسی ہیبت تھی کہ مجھ میں اس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک روز اہلِ کشتی میں سے کسی کا ایک موتی چوری ہو گیا اور اُنہوں نے اس درویش پر شک کیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ان لوگوں کا موتی گم ہو گیا ہے اور وہ آپ پر شک کرتے ہیں تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر کچھ کہا، جس کو مولانا رومؒ نے یوں تحریر فرمایا ہے ؎

گفت یا رب بر غلامت را خساں   متہم کردند حکمے در رساں

اے پروردگار! یہ کمینے لوگ تیرے غلام پر تہمت لگاتے ہیں، تُو ان پر اپنا حکم صادر فرما۔ (۲/۳۲۷)

یَا غِیَاثِیْ عِنْدَ کُلِّ کُرْبَۃٍ   یَا مُعَاذِیْ عِنْدَ کُلِّ شِدَّۃٍ

اے ہر مصیبت میں میری فریاد کو پہنچنے والے! اے ہر سختی میں مجھے پناہ دینے والے! (۲/۳۲۷)

یَا مُجِیْبِیْ عِنْدَ کُلِّ دَعْوَۃٍ   یَا مَلَاذِیْ عِنْدَ کُلِّ مِحْنَۃٍ

اے میری ہر دُعا کو قبول کرنے والے! اے ہر مشقت کے کام میں میری جائے پناہ! (۲/۳۲۷)

جب اس درویش نے یہ دُعا مانگی تو حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ سمندر کی تمام مچھلیاں سطحِ سمندر پر آ گئیں وہ ایک ایک موتی منہ میں لیے ہوئے تھیں۔ اس درویش نے ایک مچھلی کے منہ سے موتی لے کر اس شخص کو دے دیا، جس کا موتی گم ہو گیا تھا۔ کشتی کے تمام مسافروں نے یہ کمال دیکھ کر اس درویش کی طرف عقیدت مندی کا اظہار کرنا چاہا تو اُس نے کشتی سے باہر اپنا پاؤں رکھ کر سمندر کی سطحِ آب پر چلنا شروع کر دیا۔ اس موتی کو ملاحوں میں سے ایک شخص نے چوری کیا تھا۔ اس نے گھبراہٹ اور خوف میں وہ موتی اس کے مالک کو دے دیا اور اہلیانِ کشتی شرمندہ ہوئے۔

دُعا کا قبول نہ ہونا بھی عطائے خدا ہے

اگر اللہ تعالیٰ کوئی دُعا قبول نہ فرمائے تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ مَنعُہٗ عَطَاءٗ یعنی اس کا کسی وجہ سے دُعا قبول نہ کرنا، اس کی عطا ہی ہے۔ کمال اس میں ہے کہ اللہ کی منع کو عطا ہی جانے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اگر مراد تو اے دوست نامرادیٔ ما است	مرادِ خویش دگر بار من نخواہم خواست

اے اللہ! اگر تیری مراد ہماری نامرادی میں ہے، تو میں اپنی مراد کی درخواست دوسری بار نہیں کرتا۔ (غیر مثنوی)

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے فرمایا کہ مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میں کس حال میں صبح کروں گا۔ آیا ایسی حالت میں جس کو میں پسند نہیں کرتا یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لیے بھلائی کس حالت میں ہے اور اس بات پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۶ میں فرمایا گیا کہ ''وَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئاً وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ج'' (شاید کہ بُری لگے تمہیں کوئی چیز، حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو)۔ یہیں سے مقامِ رضا کی ابتدا ہوتی ہے۔ اللہ کی حکمت دیکھئے کہ بندۂ مومن کی جو دُعا قبول نہ ہو تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں اور مطلوب کی طرف خیال پلٹ دیتے ہیں اور جزع وفزع کے بغیر مقامِ رضا عطا فرما دیتے ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ اس کی ہر تمنا پوری کی جائے مگر اللہ وہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ٭ فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی۔ (النجم:۲۴۔۲۵)

''کیا انسان کو ہر وہ چیز مل جاتی ہے، جس کی وہ تمنا کرتا ہے، پس اللہ کے دستِ قدرت میں ہے آخرت اور دنیا۔''

گویا ہر چیز اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس دنیا میں جو ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اِذن سے ہو رہا ہے۔ کسی اہلِ رضا نے کہا ہے کہ الٰہی! میری تمنائیں اپنی رضا کے مطابق کر دے۔

کافر کی دُعا قبول نہیں ہوتی

کافر کی گریہ و زاری اور دُعا و مناجات کا قبول نہ ہونا عدم خلوص و فُقدان پر مبنی ہے، عدم اسلام پر نہیں اور خود

مولاناؒ کے کلام میں اس کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا، کافر کا رونا خلوص سے خالی ہو تو غیر مقبول ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ رقتِ قلب اور سچے درد سے ہو تو مقبول ہے۔

نالہء کافر چو زِشت است و شہیق زاں نمی گردد اِجابت را رفیق

کافر کا رونا چونکہ (اکثر) بُرا اور گدھے کی آواز کا سا ہوتا ہے، اس لیے قبولیت کا رفیق نہیں بنتا۔ (۱۹۵/۲)

غریب کا خون چوسنے والے کی دُعا قبول نہیں ہوتی

کافر لوگ جہنم میں گریاں و نالاں ہو کر پکاریں گے "رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ" اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس آگ سے نکال پھر اگر ہم ایسا کریں تو ہم قصور وار ہیں "قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ" اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دور رہو، اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو (المومنون:۱۰۷۔۱۰۸) یہ کون لوگ ہیں؟ کافر و مشرک، منکرانِ حق جنھوں نے دنیا اور اسبابِ دنیا کو ہی منتہائے مقاصد سمجھا اور دُنیا کے حصول کے لیے غریبوں کا گلا گھونٹنے اور ان کا خون چوسنے سے دریغ نہ کیا۔

اِخْسَئُوْ برزِشت آواز آمدست کو زخونِ خلق چوں سگ بود مست

اِخْسَئُوْ (چلو دُور ہٹو، کا تہدیدی کلمہ اسی قسم کی) بدآواز کے بارے میں آیا ہے، جو کتے کی طرح مخلوق کے خون سے مست تھا۔ (۱۹۵/۲)

اُستنِ حنانہ

مسجدِ نبوی میں ایک کھجور کا تنّا تھا جس کے ساتھ کھڑے ہو کر حضور ﷺ خطبۂ جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ جب آپ کے لیے منبر شریف تیار ہوا تو وہ ستون آپ کے فراق میں رونے لگا (سنن ترمذی رقم الحدیث ۵۰۵) انسان کو بھی چاہیے کہ وہ اللہ کی رضا کو طلب کرے تو اللہ اس کی بھی سنتا ہے، جس طرح استن حنانہ کی بات کو سنا۔ اس موضوع پر مولاناؒ کے بہت سے اشعار ملتے ہیں، مگر یہاں ایک ہی شعر دیا جا رہا ہے ؎

ہر کرا باشد زیزداں کاروبار یافت بار آنجا و بیروں شد زکار

جس کو اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو جاتا ہے، اس کا وہاں دخل ہو جاتا ہے اور وہ دُنیا کے کام سے خارج ہو جاتا ہے۔ (۲۳۱/۱)

حقوقُ النفس اور حقوقُ العباد کو تلف کرنے سے دُعا قبول نہیں ہوتی

اگر تم حقوق النفس اور حقوق العباد کو تلف کر رہے ہو تو اجابتِ دُعا ناممکن ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا ہے جو لمبے سفر پر تھا پراگندہ بال، موٹے کپڑوں والا، غبار آلود چہرے والا، آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے، اے میرے پروردگار! اور دُعا کرتا ہے، حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، پینا حرام ہے اور اس کی

پوشاک حرام ہے اور حرام غذا پاتا ہے اس کی دُعا کب مقبول ہو گی۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث ۲۳۴۶)

دانکہ با یوسف تو گرگی کردۂ یا زخونِ بیگناہے خوردۂ
توبہ کن وز خوردہ استفراغ کن ور جراحت کہنہ شد رو داغ کن

اور سمجھ لے کہ تم نے یوسف (کی سی اپنی جانِ عزیز) کے ساتھ بھیڑیے کا سلوک کیا ہے یا کسی بے گناہ کا خون پیا ہے، تو (اس سے) توبہ کرو اور (ساتھ ہی اپنے ناجائز) کھائے ہوئے (مال) کو اُگل ڈالو اور اگر زخم پرانا ہو چکا ہو تو جاؤ اس پر داغ دے دو۔ (۱۹۵/۲)

اصلاحِ نفس اور تبدیلیٔ اخلاق کے لیے دُعا مددگار ثابت ہوسکتی ہے

قلب و روح کے مسخ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تم پر اخلاقِ رذیلہ کا غلبہ ہے اور تم لوگوں کا خون چوسنے میں بھیڑیے کی طرح خونخوار اور مکر و فریب سے کام لینے میں لومڑی کی طرح مکار ہو۔ اگر اصلاحِ نفس چاہتے ہو تو اخلاقِ بد سے باز آؤ، بے شک اصلاحِ نفس اور تبدیلیٔ اخلاق ایک مشکل اور کٹھن مہم ہے، تم اس مہم میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو وہ بہتر مددگار ہے۔

باز گرد از گرگی اے رُوباہِ پیر نُصرت از حق می طلب نِعْمَ النَّصِیْرُ

اے بوڑھی لومڑی کے سے مکار آدمی! بھیڑیا پن چھوڑ دے، حق تعالیٰ سے مدد طلب کر (وہ) بہتر مددگار ہے۔
(۱۹۵/۲)

پینتالیسواں باب

وعدہ

عہد فاسق بیخ بوسیدہ بود

(بدکار کا عہد بوسیدہ جڑ ہوتی ہے)

مولانا رومیؒ وعدہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آدمی درخت کی مانند ہے اور عہد اس کی جڑ ہے۔ جڑ کی حفاظت بڑی کوشش کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ ایک بدکار آدمی کا وعدہ بوسیدہ جڑ ہے، جو لطفِ حق کے پھلوں سے محروم ہوتی ہے بلکہ حدیث پاک میں منافق کی علامت بیان کی گئی ہے "اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ" یعنی جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف چلتا ہے۔ (بخاری رقم الحدیث ۳۴، ۲۴۵۹) کھجور کی شاخ اور پتے اگرچہ سبز ہوں مگر جڑ کی خرابی کے ساتھ سبزی مفید نہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ آدمی کی طاعات و عبادات بے سود ہیں، جب کہ وہ بدعہد ہو کیونکہ یہ نشانِ منافقت ہے، اسی طرح اگر ہرے پتے نہ ہوں اور صرف جڑ ہو تو آخرکار سینکڑوں ہرے پتے نکل آئیں گے، یعنی اگر آدمی طاعات و عبادات کا پورا پابند نہ ہو مگر عہد کا پکا ہو تو وہ آخر عابد و پرہیزگار بن جاتا ہے۔ ایک شخص کو شراب، زنا، چوری اور جھوٹ کی عادت تھی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے عہد کر لیا کہ جھوٹ نہ بولوں گا۔ اس عہد کی برکت سے اس کی شراب، زنا، چوری اور جھوٹ کی عادت بھی جاتی رہی۔ کیونکہ ماضی کے فعل کے اِرتکاب کی صورت میں سچ بتاتے اس کو شرم آتی تھی اور جھوٹ بولنے سے بدعہدی لازم آتی تھی۔ مولانا رومؒ آدمی کی پہچان کے

بارے میں فرماتے ہیں کہ تم جب کسی علم والے آدمی سے ملو تو اس کے علم وفضل کی وجہ سے دھوکا نہ کھاؤ بلکہ اس کا عہد دیکھو کہ کہیں وہ بدعہد تو نہیں، کیونکہ علم چھلکے کی مانند ہے اور اس کا عہد اس کے لئے مغز ہے۔ مولانا رومؒ نے عہد کے متعلق کلام لکھا ہے ؎

چوں درخت ست آدمی و بیخ عہد بیخ را تیمارمی باید بجہد

آدمی درخت کی مانند ہے اور عہد (اس کی) جڑ ہے، جڑ کی حفاظت بڑی کوشش کے ساتھ کرنی چاہیے۔ (۱۲۲/۵)

عہدِ فاسد بیخِ بوسیدہ بود وز ثمارِ لطف ببریدہ بود

بدکار آدمی کا عہد بوسیدہ جڑ ہوتی ہے اور وہ لُطف (حق) کے پھلوں سے محروم ہوتی ہے۔ (۱۲۲/۵)

شاخ و برگِ نخل اگرچہ سبز بود بافساد بیخ سبزی نیست سود

کھجور کی شاخ اور پتے اگرچہ ہرے ہوں (مگر) جڑ کی خرابی کے ساتھ سبزی مفید نہیں۔ (۱۲۳/۵)

ور ندارد برگِ سبز و بیخ ہست عاقبت بیروں کند صد برگ دست

اگر ہرے پتے نہ ہوں اور جڑ موجود ہو تو آخرکار سینکڑوں ہرے پتے نکل آئیں گے۔ (۱۲۳/۵)

تو مشو غرہ بعلمش عہد جُو عِلم چوں قشرست عہدش مغز اُو

تم کسی شخص کے علم سے دھوکہ نہ کھاؤ (بلکہ) اس کا عہد دیکھو، کیونکہ علم چھلکے کی مانند ہے اور اس کا عہد اس کے لیے مغز ہے۔ (۱۲۳/۵)

سچا وعدہ دل پسند ہوتا ہے اور بناوٹی وعدہ دل کو بے قرار کرتا ہے

سچے وعدے دل پسند ہوتے ہیں، بناوٹی وعدے دل کو بے قرار کرتے ہیں کہ پورے ہوں گے یا نہیں۔ شیخِ کامل کے وعدے خواہ تعلیم و تربیت سے متعلق ہوں یا بطور بشارات ہوں، سب صادق اور طمانیتِ قلب کا باعث ہوتے ہیں مگر شیخِ مکار کے وعدے کذب اور پورے نہ ہونے کے باعث پریشان کرنے والے ہوتے ہیں۔

امام حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کلمات سن کر یاد کر لیے کہ شکی بات کو چھوڑ کر غیر شکی بات اختیار کرو کیونکہ سچائی دل کا اطمینان ہے اور جھوٹ شبہ کی بات ہے۔ (ترمذی رقم الحدیث ۲۵۱۸)

وعدۂ اہلِ کرم گنجِ رواں وعدۂ نااہل شد رنجِ رواں

اہلِ کرم کا وعدہ وہ خزانہ ہے جس کا فیض سدا جاری رہنے والا ہے، نالائق کا وعدہ رنجِ جان (ثابت) ہوتا ہے۔ (۴۹/۱)

وعدہ پورا کرنا واجب ہے

وعدے کا دل و جان سے پورا کرنا واجب ہے، تاکہ تم قیامت میں اس ایفائے عہد کا فیض دیکھو۔ وعدہ خلاف آدمی کو سرد دل اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں اپنی صداقت کو قائم رکھنے کی سرگرمی نہیں ہوتی۔ اسے خام کار اس لیے

کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی بناء پر جو کام کرتا ہے یا کراتا ہے اس میں دوام اور پختگی نہیں ہوتی، اس لیے اس کا اعتبار جاتا رہتا ہے اور کام بنتے بنتے بگڑ جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تو اپنے بھائی سے جھگڑا مت کر اور نہ اس سے (اس درجہ) مزاح کر (جس سے اسے تکلیف ہو) اور نہ اس سے کوئی وعدہ کر کے اس کے خلاف کر۔ (ترمذی رقم الحدیث ۱۹۹۵، مشکوٰۃ رقم الحدیث ۴۸۹۲)

وعدہ ہا باید وفا کردن تمام ور نخواہی کرد باشی سرد و خام

تمام وعدوں کو پورا کرنا چاہیئے، اگر تم (پورے) نہ کرو گے تو سرد (مہر) اور خام (کار) ثابت ہو گے۔ (۱/۴۹)

حصہ ششم

چھیالیسواں باب

مثنوی میں احادیث اور اشاراتِ قرآن

مثنویٔ معنویٔ مولوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

مولانا جامیؒ نے مثنوی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ آپ کی مثنوی حقیقتاً فارسی زبان میں قرآن و حدیث کو بیان کرتی ہے ۔

مثنویٔ معنویٔ مولوی ہست قرآں در زبانِ پہلوی

(مولانا رومؒ کی مثنوی فارسی زباں میں قرآن کو بیان کرتی ہے)

مثنوی کے مطالعہ کے بعد مولانا جامیؒ کے مذکور بالا قول کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ آپ کا کلام جو کہ مثنوی میں موجود ہے، وہ سب کا سب قرآن اور حدیث کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ مولاناؒ کا طریقۂ کلام کچھ اس نہج پر ہے کہ آپ چند سہل اور دلچسپ تشبیہات کے ذریعے مشکل سے مشکل معاملات کی آسانی سے وضاحت فرما دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآن یا سنتِ رسول ﷺ کے اشارات کو واضح کر دیتے ہیں تاکہ اس کے پڑھنے والوں کو سمجھنے میں چنداں تکلیف محسوس نہ ہو۔ آپ کے اکثر اشعار میں احادیثِ نبوی ﷺ کا کھلم کھلا ذکر ملتا ہے اور زیرِ نظر مضمون میں ان احادیث کو اشعار کے نیچے حوالہ جات کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

قارئین کی سہولت اور اختصار کی خاطر تمام آیاتِ قرآنی کو اس باب میں بیان کرنا مشکل تھا، لہٰذا نیچے دیئے گئے اشعار اگرچہ مثنوی میں بیان کردہ تمام آیاتِ قرآنی اور احادیث کا احاطہ نہیں کرتے، تاہم ان کے مطالعہ سے مذکور شعر

کی صحت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ زیرِ نظر باب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، جن میں سے ایک حصہ میں احادیثِ مثنوی کو حوالہ جات اور بامحاورہ ترجمہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں مثنوی میں استعمال کردہ چند اشاراتِ قرآن کا ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ احادیث بھی قرآن کی وضاحت ہی کرتی ہیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا رومیؒ کی بیان کردہ احادیث بھی قرآن ہی کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں اور یوں پوری مثنوی قرآن کے علاوہ کچھ الگ چیز نہیں۔

مولانا رومیؒ نے مثنوی کے اشعار میں بہت سی احادیث کا ذکر کیا ہے۔ ایسے بہت سے اشعار کا مجموعہ دانش گاہ تہران سے جناب بدیع الزمان نے فارسی زبان میں شائع کیا ہے اور اس میں ان مستند کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جہاں سے یہ احادیث اخذ کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں مثنوی کے ۷۴۵ اشعار ہیں، جن کی مؤلف نے ترجمہ، مطلب، اشارۂ حدیث کے علاوہ کچھ تشریح بھی کی ہے۔ ان میں سے بہت سی احادیث کا ذکر تو زیرِ نظر کتاب میں مختلف ابواب اور عنوانات کے تحت کر دیا گیا ہے اور اس جگہ چند مزید اشعار تبرکاً پیش کیے جا رہے ہیں۔ مذکورہ تمام احادیث کا ذکر اس مختصر تحریر کے احاطہ سے باہر ہے، اس جگہ چند اشعار اور ان کا ترجمہ بیان کیا جا رہا ہے تاکہ زیرِ نظر کتاب کی ضخامت ضرورت سے زیادہ نہ بڑھ جائے۔ اس تحریر میں شامل کئے گئے اشعار کا نمبر دے دیا گیا ہے اور اس کے نیچے احادیثِ مثنوی کی مذکورہ کتاب کا صفحہ نمبر بھی دے دیا گیا ہے تاکہ ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار میں پہلے شعر کا حوالہ (۶/۸) دیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد لطیف کی کتاب کا شعر نمبر۶ اور صفحہ نمبر۸ ہے۔

مذکورہ کتاب میں تمام اشعار سے پہلے ان سُرخیوں کو بھی لکھ دیا گیا ہے، جن کی طرف درج کیے گئے اشعار غمازی کرتے ہیں۔ اس تحریر میں وہ اشعار درج کیے گئے ہیں، جن کا تعلق پیر کی ضرورت، رزق، خدا کے ہونے کے دلائل، بھوک کفر تک لے جاتی ہے، دُنیاوی موت، محرومِ طریقت، رحم، فراست، جہادِ اصغر، نفس، قرآن، اللہ کا ہاتھ، خرچ کرنے والوں کے درجے، اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ، قضا و قدر، اللہ تعالیٰ کا زمین اور آسمان میں نہ سمانا، اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ، اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا، کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا، کَلِمَةُ الْحِکْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ، عَرَفْتُ رَبِّیْ عَنْ فَسْخِ الْعَزَائِمِ، جواسِیْسُ الْقُلُوْب، حکمت، اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ، خدا بندوں کو اپنی طرف بلاتا ہے، نماز اللہ کا دروازہ کھٹکھٹانے کے برابر ہے، بلا یا آزمائش (۷ اشعار)، اللہ نگہبان ہے، بھیڑوں کا چرواہا اور اللہ سے پیار، ہم اہلِ بیت کشتیٔ نوح علیہ السلام کی طرح ہیں، وضو کے وقت کی دُعا، توبہ کا دروازہ، آتشِ نمرود کے وقت جبرئیل علیہ السلام کا ابراہیم علیہ السلام کے پاس مدد کے لئے آنا، دین داروں کے غم دُور ہو جاتے ہیں، اللہ چاہتا ہے کہ بندے اس کی طرف رجوع کریں، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لقب ''صدیقِ اکبر'' کی وجہِ تلقیب، فرعون کو اللہ کے چار انعامات دینے کا وعدہ اگر وہ اسلام قبول کر لیتا، بھوک (بہت سے اشعار)، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ، فکرِ معاش نہ کرنے کی

طرف اشارہ کو شامل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ عقل کا نماز میں دخل، محاسبہ بھی عقل کی وجہ سے ہے، مُنْکَسِرَۃُ الْقُلُوْبِ، پاک دامنی شہوت کے تابع ہے، خصی نہ ہونا، فقر، اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ، صحبت، تین بندوں کی عزت کرو، شیطان کہاں ہوتا ہے، مَنْ جَدَّ وَجَدَ، گریہ، معرفت، تقدیر کا لکھا جانا، اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ، انسان فی القرآن اور جہنم مومن سے فریاد کرے گی کہ جلدی گذر جا وغیرہ۔ ان سب موضوعات کے علاوہ اور بھی کئی اشعار موجود ہیں، جن کا ذکر مثنوی میں کیا گیا ہے اور جن سے انسان کو عام زندگی میں تعلق رہتا ہے۔ ایسے اشعار نیچے دیئے جا رہے ہیں :-

عشقِ حقیقی اور مجازی

عشقہائے کز پئے رنگی بود عشق نبود عاقبت ننگی بود

جو عشق محض رنگ و روپ کے لئے ہے، وہ (سچا) عشق نہیں بلکہ آخر کار کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوتا ہے۔ (اللؤلؤ المرصوع) (۶/۸)

ایک حدیث شریف میں اس مفہوم کی تائید یوں ملتی ہے "مَنْ اَحَبَّکَ لِشَیْءٍ مَلَّکَ عِنْدَ اِنْقِضَائِهٖ" (یعنی جو تجھ سے کسی چیز کے لئے محبت کرتا ہے، اس کے پورا ہو جانے کے بعد تجھ سے اُکتا جائے گا)۔

مصیبتوں کا آنا

ابر ناید از پئے منعِ زکوٰۃ وز زنا افتد وبا اندر جہات

زکوٰۃ روکنے سے بادل نہیں آتے اور زنا سے اطراف میں وبا پھیل جاتی ہے۔ (۱/۵)

حدیث : "مَا حَبَسَ قَوْمٌ الزَّکٰوۃَ اِلَّا حَبَسَ اللّٰہُ عَنْھُمُ الْمَطَرَ" (ربیع الابرار)

ترجمہ : یعنی جو قوم زکوٰۃ ادا کرنا بند کر دے، اللہ ان سے بارش روک لیتا ہے۔

اپنی مراد پانا

گفت پیغمبر ﷺ ہر آنکو سر نہفت زود گردد با مرادِ خویش جُفت

پیغمبرِ پاک ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنا بھید چھپایا وہ جلد ہی اپنی مراد کو پا لیتا ہے۔ (کنوز الحقائق) (۴/۷)

حدیث : "اِسْتَعِیْنُوا عَلٰی اُمُوْرِکُمْ بِالْکِتْمَانِ" (کنوز الحقائق)

ترجمہ : اپنے کاموں میں راز داری سے مدد طلب کرو۔

بے جا تعریف

می بلرزد عرش از مدحِ شقی بد گماں گردد ز مدحش متقی

بدذات آدمی کی مدح سے عرش کانپتا ہے، اس کی تعریف سے پرہیزگار بدظن ہو جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف) (۹/۷)

حدیث : "اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَاھْتَزَّ لِذٰلِکَ الْعَرْشُ" (جامع صغیر، ج ۱، ص ۳۴)

ترجمہ : جب فاسق کی تعریف کی جائے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے اور اللہ کا عرش کانپ اُٹھتا ہے۔

نفس

نفس ہر دم از درونم درکمیں　　　از ہمہ مر دم بر در مکر و کیں

میرا نفس میرے اندر تاک میں بیٹھا ہے، جو مکر روکنے میں سب لوگوں سے بدتر ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)　(۱۷/۱۴)

حدیث : "اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِی بَیْنَ جَنْبَیْکَ" (احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۴)

ترجمہ : تیرا بڑا دشمن تیرا نفس ہے، جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

عبادت و نیکیاں

بشنو از اخبارِ آں صَدْرُ الصُّدُوْرِ　　　لَا صَلٰوۃَ ثَمَّ اِلَّا بِالْحُضُوْرِ

اس سب سے بڑے مسند نشین کی بات سنو کہ نماز بغیر حضورِ قلب کے مکمل نہیں۔ (احیاء العلوم)　(۶/۱۱)

اس شعر میں "لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ" کے علاوہ اس حدیث کی طرف بھی اشارہ ہے۔

حدیث : "لَا یَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰی صَلٰوۃٍ لَّا یَحْضُرُ الرَّجُلُ فِیْھَا قَلْبَہٗ مَعَ بَدَنِہٖ" (احیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۱۱۰)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ اس نماز کی طرف نہیں دیکھتے، جس میں انسان اپنے بدن کے ساتھ اپنے دل کو حاضر نہیں کرتا۔

اولیاء کا نور

نور غالب ایمن از کسف و غسق　　　درمیانِ اِصْبَعَیْنِ نُوْرِ حَقْ

وہ ایک نُور ہے سب پر چھانے والا، گہن اور تاریکی سے محفوظ، وہ نُورِ حق تعالیٰ کی دو اُنگلیوں کے درمیان ہے۔

(صحیح مسلم، احیاء العلوم) (۹/۱۳)

حدیث : "اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ کَقَلْبٍ وَّاحِدٍ یُّصَرِّفُہٗ حَیْثُ یَشَآءُ"

ترجمہ : تمام بنی آدم کے دِل ایک دل کی مانند خدائے رحمان کی دو اُنگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرف چاہتا ہے اُن کو موڑ دیتا ہے۔ (صحیح مسلم، ج ۸، ص ۵۱)

حق فشاند آں نور را بر جانہا　　　مقبلاں برداشتہ دامانہا

اللہ تعالیٰ اس نور کو ولیوں پر برساتا ہے جو اہلِ اقبال ہیں اور اس نُور کے لئے دامن پھیلائے ہوئے ہیں۔ (۱۰/۱۳)

(جامع صغیر، فتوحات)

حدیث : "اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ خَلْقَہٗ فِیْ ظُلْمَۃٍ فَاَلْقٰی عَلَیْھِمْ مِّنْ نُّوْرِہٖ فَمَنْ اَصَابَہٗ مِنْ ذٰلِکَ النُّوْرِ اِھْتَدٰی وَمَنْ اَخْطَاءَہٗ ضَلَّ" (ترمذی شریف، رقم الحدیث ۲۶۴۲)

ترجمہ : یعنی اللہ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر اس پر اپنا نور ڈالا، جس کو وہ نُور پہنچا وہ ہدایت پا گیا

اور جس کو نہ پہنچا وہ گمراہ ہوگیا۔

رحم کرو

اشک خواہی رحم کن بر اشکبار　　　　رحم خواہی برضیفاں رحم آر

اگر تم اشک چاہتے ہو تو آبدیدہ ہو کے معافی مانگنے والے پر رحم کرو، اگر رحم چاہتے ہو تو پہلے ضعیفوں پر رحم کرو۔ (۱۱/۱۳)

حدیث : "اِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہُ عَلٰی عِبَادِہِ الرُّحَمَآءِ" (صحیح مسلم، ج۲،ص۳۹)

ترجمہ : یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں پر رحم کرتا ہے جو لوگوں پر رحم کرنے والے ہیں۔

توکّل

i- گفت پیغمبر بہ آوازِ بلند　　　　با توکل زانوے اشتر بند

جناب پیغمبرِ پاک ﷺ نے بآوازِ بلند فرمایا، توکّل کے ساتھ اونٹ کے گھٹنے بھی باندھ دو۔

حدیث : "اِعْقِلْھَا وَتَوَکَّلْ" (الدرر المنتثرہ)

ترجمہ : گھٹنا باندھو اور اللہ پر توکّل کرو۔

ii- رمز اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ شنو　　　　از توکل در سبب کاہل مشو

کسب کرنے والا اللہ کا محبوب ہے، اس کا نکتہ ہم سے سنو اور توکّل کی وجہ سے اسباب میں سُستی نہ کرو۔ (۱۸/۱۸)

حدیث : "طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ" (مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ : یعنی حلال روزی کے لیے سعی کرنا فرائضِ عبادت کے بعد فرض ہے۔

اولیاء پر کرم

ما عیالِ حضرتیم و شیر خواہ　　　　گفت اَلْخَلْقُ عیال اللہ لہٗ

ہم سب اللہ تعالیٰ کے عیال اور شیرخوار ہیں، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا، مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

کچھ مسافر بھوکے تھے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ آگے سفر میں تمہیں ہاتھیوں کے بچے ملیں گے، ان کو پکڑ کر کھا نہ لینا اور اگر ایسا کرو گے تو سینکڑوں ہاتھی فوراً تمہیں مار دیں گے۔ مولانا رومیؒ نے استنباط کیا کہ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ولیوں کو تنگ کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو معاف نہیں کرتا۔ (جامع صغیر) (۱۹/۱۸)

مجاہدہ جہادِ اکبر ہے

قَدْ رَجَعْنَا مِنْ جِہَادِ الْاَصْغَرِیْم　　　　بانبی اندر جہادِ اَکْبَرِیْم

ہم جہادِ اصغر (تلوار کے جہاد) سے لوٹے ہیں اور اب نبی ﷺ کے ساتھ جہادِ اکبر (دُنیا کا جہاد) کر رہے ہیں۔
(مُجَاھِدَۃُ الْعَبْدِ ھَوَاہُ۔ احیاء العلوم وغیرہ) (۳۵/۲۵)

رو کہ بِیْ یَسْمَعُ وَ بِیْ یُبْصِرُ تُوئی سر توئی چہ جائے صاحب سر توئی

اے بندے! جس کا سننا اور دیکھنا میرے کان اور آنکھ سے ہو تو میرا سر مخفی ہو گیا ہے، چہ جائیکہ صاحبِ سر۔ (بخاری شریف) (۴۲/۲۸)

بیمار ہونا

گفت پیغمبر ﷺ کہ رنجوری بلاغ رنج آرد تابمیرد چوں چراغ

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: جھوٹی بیماری ظاہر کرنے سے بندہ سچ مچ بیمار ہو جاتا ہے اور ایسا (بناوٹی) بیمار چراغ کی طرح گُل ہو جاتا ہے۔ (لَا تَمَارَضُوا فَتَمْرُضُوا۔ بحرالعلوم) (۲۶/۲۱)

قضا

چوں قضا آید شود دانش بخواب مہ سیاہ گردد بگیرد آفتاب

جب قضا آئے تو عقل سو جاتی ہے، چاند سیاہ ہو جاتا ہے اور سورج کو گرہن لگ جاتا ہے۔ (جامع صغیر) (۲۹/۲۲)

دُنیا سے نجات

ایں جہاں زنداں و ما زندانیاں حفرہ کن زنداں و خود را وارہاں

یہ دُنیا قید خانہ ہے اور ہم قیدی ہیں، اس قید خانے میں سوراخ کر کے باہر نکل جاؤ۔ (مشکوٰۃ۔ کنوزالحقائق) (۲۲/۱۹)

جو اللہ کا ہو گیا

چوں شدی مَنْ کَانَ لِلّٰہِ از ولہ حق ترا باشد کہ کان اللہ لہ

جب تم عشق کی بدولت "فَکَانَ لِلّٰہِ" کے مصداق بن گئے تو میں تمہارا حامی و ناصر ہوں کیونکہ "کَانَ اللّٰہُ لَہٗ" حدیثِ برحق ہے۔ (جامع صغیر، ج۱، ص۷۰) (۴۳/۲۹)

حدیث: "مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ" (کشف الاسرار۔ دانش گاہ تہران ص۵۶۲)

ترجمہ: جو اللہ کا ہو جائے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ

گفت پیغمبر ﷺ کہ اَصْحَابِیْ نُجُوْم مقتبش شو زود چوں یابی نجوم

جب تم ہدایت کے روشن ستاروں کو دیکھو تو اُن سے نورِ ہدایت حاصل کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے "اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ" فرمایا ہے۔ (۴۴/۲۹)

حدیث: "اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ" (کنوزالحقائق ص۱۳)

ترجمہ: میرے ساتھی ستاروں کی طرح ہیں، ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

زیارتِ رسول ﷺ

گفت طوبیٰ من رآنی مصطفےٰ ﷺ   وَالَّذِی یُبْصِرُ لِمَنْ وَجْهِیَ رَأی

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ مبارک ہے وہ شخص جس نے میری زیارت کی یا اس شخص کی زیارت کی، جس نے میری زیارت کی ہو۔ (۴۵/۳۰)

مطلب : صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین کی فضیلت مقصود ہے۔

حدیث : طُوْبٰی لِمَنْ رَاٰنِیْ وَاٰمَنَ بِیْ وَطُوْبٰی لِمَنْ رَاٰیٰ مَنْ رَاٰنِیْ وَلِمَنْ رَاٰیٰ مَنْ رَاٰیٰ مَنْ رَاٰنِیْ وَاٰمَنَ بِیْ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنَ مَاٰبٍ (جامع صغیر، ج۲،ص۵۴) (۴۵/۳۰)

ترجمہ : خوش نصیب ہے وہ انسان جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا۔ خوش بخت ہے وہ آدمی جس نے اس انسان کو دیکھا جس نے مجھے دیکھا اور وہ انسان جس نے اس انسان کو دیکھا جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا۔ ایسے انسان کا ٹھکانا عمدہ ہے۔

محبوب سے ہم کلامی

مصطفیٰؐ آمد کہ سازد ہمدمی   کِلِّمِیْنِی یَا حُمَیْرَا کَلِّمِی

مصطفیٰؐ آمادہ ہیں کہ (روح) سے ہمکلامی کریں اور اس سے مخاطب ہو کر کہیں اے حمیراؓ! (لقب حضرت عائشہؓ) ہم سے ہمکلام ہو، ہاں ہم سے ہمکلام ہو۔ (۴۷/۳۱)

حدیث : "کَلِّمِیْنِیْ یَاحُمَیْرَا" (احیاء العلوم، ج ۳،ص ۴۷)

ترجمہ : یعنی حمیراؓ! میرے ساتھ گفتگو کر۔

کاملیتِ بلالؓ

جاں کمال ست و ندائے او کمال   مصطفیٰ گویاں ارِحْنَا یَا بِلَالُ

جو جان کامل ہے وہ خود بھی اور اس کی آواز بھی عین کمال ہے، مثلاً حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اذان، چنانچہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے اے بلالؓ! اذان سے ہمیں راحت پہنچاؤ۔ (۴۸/۳۲)

حدیث : "یَابِلَالُ اَرِحْنَا بِالصَّلٰوۃِ" (مسند احمد، ج ۵،ص ۳۶۴)

ترجمہ : اے بلالؓ! نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچا۔

اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ

گفت ای زن تو زنی یا بوالحزن   فقر فخر آمد مرا طعنہ مزن

وہ بولا، اے عورت! تُو عورت ہے، فقر کا موجب فخر ہونا مشہور ہے، تُو مجھ کو طعنہ نہ دے۔ (۵۴/۳۴)

حدیث : "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَبِهٖ اَفْتَخِرُ" (سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۳۷۸)

ترجمہ : فقر میرے لئے باعثِ فخر ہے اور میں اس پر فخر کرتا ہوں۔

قلب کی لامکانیت

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است　　من نگنجم ہیچ در بالا و پست

وز زمین و آسماں و عرش نیز　　من نگنجم این یقین داں ای عزیز

در دلِ مومن بگنجم ای عجب　　گر مرا جوئی در آں دلہا طلب

حضورِ پاک ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اُوپر نیچے نہیں سما سکتا، میں زمین و آسمان اور عرش میں بھی نہیں سما سکتا مگر تعجب ہے کہ میں مومن کے دل میں سما سکتا ہوں، اگر مجھے تلاش کرنا ہو تو اُن کے دلوں میں تلاش کرو۔ (۶۳/۳۷)

حدیث : "لَا یَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَاسَمَآئِیْ وَ وَسَعَنِی قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ اللَّیِّنَ الْوِدَاعِ"

ترجمہ : میری ذات نہ تو زمین میں سما سکتی ہے اور نہ آسمانوں میں مگر میرے نرم خُو بندے کے دل میں میری ذات سما جاتی ہے۔ (احیاء العلوم، ج ۳، ص ۱۲)

عورت سے مشورہ

شَاوِرُوْهُنَّ پس آنگو خَالِفُوْا　　اِنَّ مَنْ لَمْ یَعْصِهِنَّ تَالِفُ

پہلے عورتوں سے مشورہ کرو پھر اس مشورے کے خلاف کرو، کیونکہ جو شخص ان کے خلاف نہ کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا۔ (۷۴/۴۳)

مطلب : عورت کے ضعیف العقل ہونے پر دلالت ہے۔

حدیث : "شَاوِرُوْهُنَّ وَ خَالِفُوْهُنَّ". (شرح نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۲۷۰)

ترجمہ : عورتوں کے ساتھ مشورہ کرو اور پھر اس کے خلاف کرو۔

مسلک نبی و ولی

ہر نبی و ہر ولی را مسلکیست　　لیک تاحق میبرد جملہ یکیست

ہر نبی اور ہر ولی کا خاص مسلک ہوتا ہے، لیکن سب خدا تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں، اس لحاظ سے سب کے سب ایک ہیں۔ (۷۸/۴۶)

حدیث: "اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَالْاَنْبِیَآءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ وَ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰی وَدِیْنُهُمْ وَاحِدٌ لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَهٗ" (بخاری رقم الحدیث ۳۴۴۶، ۳۴۴۳)

ترجمہ: میں عیسیٰ ابنِ مریمؑ کے زیادہ قریب ہوں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ صحابہؓ نے پوچھا، کیسے یارسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمام نبی علاتی بھائی ہیں اور اُن کی مائیں الگ الگ ہیں اور ان کا دین ایک ہے اور میرے اور عیسیٰؑ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔

ملاقاتِ محبوب

اندکے صرفہ بکن از خواب و خور ارمغاں بہر ملاقاتش بُبر

اپنی نیند اور خوراک میں کسی قدر کمی گوارا کرو اور اس محبوبِ حقیقی کی ملاقات کے لئے (نیک اعمال کی) سوغات لے جاؤ۔ (۴۸/۷۹)

حدیث: "اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَأْكُلُ فِيْ مِعًى وَاحِدٍ وَّالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِيْ سَبْعَةِ اِمْعَاءٍ" (صحیح بخاری، رقم الحدیث ۸۳۹۷)

ترجمہ: حضور ﷺ نے فرمایا: مومن ایک آنت میں کھانا کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھانا کھاتا ہے۔

نسبتِ زُہد

گفت حق نے بلکہ لا انساب شد زہد و تقویٰ فضل را محراب شُد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یہ بات نہیں بلکہ ہمارے نزدیک نسب کا اعتبار ہی نہیں، زُہد و تقویٰ فضیلت کا مقام ہے۔ (۴۹/۸۱)

حدیث: "يَافَاطِمَةُ لَاتَتَّكِىْ عَلٰى اَنَّكِ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِعْمَلِىْ اِعْمَلِىْ" (مشکوٰۃ)

ترجمہ: اے فاطمہؓ! اس بھروسے پر نہ رہو کہ تم رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی ہو بلکہ عمل کرو، عمل کرو۔

اَصْحَابِىْ كَالنُّجُوْمِ

گفت پیغمبر ﷺ کہ اصحابی نجوم رہرواں را شمع و شیطاں را رجوم

جنابِ پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے اصحابؓ ستاروں کی مانند ہیں یعنی وہ رہرو لوگوں کے لئے ہدایت اور شیطان کے لئے چوٹ ہیں۔ (۵۳/۸۷)

حدیث: "اَصْحَابِىْ كَالنُّجُوْمِ فَبِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ" (جامع بیان العلم وفضلہ، ج۲، ص۸۹۸)

ترجمہ: میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، تم جس کی بھی اقتداء کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔

بے سحری روزہ

چوں اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّىْ فاش شد يُطْعِمُ وَ يَسْقِىْ پے ایں آشِ شد

جب کہ حدیث میں "اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّىْ" (یعنی میں اپنے پروردگار کے پاس رات گذارتا ہوں) صاف آیا ہے تو يُطْعِمُ وَ يَسْقِىْ (یعنی کھلاتا پلاتا ہے) سے مراد آش (حقیقی معنوں میں) ہے۔ (۵۴/۸۹)

حدیث : "نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْوِصَالِ فِى الصَّوْمِ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِنَّكَ تُوَاصِلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاَيُّكُمْ مِثْلِىْ اِنِّى اَبِيْتُ يُطْعِمُنِىْ رَبِّىْ وَيَسْقِيْنِىْ" (صحیح بخاری رقم الحدیث ۱۹۶۵)

ترجمہ : یعنی حضور ﷺ نے ان روزوں سے منع فرمایا جو سحری کھائے بغیر ہی رکھے جائیں۔ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے کہا : یارسول اللہ ﷺ آپ بھی تو سحری کھائے بغیر روزے رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ہمارا ہم پلہ کون ہوسکتا ہے؟ میں رات کو سوتا ہوں، خدا مجھے کھلا بھی دیتا ہے اور پلا بھی دیتا ہے۔

مومن مومن کا آئینہ

چونکہ مومن آئینۂ مومن بود　　　رُوئے او از آلودگی ایمن بود

یار آئینہ است جانرا در حُزن　　　بر رُخِ آئینہ اے جاں دم مزن

جب ایک مومن کی ذات دوسرے مومن کے لئے بمنزلہ آئینہ ہے تو دوسرے مومن کا چہرہ آلودگی اور تکدّر سے پاک ہونا چاہیے (بعد عن الحق سے) جو غم طاری ہوتا ہے وہ اس میں تیری جان کے لیے آئینہ ہوتا ہے، جس سے وہ اپنے مصائب کا مشاہدہ کر کے اُن کی اصلاح کر سکتا ہے اور جو حق سے دور ہونے کا باعث ہیں، پس اے عزیز! اس آئینہ کی سطح پر پھونک مار کر اُسے مکدّر نہ کر۔ (۱۰۴/۶۳)

حدیث : "اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنِ" (جامع صغیر للسیوطی ج ۲ ص ۱۸۳)

ترجمہ : مومن دوسرے مومن کے لئے آئینہ کی مانند ہے۔

معرفت میں سونا بیداری ہے

خواب بیداریست چوں بادانشست　　　وائے بیداری کے با ناداں نشست

جو نیند معرفتِ حق کے ساتھ ہو وہ بیداری کا حکم رکھتی ہے۔ افسوس ہے اُس بیدار پر جو کسی معرفت سے محروم کی صحبت میں بیٹھا جاگ رہا ہے۔ (۱۰۵/۶۴)

حدیث : "نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ وَنَفَسُهُ تَسْبِيْحٌ" (کنوز الحقائق، ج ۲، ص ۲۳۸)

ترجمہ : عالم کی نیند عبادت ہے اور اس کا سانس تسبیح کے برابر ہے۔

حدیث : "نَوْمٌ عَلٰى عِلْمٍ خَيْرٌ مِّنْ صَلَاةٍ عَلٰى جَهْلٍ" (جامع صغیر، ج ۲، ص ۱۸۷)

ترجمہ : علم کے ساتھ نیند، جہالت کے ساتھ نماز سے بہتر ہے۔

اَللّٰهُ يُحِبُّ الْجَمَالَ

او جَمِيْلٌ است و يُحِبُّ لِلْجَمَالِ　　　کے جواں نو گزیند پیرِ زال

وہ خود صاحبِ جمال ہے اور جمال ہی کو پسند کرتا ہے۔ (اور کیوں نہ کرے) ایک نوجوان مرد کسی بڑھیا ضعیف

عورت کو کب (اپنے نکاح کے لئے) پسند کرتا ہے؟ (۱۰۶/۶۵)

مطلب : اللہ پاک ہے اور پاک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

حدیث : "اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالَ" (صحیح مسلم، ج ۱، ص ۶۵)

ترجمہ : بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

خدائی نورِ ہدایت

چونکہ حق رش عَلَیْھِمْ نُورہ مفترق ہرگز نگردد نورِ اُو

چونکہ حق تعالیٰ نے اُن پر اپنا نُور چھڑکا ہے، لہٰذا اُن میں تفرقہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اس کا نُور ہرگز متفرق نہیں ہوسکتا۔ (۱۱۰/۶۶)

مطلب : جس نے نور کو پایا ہدایت پائی اور اس سے محروم گمراہ ہے۔

حدیث : "اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ خَلْقَہٗ فِیْ ظُلْمَۃٍ فَاَلْقٰی عَلَیْھِمْ مِّنْ نُّوْرِہٖ فَمَنْ اَصَابَہٗ مِنْ ذَالِکَ النُّوْرِ اِھْتَدٰی وَمَنْ اَخْطَاہُ ضَلَّ" (جامع صغیر، ج۱، ص ۹۶)

ترجمہ : یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر اُس پر اپنا نور ڈالا، جس پر اس کا وہ نور پہنچا وہ ہدایت پا گیا اور جس پر نہ پہنچا وہ گمراہ ہوگیا۔

ہدایت یافتہ اُمت

کُنْتُ کَنْزًا رَحْمَۃً مَّخْفِیَّۃً فَابْتَعَثْتُ اُمَّۃً مَّھْدِیَّۃً

میں ایک خزانہ یعنی رحمتِ مخفی تھا تو میں نے ایک ہدایت یافتہ اُمت (یعنی اُمتِ محمدیہ ﷺ) پیدا کی۔ (۱۱۴/۶۷)

حدیث : "کُنْتُ کَنْزًا مَّخْفِیًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ" (حدیث قدسی، الدرالمنتثرۃ للسیوطی، ص ۲۲۷)

ترجمہ : یعنی میں ایک خزانہ مخفی تھا پھر مجھے خواہش ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق پیدا کی۔

نفس کتا ہے

ہیں سگِ نفس ترا زندہ مخواہ کاوعدِ جانِ تست از دیر گاہ

خبردار! اپنے کتے نفس کی زندگی کے خواہاں نہ بن جانا کیونکہ وہ مدت سے تمہاری جان کا دُشمن ہے۔ (۱۱۷/۶۹)

حدیث : "قَدِمْتُمْ مِنَ الْجِھَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِھَادِ الْاَکْبَرِ مُجَاھَدَۃُ الْعَبْدِ ھَوَاہُ" (کنوزالحقائق، ج۲، ص۲۰)

ترجمہ : تم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے ہو، وہ جہادِ اکبر یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرے۔

بھوک کفر میں ڈال دیتی ہے

صوفیاں درویش بودند و فقیر کَادَ کُفرًا اَنْ یَکُنَ کُفرًا یبیر

(خانقہی) صوفی نادار محتاج تھے اور (جیسا کہ حدیث میں وارد ہے) کہ محتاجی قریب ہے کہ ایک بڑا کفر بن جائے۔
(۱۱۹/۶۹)

حدیث : "کَادَالْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" (کنوز الحقائق، ج ۲،ص ۳۴) (حلیہ ابونعیم، ج ۳،ص ۵۳)

ترجمہ : تنگدستی بعض دفعہ کفر کی سرحدوں تک پہنچا دیتی ہے۔

بغیر صبر ایمان نہیں

صبر از ایماں بیابد سر کلہ حَیْثُ لَا صَبْرَ فَلَا اِیْمَانَ لَهٗ

گفت پیغمبر خدا ایماں نداد ہر کرا نبود صبوری در نہاد

صبر نے ایمان سے شرف پایا، چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جس میں صبر نہیں تو اس میں ایمان بھی نہیں۔ (۱۲۲/۷۱)

جناب پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس شخص کو خدا نے ایمان نہیں دیا جس کے اندر صبر نہ ہو۔

حدیث : "مَنْ لَا صَبْرَ لَهٗ لَا اِیْمَانَ لَهٗ" (مشکوٰۃ در رسالہ قشیریہ طبع مصر، ص ۸۵،۸۶)

ترجمہ : جس شخص میں صبر نہیں، اس میں ایمان نہیں۔

ہر درد کی دوا

گفت پیغمبر ﷺ کہ یزدانِ مجید از پے ہر درد درماں آفرید

پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہر درد کی دوا پیدا کی ہے۔ (۱۲۳/۷۱)

حدیث : "مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَهٗ شِفَاءً" (بخاری شریف، ج ۴،ص ۶ ۔ مسلم، ج ۷،ص ۱۲۱)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نازل نہیں کی مگر اُس کے لئے شفاء کو بھی نازل کر دیا ہے۔

رُوحوں کی محبت

روحِ او باروحِ با شہ دراصلِ خویش پیش ازیں تن بود ہم پیوند خویش

کیونکہ اُس غلام کی روح بادشاہ کی روح کے ساتھ اپنی اصل میں موجود جسم کے ساتھ متعلق ہونے سے پہلے متصل و متقارب ہو چکی تھی۔ (۱۳۲/۷۶)

حدیث : "اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاکَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ"

ترجمہ : ارواح بے پناہ لشکروں کی شکل میں موجود ہیں۔ عالمِ ارواح میں اگر ایک روح کا دوسری سے تعارف ہو جائے تو پھر جب وہ آدمی اس عالم میں آتے ہیں تو انہیں محبت ہو جاتی ہے۔ اگر وہاں اجنبیت رہے تو

ادھر آکر بھی دونوں میں اختلاف رہتا ہے۔ (مسلم ج ۸، ص ۴۱۔ صحیح بخاری ج ۲، ص ۱۴۷۔ جامع صغیر ج ۱، ص ۱۲۱)

تدبیر اور تقدیر

ہست دستِ راست اینجا ظنِ راست   کاو بداند نیک و بد را از کجاست

نیزہ گردانیست اے نیزہ کہ تو   راست میگردی گہ و گاہی دوتو

یہاں صحیح الخیال ہونا ہی سب سے اچھا داؤ ہے کیونکہ نیک و بد کی اصلیت کو وہی خوب جانتا ہے۔ اے نیزہ گردان تم نیزہ پھینکتے ہو، کبھی وہ سیدھا جاتا ہے اور کبھی ٹیڑھا۔ (۱۳۳/۷۷)

مطلب : تدبیرِ انسانی پر تقدیرِ ربانی کی فوقیت کا ذکر ہے۔

اشارہ : "عَرَفْتُ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَحَلِ الْعُقُوْدِ وَ نَقْضِ الْهِمَمِ"

ترجمہ : یعنی میں نے خدائے پاک کو ارادوں کے ٹوٹنے، مشکلات کے حل ہو جانے اور ہمتوں کے پست ہونے سے پہچانا۔ (شرح نہجۃ البلاغہ، ج ۴، ص ۳۵۰)

مومن کا نُور اور دوزخ

مصطفٰی فرمود از گفتِ جحیم   کہ بمومن لابہ گر گردد زبیم

گویدش بگذر زمن ای شاہ زود   ہین کہ نورت سوز نارم را ربود

حضور علیہ السلام نے دوزخ کا قول نقل فرمایا ہے کہ وہ اپنے سرد ہو جانے کے خوف سے مومن کے ساتھ خوشامد کی باتیں کرے گی کہ اے شاہ! مجھ پر جلدی گزر جایئے۔ دیکھو تمہارے نور نے میری آگ کی سوزش کو اُڑا دیا۔ (۱۳۴/۷۷)

حدیث : "تَقُوْلُ النَّارُ لِلْمُؤْمِنِ جُزْيَا مُؤْمِنُ فَقَدْ اَطْفَاَ نُوْرُکَ لَهَبِیْ" (الدرر المنتثرۃ، ص ۱۴۲)

ترجمہ : آگ مومن سے کہے گی اے مومن! گزر جا کیونکہ تیرے نور نے میری آگ کو بجھا دیا۔

زانکہ دوزخ گوید ای مومن تو زود   برگذر کہ نورت آتش را ربود

بگذر اے مومن کہ نورت می کشد   آتشم را چونکہ دامن می کشد

دوزخ کہے گی کہ اے مومن! مجھ پر سے جلدی گذر جا کیونکہ تیرے نور نے میری آگ بجھا دی، اے مومن! گذر جا کیونکہ تیرا نور میری آگ کو بجھا دیتا ہے جب وہ دامن کھینچتا ہوا آتا ہے۔ (۴۰۱/۱۹۶)

در حدیث آمد کہ مومن در دعا   چوں امان خواہد زدوزخ از خدا

دوزخ ازوے ہم امان جوید بجان   کہ خدایا دور دارم از فلاں

حدیث میں آیا ہے کہ مومن جب اپنی دُعا میں دوزخ سے خدا کی پناہ مانگتا ہے تو دوزخ بھی دل و جان سے اس سے پناہ چاہتی ہوئی کہتی ہے کہ الٰہی! مجھ کو فلاں آدمی سے دُور رکھو۔ (۴۰۲/۱۹۶)

حدیث : "اِذَا قَالَ الْمُؤمِنُ اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ تَقُوْلُ النَّارُ اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِیْ مِنْهُ"

ترجمہ : جب مومن یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھے آگ سے بچا تو آگ بھی کہتی ہے کہ اے اللہ! مجھے بھی اس مومن سے بچا۔

اولیاء کی جاسوسی

بندگانِ خاص عَلَّامُ الْغُیُوْبِ در جہاں جانِ جَوَاسِیْسُ الْقُلُوْبِ

خدائے غائب دان کے خاص بندے ایسے ہیں جو رُوحانی دُنیا میں دلوں کے جاسوس ہیں۔ (۱۳۹/۷۹)

حدیث پاک میں ہے "اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ" (مومن کی فراست سے بچو! بے شک وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔) (سنن ترمذی رقم الحدیث ۳۱۲۷)۔ اسی لئے عرفاء کرام نے ارشاد فرمایا:

"اِحْذَرُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ جَوَاسِیْسُ الْقُلُوْبِ" (شرح تعرف، ج ۱، ص ۸ بحرالعلوم)

ترجمہ: یعنی ان سے خوفزدہ رہو، وہ لوگ دلوں کے جاسوس ہیں۔

ناقص ملعون ہے

چونکہ ملعون خواند ناقص را رسول ہست در تاویل نقصان عقول

حضور سرورِ کائنات ﷺ نے جو ناقص کو ملعون کا لقب دیا ہے، اس سے بروئے تاویل عقلوں کا نقصان مراد ہے۔ (۱۴۰/۷۹)

حدیث : "اَلنَّاقِصُ مَلْعُوْنٌ" (شرح خواجہ ایوب طبع مصر، ج ۲، ص ۳۵۲)

ترجمہ : ناقص آدمی اللہ کی رحمت سے محروم (دُور) رہتا ہے۔

اللہ کے نور سے دیکھنا

۱۔ چشم اُو یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ شدہ پردہ ہائے جہل را خارق شدہ

اس کی آنکھ حق تعالیٰ کے نور سے دیکھنے والی ہے اور اس نے جہل کے پردے کو چاک کر ڈالا ہے۔ (۱۴۱/۸۰)

حدیث : "اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ" (سنن ترمذی، رقم الحدیث ۳۱۲۷)

ترجمہ : مومن کی فراست سے بچو، بے شک وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

۲۔ مومن ار یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰه نبود عیب مومن را برہنہ چوں نمود

اگر مومن اللہ کے نور سے نہیں دیکھتا تو وہ مومن کے عیب کو صاف صاف کیسے بتا دیتا ہے۔ (جامع صغیر، احیاء العلوم) (۳۳/۲۴)

۳۔ آنکہ او یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہ بود ہم زمرغ و ہم زموے آگہ بود

اور وہ جو اللہ کے نور کے ساتھ دیکھنے والا ہوتا ہے، وہ مرغ سے بھی اور بال تک سے بھی آگاہ و آشنا ہوتا ہے۔

(۶۳۰/۲۸۵)

حدیث : "کَانَ اَبُوْ الدَّرْدَاءِ یَقُوْلُ الْمُؤْمِنُ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ مِنْ وَّرَاءِ سَتْرٍ رَقِیْقٍ" (احیاء العلوم، ج ۳، ص ۱۸)

ترجمہ : حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مومن اللہ کے نور کی بدولت باریک پردے کے پیچھے سے دیکھتا ہے۔

مطلب : خاصانِ حق کے کمالِ باطن کی طرف اشارہ ہے۔

۴۔ او مگر ینظر بنور اللّٰہ بود کاندرونِ پوست اورا راہ بود

وہ شخص اللہ کے نور سے دیکھنے والا ہے کیونکہ اس کے لئے پوست کے اندر (تحقیقات) کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

(۸۵/۵۲)

حدیث : "اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ" (سنن، ترمذی رقم الحدیث ۳۱۲۷)

ترجمہ : مومن کی فراست سے بچو، بے شک وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

دانائی کی بات سرمایۂ مومن

زانکہ حکمت ہمچو ناقۂ ضالہ است ہمچو دلّالاں شہاں را دالہ است

کیونکہ حکمت مومن کے لئے گمشدہ اونٹنی کی مانند ہے وہ (اقلیمِ ولایت کے) بادشاہوں کو دلّالوں کی طرح راہ دکھاتی ہے۔

(۱۴۴/۸۱)

حدیث : "کَلِمَۃُ الْحِکْمَۃِ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا" (سنن، ترمذی رقم الحدیث ۲۶۸۷)

ترجمہ : دانائی کی بات مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اسے پاتا ہے وہ اسے حاصل کرنے کا زیادہ مستحق ہے۔

خدا اور مخلوق

من نکردم خلق تاسودی کنم بلکہ تا بربندگان جودی کنم

میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ خود کوئی فائدہ حاصل کروں بلکہ اس لئے کہ بندوں پر احسان کروں۔

(۱۴۹/۸۳)

حدیث : "یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِنَّمَا خَلَقْتُ الْخَلْقَ لِیَرْجُوْا عَنِّی وَلَمْ اَخْلُقْھُمْ لِاَرْجُ عَنْھُمْ"

ترجمہ : اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے مخلوق کو اس واسطے پیدا کیا کہ وہ مجھ سے فائدہ حاصل کریں، اس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں ان سے فائدہ حاصل کروں۔

ظاہر بینی

ما بروں را ننگریم و قال را　　　　ما دروں را بنگریم و حال را

ہم ظاہر (داری) اور زبانی باتوں کونہیں دیکھتے بلکہ ہم تو باطن کی کیفیت اور اصلی حالت کو دیکھتے ہیں۔ (۱۵۰/۸۳)

حدیث : "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ و اَعْمَالِکُمْ"

ترجمہ : خدائے تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے اموال کونہیں دیکھتا بلکہ اُس کی نگاہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر رہتی ہے۔ (مسلم، ج۸، ص۱۱)

خدا کو جدائی ناپسند ہے

ناتوانی پا منہ اندر فراق　　　　اَبْغَضُ الْاَشْیَآءِ عِنْدِیْ اَلطَّلَاقْ

جہاں تک تم سے ہو سکے جدائی میں قدم نہ رکھو (مجھے جدائی ناپسند ہے)، چنانچہ طلاق میرے نزدیک تمام اشیاء سے ناپسند تر ہے۔ اس لئے کہ اس میں زن وشوہر میں جدائی واقع ہوتی ہے۔ (۱۴۸/۸۲)

حدیث : "اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقْ" (جامع صغیر، ج۱، ص۴)

ترجمہ : تمام حلال اشیاء میں سے ناپسندیدہ تر چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔

شہید کا خون

خون شہیداں را زآب اولیٰ تر است　　　　ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است

جس طرح خون شہیدوں کے لئے پانی سے بہتر ہے اسی طرح یہ خطا جو عاشقِ حق سے سرزد ہوئی ہے، سینکڑوں صحیح باتوں سے بہتر ہے۔ (۱۵۱/۸۳)

حدیث : "زَمِّلُوْھُمْ بِدِمَائِھِمْ فَاِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ کَلْمٍ یُکْلَمُ فِی اللّٰہِ اِلَّا وَھُوَ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَدْمِیْ لَوْنُہٗ لَوْنَ الدَّمِ" (جامع صغیر، ج۲، ص۲۷)

ترجمہ : ان شہیدوں کو انہی خونوں میں لپیٹ دو کیونکہ کوئی زخم بھی ایسا نہیں جو اللہ کے راستے میں آیا نہ ہو اور قیامت کے دن اُس سے خون بہہ رہا ہوگا، جس کا رنگ تو عام خون کی طرح ہوگا لیکن اُس کی خوشبو کستوری کی سی ہوگی۔

تکالیف اور خواہشات

حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِمَکْرُوھَاتِنَا　　　　حُفَّتِ النِّیْرَانُ مِنْ شَھْوَاتِنَا

جنت ہماری تکالیف سے گھری ہوئی ہے اور دوزخ ہماری خواہشاتِ بد سے گھری ہوئی ہے۔ (۱۵۲/۸۴)

حدیث : "حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ وَ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ" (مسلم، ج۸، ص۱۴۳)

ترجمہ : جنت کے اردگرد مصائب کی باڑ لگا دی گئی ہے اور دوزخ کے اردگرد دلفریبیوں کی باڑ لگا دی گئی ہے۔

سرمایۂ حکمت

کالۂ حکمت کہ گم کردۂ دلست — پیش اہلِ دل یقین آں حاصل است

سرمایۂ حکمت دل جس کو گم کر چکا ہے، یقیناً اہلِ دل کے پاس حاصل ہوسکتا ہے۔ (۱۶۴/۸۹)

حدیث: "کَلِمَةُ الْحِکْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَا حَقُّ بِهَا" (ترمذی رقم الحدیث ۲۶۸۷)

ترجمہ: دانائی کی بات دانا کا گمشدہ مال ہے، وہ اسے جہاں کہیں پاتا ہے حاصل کرنے کا زیادہ حق دار ہوتا ہے۔

آنکھ کا نور

از دو پارہ پیہ آں نورِ رواں — موجِ نورش میرود تا آسماں

چربی کے دو ٹکڑوں یعنی آنکھ کے دو ڈھیلوں سے خدا نے وہ سریعُ السیر اور تیز رفتار نُور پیدا کیا ہے جس کی موج آسمان سے جا ٹکراتی ہے۔ (۱۶۵/۸۹)

اشارہ: "اَعْجَبُوْا لِهٰذَا الْاِنْسَانِ یَنْظُرُ بِشَحْمٍ وَیَتَکَلَّمُ بِلَحْمٍ و یَسْمَعُ بِعَظْمٍ وَیَتَنَفَّسُ مِنْ خَرَمٍ"
(حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے اقتباس ہے) (شرح نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۲۴۴)

ترجمہ: اس انسان کو دیکھ کر تعجب کرنا چاہیئے کہ چربی کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، گوشت کے ساتھ وہ بولتا ہے، ہڈی کے ساتھ وہ سنتا ہے اور خرم (ناک کے بانسے) کے ساتھ سانس لیتا ہے۔

ابرار کی نیکیاں

طاعتِ عامہ گناہِ خاصگاں — وصلتِ عامہ حجابِ خاص داں

عام لوگوں کی اطاعت خاص کے لئے بمنزلہ گناہ کے ہے اور عام لوگوں کا وصال خاص اصحاب کے لئے گویا حجاب ہے۔ (۱۷۳/۹۳)

اشارہ: "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ" حوالہ: "قَوْلُ اَبِی سَعِیْدٍ خَرَّازَ" (اتحاف السادۃ المتقین، ج ۸، ص ۶۰۶)

ترجمہ: یعنی عام لوگوں کی نیکیاں مقرب حضرات کے لئے بمنزلہ گناہ کے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ شفیق ہیں

i- راست میفرمود آں بحرِ کرم — من شمارا از شما مشفق ترم

آنحضرت ﷺ نے جو بحرِ کرم ہیں، سچ فرمایا ہے کہ میں تم پر خود تم سے زیادہ مہربان ہوں۔ (۱۷۵/۹۳)

حدیث: "اَنَا اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَتَرَکَ دَیْنًا فَعَلَیَّ قَضَاؤُهٗ وَمَنْ تَرَکَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهٖ" (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۲۷)

ترجمہ : میرا مومنوں کے ساتھ ان کی ذات سے بھی زیادہ گہرا تعلق ہے، پس کوئی مومن مر جائے اور قرضہ چھوڑ جائے تو اس کی ادائیگی کا میں ذمہ دار ہوں اور اگر مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارثوں کی ملکیت ہے۔ (مسلم، ج ۵، ص ۶۲، مشکوٰۃ رقم الحدیث ۲۹۱۳)

ii- من نشستہ درکنارِ آتشی با فروغ شعلۂ بس ناخوشی

iii- ہمچو پروانہ شما آنسو دواں ہر دو دستِ من شدہ پروانہ راں

آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال ایسی ہے کہ گویا میں ایک آگ کے کنارے بیٹھا ہوں جو بڑی چمک اور بھیانک شعلہ والی ہے، مگر تم پروانوں کی طرح اس آگ پر لپکتے ہو اور میرے دونوں ہاتھ پروانوں کو ہٹا رہے ہیں۔ (۱۷۶/۹۳)

مطلب : اس مثال سے آنحضرت ﷺ کا اپنی اُمت کے لئے کس قدر لطف و کرم ثابت ہے۔

حدیث : "مَثَلِیْ وَ مَثَلُکُمْ کَمَثَلِ رَجُلٍ اَوْقَدَنَارًا فَجَعَلَ الْجَنَادِبُ وَالْفِرَاشُ یَقَعْنَ فِیْهَا وَهُوَ یَذُبُّهُنَّ عَنْهَا اٰخِذٌ بُحُجُزِکُمْ عَنِ النَّارِ وَاَنْتُمْ تَفَلِتُوْنَ مِنْ یَّدِیْ".

ترجمہ : میری مثال اور تمہاری مثال اس آدمی کی ہے کہ وہ آگ کو جلائے اور جھنگے اور پتنگے اس میں گرنے شروع ہو جائیں اور وہ ان کو ہٹائے، اسی طرح میں تمہاری کمروں سے پکڑ کر تمہیں آگ سے بچاتا ہوں اور تم ہو کہ میرے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ کر گر رہے ہو۔ (مسلم شریف، ج ۷، ص ۶۳۔ جامع صغیر، ج ۲، ص ۱۵۴)

iv- گفت پیغمبر ﷺ شمارا اے مہاں چوں پدر ہستم شفیق و مہرباں

پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے شریف لوگو! میں تم پر باپ کی طرح شفیق اور مہربان ہوں۔ (۲۲۸/۱۱۹)

حدیث : "اِنَّمَا اَنَالَکُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ" (مسند احمد، ج ۲، ص ۲۴۷)

ترجمہ : یعنی میں تمہارے لئے والد کی مانند ہوں۔

نماز میں ٹھنڈک

بہر ایں بو گفت احمدؐ در عظات ذَائِمًا قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ

اس خوشبو کے لیے آنحضرت ﷺ ہمیشہ وعظوں میں فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ (۱۸۲/۹۶)

حدیث : "حُبِّبَ اِلَیَّ النِّسَآءُ وَالطِّیْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ" (مسند احمد، ج ۳، ص ۱۹۹)

ترجمہ : تمہاری دُنیا میں مجھے تین چیزیں بہت زیادہ محبوب ہیں۔ خوشبو، عورتیں اور نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے۔

خوئے دارم در نماز آں التفات معنیٔ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ

میں نماز میں اس توجہ (بحق) کی عادت رکھتا ہوں، یہی ہے معنی اس حدیث کا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ (۲۴۰/۱۲۴)

زمین پاک ہے

روکہ سجدہ گاہ مارا لطفِ حق　　پاک گردانید تا ہفتم طبق

اے عائشہ! اسی مذکورہ سبب سے خدا نے مہربانی سے میری سجدہ گاہ کو زمین کے ساتویں طبق تک پاک کردیا۔ (۱۸۶/۹۸)

حدیث : "جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطُهُوْراً" (بخاری، ج۱، ص ۴۶)

ترجمہ : تمام زمین میرے لئے مسجد اور پاکیزہ بن چکی ہے۔

آنکھوں کا سونا اور دل کا جاگنا

گفت پیغمبر کہ عَیْنَایَ تَنَامُ　　لَایَنَامُ الْقَلْبُ عَنْ رَبِّ الْاَنَامِ

حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل پروردگارِ عالم کی طرف سے نہیں سوتا۔ (۱۸۸/۹۹)

حدیث : "تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ" (مسند احمد، ج ۱، ص ۲۲۰)

ترجمہ : میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔

گفت پیغمبر کہ خسپد چشمِ من　　لیک کے خسپد دلم اندر وسن

پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن نیند میں میرا دل کب سوتا ہے۔ (۲۰۹/۱۰۹)

حدیث : "تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ" (مسند احمد، ج ۱، ص ۲۰۰)

ترجمہ : میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔

اولیاء میرے کنبہ کی طرح ہیں

گفت اطفالِ من اند ایں اولیاء　　در غریبی فرد از کار و کیا

مثنوی میں مولانا رومؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اولیاء میرے کنبہ کی طرح ہیں، اجنبیت میں کام اور شغل سے الگ (ماسوا اللہ تعالیٰ سے قطعاً بیگانہ)۔ (۱۹۳/۱۰۲)

مطلب : اولیاء میری طرف اس طرح متوجہ اور مشغول ہیں کہ ماسوا اللہ سے بالکل اجنبی اور بیگانہ ہوکر رہ گئے ہیں۔

حدیث : "اَلْخَلْقُ کُلُّهُمْ عَیَالُ اللّٰهِ" (لطائف معنوی، ص ۱۱۱، الدرالمنتثرۃ، ص ۱۲۲)

ترجمہ : تمام مخلوقات خدائے پاک کی اہل وعیال ہے۔

دوسروں کا مال کھانا

مالِ ایشاں خونِ ایشاں داں یقین　　زانکہ مال از زور آید در یمین

اُن کے مال کو ان کے خون کے برابر سمجھو (پس اُن کا مال چھین لینا اُن کی خونریزی سے کم نہیں)۔ (۱۹۴/۱۰۲)

مطلب : خون پسینہ ایک کر کے کمایا ہوا مال یعنی رزقِ حلال کی اہمیت کا بیان ہے۔

حدیث : "حُرْمَةُ مَالِ الْمُسْلِمِ كَحُرْمَةِ دَمِهٖ" (حلیۃ الاولیاء، ج ۷، ص ۳۳۴)

ترجمہ : مسلمان کا مال دوسرے مسلمان کے لئے اسی طرح حرام ہے، جیسا اُن کا خون۔

حضور ﷺ کی دُور رسی

آنکہ یابد بُوئے رحمٰن از یمن ۔۔۔ چوں نیابد بوئے باطل را زمن

مصطفٰی چوں برد بو از راہ دُور ۔۔۔ چوں نیابد از دہانِ ما بخور

وہ پاک ہستی جو مدینے بیٹھے یمن کے ملک سے رحمٰن کی خوشبو محسوس کرتی ہے، میرے اندر سے بدبو کیوں نہ محسوس کر لے گی۔ آنحضرت ﷺ نے جب یمن کی اس قدر دُور دراز راہ سے بو محسوس فرمائی تو ہمارے منہ کی بدبو کیونکر نہ محسوس کریں گے۔ (۱۹۵/۱۰۳)

حدیث : "اِنِّیْ لَاَجِدُ نَفَسَ الرَّحْمٰنِ مِنْ جَانِبِ الْیَمَنِ" (احیاء العلوم، ج ۳، ص ۱۵۳)

ترجمہ : بے شک میں اللہ تعالیٰ کے جھونکے یمن کی طرف سے پا رہا ہوں۔

حضور ﷺ نے اپنے عاشق زار اویس قرنیؒ کی خوشبو یمن سے محسوس فرمائی تھی، اسی کی جانب اشارہ ہے۔

خلوصِ بلالؓ در اذان

آں بلالِ صدق در بانگِ نماز ۔۔۔ حی را ھی خواند از روے نیاز

سچائی کا وہ نمونہ کہ بلال نماز کی اذان میں حی (علی الفلاح) کی بجائے خلوص کے ساتھ ھَیَّ (ہائے ہوّز) کے ساتھ پڑھتے تھے۔ (۱۹۶/۱۰۳)

حدیث : "سِیْنُ بِلَالٍ عِنْدَاللّٰهِ شِیْنٌ" (اللؤلوء المرصوع ص ۴۰)

ترجمہ : حضرت بلال کی سین اللہ تعالیٰ کے نزدیک شین ہے۔

مطلب : دُعا اگر صدقِ دل اور خلوصِ نیّت سے کی جائے تو مقبول ہے، اگرچہ اس کے الفاظ غیر فصیح ہوں اُس کی مثال حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غلط اذان سے دی جو اُن کے خلوص کی بناء پر دوسرے لوگوں کی صحیح اذان سے بدرجہا بہتر تھی۔

قضا میں فضا تنگ ہوتی ہے

۱۔ چوں قضا آید شود تنگ ایں جہاں ۔۔۔ از قضا حلوہ شود رنجِ دہاں

۲۔ گفت اِذَا جَاءَ الْقَضَا ضَاقَ الْفَضَا ۔۔۔ تَحْجَبُ الْاَبْصَارُ اِذْ جَاءَ الْقَضَاء

۳۔ چشم بستہ میشود وقتِ قضا ۔۔۔ تا نہ بیند چشم کحلِ چشم را

جب قضا آتی ہے تو یہ وسیع جہاں تنگ ہو جاتا ہے۔ قضا سے حلوہ بھی منہ کو تکلیف دینے لگتا ہے۔ فرمایا کہ جب قضا آتی ہے تو فضا تنگ ہو جاتی ہے، جب قضا آتی ہے تو آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے، قضا کے وقت آنکھ بند ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ آنکھ سرمۂ چشم کو بھی نہیں دیکھ سکتی۔ (جس سے بینائی تیز ہوتی ہے)۔ (۲۰۰/۱۰۵)

حدیث : "اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَرَادَ اِنفَاذَ اَمْرٍ سَلَبَ کُلَّ ذِیْ لُبٍّ لُبَّہٗ" (جامع صغیر، ج ۱، ص ۶۶)

ترجمہ : بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی فیصلے کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو ہر عقلمند کی عقل سَلب کر لیتا ہے۔

۲۔ چوں قضا بیرون کند از چرخ سر عاقلاں گردند جملہ کور و کر

جب قضا آسمان سے سر نکالتی ہے تو عقلمند بھی سب کے سب اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں۔ (۲۰۴/۱۰۷)

عقل کا اختلاف

اختلاف عقلہا دراصل بود بر وفاق سنیان باید شنود

مگر اہلِ سنّت والجماعت کے مسلک کے موافق سننا چاہیئے کہ عقلوں کا اختلاف اصل فطرت میں ہے۔ (۲۱۶/۱۱۲)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فرشتوں نے ایک دن کہا کہ اے ہمارے رب! کیا تو نے اپنے عرش سے بھی زیادہ کوئی چیز عظیم بنائی ہے؟ خدا نے فرمایا: ہاں! عقل۔ انہوں نے کہا کہ اس کی انتہا کہاں تک ہے؟ خدا نے فرمایا کہ ظاہری علوم کے ذریعہ اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تمہیں ریت کے ذروں کی تعداد کا علم ہے؟ فرشتوں نے نفی میں جواب دیا۔ خدا نے کہا کہ میں نے عقل کو پیدا کیا ہے کئی قسموں پر، جس طرح ریت کے ذروں کی تعداد ہوتی ہے۔ بعض آدمی تو وہ ہیں جن کو عقل کا صرف رتی برابر حصّہ دیا گیا ہے، بعض وہ ہیں جن کو دو رتیاں دی گئیں ہیں اور بعض کو تین رتیاں اور بعض کو مٹھی بھر اور بعض کو سر کے بوجھ کے برابر اور بعض کو اس سے بھی زیادہ۔ (المنہج القوی، ج ۳، ص ۲۲۰)

ہر شخص کی تخلیق جداگانہ ہے

ہمچنانکہ سہل شد ما را حضر سہل شد ہم قوم دیگر را سفر

آنچنانکہ عاشقی بر سروری عاشق است آں خواجہ بر آہنگری

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند میل آں را در دلش انداختند

جس طرح ہمارے لئے شہر میں (مل جُل کر) رہنا آسان ہے، اسی طرح دوسروں (اللہ کے بندوں) کے لئے سفر کرنا (اور پہاڑوں پر تنہا رہنا) آسان ہے۔ جس طرح تم سرداری کے دِلدادہ ہو تو کوئی اور صاحب لوہار کے پیشہ پر فریفتہ ہے۔ (اپنی اپنی پسند ہے) ہر شخص کو کسی نہ کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اُسی کام کی خواہش اُس کے دل میں ڈال دی گئی ہے۔ (۲۱۸/۱۱۳)

حدیث : "اِعْمَلُوا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ" (مسلم، ج ۸، ص ۴۷)

ترجمہ : کام کرتے رہو، قدرت نے جس کام کے لئے تمہیں پیدا کیا ہے لازماً تمہیں اس کے لئے کام کرنا ہوگا۔

دل ہوا کے قبضے میں ہے

در حدیث آمد کہ دل ہمچو پریست　　در بیابانے اسیر صرصریست

حدیث میں آیا ہے کہ دل گویا ایک پر ہے، جو ایک جنگل کے اندر تیز ہوا کے قبضے میں ہے۔ (۲۱۹/۱۱۴)

مطلب : انسان کے دل کا اعتبار نہیں۔

حدیث : "اِنَّ هٰذَا الْقَلْبَ کَرِیْشَةٍ بِفُلَاةٍ مِّنَ الْاَرْضِ یُقَلِّبُهَا الرِّیْحُ ظَهْرًا لِّبُطْنٍ"

ترجمہ : یعنی اس دل کی مثال اس تنکے کی طرح ہے، جو زمین پر پڑا ہو اور ہوا کے جھونکے اس کو اُلٹ پلٹ رہے ہوں۔ (مسند احمد، ج ۴، ص ۴۱۹)

نیکوں کے امتحان

مخلصاں ہستند دایم در خطر　　امتحانہا ہست در راہ اے پسر

خداوند کے بااخلاص بندے بھی ہمیشہ خطرے میں رہتے ہیں، اس راستے میں انہیں بڑے بڑے امتحانات پیش آتے ہیں۔ (۲۲۱/۱۱۵)

اشارہ : "وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطْرٍ عَظِیْمٍ" (شرح خواجہ ایوب)

ترجمہ : مخلص لوگ ہر وقت ایک عظیم خطرے پر ہوتے ہیں۔

مشائخ قوم میں انبیاء کی مانند ہوتے ہیں

گفت پیغمبر کہ شیخِ زقپہ پیش　　چوں نبی باشد میان قومِ خویش

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ شیخِ پیشرو اپنی قوم کے اندر مثل نبی کے ہوتا ہے۔ (۲۲۴/۱۱۶)

حدیث : "اَلشَّیْخُ فِیْ بَیْتِهٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ قَوْمِهٖ" (کنزالعمال رقم الحدیث ۴۲۷۳۳)

ترجمہ : معمر آدمی اپنے گھر میں ایسے ہی ہوتا ہے جیسے اپنی قوم میں نبی ہوتا ہے۔

ولیوں کی شفاعت

صالحانِ امتم خود فارغند　　از شفاعتہائے من روز گزند

بلکہ ایشاں را شفاعت ہا بُود　　گفت شان چوں حکم نافذ میرود

میری اُمت کے نیک لوگ اس تکلیف کے دن میری شفاعت سے فارغ ہوں گے کیونکہ وہ پہلے ہی بخشے ہوئے ہیں

بلکہ خود ان کا شفاعتیں کرنے کا حق ہوگا۔ اُن کی بات چلتے ہوئے حکم کی طرح چلے گی۔ (۲۲۶/۱۱۷)

حدیث : "لَیَدُ خُلَنَّ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَةِ رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِی اَکْثَرُ مِنْ بَنِی تَمِیمٍ" (متدرک حاکم، ج ا، ص ۷۰)

ترجمہ : ایک آدمی کی شفاعت سے میری اُمت کے اتنے کثیر آدمی جنت میں داخل ہوں گے کہ ان کی تعداد بنی تمیم کی تعداد سے زیادہ ہوگی۔

اَلتَّحِیَّاتُ کی مشمولیات

در تحیّات و سلام الصالحین   مدح جملہ انبیاء آمد عجین

نیک لوگوں کے سلام اور آداب میں تمام انبیاء کی مدح بھی شامل ہے۔ (۲۳۲/۱۲۰)

حدیث : "اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلوٰتُ وَالطَّیِّبٰتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ فَاِنَّکُمْ اِذَا قُلْتُمُوْهَا اَصَابَتْ کُلَّ عَبْدٍ لِلّٰهِ صَالِحٍ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ"

ترجمہ: تمام بدنی تحفے، تمام دُعائیں اور تمام حمد و ثنائیں اُس خدائے پاک کے لائق ہیں۔ اے نبی ﷺ آپ پر درود و سلام ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔ ہم پر بھی خدا کی طرف سے سلامتی ہو اور تمام نیک بندوں پر خدا کی طرف سے سلامتی ہو۔ اگر انسان یہ دُعا پڑھے تو زمین و آسمان میں بسنے والے ہر نیک آدمی کو یہ دُعا پہنچتی ہے۔ (بخاری شریف، ج ا، ص ۹۹)

انسان کی عمرِ رفتہ

حق ہمیگوید چہ آوردی مرا   اندریں مہلت کہ دادم مر ترا

عمر خود را درچہ پایاں بردہ ای   قُوت و قوت درچہ فانی کردہ ای

گوہرِ دیدہ کجا فرسودہ ای   پنج حِس را در کجا پالودہ ای

اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ اے بندے! تُو اس مہلت میں جو میں نے تجھے دی ہے، میرے حضور میں کیا تحفہ لایا ہے، تُو نے اپنی عمر کس شغل میں بسر کی ہے، اپنی روزی اور طاقت کس کام میں صرف کی، تُو نے آنکھوں کے جوہر کو کہاں فنا کیا اور پانچوں حواس کو کہاں آلودہ کیا ہے؟ (۲۳۳/۱۲۱)

مطلب : یہ سب نمازِ باجماعت کی کیفیت بیان کی ہے، وہ صف بندی ایسے ہی ہے، جیسے قیامت کے دن حق تعالیٰ کے سامنے صف بندی ہوگی۔

ترجمۂ حدیث : ابنِ آدم کو درگاہِ خداوندی سے اُس وقت تک نہیں ہلنے دیا جائے گا جب تک اس سے یہ نہ پوچھ لیا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کن کاموں میں صرف کی، اپنی جوانی کن کوششوں میں گزاری، اپنا مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا اور جو کچھ خدا نے اس کو حکم دیا کہاں تک اس پر عمل کیا۔ (نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۵۳۲)

نماز میں ٹھونگے

بچہ بیروں آر از بیضہ نماز　　　سر مزن چوں مرغِ بے تعظیم و ساز

تم نماز کے انڈے سے (سبقِ عبرت کا) بچہ پیدا کرو، ایک بے تعظیم و بے ادب مُرغ کی طرح ٹھونگیں نہ مارو۔
(۲۳۴/۱۲۱)

حدیث : "نَهَانِی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ نَقْرَةٍ كَنَقْرَةِ الدِّیْکِ وَاِقْعَاءٍ کَاِقْعَاءِ الْکَلْبِ وَالْتِفَاتٍ کَالْتِفَاتِ الثَّعْلَبِ" (مسند احمد، ج ۲،ص ۳۱۱)

ترجمہ : رسول اللہ ﷺ نے مجھے مرغے کی طرح چونچیں مارنے سے منع کیا اور کتے کی طرح بیٹھنے سے بھی منع فرمایا اور لومڑی کی طرح دبک کر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا۔

اندھی نماز

دل نباشد غیرِ آں دریائے نور　　　دل نظر گاہِ خدا و آنگاہ کور

دل سوائے اس دریائے نور کے (جو کہ پاک و برگزیدہ لوگوں کا دل ہے) اور کچھ نہیں، بھلا اتنا تو سوچو کہ دل خداوند تعالیٰ کا مطمعِ نظر ہو اور اُس وقت اندھا بھی ہو (کیا یہ ممکن ہے؟ ہرگز نہیں!)　(۲۳۷/۱۲۳)

حدیث : "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ."

ترجمہ : خدا تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اُس کی نگاہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر رہتی ہے۔ (مسلم، ج ۸، ص ۱۱)

اللہ کا بلاوا

یا نمیدانی کرم ہائے خدا　　　کو ترا میخواہد ایں سو کہ بیا

یا تُو (دین کے لئے کوشش کرنے میں اس لئے سُستی کرتا ہے کہ) تجھ کو خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم کی خبر تک نہیں جو تجھ کو بار بار پکارتا ہے کہ اِدھر چلا آ۔　(۲۵۲/۱۳۲)

ترجمہ: خدائے پاک فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے پاس ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، اگر وہ اپنے دل میں یاد کرے تو میں اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں، اگر وہ مجھے جلوت میں یاد کرے تو میں اسے جلوت میں یاد کرتا ہوں، ایسی جلوت جو اس کی جلوت سے زیادہ بہتر ہے، اگر وہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ اور اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ آتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ آتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چلتے ہوئے آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑتے ہوئے آتا ہوں۔

"وَاللّٰهُ یَدْعُوْا اِلٰی دَارِالسَّلَامِ" (یونس:۲۵) ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے (امن و) سلامتی کے گھر کی طرف۔

نفس دشمن ہے

در خبر بشنو تو ایں پندِ نکو　　　　بَیْنَ جَنْبَیْکُمْ لَکُمْ اَعْدَیٰ عَدُوٌّ

حدیثِ پیغمبر ﷺ میں تم یہ اچھی بات سن لو کہ تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان تمہارا سخت ترین دشمن (موجود ہے)۔ (۲۸۴/۱۴۴)

مطلب : نفس کا تمام دشمنوں سے بدترین دشمن ہونے کا بیان ہے۔

حدیث : "اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ" (احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۴)

ترجمہ : تیرا بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

تقریروں کا جادو

گفت پیغمبر کہ اِنَّ فِی الْبَیَانِ　　　　سحرًا و حق گفت آں خوش پہلوان

پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک بیان میں جادو ہے اور اُس اچھے سردار نے حق فرمایا ہے۔ (۲۸۵/۱۴۴)

حدیث : "اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا وَ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃٌ" (مسند احمد، ج ۱، ص ۲۶۹)

ترجمہ : بے شک بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے اور بعض شعروں میں دانائی۔

نبی کا ریوڑ

کُلُّکُمْ رَاعٍ نبی چوں راعیست　　　　خلق مانندِ رمہ او ساعیست

اس حدیث کُلُّکُمْ رَاعٍ کی رُو سے نبی گڈریئے کی مانند ہے، (اور) مخلوق ریوڑ کی مانند ہے۔ (۲۸۷/۱۴۵)

ترجمۂ حدیث : خبردار! تم میں سے ہر شخص ذِمہ دار ہے اور اس سے ذمہ داری کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ملک کا حاکم اپنی رعیّت کا ذِمہ دار ہے اور اس سے رعیّت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ایک خاندان کا سرپرست اپنے اہل و عیال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اُن کے بارے میں باز پُرس ہوگی۔ بیوی اپنے گھر کی ذِمہ دار ہے اور اپنی اولاد کے بارے میں ذِمہ دار ہے اور اُس سے اُن کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ نوکر اپنے آقا کے مال کا ذِمہ دار ہے اور اس سے اُس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ خبردار! تم میں سے ہر ایک ذِمہ دار ہے اور ہر ایک سے اُس کی ذِمہ داری کے بارے میں بازپُرس ہوگی۔ (صحیح مسلم، ج ۶، ص ۸۔ صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۰۵)

اولیاء کی نگہبانی

بانگِ دیواں گلہ بانِ اشقیاست　　　　بانگِ سلطاں پاسبانِ اولیاست

شیطان کی آواز بدبختوں کی رکھوالی کرتی ہے، بادشاہِ حقیقی (حق تعالیٰ) کی آواز اولیاء کی نگہبان ہے۔ (۲۹۱/۱۴۷)

ترجمۂ حدیث : یعنی شیطان ابنِ آدم کے دل میں بات ڈالتا ہے اور فرشتہ بھی ڈالتا ہے۔ شیطان کی ڈالی ہوئی بات بُرائی کا وعدہ دینا اور حق کو جھٹلانا ہے اور فرشتے کی بات نیکی کا وعدہ دینا اور حق کی تصدیق کرنا ہے، پس جو شخص یہ بات پائے تو سمجھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو شخص دوسری بات پائے تو شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ (جامع صغیر للسیوطی، ج ۱، ص ۹۴)

شکست میں اِصلاح

چوں نشانِ مومناں مغلوبی است ... لیک در اسکستِ مومن خوبی است

چونکہ مومن کا نشان (بظاہر) کمزوری ہے لیکن مومن کی شکست میں بھی کسرِ نفس اور اصلاحِ اخلاق کی خوبی ہے۔ (۲۹۷/۱۴۹)

حدیث : "اَلْمُؤمِنُ یَهْرُبُ مِنَ اَلَدِّالْخِصَامِ كَماَ یَهْرُبُ الْغَنَمُ مِنَ الّذِئبِ" (شرح خواجہ ایوّب)

ترجمہ : مومن آدمی جھگڑالو آدمی سے اسی طرح بھاگتا ہے، جیسے بکری بھیڑیئے کو دیکھ کر بھاگ جاتی ہے۔

جنتی لوگ کم جھگڑتے ہیں

گفت پیغمبر کہ ہستند از فنون ... اہلِ جنت درخصومتہا زبُون

پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنتی لوگ بعض مصالح کی بناء پر جھگڑوں میں دب جایا کرتے ہیں۔ (۳۰۳/۱۵۱)

حدیث : "اَكْثَرُ اَهْلِ الْجَنَّةِ اَلْبُلْهُ" (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۱۲٦)

ترجمہ : اکثر جنتی لوگ بھولے بھالے ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ کا لوگوں کو دوزخ سے کھینچنا

زاں ھمی خندم کہ از زنجیرِ دغل ... می کشمتانِ سوئے سروستان و گل

ای عجب کز آتشِ بے زینہار ... بستہ می آریمتاں تا سبزہ زار

از سوئے دوزخ بزنجیرِ گراں ... می کشمتاں تا بہشتِ جاوداں

میں تمہاری زنجیر اور طوق سے اس لئے خوش ہو کر ہنس رہا ہوں کہ تم کو اُن کے ذریعہ سے سروگل والے بہشتی مقام کی طرف لئے جا رہا ہوں۔ واہ واہ! کیا مزے کی بات ہے کہ ہم تم کو جہنم کی بے پناہ آگ سے گرفتار کرکے بہشت کے سبزہ زار کی طرف لا رہے ہیں۔ میں تم کو بھاری زنجیر کے ساتھ دوزخ کی طرف سے دائمی بہشت کی جانب کھینچ رہا ہوں۔ (۳۰۵/۱۵۲)

حدیث : "عَجِبَ رَبُّنَا قَوْماً یُقَادُوْنَ اِلَی الْجَنَّةِ فِیْ السَّلاَسِلِ" (جامع صغیر، ج ۲، ص ۵۷)

ترجمہ : اللہ پاک کو اُس قوم پر بڑا ہی تعجب ہوگا جنہیں جنت کی طرف زنجیروں میں باندھ کر لے جایا جائے گا۔

موت سے نفرت

چوں کراہت رفت خود آں مرگ نیست   صورتِ مرگست نقلاں کرد نیست

جب موت سے نفرت جاتی رہے تو وہ موت ہی نہیں صرف ظاہراً موت ہے، ورنہ حقیقت میں وہ نقل مکانی ہے۔ (۳۰۶/۱۵۳)

مشائخ کرام کا قول ہے: "اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا يَمُوْتُوْنَ بَلْ يَنْتَقِلُوْنَ مِنْ دَارٍ اِلٰى دَارٍ" (لطائف معنوی، ص ۱۶۹)

ترجمہ : خبردار! اللہ کے ولی مرتے نہیں بلکہ وہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

اولیاء پر رشک

سخت پنہاں است و پیدا حیرتش   جانِ سلطانانِ جاں در حیرتش

اس کی حیرت (بلحاظِ ماہیّت) سخت پوشیدہ ہے اور (بلحاظِ آثار) سخت نمایاں، سلاطینِ روح یعنی انبیاء و اولیاء کی جان بھی اس کے متناہی مراتب میں سے کسی ایک درجہ پر پہنچ کر اگلے درجہ کی حسرت میں ہے۔ (۳۱۱/۱۵۵)

حدیث : "اِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لَيْسُوْا بِاَنْبِيَآءَ لٰكِنْ يُغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَالشُّهَدَآءُ لِقُرْبِهِمْ وَمَكَانَتِهِمْ عِنْدَاللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ" (بحرالعلوم طبع ہند)

ترجمہ : یعنی اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں جو نبی نہیں لیکن انبیاء اور شہداء ان پر رشک کرتے ہیں، اس قُرب اور درجہ کی وجہ سے جو ان کو اللہ عزّوجلّ کی بارگاہ میں حاصل ہے۔

بہتر فرقے

غیرِ ہفتاد و دو ملّت کیشِ اُو   تختِ شاہاں پختہ بندی پیشِ اُو

اُس کا مذہب بہتر (۷۲) فرقوں سے جدا ہے، بادشاہوں کے تخت اُس کے آگے زبون وحقیر ہیں۔ (۳۱۲/۱۵۵)

حدیث : "اِفْتَرَقَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى اِحْدٰى وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً وَتَفَرَّقَتِ النَّصَارٰى عَلٰى اِثْنَتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً" (جامع صغیر، ج ۱، ص ۴۷)

ترجمہ : یہود اکہتر (۷۱) فرقوں میں بٹ گئے تھے اور عیسائی بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے تھے۔

بندے پر خدا کا سایہ

سایۂ حق بر سرِ بندہ بُوَد   عاقبت جوئندہ یابندہ بُوَد

حق تعالیٰ کا سایہ بندے کے سر پر ہوتا ہے، آخر تلاش کرنے والا پا ہی لیتا ہے۔ (۳۱۳/۱۵۶)

حدیث : "مَنْ قَرَعَ بَابًا وَّلَجَ" (المنہج القوی)

ترجمہ : یعنی جس شخص نے کوئی دروازہ کھٹکھٹایا تو داخل ہو گیا۔

خدا کا دروازہ کھٹکھٹانا

گفت پیغمبر ﷺ کہ چوں کوبی درے　　　عاقبت زاں در بروں آید سرے

پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کوئی دروازہ کھٹکھٹاؤ تو آخر اُس دروازے سے کوئی سر نکل آتا ہے۔ (۳۱۴/۱۵۶)

مطلب : ڈھونڈنے والا آخر پا ہی لیتا ہے۔

حدیث : "مَادُمْتَ فِیْ صَلاۃٍ فَاَنْتَ تَقْرَعُ بَابَ الْمَلِکِ وَمَنْ یَّقْرَعُ بَابَ الْمَلِکِ یُفْتَحُ لَہٗ"

ترجمہ : جب تک تُو نماز ادا کرتا رہتا ہے تو دراصل اس مالکِ حقیقی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوتا ہے اور جو اپنے مالک کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہے، کبھی نہ کبھی وہ دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔ (حلیۃ الاولیاء، ج ۱، ص ۳۰)

محبوب پر نظر

بلک از او عاریت کن چشم و نظر　　　پس بچشم او بروے او نگر

خود اُسی محبوب سے آنکھ اور نظر مستعار لے لو اور پھر اسی کی آنکھ سے اُس پر نظر کرو۔ (۳۱۷/۱۵۷)

حدیث : "اِعْرَفُوْا اللّٰہَ بِاللّٰہِ" (اصول کافی طبع تہران، ص ۴۱)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کو اسی کے نور سے پہچانو۔

فرشتوں کی دُعا

انبیاء بادشمناں بر می تنند　　　پس ملائک ربِّ سَلِّم می زنند

انبیاء کرامؑ جو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں تو گویا وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں آ رہے ہیں، اس لئے فرشتے "الٰہی اُن کو سلامت رکھ" کا نقارہ بجاتے ہیں۔ (۳۱۶/۱۵۷)

حدیث : "شِعَارُ الْمُسْلِمِیْنَ عَلَی الصِّرَاطِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ" (مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۳۷۵)

ترجمہ : پُل صراط پر قیامت کے دن مسلمانوں کے درمیان امتیازی الفاظ یہ ہوں گے۔ "اَللّٰھُمَّ سَلِّم سَلِّم"

خدا کا ہاتھ

چشم او من باشم و دست و دلش　　　تا رہد از مدبریہا مقبلش

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں اور اس کا دل، تاکہ اُس کا بااقبال نصیب بدبختیوں سے چھوٹ جائے۔ (۳۱۹/۱۵۸)

مطلب : قُربِ خداوندی کے فیوض و برکات۔

ترجمۂ حدیث : بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی دوست کو اذیّت دی، گویا اُس نے مجھے لڑائی کے لئے چیلنج کیا اور مجھ سے قریب کرنے کے لئے فرائض سے زیادہ کوئی محبوب چیز نہیں ہے۔ میرا بندہ مسلسل

نوافل ادا کرتا ہے اور میرے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اُسے محبوب رکھنے لگتا ہوں اور جب وہ میرا محبوب ہو جائے تو جن کانوں کے ساتھ وہ سنتا ہے، وہ کان میں بن جاتا ہوں اور جن آنکھوں کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، وہ آنکھیں میں بن جاتا ہوں، جن ہاتھوں کے ساتھ وہ پکڑتا ہے اور جن پاؤں کے ساتھ وہ چلتا ہے، وہ میں بن جاتا ہوں پھر اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے تو میں ضرور عطا کرتا ہوں اور وہ میری پناہ مانگے تو ضرور دیتا ہوں۔ (بخاری رقم الحدیث ٦۵٠٢)

حدیث : "مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ" (کشف الاسرار دانشگاہ تہران، ص ۵٦٢)

ترجمہ : یعنی جو اللہ کا ہو جائے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

نیکوں پر مصائب

زیں سبب بر انبیاء رنج و شکست — از ہمہ خلقِ جہاں افزوں تر است

اسی لئے تو انبیاء پر دکھ اور شکستہ حالی تمام مخلوقِ عالم سے زیادہ نازل ہوتی ہے۔ (۳۲٠/۱۵۸)

مطلب : نزولِ مصائب سے رُوحانی ترقی ہوتی ہے۔

حدیث : "اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَآءُ ثُمَّ الصَّالِحُوْنَ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ" (جامع صغیر، ج ۱، ص ۴۱)

ترجمہ : خدا کی طرف سے جو مصائب نازل ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ انبیاء پر پھر نیک لوگوں پر اور پھر درجہ بدرجہ۔

مومن کی مصیبت

کہ بلائے دوست تطہیر شماست — علم او بالائے تدبیر شماست

محبوبِ حقیقی کی بھیجی ہوئی بلا تمہاری رُوحانی پاکیزگی کا سامان ہے، اُس کا علم تمہاری تدبیر سے بالاتر ہے۔ (۳۲۱/۱٦٠)

حدیث : "مَامِنْ مُّصِيْبَةٍ تُصِيْبُ الْمُسْلِمَ اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا عَنْهُ حَتّٰى الشَّوْكَةَ يُشَاكُهَا"

ترجمہ : مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ اُس کے گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے، یہاں تک کہ جو کانٹا بھی اُس کو چبھتا ہے۔ (جامع صغیر، جلد ۲، ص ۱۵۲)

اللہ کی حفاظت

کے کم از برّہ کم از بزغالہ ام — کہ نباشد حارس از دنبالہ ام

میں کیا ایک بھیڑ بکری کے بچے سے بھی کم ہوں کہ میرے پیچھے کوئی نگہبان نہ ہو؟ (۳۲۳/۱٦۱)

حدیث : "اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَحْمِىْ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ كَمَا يَحْمِىْ الرَّاعِىْ الشَّفِيْقُ غَنَمَهٗ عَنْ مَوَاقِعِ الْهَلَكَةِ"

ترجمہ : بے شک اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کی اس طرح حفاظت کرتا ہے، جس طرح ایک شفیق چرواہا

اپنی بھیڑوں کی حفاظت کرتا ہے کہ کہیں وہ تباہی کے گڑھے میں نہ گر جائیں۔ (جامع صغیر، ج ۱، ص ۷۵)

قضا اندھا کر دیتی ہے

آدما تو نیستی کور از نظر لیک اِذَا جَاءَ الْقَضَآ عَمَی الْبَصَرُ

اے آدم! تم بینائی سے اندھے نہیں ہو لیکن جب قضا آتی ہے تو بصارت بیکار ہو جاتی ہے۔ (۳۲۶/۱۶۲)

حدیث : "اِنَّ اللّٰہ اِذَا اَرَادَ اِنْفَاذَ اَمْرٍ سَلَبَ کُلَّ ذِیْ لُبٍّ لُبَّہٗ" (جامع صغیر، ج ۱، ص ۶۶)

ترجمہ : جب اللہ اپنے کسی فیصلے کا ارادہ کرتا ہے تو عقلمند افراد کی عقل سلب کر لی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا حکم نافذ ہو جائے تو اُن کی عقلیں واپس لوٹا دی جاتی ہیں، پھر اُن کے پاس ندامت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

ہم نوح کی کشتی ہیں

بہر ایں فرمود پیغمبر کہ من ہمچو کشتی ام بطوفانِ زمن

ما و اصحابیم چوں کشتیٔ نوح ہر کہ دست اندر زند یابد فتوح

اسی لئے پیغمبرِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں زمانے کے طوفان میں مع صحابہ حضرت نوحؑ کی کشتی کی مانند ہوں پھر جو شخص ہمارا سہارا پکڑے گا، نجات پائے گا۔ (۳۳۴/۱۶۶)

حدیث : "مَثَلُ عِتْرَتِیْ کَسَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَّکِبَ فِیْھَا نَجَا" (کنوز الحقائق، ص ۱۱۹)

ترجمہ : میرے اہلِ بیت کی مثال سفینۂ نوحؑ کی ہے پھر جو اس میں سوار ہو گیا، نجات پا گیا۔

ہدیہ دینے کی حکمت

من نمی گویم مرا ہدیہ دہید لیک گفتم لائقِ ہدیہ شوید

کہ مرا از غیب نادر ہدیہ ہاست کہ بشر آنرا نیارد نیز خواست

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے ہدیہ دو بلکہ میں کہتا ہوں کہ تم ہدیہ دینے کے لائق بنو۔ کیونکہ مجھے غائب سے علوم و معارف یا حکومتِ انس و جان کے وہ نادر تحفے ملے ہیں کہ کوئی دوسرا انسان اُن کی آرزو بھی نہیں کر سکتا۔ (۳۳۶/۱۶۷) (چہ جائیکہ اُن کو حاصل کر لے)۔

ترجمۂ حدیث : خدا نے فرمایا کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کیا ہے جو آج تک نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ہی کسی دل میں اس قسم کا خیال آیا ہے۔

آدم کی صورت خدا کی صورت

خلق ما بر صورت خود کرد حق وصف ما از وصف او گیرد سبق

حق تعالیٰ نے ہماری آفرینش اپنی صورت کے مطابق کی ہے، اس لئے ہمارا وصف اُس کے وصف سے سبق حاصل

کرتا ہے۔ (۳۴۶/۱۷۲)

حدیث : "اِذَا قَاتَلَ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ فَلْیَجْتَنِبِ الْوَجْهَ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ" (مسلم، ج۸، ص ۳۰)

ترجمہ : جب کوئی آدمی اپنے بھائی کے ساتھ لڑے تو اسے چاہیئے کہ اس کے چہرے سے اجتناب کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا چہرہ اپنی صورت میں بنایا تھا۔

جو لوگ خدا کے ساتھ ٹیڑھے ہیں

ہمچنیں تاجِ سلیمانؑ مَیل کرد — روزِ روشن را برو چوں لیل کرد

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تاج ٹیڑھا ہو گیا اور اس نے ان پر دن دہاڑے اندھیرا ڈال دیا۔
(۳۷۱/۱۸۴)

مطلب : مولاناؒ کا مقصود یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اُن کی ایک لغزش سے ایسا ہوا، لہٰذا کج رَو کے خلاف مخلوقِ خدا بھی کج رَو بن جاتی ہے۔

پیشوا بوڑھا چاہیے

ہم تو گفتی ایں و گفتِ تو گوا — پیر باید پیر باید پیشوا

یہ آپ ہی نے فرمایا ہے اور آپ کا فرمان گواہ ہے کہ پیشوا بڈھا چاہیے، بڈھا۔ (۳۷۸/۱۸۸)

مطلب : وہی فوج ارسال کرنے کی بات چل رہی ہے کہ سالار فوج جہاں دیدہ تجربہ کار اور بڈھا ہونا چاہیے۔

حدیث : "کَبِّرُوْ الْکِبَرَ اَلْکِبَرَ الْکِبَرَ" (مسلم، ج ۵، ص ۹۸،۹۹)

ترجمہ : بڑے آدمی کی عزت کرو۔

موت سے پہلے مرنا

مرگ پیش از مرگ امن است ای فتیٰ — ایں چنیں فرمود مارا مصطفیٰؐ

گفت مُوْتُوْا قَبْلَکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ — یَّاْتِیَ الْمَوْتُ تَمُوْتُوْا بِالْفِتَنِ

اے جوان! مرنے سے پہلے مر جانا یہ ہے اور حضرت محمد ﷺ نے فرمایا بھی ہے کہ مر جاؤ! قبل اس کے کہ موت آئے اور تم فتنوں سے مرو۔ (۳۸۷/۱۹۱)

حدیث : "حَاسِبُوْا اَعْمَالَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا وَزِنُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُوْزَنُوْا وَمُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا"

ترجمہ : اپنے اعمال کا محاسبہ اس وقت سے پہلے کر لو جب کہ تم سے محاسبہ کیا جائے گا، اپنے نفسوں کا موازنہ اُس سے پہلے کر لو جب کہ تمہیں موازنے کے لئے پکارا جائے گا، مرنے سے پہلے ہی مر جاؤ۔ (منہج سے روایت ہے)۔

فرعون سے انعامات کے وعدے

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے فرعون کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر تو ایمان لے آوٴ تو تمہیں چار عدد وعدوں سے ممتاز کیا جائے گا۔

گفت موسیٰ کاوّلین آں چہار　　　صحتی باشد تنت را پائدار

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان چاروں میں سے پہلی یہ ہے کہ تیرے وجود کی صحت پائیدار رہے گی۔

(۳۹۲/۱۹۳)

مطلب : حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کو نصیحت کہ میری ایک بات مانو، اُس کے عوض چار انعام اور ان میں سے پہلا انعام ہے صحتِ دائمی۔

حدیث : "اِنَّ لَکُمْ اَنْ تَحْیُوْنَ فَلاَ تَمُوْتُوْا وَ اِنَّ لَکُمْ اَنْ تَصِحُّوْا فَلَا تَسْتَھُوْا وَ اِنَّ لَکُمْ اَنْ تَشِبُّوْ فَلَا تَھْدِمُوْا وَ اِنَّ لَکُمْ اَنَ تَنْعَمُوْا فَلاَ تَبْاَسُوْا" (مسند احمد، ج۲، ص ۳۱۹)

ترجمہ : تمہیں چاہیئے کہ (۱) زندہ رہنے کی کوشش کرو اور نہ مرو۔ تمہیں چاہیئے کہ (۲) تندرست رہنے کی کوشش کرو اور بیمار نہ پڑو اور تمہیں چاہیئے کہ (۳) جوان رہنے کی کوشش کرو اور بوڑھے نہ ہو جاوٴ اور تمہیں چاہیئے کہ (۴) بے فکر رہنے کی کوشش کرو اور متفکر نہ رہو یعنی اگر فرعون مسلمان ہو جاتا تو اس کو یہ چار چیزیں ملتیں مگر اس نے ہامان سے مشورہ کیا تو اس نے کہا جناب آپ تو خود خدا ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے خدا کی بات کیوں مانتے ہو، لہٰذا محروم رہا۔

صحابی سے جنت کا وعدہ

گفت عکاشہ صفر بگذشت و رفت　　　گفت کہ جنت ترا اے شیر رفت

دیگرے آمد کہ بگذشت اینِ صفر　　　گفت عکاشہ ببرد از مژدہ بر

عکاشہ نے جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ماہِ صفر بیت گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے بہادر شیر! بہشت تمہاری قیام گاہ ہے پھر دوسرا آیا اور عرض کیا کہ ماہِ صفر گذر گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خوشخبری کا پھل تو عکاشہ لے گیا۔

(۳۹۷/۱۹۵)

ترجمہٴ حدیث : متعدد روایات میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا! جنت میں میری اُمت سے ستر ہزار آدمی ایسے داخل ہوں گے جن سے حساب کتاب نہیں لیا جائے گا۔ عکاشہ بن محصنؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں ان لوگوں میں سے ہوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تُو بھی انہی میں سے ہے۔ پھر دوسرا آدمی اُٹھا اُس نے کہا یارسول اللہ ﷺ! کیا میں بھی اُنہیں میں سے ایک ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا عکاشہ تم سے سبقت لے گیا۔

اللہ کے ساتھ خاص وقت

لِیْ مَعَ اَللّٰہِ وَقْتٌ بود آں دم مرا لا یَسَعُ فِیْہِ نَبِیٌّ مُجْتَبٰی

میں اس وقت خدا کے ساتھ تھا، جہاں کسی نبی مرسل کی بھی گنجائش نہ تھی۔ (۱۹۹/۴۰۶)

مطلب : حضور کے تقرب کا بیان ہے۔

حدیث : "لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَّا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُّقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ"

ترجمہ : یعنی مجھ کو خدا کے ساتھ معیت و قُرب کا ایک ایسا خاص وقت حاصل ہے جس میں اور کسی رسول یا مقرب فرشتے کی گنجائش نہیں۔ (مئولف اللؤلؤ والمرصوع ص ۶۶)

خلیلؑ کی خدمت میں جبرئیل علیہ السلام کا آنا

او ادب نا موخت از جبرئیلؑ راد کہ پرسید از خلیل حقؑ مراد

وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اَدب کیوں نہ سیکھے، جنہوں نے حضرت خلیلؑ سے آگ میں گرتے وقت ان کی مراد کے متعلق پوچھا تھا۔ (۱۹۹/۴۰۸)

حدیث : حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کہنا ھَلْ لَکَ مِنْ حَاجَۃٍ۔ (کیا آپ کی کوئی حاجت ہے؟)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اَمَا اِلَیْکَ فَلاَ۔ (مگر آپ سے کوئی نہیں)۔

مطلب : آتشِ نمرود کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کا آنا اور پوچھنا کہ یا خلیل اللہؑ! کوئی خدمت میرے لائق ہے۔

حدیث : "عِلْمُہٗ بِحَالِیْ حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ" (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۱۲۳)

ترجمہ : یعنی مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اُس خدائے پاک کا علم اور اس کی بصیرت مجھے دیکھ رہی ہے۔

دینداروں پر انعام

گفت رو ہر کاوِ غم دیں برگزید باقی غمہا را خدا از وے برید

بادشاہ نے کہا کہ جاؤ بھی، جس نے غمِ دیں اختیار کر لیا، خدائے بزرگ و برتر نے اسے تمام افکار سے چھڑا لیا۔ (۲۰۱/۴۱۵)

حدیث : "مَنْ جَعَلَ الْھُمُوْمَ ھَمًّا وَّاحِدًا کَفَاہُ اللّٰہُ ھَمَّ دُنْیَاہُ وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِہِ الْھُمُوْمُ لَمْ یُبَالِ اللّٰہُ فِیْ اَیِّ اَوْدِیَۃِ الدُّنْیَا ھَلَکَ" (مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۴۴۳)

ترجمہ : جو تمام غموں کو ایک غم بنا دے، اللہ تعالیٰ اس کے دُنیا کے غموں کا کفیل خود ہو جاتا ہے اور جو مختلف غموں میں اُلجھتا رہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ دُنیا کی جس وادی میں چاہے گرے اور ہلاک ہو جائے۔

پیغمبرؑ کی ستر بار توبہ

ہمچو پیغمبر زگفتن وز نثار　　　توبہ آرم روز من ہفتاد بار

جنابِ رسول ﷺ کی طرح میں بھی اپنی گفتگو اور معرفت کے موتی نثار کرنے کے لئے ہر روز ستر بار توبہ کرتا ہوں۔
(۴۲۵/۲۰۴)

مطلب : حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میں ستر مرتبہ مغفرت طلب کرتا ہوں۔

حدیث : "وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُاللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً" (بخاری، ج ۴، ص ۶۴)

ترجمہ : اللہ پاک کی قسم ہے کہ میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں دن میں ستر بار۔

مصیبت اور اللہ والے

گفت درویشے بہ درویشے کہ تو　　　چوں بدیدے حضرتِ حق را بگو

ایک درویش نے دوسرے درویش سے پوچھا، یہ تو بتاؤ کہ تم نے حضرتِ حق کو کیسے دیکھا؟ (۴۶۳/۲۲۱)

مطلب : بے شک دجّال کا خروج ہوگا تو اُس کی معیت میں آگ اور پانی ہوگا، جس چیز کو آدمی آگ سمجھیں گے وہ حقیقتاً ٹھنڈا پانی ہوگا اور جس کو لوگ پانی سمجھیں گے وہ ایک جلا دینے والی آگ ہوگی۔ تم میں سے جو آدمی اس کو پائے اسے چاہیئے کہ اس حصے میں گرے جو بظاہر آگ دکھائی دے رہا ہو کیونکہ وہ آگ نہیں، شیریں اور ٹھنڈا پانی ہوگا۔ (مسند احمد، ج ۵، ص ۹۹)

عقل کا ذرّہ

ذرّۂ عقلت بہ از صوم و نماز　　　پس نکو گفت آں رسُولِ خوش جواز

پس پاک روشن رسولِ مقبول ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ تیرے لئے ذرہ بھر عقل روزہ و نماز سے بہتر ہے۔
(۴۶۳/۲۲۱)

مطلب : عقل کی فضیلت کا بیان۔

حدیث : "کُنْتُ اُبَایِعُ النَّاسَ وَکَانَ مِنْ خُلُقِیَ الْجَوَازُ" (نہایہ ابن اثیر، ج ۱، ص ۱۲۴)

ترجمہ : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! میں لوگوں سے بیعت لیا کرتا ہوں اور میری فطرت میں اختصار پسندی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ایک آدمی کی تعریف کی جب کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ وہ آدمی عبادت گزار اور اچھی عادت رکھنے والا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے بہت مبالغہ کیا۔ رسول پاک ﷺ نے پوچھا کہ اُس کی عقل کیسی ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو آپ کو اس کی عبادت اور نیکی کے دوسرے امور کے بارے میں اس کی جدوجہد کی خبر دے رہے ہیں اور آپ ﷺ اس کی عقل کے بارے

میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک احمق کو اپنی حماقت کی بناء پر اتنا کچھ نقصان پہنچ جاتا ہے، جتنا کہ ایک فاسق و فاجر کو اپنے فسق و فجور سے پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو درجات میں رفعت عطا فرمائے گا لیکن ان کو خدا کا قُرب اُن کی عقلوں کے مطابق نصیب ہوگا۔ (شرح نہج البلاغہ، ج ۴، ص ۴۶۴)

عقلوں میں فرقِ بسیار

ایں تفاوت عقلہا را نیک داں در مراتب از زمیں تا آسماں

عقلوں کے اس تفاوت (فرق) کو جو ان کے مراتب میں ہے زمین سے لے کر آسمان تک خوب سمجھ لو۔ (۴۶۵/۲۲۳)

مطلب : معتزلہ کے اس عقیدے کی تردید ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ دراصل شخصی عقلیں برابر ہیں۔

شکستہ حال کی دُعا

دستِ اشکستہ بر آوردِ دُعا سوئے اشکستہ پرد فضلِ خدا

اے مخاطب دُعا میں شکستہ ہاتھ اُٹھاؤ، کیونکہ شکستہ حال آدمی کی طرف فضل و اجابت خداوندی اُڑ کر آتی ہے۔ (۴۶۶/۲۲۳)

حدیث : "اِلٰهِیْ اَیْنَ اَطْلُبُکَ قَالَ عِنْدَالْمُنْکَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ" (شرح تصرف، ج ۳، ص ۱۲۷)

ترجمہ : یعنی اے میرے پروردگار! میں تجھے کہاں تلاش کروں؟ خدا نے فرمایا کہ ٹوٹے ہوئے دل والوں کے پاس۔

پاکدامنی اور شہوت

ہیں مکن خود را خصی رہباں مشو زانکہ عفت ہست شہوت را گرو

خبردار! اپنے آپ کو خصی نہ کرو، رہبانیّت اختیار نہ کرو، کیونکہ پاک دامنی شہوت کے تابع ہونے پر موقوف ہے۔ (۴۷۲/۲۲۶)

حدیث : "رَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی عُثْمَانَ بْنَ مَظْعُوْنِ اَلتَّبَتُّلَ وَلَوْاَذِنَ فِیْهَ لَاخْتَصَیْنَا"

ترجمہ : رسولِ پاک ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رہبانیّت سے روک دیا اور اگر آپ ﷺ اجازت دیتے تو ہم خصّی ہو جاتے۔ (نہایہ ابنِ اثیر، ج ۱، ص ۵۹)

مرشد نبی کا نُور ہے

کاونبیٔ وقتِ خویش است اے مرید زانکہ از نورِ نبی آمد پدید

کیونکہ اے مرید وہ مرشدِ کامل اپنے وقت کا نبی ہے، اس لئے کہ وہ صاف طور پر نبی کا نور ہے۔ (۴۸۱/۲۲۸)

حدیث : "اَلشَّیْخُ فِیْ بَیْتِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ قَوْمِہٖ" (الدرر المنتثرۃ کما تقدم)

ترجمہ : معمر آدمی اپنے گھر میں ایسے ہوتا ہے، جیسے اپنی قوم میں نبی ہوتا ہے۔

کائنات کا مقصود

جوہر است انسان و چرخ او را عرض　　　جملہ فرع و سایہ اند و تو عرض

انسان اک جوہر ہے اور آسمان اس کی عرض ہے، تمام مخلوقات (غیر انسان) متعلقات اور سایہ ہیں اور اصل مقصود انسان ہے۔ (۵۷۵/۲۶۳)

حدیث : "یَا ابْنَ اٰدَمَ خَلَقْتُکَ لِاَجْلِیْ وَخَلَقْتُ الْاَشْیَآءَ لِاَجْلِکَ" (المنہج القوی، ج ۵، ص ۵۱۶)

ترجمہ : اے ابنِ آدم! میں نے تجھ کو اپنے لئے پیدا کیا اور کائنات کی دوسری چیزیں تیرے لئے پیدا کیں۔

نفس کا ذلیل ہونا

چوں طمع بستی تو در انوار ہُو　　　مصطفٰے گوید کہ ذلت نفسہٗ

جب تم انوارِ الٰہیہ کے شائق ہو جاؤ تو تم اس عالی مقام پر پہنچ گئے، جس کے متعلق حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ اُس کا نفس ذلیل ہوگیا۔ (۵۷۲/۲۶۴)

حدیث : "اَلْمُؤْمِنُ یَھْرُبُ مِنَ اَلَدِّالْخِصَامِ کَمَا یَھْرُبُ الْغَنَمُ مِنَ الذِّئْبِ" (شرح خواجہ ایوب)

ترجمہ : مومن آدمی جھگڑالو آدمی سے اسی طرح بھاگتا ہے، جیسے بکری بھیڑیئے سے بھاگتی ہے۔

ہر شخص معمور بہ خدمت ہے

ہر کسی راہ خدمتی دادہ قضا　　　در خورِ آں گوہرش در ابتلا

قضا و قدر نے ہر شخص کو امتحان کی مصلحت سے اس کی استعداد و صلاحیت کے موافق ایک نہ ایک خدمت سپرد کر رکھی ہے۔ (۵۸۷/۲۶۸)

حدیث : "اِعْمَلُوْ افکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَہٗ" (مسلم، ج ۸، ص ۴۷)

ترجمہ : کام کرتے رہو، قدرت نے جس کام کے لئے تمہیں پیدا کیا ہے لازماً تمہیں وہ کرنا ہوگا۔

اللہ کے ہم نشین کون ہیں

پس جلیس اللہ گشت آں نیکبخت　　　کہ بہ پہلوئے سعیدے برد رخت

پس وہ خوش نصیب آدمی اللہ تعالیٰ کا ہم نشین ہو گیا جس نے کسی صاحبِ سعادت کے پہلو میں ڈیرہ ڈال دیا۔

(۶۳۵/۲۸۷)

مطلب : کاملین کی صحبت گویا ہمنشینیٔ باخدا ہے۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا او نشیند در حضور اولیاء

حدیث : "مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّجْلِسَ مَعَ اللّٰہِ فَلْیَجْلِسْ مَعَ اَھْلِ التَّصَوُّفِ" (علامہ سیوطی اللآلی ج ۲ ص ۲۶۴)

ترجمہ : جو اللہ کی مجلس میں بیٹھنا چاہے اسے صوفیاء کے ساتھ بیٹھنا چاہیئے۔

جاہل کے نقصانات

جاہل ار باتو نماید ہمدلی عاقبت زحمت زند از جاہلی

جاہل اگر تم سے ہمدلی کا اظہار بھی کرے، انجام کار جہالت کی وجہ سے تم کو نقصان اور صدمہ پہنچائے گا۔
(۶۳۷/۲۸۷)

مطلب : جاہل کی دوستی ضرر ہی ضرر ہے۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بھی اس بارے میں ہے :

"یَابُنَیَّ اِیَّاکَ وَمُصَاحِبَۃَ الْاَحْمَقِ فَاِنَّہٗ یُرِیْدُ اَنْ یَّنْفَعَکَ فَیَضُرُّکَ"

ترجمہ : اے میرے بیٹے! احمق کی دوستی سے پرہیز کر، وہ چاہے گا کہ تجھے نفع پہنچائے مگر بے خیالی میں نقصان پہنچائے گا۔ (شرح نہج البلاغہ، ص ۲۵۹)

جے پیر نظر اک تکے ہُو

ورکنی خدمت نخوانی یک کتیب علمہائے نادرہ یابی زجیب

اگر تم مرشدِ کامل کی خدمت کرو اور خواہ ایک کتاب بھی نہ پڑھو تو بھی اپنے گریبان کے اندر نادر علوم پاؤ گے۔
(۶۵۰/۲۹۱)

مطلب : خدمت سے مراد خدمتِ مرشد ہے اور مقصود یہ ہے کہ خدا چاہے تو بلا اسباب بھی مراد پوری کر دے، اس کی رضا مقدم ہے۔

حدیث : "مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ یَوْماً ظَھَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ."

ترجمہ : جو انسان چالیس دن تک خدا کا مخلص بندہ بن کر زندگی بسر کر لے، اس کے دل سے حکمت و دانش کے چشمے پھوٹ کر اُس کی زبان پر آنے لگتے ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء، ج ۵، ص ۱۸۹)

ہر ولی اللہ ایک کشتی بان ہے

ہر ولی را نوح و کشتی بان شناس صحبت ایں خلق را طوفان شناس

ہر ولی کو نوح اور کشتی بان اور اُس کی صحبت کو کشتی سمجھو اور اِس مخلوق کی صحبت کو طوفان جانو۔ (۶۶۰/۲۹۴)

مطلب : صحبتِ عوام سے بچنے کے لئے صحبتِ اہل اللہ کی کشتی میں پناہ لینی چاہیئے۔

حدیث : "مَثَلُ عِتْرَتِیْ کَسَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَّنْ رَکِبَ فِیْھَا نَجَا" (کنور الحقائق ص ۱۱۹)

ترجمہ : میرے اہلِ بیت کی مثال سفینۂ نوحؑ کی ہے، جو اس میں سوار ہو گیا، نجات پا گیا۔

شہریوں اور دیہاتیوں میں فرق

اَلْکِیَاسَۃُ وَالْاَدَبُ لِاَھْلِ الْمَدَرِ اَلضِّیَافَۃَ وَالْقِرَی لِاَھْلِ الْوَبَرِ

الضِّیَافَۃُ لِلْغَرِیْبِ وَالْقِرَیٰ اَوْدَعَ الرَّحْمٰنُ فِیْ اَھْلِ الْقِرَیٰ

دانائی اور تہذیب شہر والوں کا حصہ ہے اور ضیافت و مہماں نوازی کا وصف اہلِ بادیہ کے لئے ہے، مسافر کے لئے ضیافت اور مہمان داری حق تعالیٰ نے اہلِ دیہات کو بخشی ہے۔ (۲۶۸/۲۹۶)

مطلب : تہذیب و شائستگی اہلِ شہر کا اور مہمان نوازی اور مسافر پروری اہلِ دیہات کا حصّہ ہے۔

حدیث : "اَلضِّیَافَۃُ عَلٰی اَھْلِ الْوَبَرِ وَلَیْسَتْ عَلٰی اَھْلِ الْمَدَرِ" (جامع صغیر، ج ۲، ص ۵۲)

ترجمہ : صحیح طور پر مہمان نوازی دیہاتیوں ہی کا حصہ ہے اور یہ شہر والوں کے نصیب میں نہیں ہے۔

دُکھ سُکھ کے احوال

سعد دیدی شکر کن و ایثار کن نحس دیدی صدقہ و استغفار کن

اگر تم کوئی مبارک ستارہ دیکھو تو شکر کرو اور دوسروں کو فائدہ پہنچاؤ، اگر کوئی منحوس ستارہ دیکھو تو صدقہ دو اور استغفار کرو۔ (۶۸۵/۳۰۲)

مطلب : نحس سے یہاں مولاناؒ کی مراد خیالاتِ بد اور سعد سے مراد نیک خیال ہے، ایک پہ شکر اور دوسرے پر توبہ کرو۔

حدیث : "اِذَا اَصْبَحْتَ فَتَصَدَّقْ بِصَدَقَۃٍ یَّذْھَبُ عَنْکَ نَحْسَ ذَالِکَ الْیَوْمِ وَاِذَا اَمْسَیْتَ فَتَصَدَّقْ بِصَدَقَۃٍ یَّذْھَبُ عَنْکَ نَحْسَ تِلْکَ اللَّیْلَۃِ." (مستدرک الوسائل، ج ۱، ص ۵۳۳)

ترجمہ : جب صبح ہو تو کچھ نہ کچھ صدقہ دیا کرو، اس سے اُس دن کی نحوست تم سے چلی جائے گی اور جب شام ہو تو بھی صدقہ کیا کرو تاکہ اُس رات کی نحوست زائل ہو جائے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ کی پہنچ

از اَلَمْ نَشْرَحْ دو چشمش سرمہ یافت دید آنچہ جبرئیلش بر نتافت

کیا ہم نے تمہارے سینے کو کشادہ نہیں کیا، اس ارشادِ حق سے حضور ﷺ کی دونوں آنکھوں نے سُرمۂ بصیرت پایا اور اس بصیرت کی بدولت حضور ﷺ نے وہ کچھ دیکھا جس کے دیکھنے کی جبرئیل علیہ السلام تاب نہ لا سکے۔ (۶۸۸/۳۰۳)

مطلب : شرح صدرِ حضور کے لئے باعثِ معرفت و بصیرت ہے، دوسرے مصرع میں معراج کے واقعہ کا

ذکر ہے۔

حدیث : "فَلَمَّا بَلَغَ سِدْرَۃَ الْمُنْتَھٰی فَانْتَھٰی اِلَی الْحَجَبِ فَقَالَ جِبْرِیْلُ تَقَدَّمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَیْسَ لِیْ اَنْ اَجُوْزَ ھٰذَا الْمَکَانَ وَلَوْ دَنَوْتُ اَنْمِلَۃً لَاَحْتَرَقْتُ." (بحار الانوار، ج ۶، ص ۳۳ فی معراج)

ترجمہ : جب رسول اللہ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو آپ اُن نورانی پردوں تک گئے اور جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! آپ خود آگے بڑھ جائیے، مجھ میں ہمت نہیں کہ اس مقام سے آگے تجاوز کروں اور اگر میں ایک بال برابر بھی آگے بڑھوں تو میں جل جاؤں گا۔

غرض مند کا اندھا پن

پس نبیند جملہ را باطمّ و رمّ — حُبُّکَ الْاَشْیَآءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ

پس وہ نظر اس سارے واقعہ کو اس کے رطب و یابس سمیت نہیں دیکھ سکتی کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ بعض اشیاء سے محبت کرنا (ان کے معائب سے) اندھا بہرا کر دیتا ہے۔ (۶۸۹/۳۰۳)

مطلب : اغراض آنکھوں کا حجاب ہو جاتی ہیں۔

حدیث : "حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ" (مسند احمد، ج ۵، ص ۱۹۴)

ترجمہ : کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔

نیکوں کی تلاش کرو

پس تو ہم اَلْجَارُ ثُمَّ الدَّارُ گو — گر دلے داری برو دلدار جو

پس تم بھی کہو کہ نیک ہمسایہ کی طلب ضروری ہے پھر گھر کی اور اگر تم دِل رکھتے ہو تو جاؤ دلدار کو تلاش کرو۔

(۶۹۵/۳۰۴)

مطلب : دِلدار سے مراد مرشدِ کامل ہے۔ خاصانِ حق کی قبور کے شرف کا بیان آ رہا ہے، ضمناً نیک ہمسایہ اور ساتھی کی فضیلت۔

حدیث : "اَلْجَارُ قَبْلَ الدَّارِ وَالرَّفِیْقُ قَبْلَ الطَّرِیْقِ وَالزَّادُ قَبْلَ الرَّحِیْلِ" (جامع صغیر، ج ۱، ص ۱۴۳)

ترجمہ : مکان بنانے سے پہلے پڑوسی کی تحقیق کر لو، سفر کرنے سے پہلے ساتھی کی اور کوچ سے قبل راہ کی تسلی کر لو۔ یوں بھی روایت ہے۔

حدیث : "اَلْجَارُ ثُمَّ الدَّارُ" (مجمع الامثال، ص ۱۴۵)

ترجمہ : پہلے پڑوسی پھر گھر۔

اختتامیہ

ایک زمانہ تھا کہ فارسی زبان کو شاہی زبان ہونے کا شرف حاصل تھا مگر آج اس زبان کا استعمال پاکستان میں نہایت محدود ہو گیا ہے، حالانکہ یہ زبان ذخیرہ ہائے علم و ادب، صوفیانہ تخیّلات اور بہت سے علومِ دنیا کی حامل ہے۔ اس زبان میں آج بھی فلسفیانہ، صوفیانہ اور رُوحانی طرزِ تکلم کا ایک بہت بڑا خزانہ ملتا ہے۔ اس زبان کی شیرینی، تازگی اور بانکپن کو عظیم شاعروں نے محسوس کیا تو اس کو اپنے کلام کے لئے منتخب کیا۔ اس زبان پر فریفتہ ہونے والوں میں مولانا رومؒ، حافظ شیرازیؒ، سنائیؒ، جامیؒ، شیخ سعدیؒ، عراقیؒ، عرفیؒ، فردوسیؒ، ابوسعید ابوالخیرؒ، عمر خیامؒ اور علامہ اقبالؒ جیسے شعراء کا رِقّت آمیز اور لطافت سے بھرپور کلام ملتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اور غالب نے بھی اس زبان کی خوبیوں کی بناء پر اس زبان کے ذریعے اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام کو دیگر اسلامی ممالک تک پہنچانے کے لئے فارسی کو اپنے کلام کا ذریعہ بنایا تاکہ مسلمانوں کا ایک وسیع علاقہ ان کے کلام سے استفادہ کر سکے۔ اس زبان میں لکھے گئے مختلف الانواع موضوعات پر علم کے خزانے ملتے ہیں، جس سے مسلمانوں کا علمی معیار بلند ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کر کے علومِ مغربیہ کو اختیار کیا تاکہ ان کی معاشی حالت استوار ہو سکے۔ علومِ دینیہ کے اتنے بڑے خزانوں کو ترک کرنے سے مسلمانوں کو انحطاط کا شکار ہونا پڑا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز   پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو

مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے راقم الحروف نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مُسلمان اپنے آبائی علوم سے شناسائی حاصل کریں اور ان کے افکار سے اپنے ذہنوں کی آبیاری کریں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے فارسی اور اُردو کلام کا مطالعہ کر کے اپنی زندگی میں پائی جانے والی کجی کو دُور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے اپنی مختلف کتب میں علامہ اقبالؒ کے کلام کے ذریعے مشکلاتِ زندگی کا حل تجویز کیا ہے۔ علامہ کے کلام کی وضاحت نہایت آسان الفاظ میں کی گئی ہے تاکہ ہر کوئی آپ کے کلام کو سمجھ سکے۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے ایک کتاب بعنوان ''تعلیماتِ اقبال'' تالیف کی ہے جو عنقریب زیورِ طباعت سے اِن شاء اللہ آراستہ ہوگی۔

آج کا مسلمان دولت کے نشے میں اس قدر مدہوش ہو چکا ہے کہ اس کو اسلامی فرامین کی چنداں پرواہ نہیں، حالانکہ اسلام رزق کی فکر کا بہت آسان حل تجویز کرتا ہے۔ دولت کا حصول سکونِ قلب فراہم نہیں کرتا۔ علامہؒ نے فرمایا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

علامہ اقبالؒ کا وافی کلام راقم الحروف نے مختلف مضامین کے حوالے دیتے ہوئے اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے زوال کا سبب بے عملی اور عیش پرستی کو گردانا ہے، نہ کہ مفلسی اور غربت کو۔ فرماتے ہیں ؎

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں　　　سبب کچھ اور ہے جسے تو خود سمجھتا ہے

قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں　　　اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا

مسلمانوں کو اس حالت سے نکالنے کی دوسری کڑی یہ ہے کہ مولانا رومؒ کے کلام کو سمجھا جائے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے۔ الحمدللہ کہ اس دوسری کڑی کا مرحلہ زیرِنظر کتاب کی صورت میں بخیر اسلوبی اختتام پذیر ہوا۔ راقم الحروف کی دیگر کتب بھی مسلمانوں کو بیداری کا سبق پیش کر رہی ہیں، جن میں مضامین بہت سہل اور عام فہم انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر وقت نے اجازت دی تو دیگر فارسی کلام کا ترجمہ اور تشریح بھی پیش کی جائے گی۔

موجودہ کتب سے مدد حاصل کر کے غمِ دنیا سے آزاد ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ دینِ اسلام کے اصولوں سے مدد لی جائے تو انسان کو اس سے بھی زیادہ دولت اور عزت عطا کی جائے گی جو وہ دوسرے راستے اختیار کرنے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقِ

وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ.

ختم خواجگان

بروز جمعۃ المبارک بعد نمازِ عصر و قبل از مغرب پڑھیں

۱	بسم اللّٰہ شریف	۱۰۰ بار
۲	درُود شریف	۱۰۰ بار
۳	الحمد شریف	۱۰۰ بار
۴	سورہ الم نشرح لک	۷۹ بار
۵	سورہ الاخلاص	۱۰۰۰ بار
۶	الحمد شریف	۷ بار
۷	درُود شریف	۱۰۰ بار
۸	یَا قَاضِیَ الْحَاجَاتِ	۱۰۰ بار
۹	یَا شَافِیَ الْاَمْرَاضِ	۱۰۰ بار
۱۰	یَاکَافِیَ الْمُهِمَّاتِ	۱۰۰ بار
۱۱	یَادَافِعَ الْبَلِیَّاتِ	۱۰۰ بار
۱۲	یَارَافِعَ الدَّرَجَاتِ	۱۰۰ بار
۱۳	یَا حَلَّ الْمُشْکِلَاتِ	۱۰۰ بار
۱۴	یَامُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ	۱۰۰ بار
۱۵	یَا مُفَتِّحَ الْاَبْوَابِ	۱۰۰ بار
۱۶	یَاغِیَاثَ الْمُسْتَغِیْثِیْنَ اَغِثْنَا	۱۰۰ بار
۱۷	یَا وَاسِعَ الْمَغْفِرَاتِ	۱۰۰ بار
۱۸	یَامُنَزِّلَ الْبَرَکَاتِ	۱۰۰ بار
۱۹	یَا مُجِیْبَ الدَّعْوَاتِ	۱۰۰ بار
۲۰	یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ	۱۰۰ بار
۲۱	درُود شریف	۱۰۰ بار

الداعی

پیر عبداللطیف خان نقشبندی
ڈائریکٹر (ر) محکمہ
موسمیات، لاہور

ایصالِ ثواب برائے خواجگان نقشبندؒ

۱ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
۲ خواجہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ
۳ خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ
۴ خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ
۵ خواجہ ابو یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ
۶ خواجہ عارف ریوکری رحمۃ اللہ علیہ
۷ خواجہ بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ
۸ خواجہ سیّد امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ
۹ پیرانِ پیر خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ
۱۰ خواجہ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ

(مِن خدّامِ دربار نیریاں شریف)

شجرہ شریف

سلسلہ نقشبندیہ بہ مناسبتِ عبداللطیف خان نقشبندی، خاک پائے آستانۂ نیریاں شریف

یا الٰہی خستہ حالم رحم کن برحالِ ما
اِتقا دارم زِفضلت نیست جز تو والِ ما

اِلتجا دارم بہ درگاہت بنامِ مصطفےٰ ﷺ
کاں بُود اَحمدؐ محمدؐ درصفات و در عطا

دستِ اُو گیرم کہ دستِ خویش اُورا گفتہ ای
زِیں سبب گفتہ نہ باشد دستِ اُو از تو جُدا

حضرتِ صدیقؓ و سلمانؓ، قاسمؒ و جعفرؒ دِگر
بایزیدؒ و خواجۂ ما بوالحسنؒ خوُرشید فر

بوعلیؒ بحرِ عطا بوُ یوُسفؒ ابرِ مکرمت
عبدِ خَالقؒ عارفؒ و محمودؒ شاہِ داد گر

بحرِ کرم را میتنیؒ بابا سماسیؒ وکلالؒ
نقشبندؒ، عطارؒ و چرخیؒ عِشق را تیغ و سِپر

پس عبیدُاللہؒ و زاہدؒ خواجہ درویشِ اَجلؒ
خواجہ امکنگیؒ و باقی باللہؒ آمد خوُب تر

پس مجددؒ عُروۃ الوُثقٰی و شاہِ شاہ حُسینؒ
خواجہ عبدُالباسطؒ و شاہ عبدِ قادرؒ دیدہ وَر

فغنوی محمودؒ خواجہ اولیاء عبداللہ شاہؒ
شاہ عنایتؒ، حافظ احمدؒ والیانِ بحر و بَر

فخرِ ہند عبدُالصبوُرؒ و گُل محمدؒ شاہ غفورؒ
خلق را عبدُالمجیدؒ عبدُالعزیزؒ آمرُ دگر

خواجہ سُلطانُ المُلوکؒ وآں نظامُ الدّین شہؒ
خواجہ قاسمؒ ہادیٔ ہند و جہاں را راہبر

زاہدِ کاملِ محیُ الدّین شاہِ نیروی
داد علاؤالدّین جہانِ عِشق را کاملِ نظر

یا الٰہی رحم کنُ بر ما طفیلِ آں شہاں
لُطف فرما بر لطیفؔ و دوستاں شام و سحر

تعارفِ مصنّف

نام: عبداللطیف خان نقشبندی　　　سالِ پیدائش: 1927ء

مقامِ پیدائش: جالندھر　　　تعلیم: ایم ایس سی و دیگر محکمانہ تعلیمات

پیشہ: ڈائریکٹر (ر) محکمۂ موسمیات لاہور، تاحال سرپرست ادارہ تبلیغ و ترویجِ اسلام اور سلسلۂ درس و تدریس

ایڈریس: ای۔ 7/1۔ یولین کیولری گراؤنڈ لاہور چھاؤنی۔ فون:6666631-6665475

اسلام کی ترویج و اشاعت میں جن مقتدر ہستیوں نے کردار ادا کیا ہے اور جن کے طفیل وطنِ عزیز میں آبادی کا بہت بڑا حصہ اسلامی تعلیمات سے رُوشناس ہوا ہے، ان میں سے ایک اہم شخصیت، مصنفِ کتاب ہذا پیر عبداللطیف خان نقشبندی بھی ہیں۔ موصوف اپنی دینی خدمات کے باعث ملک اور بیرونِ ملک دینی حلقوں میں خاصے معروف ہیں، اگرچہ آپ نے چالیس برس کا عرصہ ایک ایسے محکمہ میں ممتاز عہدوں پر گزارا ہے جہاں آپ کا تعلق ماڈرن سائنس کے متعلقات سے وابستہ رہا، مگر آپ نے اس محکمہ کی اہم ذمہ داریوں کے علاوہ اوائلِ شباب سے ہی دینی اور تصوّف کے عمیق علوم کا مطالعہ کیا اور اب تک آپ متعدد رسائل اور مکتوبات کے علاوہ بیس سے زائد دینی کتب کے مصنف ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے لاتعداد مضامین تصوّف، رُوحانیت اور دیگر اسلامی عنوانات پر نوائے وقت، جنگ اور خبریں جیسے اخبارات کے علاوہ مختلف دینی رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ کی جو کتب اب تک زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں، ان میں سے آپ کی دس کتب ''نشانِ منزل''، (اُردو اور انگریزی) ''حسنِ نماز''، ''حضورِ قلب''، ''بیعت کی تشکیل''، ''سنتِ مبارکہ''، ''جنیدؒ و بایزیدؒ''، ''مجلسِ اقبالؒ''، ''رابطہ شیخ''، ''اِقَامَةُ الصَّلٰوة'' شائع ہو چکی ہیں۔ ''اسلام اور رُوحانیت'' اور ''تہذیبِ نفس'' کے علاوہ آٹھ عدد کتب عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔

مذکورہ بالا تصانیف و اشاعت کے ساتھ ساتھ پیر عبداللطیف خان نقشبندی نے تبلیغ کا ایک انوکھا سلسلہ وضع کیا ہے اور وہ یہ کہ آپ مختلف مقامات پر کچھ لوگوں کے اجتماع میں دو تین دِنوں کے لیے (صرف ایک گھنٹہ یومیہ) درس کا اہتمام کرتے ہیں، جس میں وہ جدید سائنٹیفک انداز میں اسلامی زندگی کے ایمان افروز حقائق اور قرآن و حدیث کے خوبصورت نکات سے آراستہ گفتگو کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو اس طرح گرما دیتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں حیرت انگیز کیفیت، زبردست انقلاب اور اسلامی ولولہ پیدا ہو جاتا ہے، بسااوقات تو آپ منٹوں میں ہی لوگوں کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کے اس حسنِ تعلیم و تدریس اور فیضِ صحبت سے اب تک ہزاروں مسلمان نشہءاسلام سے سرشار ہو چکے ہیں۔ مصنّف کی خواہش ہے کہ اگر درس و تدریس کے اس طریقے کو وسیع تر پیمانے پر رائج کیا جائے تو مسلمانوں کی کثیر تعداد بہت جلد اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت و کردار کی دولت سے مالا مال ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے حکومت یا متمول حضرات کی توجہ اشد ضروری ہے۔

ISBN 978-969-0-02154-0

فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی